قرآن وحدیث اور بنیادی ماخذ کی روشنی میں تحقیق وتوثیق کے ساتھ

سیرتِ نبوی
على صاحبها الصلاة والسلام

ڈاکٹر مہدی رزق اللہ احمد



جلد اول

دار العلم ممبئی

سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

قرآن و حدیث اور بنیادی ماخذ کی روشنی میں تحقیق و توثیق کے ساتھ

جزیرہ نمائے عرب سے غزوہ بنو قریظہ (6ھ) تک

جلد اوّل

تالیف
دکتور مہدی رزق اللہ احمد

ترجمہ
شیخ الحدیث حافظ محمد امین

نظر ثانی و ترجمہ حواشی
حافظ قمر حسن

دار العلم ممبئی

سلسلہ مطبوعات دارالعلم نمبر ۱۶۴

نام کتاب	:	سیرت نبوی
جلد	:	اوّل
تالیف	:	دکتور مہدی رزق اللہ احمد
ترجمہ	:	شیخ الحدیث حافظ محمد امین
طابع	:	محمد اکرم مختار
ناشر	:	دارالعلم ممبئی
تعداد اشاعت	:	ایک ہزار
تاریخ اشاعت	:	اکتوبر ۲۰۱۲ء

دارالعلم ممبئی
DARUL ILM
PUBLISHERS & DISTRIBUTORS

242, J.B.B. Marg, (Belasis Road),
Nagpada, Mumbai-8 (INDIA)
Tel. (+91-22) 2308 8989, 2308 2231
Fax : (+91-22) 2302 0482
E-mail : ilmpublication@yahoo.co.in

بسم الله الرحمن الرحيم

اللہ کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے۔

ABU UMAIMAH OWAIS

الله
رسول
محمد

اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاہِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاہِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

اللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاہِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاہِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

مضامین

باب 1: اسلام سے پہلے جزیرہ نمائے عرب

باب 2: پیدائش سے بعثت تک

باب 3: بعثت نبوی اور مشرکین کی مخالفت

باب 4: ہجرت حبشہ سے اسراء و معراج تک

باب 5: ہجرت مدینہ

باب 6: اسلامی معاشرہ اور تشکیلِ حکومت

باب 7: غزوات وسرایا

باب 8: غزوۂ اُحد تک کے واقعات

باب 9: غزوۂ مریسیع تک کے واقعات

باب 10: غزوۂ احزاب وبنوقریظہ

فہرست ابواب ونقشہ جات (جلد اول)

عرض ناشر

زندگی ایک آزمائش ہے۔ جب تک انسان پوری توجہ اور سنجیدگی سے زندگی کا اصل مقصد نہیں پہچانے گا اور صحیح فکر و عمل سے بیگانہ رہے گا، زندگی کبھی اعتدال پر نہیں آئے گی۔ حسن خیال اور اعمال صالحہ اختیار کرنے کے لیے ہم کہاں جائیں؟ کدھر نکلیں اور کسے ڈھونڈیں تاکہ اسے نمونۂ عمل بنائیں؟ اس سوال کا واحد جواب یہ ہے کہ تمام انسان محمد رسول اللہ ﷺ کے سچے فدائی بن جائیں اور انھی کے فکر و عمل کا چراغ لے کر زندگی کی مسافت طے کرتے رہیں حتی کہ اپنے پروردگار سے جا ملیں۔ کامیابی کا واحد طریقہ یہی ہے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی دوسرے طریقے ہیں، ان میں کامیابی کا کوئی وجود نہیں۔ یہ محض عقیدت و محبت کی کارفرمائی نہیں بلکہ عقل و شعور کی گواہی ہے کہ بنی نوع انسان میں امام الانبیاء محمد ﷺ جیسی صادق القول، احسن، اجمل اور اکمل شخصیت دوسری کوئی نہیں۔

جب خانہ کعبہ کی دیواریں نئے سرے سے تعمیر ہوئیں تو حجر اسود کی تنصیب پر جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ تمام قبائل کے سرداروں نے فیصلہ کیا کہ جو شخص باب بنی شیبہ میں سب سے مسجد الحرام میں پہلے داخل ہو گا وہی یہ مسئلہ حل کرے گا، چنانچہ سب سے پہلے حضرت محمد ﷺ تشریف لائے تو ہر شخص پکار اُٹھا: ''صادق آ گئے۔ امین آ گئے!''...... یہ رسولِ اکرم ﷺ کے بارے میں نبوت سے پہلے زمانے کے ان لوگوں کی گواہی ہے جو اپنے

مقابلے میں سب کو ہیچ اور ناقابلِ توجہ سمجھتے تھے۔

جب غار حراء میں حضرت محمد ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کے ذریعے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ اب تمام انسانوں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دیں۔ آپ بہر حال اللہ کے بندے تھے، وحی الٰہی کا جلال دیکھ کر گھبرا گئے اور بھٹکی ہوئی انسانیت کی رہنمائی کا جو عظیم کام آپ ﷺ کو سونپا گیا، اس کی سنگین دشواریوں کا اندازہ کر کے آپ کو پسینہ آ گیا۔ آپ شدید اضطرابی حالت میں گھر تشریف لائے۔ بستر پر لیٹ گئے۔ اہلیہ محترمہ سے چادر طلب فرمائی۔ ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: ''خیریت تو ہے؟'' آپ ﷺ نے وحی کی کیفیت، اپنے منصب کی گراں بار ذمہ داری اور اپنے اضطراب کی حالت بیان فرما دی۔ یہ سنتے ہی ام المومنین رضی اللہ عنہا نے بے ساختہ کہا: ''ہرگز نہ گھبرائیے۔ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو کبھی غمزدہ نہ ہونے دے گا۔ آپ عزیزوں اور رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتے ہیں۔ ناتوانوں، بے کسوں اور غریبوں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں۔ جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا انھیں مرحمت فرماتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔ مصائبِ زمانہ میں اہلِ حق کے مددگار ہیں اور ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔''

یہ آپ ﷺ کی صداقت پر ایک ایسی جلیل القدر بیوی کی گواہی ہے جس نے زمانۂ نبوت سے پہلے صرف آپ کی صداقت، دیانت اور عظیم کیریکٹر کو دیکھ کر ہی آپ سے شادی کی تھی۔ دورِ نبوت میں جس ہستی کو آپ ﷺ کا سب سے زیادہ قرب نصیب ہوا وہ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ ﷺ کے اخلاق و آداب کیسے تھے؟ انھوں نے جواب دیا: ''وہ تو مجسم قرآن تھے!'' یہ اُس دوسری عظیم المرتبت بیوی کی گواہی ہے جن کے حجرے میں آپ ﷺ نے زندگی کے آخری سانس لیے۔

جس ہستی کی سچائی کی گواہی اس کے اہلِ خانہ بھی دیتے ہوں اور گھر سے باہر بھی ہر شخص جس کی سچائی کا لوہا مانتا ہو، اس کے ارشادات پر ایمان نہ لانا اور اس کی پیروی سے

عملاً انکار سب سے بڑا المیہ اور ناقابلِ تلافی خسارہ ہے۔...... جب ایک ڈاکٹر کہتا ہے کہ زیادہ میٹھی چیزیں نہ کھاؤ ورنہ شوگر ہو جائے گی تو ہم اس کا فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ ہمیں اس سے بھی بڑھ کر طبیبِ انسانیت ﷺ کے ارشادات و ہدایات پر کامل یقین رکھنا چاہیے۔ جب آپ فرماتے ہیں کہ گناہ نہ کرو، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ نیکی کی زندگی بسر کرو، ہمیشہ کامیاب رہو گے......تو ہمیں ہمیشہ ایسا ہی کرنا چاہیے، نافرمانی نہیں کرنی چاہیے۔

قافلۂ انسانیت کے رہبرِ اعظم محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی بتاتی ہے کہ آپ ﷺ نے مظلومی کی حالت میں صبر کیا۔ باطل کے مقابلے میں عزمِ راسخ کی شان دکھائی۔ دینِ حنیف کی دعوت و تبلیغ میں پوری استقامت سے سرگرمِ عمل رہے۔ معاملات میں سچائی اور کردار میں بڑائی، پارسائی اور دلربائی کے فانوس روشن کیے۔ اور جب آپ ﷺ طاغوتی قوتوں کو مغلوب کر کے فاتحانہ شان سے برسرِ اقتدار ہوئے تو آپ ﷺ نے اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کو بھی معاف فرما دیا۔ کسی سے انتقام نہیں لیا اور اپنی زندگی کے آخری لمحات بھی اسلام کے فروغ اور تعمیرِ انسانیت کی ہدایات دیتے ہوئے بسر فرمائے۔

کیا ایسے اعلیٰ صفات و حسنات کی جلوہ گری تاریخِ عالم کے کسی اور انسان میں بھی ملتی ہے؟ کہیں نہیں ملتی۔ یہ بے مثل فضائل و مکارم صرف سیرت النبی ہی میں جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ پس آیئے! ہم سب انسانِ کامل حضرت محمد ﷺ ہی کی سیرت کے مطالعے کو وظیفۂ حیات بنالیں اور اپنا ہر عمل اسوۂ حسنہ ہی کی روشنی میں سنوارنے کی سعیٔ بلیغ کریں۔

اس کتاب کے مؤلف عالمِ عرب کے نامور محقق دکتور مہدی رزق اللہ احمد ہیں۔ ان کی اس عالمانہ کتاب کا یہ دلکش ترجمہ شیخ الحدیث محترم حافظ محمد امین ﷾ نے کیا ہے۔ نظرِ ثانی اور حواشی کے ترجمے کا فریضہ ادارے کے رکن محترم حافظ قمر حسن ﷾ نے بخوبی انجام دیا ہے۔ محسن فارانی نے اس میں 16 تحقیقی اور معلومات افزا جغرافیائی نقشے

شامل کر کے اس کی افادیت میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے الگ عنوان کے تحت اصطلاحی الفاظ کی توضیحات، سیرت النبی کے واقعات کا زمانی اشاریہ اور مصادر و مراجع بھی شامل کیے گئے ہیں۔ دکتور مہدی رزق اللہ قرآنی علوم کے ماہر ہیں، حدیث کے جید عالم ہیں۔ وہ جدید اسالیب تحقیق سے بخوبی آگاہ ہیں۔ انھوں نے اپنے فاضلانہ مقدمے میں لکھا ہے کہ میں عام مؤرخوں کی طرح ضعیف روایات قلم بند نہیں کرتا۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ صحیح صحیح روایات کی مدد سے سیرت مقدسہ کی حقیقی تصویر پیش کر دوں۔ انھوں نے سیرت مطہرہ سے متعلق تمام معلومات کی اچھی طرح چھان بین کی ہے۔ اُن صحابۂ کرام اور تابعین عظام کے اسمائے گرامی بتائے ہیں جنھیں جمال نبوت کے احوال لکھنے اور سننے سنانے کا خاص ذوق تھا۔ پھر انھوں نے عہد بہ عہد درجہ بدرجہ سیرت نگاروں کا مفصل تعارف کرایا ہے۔ فاضل مؤلف نے ان مستشرقین سے بھی بے اعتنائی نہیں برتی جنھوں نے رسالت مآب ﷺ کی سیرت و شخصیت کے کسی بھی پہلو کا کوئی تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے ضعیف واقعات کو ساقط الاعتبار گردانتے ہوئے اسبابِ ضعف بھی بیان کیے ہیں۔ ڈکتور مہدی رزق اللہ احمد نے جزیرہ نمائے عرب کا قدیم پس منظر اُجاگر کیا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے سفر و حضر کی ولولہ انگیز اور ایمان افروز داستان سنائی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اپنے رب کی محبت و فدویت میں ڈوبے ہوئے اس رفیع الشان پیغمبر اور اس کے لخت جگر نے کس وارفتگیٔ شوق سے خانہ کعبہ تعمیر کیا اور ان کے بعد تاریخ کے مختلف مراحل میں خانہ کعبہ کی تعمیر نو کی ضرورت کتنی مرتبہ پیش آئی۔ اس مقدس سرزمین کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے اس دور کے مروجہ مذاہب اور سیاسی و سماجی حالات کی تصویریں بھی کھینچی ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اللہ کے آخری رسول محمد ﷺ کن بے مثل صفات، جہات، حیثیات اور کمالات کا مرقع تھے، انھوں نے کس طرح باطل کی سفاہت، دناءت، مخالفت اور شرارت کے سفینے ڈبو دیے اور نامساعد حالات کی کیسی

کیسی منہ زور آندھیوں میں پوری استقامت سے دینِ حنیف کی تبلیغ و دعوت کے چراغ روشن رکھے۔ محترم مؤلف نے سیرت طیبہ کے ہر پہلو سے فکر و عمل کو جلا بخشنے والی حکمتیں اخذ کی ہیں اور نہایت بیش قیمت نصیحتیں یک جا کر دی ہیں۔ مؤلف نے کہیں بھی غلو سے کام نہیں لیا نبی ﷺ کی دینی، تبلیغی سماجی اور سیاسی زندگی کی بڑی سچی نقش آرائی کی ہے۔ یوں آپ ﷺ کے مکارم و اوصاف کی کہکشاں دکھا کر سب کی نگاہوں کو دعوت دی ہے کہ آیئے! اسوۂ حسنہ سے رہنمائی کا نور حاصل کیجیے۔ اس طرح ہماری معیشت، معاشرت، معاملات، اخلاق اور عبادات کا ہر گوشہ چمک اٹھے گا اور جدید دنیا کی وہ تمام تاریک راہیں روشن ہو جائیں گی جہاں آج اُجالے کی اشد ضرورت ہے۔

اللہ رب العزت سے دُعا ہے کہ اس کوشش کو قبول فرمائے۔ آمین

ناشر
دارالعلم

مقدمہ

حضرت محمد ﷺ کی سیرت مقدسہ کے بارے میں بڑی کثرت سے روایات مروی ہیں لیکن اس کتاب کے قارئین دیکھیں گے کہ میں نے بہت سی ضعیف روایات قلم بند نہیں کیں جنھیں مؤرخین اور سیرت نگار عام طور پر بیان کرتے ہیں۔ اس کتاب کا مقصد سیرت طیبہ سے متعلقہ تمام روایات جمع کرنا نہیں بلکہ سیرت پاک کی وہ حقیقی تصویر پیش کرنا ہے جو صحیح روایات سے تشکیل پاتی ہے۔ اگر مجھے صحیح روایت نہیں ملے گی تو میں ایسی ضعیف روایات کا حوالہ دوں گا جو شرعی احکام اور عقیدے سے متعلق نہ ہوں۔ ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کروں گا کہ روایت ضعیف ہے اور قابل اعتبار نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے علماء فقہی احکام اور اعتقادی مسائل سے غیر متعلق ضعیف روایات بیان کرنا جائز سمجھتے ہیں۔

اس کتاب کا بنیادی مقصد تو صحیح روایات ہی پر اعتماد کرنا ہے، تاہم جب مجھے صحیح روایت نہ ملی تو مجبوراً ناقص روایات لانی پڑیں۔ امید ہے کہ اہل علم اور ماہرینِ فن تصحیح و تنقیح کا فریضہ سرانجام دیں گے۔

کوئی حدیث صحیحین میں سے کسی ایک میں مذکور ہو تو میں اسی پر اکتفا کروں گا اور دیگر محدثین کی روایت صرف اس وقت بیان کروں گا جب اُس میں کوئی زائد مفید بات موجود ہو۔ باقی رہیں مؤرخین اور سیرت نگاروں کی ضعیف روایات تو وہ صرف اسی صورت میں

بیان کروں گا جب وہ شواہد اور متابعات کی بنا پر محکم حیثیت اختیار کر جائیں یا کم از کم یہ ثابت ہو جائے کہ ان کی کوئی نہ کوئی اصل موجود ہے۔

جب میں کسی روایت کے بارے میں لکھوں کہ یہ "معلق" ہے یا "بلا سند" یا "منقطع" یا "مُعْضل" یا "مُرسَل" ہے اور اس کا ضعف ختم نہیں ہو سکتا، یا "یہ واقدی اور اس قسم کے دیگر متروک اور ضعیف راویوں کی روایت ہے" تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ روایت ضعیف ہے یا بہت زیادہ ضعیف ہے۔

جب میں سیرت ابن ہشام کا حوالہ دوں گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے دو محققین دکتور ہمام اور ابوصعیلیک کی تحقیق پر اعتماد کیا ہے جبکہ میں نے کسی اور محقق کا ذکر نہ کیا ہو۔ میری حتی الامکان کوشش رہی ہے کہ میری تمام معلومات باوثوق اور قابلِ اعتماد ہوں تاکہ قاری ان کی صحت پر آسانی سے مطمئن ہو جائے اور وہ ان روایات کے بارے میں جو یہاں مختصراً درج کی گئی ہیں، تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہے تو بلا تردد اصل کتابوں سے رجوع کر سکے۔

میں نے بھرپور کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں درج معلومات انتہائی معتبر ذرائع سے حاصل کی جائیں۔ اُن میں اہم ترین ذریعہ اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید ہے، پھر تفسیر، حدیث اور مغازی کی کتابوں کا درجہ ہے۔ مزید برآں میں نے ہر حدیث اور روایت کا درجہ بھی بیان کر دیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ حدیث حجت ہے یا نہیں۔ میں نے اس سلسلے میں محدثینِ کرام، حدیث کے نقادوں اور محققین کی آراء پر اعتماد کیا ہے۔

میں نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اول قرآنی آیات سے استدلال کیا جائے، پھر صحیحین کی روایات سے استشہاد کیا جائے، بعد ازاں تفسیر، حدیث، خصائصِ نبوی، دلائلِ نبوت، مغازی و اسفار اور تاریخ و اخلاقیات کی کتابوں سے صحیح روایات لائی جائیں۔

میں نے ادب کی کتابوں اور اُن ثانوی مآخذوں پر زیادہ تر اعتماد نہیں کیا جن پر اہل علم

نے تنقید کی ہے۔

میں نے یہ التزام بھی کیا ہے کہ سیرت کے بیشتر واقعات سے اہم فقہی مسائل، مفید اسباق، عبرت آموز اور حکمت بھری باتیں اخذ کر کے قارئین کی نذر کروں۔

سیرت نبوی کے مطالعہ کے مقاصد

* سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآنی آیات اور احادیث نبویہ میں موجود احکام کو زندگی کے مختلف شعبوں میں عملی طور پر کس طرح نافذ کیا۔

* رسول اللہ ﷺ کی اقتدا و اتباع کا اولین تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے مختلف گوشوں میں آپ کی صفات و اخلاق، آپ کی نبوت کے دلائل اور خصائص کی معرفت حاصل کی جائے۔ جو شخص آپ کے اخلاق و اوصاف سے آگہی حاصل کرے گا وہ یقیناً آپ سے محبت بھی کرے گا اور آپ کی پیروی بھی کرے گا۔ یوں وہ اللہ تعالیٰ سے اجر عظیم پائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ﴾

''یقیناً تمھارے لیے اللہ کے رسول (کی ذات) میں بہترین نمونہ ہے، ہر اُس کے لیے جو اللہ (سے ملاقات) اور روز آخر کی امید رکھتا اور اللہ کا زیادہ سے زیادہ ذکر کرتا ہے۔''[1]

* رسول اللہ ﷺ کی پیروی اس بات کی دلیل ہے کہ بندہ اپنے رب عظیم سے محبت رکھتا ہے اور وہ جلد ہی اللہ تعالیٰ کا محبوب ہونے کا اعزاز حاصل کر لے گا۔ اللہ تعالیٰ

[1] الأحزاب 21:33.

کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾

''آپ کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''[1]

* سیرت نبوی رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کے جذبۂ ایمان و یقین کے ان واقعات سے بھری ہوئی ہے جو ان سے اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر ظہور پذیر ہوئے۔ ان دل آویز واقعات کی معرفت سے مومنین کے عزائم کو قوت و مضبوطی حاصل ہوتی ہے، دین حق کے دفاع کا جذبہ مستحکم ہوتا ہے اور دلوں کو سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے۔
* آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ میں وعظ و نصیحت اور عبرت و حکمت کے بے مثال نمونے جلوہ گر ہیں جن سے ہر صاحب شعور مستفید ہو سکتا ہے، چاہے وہ حاکم ہو یا محکوم، اسے معلوم ہو جائے گا کہ جو شخص ظلم اور تکبر کرتا ہے وہ کس عبرتناک انجام سے دوچار ہوتا ہے۔
* آنحضرت ﷺ کی سیرت میں ہر شعبۂ زندگی کے لوگوں کے لیے سبق پوشیدہ ہے، خصوصاً دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے عظیم الشان رہبری ہے جس سے دعوت الی اللہ کے راستے میں پیش آنے والی مشکلات اور آزمائشوں سے نمٹنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے۔
* رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ ایک انسانِ کامل کے لیے ہر اعتبار سے اعلیٰ درجے کی نادر مثال ہے۔
* رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ پڑھنے سے کتاب اللہ اور سنت رسول کے فہم میں بڑی مدد ملتی ہے۔
* سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرنے والے کو عقیدہ و ایمان، شریعت، اخلاق، تفسیر، حدیث،

[1] آل عمرٰن 31:3.

صداقت، سیاست، عدالت، دعوت و تربیت اور معاشرت اور دیگر اُمور کے بارے میں بالکل صحیح، مستند اور مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

* سیرت طیبہ کے مطالعہ سے دعوت اسلامیہ کے تدریجی حالات اور نشیب و فراز کے مراحل و مسائل سے آگاہی اور ان کٹھن مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے جن سے نبیٔ کریم ﷺ اور صحابۂ کرام کو اعلائے کلمۃ اللہ کے سلسلے میں گزرنا پڑا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ نے پیش آمدہ دشواریوں کی گھاٹیاں عبور کرنے کے لیے کیا طریق کار اختیار کیا۔

* قرآنی آیات کے اسباب نزول اور رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کے بہت سے ارشادات و فرامین سے صحیح معنوں میں باخبر ہونے کے لیے سیرت طیبہ کا مطالعہ شرطِ لازم ہے۔

* قرآن کریم اور سنت مطہرہ میں ناسخ و منسوخ کی صحیح معرفت سیرت طیبہ کے واقعات کی روشنی میں حاصل ہو سکتی ہے۔

* رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے صادر ہونے والے معجزات کا صحیح فہم وہ واقعات جانے بغیر نصیب نہیں ہو سکتا جن کے پس منظر میں یہ معجزات صادر ہوئے اور ظاہر ہے کہ معجزات کی معرفت مسلمان کے ایمان و یقین میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

* نبیٔ کریم ﷺ کے خصائص و امتیازات کی صحیح معرفت آپ کی سیرتِ طیبہ کی روشنی میں ہو سکتی ہے۔

* سیرتِ طیبہ کا تحقیقی مطالعہ کرنے سے ان صحیح احادیث کی معرفت حاصل ہوتی ہے جن سے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ سیرتِ طیبہ کے مطالعے میں ان احادیث کو کتنی زبردست اہمیت حاصل ہے۔

سیرت طیبہ کے مآخذ ومصادر

قرآن مجید

قرآن مجید کی بہت سی آیاتِ کریمہ میں رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ قرآن کریم ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ یہ جس پر اترا وہ مقدس انسان کون تھا، کن لوگوں میں آیا، اس کے شب و روز کس طرح گزرتے تھے، اس کے دوست کون تھے اور دشمن کون تھے، اس کے عادات و خصائل کیسے تھے، اس کی دعوت کیا تھی، وہ کس جمیل وجلیل ہستی کی بندگی کی دعوت دیتا تھا اور اس دعوت کے فیضان سے یہ دنیا ارتقائی مراحل طے کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ان قرآنی آیات کا سرسری جائزہ ہی ان حقائق کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ قرآن کریم نے یہ پہلو اس قدر اجاگر کیا ہے کہ صرف اسی کی مدد سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت مطہرہ پر ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ استاذ محمد عزت دروزہ نے اس موضوع پر دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی جس کا نام: سیرة الرسول ﷺ صورة مقتبسة من القرآن الكريم (سیرت رسول قرآن کریم کے آئینے میں) ہے۔ چونکہ قرآن کریم لاریب کتاب ہے، اس کا ثبوت قطعی ہے اور یہ صحیح ترین بیان ہے، لہٰذا سیرتِ نبوی کا اولین اور اصل ماخذ قرآن کریم ہی ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے مزید کلام کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کا انکار ایمان سے دست بردار ہونے کے مترادف اور علم وعقل سے بے بہرہ ہونے کی علامت ہے۔ قرآن مجید نے قبل از اسلام عربوں کی دینی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی کے بارے میں بہت سے معاملات کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید نے جزیرہ نمائے عرب اور اس کے قرب و جوار کی دیگر قدیم تہذیبوں پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے طلوع اسلام اور

اس سے پہلے کے انسانی معاشرے کی پوری حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔

قرآن مجید سے سیرت نبوی کے مطالعے اور استفادے کے لیے ضروری ہے کہ قرآنی تفاسیر بالماثور کی طرف رجوع کیا جائے جن میں مختلف آیات کی تفسیر میں احادیث باسند نقل کی گئی ہیں، ناسخ منسوخ کا بیان ہے اور اسبابِ نزول کا مفصل تذکرہ ہے، البتہ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جن احادیث سے مفسرین استدلال کرتے ہیں وہ معیار کے لحاظ سے ایک جیسی نہیں بلکہ ان میں صحیح، حسن، ضعیف، نہایت کمزور اور غیر معتبر، ہر قسم کی روایات موجود ہیں، چنانچہ ضروری ہے کہ جرح و تعدیل کے اصولوں کے مطابق اُن روایات کو پرکھا جائے اور انھی روایات کو لیا جائے جو ائمۂ حدیث کے نزدیک صحیح یا کم از کم قابلِ حجت ہوں۔

تفسیر بالماثور کی چند معتبر اور مشہور تفاسیر یہ ہیں: تفسیر طبری (متوفی 310ھ)، تفسیر ابن کثیر (متوفی 774ھ)، تفسیر ابن جوزی (متوفی 597ھ) اور امام سیوطی (متوفی 911ھ) کی تفسیر الدُّرالمنثور في التفسیر بالمأثور، جس میں جلیل القدر مصنف نے سابقہ تفاسیر کی تلخیص کی ہے اور اُن تمام نصوص پر روشنی ڈالی ہے جو سابقہ تفاسیر میں نظر انداز ہوگئی تھیں۔[1]

حدیث نبوی

کتبِ احادیث میں رسول اللہ ﷺ کے تمام اقوال و افعال اور تقاریر خوش اسلوبی سے جمع کر دیے گئے ہیں اور آپ کی شکل و صورت، اخلاق عالیہ اور معجزات و خصائص کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے۔ بعض کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے غزوات و سرایا کی تفصیلات کہیں ابواب کی صورت میں اور کہیں متفرق روایات کی شکل میں بیان کی گئی ہیں۔

[1] مصادر السیرة النبویة وتقویمها للدکتور فاروق حمادہ، ص: 35,34.

سب محدثین کے ہاں سیرت نگاری کا اپنا اپنا اسلوب ہے، مثلاً: امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں نبوت سے پہلے اور بعد از نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ، غزوات و سرایا، خطوط، صحابۂ کرام اور ازواج مطہرات کے فضائل کے بیان میں باقاعدہ الگ الگ ابواب اور عنوان قائم کیے ہیں، اگرچہ دیگر تمام روایات اور ابواب میں بھی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی متفرق جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ اسی طرح امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی اپنی صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ، خاص طور پر غزوات و سرایا کے ضمن میں الگ الگ ابواب باندھے ہیں۔ اسی طرح فضائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فضائل الصحابہ اور باب الامارہ کے علاوہ دوسرے ابواب میں بھی سیرت طیبہ کے حوالے سے بے شمار احادیث موجود ہیں۔

مستدرک حاکم جسے امام حاکم نیشاپوری رحمہ اللہ نے امام بخاری اور امام مسلم کی شروطِ روایت کے مطابق مدوّن کیا ہے، یہ خود انھی کا دعویٰ ہے اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے بہت سی احادیث کے بارے میں ان کا دعویٰ تسلیم بھی کیا ہے اور کئی احادیث میں اُن کے فیصلے کی موافقت نہیں کی، اس کتاب میں بھی غزوات و سرایا سے متعلقہ بہت سی احادیث ہیں جو الگ الگ ابواب میں آئی ہیں۔

سننِ اربعہ میں سے جامع ترمذی میں سیرت کا مفصل تذکرہ موجود ہے، خصوصاً ابواب المناقب میں سیرت طیبہ کے بارے میں گرانمایہ معلومات ملتی ہیں۔ اِس کے بعد سنن ابی داود اور پھر سنن ابن ماجہ کا نام آتا ہے۔ خاص طور پر اُس کی کتاب الجہاد۔ آخر میں سُنن نسائی ہے جس میں سیرت کے متعدد پہلوؤں کے بارے میں مفید تذکرے موجود ہیں۔

امام بیہقی رحمہ اللہ کی سنن کبریٰ سیرتِ طیبہ کے معتبر اور مستند واقعات سے بھرپور ہے۔

مسانید کی کتابوں میں مسند امام احمد سب سے زیادہ بلند پایہ ہے۔ غزوات اور سرایا کے تحت اِس میں سیرت سے متعلقہ بہت سے واقعات ہیں۔ اس میں سیرت اور مناقب کے

ابواب خاص طور پر اسی موضوع کے بارے میں ہیں جن میں سیرت طیبہ کی بیش بہا تفصیلات جلوہ گر ہیں۔ میری معلومات کے مطابق سیرت نبوی کا سب سے زیادہ سرمایہ کتبِ احادیث میں سے مسند احمد میں پایا جاتا ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ یہ کتاب تیس ہزار سے چالیس ہزار احادیث کی جامع ہے۔ ظاہر ہے کہ جب احادیث اتنی کثیر تعداد میں ہیں تو یقیناً ان میں سیرت سے متعلقہ احادیث بھی بڑی تعداد میں ہوں گی۔[1] البتہ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ صحت و ثقاہت کے لحاظ سے تمام کتبِ احادیث یکساں نہیں ہیں۔ التزامِ صحت کے اعتبار سے امام بخاری اور امام مسلم رحمہ اللہ کا درجہ سب سے بلند ہے جبکہ دوسری کتبِ احادیث میں تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہے۔ صحیح اور حسن روایات تو بالاتفاق قابلِ قبول ہوں گی۔ اِسی طرح معمولی ضعف والی احادیث بھی معتبر ہوں گی، البتہ اُن کے ضعف کی نشاندہی کی جائے گی، لہٰذا سیرت کے متعلق تحقیق کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصطلاحاتِ حدیث اور علمِ جرح و تعدیل سے بخوبی واقف ہو۔

اِن کتب احادیث کی خدمت کے نقطۂ نظر سے کئی اور کتب بھی لکھی گئیں، مثلاً: تراجم اور طبقات کی کتابیں اور معاجم وغیرہ۔ طبقات کی کتابوں میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور دیگر راویوں کے تفصیلی حالات موجود ہیں۔ اِس ضمن میں سیرت سے متعلقہ کثیر روایات بھی ان کتب میں مذکور ہیں۔ صحت کے لحاظ سے اِن روایات کے مرتبے کا تعین بھی آسانی سے ممکن ہے۔ طبقات کی مشہور کتابوں میں طبقات ابن سعد شامل ہے۔ اور تراجم کی مشہور کتابوں میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی الاصابہ، حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی الاستیعاب، علامہ ابن الاثیر رحمہ اللہ کی اسد الغابہ اور معاجم میں علامہ طبرانی رحمہ اللہ کی تمام معاجم قابلِ ذکر ہیں۔

[1] ہمارے ہاں عام طور پر پائے جانے والے نسخوں میں احادیث کی ترقیم تقریباً اٹھائیس ہزار تک مکمل ہو جاتی ہے، یہ تعداد شاید نسخوں کے فرق کی وجہ سے ہے۔

کتب شمائل

اگرچہ شمائل (عادات و خصائل) سے متعلقہ اکثر احادیث کتبِ حدیث کے مختلف ابواب کے تحت درج ہوتی ہیں، تاہم بعض محدثین نے اس عنوان کے تحت مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں جبکہ بعض دیگر محدثین نے اپنی کتب میں اس عنوان سے خصوصی ابواب قائم کیے ہیں، مثلاً: صحیح بخاری میں الاستیذان، اللّباس وغیرہ۔ صحیح مسلم میں البر والصلة والأدب، الآداب، فضائل النبي ﷺ، اللباس والزینة، الزهد والرّقاق وغیرہ۔ اسی طرح جامع ترمذی میں البر والصلة، الاستیذان وغیرہ۔ اورسنن ابن ماجہ میں الأدب، الزهد وغیرہ۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے شمائل کے نام سے ایک جداگانہ خصوصی تصنیف مرتب کی ہے۔ شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس کی تلخیص اور تحقیق بھی کی ہے۔ امام ابو الشیخ نے کتاب أخلاق النبي ﷺ وآدابہٗ تصنیف کی۔ علامہ بغوی رحمہ اللہ نے الأنوار في شمائل النبي المختار نامی کتاب لکھی اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اِس موضوع پر الأدب المفرد تصنیف کی۔ ان کتب میں صحیح اور ضعیف، ہر قسم کی احادیث موجود ہیں، چنانچہ ضروری ہے کہ ان میں سے صحیح اور معتبر کو اختیار کیا جائے۔

دلائل نبوت اور معجزات کے متعلق کتابیں

دلائل اور معجزات سے متعلقہ احادیث بھی حدیث کی کتابوں میں شامل ہوتی ہیں مگر بعض اہل علم نے علیحدہ طور پر اس عنوان سے خصوصی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ اگرچہ اس سلسلے کی بہت سی کتابیں ضائع ہو چکی ہیں مگر ابو نُعَیم اصبہانی کی دلائل النّبوة اور حافظ احمد بن حسین بیہقی کی دلائل النبوة اب بھی ملتی ہیں۔ امام بیہقی رحمہ اللہ کی تحریر کردہ کتابِ سیرت انتہائی نفیس ہے۔ نام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صرف معجزات کا تذکرہ ہوگا

مگر درحقیقت مصنف رحمہ اللہ نے اس کتاب میں سیرت نبوی سے متعلقہ نہایت قیمتی سرمایہ جمع کر دیا ہے۔ یہ اہم کتاب سات جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ چونکہ مصنف نے سابقہ تمام کتب سے استفادے کے بعد یہ کتاب لکھی ہے، اس لیے یہ کتاب سیرت نبوی اور غزوات وسرایا کے سلسلے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس سے کوئی مؤرخ صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الخصائص الکبریٰ میں تمام سابقہ کتب حدیث سے دلائل و معجزات سے متعلقہ تمام معلومات بڑی حد تک جمع کر دی ہیں۔ یہ کتب بھی مزید تحقیق و تدقیق کی ضرورت سے خالی نہیں تاکہ صحیح اور ضعیف حدیث میں امتیاز ہو سکے اور صحیح سیرت طیبہ کی جستجو کرنے والا ان سے فائدہ اٹھا سکے۔

کتب خصائص

اس موضوع پر دو ہی کتابیں قابل ذکر ہیں۔ ایک علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی الخصائص الکبریٰ اور دوسری امام شامی رحمہ اللہ کی سبل الھدیٰ والرشاد جو اپنے موضوع پر انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔

کتب سیرت و مغازی

اس میں شک نہیں کہ کتب مغازی کی معلومات انھی روایات سے حاصل ہوتی ہیں جو کتب حدیث میں بیان کی گئی ہیں حتی کہ محدثین حدیث یا سنت کی تعریف کرتے ہیں تو اس میں سیرت کو بھی شامل کرتے ہیں کہ جو بات بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو وہ حدیث ہے، چاہے وہ آپ کا قول، عمل یا تقریر ہو، یا وہ بات آپ کے اخلاق یا جسمانی خدوخال یا سیرت سے تعلق رکھتی ہو۔

یہ حقیقت پہلے ہی عرض کی جا چکی ہے کہ حدیث کی کتابیں ہی سیرت کا اصلی ماخذ ہیں اور سیرت کی تمام چھوٹی بڑی معلومات کتب حدیث ہی سے حاصل ہوتی ہیں، چنانچہ خود محدثینِ کرام نے محنت شاقہ سے کام لیا اور اسوۂ حسنہ پر جداگانہ کتابیں تحریر کر دیں۔

پہلی صدی ہجری کے سیرت نگار: ہمارے علم کے مطابق ''سیرت'' یا ''غزوات و سرایا'' کے موضوع پر سب سے پہلے جن لوگوں نے الگ کتابیں لکھیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

* حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔ انھوں نے 68 ھ میں رحلت فرمائی۔
* حضرت سعید بن سعد بن عبادہ خزرجی رضی اللہ عنہما۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ حضرت شرحبیل کے والد ہیں۔
* حضرت سہل بن ابی حثمہ مدنی انصاری رضی اللہ عنہما، وہ 3 ھ میں پیدا ہوئے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں وفات پائی۔
* تابعین میں سے حضرت عروہ بن زبیر بن عوام، وہ 94/93ھ کے مابین فوت ہوئے۔
* حضرت سعید بن مسیب مخزومی۔ وہ 94 ھ میں فوت ہوئے۔
* حضرت ابان بن عثمان بن عفان۔ وہ 86-105 ھ کے مابین فوت ہوئے۔
* ابو فضالہ حضرت عبداللہ بن کعب بن مالک انصاری۔ وہ 97 ھ میں فوت ہوئے۔

دوسری صدی ہجری کے سیرت نگار

* حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق، متوفی 107 ھ۔
* حضرت وہب بن منبہ، متوفی 114 ھ۔
* حضرت شرحبیل بن سعید، متوفی 123 ھ۔
* حضرت ابو روح یزید بن رومان اسدی، متوفی 130 ھ۔
* ابو اسود محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل اسدی جو یتیمِ عروہ کے نام سے معروف تھے، متوفی 131 ھ۔

* حضرت عبداللہ بن ابی بکر بن حزم، وہ 130-135ھ کے مابین فوت ہوئے۔
* حضرت موسیٰ بن عقبہ، متوفی 141ھ۔
* حضرت محمد بن اسحاق بن یسار مطلّبی مدنی، متوفی 151ھ۔
* حضرت یونس بن یزید ایلی، متوفی 152ھ۔
* حضرت معمر بن راشد، متوفی 154ھ۔
* حضرت ابو معشر سندھی، وہ 170ھ کے بعد فوت ہوئے۔
* حضرت ابو اسحاق فزاری، متوفی 186ھ۔
* حضرت ولید بن مسلم دمشقی، متوفی 195ھ۔

تیسری صدی ہجری کے سیرت نگار

* محمد بن عمر واقدی، متوفی 207ھ۔
* عبدالرزاق بن ہمام صنعانی، متوفی 211ھ۔
* سعید بن مغیرہ بن صیاد مِصِّیصی، متوفی 220ھ۔
* احمد بن محمد ورّاق، متوفی 228ھ۔
* محمد بن سعد بن منیع زُہری، متوفی 230ھ۔
* محمد بن عائذ قرشی، متوفی 224ھ۔
* سلیمان بن طرخان تیمی، متوفی 245ھ۔
* ہشام بن عمار، متوفی 245ھ۔
* سعید بن یحییٰ اموی، متوفی 249ھ۔
* عمر بن شبہ بن عبید، متوفی 262ھ۔

بعض مؤرخین نے ان سیرت نگاروں کو چار طبقاتِ میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے طبقے کے مشہور سیرت نگار ابان، عروہ، شرحبیل اور ابن منبہ ہیں۔ اگرچہ ان حضرات کی اصل کتابیں

ہمیں نہیں ملیں لیکن بعد کے ادوار کے مفسرین، محدثین اور سیرت نگاروں کی کتابوں میں ان کی بہت سی مرویات بڑی وضاحت سے مذکور ہیں۔

مشہور مستشرق بیکر نے حضرت وہب کی ''مغازی'' کا ایک حصہ بُردی اوراق پر لکھا ہوا پایا جو شٹارن ہارٹ کے ذخیرے میں محفوظ تھا اور اب جرمنی کے شہر ہائیڈل برگ میں موجود ہے۔ یہ کتاب وہب کے نواسے عبدالمنعم کی روایت ہے جو محدثین کے نزدیک کذاب ہے۔

ڈاکٹر پروفیسر محمد مصطفیٰ اعظمی نے حضرت عروہ کی سیرت سے متعلقہ روایات جمع کی ہیں جو ابو اسود کی روایت سے ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب مغازي رسول الله ﷺ لعروة بن الزبير برواية أبي الأسود يتيم عروة کے عنوان سے شائع کی ہے۔

دوسرے طبقے کے سیرت نگاروں میں عبداللہ بن ابی بکر، عاصم اور زہری رحمہم اللہ بہت مشہور ہیں۔ ان کی کتابیں بھی ہم تک نہیں پہنچیں، تاہم ان کے بعد آنے والے مؤرخین کی کتابوں میں ان کی روایات بکثرت ملتی ہیں۔ دکتور سہیل زکار نے ان کتابوں سے امام زُہری کی مرویات المغازي النبوية کے عنوان سے جمع کر کے شائع کر دی ہیں۔

تیسرے طبقے کے سیرت نگاروں میں سے زیادہ مشہور موسیٰ بن عقبہ، معمر بن راشد اور محمد بن اسحاق رحمہم اللہ ہیں۔ یہ تینوں امام زہری رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ ان کے علاوہ فزاری، ولید، واقدی، عبدالرزاق، مصیصی، ابن سعد، وراق، ابن عائذ، ابن أبی شیبہ، سلیمان بن طرخان، ہشام بن عمار اور یحییٰ بن سعید اموی بھی اسی طبقے کے مشہور سیرت نگار ہیں۔ اس طبقے کی اکثر کتابیں یا بعض حالتوں میں ان کے کچھ اجزاء ہم تک پہنچے ہیں، مثلاً: مغازی موسیٰ بن عقبہ کے کچھ حصے مشہور مستشرق ایڈورڈ سخاؤ نے جرمن ترجمے کے ساتھ 1904ء میں شائع کیے ہیں۔ اسی طرح سیرت ابنِ اسحاق کے بھی کچھ اجزاء ہم تک پہنچے ہیں۔ زیادہ مشہور اور اہم حصہ وہ ہے جو سیرت ابن ہشام کے نام سے معروف ہے۔ سیرت

ابنِ اسحاق کا وہ حصہ جو ''سیر و مغازی'' کے نام سے پایا گیا ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ یہی حصہ دوبارہ دکتور سہیل زکار کی تحقیق کے ساتھ بھی شائع ہوا۔

فزاری کی سیرۃ الرسول کے دو اجزاء مراکش کی قرویین یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہیں جنھیں دکتور فاروق حمادہ ان شاء اللہ عنقریب شائع کرنے والے ہیں۔ واقدی کی کتاب ''مغازی'' مشہور مستشرق مارسن جونز کی تحقیق سے تین جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

امام عبدالرزاق کی کتاب ''السیرۃ'' ان کی مشہور کتاب ''مصنف عبدالرزاق'' کے ضمن میں ہم تک پہنچی ہے جو مدت ہوئی شائع ہو چکی ہے اور عام طور پر پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔ ابن سعد کی ''طبقاتِ کبریٰ'' سات جلدوں میں چھپی ہے اور عام ملتی ہے۔ اس کی پہلی اور دوسری جلد سیرت نبوی کے بارے میں ہے جس کی اکثر روایات انھوں نے اپنے استاد واقدی کی سند سے بیان کی ہیں۔ ابن سعد نے 143 مقامات پر واقدی سے روایت کی ہے۔[1] ابن عائذ کی کتاب بھی ہم تک پہنچ چکی ہے۔ وہ لندن میوزیم میں ہے اور مخطوطے کی صورت میں محفوظ ہے۔

امام ابن ابی شیبہ کی کتاب بھی مخطوطے کی شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔ اس کا ایک نسخہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں بھی موجود ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جن مؤرخین نے سیرت نگاروں کے یہ طبقے بنائے ہیں انھوں نے بہت سے سیرت نگاروں کو قلم بند نہیں کیا اور طبقات میں اُنھیں اُن کی علمی حیثیت کے مطابق جگہ نہیں دی۔

مندرجہ بالا کتابوں میں سیرت سے متعلقہ مواد یکساں نہیں بلکہ کسی کتاب میں زیادہ معلومات ہیں اور کسی میں کم، مثلاً: محمد بن اسحاق، واقدی، محمد بن سعد، فزاری، عروہ بن

[1] طبقات ابنِ سعد کا مقدمہ تحقیق، ص:51، تتمہ تابعین، اہل مدینہ و مابعد۔ زیاد محمد منصور نے ابنِ سعد کے ہر استاد کی روایات کو شمار کیا ہے۔

زبیر، زہری، ابن ابی شیبہ، موسیٰ بن عقبہ اور یحییٰ بن سعید اموی رحمہم اللہ کی تصنیفات میں سیرت سے متعلقہ حالات و واقعات بہت زیادہ مقدار میں ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں ولید دمشقی، سلیمان بن طرخان، ابن عائذ اور ہشام بن عمار کی تالیفات میں نسبتاً کم معلومات ہیں۔ علاوہ ازیں یہ تمام مصنفین جرح و تعدیل کے لحاظ سے بھی ایک جیسے نہیں۔ ان میں سے بعض کو ثقات میں شمار کیا گیا ہے جبکہ بعض مدلس، ضعیف یا متروک قرار پائے ہیں۔ مذکورہ بالا سیرت نگار اگرچہ محدثین کے نزدیک مشہور ہیں اور انھوں نے اکثریت کو ثقہ قرار دیا ہے مگر مؤرخین کے نزدیک ان میں سے ابن اسحاق، واقدی اور ابن سعد ہی معروف ہیں۔ خصوصاً ابن اسحاق کیونکہ ان کی کتاب السیر والمغازي عام و خاص تمام مسلمانوں میں مشہور ہوگئی۔ علم حدیث کی رو سے ان کا کیا مقام و مرتبہ ہے؟ یہ تو اگلے اوراق میں معلوم ہو جائے گا لیکن سیرت اور مغازی کی معرفت کے لحاظ سے یہ مسلَّم امام ہیں اور ان کی اس مُسلَّمہ حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں علم حدیث کی رو سے ان پر کی جانے والی جرح بھی مختلف فیہ ہے اور سب محدثین کا اس پر اتفاق نہیں۔

امام ابن اسحاق کی کتاب السیر والمغازي کی عوام و خواص میں شہرت کی چند وجوہ یہ ہیں:

* انھوں نے واقعات کے تذکرے میں زمانی ترتیب کا لحاظ رکھا ہے اور یہ بات انھوں نے اپنے استاد امام زہری رحمہ اللہ سے سیکھی، انھوں نے بھی اپنی ''سیرت'' زمانی تسلسل کی مناسبت سے ترتیب دی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے دور میں یہ ایک نادر اور انوکھا کام تھا۔
* انھوں نے تمام روایات ایک تسلسل کے ساتھ بیان کی ہیں اور ہر راوی کی روایت کو علیحدہ طور پر ذکر نہیں کیا۔ اِس سے واقعے کی مکمل تفصیل سامنے آ جاتی ہے۔ یہ چیز مبتدی طالبانِ علم اور عام قارئین کے لیے بہت مفید ہے کیونکہ اس طرح کسی واقعے کو سمجھنا، سمجھانا اور یاد رکھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ محدثین نے ان کے اس انداز پر تنقید کی ہے کیونکہ

اس طرح یہ پتہ نہیں چلتا کہ کسی راوی نے کوئی واقعہ کس حد تک بیان کیا ہے۔

* ابن اسحاق اپنے عہد کے ایک جید عالم تھے اور وہ اپنی علمی وسعتوں کی بدولت بلند مرتبے پر فائز ہوئے، مزید برآں ان کا انداز بیان بڑا دلآویز ہے اور وہ فصاحت و بلاغت کی خوبیوں سے بھی مالا مال تھے۔

* ابن ہشام کی تہذیب و ترتیب نے ابن اسحاق کی سیرت کو چار چاند لگا دیے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام اس کتاب پر ایسے ریجھے کہ اسے شامل درس و تدریس کر لیا۔ اور اس پر علمائے کبار نے تشریحات اور حاشیے لکھے اور اس کی منقطع روایات کو موصولاً بیان کیا۔ یوں اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہوا۔[1]

واقدی اور ان کے شاگرد ابن سعد پہلے تین اسباب میں تو امام ابن اسحاق کے شریک و سہیم ہیں اور مؤرخین کے نزدیک نہایت معروف اور مسلّم ہیں، البتہ فصاحت و بلاغت میں ابن اسحاق کا کوئی ہمسر نہیں اور محدثین کرام کے نزدیک بھی وہ مقبول و معتبر ہیں۔[2]

سیرتِ اطہر کی نگارش کے حوالے سے ان تینوں جلیل القدر علماء کو جس شہرت عام اور بقائے دوام کا امتیاز و اعزاز میسر آیا، اس کے پیش نظر ہم ان کی علمی وجاہت و جلالت پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

محمد بن اسحاق (متوفی 150 یا 151ھ): ان کا پورا نام و نسب ابو بکر محمد بن اسحاق بن یسار مُطّلبی ہے۔ یہ قیس بن مخرمہ بن مطلب بن عبد مناف قرشی کے غلام تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان کے دادا یسار کو 12ھ میں انبار کے قریب عراق کے ایک شہر عین التمر سے گرفتار کیا تھا۔[3] ان کی نشو و نما مدینہ منورہ میں ہوئی۔ حفظِ حدیث کے لیے نہایت

[1] مصادر السيرة النبوية وتقويمها للدكتور فاروق حمادة، ص: 72,71. [2] یاد رہے کہ ابن سعد کے علم کا بڑا حصہ واقدی ہی کا مرہونِ منت ہے۔ [3] الطبقات الكبرىٰ: 7 / 321، وتاريخ بغداد: 214/1، وسير أعلام النبلاء: 33/7.

ذوق شوق اور بڑی پابندی سے علماء کی مجالس میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کے مشہور اساتذہ قاسم بن محمد بن ابی بکر، ابان بن عثمان، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف، نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر اور ابنِ شہاب زہری ہیں۔ انھوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ کے دیدار کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔ بہت سے مشرقی اسلامی شہروں میں ان کی اکثر آمدورفت رہتی تھی۔ اس مناسبت سے انھوں نے ان شہروں کے اساتذہ سے بھی کسبِ فیض کیا۔

محدثین ان کی ثقاہت کے بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے تو ان کو دجالوں میں سے ایک دجال قرار دیا ہے۔ حضرت ہشام بن عروہ رحمہ اللہ نے بھی ان کو "کذّاب" کہا ہے کیونکہ وہ ان کی بیوی فاطمہ بنت منذر بن زبیر سے روایات بیان کرتے تھے جبکہ ہشام اس امر کی تردید کرتے۔ وہ کہا کرتے تھے: "بھلا وہ میری بیوی کے ہاں جا سکتا ہے؟" اسی طرح ان پر انکار تقدیر اور تشیع کے الزامات بھی لگائے گئے۔ (1)

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ان سے کوئی روایت نہیں لی، البتہ متابعات (مؤیدات) میں ان سے روایت لی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اپنی صحیح میں صرف معلق روایات میں ان کا ذکر کیا ہے اور مسند روایات میں ان سے کوئی روایت نہیں لی۔ (2)

(1) عقیدۂ انکارِ تقدیر: اس کا حامل اسلامی فرقہ "قدریہ" کے نام سے معروف ہے جو کہتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کے ارادے اور اُس کی تقدیر کے بغیر اچھے بُرے کام کرتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (الغلو والفِرَق الغالية في الحضارة الإسلامية للدكتور عبدالله سلوم، ص: 272)

(2) معلق روایت: اس روایت کو کہتے ہیں جس میں ابتدائے سند سے ایک یا ایک سے زیادہ راوی تسلسل سے حذف کر دیے جائیں۔ حذف کا یہ عمل کبھی سند کے آخر یعنی صحابی یا تابعی تک چلا جاتا ہے۔ کبھی یہ روایت بالجزم قَالَ کے صیغے سے ہوتی ہے اور کبھی یُذْکَرُ اور یُرْوٰی جیسے کمزور صیغوں سے، دیکھیے: (مقدمة الفتح، الفصل الرابع، ص: 15) معلق روایت کی مثال کے لیے ملاحظہ کیجیے: (صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة العشيرة [أو العُسيرة]، حديث: 3949)

دوسری طرف محدثین کی ایک جماعت نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔ ان میں ایک اہم شخصیت شعبہ بن حجاج ہیں جو اپنے دور میں جرح و تعدیل کے امام تھے۔ وہ فرماتے ہیں: ''محمد بن اسحاق علم حدیث میں امیر المومنین کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' مزید فرمایا: ''مجھے اختیار ہوتا تو میں محمد بن اسحاق کو محدثین کا امیر بنا دیتا۔'' امام زہری رحمہ اللہ کے شاگردوں کو ان کے حافظے پر اس قدر اعتماد تھا کہ اگر انھیں زہری کی کسی حدیث کے بارے میں شک پڑ جاتا تو وہ ان سے رجوع کرتے تھے۔

امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے بھی انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''محمد بن اسحاق حدیث میں ثقہ اور معتبر ہیں۔'' ایک دفعہ ان سے محمد بن اسحاق کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: ''مشہور محدث عاصم بن عمر بن قتادہ نے فرمایا ہے کہ جب تک محمد بن اسحاق زندہ ہیں لوگوں میں علم حدیث باقی رہے گا۔'' امام یحییٰ بن سعید قطان اور امام احمد بن حنبل نے بھی انھیں ثقہ قرار دیا ہے اور ان کی بیان کردہ حدیث کو قابل حجت کہا ہے۔ تمام سنن، مسانید اور مستدرک کی کتابوں میں ان کی روایات بکثرت پائی جاتی ہیں۔ بڑے بڑے ائمہ نے ان کے حوالے سے احادیث بیان کی ہیں، مثلاً: امام مالک رحمہ اللہ کے استاد یحییٰ بن سعید انصاری، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ وغیرہ رحمہم اللہ، حتی کہ امام سفیان بن عیینہ نے ان کے بارے میں فرمایا: ''مجھے کوئی شخص ایسا نہیں ملا جو ابن اسحاق کو حدیث میں جھوٹ کا الزام دیتا ہو۔'' اسی طرح حماد بن سلمہ بن دینار، حماد بن زید، ثوری، شعبہ اور ابن جریج جیسے اساطینِ حدیث نے بھی ان کے حوالے سے روایات بیان کی ہیں۔

امام ابوزرعہ فرماتے ہیں: ''تمام اکابر اہل علم ان سے روایت لینے پر متفق ہیں۔'' امام ذہبی نے ان کے بارے میں فرمایا: ''ان کی حدیث حسن درجے کی ہے۔ وہ نیک اور سچے ہیں، البتہ جس روایت کو بیان کرنے میں وہ منفرد ہوں اس میں کچھ کمزوری ہوتی ہے۔ بہر صورت ائمہ نے انھیں قابلِ حجت سمجھا ہے۔'' امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اپنی تاریخ میں

ان کا ذکر کیا ہے اور انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔ وہ انھیں کتاب الضعفاء میں نہیں لائے۔ امام ابن عدی نے فرمایا: ''میں نے ان کی بہت سی احادیث کی چھان بین کی ہے۔ مجھے کوئی ایسی بات نہیں ملی جس کی بدولت انھیں قطعی طور پر ضعیف کہا جا سکے۔ ہاں دوسرے راویوں کی طرح انھیں کبھی کبھی کوئی غلط فہمی ہو جاتی ہے اور بعض روایات میں ان پر تنقید کی گئی ہے۔''

انھیں ثقہ قرار دینے والے اہل علم نے کہا ہے کہ جن بزرگوں نے ان پر جرح کی ہے، ازروئے قواعد ان کی جرح قابل قبول نہیں کیونکہ اس میں جرح کی پوری شرائط نہیں پائی جاتیں۔ اسی لیے علماء نے اس جرح کو مسترد قرار دیا اور محمد بن اسحاق کی علمی بڑائی تسلیم کی ہے۔ امام ابن سید الناس [1] اور خطیب بغدادی [2] نے ان کے بارے میں موافق اور مخالف تمام اقوال کا موازنہ کر کے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔

معاصر علماء میں سے جن لوگوں نے محمد بن اسحاق کے متعلق جرح و تعدیل کے اقوال کی تحقیق میں کردار ادا کیا اُن میں دکتور سلیمان بن حمد عودہ اور دکتور مسفر سعید دماس غامدی نمایاں ہیں۔ اول الذکر نے ''السّيرة النبوية في الصحيحين وعند ابن إسحاق'' کے عنوان سے لکھے گئے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں تفصیل سے اُن اقوال کا جائزہ لیا ہے۔ اور دکتور غامدی نے 1419ھ کے مجلۂ بحوثِ اسلامیہ کے شمارہ نمبر 54 میں ''إمام المغازي محمد بن إسحاق'' کے زیرِ عنوان اپنی تحقیق پیش کی ہے۔

جہاں تک سیرت اور مغازی میں ان کی سیادت و امامت کا تعلق ہے تو وہ متفقہ ہے اور اس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔ ان کی حدیث کے بارے میں محدثین کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ حسن لذاتہ کے مرتبے پر ہو گی بشرطیکہ وہ صراحت سے حَدَّثَنا (انھوں نے ہم سے بیان کیا) یا سَمِعْتُ (میں نے سُنا) کہیں، نیز سند متصل ہو اور سب راوی ثقہ ہوں۔ یہ شرط

[1] عيون الأثر في فنون المغازي والسِّيَر لابن سيد الناس، ص: 8-17. [2] تاريخ بغداد: 215,214/1.

اس لیے قائم کی گئی ہے کہ وہ مُدَلِّس راوی ہیں۔

سیرت ابن اسحاق پر ابن ہشام کے اثرات: مشہور مؤرخ ابن ہشام نے زیاد بن طفیل بکائی کی روایت سے یہ کتاب نقل کی ہے، [3] البتہ انھوں نے بعض مقامات پر ابن اسحاق کی گرفت کی ہے، چنانچہ انھوں نے بعض مبہم باتوں کو کھول کر بیان کیا، غیر ضروری طوالت کو اختصار میں بدلا اور روایات کی چھان بین کی ہے۔ اگر کہیں ابن اسحاق سے کوئی روایت چھوٹ گئی ہے تو انھوں نے اسے بھی سند سمیت بیان کر دیا ہے، اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ انھوں نے سیرت ابن اسحاق پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں حتی کہ لوگ ابن اسحاق ہی کو بھول گئے اور اسے ابن ہشام کی طرف ہی منسوب کرتے ہیں۔

ابن ہشام خود لکھتے ہیں: ''میں ان شاء اللہ اس کتاب کو حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام سے شروع کروں گا اور ہر اس شخصیت کا ذکر کروں گا جسے رسول اللہ ﷺ کے آباء و اجداد میں شمار کیا جاتا ہے، البتہ بطور اختصار ان شخصیات کا ذکر نہیں کروں گا جو آپ ﷺ کے آباء واجداد میں نہیں آتے، چاہے ابن اسحاق نے ان کا تذکرہ کیا ہو۔ اسی طرح میں

[3] زیاد بن طفیل بکائی: یہ زیاد بن عبداللہ بن طفیل بکائی عامری ہیں۔ 183ھ میں فوت ہوئے۔ حافظ ابن حجر نے اُن کے متعلق لکھا: ''وہ مغازی کے فن میں صدوق (نہایت سچے) اور ثبت (پختہ) ہیں، تاہم انھوں نے جو احادیث ابن اسحاق کے علاوہ دیگر راویوں سے روایت کیں اُن میں کسی قدر ضعف ہے۔'' دیکھیے: (تقریب التہذیب، ص: 230) صحیح بخاری میں اُن کی صرف ایک روایت ہے اور وہ بھی بطور متابعت (تائید)۔ میں (مصنفِ کتاب) کہتا ہوں کہ امام سُہیلی نے سیرت ابن ہشام کی شرح میں لکھا: ''بکائی ثقہ ہیں۔ امام بخاری کتاب الجہاد اور امام مسلم اپنی کتاب میں متعدد جگہوں پر ان کی روایت لائے ہیں۔ اُن کے قابلِ اعتماد ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔'' دیکھیے: (الروض الأنف: 6/1) زیاد نے حُمید طویل سے بھی (جو صحیح بخاری و مسلم کے راوی ہیں) روایت کی ہے۔ امام بخاری نے تاریخ میں وکیع کا ایک قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا: ''زیاد کے شایانِ شان نہیں کہ وہ حدیث میں جھوٹ بولے۔'' دیکھیے: (التاریخ الکبیر: 360/3)

رسول اللہ ﷺ کے مکمل حالات بیان کروں گا، البتہ ابن اسحاق کے بیان کردہ ان واقعات کا ذکر نہیں کروں گا جن کا رسول اللہ ﷺ سے کوئی تعلق نہیں اور قرآن مجید نے بھی اُن کا تذکرہ نہیں کیا۔ مزید برآں ان کا تفسیر سے بھی کوئی تعلق نہ ہو۔ میں وہ اشعار بھی حذف کر دوں گا جو اہلِ علم کے ہاں معروف نہیں۔ وہ واقعات بھی قلم بند نہیں کروں گا جن کا تذکرہ شایان شائستگی نہ ہو اور جن سے کچھ لوگوں کو اذیت پہنچنے کا خدشہ ہو۔ میں ایسی روایات بھی بیان نہیں کروں گا جن کی شیخ بکائی نے تائید نہیں کی۔ ان کے علاوہ ان شاء اللہ میں اپنی معلومات کی آخری رسائی تک ہر امر پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان کروں گا جو مروی ہے یا جس کا تعلق میری معلومات سے ہے۔" [1] اب اگر لوگ "سیرت ابن اسحاق" کو "سیرت ابن ہشام" کہنے لگے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

واقدی (متوفی 207ھ): ان کا نام و نسب محمد بن عمر بن واقد، کنیت ابوعبداللہ اور نسبت واقدی ہے۔ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، پھر بغداد چلے گئے۔ حضرت عبداللہ رحمہ اللہ (ابن بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ) کے مولیٰ یعنی آزاد کردہ غلام تھے۔ متقدمین ائمۂ حدیث میں سے اکثر حضرات نے انھیں علم حدیث میں ضعیف قرار دیا ہے۔ امام بخاری، رازی، نسائی اور دارقطنی نے فرمایا ہے: "ان کی حدیث متروک ہے۔" البتہ دراوردی، یزید بن ہارون، ابوعبید قاسم بن سلام، ابوبکر صنعانی، مصعب زبیری، مجاہد بن موسیٰ، مسیب اور ابراہیم حربی جیسے محدثین انھیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔ [2] لیکن ان کے بارے میں امام بخاری اور ان کے ساتھیوں ہی کی بات تسلیم کر لی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں: "وسعت علم کے باوجود واقدی متروک ہیں۔" اصحاب صحاحِ ستہ میں سے ابن ماجہ کے سوا کسی محدث نے ان کی کوئی حدیث نہیں لی۔ ابن سید الناس نے ان کے بارے میں موافق و مخالف تمام اقوال بیان کر کے ان کا دفاع کیا ہے اور انھیں قوی قرار

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 36/1. [2] تهذيب التهذيب: 365,364/9.

دینے کی کوشش کی ہے۔ [1] ہر چند اکثر اہل علم نے انھیں علم حدیث میں ضعیف قرار دیا ہے مگر سیرت و مغازی میں ان کی امامت و سیادت مُسلَّم ہے۔ [2]

وہ اہم خصوصیت، جو واقدی کو تمام مؤرخین اور سیرت نگاروں میں ممتاز کرتی ہے وہ ان کا علمی اور فنی اسلوب ہے۔ وہ واقعات کی تفصیلات کو منطقی انداز میں ترتیب دیتے ہیں، مثلاً: جب وہ مغازی کا ذکر کرتے ہیں تو پہلے ان تمام راویوں کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہیں جن سے واقعات منقول ہیں، پھر ایک ایک کر کے واقعاتی ترتیب کے ساتھ سن وار غزوات کا ذکر کرتے اور ہر غزوے کی باقاعدہ تاریخ درج کرتے ہیں اور متعلقہ مقامات کی جغرافیائی تفصیلات بھی بیان کرتے ہیں۔ ہر غزوے میں ان صحابہ کے نام بھی درج کرتے ہیں جنھیں نبی اکرم ﷺ نے اپنی عدم موجودگی میں اپنا نائب مقرر فرمایا۔ آخر میں ہر جنگ میں مسلمانوں کا شعار [4] (خفیہ لفظ جسے عرف عام میں کوڈ ورڈ کہتے ہیں) بھی بیان کرتے ہیں۔

اگر کسی غزوے کے بارے میں چند آیات نازل ہوئی ہیں تو آخر میں ان کا علیحدہ اندراج کرتے اور ان کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔

ابن سعد (متوفی 230ھ): ان کا نام ونسب محمد بن سعد بن مَنیع، کنیت ابوعبداللہ اور نسبت ہاشمی بصری ہے۔ انھیں ہاشمی اس لیے کہا گیا کہ وہ ہاشمیوں کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے۔ ابن سعد کے نام سے معروف ہیں۔ انھیں کاتبِ واقدی کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے کیونکہ یہ عرصۂ دراز تک اپنے استاد واقدی کے پاس رہے، ان سے فیض

[4] شعار: خفیہ لفظ کو کہتے ہیں، جیسے ایک غزوے میں نبی اکرم ﷺ کا شعار أَمِتْ (مار ڈالو) تھا، دیکھیے: (سنن أبي داود، الجهاد، باب في الرجل ينادي بالشعار، حديث: 2596)

[1] عيون الأثر في فنون المغازي والسير، ص: 17-21. [2] صحيح السيرة النبوية لابن طرهوني: 1/24-29.

حاصل کیا اور ان کی کتابیں نقل کرتے رہے۔

ابن سعد عموماً محدثین کی جرح سے محفوظ رہے ہیں، البتہ امام یحییٰ بن معین نے انھیں کذّاب کہا ہے۔[1] شیخ زیاد منصور نے ان کے بارے میں محدثین کے اقوال نقل کر کے یہ تبصرہ کیا ہے: ''یہ بات واضح ہے کہ امام یحییٰ بن معین ابنِ سعد کو کذّاب قرار دینے میں اکیلے ہیں جبکہ خطیب بغدادی، علامہ سمعانی اور ابنِ تَغرِی بُردی کا ابنِ سعد کی طرف سے دفاع کرنا انھیں اِس الزام سے بری کرتا ہے، نیز حفاظ محدثین نے امام یحییٰ بن معین کو متشدد ناقدین میں شمار کیا ہے، لہٰذا جب وہ جرح کرنے میں اکیلے ہوں اور باقی ناقدین ان کے خلاف ہوں تو ان کی جرح معتبر نہیں۔''

زیاد منصور نے مزید کہا: ''ناقدین کے اقوال سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے ابن سعد کی عدالت وثقاہت پر انگشت نمائی نہیں کی بلکہ اعتراض یہ کیا ہے کہ وہ ضعیف راویوں سے روایت کرتے ہیں۔ علامہ ابن صلاح (متوفی 213 ھ) کے الفاظ ہیں: ''ابن سعد ثقہ ہیں مگر وہ ضعیف راویوں سے بہت روایات لیتے ہیں، مثلاً: محمد بن عمر واقدی سے۔''[2] ابن سعد کو ثقہ کہنے والوں میں امام ابو حاتم رازی بھی شامل ہیں، حالانکہ وہ متشدد ہیں۔ حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے بھی انھیں ثقہ قرار دیا ہے اور یہ دونوں محدث متقدمین کے اقوال کی چھان بین اور صحیح و معتدل اقوال کو ترجیح دینے میں معتبر اور مُسَلَّم ہیں۔ ابن سعد کا واقدی اور دوسرے ضعیف راویوں سے روایت کرنا ان پر طعن کرنے کا سبب نہیں بن سکتا، اس لیے کہ بڑے بڑے حفاظ محدثین بھی اس ''عمل'' میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔ جب کوئی شخص سند بیان کر دیتا ہے تو وہ خود بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ ابن سعد ضعیف راویوں سے روایت کریں یا ثقہ راویوں سے وہ صاف صاف سند بیان کر دیتے ہیں۔ اب ان کی کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہتی۔ انھوں نے کب کہا ہے کہ میں

[1] تاريخ بغداد: 321/5. [2] مقدمة ابن الصّلاح، ص: 599.

صرف صحیح روایات ہی بیان کروں گا؟ ان پر اعتراض کا کوئی جواز نہیں۔"[1]

حرمین شریفین کے بارے میں تاریخی کتابیں

بعض مؤرخین نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی تاریخ کے سلسلے میں الگ کتابیں لکھی ہیں۔ اُن کتابوں میں اِن دونوں شہروں سے متعلقہ قبل از اسلام اور بعد از اسلام کے حالات و واقعات نقل کیے ہیں۔ اس بارے میں سب سے اہم کتاب ابو الولید محمد بن عبداللہ ازرقی رحمہ اللہ کی أخبار مکة ہے۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے اور شیخ رشدی صالح نے اس کتاب کی تحقیق کی ہے۔ غیر مطبوعہ کتب میں اہم کتاب ابن نجار ابو عبداللہ محمد بن حسن ہبة الله بغدادي کی تاریخ مکة وماجاء فیها من الآثار ہے۔ ان کی ایک دوسری کتاب الدرة الثمینة في أخبار المدینة صالح محمد جمال نے پوری تحقیق کے ساتھ 1966ء میں مکہ مکرمہ سے أخبار مدینة الرسول کے زیرِ عنوان شائع کر دی تھی۔ ایک غیر مطبوعہ کتاب فاکہی (وفات 280ھ) کی أخبار مکة ہے۔ فاکہی نے ازرقی کی تاریخ پر جو اضافے کیے وہ مستشرق ویسٹن فیلڈ نے شائع کیے ہیں۔ بعض لائبریریوں میں فاکہی کی کتاب کے کچھ مخطوطے ملے ہیں۔ 1964ء میں بیروت میں اس کے مخطوطے کا فوٹو چھپ چکا ہے۔ عبدالملک بن دُہیش نے 1407ھ/1986ء و 1987ء میں اس کتاب کی تحقیق کی تھی۔ اس کے علاوہ ابن زبالہ (متوفی قبل از 200ھ) کی تاریخ المدینة، ابن بکار (متوفی 256ھ) کی تاریخ المدینة اور عمر بن شبہ (متوفی 662ھ) کی تاریخ المدینة بھی اچھی کتابیں ہیں۔ آخر الذکر کتاب مدینہ منورہ کے ناظم اوقاف سید حبیب محمود احمد نے فہیم شلتوت کی تحقیق کے ساتھ 1399ھ/1979ء میں شائع کر دی تھی۔ اس کتاب میں سیرتِ نبوی کے حوالے سے وسیع معلومات ملتی ہیں۔ محمد بن احمد فاسی (متوفی

[1] طبقات ابن سعد کا مقدمہ تحقیق، ص: 45.

832ھ) کی کتاب شِفَاء الغَرام بأخبار بلد اللّٰه الحرام بھی اس سلسلے کی ایک اہم کتاب ہے۔ دکتور عمر عبدالسلام تدمُری نے 1405ھ/1985ء میں دو جلدوں میں اس کتاب کی تحقیق کردی تھی۔ فاسی کی ایک کتاب بنام العقد الثمین في تاریخ البلد الأمین بھی ہے۔[1] وفاء الوفا بأخبار دار المصطفٰی جو سمہودی (متوفی 922ھ) کی تالیف ہے یہ کتاب محمد محی الدین عبدالحمید کی تحقیق کے ساتھ تین جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

ان تالیفات سے استفادہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ان کی روایات کی تحقیق کر کے صحیح اور ضعیف کی پہچان کر لی جائے تاکہ عقائد واحکام کے بارے میں صرف صحیح روایات سے استدلال کیا جائے۔ اوصاف و آثار اور نقشوں کے لیے ضعیف روایات بھی قابلِ اعتماد ہیں، تاہم یہ صراحت کرنا ضروری ہے کہ روایت ضعیف ہے۔

عام تاریخی کتب

ان کتابوں میں ہر قسم کی تاریخ بیان ہوتی ہے، چاہے اس کا تعلق کسی قوم، حکومت یا کسی فرد سے ہو اور چاہے وہ قبل از اسلام کی ہو یا بعد کی۔ ان کتابوں کی ابتدا عموماً ''بدء الخلق'' (مخلوق کی ابتدا) سے ہوتی ہے۔ یہ تاریخی کتابیں بہت زیادہ ہیں۔ اہم کتابیں یہ ہیں:

تاریخ الامم والرسل والملوک: یہ کتاب ابن جریر طبری (متوفی 310ھ) کی لکھی ہوئی ہے۔ اور ''تاریخ طبری'' کے نام سے مشہور ہے۔ تاریخی روایات کے متعلق طبری کی معلومات نہایت وسیع تھیں۔ وہ محدّث بھی تھے۔ انھوں نے اپنی اس تاریخ میں سیرتِ طیبہ کا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، تاہم ان میں ایک خامی ہے کہ وہ صحیح، ضعیف اور غیر معتبر ہر قسم کی روایات بیان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب اسلام کا چہرہ بگاڑنے والے

[1] مصادر السیرة النبویة للدکتور فاروق حماده، ص:79,78.

گمراہ لوگوں کے لیے بڑی ''مرغوب دستاویز'' رہی ہے کیونکہ وہ اسی کتاب کی غیر معتبر روایات بطور حجت پیش کرتے اور طبری کو اپنا ہتھیار بنا لیتے ہیں، چنانچہ اس کتاب کی روایات کی چھان بین تنقید حدیث کے اصولوں کی روشنی میں ہونی چاہیے۔ دوسری کمزوری یہ ہے کہ وہ ضعیف و غیر معتبر روایات کی وضاحت بھی نہیں کرتے بلکہ بیان کر کے خاموشی سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس وصف میں اکثر مؤرخین ان کے ساتھ شریک ہیں کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ جب ہم نے سند بیان کر دی تو ہم پر کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہی اور سند پر غور کرنا قاری کا کام ہے۔ طبری اپنی تاریخ کے مقدمے میں خود لکھتے ہیں: ''اگر میری کتاب میں کوئی ایسی روایت نظر آئے جسے قاری قبیح یا نامناسب خیال کرتا ہو یا اسے درست نہ سمجھتا ہو تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں بلکہ کوتاہی ہوگی تو اس شخص کی جس نے وہ بات ہم تک پہنچائی۔ ہم نے تو صرف یہ کیا ہے کہ اس کی پہنچائی ہوئی بات من وعن نقل کر دی ہے۔''[1]

یہاں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ امام طبری بذاتِ خود ثقہ اور معتبر شخصیت ہیں۔

تاریخ خلیفہ بن خیاط: خلیفہ بن خیاط عصفری (متوفی 240ھ) نے اپنی کتاب کو سن وار مرتب کیا ہے۔ انھوں نے آغاز نگارش اس امر کی وضاحت سے کیا ہے کہ ہجری تاریخ کی ابتدا کیسے ہوئی؛ پھر انھوں نے تقریباً 50 صفحات میں اختصار کے ساتھ سیرت نبوی کے واقعات تحریر کیے ہیں۔ ان واقعات کے بارے میں انھوں نے دراصل امام محمد بن اسحاق پر اعتماد کیا ہے اور ان کے دو معتبر شاگردوں بکر بن سلیمان (5) اور وہب بن جریر بن

(5) بکر بن سلیمان: امام بخاری نے اس کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے۔ امام ابو حاتم کہتے ہیں: ''یہ مجہول ہے۔'' دیکھیے: (التاريخ الكبير للبخاري، م: 90/1/2، والجرح والتعديل لابن أبي حاتم: م387/1/1)

[1] تاريخ الطبري: 8/1.

حازم ⑥ کی روایت سے نقل و استفادہ کیا ہے۔ اس فصل میں سیرت طیبہ سے متعلقہ تمام اہم واقعات اختصار کے ساتھ آ گئے ہیں۔ انھوں نے ابن اسحاق کی روایات مختصراً بیان کی ہیں۔ اس طرح تفصیل و اطناب کے بغیر سیرت کا ایک مستحکم قالب پیش کر دیا ہے۔

چونکہ خلیفہ عصفری ثقہ اور معتبر محدث ہیں، امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اپنی صحیح بخاری اور دیگر تالیفات میں ان سے روایات نقل کی ہیں، اس لیے اس کے اثرات بھی ان کی تاریخ میں صاف جھلکتے نظر آتے ہیں۔ خصوصاً سیرت کے متعلقہ روایات انھوں نے مؤقر و معتبر محدث اساتذہ کے حوالے سے بیان کی ہیں، مثلاً: ابن عیینہ، یزید بن زریع، غندر اور اسماعیل بن علیہ۔ اور یہ بہت اعلیٰ درجے کی صحیح اور ثقہ روایات ہیں۔ [1] حافظ ابن حجر نے ان کے بارے میں لکھا ہے: ''بہت سچے (صدوق) اور کھرے انسان تھے، گاہے گاہے بھول چوک ہو جاتی تھی، مؤرخ تھے۔'' [2]

دیگر تاریخی کتابیں

عمومی تاریخ کی دیگر اہم کتابیں یہ ہیں:

* ابن طاہر مقدسی (متوفی 355ھ) کی کتاب ''البدء والتاریخ''
* احمد بن یحییٰ بلاذری (متوفی 279ھ) کی ''فتوح البلدان''۔ اس کتاب میں صحیح اسناد بکثرت موجود ہیں۔ اس کا خصوصی امتیاز معاہدے اور عہد نامے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے

⑥ وہب بن جریر بن حازم: وہب ثقہ محدّث ہیں۔ 206ھ میں فوت ہوئے، دیکھیے: (تقریب التہذیب، ص: 585) جریر بن حازم بھی ثقہ ہیں، تاہم انھوں نے جو احادیث قتادہ سے روایت کیں ان میں قدرے ضعف ہے اور جب وہ اپنے حافظے سے حدیث بیان کریں تو بھول چوک کا شکار ہو جاتے ہیں، دیکھیے: (تقریب التہذیب، ص: 138)

[1] مصادر السيرة النبوية وتقويمها للدكتور فاروق حماده، ص: 81، ومقدمة التحقيق لتاريخ خليفة بن خياط للدكتور العمري، ص: 5-18. [2] تقريب التهذيب: 273/1.

اپنے عہد مبارک میں تحریر کرائے اور وہ اس کتاب میں حرف بحرف نقل کر دیے گئے ہیں۔

* احمد بن جعفر بن وہب (متوفی 292ھ) کی "تاریخ الیعقوبي" ہر چند انھوں نے اسناد بیان نہیں کیں لیکن رسول اللہ ﷺ کے خطبات کے نمونے بڑے اہتمام سے نقل کیے ہیں۔

* ابو الحسن علی بن حسین مسعودی (متوفی 364ھ) کی کتابیں، مثلاً: "مروج الذهب" اور "التنبیه والإشراف"۔ موصوف نے ان کتابوں میں واقعات اجمالاً نقل کیے ہیں اور اسناد بیان نہیں کیں، تاہم کہیں کہیں مؤرخین واقدی، ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ اور ابو عبید قاسم بن سلام کے حوالے دیے ہیں۔

* ابو القاسم علی بن حسن بن عساکر (متوفی 571ھ) کی "تاریخ دمشق الکبیر"۔ یہ اپنے دور کے بہت بڑے حافظ تھے۔ انھوں نے سیرت طیبہ سے متعلقہ بکثرت معتبر اور مستند روایات بیان کی ہیں۔

* ابن حبیب بغدادی (متوفی 245ھ) کی "المحبَّر"۔ انھوں نے اسناد بیان کرنے کا اہتمام نہیں کیا۔

* ابو یوسف یعقوب بن سفیان فسوی (متوفی 227ھ) کی "المعرفة والتاریخ"۔

* ابن ابی خیثمہ ابو بکر احمد بن زہیر بن حرب (متوفی 279ھ) کی "التاریخ الکبیر"۔

* ابن قتیبہ دینوری (متوفی 270ھ) کی "عیون الأخبار" اور "المعارف"۔

* احمد بن داود دینوری (متوفی 282ھ) کی "الأخبار الطوال"۔

* حافظ ذہبی (متوفی 748ھ) کی "تاریخ الإسلام"۔

* حافظ ابن کثیر (متوفی 774ھ) کی "البدایة والنهایة"۔

یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ ان کتابوں میں صحیح، حسن اور دیگر ہر قسم کی ضعیف روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ پس ضروری ہے کہ اسناد کی تحقیق کے بعد ہی ان پر اعتماد کیا جائے۔[1]

[1] مصادر السیرة النبویة وتقویمها للدکتور فاروق حماده، ص: 82-88.

ادبی کتابیں

متقدمین نے وہ اشعار بڑے ذوق وشوق سے نقل کیے ہیں جن میں تاریخی واقعات کی ترجمانی وتفسیر پائی جاتی ہے۔ ان میں ابن اسحاق اور ابن ہشام سرفہرست ہیں، یہاں تک کہ امام بخاری اور امام مسلم جیسے جلیل القدر ائمہ حدیث نے بھی ایسے اشعار سے بے اعتنائی نہیں برتی، ہر چند ان کا مقصد صرف استشہاد کرنا ہے۔ ان اشعار کے کہنے والوں کا صحیح صحیح تعین بھی ایک قابلِ لحاظ امر ہے۔ ادب کی وہ نثری کتابیں جن میں رسول اللہ ﷺ کے اقوال وآثار حرف بحرف نقل کیے گئے ہیں اِن میں سے چند اہم کتابیں حسبِ ذیل ہیں:

* جاحظ (متوفی 255ھ) کی کتابیں "البیان والتبیین" اور "الحیوان" اِن کتابوں کی کچھ نصوص صحیح ہیں اور کچھ وضعی۔
* عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ (متوفی 276ھ) کی کتابیں "المعارف" اور "الشعر والشعراء" امام ابنِ قتیبہ عظیم محدث تھے۔ قرآن کے بہت بڑے عالم تھے۔ بلند پایہ ادیب تھے۔ اصحابِ صحاح ستہ کے ہم عصر تھے اور انھی کے اساتذۂ کرام سے فیض یافتہ تھے۔
* محمد بن یزید کی کتاب "الكامل في اللغة والأدب"۔
* ابوبکر محمد بن قاسم بن انباری (متوفی 317ھ) کی کتابیں "الوقف والابتداء" اور "الأضداد"۔
* ادب کی نہایت اہم کتابوں میں ابوالفرج علی بن حسین بن محمد قرشی اصفہانی (متوفی 356ھ) کی "الأغاني" اور ابوعمر شہاب الدین احمد بن محمد بن عبدربہ بن حبیب قرطبی (متوفی 327ھ) کی "العقد الفريد" شامل ہیں۔

"الاغانی" میں ابوالفرج نے عام روایات اسناد کے ساتھ بیان کی ہیں، اس لیے بہت سے شائقین علم صحت سند کی تحقیق کیے بغیر اس کی روایات سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً

یہ کتاب بدنیت مستشرقین اور ان سے متاثرہ مسلمان نوجوانوں کے لیے جو علمی تحقیق سے نابلد ہیں، حوالے کی من پسند کتاب بن چکی ہے۔

''الاغانی'' اور اس کے مؤلف کے متعلق حقائق کے بارے میں متعدد تحقیقی مقالے چھپ چکے ہیں جن میں اس خطرے کی نشاندہی کی گئی ہے کہ مبادا کوئی شخص اس کتاب یا اس کے مؤلف کو معتبر سمجھ لے، ان میں سے چند اہم مقالے یہ ہیں جو عربی زبان میں لکھے گئے ہیں:

* پروفیسر نذیر محمد مکتبی کا مقالہ ''جولة في آفاق الأغاني'' (البصائر: 10/ 7- 109)

* دکتور داود سلوم کا مقالہ بعنوان ''شخصيّة أبي الفرج الأدبيّة والفكريّة من خلال كتابه'' میں الاغانی کے ماخذوں، اسانید اور روایات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

* شوقی ابو خلیل کا مقالہ جو انھوں نے اپنی کتاب ''هارون الرشيد...... '' میں من شوّه سيرة الرّشيد؟ کے عنوان سے صفحہ 123 سے 133 تک تحریر کیا ہے۔

* دکتور زکی مبارک کی کتاب ''النثر الفني في القرن الرابع الهجري'' (ص:288-290) انھوں نے ابوالفرج کی شخصیت پر کچھ بحث کی اور اس کے اخلاق وعادات بھی بتائے ہیں اور اس کی کتاب کے اغراض ومقاصد کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے اس کی فکری گمراہیوں کی نشاندہی کی ہے کہ اگرچہ وہ عبقری شخص تھا مگر وہ عشق ومستی میں ایسا ڈوبا کہ اخلاق اور دین کی حدود سے باہر نکل گیا۔ پس یہ بہت خطرناک بات ہوگی کہ کوئی شائق علم یہ سمجھ بیٹھے کہ ''الأغاني'' کی روایات کسی تاریخی قدر وقیمت کی حامل ہیں یا کوئی شخص ان روایات پر تاریخی حقائق کی بنیاد رکھ لے۔ ابن کثیر نے ابوالفرج کے متعلق ابن جوزی کی یہ رائے نقل کی ہے: ''ایسے شخص پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ وہ اپنی کتابوں میں عشق ومستی کی دعوت دیتا، شراب نوشی کو معمولی غلطی سمجھتا اور وہ خود اپنے عشق کی داستانیں بھی بیان کرتا ہے۔ جو بھی شخص اس کی کتاب کا بغور مطالعہ کرے گا وہ اس میں ہر قباحت اور مضرت پائے گا۔ اس نے محمد بن عبداللہ بن بطیت اور بعض دوسرے لوگوں سے

احادیث روایت کی ہیں۔ امام دارقطنی وغیرہ نے اس سے بھی روایات لی ہیں۔‘‘[1]

’’العقد الفرید‘‘ میں سیرت طیبہ سے متعلقہ بہت مفید باتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ دوسری ادبی کتابوں کی طرح اس کی بھی چھان بین کی جانی چاہیے۔ یاد رہے کہ میں نے اپنی کتاب میں ان ادیبوں کی کسی روایت کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ ثقہ اور معتبر اہل علم سے سنت سے متعلقہ روایات کا ذخیرہ اس قدر کثرت سے منقول ہے کہ ان جیسے لوگوں کی روایات کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

سیرت کے مصادر و مآخذ کے بارے میں آخری بات

ان مؤلفین کے بعد جس نے بھی سیرت طیبہ کے بارے میں کوئی کتاب لکھی اس نے انھی کو بنیاد بنایا ہے، لہٰذا ہر محقق اور مؤلف کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کی روایات اور اسانید کی خوب چھان بین کر لے، پھر صحیح روایات سے استدلال کرے اور عقیدہ و احکام شرعیہ کے علاوہ دیگر موضوعات میں قدرے کمزور روایات پر بھی اعتماد کرے، البتہ نہایت کمزور روایات نظر انداز کر دے۔ مزید برآں وہ ان مراتب کی صراحت بھی کرے کہ کون سی روایت صحیح ہے، کون سی ضعیف اور کون سی غیر معتبر ہے تاکہ قاری کی نظر سے کوئی چیز اوجھل نہ رہے اور ہر چیز اس پر پوری طرح روشن ہو جائے، پھر اس کی مرضی ہے کہ وہ ہدایت پر رہے یا گمراہ ہو جائے۔

قدرے ضعیف روایت کرنا یا (عقیدہ اور احکام کے علاوہ) دیگر امور کے سلسلے میں ان پر اعتماد کرنا خود ائمۂ حدیث سے صراحتاً ثابت ہے۔ ان محدثین کے سرخیل امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہیں، وہ فرماتے ہیں: ’’جب ہم نبیٔ کریم ﷺ سے فضائل اعمال یا کسی ایسے معاملے میں، جس کی بدولت کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا یا منسوخ قرار نہیں پاتا روایت

[1] البداية والنهاية: 11/294.

کرتے ہیں تو ہم اسانید کے معاملے میں نرمی برتتے ہیں۔"[1]

امام ذہبی لکھتے ہیں: "اکثر ائمۂ محدثین احکام کی احادیث میں سختی برتتے ہیں مگر فضائل اور رقاق (ترغیب و ترہیب اور زہد) کی احادیث میں مکمل طور پر تو نہیں لیکن قدرے نرمی برتتے ہیں اور اس بارے میں ضعیف سند والی روایات بھی قبول کر لیتے ہیں بشرطیکہ ان کے راویوں پر تہمتِ دروغ نہ ہو کیونکہ سراسر موضوع اور بہت کمزور روایات ناقابلِ التفات ہیں۔"[2] ابن رجب حنبلی رقم طراز ہیں: "بہت سے ائمۂ محدثین نے رقاق وغیرہ کی احادیث ضعیف راوی سے روایت کرنے کی اجازت دی ہے۔ ان میں امام عبدالرحمٰن بن مہدی اور امام احمد بن حنبل جیسے عظیم محدّث بھی شامل ہیں۔"[3]

مندرجہ بالا کتابوں اور اس موضوع پر لکھی جانے والی دوسری کتابوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ان کی اسانید کی جانچ پرکھ ہی سے لگایا جا سکتا ہے، لہٰذا وہ کتابیں جن میں روایات کا درجہ بیان کر دیا گیا ہے یا جن کتابوں میں صحیح روایات پر اعتماد کیا گیا ہے وہی ہمارے نزدیک اہم اور ثقہ ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جب سیرت طیبہ کی وسیع معلومات صحیح اور معتبر کتابوں میں موجود ہیں تو یہی کتابیں قابل اعتماد ہیں۔ صحیح اور مستند روایات کی موجودگی میں ضعیف روایات پر اعتماد کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

مشہور مقولہ ہے: "کسی چیز کی اصل حقیقت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس کے مدِمقابل سے آگہی کے بعد ہی ہوتا ہے۔" اس لیے اگر ہم انسانی تہذیب و تمدن پر رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے نقوش جاننا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم اس ماحول کا جائزہ لیں جو آپ کی تشریف آوری کے وقت موجود تھا۔

---

[1] الكفاية في علم الرواية: 163، والمقصد الأرشد في ذكر أصحاب الإمام أحمد: 161/3.
[2] سير أعلام النبلاء: 520/8. [3] شرح العلل للترمذي: 73/1.

باب

1

اسلام سے پہلے جزیرہ نمائے عرب

- وادیِ ام القریٰ
- بعثت نبوی کے وقت عرب کے عام حالات
- جزیرہ نمائے عرب کے بیرونی حالات

***

﴿ رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ وَارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ ○﴾

”اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ نسل ایک بے زراعت وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسائی ہے۔ اے ہمارے رب! اس لیے کہ وہ نماز قائم کریں، چنانچہ تو بعض لوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ ان کی طرف مائل رہیں اور انھیں ہر قسم کے پھلوں سے رزق دے تاکہ وہ (تیرا) شکر کریں۔“

[إبراهيم 14:37]

«إِنَّ اللّٰهَ نَظَرَ إِلٰى أَهْلِ الْأَرْضِ فَمَقَتَهُمْ، عَرَبَهُمْ وَ عَجَمَهُمْ جَمِيعًا إِلَّا بَقَايَا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ».

”اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر بسنے والے لوگوں کو دیکھا تو کیا عرب کیا عجم، اللہ تعالیٰ کو کوئی فرد پسند نہیں آیا، سوائے اہل کتاب میں سے گنتی کے چند افراد کے (جو تحریف سے پاک اپنے دین حق پر قائم تھے۔)“

[صحيح مسلم، حديث: 2865]

وادیِ ام القریٰ

مکہ مکرمہ کی بستی کا آغاز

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے شام اور شام سے مصر کی طرف ہجرت کی۔ وہ سفر وحضر میں توحید کا پرچم بلند کیے رکھتے تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ وہ اپنے دور کی حسین ترین عورت تھیں۔ اس دور کے شاہ مصر کی عادت بد تھی کہ وہ ہر خوبصورت عورت کو حاصل کرنا اپنا حق سمجھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا کہ وہ حضرت سارہ کو اس کے ناپاک ارادوں سے محفوظ رکھے گا۔ اللہ کا امر پورا ہوا۔ حضرت سارہ نہ صرف اللہ کی حفاظت میں محفوظ و مامون رہیں بلکہ وہ اس بدبخت کے ہاں سے ایک خادمہ بھی لے آئیں۔ اس خادمہ کا نام ہاجرہ تھا۔ یہ نہایت نیک اور عالی ہمت خاتون تھیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام انھی کے فرزند تھے۔ [1]

سارہ بانجھ تھیں اور ابراہیم پر تیزی سے بڑھاپا چھا رہا تھا۔ ان کے بال سفید ہو گئے تھے، اس لیے حضرت سارہ نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ خادمہ ابراہیم علیہ السلام کو دے دیں تا کہ وہ اس سے شادی کر لیں۔ ان کا خیال تھا کہ شاید ہاجرہ سے انھیں نیک اولاد نصیب ہو جائے۔

[1] صحیح البخاري، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللّٰه تعالٰی: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾، حدیث: 3358.

ادھر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا کہ ہاجرہ ان کے پہلے بیٹے کی ماں بنیں گی۔ اللہ نے انھیں بیٹا دیا جس کا نام اسماعیل رکھا گیا۔ [1]

لیکن جب اسماعیل پیدا ہوئے تو حضرت سارہ کو فطری رشک و غیرت نے آ لیا۔ وہ قسم کھا بیٹھیں کہ میں اس کے تین اعضاء کاٹ کر ہی دم لوں گی۔ [2] حضرت ہاجرہ کو ان کے ارادے کا علم ہو گیا، چنانچہ انھوں نے کمر پر لمبے دامن والا پٹکا باندھنا شروع کر دیا تاکہ حضرت سارہ ان کے قدموں کے نشان نہ دیکھ پائیں۔ آخر کار انھیں اپنے شوہر کے ساتھ بھاگنا پڑا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام انھیں ان کے شیر خوار بیٹے سمیت بیت اللہ والی جگہ پر لے آئے۔ وہ دونوں ایک بڑے درخت کے نیچے ٹھہرے جہاں بعد میں زمزم جاری ہوا۔ ان دنوں مکہ سنسان تھا۔ کوئی رہائش پذیر نہ تھا، نہ وہاں پانی تھا۔ [3] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھیں کھجوروں کی ایک تھیلی اور پانی کا ایک مشکیزہ تھمایا اور واپس چل پڑے۔ حضرت ہاجرہ ان کے پیچھے بھاگیں اور عرض کرنے لگیں: ''ابراہیم! آپ ہمیں اس ویران وادی میں جہاں کوئی غم خوار نہیں، چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟'' مگر ان کے بار بار پکارنے پر جواب تو کجا حضرت ابراہیم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ آخر کار وہ کہنے لگیں: ''کیا آپ کو ہمیں یہاں چھوڑنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے؟'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا: ''ہاں'' حضرت ہاجرہ یہ سن کر لوٹ آئیں اور کہنے لگیں: ''تب اللہ تعالیٰ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام چلتے گئے حتی کہ جب ایک گھاٹی کے پاس پہنچ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو بیت اللہ کی طرف منہ کیا اور یہ دعا کی:

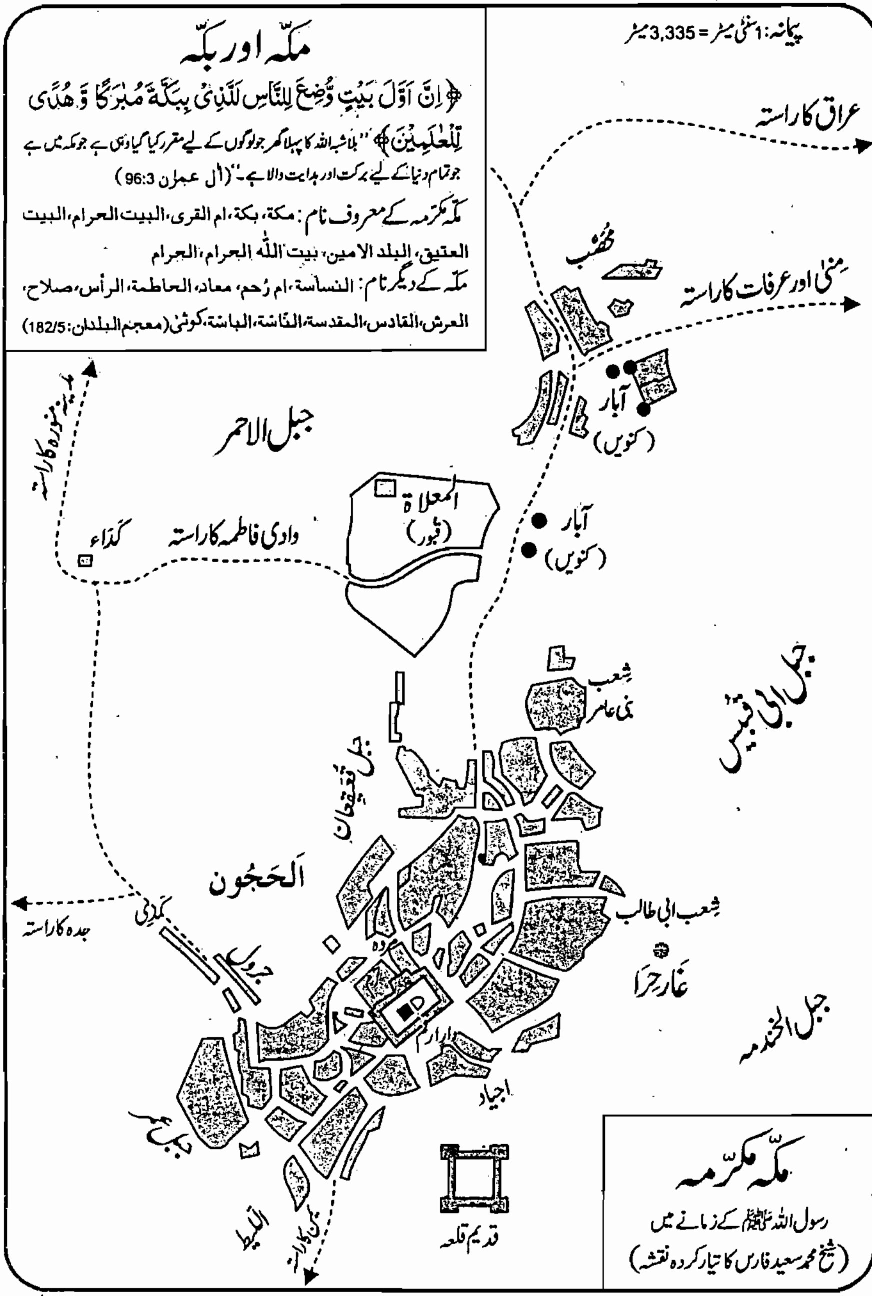
[1] یہ ابن عبدالحکم کی روایت ہے جس کی سند ضعیف ہے، دیکھیے: (فتوح مصر، ص: 12، وأخبار مكة للأزرقي: 54/1) ازرقی کی سند بھی ضعیف ہے۔ [2] فتح الباري: 141/13، شرح الحديث: 3364.
[3] ازرقی نے ایک روایت نقل کی جس کی سند ضعیف ہے کہ ان دنوں مکہ کے بیرونی حصے میں عمالقہ آباد تھے، دیکھیے: (أخبار مكة: 54/1)

مکّہ اور بکّہ

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىۡ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلۡعٰلَمِيۡنَ﴾ ”بلاشبہ اللہ کا پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے جو تمام دنیا کے لیے برکت اور ہدایت والا ہے۔“ (آل عمران 96:3)

مکہ مکرمہ کے معروف نام: مكة، بكة، ام القرى، البيت الحرام، البيت العتيق، البلد الامين، بيت الله الحرام، الحرام

مکہ کے دیگر نام: النساسة، ام رُحم، معاد، الحاطمة، الرأس، صلاح، العرش، القادس، المقدسة، الناشة، الباسة، كوثى (معجم البلدان: 182/5)



﴿ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾

''اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ نسل ایک بے زراعت وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسائی ہے۔ اے ہمارے رب! اس لیے کہ وہ نماز قائم کریں، چنانچہ تو بعض لوگوں کے دلوں کو ایسا کردے کہ ان کی طرف مائل رہیں اورانھیں ہر قسم کے پھلوں سے رزق دے تاکہ وہ (تیرا) شکر کریں۔''[1]

چند دنوں میں پانی ختم ہوگیا۔ حضرت ہاجرہ اور ان کا بیٹا پیاس کے مارے بے چین ہو گئے۔ پیاس سے بلکتا بچہ ماں سے دیکھا نہ گیا۔ وہ بھاگیں، قریبی پہاڑ صفا پر چڑھیں اور وادی میں ادھر ادھر دیکھنے لگیں، شاید کوئی نظر آ جائے۔ لیکن اس سنسان فضا میں کون نظر آتا! صفا سے اتریں، ہموار زمین پر آئیں اور دامن اٹھا کر تیزی سے بھاگیں اور مروہ پر جا کھڑی ہوئیں۔ وہاں بھی کوئی نظر نہ آیا تو نیچے اتر آئیں۔ وہ بے قراری کے عالم میں اسی طرح بھاگتی دوڑتی رہیں۔ اس بھاگ دوڑ میں انھوں نے سات چکر لگائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ حج و عمرہ میں سعی کرنے کی بنیاد یہی ہے۔ ساتویں چکر میں جب وہ مروہ پر تھیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور زمزم کی جگہ پر اپنی ایڑی یا پر رگڑنے لگے حتی کہ وہاں سے پانی نکل آیا۔ وہ یہ دیکھ کر بھاگیں اور آ کر حوض سا بنانے لگیں تاکہ پانی محفوظ ہو جائے۔ انھوں نے یہ پانی جلدی جلدی اپنے مشکیزے میں بھرا۔ پانی فوارے کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

«يَرْحَمُ اللّٰهُ أُمَّ إِسْمَاعِيلَ، لَوْ تَرَكَتْ زَمْزَمَ۔ أَوْ قَالَ: لَوْ لَمْ تَغْرِفْ مِنْ زَمْزَمَ۔ لَكَانَتْ زَمْزَمُ الْيَوْمَ عَيْنًا مَّعِينًا»

[1] إبرٰهيم 14:37.

"اللہ تعالیٰ ام اسماعیل پر رحمتیں نازل فرمائے! اگر وہ زمزم کو بہنے دیتیں، یا فرمایا: اگر وہ لپیں نہ بھرنے لگتیں تو آج زمزم ایک جاری چشمہ ہوتا۔"[1]

بہرحال انھوں نے پانی پیا اور بچے کو دودھ پلایا۔ فرشتے نے ان سے کہا: "آپ یہ خیال بھی دل میں نہ لائیں کہ ہم یونہی مرکھپ جائیں گے۔ یہاں بیت اللہ ہے جسے یہ بچہ اور اس کا والد مل کر تعمیر کریں گے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ اپنے سچے بندوں کو ضائع نہیں فرماتا۔"

وہ انھی حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ ان کے قریب سے قبیلۂ جرہم کا ایک خاندان گزرا۔ یہ لوگ قحطانی تھے اور یمن سے تعلق رکھتے تھے۔ جب انھوں نے پانی دیکھا تو حضرت ہاجرہ سے وہاں رہائش کی اجازت مانگی۔ انھوں نے بخوشی اجازت دے دی، تاہم یہ شرط رکھی کہ ان کا پانی پر کوئی حق نہیں ہوگا۔ انھوں نے یہ شرط تسلیم کر لی اور اپنے باقی اہل خانہ کو بھی وہیں بلا لیا اور سب مل کر رہنے لگے۔ ادھر بچہ جوان ہوگیا۔ اس نے ان سے عربی بھی سیکھ لی تھی یہ جوان انھیں بہت پسند آیا۔ وہ شادی کی عمر کو پہنچا تو انھوں نے اپنی ایک لڑکی سے اس کی شادی کر دی۔[2]

حضرت ہاجرہ کی وفات پر حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے۔ حضرت اسماعیل گھر پر نہیں تھے۔ انھوں نے دریافت فرمایا: "اسماعیل کہاں ہے؟" بیوی بولی: وہ کسی کام سے باہر گئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بہو کی خیر خیریت دریافت کی تو وہ پھٹ پڑی۔ طرح طرح کے شکوے کرنے کے بعد بولی: "ہم بڑی مصیبت سے زندگی گزار رہے ہیں۔" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: "انھیں میرا سلام پہنچانا اور کہنا کہ وہ گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔"

---

[1] بخاری کی ایک دوسری روایت میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ ام اسماعیل پر رحم فرمائے! اگر وہ جلد بازی سے کام نہ لیتیں تو زم زم ایک جاری چشمہ ہوتا۔" دیکھیے: (صحیح البخاري، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللّٰہ عزوجل: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾، حدیث: 3362) [2] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کی پہلی بیوی کا تعلق عمالقہ سے تھا، دیکھیے: (البدایة والنهایة: 209/1)

حضرت اسماعیل علیہ السلام واپس آئے تو ان کی بیوی نے سارا واقعہ سنایا۔ وہ جان گئے کہ وہ میرے ابا جان تھے۔ وہ اپنے والد گرامی کے پیغام کا مطلب سمجھ گئے کہ چوکھٹ سے مراد بیوی ہے، چنانچہ انھوں نے اسے طلاق دے دی اور ایک دوسری عورت سے شادی کر لی۔

کچھ عرصے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام دوبارہ تشریف لائے۔ اس دفعہ بھی اسماعیل گھر میں نہ ملے۔ آپ نے ان کی بیوی سے حال احوال پوچھا تو اس اللہ کی بندی نے اللہ تعالیٰ کا خوب شکر ادا کیا اور کہا کہ ہم ہنسی خوشی رہ رہے ہیں اور خوب کھا پی رہے ہیں۔ حضرت نے اسی بیوی کو آخری دم تک اپنے عقد میں رکھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ''انھیں میرا اسلام پہنچانا اور کہنا کہ گھر کی چوکھٹ قائم رکھیں۔'' حضرت اسماعیل علیہ السلام واپس آئے تو بیوی نے یہ ماجرا سنایا۔ وہ سمجھ گئے کہ وہ میرے والد محترم ہی تھے۔ وہ اپنے والد کے پیغام کا مطلب یہ سمجھے کہ موجودہ بیوی سے عقد قائم رکھا جائے، چنانچہ انھوں پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام مدت تک نہیں آئے۔ ایک دن تشریف لائے تو بیٹے کو زمزم کے پاس پایا، وہ اپنے تیروں کی مرمت کر رہے تھے۔ اسماعیل کی نظر ان پر پڑی تو اٹھے اور آگے بڑھ کر والد ماجد کے سینے سے لپٹ گئے۔ خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک کام کرنے کا حکم دیا ہے، تم مجھ سے تعاون کرو۔ زمزم کے قریب ایک ٹیلہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرف اشارہ کیا اور فرمایا: ''یہاں اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کرنا ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ تعمیر کرنے لگے، حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر لاتے، والد گرامی کو تھماتے اور وہ دیواریں چنتے جاتے۔ جب عمارت اونچی ہوگئی اور زمین پر کھڑے ہو کر تعمیراتی کام کرنا ممکن نہ رہا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام وہ پتھر لائے جسے آج دنیا ''مقام ابراہیم'' کے نام سے جانتی ہے۔ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پتھر پر کھڑے ہوئے اور عمارت بنانے لگے۔ یوں یہ دونوں عظیم باپ بیٹا عمارت بھی بناتے جاتے تھے اور از راہ تشکر یہ دعا

بھی کرتے جاتے تھے:

﴿ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ ﴾

"اے ہمارے رب! ہماری طرف سے (یہ خدمت) قبول کر بلاشبہ تو ہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔" [1]

راہ حق میں اطاعت شعاری کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام میں آداب فرزندی کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے جن کا پورا پورا مظاہرہ انھوں نے عنفوان شباب ہی میں اس وقت کر دکھایا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں اشارہ ہوا کہ اپنے بیٹے کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں قربان کر دیں۔ آپ نے بیٹے سے فرمایا:

﴿ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ ﴾

"اے میرے پیارے بیٹے! بے شک میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اب تو دیکھ! تیری کیا رائے ہے؟" [2]

سعادت مند بیٹے کو عرفانِ حقیقت نصیب ہو گیا۔ فوراً سر جھکا کر عرض کی:

﴿ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ○ ﴾

"ابا جان! جو آپ کو حکم دیا گیا ہے کر گزریں۔ ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔" [3]

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل درآمد کے لیے اسماعیل کو منیٰ لے گئے اور انھوں نے جونہی صاحبزادے کو کروٹ کے بل زمین پر لٹایا اور چھری ان کے ہاتھ میں تھی تو اچانک صدائے ربانی گونج اٹھی:

﴿ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ○ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ ﴾

---

[1] البقرة 2 : 127. صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب: ﴿ يَزِفُّوْنَ ○ ﴾ ......، حديث: 3365,3364. [2] الصّٰفّٰت 37:102. [3] اس واقعے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الصّٰفّٰت 37:102.

”اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا ہے۔“[1]

اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں ایک عظیم ذبیحہ عطا کیا۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾

”اور ہم نے اس (اسماعیل) کے بدلے میں ایک عظیم القدر ذبیحہ (جانور ذبح کرنے کو) دیا۔“[2]

یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک بڑا چتکبرا مینڈھا بھیجا۔ انھوں نے بیٹے کو چھوڑا اور مینڈھا ذبح کر دیا۔ یوں باپ اور بیٹا دونوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر لی۔

جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کریں:

﴿ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ ﴾

”اور لوگوں میں حج کا اعلان کرو، وہ تیرے پاس ہر دور دراز کے راستے سے پیدل چل کر اور دبلے پتلے اونٹوں پر سوار ہو کر آئیں گے۔“[3]

کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ابوقبیس پہاڑ یا صفا پہاڑ یا مقام ابراہیم پر اللہ کا نام لے کر اعلان فرمایا:

«أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ رَبَّكُم بَنٰى لَكُمْ بَيْتًا فَحُجُّوهُ»

”اے لوگو! تمھارے رب نے تمھارے لیے ایک گھر تعمیر کرایا ہے، لہٰذا اس کا حج کرنے آؤ۔“

اللہ تعالیٰ نے ان کی آواز تمام مخلوقات کو اور قیامت تک آنے والے ان لوگوں کو بھی جن کی قسمت میں حج کرنا لکھا گیا ہے، سنادی، چنانچہ لوگوں نے ان الفاظ سے جواب دیا:

[1] الصّٰفّٰت 37:104،105. [2] الصّٰفّٰت 37:107. [3] الحج 22:27.

«لَبَّيْكَ، اللّٰهُمَّ! لَبَّيْكَ» ”میں حاضر ہوں، اے اللہ! میں حاضر ہوں“[1]

قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اللہ رب العزت کے حضور دعا کی:

﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾

”اے ہمارے رب! اوران میں انھی میں سے ایک رسول بھیج، وہ ان کے سامنے تیری آیات تلاوت کرے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک صاف کردے۔ بلاشبہ تو ہی غالب، خوب حکمت والا ہے۔“[2]

امام ابو جعفر طبری لکھتے ہیں: ”ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی یہ دعا خاص طور پر ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کے حق میں تھی۔ اسی دعا کی نسبت رسول اللہ ﷺ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے:

«أَنَا دَعْوَةُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ وَبُشْرٰى عِيسٰى»

”میں اپنے والد ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا نتیجہ اور عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری کا مصداق ہوں۔“[3]

حضرت اسماعیل علیہ السلام بیت اللہ کے قریب اپنے سسرالی رشتے داروں کے ساتھ رہنے لگے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حجاز میں رہنے والے عمالیق (ایک قدیم قوم) اور یمن والوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔[4] اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ﴾

”اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کرو۔ بلاشبہ وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول نبی تھا۔“[5]

[1] تفسیر ابن کثیر: 410/5. [2] البقرة 129:2. [3] تفسیر الطبري (تحقیق أحمد شاکر): 82/3، ومسند أحمد: 262/5. اس روایت کی سند حسن ہے۔ [4] البدایة والنهایة: 209/1. یہ روایت بلاسند ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ [5] مریم 54:19.

اللہ تعالیٰ نے انھیں بارہ عظیم بیٹے عطا فرمائے۔ امام ابن اسحاق نے ان کے نام بھی درج کیے ہیں جو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان کے حوالے سے نقل کیے ہیں۔[1] دو بڑے بیٹے نابت اور قیدار کے نام سے موسوم تھے۔ حضرت نابت ہی وہ شخصیت ہیں جنھیں ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی دعوت کے کام کے لیے منتخب کیا گیا۔ بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر نابت اور عدنان کے درمیان اس زریں سلسلے کی کڑیاں گمنام ہیں۔ نابت اور عدنان کے درمیان چھ پشتیں بتائی جاتی ہیں۔ یہ سب حرم مکی ہی میں رہتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے نام محفوظ نہیں ہو سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدنان تک اپنے نسب کی تصدیق فرمائی ہے، البتہ عدنان سے اسماعیل علیہ السلام تک کے سلسلے کے بارے میں اختلاف ہے۔[2] جب حضرت اسماعیل علیہ السلام فوت ہو گئے تو انھیں ان کی والدہ کے پہلو میں حجر (حطیم والی جگہ) میں دفن کر دیا گیا۔ ان کی عمر 137 سال تھی۔ حجاز کے تمام عرب ان کے دونوں بیٹوں نابت اور قیدار ہی کی طرف منسوب ہیں۔[3]

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور حضرت مسیح علیہ السلام سے انیس صدیاں قبل تھا۔[4]

تعمیر کعبہ

* کعبہ گیارہ مرتبہ تعمیر ہوا۔
* ازرقی کی روایت کے مطابق کعبہ پہلی دفعہ فرشتوں نے تعمیر کیا تھا۔[5]

[1] البداية والنهاية: 208/1. [2] یہ روایت بھی بلاسند ہے، چنانچہ ضعیف ہے۔ اس سلسلے میں مختلف اقوال کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (تاريخ دمشق الكبير، قسم السيرة، ص: 36-53)
[3] البداية والنهاية: 210/1. [4] العرب واليهود في التاريخ لأحمد سوسة، ص: 232.
[5] أخبار مكة: 2/1.

* امام بیہقی وغیرہ کی روایت کے مطابق دوسری دفعہ آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ [1]

* تیسری مرتبہ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں نے تعمیر کیا جیسا کہ ازرقی وغیرہ نے حضرت وہب بن منبہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ سہیلی نے بتایا ہے: ''کعبہ شیث بن آدم نے تعمیر کیا تھا۔'' [2]

* چوتھی بار کعبے کی تعمیر کا اعزاز حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے حصے میں آیا جس کا تذکرہ ہم گزشتہ صفحات میں کر آئے ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ دراصل کعبہ کی باقاعدہ پہلی تعمیر یہی تھی۔ وہ لکھتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی صحیح روایت منقول نہیں جس سے یہ بات ثابت ہو کہ کبھی حضرت ابراہیم سے پہلے بھی بیت اللہ کا وجود تھا۔ جن لوگوں نے ﴿مَكَانَ الْبَيْتِ﴾ ''بیت اللہ کی جگہ'' (الحج 22:26) کے الفاظ سے استدلال کیا ہے ان کا استدلال قوی نہیں کیونکہ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بیت اللہ کی وہ جگہ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی اور اس کی تقدیر میں متعین تھی اور آدم علیہ السلام سے لے کر ابراہیم علیہ السلام تک کے انبیاء کے نزدیک معظم و محترم تھی۔'' [3] لیکن علامہ شامی نے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی اس عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''حافظ ابن کثیر کی یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس کے بارے میں بہت سے آثار منقول ہیں۔'' [4]

* پانچویں تعمیر عمالیق کے ہاتھوں انجام پائی۔

* اور چھٹی بنو جرہم نے کی جیسا کہ علامہ شامی نے ابن ابی شیبہ کی روایت نقل کی ہے، [5] اور جسے مشہور محدث اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح ابن جریر

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 2/45، وفتح الباري: 13/144، وسبل الهدٰى والرشاد: 1/171.
[2] أخبار مكة: 1/8، وسبل الهدٰى والرشاد: 1/172 امام صالحی نے بتایا ہے کہ اسے روایت کرنے والوں میں ابن منذر بھی شامل ہے، دیکھیے: (الروض الأنف: 1/221) سہیلی کے نزدیک کعبہ کی پہلی تعمیر شیث بن آدم نے کی تھی۔ [3] البداية والنهاية: 1/178. [4] سُبُل الهُدٰى والرَّشاد: 1/172.
[5] سُبُل الهُدٰى والرَّشاد: 1/192.

اور ابن ابی حاتم نے بھی اسے بیان کیا ہے اور امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔ یہ روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ علامہ سہیلی لکھتے ہیں: ''یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بنو جرہم کے دور میں بیت اللہ کی تعمیر کی نوبت ایک یا دو مرتبہ اس وقت پیش آئی جب سیلاب کی شدت سے بیت اللہ کی دیوار مسمار ہو گئی تھی لیکن درحقیقت یہ کوئی نئی تعمیر نہیں تھی بلکہ یہ تو محض کعبے کے ایک بوسیدہ حصے کی مرمت تھی اور سیلابی پانی اور کعبہ کے درمیان ایک دیوار بنا دی گئی تھی جسے عامر بن جارود نے تعمیر کیا تھا۔'' یہ روایت پیچھے گزر چکی ہے۔[1]

- ساتویں دفعہ اسے نبیٔ اکرم ﷺ کے جدامجد قصی بن کلاب نے تعمیر کیا۔ علامہ شامی نے لکھا ہے: ''مشہور مؤرخ زبیر بن بکار نے یہ بات کتاب النسب میں لکھی ہے اور امام ابو اسحاق ماوردی نے اپنی کتاب الأحکام السلطانیة میں اس کی تائید کی ہے۔''[2]
- آٹھویں دفعہ کعبہ قریش نے تعمیر کیا۔ اس وقت اس کی تعمیر میں خود رسول اللہ ﷺ بھی بنفس نفیس شریک تھے۔ اس وقت آپ کی عمر 35 سال تھی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔
- نویں تعمیر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ بات متفق علیہ روایت میں مذکور ہے۔[3]
- دسویں مرتبہ کعبے کی تعمیر حجاج بن یوسف نے اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے حکم پر کی جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے۔[4] اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے دور میں بیت اللہ کو آگ لگ گئی، انھوں نے نئے سرے سے تعمیر کیا اور

[1] الرّوضُ الأُنُف: 222/1. [2] سُبُل الهُدٰی والرّشاد: 192/1، والأحکام السلطانیة، ص: 143.
[3] صحیح البخاري، الحجّ، باب فضل مکة وبنیانها، حدیث: 1586، وصحیح مسلم، الحجّ، باب نقض الکعبة و بنائها، حدیث: 1333. [4] صحیح مسلم، الحجّ، باب نقض الکعبة وبنائها، حدیث: 1333.

دوران تعمیر چند تبدیلیاں کر دیں۔ مقام حجر (حطیم) کو بیت اللہ میں شامل کر دیا۔ دروازے کے مقابل ایک اور دروازہ لگا دیا اور دونوں دروازے زمین کے برابر کر دیے کیونکہ انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''(اے عائشہ) اگر تیری قوم (قریش) کا دورِ جاہلیت یا فرمایا: کفر کا زمانہ ابھی تازہ نہ ہوتا تو میں بیت اللہ کی موجودہ عمارت گرا دیتا اور اس کی پچھلی جانب دروازہ بنا دیتا اور اس کا دروازہ سطح زمین کے برابر رکھتا، نیز حطیم کو اس میں شامل کر لیتا۔''

لیکن عبدالملک کو شک تھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے یہ روایت اپنی خالہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نہیں سنی۔ اس نے حجاج کو حکم دیا کہ بیت اللہ کی پہلی حالت بحال کر دی جائے، چنانچہ حجاج نے متذکرہ بالا تبدیلیاں ختم کر کے بیت اللہ کو حسب سابق پہلی حالت پر تعمیر کر دیا۔ بعد میں مشہور شاعر عمر بن ابی ربیعہ کے بھائی حارث بن عبداللہ بن ابی ربیعہ نے خلیفہ عبدالملک کے رو برو تصدیق کی کہ یہ روایت میں نے بھی عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنی ہے تو عبدالملک کو اپنے کیے پر بہت افسوس ہوا۔[1]

مروی ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید عباسی نے ارادہ کیا تھا کہ وہ کعبے کو از سر نو سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی تعمیر کے مطابق کر دے لیکن امام مالک رحمہ اللہ نے اس کی مخالفت کی اور فرمایا: ''امیر المومنین! میں آپ کو اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ بیت اللہ کو اپنے بعد آنے والے بادشاہوں کے لیے کھیل نہ بنائیں کہ جس کا جی چاہے اسے ڈھاتا بناتا رہے۔ اس طرح لوگوں کے دلوں سے بیت اللہ کی ہیبت اٹھ جائے گی۔ یہ بات ہارون الرشید کی سمجھ میں آ گئی اور وہ اپنے ارادے سے باز آ گیا۔''⑦

⑦ کعبے کی تعمیر: حافظ ابن کثیر کا کہنا ہے کہ کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کرنے کی غرض سے مہدی بن ◄◄

[1] صحیح مسلم، الحج، باب نقض الکعبة وبنائها، حدیث: 1333، والرَّوض الأُنف: 1/222، وسُبُل الهدیٰ والرشاد: 1/169.

گیارھویں مرتبہ سلطان مراد خان چہارم عثمانی نے 1040ھ/1630ء میں کعبہ کی تعمیر کی جس کا ذکر محمد علی بن علان نے اسی موضوع پر اپنے تالیف کردہ کتابچے میں کیا ہے۔[1] اس تعمیر کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ سیلاب کی وجہ سے کعبے کی عمارت کے کچھ حصے منہدم ہو گئے تھے۔[2]

گزشتہ اوراق میں یہ بات گزر چکی ہے کہ تعمیر کعبہ کے بارے میں نازل ہونے والی قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ (جن میں صحیح بخاری کی روایات بھی شامل ہیں) سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کعبۂ مشرفہ کے اولین بانی حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام ہی ہیں، بیت اللہ کی جگہ ایک بلند ٹیلہ تھا جس سے فرشتے اور پہلے انبیاء واقف تھے اور یہ جگہ قدیم زمانے سے ہی معظم و مشرف سمجھی جاتی تھی حتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے زمانے میں باقاعدہ بنیادیں کھود کر کعبہ تعمیر کیا۔

باقی رہیں وہ روایات جن میں اس سے بھی پہلے کعبے کی عمارت کا تذکرہ ہے تو وہ ان

»» منصور عباسی نے مسمار کیا تھا، دیکھیے: (البداية والنهاية: 180/1) مؤرخ سہیلی رقم طراز ہیں: ''ابوجعفر منصور اور اس کے فرزند مہدی نے مسجد کی مضبوطی میں اضافہ کیا اور اس کی حالت بہتر بنائی تھی۔'' دیکھیے: (الروض الأنف: 224/1) دکتور بُوطي نے لکھا: صحیح مسلم کی شرح نووی اور فتح الباری میں ہے کہ ہارون الرشید نے کعبہ کو منہدم کر کے اس کی از سر نو تعمیر کرنی چاہی تھی، دیکھیے: (عیون الأثر: 53/1) اور إعلام الساجد میں مذکور ہے کہ یہ ارادہ ابوجعفر منصور کا تھا اور معلوم ہے کہ امام مالک منصور و ہارون دونوں کے ہم عصر تھے، چنانچہ یہ احتمال بہرحال باقی رہے گا کہ منصور و ہارون دونوں میں سے کوئی ایک یہ اقدام کرنا چاہتا تھا اور متعین طور پر کسی ایک کا نام نہیں لیا جا سکتا، دیکھیے: (فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 58)

[1] إخبار الكرام بأخبار المسجد الحرام لأحمد بن محمد المكي (تحقيق الحافظ غلام مصطفى)، ص: 148-157. [2] اس موضوع کی مناسبت سے دکتور مہدی رزق اللہ احمد کا مقالہ بعنوان عمارة الكعبة عبر التاريخ (ص: 95,94) لائقِ التفات ہے جو مجلّہ الدارۃ کے شمارہ نمبر 1 میں 1419ھ میں چھپا تھا۔

میں سے اکثر صحابہ یا تابعین کے اقوال ہیں۔ انھیں بیان کرنے والے بھی ''فاکہی اور ''ازرقی'' جیسے مؤرخین اور ایسے محدثین اور مفسرین ہیں جو اپنی کتابوں میں صرف صحیح و حسن روایات کی پابندی نہیں کرتے بلکہ ہر قسم کی روایات نقل کر دیتے ہیں۔ آپ اس سے پہلے ابن کثیر رحمہ اللہ کی یہ صراحت پڑھ چکے ہیں کہ کسی بھی صحیح حدیث میں، جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہو، یہ ذکر نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کعبے کی عمارت موجود تھی۔

ابوشہبہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے موقف کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''وہ روایات ہمارے اس موقف کے منافی نہیں جن میں ذکر ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بیت اللہ کا حج نہ کیا ہو۔ اسی طرح وہ روایت بھی ہمارے موقف کے منافی نہیں جو حافظ ابویعلیٰ رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے باسند بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حج کے لیے نکلے۔ جب وادیٔ عسفان میں تشریف فرما ہوئے تو دریافت فرمایا: ''ابوبکر! یہ کون سی وادی ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: ''یہ وادیٔ عسفان ہے'' آپ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! یہاں سے ہود، نوح اور ابراہیم علیہم السلام بھی اپنے سرخ اور جوان اونٹوں پر سوار گزر چکے ہیں۔ ان کے اونٹوں کی مہاریں کھجور کی چھال کے ریشوں کی تھیں، انھوں نے عبائیں پہنی ہوئی تھیں اور دھاری دار چادریں اوڑھی ہوئی تھیں، وہ لبیک کہتے ہوئے قدیم گھر بیت اللہ کے حج کو جا رہے تھے۔''

اور وہ روایت بھی ہمارے موقف کے منافی نہیں جو امام احمد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے اپنی سند کے ساتھ بیان کی ہے کہ حج کے دنوں میں جب نبیٔ کریم ﷺ وادیِ عسفان سے گزرے تو پوچھا: ''ابوبکر! یہ کون سی وادی ہے؟'' انھوں نے جواب دیا: ''وادیِ عسفان'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہاں سے ہود اور صالح علیہما السلام بھی اپنے سرخ اور جوان اونٹوں پر سوار گزر چکے ہیں۔ ان کے اونٹوں کی مہاریں کھجور کی چھال کے ریشوں کی تھیں۔ انھوں نے عبائیں پہنی ہوئی اور دھاری دار چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ وہ لبیک

کہتے ہوئے قدیم گھر بیت اللہ کے حج کو جا رہے تھے۔'' اس روایت کی سند حسن ہے۔ [1]
یہ روایات ہمارے موقف کے اس لیے منافی نہیں کہ یہاں کسی عمارت کا ذکر نہیں۔ باقی رہا حج تو وہ بیت اللہ کی جگہ کا بھی ہو سکتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔ [2]

کعبہ کی عمارت میں حضرت ابن زبیر کا تصرف

جب حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے کعبہ کی تعمیر نو کا فیصلہ کر لیا تو لوگوں نے مل کر اس کی عمارت منہدم کی اور اسے زمین کے برابر کر دیا، پھر ارد گرد لکڑی کے ستون کھڑے کیے اور ان پر پردے لٹکا کر اسے کعبہ کی طرح بنا دیا، پھر ان پردوں کے اندر تعمیر شروع کر دی۔ انھوں نے بیت اللہ کے احاطے میں چھ ہاتھ کی وہ جگہ بھی شامل کر دی جو قریش نے نکال دی تھی۔ بیت اللہ کی اونچائی میں دس ہاتھ اضافہ کیا گیا۔ دروازے دو رکھے گئے۔ ایک مشرقی جانب دوسرا مغربی جانب تاکہ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوں اور دوسرے سے نکلیں۔ ان تبدیلیوں کی وجہ دراصل وہ روایت ہے جسے بخاری و مسلم دونوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عائشہ! اگر تمھاری قوم (قریش) کا دور جاہلیت ابھی تازہ نہ ہوتا تو میں حکم دیتا کہ بیت اللہ کی موجودہ عمارت گرا کر اس میں وہ جگہ شامل کی جائے جو نکال دی گئی تھی۔ اور اس کا دروازہ زمین کی سطح پر لگایا جائے اور دو دروازے بنائے جائیں۔ یوں میں اسے صحیح ابراہیمی بنیاد پر تعمیر کراتا۔'' [3]

[1] البداية والنهاية: 320/1، ومسند أحمد: 232/1. الموسوعة الحديثية (495/3، حديث: 2067) کے محققین نے اس روایت کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ اس کا ایک راوی زمعہ ضعیف اور دوسرا سلمہ بن ہرام مختلف فیہ ہے۔ علامہ احمد شاکر نے بھی زمعہ بن صالح کے ضعف کی وجہ سے اس روایت کو ضعیف کہا ہے، دیکھیے: (مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر) 340/3، حديث: 2067) [2] السيرة النبوية في ضوء القرآن والسُّنَّة: 127,126/1. [3] صحيح البخاري، الحجّ، باب فضل مكّة وبنيانها، حديث: 1586، وصحيح مسلم، الحجّ، باب نقض الكعبة و بنائها، حديث: 1333.

ازرقی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی عمارت کی اونچائی نو ہاتھ، لمبائی بتیس ہاتھ اور چوڑائی بائیس ہاتھ رکھی تھی۔ اور اس پر چھت نہیں تھی۔ [1]

امام سہیلی کہتے ہیں کہ بیت اللہ کی اونچائی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دور سے نو ہاتھ ہی رہی۔ قریش نے اسے تعمیر کیا تو اونچائی مزید نو ہاتھ بڑھا دی۔ یوں اونچائی اٹھارہ ہاتھ ہو گئی۔ اور انھوں نے اِس کا دروازہ زمین سے اتنا اونچا کر دیا کہ سیڑھی کے بغیر اس پر چڑھا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ بیت اللہ میں بند دروازہ سب سے پہلے تُبَّع (8) ہی نے لگایا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے تعمیر نو کرتے وقت بیت اللہ کی اونچائی میں مزید نو ہاتھ کا اضافہ کر دیا، اس طرح بیت اللہ کی اونچائی ستائیس ہاتھ ہو گئی۔ یہ اونچائی اب تک اتنی ہی ہے۔ [2]

ابتدا میں مسجدِ حرام کی کوئی دیوار نہیں تھی اور ہر طرف لوگوں کے گھر تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حجاج اور زائرین کی بہتات اور جگہ کی تنگی دیکھی تو اردگرد کے قریبی گھر خرید کر مسجد میں شامل کر دیے اور مسجد کو کشادہ کر کے اس کے اردگرد قد آدم دیوار بھی بنا دی اور اس پر روشنی کا باقاعدہ انتظام کیا۔ [3] پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مزید تنگی محسوس کرتے

(8) تبع: یمن کے حمیری حکمرانوں میں دوسرے دور کے بادشاہ تبع (جمع ''تبابعہ'') کہلاتے ہیں۔ سب سے پہلا ''تبع'' حارث الرائش تھا۔ حارث سے پہلے حکومت یمن، سبا اور حضرموت دو ٹکڑوں میں منقسم تھی۔ لیکن حارث الرائش جب بادشاہ بنا تو سب اس پر متفق ہو گئے اور اس کے تابع بنے، اس لیے اس کا نام ''تبع'' پڑا (اور یہی سب سے پہلا ''تبع'' ہے)۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ صرف تین ''تبع'' گزرے ہیں: تبع اکبر، تبع اوسط اور تبع اصغر۔ تبع اکبر کا نام حارث الرائش ہے، تبع اوسط اسعد ابوکرب کا لقب تھا اور تبع اصغر، تبع بن حسان تھا، دیکھیے: (اطلس القرآن (اردو)، ص: 225 و تاریخ ارض القرآن کامل از سید سلیمان ندوی، ص:230)

[1] أخبار مكة: 64/1. [2] الرّوض الأنف: 221/1. [3] أخبار مكة: 69,68/2، والرّوض الأنف: 224/1.

ہوئے بہت سے اور گھر خرید کر حرم میں مزید توسیع کی۔ [1] حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی اپنے دور میں ایسے ہی توسیع کی۔ [2]

اس وقت سے خلفاء اور حکمران وقتاً فوقتاً حرم میں توسیع کرتے رہے ہیں۔ [3]

اب سعودی حکومت نے بے مثال توسیع کی ہے، اللہ تعالیٰ اس حکومت کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

مقامِ ابراہیم

''مقامِ ابراہیم'' سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبے کی عمارت تعمیر کرتے رہے جبکہ دیواروں کی اونچائی ان کی قامت سے بلند ہوگئی تھی۔ اس پتھر پر آپ کے قدموں کے نشانات ثبت ہو گئے اور اسلام کے ابتدائی دور تک یہ نشانات برقرار رہے تھے مگر لوگوں کے بکثرت چھونے اور متواتر ہاتھ لگاتے رہنے کی وجہ سے قریب قریب محو ہو گئے۔ اسی مقام ابراہیم کے بارے میں ابو طالب کہتے تھے:

وَمَوْطِئُ إِبْرَاهِيمَ فِي الصَّخْرِ رَطْبَةً عَلَى قَدَمَيْهِ حَافِيًا غَيْرَ نَاعِلِ

''حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جوتوں کے بغیر ننگے پاؤں کھڑے ہو کر کعبے کی دیواریں چنیں۔ پتھر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بغیر جوتے کے قدموں کے نشانات دیکھو جو ابھی تک تر و تازہ ہیں۔ وہ پتھر ان کے پاؤں کے نیچے نرم پڑ گیا تھا۔'' [4]

روایت ہے کہ قدیم زمانے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت تک مقام ابراہیم کعبہ کی دیوار سے متصل رکھا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طواف کرنے اور مقام ابراہیم کے پاس

---

[1] أخبار مكة: 69/2، والرّوض الأنف: 224/1. [2] أخبار مكة: 70,69/2. [3] أخبار مكة: 71/2. اور اس کے بعد کے صفحات۔ ازرقی نے اپنے دور تک کے ان تمام امراء و خلفاء کا ذکر کیا ہے جنھوں نے حرم کی توسیع کا شرف حاصل کیا۔ [4] تفسير ابن كثير: 246/1، والبداية والنهاية: 179,178/1.

نماز پڑھنے والوں کی آسانی کے لیے اسے بیت اللہ سے کچھ دور رکھوا دیا۔ دیگر صحابہ نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کو مستحسن سمجھا۔ (9)

گزشتہ صفحات میں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ مقام ابراہیم کے قریب نماز پڑھنے کا حکم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی موافقت میں نازل ہوا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی: ''اے اللہ کے رسول! میری خواہش ہے کہ ہم طواف کے بعد مقام ابراہیم علیہ السلام کے پاس نماز پڑھا کریں۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرما دیا:

(9) مقام ابراہیم: فضائل الصحابة لأحمد: 324/1. امام احمد نے اسے عطا تک عبدالرزاق کی صحیح سند سے روایت کیا ہے، نیز ملاحظہ کیجیے: (المصنّف لعبدالرزاق: 48/5) اس کی تائید میں ایک صحیح روایت مجاہد کے حوالے سے ہے جسے عبدالرزاق نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے دیکھیے: (المصنّف لعبد الرزاق: 48,47/5، وأخبار مكة: 33/2) حافظ ابن حجر نے لکھا: ''بیہقی نے اس طرح کی ایک روایت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے نقل کی ہے جس کی سند قوی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: ''مقام ابراہیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں بیت اللہ سے متصل تھا، پھر عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پیچھے کر دیا۔'' دیکھیے: (فتح الباري: 169/8) ابن ابی حاتم نے صحیح سند سے امام سفیان بن عیینہ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مقام ابراہیم خانۂ کعبہ کے پاس تھا، بعد ازاں امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی جگہ تبدیل کر دی، پھر ایک سیلاب آیا جو پتھر کو بہا کر اپنے ساتھ لے گیا، اس پر عمر رضی اللہ عنہ نے اسے تلاش کرا کے واپس اس کی پرانی جگہ پر رکھوا دیا۔'' سفیان نے مزید کہا: ''مجھے علم نہیں کہ مقام ابراہیم کا پتھر کعبہ کی دیوار سے متصل تھا یا نہیں۔'' ملاحظہ ہو: (فضائل الصحابة: 325/1 کا حاشیۂ محقق) حافظ ابن کثیر نے عبدالرزاق کے حوالے سے عطاء و مجاہد کے اقوال اور بیہقی کے حوالے سے عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول نقل کرنے کے بعد لکھا: ''یہ اور اس سے پہلے ذکر کردہ اقوال صحیح سند سے نقل کیے گئے ہیں۔'' انھوں نے ابنِ ابی حاتم کے حوالے سے سفیان کا قول درج کرنے کے بعد بھی لکھا: ''یہ تمام اقوال ہماری اس بات کی تائید کرتے ہیں جو ہم نے اس سے پہلے کہی۔'' دیکھیے: (تفسیر ابن کثیر: 246/1)

﴿ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ ﴾ ''اور تم مقام ابراہیم کو جائے نماز بناؤ۔'' [1]

یہاں ایک اور حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ بھی تعمیر کی تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ کی بنیاد رکھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے مطابق بیت اللہ اور بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) کی تعمیر کے درمیان چالیس سال کا بُعد تھا۔ [2]

باقی رہی وہ حدیث جو امام نسائی رحمہ اللہ نے بیان کی ہے کہ مسجد اقصیٰ حضرت سلیمان بن داود علیہما السلام نے تعمیر کی [3] تو دراصل اس حدیث میں تعمیر سے مراد اس کی تجدید ثانی ہے۔ امام سیوطی، حافظ ابن قیم اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہی بات کہی ہے۔ [4]

دکتور ابوشہبہ لکھتے ہیں: ''لغتِ عربی میں ''بِنَاء'' تجدید کے معنوں میں مستعمل ہے۔'' [5]

بعثت نبوی کے وقت عرب کے عام حالات

چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں انسانیت جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر طرف بت پرستی، خرافات، عصبیت، اندھی تقلید، طبقاتی تفریق، سیاسی مفاسد

[1] البقرة 2:125. صحيح البخاري، الصلاة، باب ماجاء في القبلة ومن لم ير الإعادة......، حديث: 402، ومسند أحمد: 24,23/1. سند صحیح ہے۔ [2] صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالىٰ: ﴿ وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ ﴾، حديث: 3425، وصحيح مسلم، كتاب و باب المساجد ومواضع الصلاة، حديث: 520. [3] سنن النسائي، المساجد، باب فضل المسجد الأقصىٰ والصلاة فيه، حديث: 694. سیوطی نے قرطبی کے حوالے سے اس روایت کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (شرح السيوطي لسنن النسائي: 33/2) [4] شرح السيوطي لسنن النسائي: 33/2، وزاد المعاد في هدي خير العباد: 50,49/1، وفتح الباري: 152/13. ابن حجر نے بھی نسائی کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ [5] السيرة النبوية في ضوء القرآن والسنة: 134/1.

اور معاشرتی خرابیوں کا دوز دورہ تھا۔ نیکی اور خیر خواہی کے جذبات منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ انبیاء و مرسلین کی صحیح تعلیمات باقی نہیں رہی تھیں۔ اور فطری رویوں پر قائم حکماء اور مصلحین کی کوششیں بے اثر تھیں۔ یہ ساری صورتحال رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک مختصر جملے میں یوں عیاں کر دی ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ نَظَرَ إِلٰى أَهْلِ الْأَرْضِ فَمَقَتَهُمْ، عَرَبَهُمْ وَ عَجَمَهُمْ جَمِيعًا إِلَّا بَقَايَا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ»

''اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر بسنے والے لوگوں کو دیکھا تو کیا عرب کیا عجم، اللہ تعالیٰ کو کوئی فرد پسند نہیں آیا، سوائے اہل کتاب میں سے گنتی کے چند افراد کے (جو تحریف سے پاک اپنے دین حق پر قائم تھے۔)''[1]

اگلے صفحات میں ہم اختصار کے ساتھ اس دور کے جزیرہ نمائے عرب کے حالات بیان کریں گے تا کہ یہ اندازہ ہو جائے کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور آپ کی تعلیمات عالیہ کی ضرورت کس قدر ناگزیر تھی۔ اس کے ساتھ ہم رسالت مآب ﷺ کے قائم کردہ بلند پایہ اخلاقی معیار اور اس کے مبادیات کا ذکر بھی کریں گے کیونکہ یہی وہ مبارک سرمایہ ہے جس کی بدولت اعلیٰ انسانی شرافتوں کی تشکیل ہوئی اور انسانی تہذیب و تمدن کو چار چاند لگ گئے۔

جزیرہ نمائے عرب کی سیاسی حالت

یمن کی حکومت: یمن میں عربوں کی سب سے قدیم نسل ''قوم سبا'' آباد تھی۔ اس قوم کا ذکر قرآن کریم میں بھی موجود ہے۔ اس قدیم قوم کی ترقی، عروج اور اقتدار کا دور

[1] صحيح مسلم، الجنة و صفة نعيمها......، باب الصفات الّتي يعرف بها في الدنيا أهل الجنة وأهل النار، حديث:2865.

گیارہ سو سال تک دراز رہا۔ 300ء میں یہاں قبیلۂ حمیر کی حکومت قائم ہوئی۔ (10) پھر یمن کا دورِ انحطاط شروع ہوا اور قحطانی قبائل دوسرے علاقوں کی طرف نقل مکانی کرنے لگے۔ یمن میں اسلامی اثر و نفوذ سے پہلے دو سو ستر سال شدید اضطراب اور خانہ جنگی کی حالت میں گزرے جس کی بنا پر دوسری قوموں کو ان کی آزادی سلب کرنے کے مواقع مل گئے۔ رومی افواج عدن میں داخل ہوگئیں اور ان کی مدد سے حبشی 340ء میں پہلی مرتبہ یمن پر قابض ہوئے۔

بنو ہمدان اور بنو حمیر کی باہمی چپقلش سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور ان کا یہ تسلط 378ء تک قائم رہا۔ بعد ازاں یمن کو آزادی نصیب ہوئی لیکن 450ء یا 451ء میں اللہ تعالیٰ نے انھیں ''سیلِ عرم'' یعنی سیلاب کی شکل میں ایسے آشوب سے دوچار کیا جس کی زد میں آ کر مأرب کا بند (ڈیم) ٹوٹ گیا۔ اس ڈیم سے ان کی خوشحالی وابستہ تھی۔ [1] یہ ان کی سرکشی، فساد، کج روی اور ناسپاسی کی سزا تھی۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کی رو سے ایسے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

523ء میں ان کے بادشاہ ذونواس نے عیسائیوں (دینِ مسیح کے سچے پیروکاروں) کے خلاف زبردست تحریک چلائی تاکہ وہ اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں۔ جب یہ مقصد حاصل نہ ہوا تو اس نے ایک بڑی خندق کھدوائی، اسے آگ سے بھر دیا، پھر عیسائیوں کو اس میں جھونک کر زندہ جلا ڈالا۔ قرآن کریم کی سورۂ بروج کی ان آیات میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے:

(10) حمیری بادشاہ: تاریخی تحقیق کی رو سے یمن کے حمیر بادشاہوں کی تاریخ پہلی صدی ق م کے وسط سے شروع ہو کر ذونواس کی موت پر 525 ق م میں ختم ہوتی ہے۔ جبکہ شاہانِ حمیر کے طبقۂ ثانیہ کا آغاز تیسری صدی عیسوی کے اواخر سے ہوتا ہے، دیکھیے: (تاریخ ارض القرآن کامل از سید سلیمان ندوی، ص: 222-228)

[1] تاريخ اليعقوبي: 205/1.

﴿ قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ ﴾

''ہلاک کیے گئے خندقوں والے، (ان خندقوں میں) آگ تھی ایندھن والی۔''[1]

نتیجتاً رومیوں نے حبشیوں کو انگیخت کیا کہ وہ یمن پر دوبارہ قبضہ کر لیں، چنانچہ ارياط کی قیادت میں 525ء میں حبشی دوبارہ یمن پر قابض ہو گئے۔ ایک حبشی فوجی کمانڈر ابرہہ (11) نے ارياط کو دھوکے سے قتل کر دیا۔ شاہ حبشہ نے ابرہہ کو یمن کا حاکم مقرر کر دیا۔ اسی ابرہہ نے کعبۃ اللہ کو گرانے کے لیے لشکر کشی کی لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب تدبیر سے اسے اس کے لشکر سمیت ذلت و ناکامی سے دوچار کیا۔ قرآن مجید کی سورۂ فیل میں اس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بالآخر یمنیوں نے ایرانیوں سے مدد طلب کی اور ان کی مدد سے 575ء میں معدیکرب بن سیف بن ذی یزن حمیری کی قیادت میں حبشیوں کو یمن سے نکال باہر کیا۔ ایرانیوں نے معدیکرب کو ان کا بادشاہ بنا دیا لیکن اس سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے حبشیوں کا ایک دستہ اپنی خدمت کے لیے رکھ لیا۔ انھوں نے موقع پا کر اسے قتل کر دیا۔ اس کی موت سے اس کے خاندان کی حکومت ختم ہو گئی اور شاہ ایران کسریٰ نے ایک ایرانی گورنر مقرر کر کے یمن کو ایرانی حکومت میں شامل کر لیا۔ آخری ایرانی گورنر حضرت باذان رضی اللہ عنہ تھے جنھوں نے 628ء میں اسلام قبول کر لیا۔ ان کے مشرف بہ اسلام ہوتے ہی یمن سے ایرانی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ جمادی الاولیٰ 7ھ کا واقعہ ہے۔ (جزیرہ نمائے عرب کا جنوب

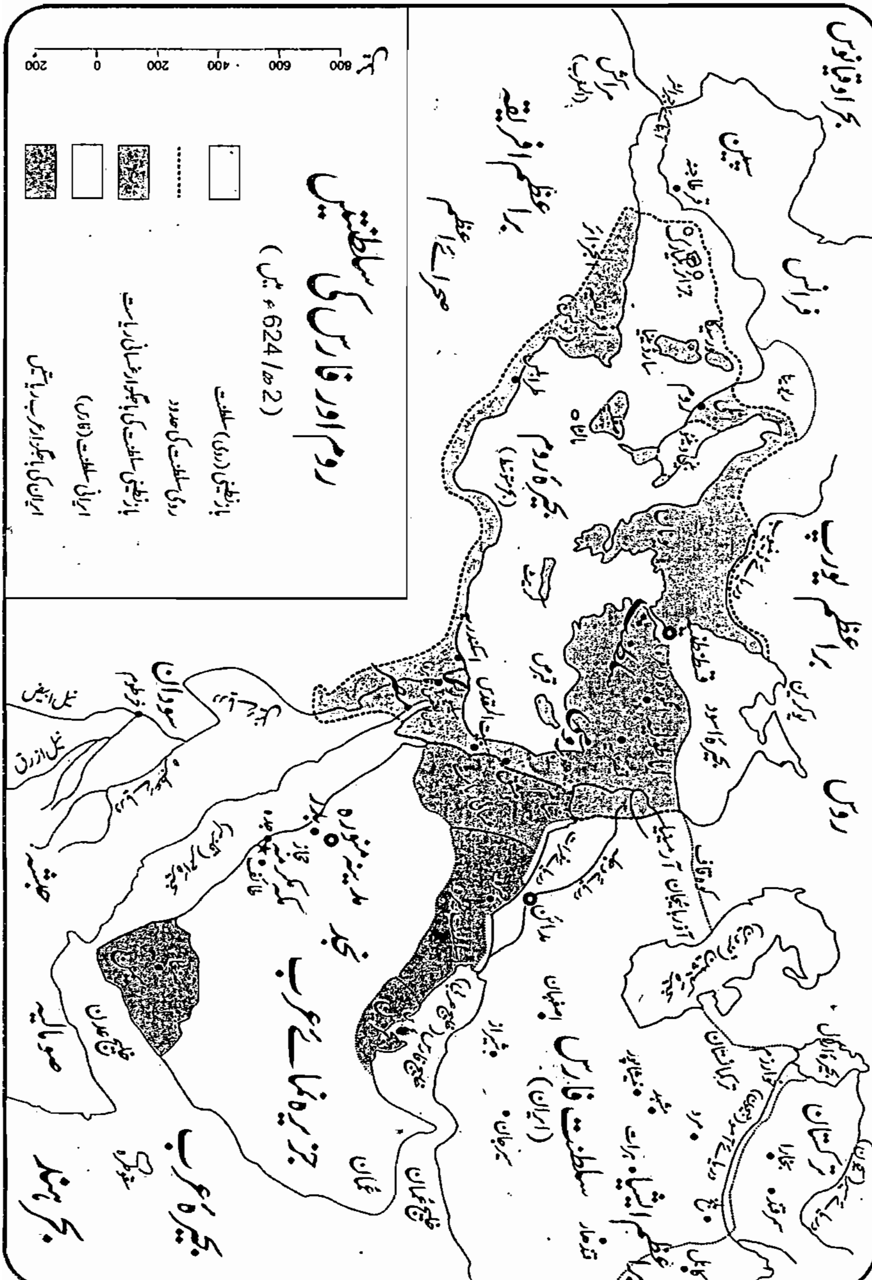
(11) ابرہہ الاشرم: لفظ ''ابرہہ'' ابراہیم کا حبشی تلفظ ہے اور چونکہ وہ نک کٹا تھا اس لیے ''اشرم'' کہلاتا تھا۔ ابرہہ کے آغازِ حکومت کی تاریخ معلوم نہیں لیکن اس کے ایک ابتدائی کتبہ پر سن 657 یمنی مطابق 543ء درج ہے۔ ابرہہ ایک رومی غلام تھا جو زیلع (اریٹریا) میں رہتا تھا، شاہ حبش یلا اصبحہ کے خلاف جس فوج نے بغاوت کی، ابرہہ اس کا سردار بن گیا۔ شاہ حبش کی وفات کے بعد سے یمن کا نائب (گورنر) بنا دیا گیا، دیکھیے: (تاریخ ارض القرآن کامل، ص: 245,244)

[1] البروج 85:4,5.

مغربی حصہ قبل مسیح کے زمانے میں اور اس کے بعد ''سبا'' کہلاتا تھا اور عہد نبوی میں اسے یمن کہتے تھے اور یہی نام آج تک معروف ہے۔ یمن کے شمال میں سعودی عرب کے صوبے نجران اور عسیر ہیں۔ شمال مشرق میں ربع الخالی ہے۔ مشرق میں عمان، جنوب میں بحیرۂ عرب اور خلیج عدن اور مغرب میں بحیرۂ احمر واقع ہیں۔ دارالحکومت صنعاء ہے اور عدن، جدید، مخا اور مکلاّ بندرگاہیں ہیں۔ یمن کا مشرقی حصہ حضرموت کہلاتا ہے۔ حمیری دور میں ''مأرب'' قوم سبا کا دارالحکومت تھا۔ حمیروں نے وادی شیوان (مشرقی یمن) میں سدّ مأرب (قرآن میں اَلْعَرِم) تعمیر کیا تھا جس کے آثار یورپی مہم جو ہالوے نے 1875ء میں دریافت کیے۔)

حیرہ کی حکومت: جب سے کوروش کبیر (557 ق م تا 529 ق م، یونانی نام سائرس) نے ایرانی حکومت قائم کی۔ اس وقت سے عراق اور اردگرد کے علاقوں پر ایرانی حکومت ہی مسلط رہی۔ 326 ق م میں سکندر مقدونی نے ایرانی بادشاہ دارا سوم کو شکست دے کر ایرانی حکومت تتر بتر کر دی۔ یوں عراق 330ء تک طوائف الملوکی کا شکار رہا۔ ان بادشاہوں کے دور میں قحطانی آ کر ریگستانی عراق کے ایک حصّے میں رہنے لگے، پھر عدنانی بھی ہجرت کر آئے لیکن قحطانیوں نے انھیں وہاں نہ رہنے دیا، لہٰذا وہ مجبوراً جزیرہ فراتیہ [12] میں جا بسے۔ ادھر ایرانی بادشاہ اردشیر، جس نے 226ء میں ساسانی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی، نے ایرانیوں کو منظم کر کے ایرانی سرحدوں کے قریب رہنے والے عربوں

[12] جزیرہ فراتیہ: اس سے مراد الجزیرہ ہے جس کے بارے میں یاقوت حموی لکھتے ہیں: ''یہ دجلہ اور فرات کے مابین شام کے قریب واقع ہے اور دیارِ مضر اور دیار بکر پر مشتمل ہے۔ اس کا نام الجزیرہ اس لیے پڑا کہ یہ دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے درمیان واقع ہے۔ اس کے بڑے بڑے شہر حرا، الرہا، رقہ، راس عین، نصیبین، سنجار، خابور، ماردین، آمد، میافارقین اور موصل وغیرہ ہیں، دیکھیے: (معجم البلدان: 134/2) ان دنوں الجزیرہ ترکی، شام اور عراق میں بٹا ہوا ہے۔


روم اور فارس کی سلطنتیں
(624ء / 2ھ)

پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اس بنا پر بنو قضاعہ شام کی طرف کوچ کر گئے لیکن حیرہ (13) اور انبار (14) کے عربوں نے اس کی حکومت تسلیم کر لی۔ چونکہ ان دور دراز کے علاقوں پر حکومت کرنا مشکل تھا، اس لیے اردشیر نے فیصلہ کیا کہ اس علاقے پر کسی عرب ہی کو حکمران مقرر کر دے۔ اس نے جذیمۂ وضاح کو عراق کا حکمران بنا دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ایرانی لشکر متعین کر دیا تاکہ وہ رومیوں اور شام کے عربوں کے خطرے کا مقابلہ کر سکیں۔ شام کے عرب ان دنوں رومیوں کے ماتحت تھے۔ حیرہ کے بادشاہوں میں سے نعمان بن منذر نے شہرت حاصل کی۔ یہی وہ بادشاہ ہے جس نے شاہِ ایران کے خلاف لشکر کشی کی اور ذی قار کی جنگ میں ایرانی لشکر کو شکست سے دوچار کیا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کے بعد کا واقعہ ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ عرب عجمیوں پر غالب آئے۔ [1] بتایا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

«هٰذَا أَوَّلُ يَوْمٍ انْتَصَفَ الْعَرَبُ فِيهِ مِنَ الْعَجَمِ، وَ بِي نُصِرُوا»

”یہ پہلا دن ہے کہ عربوں نے عجمیوں سے اپنا حق چھینا اور میرے ذریعے سے ان کی مدد کی گئی ہے۔“ [2]

(13) حیرہ: یہ لخمی بادشاہوں کا دارالحکومت تھا جس کے آثار عراق میں کوفہ اور نجف کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ (آغاز اسلام کے وقت) یہاں نسطوری عیسائی آباد تھے۔ نعمان بن منذر کے نام پر اس کا نام حیرۃ النعمان پڑ گیا، دیکھیے: (المنجد في الأعلام، ص: 227)

(14) انبار: یہ شہر بغداد کے مغرب میں دس فرسخ دور دریائے فرات پر واقع ہے۔ اہل فارس اسے شاپور کا نام دیتے تھے۔ گندم اور جو وغیرہ کے ڈھیروں کے باعث اس کا یہ نام پڑا، دیکھیے: (معجم البلدان: 257/1) انبار شہر کے کھنڈرات دریائے فرات کے کنارے پائے جاتے ہیں، نیز اب عراق کے مغربی صوبے کا نام انبار ہے جو شام اور اردن سے ملحق ہے۔

[1] الکامل في التاریخ لابن الأثیر: 171/1-174، وتاریخ الیعقوبي: 214/1، 215. ان کی اسانید ضعیف ہیں۔ [2] تاریخ الطبري: 193/2. امام طبری نے یہ روایت بلا سند درج کی ہے۔

شام کی حکومت: جس دور میں عربی قبائل میں ہجرتوں کا دور دورہ تھا، بنو قضاعہ کے بہت سے قبائل شام میں جا کر رہنے لگے۔ یہ لوگ بنو سُلَیح بن حُلوان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے بنو ضجعم بن سلیح مشہور ہوئے۔ انھیں ''ضجاعمہ'' کہا جاتا تھا۔ رومیوں نے ان کی سرپرستی کی تاکہ یہ عربوں کو لوٹ مار سے روکے رکھیں اور ایرانیوں کے مقابلے میں کام آئیں۔ رومیوں نے انھی میں سے ایک شخص کو ان کا حکمران بنا دیا، پھر عرصہ دراز تک انھی کی حکومت جاری رہی حتی کہ غسانی ان پر غالب آ کر حکمران بن گئے۔

رومیوں کی سرپرستی میں غسانیوں کی حکومت جنگ یرموک (13ھ/634ء) تک قائم رہی جبکہ ان کا آخری بادشاہ جبلة بن الأيهم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمان ہو گیا۔ [1]

مکہ مکرمہ: مکہ مکرمہ حجاز کا ایک شہر ہے۔ حجاز میں کبھی کوئی ایسا مضبوط سیاسی ڈھانچہ قائم نہیں ہوا جسے حکومت کا نام دیا جا سکے۔ یہاں مختلف شہر تھے جن میں سے ہر ایک کا اپنا سیاسی نظام تھا جو بادشاہی کے بجائے سرداری نظام کے زیادہ قریب تھا۔ حجاز کے مشہور شہر مکہ، یثرب اور طائف تھے۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے مکہ کی ابتدائی آبادی کی کچھ تاریخ بیان کی ہے۔ وہاں کے اصلی رہائشی بنو جرہم تھے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ ان سے قبل یہاں عمالیق رہتے تھے لیکن وہ اندرونِ مکہ کے بجائے اردگرد کے علاقوں میں مقیم تھے۔ [2]

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد بنو جرہم حرم کا تقدس برقرار نہ رکھ سکے۔ ان کے دور میں ظلم و فساد کا دور دورہ رہا۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے کعبہ کا وہ مال بھی لوٹ لیا جو ازراہِ عقیدت لوگ کعبہ کو بھیجتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھی کے دور میں زمزم کا پانی

---

[1] تاریخ اليعقوبي:1/207,206. روایت کی سند ضعیف ہے۔ بعد کے دنوں میں جبلة بن الأيهم مرتد ہو کر روم بھاگ گیا اور آخر وقت تک تائب نہ ہوا، دیکھیے: (فتوح البلدان، ص:142,141) [2] أخبار مكة: 54/1. روایت کی سند ضعیف ہے۔

خشک ہو گیا تھا بلکہ بئر زمزم کے نشانات تک مٹ گئے تھے، پھر سیل عرم کے بعد جب یمن کے عربی قبائل ادھر ادھر منتشر ہوئے تو ثعلبہ بن عمرو بن طاہر اپنی قوم کو لے کر مکہ مکرمہ آ گیا لیکن بنو جرہم نے انھیں یہاں رہنے کی اجازت نہ دی، نتیجتاً جنگ ہوئی۔ بنو جرہم شکست کھا گئے۔ یوں ان کی تولیت ختم ہو گئی۔

ثعلبہ بیمار ہوا تو شام چلا گیا اور مکہ کی سرداری اور کعبے کی تولیت اپنے بھتیجے ربیعہ بن حارثہ بن عمرو کے سپرد کر گیا۔ اس کا لقب لُحَی تھا اور اس کی قوم بنوخُزاعہ کے نام سے مشہور تھی۔ بنو جرہم اور ثعلبہ کی جنگ کے دوران میں بنو اسماعیل بن ابراہیم بنوخزاعہ کے پاس چلے گئے تھے اور اس جنگ سے لاتعلق رہے۔ [1]

بنوخزاعہ نے تقریباً تین سو سال تک کعبہ کی تولیت سنبھالے رکھی۔ بعض مؤرخین نے یہ مدت پانچ سو سال بتائی ہے۔ اس دور میں قریش، بنو کنانہ میں جہاں بھی ان کے سینگ سمائے، رہتے رہے حتی کہ قُصَی نے قریش کی قیادت سنبھالی اور پورے قبیلے کو منظم کیا اور بیت اللہ کی تولیت حاصل کرنے کے لیے خزاعہ سے جنگ شروع کر دی۔ اس جنگ میں بنوقضاعہ نے قصی کی مدد کی۔ عرب کے دوسرے قبائل بھی اس جنگ میں شامل ہو گئے۔ آخر کار اس شرط پر جنگ رکی کہ غیر جانبدار حکَم تولیت کا فیصلہ کریں گے۔ فیصلے کی رو سے قصی تولیت کعبہ کے زیادہ حقدار قرار پائے۔ اس وقت سے عربوں میں قریش کا مرتبہ بڑھ گیا اور وہ عربوں کی عقیدت کا مرکز بن گئے۔ [2]

قصی نے مکہ مکرمہ کی زمین قریش کے مختلف خاندانوں میں بانٹ دی اور انھیں ان کی

---

[1] أخبار مكة:1/90-96، والسيرة النبوية لابن هشام:1/160,161. ابن ہشام نے یہ روایت محمد بن اسحاق کے حوالے سے بغیر سند کے نقل کی ہے۔ اس کی اسانید ضعیف ہیں۔ [2] أخبار مكة:1/103-107. ازرقی کی سند ضعیف ہے۔ والسيرة النبوية لابن هشام:1/164,165. ابن ہشام نے یہ روایت محمد بن اسحاق کے حوالے سے بلا سند بیان کی ہے۔ یوں یہ روایت ضعیف قرار پاتی ہے۔

مقررہ جگہوں پر ٹھہرایا۔ تولیت کی تمام ذمہ داریاں، مثلاً: حجابہ (دربانی)، سقایہ (پانی پلانا)، سَدانہ (خدمت) اور لِوَاء (جھنڈا) قصی کے ہاتھ میں تھیں۔ انھوں نے باہمی تنازعات کے فیصلے اور ظلم و تعدّی روکنے کے لیے ''دارالندوہ'' قائم کیا۔ دارالندوہ کی پنچایت کے سربراہ قصی ہی تھے۔ وہی دارالندوہ کے دیگر معاملات کے ذمہ دار بھی تھے۔ انھوں نے قریش کے ہر خاندان پر سالانہ ٹیکس لگایا جس سے وہ نادار حاجیوں کو کھانا اور دیگر ضروریات فراہم کرتے تھے۔ جب قُصَی بوڑھے ہو گئے تو انھوں نے مندرجہ بالا تمام ذمہ داریاں اور مناصب اپنے بڑے بیٹے عبدالدار کے سپرد کر دیں۔ عبدالدار کی زندگی تک تو کام چلتا رہا۔ جب عبدالدار اور ان کے بھائی عبدمَناف، عبدشمس اور عبدالعُزّٰی فوت ہو گئے تو ان کی اولاد میں ان عہدوں کی تقسیم پر اختلاف ہو گیا۔ ان کے دو گروہ بن گئے، ایک گروہ بنوعبدالدار کا اور دوسرا بنوعبدمناف کا۔

بنوعبدمناف نے حلف اٹھاتے وقت اپنے ہاتھ خوشبو سے بھرے پیالے میں ڈالے اور کعبہ کی دیواروں پر لگائے۔ عربی زبان میں خوشبو کو طِیب کہتے ہیں۔ یوں خوشبو میں ہاتھ ڈال کر حلف اٹھانے والوں کو مُطَیَّبِین کے لقب سے یاد کیا گیا۔

بنوعبدالدار اور ان کے حلیفوں نے اپنے ہاتھ خون سے بھرے پیالے میں ڈبوئے اور کعبہ کی دیواروں پر لگائے۔ ان کو ''اَحلاف'' کا لقب حاصل ہوا۔ (جنگ کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا۔) مگر آخر کار اس معاہدے پر صلح ہو گئی کہ حجاج کی خدمت گزاری اور پانی پلانے کی ذمہ داری بنوعبدمناف اور ان کے حلیفوں کو ملے گی اور حجابہ (دربانی) کا منصب، لواء (جھنڈا) اور دارالندوہ بنوعبدالدار کے پاس رہیں گے۔ بنوعبد مناف کو ملنے والے اعزازات اور عہدے ہاشم اور ان کے بھائی عبدشمس میں یوں تقسیم ہوئے کہ سقایہ اور حجاج کی میزبانی ہاشم کو ملی اور جنگ میں قیادت کا منصب عبدشمس کو ملا۔ [1] جب لوگوں کی نظر

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 1/172-181. ابن ہشام نے یہ روایت ابن اسحاق کے حوالے سے ◂◂

میں ہاشم کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا تو ان کا بھتیجا امیہ بن عبد شمس انؓ سے حسد کرنے لگا اور اس نے ان سے رفادہ کا عہدہ چھیننے کی کوشش کی مگر منہ کی کھائی۔ اس کی قوم کے بعض افراد نے اس کی شدید مذمت کی۔ اس پر وہ اور زیادہ مشتعل ہوا اور پہلے سے بڑھ کر حسد کرنے لگا۔

ہاشم کی وفات کے بعد ان کے بھائی مُطَّلِب نے سقایہ اور رفادہ کے عہدے سنبھالے۔ مطلب کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے جناب عبدالمطلب جانشین قرار پائے۔ جب وہ انتقال کر گئے تو حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ان عہدوں پر فائز ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد دونوں عہدوں پر انھی کو فائز رکھا۔

بنوعبدالدار نسل در نسل حجابہ، لواء اور دارالندوہ کی سربراہی کے وارث بنتے رہے۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجابہ کے عہدے پر انھی کو مامور رکھا اور کعبۂ مشرفہ کی چابی حضرت عثمان بن طلحہ کے سپرد فرما دی جو آج تک انھی کی نسل کے ہاتھ میں ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ یہ آیت اسی سلسلے میں نازل ہوئی تھی:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ ﴾

”بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حقداروں کو واپس کر دو۔“ [1]

جلیل القدر مفسر امام طبری کی نظر میں یہ قول ایسا بعید از صواب بھی نہیں ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں دیگر اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ [2]

یثرب: پہلے پہل یہاں عمالقہ رہتے تھے، پھر بعض یہودی قبائل ان پر غالب آ گئے اور

» بغیر سند کے نقل کی ہے۔ ابن ہشام کے علاوہ کسی مؤرخ نے بھی اس روایت کو بسند صحیح بیان نہیں کیا۔

[1] النسآء 4:58. تفسير الطبري:8/491-493. یہ ابن جریج کا قول ہے اور اس کی سند میں قدرے ضعف پایا گیا ہے۔ [2] تفسير الطبري (تحقيق أحمد شاكر):8/493. روایت کی سند کے متعلق مزید تفصیل فتح مکہ کے ضمن میں آ رہی ہے۔

وہاں رہنے لگے۔ یہ پہلی اور دوسری صدی عیسوی کی بات ہے، جب رومیوں نے شام کے علاقے میں یہودیوں کے خلاف جنگ کر کے انھیں ادھر ادھر منتشر کر دیا تو یہودیوں کے چند قبائل جن میں بنونضیر اور بنو قریظہ ممتاز تھے، یثرب آ کر رہنے لگے۔ مارب کا بند (ڈیم) ٹوٹنے کے بعد اوس وخزرج کے قبائل بھی یمن چھوڑ کر یہیں آ بسے۔ [1] کچھ عرصے تک یہودی اور اوس وخزرج نہ صرف اتفاق سے رہتے رہے بلکہ باہم معاہدے کر کے ایک دوسرے کے حلیف بھی بن گئے تا کہ ایک دوسرے سے کوئی خطرہ نہ رہے لیکن جب اوس اور خزرج کی شان وشوکت میں اضافہ ہونے لگا تو یہودی سارے معاہدے پس پشت ڈال کر ان پر چڑھ دوڑے۔ اوس وخزرج نے اپنے چچا زاد غسانیوں سے مدد طلب کی تو انھوں نے یہودیوں کے خلاف ان کی مدد کی۔ اس طرح یہودی پسپا ہو گئے۔ [2]

اوس وخزرج بھی شروع شروع میں اتفاق سے رہتے رہے لیکن بعد میں ان کے درمیان بھی طویل جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جن میں عموماً خزرج ہی غالب آتے رہے۔ بنو اوس نے بنو خزرج کے خلاف قریشیوں سے حلیفانہ معاہدہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ مجبوراً انھوں نے بنو قریظہ اور بنونضیر سے معاہدہ کر لیا۔ بنو خزرج کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے یہودیوں سے وضاحت طلب کی۔ یہودیوں نے کہہ دیا کہ ہمیں تمھاری باہمی جنگوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بنو خزرج نے ان سے چالیس جوان مانگ لیے تاکہ وہ بطور ضمانت ان کے پاس رہیں۔ یہودیوں نے یہ مطالبہ مان لیا۔ جب ان کے جوان خزرج کے قابو میں آ گئے تو انھوں نے یہودیوں کو اُلٹی میٹم دے دیا کہ یثرب خالی کر دو ورنہ ہم تمھارے جوان قتل کر دیں گے۔ یہود یثرب سے نکل جانے پر تیار ہو گئے لیکن کعب بن اسد قرظی نے انھیں قائل کر لیا کہ وہ یثرب نہ چھوڑیں، چاہے جوان قتل کر دیے جائیں۔ اور ایسا ہی ہوا۔ بنو خزرج نے ان کے چالیس جوانوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔

[1] إمتاع الأسماع للمقريزي: 105/1، والأغاني: 94/19. [2] صبح الأعشى للقلقشندي: 294/4.

یہودی طیش میں آ گئے۔ وہ علانیہ اوس کے حلیف بن گئے اور جنگ بعاث میں ڈٹ کر اوس کا ساتھ دیا۔ اس جنگ میں اوس غالب رہے۔ انھوں نے بنوخزرج کی بڑی تعداد قتل کر کے اگلے پچھلے سارے بدلے لے لیے۔ بالآخر دونوں فریق صلح پر آمادہ ہو گئے اور دونوں نے طے کر لیا کہ عبداللہ بن ابی ابن سلول خزرجی کی سرکردگی میں حکومت قائم کی جائے جو یثرب کے معاملات کنٹرول کرے۔ [1] ابھی وہ اس کی تیاریوں ہی میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ (یثرب) تشریف لے آئے اور یثرب کے تمام باشندے اسلام کے جھنڈے تلے آ گئے۔ عبداللہ بن ابی کے لیے یہ صورتحال بڑی روح فرسا تھی لیکن جنگ بدر کے بعد اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ ظاہری طور پر وہ بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائے۔ بعد کے واقعات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ پکا منافق تھا۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

عبداللہ بن ابی کے نفاق پر تمام محدثین، مفسرین اور مؤرخین متفق ہیں، البتہ اوس کا سردار ابو عامر بن صیفی بن نعمان، جو غسیلِ ملائکہ ابو حنظلہ کا والد تھا، بدستور کفر پر قائم رہا۔ وہ مدینہ سے نکل بھاگا اور مکہ چلا گیا۔ وہاں سے طائف کی راہ لی اور پھر رومیوں کے پاس شام جا پہنچا۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتا رہا کہ اسلام کو ختم کر دے۔ اس نے دورِ جاہلیت میں رہبانیت اختیار کر لی تھی، چنانچہ لوگ اسے راہب کہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَقُولُوا الرَّاهِبَ، وَلٰكِنْ قُولُوا الْفَاسِقَ»

"اسے راہب نہ کہو بلکہ فاسق کہو۔" [2]

غزوۂ احد کی تفصیلات میں اس کا مزید تذکرہ آئے گا۔

[1] وفاء الوفا بأخبار دار المصطفى للسمهودي: 1/215-219. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 3/97,98. ابن اسحاق نے اس واقعے کو مرسل سند سے روایت کیا ہے۔ دیگر مؤرخین اسے بغیر کسی سند کے بیان کرتے ہیں۔

طائف: طائف ''وَجّ'' کے نام سے معروف تھا۔وج بن عبدالحی وہاں رہنے والے عمالقہ میں سے ایک شخص کا نام تھا۔اس کے نام پر طائف کو بھی ''وج'' کہتے تھے، پھر وادیِ قریٰ سے قبیلہ ہوازن اٹھ کر یہاں آ گیا اور ان کے سردار قسی بن منبہ بن بکر بن ہوازن نے وج قبیلہ کے سردار عامر عدوانی کی بیٹی سے شادی کر لی۔ بعد میں یہی قسی ثقیف کے نام سے مشہور ہوا۔ جب ان لوگوں کی آبادی بڑھ گئی تو انھوں نے دیوار بنا کر ''وج'' کو قلعے کی شکل دے دی۔ چونکہ یہ دیوار چاروں طرف سے شہر کو گھیرے ہوئے تھی، اس لیے وہ اسے طائف کہنے لگے اور ''وج'' کے بجائے اس شہر کا نام طائف معروف ہو گیا۔ [1]

جب اسلام کا ظہور ہوا تو بنو ثقیف دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ایک کو بنو مالک اور دوسرے کو اَحلاف کہتے تھے۔ ان کی آپس میں دشمنی تھی۔ اس بنا پر ان میں جنگ چھڑ گئی۔اس جنگ میں احلاف غالب آ گئے اور انھوں نے بنو مالک کو طائف کے پیچھے ایک وادی حنین میں دھکیل دیا۔ بنو مالک نے اپنی جنگی قوت مضبوط کرنے کے لیے بعض قریبی قبائل سے حلیفانہ معاہدے کرنے کی سوچی اور احلاف کے خلاف دوس اور خثعم کے حلیف بن گئے۔لیکن اس کے بعد ان کے مابین کوئی بڑی جنگ نہیں ہوئی۔ [2]

جزیرہ نمائے عرب میں عربوں کی دینی حالت

بنو خزاعہ تقریباً تین سو سال یا بقول بعض مؤرخین پانچ سو سال تک کعبہ کے متولی رہے لیکن یہ نہایت ملعون لوگ ثابت ہوئے کیونکہ انھی کے دور میں ان کے سردار عمرو بن لحی کی وجہ سے حجاز میں بت پرستی کی لعنت شروع ہوئی جبکہ اس سے پہلے یہاں بت پرستی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ایک موقع پر عمرو بن لحی شام گیا۔ وہاں اس نے علاقہ بلقاء (15) میں

(15) بلقاء: عرب جغرافیہ دانوں نے یہ نام یا تو شرق اردن کے ان تمام علاقوں کے لیے استعمال کیا »

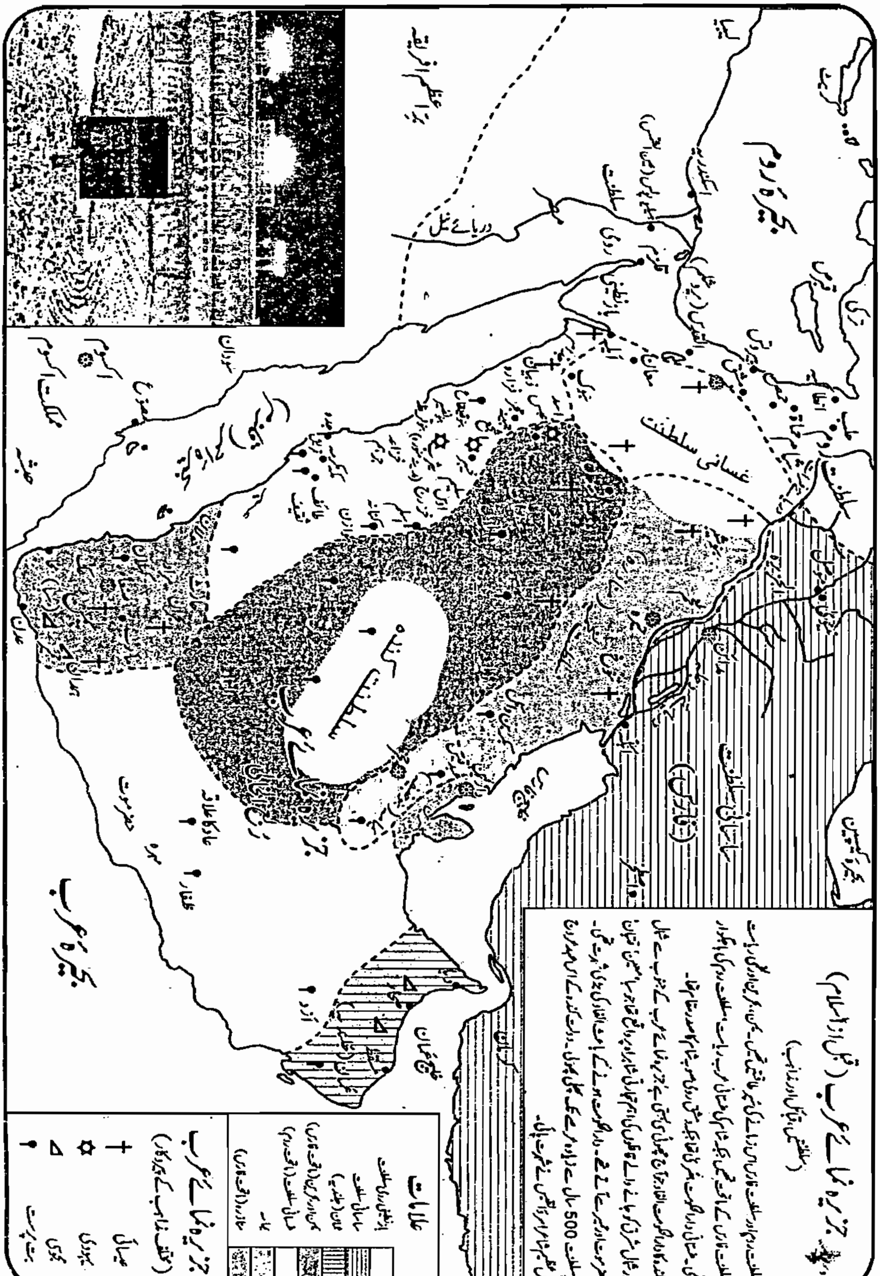
[1] معجم ما استعجم: 77,76/1. [2] الكامل في التاريخ: 254,253/1. اس روایت کی سند ضعیف ہے۔

مواب (جو آج کل اردن کا ایک علاقہ ہے) کے مقام پر عمالیق کو بتوں کی پوجا کرتے دیکھا۔ اس نے اس پوجا کی وضاحت چاہی۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ بتوں کی عبادت کا طریقہ ہے۔ ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ جب ہم ان سے بارش مانگتے ہیں تو یہ بارش برساتے ہیں۔ ہم ان سے مدد طلب کرتے ہیں تو یہ ہماری مدد کرتے ہیں۔ یہ سن کر احمق عمرو بن لحی نے ان سے ایک بت مانگ لیا۔ انھوں نے اسے ''ہبل'' نامی ایک بت دے دیا۔ وہ اسے مکہ لے آیا۔ اسے ایک جگہ نصب کر دیا اور لوگوں کو اس کی عبادت اور تعظیم کا حکم دیا۔ عمرو بن لحی ان کا غیر متنازعہ سردار تھا، اس لیے اہل مکہ نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ مزید برآں بنو اسماعیل دوسرے شہروں میں جا کر بسنے لگے۔ وہ جہاں جاتے اپنے ساتھ حرم کا کوئی پتھر بھی لے جاتے اور جس جگہ قیام کرتے وہیں پتھر رکھ کر اس کے گرد طواف کرنے لگتے۔ یہ معاملہ آہستہ آہستہ اس حد تک پہنچ گیا کہ وہ جس خوبصورت پتھر کو دیکھتے اس کی پوجا کرنے لگتے۔ بعد میں آنے والی نسلیں بھی بت پرستی کی روش پر قائم رہیں اور دین ابراہیمی کی تعلیمات کو بھلا دیا گیا۔[1]

دومۃ الجندل میں بنوکلب بن وبرہ کا بت وَد نصب تھا۔ رُہاط مقام پر بنو ہذیل کا بت سُواع تھا۔ بنو طے کے ایک قبیلے بنوانعم اور بنو مذحج کے جُرش میں رہنے والے لوگوں کا بت یغوث تھا جو جرش میں نصب تھا۔ ہمدانی قبیلے بنو خیوان کا بت یعوق اور حمیری قبیلہ

» ہے جو قدیم عمون مآب یا جلیاد (Gilead) کے برابر ہے یا اس کے وسطی حصے کے لیے جس کا مرکزی شہر مختلف وقتوں میں عمان، حسبان (ES/bus) یا السلط رہا ہے۔ یہ شمال میں وادئ زرقا اور جنوب میں وادی الموجب (ارنون Arnon) کے مابین واقع ہے۔ سقوط دمشق اور عمان کی سپر اندازی کے کچھ ہی عرصے کے بعد یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نے اسی علاقے کو فتح کر لیا تھا، دیکھیے: (اردو دائرہ معارف اسلامیہ: 822/4)

[1] السیرۃ النبویۃ لابن هشام: 121/1۔ ابن ہشام نے یہ کہہ کر کہ ''مجھ سے بعض اہل علم نے بیان کیا'' یہ روایت بغیر سند کے درج کی ہے۔ ابن ہشام ہی کے حوالے سے حافظ ابن کثیر نے یہ روایت نقل کی ہے، دیکھیے: (البدایة والنهایة: 205/2) دیگر مؤرخین نے اس روایت کو ضعیف اسانید کے ساتھ بیان کیا ہے۔


بحیرۂ روم
غسانی سلطنت
دریائے نیل
جزیرہ نمائے عرب

ذوالکلاع کا بت نسر تھا۔[1] یہ بت وہی تھے جن کی پوجا حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کرتی تھی۔
اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

﴿ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا ۙ وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ۚ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا ۖ ﴾

''اور انھوں نے کہا: تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی ود کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث، یعوق اور نسر کو۔ اور انھوں نے بہتوں کو گمراہ کیا۔''[2]

غرض اسماعیل علیہ السلام کی نسل نے دین ابراہیمی فراموش کر دیا اور ان بتوں کی پوجا شروع کر دی۔ (16) بنوخولان کا بھی ایک بت تھا جسے وہ ''عَمّ أَنَس یا عُمیَانِس'' کہتے تھے اور اپنے جانوروں اور کھیتوں میں سے اس کا حصہ مقرر کرتے تھے۔ انھی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

(16) قومِ نوح کی اصنام پرستی: امام بخاری رحمہ اللہ نے قومِ نوح کی اصنام پرستی کے متعلق عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے قدرے تفصیل درج کی ہے، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے کہ قوم نوح کے اصنام جو بعد میں مشرکین عرب کو منتقل ہوئے، دراصل ان کی قوم کے چند نیک طینت اشخاص کے ناموں پر تراشے گئے تھے۔ اس کا آغاز یوں ہوا کہ جب قوم نوح کے یہ پاکباز افراد وفات پا گئے تو شیطان نے قوم کے دلوں میں یہ گمراہ کن خیال ڈال دیا کہ عام طور پر جہاں تمھاری مجالس منعقد ہوتی ہیں وہاں تم مورتی وغیرہ کی شکل میں مرنے والے نیک لوگوں کی یادگاریں تعمیر کرو اور ان کے نام مرنے والوں کے نام پر رکھو۔ قوم نے ایسا ہی کیا۔ لیکن انھوں نے یادگاروں کی تعمیر ہی پر اکتفا کیا اور ان کی عبادت نہ کی۔ اگلی نسلوں نے جبکہ علم مٹ چکا تھا، ان یادگاروں کو پوجنا شروع کر دیا، دیکھیے: (صحیح البخاري، التفسیر، باب: ﴿وَدًّا وَلَا سُوَاعًا ۙ وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ﴾، حدیث: 4920) حافظ ابن حجر نے لکھا: ''پھر جب طوفان نوح آیا تو یہ اصنام مٹی تلے دب گئے اور ایک مدت یونہی مدفون رہے حتی کہ شیطان انھیں نکال کر مشرکین عرب کے ہاں لے آیا۔'' دیکھیے: (فتح الباري: 312/18)

[1] السیرۃ النبویۃ لابن هشام: 1/123-132۔ ابن ہشام نے یہ روایت محمد بن اسحاق کے حوالے سے بلاسند نقل کی ہے، بنابریں یہ روایت ضعیف ہے۔ [2] نوح 71:23،24.

﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا﴾

''اورانھوں نے اس میں سے اللہ کے لیے ایک حصہ ٹھہرایا جو اس نے کھیتی اور چوپایوں کی شکل میں پیدا کیا۔'' [1]

کنانہ کے ایک قبیلے بنو ملکان کا بھی ایک بت تھا جس کا نام ''سعد'' تھا۔ دوس قبیلے میں عمرو بن حُمَمہ دوسی کا ایک الگ بت تھا۔ قریش نے مقام زمزم پر ہبل کے ساتھ ساتھ ''إساف'' اور ''نائلہ'' نامی بت بھی رکھے ہوئے تھے۔ وہ ان کے پاس اونٹ ذبح کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''ہم تو یہی سنتے آئے ہیں کہ اساف اور نائلہ جرہم قبیلہ کے مرد و عورت تھے۔ ان دونوں نے کعبہ میں بدکاری کی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں پتھر بنا دیا۔'' [2]

ان بڑے بتوں کے علاوہ ہر گھرانے میں کوئی نہ کوئی بت موجود تھا جس کی تمام اہلِ خانہ عبادت کرتے تھے۔ سفر پر جاتے وقت سب سے آخری اور واپسی کے وقت اولین کام ان بتوں ہی کو ہاتھ لگانا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو توحید کا پیغام دے کر بھیجا تو انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بڑی حیرت سے کہا:

﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝﴾

''کیا اس نے تمام معبودوں کو ایک معبود بنا دیا؟ یہ تو بڑے ہی تعجب کی بات ہے۔'' [3]

صحیح بخاری میں ابو رجاء عطاردی سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ''ہم زمانۂ جاہلیت میں پوجا کے لیے جب کوئی پتھر نہ پاتے تو مٹی کا ایک ڈھیر ہی بنا لیتے تھے، پھر ایک بکری لاتے اور اس ڈھیر پر بکری کا دودھ دوہتے، پھر اس کے گرد طواف کرتے تھے۔'' [4]

حافظ ابن کثیر نے بہت سی صحیح احادیث کے حوالے سے بتایا ہے کہ عربوں میں بت پرستی

[1] الأنعام6:136. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 127/1. ابن اسحاق نے اسے بسند حسن روایت کیا ہے۔ [3] صٓ 38:5. [4] صحيح البخاري، المغازي، باب وفد بني حنيفة، وحديث ثمامة بن أثال، حديث:4376.

کا رواج عمرو بن لحی ہی نے ڈالا تھا۔ عرب اس کے پیچھے لگ گئے اور گمراہی میں جا پڑے۔[1]
ان احادیث میں سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«رَأَيْتُ عَمْرَو بْنَ عَامِرٍ الْخُزَاعِيَّ [أَيْ عَمْرَو بْنَ لُحَيٍّ] يَجُرُّ قُصْبَهُ فِي النَّارِ، كَانَ أَوَّلُ مَنْ سَيَّبَ السَّوَائِبَ»

"میں نے عمرو بن عامر خزاعی (عمرو بن لحی) کو جہنم کی آگ میں دیکھا، وہ اپنی آنتیں گھسیٹ رہا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے بتوں کے نام پر جانور چھوڑے۔"[2]

ابن اسحاق کی روایت میں یہی بات زیادہ تفصیل سے بتائی گئی ہے۔ اس کی سند بھی صحیح ہے۔ اس کے الفاظ ہیں: "اسی شخص نے سب سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین کو تبدیل کیا۔ بت نصب کیے، بتوں کے نام پر جانوروں کے کان کاٹے، بتوں کے نام پر جانور آزاد کیے، وصیلہ اور حام نام رکھ کر انھیں کھلا چھوڑا۔"[3]

اللہ تعالیٰ نے کئی ایک آیات میں ان چیزوں کی تردید فرمائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ﴾

"اور اپنی زبانوں کے جھوٹ بیان کرنے کی بنا پر یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تاکہ تم اللہ پر جھوٹ باندھو۔"[4]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "اگر تم عربوں کی جاہلیت سے آگاہی حاصل کرنا

---

[1] البداية والنهاية:2/207,206. [2] صحيح البخاري، المناقب، باب قصة خزاعة، حديث: 3521، وصحيح مسلم، الجنة وصفة نعيمها......، باب النار يدخلها الجبارون......، حديث: 2856. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 1/121. [4] النحل 16:116.

چاہو تو سورۂ انعام کی آیت:130 کے بعد کی آیات پڑھو۔''[1]

ان آیات میں عربوں کی بت پرستی اور معاشرے میں اس کے مہلک اثرات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔

عربوں میں دین ابراہیمی کی چند باتیں ہی باقی رہ گئی تھیں، مثلاً: بیت اللہ کی تعظیم، طواف، حج، عمرہ، وقوف عرفات و مزدلفہ اور حرم میں قربانی کے جانور بھیجنا وغیرہ، اگرچہ ان عبادات میں بھی وہ اپنی طرف سے بہت سی بدعات ملا چکے تھے، مثلاً: بنوکنانہ اور قریش حج و عمرہ میں لبیک یوں کہتے:

«لَبَّيْكَ، اَللّٰهُمَّ! لَبَّيكَ، لَا شَرِيكَ لَكَ إِلَّا شَرِيكًا هُوَ لَكَ، تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ»

''حاضر ہوں اے اللہ! تیرے حضور حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک جو تیرا اپنا ہے۔ تو اس کا اور اس کی تمام مملوکہ اشیاء کا مالک ہے۔''

چنانچہ وہ لبیک کہہ کر توحید کا اقرار کرتے تھے مگر فوراً ہی بتوں کو بھی شامل کر لیتے تھے اور ان کی ملکیت اللہ کے نام کر دیتے تھے۔ (17) مزید برآں وہ سیٹیاں بجاتے ہوئے

(17) تلبیہ میں شرک: ابن ہشام نے ان تفصیلات کو ابن اسحاق کے حوالے سے بلا سند درج کیا ہے۔ تلبیہ میں شرک کی آمیزش کرنے کی روایت محدّث بزار نے بسند حسن نقل کی ہے جس کے الفاظ ہیں: ''شیطان لوگوں سے گمراہ کن باتیں کیا کرتا تھا، وہ انھیں اسلام کے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے تلبیہ میں کچھ الفاظ کا اضافہ کر دیا کہ ''حاضر ہوں، اے اللہ! حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں سوائے اس شریک کے جو تیرا اپنا ہے، تو اس کا اور اس کی مملوکہ اشیاء کا مالک ہے۔'' شیطان اپنی کوشش میں مصروف رہا حتی کہ اس نے لوگوں کو اسلام کے راستے سے ہٹا کر شرک پر لگا دیا۔'' دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام 122/1، وكشف الأستار: 15/2) محدث ہیثمی نے لکھا ہے کہ اس روایت کی سند کے رجال صحیح کے رجال ہیں، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 223/3) الشیخ طرہونی رقم طراز ہیں: اس ◄◄

[1] تفسير الطبري (تحقيق أحمد شاكر): 155/12، حديث: 13953.

برہنہ حالت میں طواف کرتے تھے۔

عربوں نے کعبہ کے ساتھ ساتھ کئی بت خانے بھی بنا رکھے تھے اور ان کی کعبہ ہی کی طرح تعظیم کرتے تھے۔ ان کی بھی سدانت اور حجابت ہوتی تھی۔ وہاں بھی جانور لے جا کر ذبح کیے جاتے تھے۔ ان کا طواف بھی کیا جاتا تھا اور ان کے نام پر جانور بھی چھوڑے جاتے تھے، مثلاً: قریش اور بنو کنانہ کا خصوصی بت ''عزیٰ'' نخلہ کے مقام پر تھا۔ اس کے خادم اور نگران بنو ہاشم کے حلفاء بنو شیبان تھے۔ بنو ثقیف کا خصوصی بت ''لات'' طائف میں تھا۔ اس کے خادم اور نگران بنو معتّب تھے۔ اوس و خزرج اور ان کے ہم مسلک لوگوں کا خصوصی بت ''منات'' قُدَید میں مُشلَّل کے مقام پر تھا۔ قرآن مجید نے ان بتوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

﴿ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ ﴾

''تم مجھے لات اور عزیٰ کی خبر دو۔ اور تیسری (دیوی) منات کی جو گھٹیا ہے۔''[1]

دَوْس، خَثْعم، بَجِیلة اور ان کے علاقے کے دیگر لوگوں کا بت ''ذُوالْخَلَصَة'' تَبالَة کے مقام پر تھا۔ اسے ''یمنی کعبہ'' کہتے تھے۔ اُس سے ممتاز کرنے کے لیے اصل کعبہ کو ''شامی کعبہ'' کہا جاتا تھا۔ بنو طے اور طے کے پہاڑوں ''أجا'' اور ''سلمیٰ'' میں رہنے والوں کا بت خانہ ''فَلْس'' تھا۔ حمیرَ اور یمن والوں کا بت خانہ ''رِئَام'' تھا۔ بنو بکر اور بنو تغلب کا بت خانہ ''ذوالکعبات'' مقام سَنْدَاد میں تھا۔[2]

» روایت کی سند رباعی، یعنی چار طبقات پر مشتمل ہے، قتادہ نے عن کے ذریعے سے روایت کی ہے، تاہم یہاں نرمی برتی جائے گی خاص طور پر جبکہ اس کی تائید میں شواہد موجود ہیں، دیکھیے: (صحیح السیرة النبویة لابن طرھوني: 315/1) مختلف قبائل کے تلبیہ کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: (تاریخ الیعقوبي: 256,255/1)

[1] النجم 20,19:53. [2] عرب کے ان صنم کدوں کے متعلق مزید تفصیل فتح مکہ کے بیان کے بعد آ رہی ہے جب انھیں منہدم کیا گیا۔

عربوں میں اور بھی کئی بت تھے۔ پرانی کتابیں ان کے ذکر سے بھری پڑی ہیں۔[1] بتوں کے بارے میں عربوں کے خیالات سے وابستہ بعض عجیب وغریب داستانیں مشہور ہیں، مثلاً: مروی ہے کہ سائب بن عبداللہ کے پاس ایک پتھر تھا جسے اس نے گھڑ کر بت بنا لیا تاکہ اس کی عبادت کیا کرے۔ وہ ہر روز جما ہوا دودھ لا کر اس پر بہا دیتا۔ ایک کتا آتا، اسے چاٹتا اور پھر ٹانگ اٹھا کر اس پر پیشاب کر دیتا تھا۔[2] اسی طرح مروی ہے کہ بنوحنیفہ نے پنیر، گھی اور کھجوروں کا حلوہ سا بنا کر اس کا ایک بت بنا رکھا تھا۔ جب قحط پڑا تو بھوک سے بلبلا کر انھوں نے خود ہی اس بت کو کھا کر ختم کر دیا۔ بنوتمیم کے ایک آدمی نے انھیں شعروں میں یوں شرم دلائی:

أَكَلَتْ رَبَّهَا حَنِيفَةُ مِنْ جُوعٍ قَدِيمٍ بِهَا وَمِنْ إِعْوَازِ

"بنوحنیفہ نے اپنی قلاشی اور بھوک کی بنا پر اپنے رب ہی کو کھا لیا۔"

ایک اور شاعر نے کہا:

أَكَلَتْ حَنِيفَةُ رَبَّهَا زَمَنَ التَّقَحُّمِ وَالْمَجَاعَةِ

لَمْ يَحْذَرُوا مِنْ رَّبِّهِمْ سُوءَ الْعَوَاقِبِ وَالتَّبَاعَةِ

"بنوحنیفہ نے بھوک اور شدت کے وقت اپنے رب کو کھا لیا اور یہ قبیح کام کرتے وقت انھیں اپنے رب کی طرف سے انجام بد اور انتقام کا ذرا بھی خوف نہ رہا۔"[3]

ایک آدمی کا قصہ آتا ہے کہ اس نے دو لومڑوں کو اپنے بت پر پیشاب کرتے دیکھا تو اس بت کی ہجو میں اشعار کہے۔[4]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قصہ بھی مشہور ہے کہ انھوں نے دور جاہلیت میں کھجور

---

[1] تاريخ اليعقوبي: 255/1 ومابعدها. [2] الفتح الرّباني في ترتيب مسند أحمد الشيباني: 200/20. اس روایت کی سند صحیح ہے۔ [3] المَعَارف لابن قتيبة، ص: 621. اس روایت کی سند ضعیف ہے۔ [4] الطبقات الكبرىٰ: 307/1-309.

کے حلوے سے بنے ہوئے اپنے بت کو بھوک کی شدت کی وجہ سے ہڑپ کرلیا۔ یہ قصے کہانیاں معیار حدیث کے مطابق صحیح نہ بھی ہوں تب بھی اس دور کے عربوں کی خوئے جہالت کی خوب تصویر کشی کرتی ہیں۔

عرب علاقوں میں بت پرستی کے ساتھ ساتھ ستاروں اور سیاروں کی عبادت بھی کی جاتی تھی۔ خصوصاً حران، بحرین اور صحرائی علاقے میں یہ وبا عام تھی۔ یہ بھی منقول ہے کہ مکہ میں ابو کبشہ نامی ایک شخص تھا جو شعریٰ ستارے کی پوجا کرتا تھا بلکہ اس نے قریش کو بھی اس کی ترغیب دلائی تھی حتی کہ یہ عبادت لخم، خزاعہ اور قریش کے بعض قبائل میں بھی رواج پا گئی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو بت پرستی چھوڑ کر ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دی تو انھوں نے آپ کو ''ابن ابی کبشہ'' (ابو کبشہ کا بیٹا) کا لقب اسی بنا پر دیا تھا کیونکہ ابو کبشہ نے بھی اس سے قبل بتوں کی عبادت کی مخالفت کی تھی اور آپ ﷺ بھی بتوں کی عبادت کی مخالفت کرتے تھے۔[1]

یمن کے علاقے میں سورج کی پوجا کی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ملکہ سبا کے قصے میں فرمایا:

﴿ اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِیْمٌ ○ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا یَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ فَهُمْ لَا یَهْتَدُوْنَ ○ ﴾

''(ہدہد نے کہا:) بلاشبہ میں نے دیکھا کہ ایک عورت ان پر حکومت کرتی ہے اور اسے (ضرورت کی) ہر چیز عطا کی گئی ہے اور اس کا ایک عظیم تخت ہے۔ میں نے اسے اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ (تعالیٰ) کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے پرکشش بنا دیے ہیں اور انھیں راہ (حق) سے روک دیا ہے، چنانچہ وہ ہدایت نہیں پاتے۔''[2]

[1] بلوغ الأرب في أحوال العرب للآلوسي: 239/2. [2] النمل 27: 23، 24.

بعض مجوسی فرقے بھی عرب علاقوں میں گھل مل گئے تھے۔ ابن قتیبہ لکھتے ہیں: ”بنوتمیم میں مجوسیت کے جراثیم موجود تھے۔ ان میں زرارہ اور حاجب بن زُرارہ مجوسی تھے۔ قریش میں زندیقیت کے اثرات بھی تھے جو انھوں نے حیرہ سے حاصل کیے تھے۔ اقرع بن حابس اور وکیع بن حسان کا دادا ابوسود مجوسی ہو چکے تھے۔“[1] مجوسیت کے اثرات بحرین کے علاوہ ”ہجر“ میں بھی پہنچ چکے تھے۔[2] وہ کہا کرتے تھے: ”اگر ہمارا دشمن ہماری زمین پر مارا گیا تو وہ ہماری زمین ناپاک کر دے گا۔“[3]

عرب علاقوں میں یہودیت بھی داخل ہو چکی تھی، خصوصاً مدینہ، خیبر، وادی القریٰ، فَدک (18) اور تیماء (19) میں تو اس کے اثرات دور تک پھیل گئے۔ یہودیت یمن میں بھی جا پہنچی تھی حتی کہ حمیری بادشاہ ذونواس بھی یہودیت قبول کر چکا تھا اور اس نے تمام عیسائیوں کو جبراً یہودی بنانے کے احکام جاری کیے تھے جیسا کہ ہم تفصیل ذکر کر چکے ہیں۔ اسی طرح بنوکنانہ، بنوحارث بن کعب اور کندہ میں یہودیت پاؤں جما چکی تھی۔ غالب امکان یہ ہے کہ ان لوگوں میں یہودیت یثرب اور خیبر کے یہودیوں کے ذریعے سے پہنچی تھی۔[4]

شام کے غساسنہ (غسانی) اور یمن کے مَناذرہ (آلِ مُنذر) مسیحیت کا شکار ہو چکے تھے۔ حیرہ میں بڑے بڑے گرجے تھے، مثلاً: ”دیرِ ہند الاقدم“، ”دَیرِ لُج“ اور ”دیرِ مارۂ مریم“۔[5] جزیرۂ عرب کے جنوبی علاقوں میں بھی عیسائیت پھیل چکی تھی۔ ایک بہت بڑا گرجا ”ظفار“

(18) فدک: یہ خیبر کے مشرق میں ایک بستی تھی جو آج کل ”حائل“ میں ”حائط“ کے نام سے معروف ہے۔
(19) تیماء: یہ سعودی عرب کے صوبہ تبوک کا مشہور شہر ہے جو خیبر کے شمال میں حفيرة العيد کے راستے پر تقریباً 230 میل دور ہے۔

[1] المعارف، ص: 621. [2] صحيح البخاري، الجزية والموادعة، باب الجزية والموادعة مع أهل الذمة والحرب، حديث: 3157. [3] المستدرك للحاكم: 451/3. اس روایت کی سند صحیح ہے۔
[4] بلوغ الأرب في أحوال العرب: 241/2. [5] معجم ما استعجم: 606/2 و 595/2 و 604/2. یاقوت نے دیرِ ہند الاقدم کا نام دیرِ ہند الکبریٰ لکھا ہے، دیکھیے: (معجم البُلدان: 709/2)

میں اور دوسرا ''عدن'' میں قائم تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ میں اور پھر مدینہ میں نجران کے عیسائیوں کے مکالمے کا واقعہ آگے آ رہا ہے۔

بعض قریشی قبائل بھی عیسائیت قبول کر چکے تھے، مثلاً: بنو اسد بن عبدالعزّٰی، بنو تمیم میں سے امرؤ القیس کا خاندان، ربیعہ میں سے بنو تغلب اور بنو قضاعہ کے بعض قبائل بھی حلقہ بگوش عیسائیت ہو چکے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ براہ راست رومیوں سے متأثر ہوتے تھے۔[1] عدی بن حاتم طائی بھی تحریف شدہ عیسائیت کے غلام بن چکے تھے۔[2]

اس کے باوجود عیسائیت اور یہودیت عرب میں وسیع پیمانے پر نہیں پھیلی تھیں جیسا کہ ان مذاہب کی تاریخ سے واضح ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دین ابراہیمی بھی مکمل طور پر نہیں مٹا تھا بلکہ جہالت اور بت پرستی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھی کچھ افراد دین حنیف پر قائم تھے۔ ہر چند بہت کم تھے۔ ان سعادت مند لوگوں کو ''حنفاء'' کہا جاتا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان رکھتے تھے۔ توحید الوہیت اور توحید ربوبیت کے قائل و عامل تھے اور نبوت کے منتظر تھے۔[3] مثلاً: قُس بن ساعدہ اِیادی، زید بن عمرو بن نفیل، امیہ بن ابی الصّلت، ابوقیس بن ابی انس، خالد بن سنان، نابغہ ذُبیانی، زہیر بن ابی سُلمٰی اور نبیٔ اکرم ﷺ کے جدامجد کعب بن لؤی بن غالب وغیرہ۔[4]

ان لوگوں کو ٹھیک اسی طرح حنفاء کہا گیا جس طرح قرآن مجید میں دین ابراہیمی کو حنیف کہا گیا ہے، مثلاً:

﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴾

[1] تاریخ الیعقوبی: 214/1، وبلوغ الأرب في أحوال العرب: 241/2، والمعارف، ص: 621. ان سب روایات کی اسانید ضعیف ہیں۔ [2] مسند أحمد: 378,377/4. اس روایت کی سند حسن ہے۔
[3] بلوغ الأرب في أحوال العرب، ص: 287-349. یہ روایت ضعیف ہے۔ [4] البدایة والنهایة: 230/2-266.

’’بے شک میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف مرکوز کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، میں اسی (اللہ) کا پرستار ہوں اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔‘‘[1]

اور فرمایا:

﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾

’’ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ صرف حق پرست، فرمانبردار تھے اور مشرکوں میں سے نہیں تھے۔‘‘[2]

ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۣ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾

’’کہہ دیجیے: اللہ نے سچ فرمایا، پس تم ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو حق پرست تھا اور وہ مشرکین میں سے نہ تھا۔‘‘[3]

یہاں ہم تھوڑی دیر کے لیے رک کر اس دور کے مشہور حنفاء کے حالات اور اعتقادات کا جائزہ لیتے ہیں:

حضرت محمد ﷺ: یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان حنفاء میں سرِفہرست اور عظیم ترین شخصیت ہیں۔

زید بن عمرو بن نفیل: ابن اسحاق نے اپنی سند سے روایت کی ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے کہا: ’’میں نے زید بن عمرو بن نفیل کو دیکھا۔ انھوں نے اپنی کمر بیت اللہ کی دیوار کے ساتھ لگا رکھی تھی اور وہ کہہ رہے تھے: ’’اے قریشیو! قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میرے علاوہ تم میں سے کوئی بھی ابراہیمی دین پر نہیں ہے۔‘‘ پھر وہ کہتے: ’’اے اللہ! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تجھے عبادت کا کون سا طریقہ زیادہ

[1] الأنعام 6:79. [2] اٰل عمرٰن 3:67. [3] اٰل عمرٰن 3:95.

پسند ہے تو میں اسی طریقے سے تیری عبادت کرتا لیکن مجھے معلوم نہیں۔'' پھر اپنی سواری پر سجدہ کر دیتے۔ وہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے اور کہتے: ''میرا معبود وہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا معبود ہے اور میرا دین ابراہیمی دین ہے۔''

وہ زندہ درگور کی جانے والی بچیوں کو بچانے کی بڑی کوشش کرتے تھے۔ جب کوئی شخص اپنی بیٹی کو قتل کرنے لگتا تو وہ اس سے کہتے: ''اسے قتل نہ کر، میرے سپرد کر دے، میں اس کی پرورش کروں گا۔ جب یہ بالغ ہو جائے گی تو پھر چاہے تُو لے لینا یا چاہے مجھے دے دینا۔''[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالے سے بیان کیا ہے: ''زید بن عمرو بن نفیل صحیح دین کی جستجو میں شام کی طرف نکل گئے۔ وہاں ایک یہودی عالم سے ملے اور اس سے ان کے دین کے بارے میں پوچھا تا کہ اسے اختیار کر سکیں، وہ کہنے لگا: ''آپ ہمارے دین پر آنا چاہیں تو آپ کو اپنے حصے کے مطابق اللہ تعالیٰ کا غضب قبول کرنا پڑے گا۔'' زید کہنے لگے: ''میں تو اللہ کے غضب سے بچنے کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کا غضب برداشت نہیں کر سکتا۔ کیا آپ مجھے کوئی اور دین بتا سکتے ہیں؟''

وہ کہنے لگا: ''میرے علم کے مطابق تو وہ دین حنیف ہی ہو سکتا ہے۔'' زید کہنے لگے: ''حنیف کیا ہے؟'' وہ کہنے لگا: ''ابراہیم علیہ السلام کا دین، وہ یہودی تھے نہ عیسائی، وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے تھے۔'' زید وہاں سے نکلے تو ایک عیسائی عالم سے ملاقات ہو گئی۔ اس سے بھی وہی باتیں ہوئیں جو یہودی عالم سے ہوئی تھیں۔ جب زید نے دیکھا کہ یہ دونوں دینِ ابراہیم ہی کی بات کرتے ہیں تو وہ چل پڑے۔ باہر سر راہ آ گئے، دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہنے لگے: ''اے اللہ! میں تجھے گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں

[1] البدایة والنهایة: 258/2. اس کی سند حسن ہے۔ اس روایت کا نصف اول ''پھر اپنی سواری پر سجدہ کر دیتے'' تک ابن ہشام میں بھی موجود ہے جس کی سند حسن ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 287/1)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہوں۔''[1]

زید قریش کا ذبح کیا ہوا جانور کھانے سے انکار کر دیتے تھے۔ فرماتے تھے: ''میں اس جانور کا گوشت نہیں کھا سکتا جسے تم اپنے آستانوں پر ذبح کرتے ہو۔ میں تو صرف وہی جانور کھا سکتا ہوں جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔'' وہ غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنے کی وجہ سے قریش کی شدید مذمت کرتے ہوئے فرماتے تھے: ''بکری کو اللہ نے پیدا فرمایا، اس کے لیے آسمان سے پانی اتارا اور زمین سے نباتات اگائیں، پھر بھی تم اسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہو؟'' وہ اسے بہت قبیح جرم خیال کرتے تھے اور اس کا سختی سے انکار کرتے تھے۔[2]

کچھ دوسری احادیث بھی ہیں۔ وہ اگرچہ ضعیف سندوں سے مروی ہیں مگر ایک دوسری کے موافق ہونے کی وجہ سے اور صحیح بخاری کی احادیث کی تائید کے باعث حسن لغیرہ کے درجے تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت زید صحیح دین کی طلب اور تڑپ میں جگہ جگہ پھرتے تھے۔ بالآخر وہ دین ابراہیم ہی پر جم گئے تھے۔[3]

اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا:

«يُحْشَرُ ذَاكَ أُمَّةً وَّحْدَهُ بَيْنِي وَبَيْنَ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ»

''وہ میرے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان اکیلے ایک امت کی حیثیت سے اٹھائے جائیں گے۔''[4]

آپ نے یہ بھی فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب حديث زيد بن عمرو بن نفيل، حديث:3827.

[2] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب حديث زيد بن عمرو بن نفيل، حديث:3826.

[3] البداية والنهاية:2/260-265، والطبقات الكبرٰى:1/161,162. [4] البداية والنهاية:2/262. ابن کثیر نے کہا: ''اس کی سند جید اور حسن ہے۔''

«دَخَلْتُ الْجَنَّةَ فَرَأَيْتُ لِزَيْدِ بْنِ عَمْرٍو دَوْحَتَيْنِ»

''میں جنت میں داخل ہوا تو میں نے دو بڑے درخت دیکھے جو زید بن عمرو کی ملکیت تھے۔'' [1]

حضرت زید کو رسول اللہ ﷺ سے شرف ملاقات حاصل ہوا تھا لیکن وہ آپ کی بعثت سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ [2]

ورقہ بن نوفل: روایت ہے کہ ورقہ بن نوفل بھی صحیح دین کی تلاش میں حضرت زید بن عمرو بن نفیل کے ساتھ گئے تھے۔ تلاش و جستجو سے تھک کر وہ عیسائی ہو گئے مگر حضرت زید نے سوائے دین ابراہیمی کے کسی دین کو پسند نہیں کیا۔ [3]

نبی کریم ﷺ نے نبوت ملنے سے پہلے کے زمانے میں ایک دن حضرت خدیجہ سے کہا: ''مجھے کچھ روشنی سی نظر آتی ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہیں یہ جنوں کی کارستانی نہ ہو۔'' انھوں نے آپ کو اطمینان دلایا، پھر آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں اور ساری بات بیان کی۔ ورقہ کہنے لگے: ''اگر یہ بات سچی ہے تو یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترا کرتا تھا۔ اگر یہ میری زندگی میں نبی بن گئے تو میں ان کی حمایت کروں گا، مدد کروں گا اور ان پر ایمان بھی لاؤں گا۔'' [4]

ورقہ بن نوفل کا مفصل تذکرہ اور ان کے اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں وارد شدہ احادیث کے حوالے ان شاء اللہ آئندہ ابواب میں آئیں گے جہاں نزول وحی اور اولین مسلمانوں کا تذکرہ ہوگا۔ توحید اور بعث بعد الموت (موت کے بعد جی اٹھنے) کے

[1] البداية والنهاية:263/2. اس روایت کی سند جید ہے۔ [2] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب حديث زيد بن عمرو بن نفيل، حديث:3826. [3] مسند أبي داود الطّيالسي (ترتيب البنا): 161/2. روایت ضعیف ہے، تاہم بعض دوسری روایات اس کی تائید کرتی اور اسے تقویت بخشتی ہیں۔ [4] الفتح الرّبّاني:207/20. روایت کی سند حسن ہے۔ امام احمد نے اسے ایک بار مرسل سند سے اور بار دگر متصل سند سے روایت کیا ہے۔

موضوع پر ان کے نہایت عمدہ اشعار جہاں تہاں منقول ہیں۔ [1]

قُس بن ساعدہ الِایادی : حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابۂ کرام سے روایت ہے کہ جب بنو اِیاد کا وِفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان سے قس بن ساعدہ کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ فوت ہو چکے ہیں۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے ایک دن عکاظ کے میدان میں انھیں سرخ اونٹ پر سوار بڑی عمدہ اور سحر انگیز گفتگو کرتے سنا تھا مگر وہ الفاظ میرے ذہن میں نہیں۔''

وفد میں سے ایک آدمی نے بتایا کہ اسے وہ الفاظ یاد ہیں اور وہ الفاظ یہ تھے: ''اے لوگو! اکٹھے ہو جاؤ، میری بات سنو، جو شخص مر گیا، گزر گیا۔ اور جو چیز آنے والی ہے آ کر رہے گی۔ اندھیری رات، برجوں والا آسمان، ٹھاٹھیں مارتا سمندر، جھلملاتے ستارے، جمے ہوئے پہاڑ اور بہتے دریا دلالت کرتے ہیں کہ آسمانوں میں ان سے بھی بڑے بڑے نشانات ہیں۔ آخر کیا بات ہے کہ لوگ جاتے نظر آتے ہیں مگر واپس کوئی نہیں آتا۔ کیا وہ وہاں مستقل رہنے کے خواہش مند ہیں کہ وہیں ٹک گئے یا انھیں وہاں رکھ لیا گیا اور وہ وہیں سو گئے؟ قس اللہ تعالیٰ کی ایسی قسم کھاتا ہے جس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اصل دین تم لوگوں کے دین سے بے انتہا اچھا ہے۔'' پھر اس کے بارے میں انھوں نے چند اشعار بھی پڑھے۔ [2]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی واقعہ وفد عبدالقیس کی آمد کے حوالے سے بیان کیا۔ [3]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 295,294/1. یہ ابن اسحاق کی بلا سند روایت ہے جو ضعیف ہے۔

[2] البداية والنهاية: 251,250/2. ابن کثیر نے یہ روایت خرائطی کے حوالے سے نقل کی ہے جس کی سند ضعیف ہے۔ امام بیہقی کی روایت کے راوی انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ ابن کثیر کی روایت کے مماثل ہے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 101/2)

[3] البداية والنهاية: 251/2، و دلائل النبوة للبيهقي: 104/1. اس روایت کی سند خاصی ضعیف ہے۔

حافظ ابن کثیر اور امام بیہقی نے اس قسم کی دیگر روایات بیان کی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قُس دین حنیف کے پیروکار تھے۔ انھوں نے اس امر کے متعلق ان کے اقوال واشعار بھی نقل کیے ہیں۔ ان سب روایات سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اس واقعے کی کوئی نہ کوئی تاریخی اصل ضرور ہے۔ حافظ ابن کثیر اور امام بیہقی نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ [1]

اُمیہ بن ابی صَلت: یہ وہی شخص ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

«كَادَ أُمَيَّةُ ابْنُ أَبِي الصَّلْتِ أَنْ يُّسْلِمَ»

''قریب تھا کہ امیہ بن ابی صَلت مسلمان ہو جاتا۔'' [2]

ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں:

«فَلَقَدْ كَادَ أَنْ يُّسْلِمَ فِي شِعْرِهٖ»

''شعروں سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہونے والا تھا۔'' [3]

کہا جاتا ہے کہ یہ شخص عیسائی ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے اشعار میں توحید اور بعث بعدالموت کا خوب تذکرہ کیا ہے۔ [4] واقعہ یہ ہے کہ وہ عظیم الشان شاعر تھا۔ [5] رسول اللہ ﷺ

---

[1] البداية والنهاية: 2/251-258. حافظ ابن کثیر کا کہنا ہے کہ روایت کی اسانید ہر چند ضعیف ہیں مگر ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس واقعے کی کوئی نہ کوئی اصل ہے۔ واللہ أعلم. ودلائل النبوة للبيهقي: 2/102-113. امام بیہقی نے اس واقعے کی اسانید نقل کرنے کے بعد لکھا: ''ہر چند ان میں سے بعض سندیں ضعیف ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کی کوئی نہ کوئی اصل ہے۔'' واللہ أعلم. [2] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب أيام الجاهلية، حديث: 3841، وصحيح مسلم، الشعر، باب في إنشاد الأشعار......، حديث: 2256. [3] صحيح مسلم، الشعر، باب في إنشاد الأشعار......، حديث: 2255. [4] فتح الباري: 14/310، والسيرة النبوية لابن هشام: 1/289. [5] ابن اسحاق نے ابن ابی صلت کے اشعار نقل کیے ہیں، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 1/86) صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق شرید بن سُوَید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو ابن ابی صلت کے سو شعر سنائے، دیکھیے: (صحيح مسلم، الشعر، باب في إنشادِ الأشعار، حديث: 2255)

کے دور نبوت تک زندہ رہا۔ بدقسمتی سے وہ اسی فریب نفس اور تکبر کی وجہ سے مسلمان نہیں ہوا کہ میں ایک بزرگ آدمی ہوں، بھلا نوجوان شخص کا پیروکار بن جاؤں؟ [1] دراصل وہ خود نبی بننے کا خواہش مند تھا۔ بعض مفسرین کے مطابق یہ آیت اسی کے بارے میں نازل ہوئی:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْۤ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا﴾

''اور (اے نبی!) انھیں اس شخص کی سرگزشت پڑھ سنائیں جسے ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں مگر وہ ان (کی پابندی) سے نکل بھاگا۔'' [2]

ایک قول یہ ہے کہ امیہ بن ابی صلت 9 ھ میں فوت ہوا جبکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا انتقال 2 ھ میں ہوا۔ [3] اس نے بدر کے مقتولینِ قریش کا مرثیہ بھی لکھا تھا۔ [4]

لبید بن ربیعہ عامری کِلابی جعفری: یہ دور جاہلیت کے عظیم الشان شاعر تھے۔ ان کا معلقہ (قصیدہ) سارے عرب میں مشہور تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے انھی کے بارے میں فرمایا تھا: ''سب سے سچی بات جو کسی شاعر نے کہی، لبید کا یہ قول ہے:

أَلَا! كُلُّ شَيْءٍ مَّا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلُ

''خبردار! اللہ کے سوا ہر چیز فانی ہے۔'' [5]

ان کا حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے ساتھ قصہ مشہور ہے۔ اس کا تذکرہ مشرکین کی

[1] یہ طبری کی روایت ہے جسے حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے۔ انھوں نے اس کی سند کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 310/14) [2] الأعراف 175:7. یہ ابن مردویہ کی روایت ہے جس کی سند قوی ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس کے بارے میں لکھا: ''بعض دوسری سندوں سے روایت ہے کہ یہ آیت بلعام اسرائیلی کے بارے میں نازل ہوئی اور یہی بات زیادہ معروف ہے۔'' دیکھیے: (فتح الباري: 310/14) [3] ابن سبط جوزی نے ان اقوال کا ذکر کیا ہے اور انھیں حافظ ابن حجر نے بھی نقل کیا ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 310/14) [4] السيرة النبوية لابن هشام: 3/42-48. روایت ابن اسحاق کی ہے۔ [5] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب أيام الجاهلية، حديث: 3841، وصحيح مسلم، الشعر، باب في إنشاد الأشعار، حديث: 2256.

طرف سے دعوت اسلامیہ کی مخالفت کے مختلف حربوں میں سے دسویں حربے میں آئے گا۔

لبید رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوئے۔اس وقت ان کی عمر ایک سو پچاس سال ہو چکی تھی بعض مؤرخین نے اس سے بھی زیادہ بتلائی ہے۔ [1]

مذکورہ حضرات کے علاوہ مشہور حنفاء: ارباب بن رئاب، مشہور شاعر سوید بن عامر مصطلقی، اسعد ابو کرب حمیری، وکیع بن سلمہ بن زُہیر ایادی، عمیر بن حَیْذَب جہنی، عدی بن زید عبادی، یہ عیسائی ہو گئے تھے۔ ابو قیس صرہ بن ابی انس بخاری، سیف بن ذی یزن حمیری، عامر بنْ ظرب عدوانی، مشہور شاعر عبدالطانجہ بن ثعلب بن دبرہ بن قضاعہ، علاف بن شہاب تمیمی، ملتمس بن امیہ کنانی، مشہور شاعر زہیر بن ابی سُلمیٰ، خالد بن سنان بن غیث عبسی، عبداللہ قضاعی، عبید بن ابرص اسدی، کعب بن لوئی بن غالب قرشی جو نبیٔ اکرم ﷺ کے جدِ امجد ہیں۔ [2] عثمان بن حویرث۔ یہ دین حق کی طلب میں نکلے تو قیصر کے پاس پہنچ گئے، وہاں عیسائی ہو گئے اور اسی کے ہاں بڑی عزت کے ساتھ رہے، [3] عمرو بن عبسہ سلمی، انھیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی توفیق بخشی۔ [4] اکثم بن صیفی بن رباح۔ [5] اور نبیٔ اکرم ﷺ کے قریبی جدامجد جناب عبدالمطلب۔ [6]

جزیرہ نمائے عرب کی معاشرتی حالت

کسی قوم کی معاشرتی زندگی اس کی دینی اور معاشی زندگی سے جدا نہیں ہوتی۔ چونکہ

[1] فتح الباري: 310/14. [2] بلوغ الأرب في أحوال العرب، ص258-282، والمعارف، ص: 58-62. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 286/1. ابن ہشام نے یہ روایت بحوالۂ ابن اسحاق بلا سند نقل کی ہے، چنانچہ یہ روایت ضعیف ہے۔ [4] الإصابة: 6,5/3، وتاريخ الطبري: 315/2. اس روایت کی سند صحیح ہے۔ [5] بلوغ الأرب في أحوال العرب: 309,308/1. [6] مروج الذهب: 239/1-248، والملل والنحل: 248/2. یہ چند نام بطور مثال ذکر کیے گئے ہیں، تمام ناموں کا احاطہ نہیں کیا گیا۔

عربوں میں بت پرستی عام تھی جو عقل اور فطرت کے خلاف ہے، اس لیے ان کے معاشرتی حالات بھی عقل اور فطرت سے بیگانہ تھے۔

ان کا اخلاقی انحطاط پستی کی آخری حد تک جا پہنچا تھا جو ان کے اعمال و افعال سے صاف نظر آتا ہے، جیسے شراب پینا، جوا کھیلنا، بے شمار شادیاں کرنا، فقر کی بنا پر بلکہ فقر کے موہوم خطرے کی بنا پر اپنی اولاد کو قتل کر دینا، جھوٹی عار کے ڈر سے اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینا، معمولی معمولی باتوں پر جنگیں شروع کر دینا اور انتقام کی آگ میں اندھا ہو جانا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اور اپنے رسول کی زبانی ان تمام عاداتِ بد کا نہ صرف تذکرہ کیا ہے بلکہ بھرپور مذمت بھی کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ زندگی بھر ان گھٹیا رویوں کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''اگر تم عربوں کی جہالت سے مطلع ہونا چاہتے ہو تو قرآن مجید کی سورۂ انعام کی آیت: 130 سے بعد والی آیات پڑھو۔''

قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات میں عربوں کے چند خصائل کا ذکر ہے:

﴿ وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۝ ﴾

''اور جب زندہ درگور کی گئی بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی؟''[1]

ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ ﴾

''اور جب ان میں سے کسی کو اس (بیٹی کی پیدائش) کی بشارت دی جاتی ہے جس کی اس نے رحمٰن کے لیے مثال بیان کی تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے جبکہ وہ غم سے بھرا ہوتا ہے۔''[2]

نیز ارشاد ربانی ہے:

[1] التکویر 81:8، 9. [2] الزخرف 43:17.

﴿ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝ ﴾

''اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غم وغصے سے بھرا ہوتا ہے۔ وہ اس عار کے باعث جس کی اسے بشارت دی گئی لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے۔ (سوچتا ہے) کیا اپنی توہین کے باوجود اسے باقی رکھے یا اسے مٹی میں دبا دے؟ آگاہ رہو! بہت برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔''[1]

﴿ إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ ﴾

''بلاشبہ شراب اور جوا، آستانے اور فال کے تیر شیطانی عمل کی گندگی ہے، پس اس سے اجتناب کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''[2]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ ۖ ﴾

''اور تم اپنی اولاد کو تنگدستی (کے ڈر) سے قتل نہ کرو۔''[3]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ ﴾

''اور تم اپنی اولاد کو غریبی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔''[4]

بعض کم مرتبہ خاندانوں میں ایسے نکاح بھی رائج تھے جو زنا سے مختلف نہیں تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ''دور جاہلیت میں نکاح چار

[1] النحل16:58,59. [2] المآئدة5:90. [3] الأنعام6:151. [4] بني إسرآء يل17:31.

قسم کے تھے۔ ایک تو وہ نکاح جو آج اہل اسلام میں رائج ہے...... دوسرا نکاح استبضاع کہلاتا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کوئی اجنبی شخص کسی دوسرے شخص کی بیوی سے ایسے طہر میں جماع کرتا تھا جس میں اس کے خاوند نے اس کے ساتھ جماع نہ کیا ہو۔ اجنبی کے جماع کے بعد خاوند بھی اپنی بیوی سے جماع نہ کرتا حتی کہ اس اجنبی کا حمل ٹھہر جاتا، پھر حمل واضح ہونے کے بعد خاوند جماع کرتا اور یہ سب کچھ خاوند کی رضا مندی سے ہوتا تھا۔ تیسرا نکاح کئی آدمیوں سے ہوتا تھا، یعنی دس سے کم آدمی اکٹھے ہو جاتے اور ایک ہی عورت سے جماع کرتے رہتے، پھر جب وہ بچہ جنتی تو ان سب کو پیغام بھیجتی۔ وہ اکٹھے ہو جاتے تو اس بچے کو ان میں سے کسی ایک کی طرف منسوب کر دیتی کہ یہ تیرا بچہ ہے۔ چوتھا نکاح یہ تھا کہ بلا تمیز بہت سے آدمی ایک عورت سے جماع کرتے رہتے۔ ایسی عورتوں کے گھروں پر عموماً جھنڈا نصب ہوتا تھا، پھر جب بچہ پیدا ہوتا تو وہ سب افراد بلائے جاتے۔ قیافہ شناسی کے ماہر بھی بلا لیے جاتے، یہ لوگ جس شخص سے بچے کی زیادہ مشابہت محسوس کرتے بچے کو اس سے منسوب کر دیتے اور وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اسلام نے ان تمام نکاحوں کو باطل قرار دیا اور صرف وہی نکاح باقی رکھا جو اب رائج ہے۔'' [1]

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ وہ لوگ نکاح کے ان مکروہ طریقوں میں کسی قسم کا عار بھی محسوس نہیں کرتے تھے۔ بخاری و مسلم دونوں کی روایت ہے کہ ایک شخص کھڑا ہو کر کہنے لگا: ''اے اللہ کے رسول! فلاں میرا بیٹا ہے۔ میں نے اس کی ماں کے ساتھ دور جاہلیت میں زنا کیا تھا۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا دِعْوَةَ فِي الْإِسْلَامِ، ذَهَبَ أَمْرُ الْجَاهِلِيَّةِ، اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ»

[1] صحيح البخاري، النكاح، باب من قال: لا نكاح إلّا بوليّ......، حديث: 5127.

''اسلام میں جاہلیت کے دعوے نہیں، جاہلیت مٹ چکی، بچہ بستر والے کا ہے۔ اور زانی کے لیے پتھر ہیں۔''[1]

اگلے صفحات میں عمرۂ قضا کے بیان میں حضرت سعد بن ابی وقاص اور عبد بن زمعہ رضی اللہ عنہما کے مابین زمعہ کی لونڈی کے بیٹے کے سلسلے میں تنازع کا ذکر تفصیل سے آئے گا۔

جاہلی عرب دو سگی بہنوں سے بھی بیک وقت نکاح کر لیتے تھے۔ بے حیائی اور بے غیرتی کی انتہا یہ تھی کہ اپنے باپ کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کی بیویوں سے بھی نکاح کر لیتے تھے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۭ﴾

''اور تمھارا دو بہنوں کو جمع کرنا (بھی حرام ہے) سوائے اس کے جو پہلے گزر چکا۔''[2]

نیز ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَاۗؤُكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ ﴾

''جن عورتوں سے تمھارے باپوں نے نکاح کیا ہو، ان سے تم نکاح نہ کرو۔''[3]

ایام جاہلیت میں ایک قبیح روایت یہ بھی تھی کہ طلاق کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔[4] اسلام نے تین کی تعداد ٹھہرا دی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۠ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۭ﴾

''طلاق (رجعی) دو مرتبہ ہے، پھر یا تو (عورت کو) معروف طریقے سے رکھ لینا

[1] صحيح البخاري، البيوع، باب تفسير المشبهات، حديث: 2053، وصحيح مسلم، الرضاع، باب الولد للفراش......، حديث: 1457، وسنن أبي داود، الطلاق، باب الولد للفراش، حديث: 2274، ومسند أحمد: 179/2و208، واللفظ لهما. [2] النسآء 23:4. [3] النسآء 22:4. [4] سنن أبي داود، الطّلاق، باب نسخ المراجعة بعد التطليقات الثلاث، حديث: 2195. اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

ہے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔''[1]

زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں ان اخلاقی خرابیوں کے باوجود ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں کچھ اچھے اور روشن پہلو بھی تھے جن کا انکار ممکن نہیں۔ شاید انھی خوبیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی رسالت اور پیغام رسانی کے لیے منتخب فرمایا۔ ان کی جہالت کی بنیاد کسی پیچیدہ فلسفے پر نہیں تھی جسے ختم کرنا محال ہو۔ اس کے برعکس ان کے اردگرد دوسرے معاشرے سخت پیچیدگیوں کا شکار تھے۔ عرب لوگ پختہ عزم کے مالک تھے۔ ایک مرتبہ کوئی بات مان لیتے تو اس پر ڈٹ جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس خوبی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝﴾

''ایمان والوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا وہ سچ کر دکھایا، چنانچہ ان میں سے بعض نے اپنا عہد پورا کیا (شہادت پا گئے) اور ان میں سے بعض منتظر ہیں اور انھوں نے (عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔''[2]

بہت سے عرب اعلیٰ فضائل و مکارم پر بڑی مضبوطی سے کاربند تھے اور وہ عمدہ و اعلیٰ اخلاق کے حامل شخص کی تعظیم و توصیف کرتے تھے۔ اس باب میں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے بارے میں ان کا موقف بڑا تابناک تھا۔ اس کا ایک مظاہرہ ابوسفیان کی زبان سے ہرقل کے روبرو سر دربار ہوا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

وہ انتہائی صاف ذہن اور زبردست حافظے کے مالک تھے۔ اس کے بارے میں عجیب و غریب واقعات مشہور ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے لکھا کہ امام زہری کہا کرتے تھے:

[1] البقرة 229:2. آیت کی تفسیر کے لیے ملاحظہ کیجیے: (تفسیر ابن کثیر: 1/392-400) مفسرین کے قول کے مطابق ''بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا'' تیسری اور آخری طلاق ہے۔ [2] الأحزاب 23:33.

''میں بقیع کے پاس سے گزرتا ہوں تو اپنے کان بند کر لیتا ہوں مبادا میرے کان میں کوئی بے ہودہ لفظ پڑ جائے کیونکہ اللہ کی قسم! میرے کان میں جو بات بھی داخل ہوگئی میں اسے کبھی نہیں بھولا۔''[1]

حافظ ابن عبدالبرہی کا بیان ہے: ''بعض عرب لمبے لمبے قصیدے صرف ایک ہی دفعہ سن کر حفظ کر لیتے تھے۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عمر بن ابی ربیعہ کا قصیدہ صرف ایک دفعہ سنا اور حفظ کرلیا تھا۔

اس قصیدے کا پہلا شعر یہ ہے:

أَمِنْ آلِ نُعْمٍ أَنْتَ غَادٍ فَمُبْكِرُ   غَدَاةَ غَدٍ أَمْ رَائِحٌ فَمُهَجِّرُ

''کیا تو آل نعم سے کل صبح سویرے روانہ ہوگا یا زوال کے بعد دوپہر کے وقت؟''

جبکہ آج کوئی شخص ایسا حافظہ نہیں رکھتا۔ اگر آج کتاب نہ ہو تو بہت سا علم ضائع ہوجائے۔[2] یہ حقائق جان لینے کے بعد یہ بات ہرگز باعث تعجب نہیں کہ ابن عباس، ابوہریرہ، ابن مسعود اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم سے ہزاروں احادیث مروی ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے پانچ ہزار تین سو چوہتر احادیث بیان کی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دو ہزار چھ سو تیس احادیث مروی ہیں۔[3]

عرب آزادی کے رسیا تھے اور کسی ایرے غیرے کی قیادت تسلیم نہیں کرتے تھے اور اسی کو سردار مانتے تھے جو معمر ہونے کے ساتھ ساتھ جرأت، بہادری، جوانمردی، مضبوطی، تحمل و بردباری اور قوت جیسی صلاحیتوں اور اچھی عادات و مستحسن اعمال کا نمونہ ہوتا تھا۔ بت پرستی کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کے منکر نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾

[1] جامع بیان العلم وفضلہ: 69/1. روایت کی سند صحیح ہے۔ [2] جامع بیان العلم وفضلہ: 70,69/1. [3] جوامع السیرة لابن حزم، ص:276,275.

''اور بلا شبہ اگر آپ ان سے سوال کریں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے تخلیق کیا اور شمس وقمر کو کس نے مسخر کیا؟ تو وہ ضرور یہی کہیں گے: اللہ نے!''[1]

اور فرمایا:

﴿ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ط﴾

''اورالبتہ اگر آپ ان سے سوال کریں کہ کس نے آسمان سے پانی نازل کیا، پھر کس نے زمین کو اس کی موت (ویرانی) کے بعد زندہ کیا تو وہ ضرور یہی کہیں گے: اللہ نے!''[2]

اسے توحید ربوبیت کہا جاتا ہے، یعنی اس بات کا پختہ یقین کہ ہر چیز کا خالق و مالک اللہ رب العزت ہے۔اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایک یگانہ منفرد، لاثانی اور جادو اثر زبان و بیان اور نہایت فصیح و بلیغ لغت کے حامل تھے جن کے ذریعے سے اسلام کی درخشاں تعلیمات پوری طرح جلوہ گر ہوگئیں۔

جزیرہ نمائے عرب کے بیرونی حالات

یہودیوں کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حالات

مذہبی حالت: دونوں آسمانی دین یہودیت اور عیسائیت تحریف اور تغیر و تبدل کا شکار ہوکر مسخ ہو چکے تھے، اسی لیے وہ روح سے خالی اور بے جان تھے۔ وہ لوگوں کی اصلاح کے لیے اپنا بنیادی کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ (20)

(20) الہامی کتابوں میں تحریف: قرآن کریم نے متعدد مقامات پر یہودیت اور نصرانیت میں ◂◂

[1] العنکبوت 61:29. [2] العنکبوت 63:29.

تحریف سے قطع نظر یہودیت اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ اس کا عقیدۂ توحید بھی بگڑ چکا تھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے توحید ہی کی وجہ سے بنی اسرائیل کو اس وقت کے لوگوں پر فضیلت عطا فرمائی تھی۔ یہودیوں نے اردگرد کی قوموں، فاتحین اور اپنے ساتھ بسنے والوں سے بت برستی کے بہت سے نظریات و عقائد اخذ کر لیے تھے۔ اس حقیقت کا اعتراف یہودیوں کے انصاف پسند مؤرخین نے بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں ''دائرہ معارف یہودیہ'' کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں: ''بنی اسرائیل کے انبیاء کا بت پرستی پر غیظ و غضب یہ واضح کرتا ہے کہ بت پرستی اسرائیلیوں کے دلوں میں سرایت کر چکی تھی۔ اور جلاوطنی کے بعد اور بابل کی قید تک بت پرستی کا شوق ان کے دلوں سے نہیں نکل سکا۔ وہ بڑی حد تک مشرکانہ خرافات و عقائد قبول کر چکے تھے۔'' تلمود (21) کی عبارتوں سے بھی

»» در آنے والی تحریفات کا اجمالاً و تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں مزید آگاہی کے لیے حسب ذیل کتب کا مطالعہ مفید رہے گا: ❶ ڈاکٹر موریس بوکائے کی کتاب دراسة الكتب المقدسة في ضوء المعارف الحديثة. ❷ معروف یورپی مصنف ڈریپر کی تصنیف کردہ کتاب الصّراع بين الدّين والعلم. ❸ التوراة للدكتور مصطفىٰ محمود، یہ کتاب دارالعودہ بیروت سے 1972ء میں شائع ہوئی۔ ❹ اسطورة تجسّد الإله في المسيح. اس کتاب کے تحریر کرنے میں برطانیہ کے الٰہیات کے سات پروفیسر شریک رہے ہیں جن کی سربراہی ڈاکٹر جان ہک، پروفیسر الٰہیات، برمنگھم یونیورسٹی نے کی۔ درمیانے سائز کے دو سو صفحات میں لکھی گئی یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جو 1977ء میں پہلی بار لندن سے شائع ہوئی۔ ❺ دکتور محمد ابو غیط فرت کا مقالہ بعنوان تحقيق تاريخ الأناجيل المعتمدة عند المسيحيّين ومدى صحّة انتسابها إلىٰ أصحابها. یہ مقالہ امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی، الریاض، اصول الدین کالج کے مجلّے 1397ھ - 1398ھ کے شمارہ نمبر1 کے صفحہ 27 تا 66 پر شائع ہوا۔ ❻ الجواب الصحيح على من بدل دين المسيح لابن تيمية. ❼ الفصل في الملل والأهواء والنحل لابن حزم، خاص طور پر پہلا اور دوسرا حصہ ❽ رحمة الله الهندي کی إظهار الحق. ❾ العقائد الوثنية في الديانة النصرانية لمحمد التنير.

(21) تلمود: یہ کتاب یہودیت کی تعلیمات اور اس کے آداب پر مبنی ہے جو ایک یہودی دینی کتاب ««

معلوم ہوتا ہے کہ یہودی بڑے ذوق وشوق سے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ [1]

ان کی تورات اور تلمود بھی ایسے قصے کہانیوں سے بھری پڑی ہیں جو اللہ تعالیٰ، وحی، انبیاء اور ان کی رسالت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ مثلاً ان کی تحریف شدہ تورات اور عہد نامۂ قدیم میں لکھا ہے: ''کیونکہ خداوند نے چھ دن میں آسمان اور زمین اور سمندر اور جو کچھ ان میں ہے وہ سب بنایا اور ساتویں دن آرام کیا، اس لیے خداوند نے ہفتہ کے دن کو برکت دی اور اسے مقدس ٹھہرایا۔'' [2]

اسی لیے یہودی ہفتہ کے دن کام کرنا حرام سمجھتے ہیں۔

عہد نامۂ قدیم میں حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے بارے میں لکھا ہے: [3] ''اور انھوں نے خداوندِ خدا کی آواز، جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا، سنی اور آدم اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے؟ اس نے کہا: میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور میں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا۔ اس نے کہا: تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے؟ کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا......'' (22)

›› الشریعۃ کے حواشی اور شروحات کا مجموعہ ہے۔ الشریعۃ کی تصنیف میں مختلف ادوار کے بیشتر یہودی علماء شریک رہے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (التلمود، تاریخه وتعالیمه لظفر الإسلام خان)

(22) الٰہی تصورات کا تقابل: اب ان تصورات کا موازنہ جو بائبل نے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں بتائے ہیں ان تصورات سے کیجیے جو قرآن نے اللہ تعالیٰ کے متعلق حسب ذیل آیات میں پیش کیے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور (اے نبی!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف سے (نازل شدہ) قرآن میں سے جو کچھ بھی پڑھتے ہیں اور تم لوگ جو بھی عمل کرتے ہو، اس ››

[1] دائرة معارف اليهودية. یہ عبارت ڈاکٹر فورٹ کی ہے جو اس نے تلمود کے حاشیہ: 1، فقرہ (ہ) میں درج کی ہے۔ [2] کتاب خروج، باب: 20، آیت: 11. [3] کتاب پیدائش، باب: 3.

غرض وہ اللہ تعالیٰ کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں گویا وہ انسان ہے جس کو یہ بھی علم نہیں کہ اس کے گھر کے باغیچے میں کیا ہو رہا ہے؟ لطیفہ یہ ہے کہ وہ اس کے بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ جب آدم نے معرفت کا درخت کھا لیا تو وہ اس نافرمانی کی وجہ سے الوہیت کے درجے پر پہنچ گئے اور انھیں خیر و شر کا پتہ چل گیا جبکہ اللہ تعالیٰ ان کی پیدائش کے وقت چاہتا تھا کہ وہ خیر و شر کی معرفت سے جاہل رہیں، پھر جب اللہ تعالیٰ کو آدم کی سرکشی بڑھتی نظر آنے لگی اور معاملہ ہاتھوں سے نکلتا دکھائی دیا تو اس نے آدم اور اس کی بیوی کو جنت سے نکال دیا۔ مبادا زندگی کا درخت ان کے ہتھے چڑھ جائے اور ان کے لیے ہمیشہ کی زندگی لکھ دی جائے، چنانچہ بائبل مقدس کے عہد نامۂ قدیم میں لکھا ہے: ''اور خداوندِ خدا نے کہا: دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے، اس لیے خداوندِ خدا نے اسے باغ عدن سے باہر کر دیا تاکہ وہ اس زمین کی جس میں سے وہ لیا گیا تھا، کھیتی کرے، چنانچہ اس نے آدم کو نکال دیا۔ [1] پھر زمین پر بھی آدم اور اس کی اولاد کا طرز عمل اللہ کو پسند نہ آیا بلکہ خطرہ پیدا ہوا کہ وہ زمین کو شر و فساد سے بھر دیں گے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کو افسوس ہوا کہ اس نے انھیں کیوں پیدا کیا؟''

عہد نامۂ قدیم ہی میں ہے: ''اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصور اور خیال سدا برے ہی ہوتے ہیں۔ تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا۔'' [2]

« وقت ہم تمھیں دیکھ رہے ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔'' (یونس 61:10) ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ''اور یقیناً ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں کو بھی ہم جانتے ہیں اور ہم (اس کی) شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔'' (ق 16:50)

[1] کتاب پیدائش، باب: 3. [2] کتاب پیدائش، باب: 6.

ان کی کتاب مقدس کی رو سے اللہ تعالیٰ طوفان کے ذریعے سے زمین کو غرق کرنے پر ندامت کا اظہار کرتا ہے۔[1] وہ اپنے نبی ابراہیم کی مہمانی قبول کرتا ہے اور دو فرشتوں کی معیت میں ان کے گھر آ کر ان کے چکنے چپڑے دسترخوان سے کھانا بھی کھاتا ہے۔[2]

ان کی تحریف شدہ تورات کے مطابق ''اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندے اور نبی یعقوب سے باقاعدہ کشتی لڑتا ہے جو ساری رات جاری رہتی ہے اور جب یعقوب اس پر غالب آنے لگتا ہے تو وہ ایک داؤ کھیلتا ہے جس سے اسے غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ داؤ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یعقوب کی ران کی جڑ میں ضرب لگائی جس سے ان کا جوڑ نکل گیا لیکن یعقوب نے اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ اس سے اسرائیل کا لقب اور برکت حاصل نہ کر لی۔''[3]

ان کی تورات کہتی ہے: ''اللہ تعالیٰ صرف اسرائیلیوں ہی کا رب ہے۔ وہ ان کے علاوہ کسی کو پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کی پسندیدہ نسل ہے۔ باقی رہیں دوسری امتیں اور قومیں وہ تو بکریوں کی طرح ہیں جنھیں اللہ کوئی اہمیت نہیں دیتا۔''[4] وہ دوسری قوموں، خصوصاً عربوں کے لیے اپنی نفرت کی بنیاد اپنے اس تحریف شدہ دین پر رکھتے ہیں۔

وہ تورات میں ایک قصہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کا نبی نوح ایک دفعہ نشے میں آ گیا۔ وہ سیدھا لیٹا تو اس کی شرمگاہ ننگی ہو گئی جب اس کے بیٹے حام نے جو کنعانیوں کا باپ ہے، اسے ننگا دیکھا تو ہنسنے لگا اور اپنے بھائیوں سام اور یافث کے سامنے اس کا مذاق اڑایا۔ ان دونوں نے بغیر اس کی شرمگاہ دیکھے اسے ڈھانک دیا۔ جب نوح نشے سے ہوش میں آیا اور اسے اپنے چھوٹے بیٹے حام کی اس حرکت کا پتہ چلا تو اس نے اس کے لیے یوں لعنت کی ''کنعان ملعون ہو۔ اپنے بھائیوں کے غلاموں کا غلام ہو۔ اللہ سام کو

[1] کتاب پیدائش، باب: 9. [2] کتاب پیدائش، باب 8. [3] کتاب پیدائش، باب 32. [4] کتاب پیدائش، باب: 7,6.

برکت دے اور کنعان ان کا غلام بنے۔ اللہ یافث کو فتح دے۔ وہ سام کے گھروں میں ٹھہرے اور کنعان ان کا غلام ہو۔‘‘[1]

اس قصے کا صاف مقصد یہ ہے کہ یہودی چاہتے ہیں کہ وہ سام کی اولاد ہونے کے ناتے اپنے آپ کو پاک صاف ظاہر کریں اور حام کی اولاد کنعانیوں کو اپنا غلام بنائیں، حالانکہ ان کا کوئی جرم نہیں۔ جس طرح یہودیوں نے اپنے مذموم مقاصد پورے کرنے کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کو ایک نشئی کے روپ میں پیش کیا ہے، اسی طرح انھوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو بھی نشئی اور (نعوذ باللہ) زانی ظاہر کیا ہے جو نشے میں اپنی بیٹیوں سے زنا کرتا ہے حتی کہ وہ حاملہ ہو جاتی ہیں اور اس کے بچے جنتی ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کی چھوٹی بیٹی کا ایسا ہی ایک بیٹا ’مواب‘‘ کے نام سے مشہور ہوا جو آج تک کے موابیین کا باپ تھا۔[2] ان خرافات کا مقصد واضح ہے کہ یہودی اپنے دشمن موابیوں کو مجروح کرنا چاہتے ہیں اور یہ سب کچھ وحی کے نام پر کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہودیوں کا تذکرہ اس طرح فرمایا ہے:

﴿ وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ ۚ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۚ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ○﴾

’’اور بے شک ان میں سے ایک گروہ کتاب پڑھتے ہوئے اپنی زبانیں مروڑتا ہے تاکہ تم اسے کتاب کا حصہ سمجھو، حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں اور وہ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔‘‘[3]

مزید فرمایا:

[1] کتاب پیدائش، باب: 9، والفصل في المِلَل والأهواء والنِّحل: 123/1۔ [2] کتاب پیدائش، باب: 19۔ [3] آل عمرٰن 78:3۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾

''چنانچہ ان لوگوں کے لیے ہلاکت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت لے لیں، چنانچہ ان کے ہاتھوں نے جو لکھا اس کی وجہ سے ان کے لیے ہلاکت ہے اور جو وہ کماتے ہیں اس کی وجہ سے ان کے لیے ہلاکت ہے۔'' [1]

ان کی تورات کا دعویٰ ہے کہ یہودی عورتوں کے علاوہ تمام عورتیں زانی ہیں۔ اور یہودیوں کے سوا سب لوگ (جو ان کی نظر میں غلام ہیں) واجب القتل ہیں۔ اور جو شخص کسی غیر یہودی کو قتل کرتا ہے وہ اپنے رب تعالیٰ کے سامنے قربانی پیش کرتا ہے۔ [2]

کیا ایسی کتاب آسمانی یا ربانی کتاب ہو سکتی ہے؟ کیا ایسی کتاب لوگوں کو اللہ کا راستہ دکھا سکتی ہے؟

اس قسم کے باطل اعتقادات نے انھیں اس حد تک پہنچا دیا کہ وہ اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کے لیے اخلاقیات کی پروا بھی نہیں کرتے جیسا کہ صہیونی فلاسفہ کی تعلیمات سے واضح ہے۔ وہ بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی سے انبیاء کو ایسے اوصاف سے متصف کرتے ہیں جو ان کی شان کے یکسر منافی ہیں۔

وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو۔ نعوذ باللہ۔ ''دیوث'' ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ صرف اپنی زندگی اور دنیاوی مفادات کی خاطر کمینگی پر اتر آئے۔ تورات میں لکھا ہے کہ ابراہیم نے اپنی بیوی سارہ کو فرعون کے گھر جانے پر مجبور کیا کہ وہ اپنے آپ کو ابراہیم کی

[1] البقرة 2:79. [2] ثقافة المسلم في وجه التيارات المعاصرة للدكتور عبدالحليم عويس، النادي الأدبي، الرياض، ص:122,121.

بہن ظاہر کرے تا کہ اسے چند بکریاں اور گدھے مل سکیں۔ ابراہیم نے اس سے کہا: ''تو جا کر کہنا: میں ابراہیم کی بہن ہوں تا کہ تیری بنا پر مجھے کچھ مال حاصل ہو اور میری جان بچ سکے۔'' [1]

یہودی لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کو بھی چکر باز کی صورت میں پیش کرتے ہیں کہ وہ بڑے پست حربے سے اپنے چھوٹے بھائی سے نبوت چرا لیتا ہے۔ [2] یہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیٹی کو زانیہ بنا کر پیش کرتے ہیں کہ اس سے قریبی شہر کے سردار کے لڑکے نے زنا کیا۔ [3]

یہود کی تلمود کہتی ہے کہ عیسیٰ اپنی ماں کا ناجائز بیٹا ہے کیونکہ اس کی ماں بحالت حیض ایک فوجی ''باندارا'' کے جماع سے حاملہ ہوئی۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کذاب، مجنون، گمراہ، شعبدہ باز اور بت پرست کے القاب دیتے ہیں۔ ان کی تلمود کے مطابق عیسائی بت پرست، قاتل، فاسق، پلید جانور، گدھے، خنزیر اور کتے ہیں۔ وہ حیض کے ناپاک کپڑوں جیسے ہیں جنھیں گندگی کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا ہے۔ [4]

وہ اپنے نبی حضرت داود علیہ السلام کی یہ تصویر پیش کرتے ہیں کہ وہ اپنے ایک فوجی کمانڈر کی بیوی کو اپنے گھر کی چھت سے دیکھتا ہے تو اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ وہ اسے بلواتا ہے، اس سے زنا کرتا ہے حتی کہ وہ حاملہ ہو جاتی ہے، پھر وہ اس کے خاوند فوجی کمانڈر کو لڑائی کے میدان میں بھیج کر ہلاک کرا دیتا ہے۔ اور خود اس کی بیوی سے شادی کر لیتا ہے۔ [5] یہ کس قدر گھناؤنی اور واہیات باتیں ہیں۔ کیا عقل اسے اللہ کا کلام مان سکتی ہے؟ اور کیا ایسی کتاب انسانیت کی ہدایت اور رہنمائی کے قابل کہی جا سکتی ہے؟

[1] کتاب پیدائش، باب: 21. [2] کتاب پیدائش، باب: 27. [3] کتاب پیدائش، باب: 34. [4] التوراة للدكتور مصطفٰی محمود، ص: 67-70. [5] ثقافة المسلم في وجه التيارات المعاصرة للدكتور عبدالحليم عويس، ص: 122,121.

قرآن مجید نے یہودیوں کے مذہبی اندازِ فکر، اپنے رسولوں اور کتابوں کے بارے میں ان کے موقف کے بہت سے پہلو بیان کیے ہیں، مثلاً: یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں بت پرستی کی طرف مائل تھے۔ انھوں نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا:

﴿ اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ ۚ ﴾

''تو ہمارے لیے بھی ایک معبود بنا دے جس طرح ان کے معبود ہیں۔'' [1]

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے ملاقات کے بعد واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ بچھڑے کی عبادت میں جتے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا:

﴿ لَن نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ ۝ ﴾

''ہم تو ہمیشہ اس (بچھڑے) کی عبادت کرتے رہیں گے حتی کہ موسیٰ ہمارے پاس واپس آ جائے۔'' [2]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد بھی وہ بت پرستی سے باز نہیں آئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ جَاءَكُم مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهِ وَأَنتُمْ ظَالِمُونَ ۝ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا ۖ قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ...... ﴾

''اور بے شک موسیٰ تمھارے پاس کھلے معجزات لے کر آئے، پھر اس کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ہو ہی ظالم۔ اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے پکا وعدہ لیا اور ہم نے تم پر طور پہاڑ بلند کیا (اور کہا:) ہم نے تمھیں جو دیا ہے اسے قوت کے ساتھ پکڑو اور سنو! انھوں نے کہا: ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی۔

[1] الأعراف 138:7. [2] طٰہٰ 91:20. پورے قصے کے لیے دیکھیے: (طٰہٰ 20:83-97)

اور ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت ڈال دی گئی......۔“ [1]

قرآن مجید کے مطابق وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی گستاخی سے پیش آئے تھے۔ انھوں نے کہا:

﴿ اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً ﴾ ”(اے موسیٰ!) ہمیں اللہ بالکل آنکھوں کے سامنے دکھا۔“ [2]

اللہ تعالیٰ کی جناب میں ان کی بے ادبی ملاحظہ ہو:

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ط غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ ﴾

”اور یہودیوں نے کہا: اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، بندھ گئے انھی کے ہاتھ۔“ [3]

یہودی اللہ تعالیٰ کو ایک شخص کا باپ بھی ٹھہراتے تھے۔

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ ﴾ ”اور یہودیوں نے کہا: عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔“ [4]

یہودیوں نے اپنے علماء کو اپنا معبود بنالیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾

”انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور درویشوں کو (اپنا) رب بنالیا۔“ [5]

وہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ق ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ط ﴾

”چنانچہ ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت لے لیں۔“ [6]

ایک اور مقام پر فرمایا:

[1] البقرۃ 2:92،93۔ [2] النسآء 4:153۔ [3] المآئدۃ 5:64۔ [4] التوبۃ 9:30۔ [5] التوبۃ 9:31۔
[6] البقرۃ 2:79۔

﴿ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

''کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ (یہودی) تمھاری خاطر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں سے ایک فریق ایسا ہے کہ وہ اللہ کا کلام سنتے ہیں، پھر وہ اسے سمجھ لینے کے بعد اس میں تحریف کر دیتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے بارے میں ان کا طرز عمل اللہ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝ ﴾

''کیا پھر جب کبھی تمھارے پاس کوئی رسول وہ چیز لایا جسے تمھارے دل نہ چاہتے تھے تو تم نے تکبر کیا، پھر تم نے ایک فریق کو جھٹلایا اور دوسرے فریق کو تم قتل کرتے رہے۔''[2]

نیز اللہ کا فرمان ہے:

﴿ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ﴾

''یہ لوگ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے اور نبیوں کو ناحق قتل کر ڈالتے تھے۔''[3]

ایک اور مقام پر اللہ کا فرمان ہے:

﴿ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

''پھر اس سے پہلے تم اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے اگر تم مومن تھے؟''[4]

یہود کی اپنی کتابوں اور قرآن مجید کے بیان کردہ مندرجہ بالا حقائق سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ دین (یہودیت) ان لوگوں کے ہاتھوں کس قدر رسوا ہوا اور کتنی پستی تک جا پہنچا۔

یہودیوں کے سیاسی و معاشرتی حالات: اسلام ابدی اور آفاقی دین ہے۔ اللہ تعالیٰ

[1] البقرہ 2:75. [2] البقرة 2:87. [3] البقرة 2:61. [4] البقرة 2:91.

کو ہرگز پسند نہیں کہ اس کا دین عالمگیر انسانیت سے دور ہو کر کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص ہو جائے مگر یہودیوں نے اللہ تعالیٰ کا دین بدل کر ایک قوم کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ اس طرح اس میں انسانیت کے لیے کوئی رحمت باقی نہیں رہی۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے انبیاء پر بہتان طرازی کی اور انھیں شرمناک عیوب کے ساتھ متہم کیا جس کی تفصیل آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ آئے ہیں۔ اگر آج تک یہ لوگ ہر غیر یہودی قوم سے لڑتے جھگڑتے آئے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ان کی سرشت یہی ہے جس کے باعث اللہ تعالیٰ انھیں ہمیشہ خائب و خاسر رکھے گا۔

ساتویں صدی عیسوی میں انھوں نے انطاکیہ کے عیسائیوں اور فارسی قائد فوکا کے مابین پھوٹ ڈال دی جس کے نتیجے میں انطاکیہ کے عیسائیوں کو خوفناک خونریزی کا سامنا کرنا پڑا۔ شام کے عیسائیوں کے خلاف انھوں نے ایرانی لشکروں کی مدد کی اور خود بھی شامی عیسائیوں کو تہ تیغ کیا جیسا کہ صور (لبنان) میں واقعہ پیش آیا۔ اس خباثت کا علم شاہ روم ہرقل کو ہوا تو اس نے انھیں خوفناک سزا دی اور گن گن کر بدلے لیے۔[1]

قرآن کریم نے ان کی ایسی باریک تصویر کشی کی ہے کہ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں ان کے اخلاقی زوال و انحطاط اور معاشرتی فساد کا واضح نقشہ نظر آ جاتا ہے جس کی بنا پر یہ لوگ امتوں کی قیادت کے اہل نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

”یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں: ہم پر امیوں (عربوں) کی بابت کوئی گناہ (گرفت) نہیں اور وہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔“[2]

یثرب میں ان کی فتنہ انگیزی کی وجہ سے عربوں کو بے شمار مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

[1] الخطط المقریزیة: 392/4. [2] آل عمرٰن 3:75.

یہ لوگ اوس وخزرج میں جنگ اور تفرقہ بازی کی آگ بھڑکاتے رہے تھے، تجارت میں ذخیرہ اندوزی کرتے اور اپنے اقتصادی مفادات کے لیے عربوں کو اپنا دست نگر رکھتے تھے۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے ہمیشہ شدید دشمن رہے اور آپ کی ذات گرامی کے خلاف ہمیشہ سازشیں کرتے رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کا کوئی داؤ کارگر نہ ہونے دیا بلکہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں انھیں ہزیمت اٹھانی پڑی اور مدینہ منورہ سے جلا وطن ہونا پڑا۔ بعد ازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو انھیں جزیرہ عرب ہی سے باہر نکال دیا تاکہ اسلامی معاشرہ ان کے فتنوں سے محفوظ رہے۔ [1]

عیسائیوں کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حالات

مذہبی حالت: یہودیت کی طرح عیسائیت بھی تحریف کے ساتھ ساتھ بت پرستی، یونانی اور رومی خرافات کا شکار ہو چکی تھی۔ [23] اس کے نتیجے میں مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیمات نابود

[23] **انجیل پر تحقیق:** دکتور محمد ابو الغیط نے اپنے اس مقالے تحقیق تاریخ الأناجیل المعتمدۃ عند المسیحیین...... میں نصاریٰ کے ہاں قابل اعتماد سمجھی گئی چار انجیلوں: انجیلِ متیٰ، مرقس، لوقا اور یوحنا کی تاریخ کے متعلق اپنی تحقیق درج کی ہے۔ انھوں نے اس امر کی وضاحت بھی کی ہے کہ ان چاروں حواریوں کی طرف انجیلوں کی نسبت کہاں تک درست ہے۔ تحقیق کے بعد وہ جس نتیجے پر پہنچے اس کی تفصیل ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ”ہم نے نصاریٰ کے ہاں قابلِ اعتماد سمجھی جانے والی انجیلوں کی تاریخ کا اور اس امر کا دقتِ نظر سے جائزہ لیا ہے کہ ان انجیلوں کی نسبت ان چاروں «

[1] دعوت اسلامیہ کے مقابلے میں یہود کے طرز عمل کی بارے میں مکمل اور حقیقی تفصیلات جاننے کے لیے قرآن مجید، کتب تفسیر و حدیث اور سیرت کے قدیم و جدید مآخذ سے رجوع کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں خاص طور پر حسبِ ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید رہے گا: السیر و المغازي لابن إسحاق، وعیون الأثر في فنون المغازي والسِّیَر لابن سید الناس، وفقه السیرة النبویة للبوطي. ہماری اس کتاب میں اس امر کی تفصیلات اپنی اپنی جگہ آئیں گی۔ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ کی آیات 40 سے 44 اور ان کے بعد کا مضمون اس حوالے سے قابل ذکر ہیں۔

ہو گئیں اور رفتہ رفتہ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد عیسائیت بھی بت پرستی کا ایسا مذہب بن

» حواریوں کی طرف کہاں تک درست ہے۔ تحقیق کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حواری متی سے انجیلِ متیٰ کا تعلق نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انجیل اور متیٰ کے درمیان عبرانی زبان سے یونانی میں ترجمہ کرنے والے مترجم کی شخصیت حائل ہے اور ہم یا ہم جیسے دیگر ناقدین وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ مترجم نے ترجمہ کرتے ہوئے انجیل کے متن میں کسی قسم کا کوئی اضافہ نہیں کیا اور امانت داری کے ساتھ انجیل کو ایک سے دوسری زبان میں منتقل کر دیا ہے، پھر ترجمہ شدہ کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد اصل عبرانی نسخے کا فقدان اور مترجم کا نام پردۂ اخفا میں رہنا ایسے عوامل ہیں جو اس انجیل کی حیثیت کو گھٹانے کا بڑا سبب ہیں۔ تحقیق کاروں کے نزدیک اس امر کو ترجیح حاصل ہے کہ متیٰ کی انجیل اس کے کسی پیروکار کی تحریر کردہ ہے۔ واضح رہے کہ متیٰ کے پیروکار ٹیکس جمع کرنے کے پیشے سے وابستہ ہونے کی بدولت ''عشار'' کہلاتے تھے۔ دوسری انجیل جس آدمی سے منسوب ہے اس کا نام مرقس ہے۔ یہ مسیح علیہ السلام کا حواری نہیں تھا۔ اس نے انجیل اپنے نصرانی استاد پطرس سے اخذ کر کے لکھی تھی، تیسری انجیل، انجیلِ لوقا کی حیثیت سوائے ایک دستاویزی کتاب کے کچھ نہیں جس میں لوقا نے اس دور کے واقعات و حوادث کا ذکر کیا ہے یہ واقعات اس نے عام لوگوں سے سن کر لکھے تھے۔ انجیل لوقا میں بیان کیے گئے بیشتر واقعات و حوادث کی بنیاد ان حقائق پر رکھی گئی ہے جو غلط فہمی اور خواہشِ نفس کے اتباع کا نتیجہ ہیں، پھر مذکورہ حقائق سے ان واقعات کو اخذ کرتے وقت کسی اصول اور ضابطے کی پابندی نہیں کی گئی اور نہ دقتِ نظر سے کام لیا گیا ہے۔ لوقا مسیح ابن مریم علیہما السلام کا شاگرد تھا نہ حواری۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ سینٹ پال کا شاگرد تھا جس پر دین نصرانی میں تحریف کرنے کا الزام ہے۔ چوتھی انجیل، انجیل یوحنا کے بارے میں ہمارا میلان اس طرف ہے کہ وہ یوحنا نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں جبکہ وہ یونانی فکر و فلسفہ سے بہت متاثر ہو چکا تھا، خود گھڑی تھی۔ اس ضمن میں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ مسیح ابن مریم علیہما السلام کے خطابات اور ان کی گفتگو عام طور پر اشارات و رموز پر مبنی ہوتے تھے۔ جنھیں الفاظ میں ڈھالتے وقت حواریوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ضرب الامثال سے کام لیا۔ یوں مسیح علیہ السلام کا کلام نقل کرنے میں بھی حواریوں کا آپس میں خاصا اختلاف رہا ہے۔ ان سب امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ان چاروں انجیلوں کا وحی و الہام اور مسیح علیہ السلام کی اصل انجیل سے دور و نزدیک کا کوئی تعلق نہیں اور ان کے مندرجات کا بیشتر حصہ، سوائے مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کی ان چند »

گیا جو اپنے پیروکاروں کو علم، غور وفکر اور عقل وشعور سے محروم کر دیتا ہے۔ اس کی تصدیق خود مشہور یورپی مسیحی پاکسٹر کے الفاظ سے ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے: ''بت پرستی رک گئی لیکن مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی بلکہ وہ مسیحیوں کے دلوں میں رچ بس گئی اور مسیحیت کے نام پر ہر الا بلا چیز ان میں داخل ہو چکی ہے۔ جن لوگوں نے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیا تھا انھوں نے اپنے شہداء میں سے کسی شہید کو لیا اور اسے الٰہی صفات سے متصف کر کے اس کا ایک بت بنایا۔ یوں یہ شرک اور بت پرستی ان شہداء کی طرف منتقل ہوگئی اور اس صدی کے اختتام سے قبل شہداء اور اولیاء کی عبادت عام ہو چکی تھی، پھر ایک نیا عقیدہ معرض وجود میں آیا کہ اولیاء الوہی صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ یوں یہ اولیاء اور مقدس لوگ اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان واسطہ بن گئے اور عوام الناس کے عقیدے کے مطابق الوہی صفات کے حامل بھی بن گئے اور قرون وسطیٰ کے تقدس وطہارت کی علامت قرار پائے۔ بت پرستوں کے تہواروں کے نام بدل کر انھیں نئے نام دیے گئے جو قبول کر لیے گئے۔ 400ء میں بت پرستوں کے قدیم تہوار ''سورج دیوتا کے جشن'' کو مسیح علیہ السلام کی پیدائش کی عید بنا لیا گیا جو آج کل کرسمس کے نام سے مشہور ہے۔''[1]

» باتوں کے جو ان کے لکھنے والوں کی یادداشتوں میں باقی رہ گئیں اور جو محمد ﷺ اور قرآن مجید کی سچائی پر شاہد عادل ہیں، بے بنیاد ہے۔ امام ابن حزم ظاہری نے اپنی معرکہ آرا کتاب الملل والنحل: 116/1 کے ایک باب میں نصاریٰ کے ہاں قابل اعتماد سمجھی جانے والی چاروں انجیلوں اور تورات میں پائے گئے واضح تناقضات اور صریح جھوٹی باتوں کا ذکر کیا ہے۔ نصرانیت میں بت پرستی کے پھیلاؤ کی بابت حقائق جاننے کے لیے حسب ذیل کتب کا مطالعہ مفید رہے گا: تاریخ ابن بطریق اور الرفاعة الطهاوي کی أنوارالجلیل في أخبار مصر وتوثيق بني إسرائيل. اسی طرح رحمۃ اللہ الھندی کی إظهار الحق اور ول ڈیورنٹ کی تہذیب انسانی کا ارتقاء۔

[1] Rev.James Houston Baxter:History of Christianity in the light of Modern Knowledge, Glasgow,1926, P:407.

ابو غیط نے مسیحیت میں بت پرستی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا: ''یوں ظلم وستم کے ان مختلف ادوار میں بت پرستی کے بازار میں اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ بت پرستی کی سرگرمیوں میں اس وقت تیزی آجاتی جب نصرانی پنڈت رومی حکمرانوں کی تائید اوران کی خواہش کی تکمیل میں قیصر کا مجسمہ پوجنے پر راضی ہوجاتے۔ جو شخص بت پرستی سے بیزاری کا اظہار کرتا اور اس عمل سے پیچھے رہنا چاہتا انجام کار اسے آگ میں جلنا اور تباہ و برباد ہونا پڑتا۔ مسیحیت کی پوری تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے۔ آخر کار مسیحیت نے طویل کشمکش اور جنگ و جدل کے بعد بت پرستی اور وثنیت کے آگے گھٹنے ٹیک دیے اوراسے اختیار کرلیا۔ اس کے بعد مسیحیت جس علاقے میں بھی داخل ہوتی اور وہاں کے لوگوں کو وثنیت میں مشغول پاتی تو انھیں چند مسیحی عقائد دے کر بت پرستی پر قائم رہنے دیتی۔ [1]

دوسری جانب نصرانیوں نے ''رہبانیت'' ایجاد کر لی اور اپنی انجیلوں میں ایسی ایسی چیزیں شامل کر دیں جنھیں عقل کسی صورت قبول نہیں کرسکتی۔ تقابل ادیان کے ایک ماہر محقق علامہ ابن حزم نے جب اصل مسیحی کتابیں پڑھیں تو وہ انتہائی حیرت انگیز نتائج تک پہنچے۔ وہ عیسائیوں کے عقیدے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یعقوبی فرقے کا کہنا ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ ہی تھے۔ بقول ان کے اللہ تعالیٰ کو سولی پر لٹکایا گیا، قتل کیا گیا حتی کہ وہ مر گیا اور دنیا تین دن تک بغیر کسی مدبر و فاعل کے چلتی رہی اور افلاک بھی کسی منتظم کے بغیر چلتے رہے، پھر وہ جی اٹھا اور پہلے کی طرح ہوگیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نئے سرے سے پیدا ہوا، پھر وہی قدیم بن گیا بلکہ ان کے قول کے مطابق وہ اللہ تعالیٰ ہی تھا جو مریم کے پیٹ

[1] تحقيق تاريخ الأناجيل المعتمدة عند المسيحيين و مدى صحة انتسابها إلىٰ أصحابها للدكتور محمد أبي الغيط الفرت، مجلة كلية أصول الدين، جامعة الإمام محمد بن سعود، العدد الأول 1397ھ ,1398ھ.

میں حمل کی صورت میں رہا۔''

اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے فاسد عقائد کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾

''ان لوگوں نے بلاشبہ کفر کیا جنھوں نے کہا: اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کا کلام نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ ''بے شک اللہ تینوں میں سے تیسرا ہے۔''[2]

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ءَ... قلت لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾

''کیا تو نے ہی لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بنا لو؟''[3]

اگر عیسائیوں کے کفر و شرک کے متعلق یہ کلام قرآن مجید میں نہ ہوتا تو کسی بھی مومن کے لیے روا نہیں تھا کہ وہ ایسے قبیح اور گھٹیا الفاظ نقل کرے۔ اگر ہم نے بذات خود عیسائیوں کو نہ دیکھا ہوتا تو ہم کبھی یہ تسلیم نہ کرتے کہ دنیا میں کوئی صاحب عقل قوم ایسی مجنونانہ باتیں مان سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی ذلت سے بچائے۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ ان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''عیسائیوں کے لیے ضروری ہے، وہ ہمیں بتائیں کہ ان تین دنوں میں جبکہ ان کا رب مرا ہوا تھا، آسمانوں اور زمین کا انتظام کون چلاتا رہا؟ افلاک کو کون حرکت دیتا رہا؟ پھر جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تین اشیاء کا نام ہے باپ، بیٹا اور روح القدس، ان سے پوچھا جائے کہ جب یہ تینوں چیزیں تین ہونے کے باوجود ایک ہیں تو پھر ایک کو باپ اور دوسرے کو بیٹا کہلانے کا کیا حق تھا؟ جبکہ تم کہتے ہو کہ تینوں ایک ہیں۔ اس لحاظ سے تو باپ بیٹا ہے اور بیٹا باپ۔ یہ عجیب

[1] المآئدة 5:72. [2] المآئدة 5:73. [3] المآئدة 5:116.

گورکھ دھندا ہے جبکہ خود ان کی انجیل اس کے خلاف کہہ رہی ہے: ''میں اپنے باپ کے دائیں جانب بیٹھوں گا۔'' اور یہ خود کہتے ہیں: ''قیامت کا علم صرف باپ کو ہے، بیٹے کو اس کا علم نہیں۔'' اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیٹا باپ نہیں ہے۔ اور اگر تینوں مختلف ہیں، اگرچہ نصرانی اس کے قائل نہیں تو لازمی بات ہے کہ بیٹے کے لیے کمزوری، حدوث (تغیر پذیری) اور نقص لازم ہے، اس لحاظ سے اُسے باپ سے کم مرتبہ ہونا چاہیے جبکہ نقص اور کمی اللہ کی صفت نہیں ہو سکتی۔''[1]

ان کی مزعومہ انجیلوں کے اس عقیدے کے بارے میں ابنِ حزم کے تبصرے کا خلاصہ یہ ہے: ''ان کی اناجیل کے ستر ابواب ہیں جو یکسر جھوٹ، تناقضات اور متضاد بیانات پر مبنی ہیں۔'' مختصر یہ کہ ان کی اناجیل کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کبھی تو (نعوذ باللہ) اللہ کے بیٹے ہیں، کبھی یوسف یا داود یا کسی اور انسان کے بیٹے ہیں۔ کبھی وہ معبود ہیں جو پیدا کرتا اور رزق دیتا ہے اور کبھی وہ اللہ کی بھیڑ ہیں۔ کبھی وہ اللہ میں ہیں اور اللہ ان میں ہے۔ کبھی وہ اپنے شاگردوں میں ہیں اور ان کے شاگرد ان میں ہیں۔ کبھی وہ اللہ تعالیٰ کا علم اور قدرت ہیں اور کبھی وہ ایسے عاجز ہیں جس کا کسی پر حکم نہیں چلتا اور نہ اُس کا کوئی ارادہ پورا ہوتا ہے۔ کبھی وہ نبی اور اللہ کے غلام ہیں اور کبھی اللہ تعالیٰ انھیں ان کے دشمنوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ اپنے منصب سے دست بردار ہو جاتا ہے، حکومت مسیح سنبھال لیتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو آسمانوں اور زمین میں حلت و حُرمت کا اختیار دے دیتے ہیں۔ کبھی وہ بھوک سے بلکتے ہیں اور کھانا مانگتے ہیں۔ پیاسے ہو جاتے ہیں تو پینے لگتے ہیں، پھر ڈر کے مارے اُن کا پسینہ بہنے لگتا ہے۔ اگر انھیں کھانے کے لیے درخت پر انجیر نہ ملے تو وہ اُس پر لعنت بھیجنے لگتے ہیں۔ کبھی وہ گھبرا جاتے ہیں اور گدھے پر سوار ہو جاتے ہیں، کبھی اپنے چہرے پر تھپڑ اور سر پر چھڑیاں مارنے لگتے ہیں، کبھی ان

[1] الفصل في المِلَل والأهواء والنّحل لابن حزم: 49/1.

کے چہرے پر تھوکا جاتا ہے۔ ان کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جاتے ہیں اور پولیس والے انھیں مارتے ہیں۔ انھیں حنظل (کوڑتو نبا) ملا ہوا سرکہ پلایا جاتا ہے، پھر انھیں سُولی پر لٹکا دیا جاتا ہے اور اُن کے ہاتھوں میں کیل ٹھونک دیے جاتے ہیں اور وہ مر جاتے ہیں، پھر دفن کر دیے جاتے ہیں، پھر وہ آپ ہی آپ جی اٹھتے ہیں۔ زندہ ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں سے ملتے ہیں تو انھیں کھانے کے علاوہ کسی چیز کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ ساتھیوں سے کھانا مانگتے ہیں جو انھیں روٹی اور بھنی ہوئی مچھلی کھلاتے اور شہد پلاتے ہیں، پھر وہ اپنے مشغلے کے لیے چل پڑتے ہیں......'' [1]

علامہ ابن حزم اُن کی انجیلوں کے علاوہ دوسری کتابوں میں مذکور جھوٹ اور کفریہ کلمات سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ دراصل نصرانیت اور یہودیت کیگھناؤنے اور عبرتناک انجام ہی کا تقاضا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک اور رسول بھیجیں۔ پس اللہ رب العزت نے خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کو قیامت تک آنے والے زمانوں کے لیے سراج منیر اور رہبرِ انسانیت بنا کر بھیجا تاکہ انسانوں کو اس گمراہی سے نکالا جائے اور ساری انسانیت کے لیے آخری دین نازل کیا جائے جس کی راہ ساری انسانیت تک رہی تھی۔

سیاسی اور معاشرتی حالات: جب چھٹی صدی عیسوی شروع ہوئی تو شام کے رومی عیسائیوں اور مصر کے عیسائیوں کے درمیان جنگ برپا تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ملکانی (حکومتی مسیحی فرقہ) اور منوفیسی (قبطی مسیحی فرقہ) باہم دستِ وگریباں تھے کیونکہ اُن میں حضرت مسیح علیہ السلام کی حقیقت اور اصل کے بارے میں شدید اختلاف تھا۔ ملکانی فرقے کا عقیدہ تھا کہ حضرتِ مسیح علیہ السلام کی فطرت دوہری ہے جبکہ منوفیسی فرقے کے نزدیک اُن کی فطرت مفرد تھی۔ اس اعتبار سے مسیحی دنیا اپنے لڑائی جھگڑے میں مشغول ہو کر بگاڑ کی اصلاح، نیکی کی دعوت اور رفع شر و فساد کا فریضہ بھول بیٹھی تھی۔ مصر کے قبطی

[1] الفصل في المِلَل والأهواء والنِّحَل: 69/2.

چونکہ رومی حکومت کے عقیدے کے خلاف عقیدہ رکھتے تھے، وہ بڑی مصیبتوں میں مبتلا کردیے گئے۔ [1]

مشرقی رومی سلطنت میں بھی لوگوں کی حالت اس قدر خراب تھی کہ وہ اپنی حکومتوں سے بیزار اور اجنبی حکومتوں کے طرفدار بن گئے تھے۔ جابجا فتنے اور بغاوتیں پھوٹی ہوئی تھیں۔ صرف 532ء ہی کے ایک ہنگامے میں قسطنطنیہ شہر کے تیس ہزار افراد ہلاک ہوئے [2] اور سفاکی کے خوفناک مظاہرے سامنے آئے۔ [3]

بازنطینی مصر میں مذہبی عصبیت کی بنا پر ظلم وستم، سیاسی آمریت اور فقر و فاقے کا راج تھا۔ عیسائیوں کے لیے مصر وہ دودھیل بکری تھی جس کا وہ دودھ تو خوب نچوڑ کر دوہتے تھے لیکن اسے چارا نہیں ڈالتے تھے۔ مصریوں کو اس عبرتناک حالت سے بالآخر مسلمانوں نے نجات دلائی۔ اِس حقیقت کا اعتراف خود عیسائی مؤرخین نے کیا ہے۔ [4]

بازنطینی شام میں مظالم کا اس قدر شدید دور دورہ تھا کہ بہت سے شامی لوگ اپنے قرض چکانے کے لیے خود اپنے ہی بچے بیچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ [5]

باقی رہیں مغرب اور شمال کی یورپی ریاستیں تو وہاں خونریز جنگوں، جہالت در جہالت، مذہبی تعصب، غلو اور تشدد کا بول بالا تھا۔ وہاں عموماً اس قسم کے سوالات زیر بحث رہتے تھے کہ عورت انسان ہے یا حیوان؟ عورت میں روح ہے یا نہیں ہے؟ کیا عورت کو حق ملکیت حاصل ہے اور کیا وہ خرید وفروخت کی مجاز ہے؟ [6]

---

[1] فتح العرب لمصر، تعریب: محمد فريد أبو حديد، ص:38,37 و 47. [2] انسائیکلو پیڈیا بریٹا نیکا، مادہ: جسٹینین۔ [3] انحطاط الدولة الرومانية وسقوطها، تعريب: محمد علي أبودرة، ص: 3-5. [4] حضارة العرب، تعريب: عادل زعيتر، ص: 258. [5] خطط الشام لمحمد كرد علي: 101/1. [6] ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين لأبي الحسن الندوي، ص:44. اس کتاب کا اردو ترجمہ ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کے نام سے دستیاب ہے۔ یہ ترجمہ ابوالحسن علی ندوی نے خود کیا ہے۔

مجوسیوں کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حالات

مذہبی حالت: ایران میں زرتشت (24) کے غلبے سے پہلے میتھرا (مہرا)، یِیما (جمشید) اور آشاہ کی خدائی کا عقیدہ رائج تھا۔ یہ صورت حال کسی حد تک زرتشت کے غلبے کے بعد بھی برقرار رہی۔ یہ نیا دین بھی بڑی حد تک بت پرستی سے متاثر ہوا جس میں بعض طبعی عناصر، مثلاً آگ اور ستاروں کو مقدس مانا جاتا تھا اور بہت سے معبودوں کی عبادت کی جاتی تھی۔

زرتشتی دین اصلاً بت پرستی کے خلاف تھا۔ اس کے بنیادی ارکان میں سب سے اہم رکن لوگوں کو ایک معبود کی عبادت کی دعوت دینا، بت پرستی اور صابئیت کو ترک کرنا تھا۔ صابئیت میں بعض ستاروں اور مظاہرِ فطرت کی پوجا کی جاتی تھی۔ اس کے مقابلے میں زرتشتی دین سورج اور آگ کا تقدس تسلیم کرنے پر زور دیتا تھا کیونکہ یہ دونوں چیزیں اُس کے نزدیک اُس عظیم قوت کی علامت تھیں جو اس دنیا میں رحمت، نور، محبت اور طہارت کا منبع ہے اور جو انسان کو مصائب سے بچانے کے لیے کوشاں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس دین میں مٹی، پانی اور ہوا کے تقدس کا عقیدہ بھی رائج تھا کیونکہ ان چیزوں کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔[1]

(24) زرتشت: یہ قدیم ایرانیوں کا نبی تھا، اس کے حالات شہرستانی کی معروف کتاب الملَل والنِّحَل: 2/77-80 اور حامد عبدالقادر کی کتاب زرادشت الحكيم نبي قدامى الإيرانيين ، حياته وفلسفته میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ حامد عبدالقادر کا کہنا ہے کہ زرتشتی مذہب میں درحقیقت بت پرستی کا وجود نہیں تھا اور یہ مذہب عقیدۂ توحید کا حامل تھا جو ایک معبود کے وجود اور جزاء وسزا پر ایمان رکھتا اور شیطان کے ساتھ کفر کرتا تھا۔ من جملہ ان اشیاء کے جن کی دعوت زرتشتی مذہب دیتا تھا، ایک امر بالمعروف، یعنی نیکی کا حکم دینا اور نہی عن المنکر، یعنی برائی سے روکنا بھی تھا، نیز دیکھیے: (تاریخ الطبري: 1/61-540)

[1] الملَل والنِّحَل: 2/77.

زرتشت کی وفات کے بعد مجوسی فرقہ ظہور میں آیا۔ اس فرقے کے لوگ آگ کی پوجا کرتے تھے۔[1] اسے اپنا معبود مانتے اور اپنے دینی کاموں میں اسے بروئے کار لاتے تھے۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ آگ تو محض کمزور لوگوں کی علامت ہے۔ اسی بنا پر مجوسیوں کو آگ کے پجاری کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ انھیں مجوسی کاہن بھی کہا جاتا تھا۔ زرتشت سے پہلے چند مذہبی رسوم رائج تھیں، مثلاً: بتوں کی عبادت، جانوروں کی قربانیاں پیش کرنا، خصوصاً میتھرا بت کے لیے قربانی جو ان کے معبودوں میں سب سے ممتاز تھا۔[2]

جب سکندر مقدونی نے چوتھی صدی قبل مسیح کے اواخر میں ایران کے علاقے پر حملہ کیا تو زرتشتی دین روپوش ہوگیا اور پھر پانچ صدیوں کے بعد اُس وقت ظاہر ہوا جب ساسانی حکومت قائم ہوئی اور زرتشتیت کو ایرانی ثقافتی ورثے کا ایک حصہ تسلیم کرکے اسے اختیار کیا گیا۔ لیکن ساسانی زرتشتیت درحقیقت زرتشت کی تعلیمات سے کوسوں دور تھی اور شاہی مقاصد اور مجوسی کاہنوں کی سرکشی کے لیے ایک آلۂ کار بن گئی تھی۔[3]

تیسری صدی عیسوی میں ''مانی'' نے اپنا دین پیش کیا جو زرتشتیت، عیسائیت اور دیصانیت کا ملغوبہ تھا۔[4] زرتشتیوں نے اُسے مُلحِد، زندیق اور دینِ زرتشت سے خارج قرار دیا کیونکہ اُس کا دین دوئی پرست تھا۔ اُس کا دین دوہری فطرت کے خالق یا دو خالقوں کا قائل تھا جن کی اس جہان پر حکمرانی ہے۔ اُن میں سے ایک نور و خیر کا مبدا اور دوسرا اندھیرے اور شر کا مبدا ہے اور یہ دونوں علم و ادراک پر قادر ہیں۔[5] ان دونوں کے

[1] حامد عبدالقادر مجوسیت اور زرتشتیت کے درمیان واضح تفریق کرتے اوران دونوں کو مختلف مذاہب قرار دیتے ہیں۔ قدیم ایرانی مذاہب کے متعلق ان کی تحقیقات اپنے انوکھے پن اور ندرت کے اعتبار سے مؤرخین میں نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔ [2] ایران ساسانی عہد میں، ص: 19-29، والإسلام للدكتور أحمد شلبي، ص:41. [3] الإسلام للدكتور أحمد شلبي، ص:42,41. [4] اس مذہب کا نام ''دیصانیت'' اس کے بانی ابنِ دیصان کی نسبت سے ہے۔ [5] المِلَل والنِّحَل: 81/2، وزرادشت الحكيم، ص:125، والغلو والفِرَق الغالية في الحَضارة الإسلاميّة، ص: 24.

امتزاج سے کائنات پیدا ہوئی، اس کے تمام اجزا وجود میں آئے اور زندگی کا آغاز ہوا۔[1] اُن کا عقیدہ تھا کہ جو شخص بھی روشنی اور اندھیرے کے امتزاج کی مدت بڑھانے میں معاون بنتا ہے، وہ برا شخص ہے۔ اور مدت بڑھانے کا پہلا طریقہ شادی اور نسل کشی ہے۔ اس لیے اُن کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ انسان عُزلت پسندی اور رہبانیت اختیار کرے اور نسل کشی کی جڑ ہی کاٹ دے تاکہ یہ مادی جہان ختم ہو اور نور اندھیرے سے علیحدہ ہو جائے۔

276ء میں ''مانی'' کو ایرانی بادشاہ بہرام بن ہرمز بن شاپور نے یہ کہتے ہوئے قتل کر دیا کہ یہ شخص لوگوں کو کائنات کی تباہی کی دعوت دیتا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ سب سے پہلے اسے ختم کیا جائے۔[2] لیکن اس ظلم وتشدد کے باوجود مانویت نہ صرف جاری رہی بلکہ ایک خفیہ تحریک کی شکل اختیار کر گئی یہاں تک کہ اسلامی دور میں بھی اس تحریک کے آثار باقی رہے۔[3]

پانچویں صدی عیسوی کے آخر 478ء میں ''مزدک'' ظاہر ہوا۔ اُس نے مانی کی تعلیمات اختیار کیں اور دولت اور عورت میں اشتراک کا نظریہ پیش کیا۔[4]

ایرانی بادشاہ قباذ نے مزدک کے خیالات قبول کر لیے اور اپنی حکومت کے پہلے دس برسوں میں انھیں معاشرے میں رائج کیا۔ لیکن جب اُسے ان خیالات کی اصل حقیقت معلوم ہوئی اور آنکھوں سے پردہ اُٹھا تو اُس نے یہ دین چھوڑ دیا، مزدک کو قتل کر دیا اور اُس کے ساتھیوں کو 529ء میں تتر بتر کر دیا، اس لیے ساسانی دورِ حکومت میں یہ لوگ روپوش

[1] المِلَل والنِّحَل: 84/2. [2] المِلَل والنِّحَل: 81/2، وزرادشت الحكيم، ص:131,130، والإسلام لأحمد شلبي، ص:42، و إيران في عهد الساسانيين، ص:169-195. [3] اسلامی دور میں اس مذہب کے حالات کی بابت دیکھیے: (الغلو والفرق الغالية في الحضارة الإسلامية، ص:25,24، والمِلَل والنِّحَل:86/2) [4] المِلَل والنِّحَل:86/2، والغلو والفرق الغالية في الحضارة الإسلامية، ص:25، وماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، ص:49,48، والإسلام لأحمد شلبي، ص:43,42.

رہے اور خفیہ طور پر کام کرتے رہے، پھر اسلامی دور میں نئے سرے سے ظاہر ہوئے۔ [1]

ایران میں ''مرقونی'' دین بھی ظاہر ہوا۔ یہ دین رائج کرنے والا ''مرقیون'' نامی ایک شخص تھا۔ [2] یہ دین بھی دوئی پرست تھا کیونکہ وہ نور کو خالقِ خیر اور اندھیرے کو خالقِ شر قرار دیتا تھا۔ [3] یہ دین زرتشتیت اور مسیحیت سے متاثر تھا۔

ایران میں ایک اور دین بھی ظاہر ہوا جسے ''دیصانی'' مذہب کہا جاتا تھا۔ یہ بھی مرقونیت جیسا ہی دوئی پرست تھا۔ یہ نور اور ظلمت کے ساتھ ساتھ ایک تیسرے جہان کا بھی قائل تھا۔ لیکن وہ تیسرے جہان کے وجود کی کیفیت واضح نہیں کر سکا۔ یہ دین ابن دیصان کی طرف منسوب تھا۔ یہی شخص تھا جس نے سب سے پہلے ''حلول'' کا تصور پیش کیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا نور میرے دل میں حلول کر چکا ہے۔ [4]

مجوسیوں کے سیاسی اور معاشرتی حالات: ایران میں زرتشت سے پہلے پائے جانے والے بت پرست مذاہب کی وجہ سے فساد پھیلا ہوا تھا، خصوصاً صحرا و دیہات میں رہنے والے لوگ لوٹ کھسوٹ، ڈاکا زنی اور قتل جیسے جرائم میں ملوث رہتے تھے۔ [5] جب زرتشتیت کا دور آیا تو اُس نے تقریباً ان تمام خرابیوں کو ختم کر دیا لیکن ابھی اس حالت پر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ جلد ہی ''مانویت'' اور ''مزدکیت'' جیسے عقائد پھیل گئے۔

زرتشتیت کی کوکھ سے جنم لینے والی مجوسیت، مانویت، مزدکیت اور دیگر قدیم ایرانی ادیان کے باقی ماندہ اثرات کی بنا پر ایران میں اخلاقی بحران برپا رہا اور اُن میں داخلی اور خارجی طور پر خون ریز جنگیں ہوتی رہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اعتقادی تفریق بھی قائم

[1] المِلَل والنِّحَل: 86/2، والغلو والفرق الغالية في الحضارة الإسلامية، ص:26. [2] المِلَل والنِّحَل: 86/2، والغلو والفرق الغالية في الحضارة الإسلامية، ص: 22. [3] المِلَل والنِّحَل: 86:2، والغلو والفرق الغالية في الحضارة الإسلامية، ص: 26. [4] المِلَل والنِّحَل:89,88/2، والغلوّ والفِرَق الغالية في الحضارة الإسلامية، ص: 23. [5] زرادشت الحكيم، ص:23.

رہی۔ اکثر اوقات مقدس آگ کے پجاری مسیح علیہ السلام کے پجاریوں کو شکست دے کر اُن کے جان و مال لوٹ لیتے اور انھیں قیدی بنا لیتے اور کبھی کبھی ایرانیوں کی بھی شامت آجاتی اور رومی اُن پر غلبہ حاصل کر لیتے۔[1] ایرانی مجوسی معبودِ حقیقی کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ اُن کے دلوں میں اخلاقِ عالیہ راسخ نہیں تھے اور ایرانی بادشاہ عقیدے کے لحاظ سے اپنے مخالف دینی گروہوں پر ظلم و ستم کرتے تھے۔

معاشرتی طور پر سب سے زیادہ رکیک کام یہ تھا کہ زرتشتیوں نے محارم سے نکاح جائز قرار دے رکھا تھا۔ وہ کہتے تھے: ''بیٹے کو زیادہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ماں کی شہوت پوری کرے۔ جب خاوند فوت ہو جائے تو اُس کا بیٹا اس کی بیوی کا زیادہ حقدار ہوتا ہے۔'' اسی لیے اُن کے بادشاہ یزدگرد ثانی، جس کا دورِ حکومت پانچویں صدی عیسوی کا وسط ہے اس نے اپنی بیٹی سے نکاح کیا، پھر اُسے قتل کر دیا۔ بہرام چوبیں،(25) جو چھٹی صدی عیسوی میں حکمران رہا، اس نے اپنی بہن سے نکاح کر رکھا تھا۔[2]

مزدکیت کی تحریک نوجوانوں، سرمایہ داروں اور عیش پرست لوگوں میں زیادہ مقبول ہوئی کیونکہ اس میں اُن کی من مانی خواہشات کی تکمیل کا زیادہ خیال رکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے حکمرانوں کا تعاون بھی حاصل رہا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اس تحریک کی ترقی میں حکومت کا اثر و رسوخ بہت زیادہ مددگار ثابت ہوا۔ اس تحریک کے

(25) بہرام چوبیں: یہ ہرمز چہارم کے دور میں مشہور جرنیل تھا۔ رومیوں سے شکست کے بعد بہرام نے بغاوت کر دی اور ہرمز کو قتل کر دیا۔ ہرمز کے بعد اس کا بیٹا خسرو پرویز 589ء تا 628ء بادشاہ بنا لیکن بہرام کے تسلط نے اسے قسطنطنیہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ خسرو نے رومی فوج کی مدد سے دوبارہ تخت حاصل کیا تو بہرام ملک چھوڑ کر بھاگا اور ترکوں کے ہاتھوں مارا گیا، دیکھیے: (انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم: 132/2)

[1] تفسير ابن كثير: 305/6، وزرادشت الحكيم، ص: 138. [2] تاريخ الطبري: 178/2، وماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، ص: 47، وإيران في عهد الساسانيين، ص: 309-311.

اثرات ہی کی وجہ سے ایران اخلاقی انحطاط کا شکار ہوتا چلا گیا۔ [1]

ایرانی لوگ روحانی قائدین اور سرداروں کے بڑے معتقد تھے اور انھیں عام لوگوں سے بہت اونچا اور سب سے زیادہ عقلمند سمجھتے تھے۔ انھیں روحانی حکمران خیال کرتے تھے اور اُن کے سامنے بے حد عاجزی سے پیش آتے تھے۔ عام افراد خود بھی کئی طبقوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر طبقہ دوسرے سے جداگانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ہر طبقے کے فکر و عمل کا محور الگ الگ تھا۔ [2]

فارسی لوگ اپنی قومیت کو برتر سمجھتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ فارسی قوم دوسری تمام قوموں سے افضل ہے، اللہ تعالیٰ نے اُسے خصوصی امتیازات عطا فرمائے ہیں اور اُن میں وہ خوبیاں رکھی ہیں جو کسی اور قوم میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ اردگرد کے تمام لوگوں کو بڑی حقیر نظر سے دیکھتے اور انھیں ایسے ایسے القابات سے مخاطب کرتے جن سے ان کی بڑی توہین ہوتی تھی۔ [3]

چونکہ آگ اپنے پرستاروں کی طرف نہ تو کوئی شریعت بھیج سکتی ہے نہ رسول۔ اُس کا ان کی زندگی سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ وہ مجرموں کو بھی سزا نہیں دے سکتی۔ مجوسیوں کا دین، جو زرتشتیت ہی کی بگڑی ہوئی شکل تھی، محض چند رسوم کا نام تھا جو خاص اوقات میں مخصوص مقامات پر سرانجام دی جاتی تھیں۔ لیکن عبادت گاہوں سے باہر اپنے گھروں میں، کاروبار میں، بازار میں، سیاست و معیشت میں اور معاشرت وغیرہ میں وہ بالکل آزاد تھے، جو چاہتے کرتے تھے۔ کسی قانون اور ضابطے کے پابند نہیں تھے۔ ہر دور کے مشرکین کا یہی

[1] المِلَل والنِّحَل: 86/2، وماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین، ص: 49، والإسلام لِأحمد شلبي، ص: 42، وإيران في عهد الساسانيين، ص:348-350. [2] ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، ص: 50,51. [3] تاريخ الطبري: 3/520-523، وماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، ص: 52.

دستور رہا ہے۔ [1]

گویا فارسی قوم اپنی مجوسیت کی وجہ سے ایسے ہمہ گیر اور جامع دین سے محروم تھی جو اُن کی تربیت کرتا، انھیں مہذب بناتا، نیکیوں پر چلاتا، افراد، معاشرے اور حکومت کو اُن کے دائرۂ اختیار میں رکھتا، ان میں نظم و ضبط پیدا کرتا اور لوگوں کو سرکشی سے روکتا۔ [2] وہ ایسی صالح اور صحت مند حکومت سے بھی محروم رہے جو فتنہ و فساد کا قلع قمع کرتی۔ خود اُن کے حکمران فساد کی جڑ تھے کیونکہ وہ خود ہی "رب" بن بیٹھے تھے۔ یقیناً معبود حقیقی اور رب العالمین کو بھولنے کا یہی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ یہ حکمران حکومت کے لیے لڑتے مرتے تھے حتی کہ چند مہینوں میں چھ بادشاہ تخت حکومت پر بیٹھے۔ اس سے حکومت کی قدر و قیمت ختم ہو چکی تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بیت المال کی تمام آمدنی اُن کے بادشاہوں کی ذاتی ملکیت تصور کی جاتی تھی جس کی بنا پر اُن کی عیش پرستی اور فضول خرچی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔

اس کی نمایاں مثال اُن کا آخری بادشاہ یزدگرد ہے جو اسلامی فتوحات سے خوف کھا کر بھاگا تو اُس کے ساتھ ایک ہزار مسخرے، ایک ہزار گویے، چیتوں کے ایک ہزار منتظم، بازوں کے ایک ہزار نگران اور بہت سے دوسرے نوکر چاکر تھے مگر پھر بھی وہ خود کو غیر محفوظ اور حقیر پناہ گزین تصور کرتا تھا اور بڑی قابلِ رحم حالت میں تھا جبکہ فارسی قوم انتہائی تنگ دستی اور غربت کی حالت میں زندگی گزار رہی تھی اور مسلسل جنگوں اور ٹیکسوں نے اُس کی کمر توڑ دی تھی۔ [3]

چینی تہذیب کی مذہبی اور معاشرتی حالت

مذہبی زندگی: چھٹی صدی عیسوی میں چین پر تین ادیان کی حکمرانی تھی: دینِ لاؤزو

[1] الملل والنحل: 93,92/2، وماذاخسر العالم بانحطاط المسلمين، ص: 53,52. [2] ماذا خسرالعالم بانحطاط المسلمين، ص: 53. [3] السيرة النبوية للندوي: 14، وإيران في عهد الساسانيين، ص: 196، وتاريخ الطبري: 150/2.

(Laotzu) جو تاؤ مت کے نام سے معروف ہے، دینِ کنفیوشس اور بدھ مت۔ [1] پہلا دین تو خالص بت پرست تھا اور اعمال سے زیادہ تصورات پر زور دیتا تھا۔ اس کے پیروکار عموماً زاہد و راہب قسم کے لوگ تھے۔ تاؤ مت کے بانی کی وفات کے بعد اس مذہب کے پیروکار اسے چھوڑ کر دوسرے مذاہب کی طرف مائل ہو گئے۔ [2]

کنفیوشس عقائد سے زیادہ اعمال پر زور دیتا تھا لیکن اُس کی بیشتر تعلیمات صرف دنیوی اُمور کے بارے میں تھیں۔ اُس کے پیروکار کسی مخصوص معبود کی عبادت کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ وہ درخت، پتھر، دریا وغیرہ جس کی چاہتے عبادت کرتے تھے۔ [3] انھوں نے کنفیوشس کے مجسمے بنائے اور اُس کی پوجا کی۔ وہ اُس کے مجسموں کے سامنے ذبح شدہ جانور اور دوسری قربانیاں پیش کرتے اور اُن کی پوجا کرتے تھے۔

زمانۂ اسلام سے کچھ عرصہ قبل چین میں ارواح، خصوصاً باپ دادوں کی ارواح کی عبادت رائج تھی۔ اُن کا اعتقاد تھا کہ وفات کے بعد مرنے والوں کی روحیں ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ [4]

چین میں بدھ مت ہندوستان سے وارد ہوا۔ یہ مذہب ہندوستان میں بہت قلیل مدت تک اپنی اصل حالت پر قائم رہا تھا۔ جلد ہی ظالم برہمنیت نے اسے نگل لیا، پھر یہ بت پرست دین بن گیا۔ جہاں جہاں ان کی حکومت ہوتی وہاں یہ لوگ بت بھی ساتھ لے جاتے۔ عبادت خانے بناتے اور اُن میں بدھ کے مجسمے نصب کر دیتے۔ ان مجسموں نے اُس مذہبی اور شہری زندگی کا خاتمہ کر دیا جو بدھ مت کی اصل ترقی کے دور میں پائی جاتی تھی۔ اس کے برعکس ان کی زندگی اور عبادت کے طور طریقوں میں جادو اور توہمات کا

[1] الإسلام لأحمد شلبي، ص:43. لاؤزو عمر میں کنفیوشس سے پچاس برس بڑا تھا۔ زندگی کے بعض مسائل پر ان دونوں نے اکٹھے بیٹھ کر بھی غور و فکر کیا تھا۔ [2] ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، ص: 53. [3] ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، ص: 53. [4] الإسلام لأحمد شلبي، ص:41.

چلن عام ہوگیا اور پھر ایک ہزار سال تک حکمرانی کے بعد یہ دین زوال پذیر ہوگیا۔[1] یوں چین میں آنے والا بدھ مت سراسر بت پرستی پر مبنی تھا۔

معاشرتی زندگی: چینی چاہے دین کنفیوشس سے وابستہ تھے یا کسی اور مکتب فکر سے، وہ نورِ یقین اور ایمانی جذبے سے بہرحال بے بہرہ تھے۔ ان کے پاس کوئی آسمانی شریعت نہیں تھی جس سے وہ اپنی مشکلات کا حل نکالتے۔ وہ محض چند دانا لوگوں کی حکمتوں اور عقلمند لوگوں کے تجربات کے مجموعے پر عمل پیرا تھے جن سے انسان جب چاہے فائدہ اٹھالے، جب چاہے انھیں چھوڑ دے۔[2] اس کے نتیجے میں اُن میں بہت سی قباحتیں پیدا ہوگئیں، مثلاً: وہ جاہل عربوں کی طرح، بیٹوں کو بہت معزز سمجھتے تھے۔ جب کسی چینی کو بیٹے کی پیدائش کی خبر دی جاتی تو وہ اپنے گھر کے دروازے پر کمان اور ترکش لٹکا دیتا تھا تاکہ پتہ چلے کہ اس گھر میں قبیلے کا محافظ پیدا ہوا ہے۔ اور جب کسی کو بیٹی کی پیدائش کی اطلاع دی جاتی تو وہ دروازے پر تکلا لٹکا دیتا جو کہ اُن کے ہاں کمزوری اور ذلت کی علامت تھی۔[3]

چینی بدھ مت کے زیرِ سایہ کئی حکومتیں قائم ہوئیں جو بتوں اور مجسموں کی عبادت کی دلدادہ تھیں۔ ان حکومتوں نے اصل بدھ مت کے بھائی چارے والے وسیع باہمی تعلقات منقطع کر ڈالے، بدعات اور باطل رسوم و رواج رائج ہوگئے اور کنفیوشسی فلسفہ طبقاتی نظام کو وجود میں آنے سے نہ روک سکا اگرچہ اس طبقاتی نظام میں اتنی شدت نہیں تھی جو ہندوستان کے بدھ مت طبقاتی نظام میں پائی جاتی ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔[4]

---

[1] ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، ص: 54,53، والإسلام لأحمد شلبي، ص: 41.

[2] ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، ص: 53-55، والإسلام لأحمد شلبي، ص: 44.

[3] الإسلام لأحمد شلبي، ص: 45,44. [4] الإسلام لأحمد شلبي، ص: 45، وماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، ص: 54. اس حوالے سے ابوالحسن علی ندوی کا ماخذ پروفیسر ایشوراٹوپا کی اردو زبان میں تحریر کردہ کتاب ''ہندوستانی تمدن'' ہے۔ کنفیوشسی فلسفے میں طبقاتی نظام کی تفصیلات کے متعلق دکتور حسن شحاتہ سعفان کی کتاب ''کونفوشیوس'' ملاحظہ ہو۔

ہندوؤں کی مذہبی اور معاشرتی حالت

مذہبی زندگی: ہندوستان میں برہمن مذہب کی عملداری تھی۔ اس کے پیروکار کائنات میں موجود قوتوں کی پوجا کرتے تھے۔ انھوں نے ان قوتوں کے مجسمے بنائے اور پھر اُنھی قوتوں کا ان میں حلول کرنا تسلیم کیا، پھر اُن کی پوجا کی۔ اُن کے معبود بے شمار تھے۔ بعدازاں اُن کے عقائد میں تبدیلیاں آتی گئیں۔ بالآخر ان کے تمام معبود اقانیم ثلاثہ (تین جوہر): برہما، شبو اور وشنو میں محدود ہو گئے۔ [1]

مذہب برہمن کے بعد بدھ مت کا نمبر آتا ہے۔ بدھ مت مابعدالطبیعیات کی بحث نہیں کرتا تھا بلکہ اُس کا مطمح نظر معاشرے کی اصلاح تھا اور وہ اس طریقے سے کہ انسانی ارادے کو لذتِ محرومی کی مشق (یوگا وغیرہ) سے پختہ کر دیا جائے اور اسے لذیذ چیزوں کی رغبت پر غلبہ پانے کا عادی بنایا جائے تاکہ کوئی محروم شخص حصولِ لذائذ کی کوشش نہ کرے اور لذتیں میسر نہ آنے پر رنجیدہ نہ ہو۔ [2]

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بیمار افکار کو بدھ کی اخلاقی تعلیم بنا دیا گیا۔ یوں بدھ کی اصلی اخلاقی تعلیمات ان بیمار خیالات کے پردے میں چھپ گئیں۔ یہ سب کچھ پیوندکاری اور کھینچ تان کا نتیجہ تھا۔ بالآخر ہندومت (برہمنیت) کی طرح بدھ مت بھی زوال پذیر ہو گیا اور یہ دونوں مذہب ایک دوسرے میں ایسے گڈمڈ ہوئے کہ ان میں امتیاز مشکل ہو گیا۔ یوں سمجھیے کہ بدھ مت ہندومت میں مدغم ہو کر پگھل گیا اور اُس کا اپنا وجود باقی نہ رہا۔ [3]

بت پرستی ہندو معاشرے کا جزو لاینفک تھی۔ اُن کے معبودوں کی تعداد مضحکہ خیز حد تک بڑھ گئی تھی۔ درحقیقت بت پرستی کو اصل سازگار ماحول ہندوستان میں ملا۔ ہندوؤں کے

[1] الديانات القديمة لمحمد أبوزهرة، ص:28,27. [2] الديانات القديمة لمحمد أبوزهرة، ص: 78,77، والسيرة النبوية للندوي، ص: 6، وماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، ص:55,54.
[3] ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، ص:55,54.

عقیدے کے مطابق بہت سی تاریخی شخصیتوں اور بہادر افراد میں (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ حلول کر گیا تھا۔ وہ پہاڑ بھی ان کے معبود تھے جن پر ان کے دیوتا بیٹھا کرتے تھے۔ اُنھیں چاندی سونے میں بھی اپنے معبودوں کے جلوے نظر آتے تھے۔ ان کی دماغی گمراہی اس حد تک جا پہنچی کہ وہ جنگی آلات، آلاتِ کتابت، آلاتِ تناسل حتی کہ حیوانات، خصوصاً گائے اور اجرامِ فلکیہ تک کو اپنا معبود سمجھنے لگے۔ [1]

معاشرتی زندگی: مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان میں مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی طور پر پست ترین دور وہ ہے جو چھٹی صدی عیسوی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے۔ اُس وقت ہر طرف مفاسد ہی مفاسد تھے حتی کہ دینی عبادت گاہیں بھی مفاسد سے محفوظ نہ رہیں اور بے حیائی کا گڑھ بن گئیں۔ بعض مذہبی فرقوں کے مرد ننگی عورتوں کی پوجا کرتے تھے اور عورتیں ننگے مردوں کو پوجتی تھیں۔ عورت کی کوئی وقعت باقی نہیں رہی تھی۔ بسااوقات مرد جوئے میں اپنی بیویاں ہار آتے تھے۔ بیوہ عورت نکاح ثانی کی مجاز نہیں تھی۔ اونچے طبقے کے لوگوں میں بیوہ کو اپنے خاوند کی چتا میں جل کر مرنا پڑتا تھا۔ اس معاشرے میں عورت کی حیثیت لونڈیوں سے بھی بدتر تھی۔ [2]

ان کے دینی فلسفے کی بنیاد ذات پات پر تھی۔ ہندو معاشرہ چار طبقات پر مشتمل تھا:

* برہمن: یہ دینی پیشوا اور کاہن لوگ تھے۔
* کھتری: یہ جنگجو لوگ تھے جن کا کام ملک کا دفاع تھا۔
* ویش: یہ زراعت و تجارت کرنے والے تھے۔
* شودر: یہ نوکر چاکر تھے اور پہلے تین طبقوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔ انھیں نجس شمار کیا جاتا تھا۔ ان سے میل جول ممنوع تھا۔ انھیں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

[1] ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، ص: 57,56. [2] ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، ص: 59,58.

مذہب کی مقدس کتابیں بھی ان کے لیے ممنوع تھیں۔ وہ انھیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے تھے۔[1] ان غریبوں کو بلا وجہ اور بے تکلف قتل کر دیا جاتا تھا۔شودروں کو جان سے مار دینا کتے، بلی، مینڈک، کوے اور اُلو کو ہلاک کر دینے کے مترادف تھا۔ برہمن قانون سے ماورا تھے۔ انھیں حق حاصل تھا کہ وہ کسی بھی نیچ شخص، یعنی نچلے تین طبقوں کے افراد میں سے جسے چاہیں موت کے گھاٹ اتار دیں۔

ذلت و ہلاکت کا یہی سماں تھا جس میں جزیرۂ عرب کے اندر اور باہر کا سارا عالم ڈوبا ہوا تھا۔ ساری دنیا کے انسان سسک رہے تھے۔ وقت کا تقاضا تھا کہ آخری رسول کی تشریف آوری ہو، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے عرب و عجم کو اس تباہی، ذلت اور اندھیرے سے نکالنے کے لیے حضرت محمد ﷺ کو تمام دنیا کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔

---

[1] ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، ص: 60,59.اس حوالے سے ندوی کا ماخذ ہندو قانون کی کتاب ''منوشاستر'' ہے۔والسيرة النبوية للندوي، ص: 15.

باب

2

پیدائش سے بعثت تک

- رسول اللہ ﷺ کی ولادت اور نسب نامہ
- پرورش
- عنفوان شباب
- ارہاصات واشاراتِ نبوت

﴿ أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝ ﴾

''کیا اس نے آپ کو یتیم نہ پایا، پھر ٹھکانا دیا۔ اور آپ کو ناواقفِ راہ پایا، پھر ہدایت بخشی۔''

[الضحیٰ 93:6،7]

«إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اصْطَفٰى كِنَانَةَ مِنْ وَّلَدِ إِسْمَاعِيلَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ، وَاصْطَفٰى قُرَيْشًا مِّنْ كِنَانَةَ، وَاصْطَفٰى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشِمٍ، وَّاصْطَفَانِي مِنْ بَنِي هَاشِمٍ»

''اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے کنانہ کو چنا، کنانہ سے قریش کو، قریش سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم سے مجھے منتخب فرمایا۔''

[صحیح مسلم، حدیث:2276]

رسول ﷺ کی ولادت اور نسب نامہ

ولادت اور نسب نامہ

مشہور یہ ہے کہ آپ عام الفیل (ہاتھی کے حملے والے سال) 12 ربیع الاول کو سوموار کے دن مکہ میں یتیم پیدا ہوئے۔[1]

محمد (ﷺ) بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مُرّہ بن کعب بن لُؤی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں آپ ﷺ کا اتنا ہی نسب بیان کیا ہے[2] اور یہی علماء کے درمیان متفق علیہ ہے۔ اس سے اوپر حضرت آدم علیہ السلام تک بہت اختلاف ہے۔کوئی قابل اعتماد بات نہیں ملتی، البتہ یہ بات متفقہ ہے کہ عدنان حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام ہی کی نسل سے ہیں۔[3] رسول اللہ ﷺ کے ننھیال بنو زہرہ

[1] صحيح السيرة النبوية لابن طرهوني، ص:271-276. [2] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب مبعث النبي ﷺ، قبل الحديث:3851. [3] یہ بیان رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کی رو سے ہے جس میں آپ نے فرمایا: ''امر واقع یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے کنانہ کا انتخاب کیا اور کنانہ سے قریش کو منتخب کیا اور قریش سے بنوہاشم کو چنا اور بنو ہاشم سے میرا انتخاب کیا۔'' ◄◄

ہیں۔[1] آپ کی والدہ حضرت آمنہ بنت وہب اس خاندان سے تھیں۔[2] اُن کا نسب کلاب بن مُرّہ پر آپ ﷺ کے نسب سے جا ملتا ہے۔[3]

اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ تھا کہ آپ حسب ونسب کے لحاظ سے تمام انسانوں سے اعلیٰ اور اقدس ہوں اور اپنی قوم، قبیلہ اور خاندان کے لحاظ سے سب سے زیادہ بلند مرتبہ ہوں۔ اس کے بارے میں خود رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اصْطَفٰى كِنَانَةَ مِنْ وَّلَدِ إِسْمَاعِيلَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَ السَّلَامُ، وَاصْطَفٰى قُرَيْشًا مِّنْ كِنَانَةَ، وَاصْطَفٰى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشِمٍ، وَّاصْطَفَانِي مِنْ بَنِي هَاشِمٍ»

''اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے کنانہ کو چنا، کنانہ سے قریش کو، قریش سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم سے مجھے منتخب فرمایا۔''[4]

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا تو مجھے بہترین مخلوق میں رکھا، پھر جب اُن کے دو گروہ (عرب و عجم) بنائے تو مجھے بہترین گروہ (عرب) میں رکھا، پھر جب قبائل بنائے تو مجھے بہترین قبیلے (قریش) میں رکھا، پھر جب (قریش کے) خاندان بنائے تو مجھے بہترین خاندان (بنو ہاشم) میں رکھا، لہٰذا میں نسبی اور خاندانی لحاظ سے سب لوگوں سے بہترین ہوں۔''[5]

◄ دیکھیے: (صحیح مسلم، الفضائل، باب فضل نسب النبي ﷺ وتسليم الحجر عليه قبل النبوة، حديث: 2276) [1] صحيح البخاري، المناقب، باب مناقب قريش، حديث: 3505. [2] فتح الباري: 14/230، شرح الحديث: 3505. [3] السيرة النبوية لابن حبان، ص: 44. حافظ ابن عساکر نے اپنی کتاب میں اس عنوان سے باب باندھا ہے: معرفة أمّه وجدّاته [من جهة الأم والأب] وعمومته وعماته، دیکھیے: (تاريخ دمشق (السيرة النبويّة، تحقيق نشاط غزاوي): 1/80-102) [4] صحيح مسلم، الفضائل، باب فضل نسب النبي ﷺ ......، حديث: 2276. [5] جامع الترمذي، المناقب، باب ماجاء في فضل النبي ﷺ، حديث: 3607، ودلائل النبوة للبيهقي: 1/168 ◄

قیصر کے دربار میں ابوسفیان آپ ﷺ کے نسب کی عظمت اور برتری کا انکار نہ کر سکے باوجود اس کے کہ وہ اس وقت آپ کے شدید دشمن تھے، پھر بھی انھوں نے اعتراف کیا کہ ''آپ ہم میں بلند نسب والے ہیں۔'' [1]

حضرت محمد ﷺ کا نام آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب اور والدہ حضرت آمنہ بنت وہب نے اپنے خاندان کے ناموں سے جداگانہ رکھا۔ اُن کی خواہش تھی کہ آسمانوں میں اللہ تعالیٰ آپ کی تعریف فرمائے اور زمین پر ساری مخلوق آپ کی توصیف میں رطب اللسان رہے۔ [2]

اعلیٰ نسب کی حکمتیں اور فوائد

* عربوں کا مزاج اور رواج یہ تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کی بات نہیں سنتے تھے جو اعلیٰ نسب کا حامل نہ ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ اُس کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ سب سے عالی نسب ہوں تاکہ دشمنانِ اسلام لوگوں کو دینِ اسلام سے روکنے کے لیے اس معاملے کو ہتھکنڈہ نہ بنا سکیں اور کسی کے دل میں یہ بات نہ آئے کہ یہ نبی اپنے دعوائے رسالت کے ذریعے سے اپنی معاشرتی حیثیت بلند کرنا چاہتا ہے۔
* رسولِ اکرم ﷺ کے عرب ہونے کا تقاضا ہے کہ ہر مسلمان عربوں سے بحیثیت قوم محبت رکھے، البتہ ہر فرد کے ساتھ محبت رکھنا ضروری نہیں کیونکہ افراد تو اسلام سے منحرف بھی ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں اُن کے افعال سے نفرت ہوگی نہ کہ قومِ عرب سے۔

◄◄ واللفظ له. یہ روایت ضعیف ہے۔ [1] صحيح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي ......، حديث: 7. [2] فتح الباري: 3/15، ودلائل النبوة للبيهقي: 161/1. ابن حجر نے بیہقی کی سند کو مرسل قرار دیا ہے۔

ختنہ اور نام

آپ کے ختنے کے بارے میں علمائے کرام میں اختلاف ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ آپ ختنہ شدہ پیدا ہوئے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کے دادا محترم نے آپ کی ولادت کے ساتویں دن آپ کا ختنہ کیا، قبیلے کی دعوت کی اور آپ کا نام محمد رکھا۔[1] لیکن قدیم کبار محققین کے نزدیک قابلِ ترجیح یہی ہے کہ آپ مختون پیدا ہوئے تھے۔ (26)

جب آپ کے دادا محترم سے پوچھا گیا کہ آپ نے مشہور خاندانی نام چھوڑ کر یہ جداگانہ نام کیوں رکھا؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ میری تمنا ہے اللہ تعالیٰ آسمانوں میں اور ساری مخلوق زمین میں اس کی تعریف و ستائش کرے۔[2]

(26) **مختون پیدائش کی تحقیق:** محدّث ابونُعیم نے ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''میرے رب کی طرف سے میری ایک کرامت یہ ہے کہ میں ختنہ شدہ پیدا ہوا اور کسی نے میری شرمگاہ نہیں دیکھی۔'' دیکھیے: (دلائل النبوة لأبي نعيم: 154/1) ابونُعیم کی کتاب کے محققین کا کہنا ہے کہ اس روایت کو طبرانی نے اپنی کتاب اوسط میں اور خطیب اور ابن عساکر نے بھی انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کیا ہے جس کی کئی ایک اسانید ہیں۔ ضیاء مقدسی نے اپنی کتاب المختارہ میں اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے لکھا: ''اس کے بارے میں تواتر سے احادیث روایت کی گئی ہیں کہ آنحضرت ﷺ ختنہ شدہ پیدا ہوئے۔'' دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 602/2) علاوہ ازیں ملاحظہ کیجیے: (السيرة النبوية لابن حبان، ص:58، والسيرة الشامية: 421،420/1) معروف محقق طرہونی نے اپنی معرکہ آرا کتاب صحيح السيرة النبوية میں ان احادیث کو قوی قرار دیا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ختنہ آپ کے دادا نے کیا۔

[1] ولید بن مسلم نے اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول روایت کیا ہے۔ ذہبی نے اپنی کتاب تاریخ الاسلام میں یہ قول نقل کرنے کے بعد لکھا: ''یہ روایت اس روایت سے زیادہ صحیح ہے جسے ابن سعد نے اپنی سند سے، جو ابن عباس رضی اللہ عنہما تک پہنچتی ہے، نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس حالت میں پیدا ہوئے کہ ختنہ کیا ہوا تھا اور ناف کی نال کٹی ہوئی تھی۔'' دیکھیے: (الطبقات الكبرىٰ: 103/1) [2] فتح الباري: 3/15. بیہقی کی یہ روایت بسند مرسل نقل کی گئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ اس نام کے علاوہ دیگر ناموں سے بھی معروف تھے۔ آپ ﷺ کا اپنا فرمان ہے:

«إِنَّ لِي أَسْمَاءً: أَنَا مُحَمَّدٌ، وَّأَنَا أَحْمَدُ، وَأَنَا الْمَاحِي الَّذِي يَمْحُو اللّٰهُ بِيَ الْكُفْرَ، وَأَنَا الْحَاشِرُ الَّذِي يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى قَدَمِي، وَأَنَا الْعَاقِبُ»

''میرے کئی نام ہیں: میں محمد ہوں، احمد ہوں، ماحی ہوں جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کفر کو مٹائے گا، میں حاشر ہوں جس کے قدموں (کے نشانات) پر لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا، میں عاقب (آخری نبی) ہوں۔''

راویِ حدیث زہری کہتے ہیں کہ عاقب سے مراد یہ ہے آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ [1]

ابن سعد رحمہ اللہ کی حدیث میں ایک اور نام ''خاتم'' کا اضافہ ہے۔ [2]

امام مسلم رحمہ اللہ نے دو اور نام بھی روایت کیے ہیں:

''مُقَفِّي (پیچھے آنے والا) اور نَبِيُّ الرَّحْمَةِ۔'' [3]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''نَبِيُّ الْمَلَاحِمِ'' کا اضافہ کیا ہے۔ [4] کئی ایک احادیث میں

[1] صحيح البخاري، التفسير، باب: ﴿مِنۢ بَعْدِى ٱسْمُهُۥٓ أَحْمَدُ﴾، حديث: 4896، وصحيح مسلم، الفضائل، بابٌ في أسمائه ﷺ، حديث: 2354. [2] الطبقات الكبرٰى: 104/1. حافظ ذہبی کا کہنا ہے کہ ابن سعد کی سند قوی اور حسن ہے۔ [3] صحيح مسلم، الفضائل، بابٌ في أسمائه ﷺ، حديث: 2355. اس حدیث میں ایک اور نام نبي التوبة کا ذکر بھی ہے۔ [4] الشمائل المحمدية للترمذي، باب ما جاء في أسماء رسول الله ﷺ، حديث: 366. اس روایت کی سند حسن ہے۔ تاریخ الاسلام کے محقق نے بھی اسے حسن کہا ہے، دیکھیے: (تاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي، ص: 31) رسول اللہ ﷺ کے تمام اسماء کے متعلق روایات کے لیے دیکھیں: (دلائل النبوة للبيهقي: 151/1 و161، والسيرة الشامية: 512/1-663) علامہ شامی نے رسول اللہ ﷺ کے تمام اسماء حروف تہجی کی ترتیب سے درج کیے ہیں۔

مذکور ہے کہ آپ ﷺ کی والدہ محترمہ نے آپ کا نام ''احمد'' رکھا۔ ابن سعد نے حسن سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«سُمِّيتُ أَحْمَدَ» ''میرا نام احمد رکھا گیا تھا۔''[1]

''محمد'' اور ''احمد'' دونوں نام قرآن مجید کی نصوص سے ثابت ہیں۔[2]

چونکہ آپ ﷺ کے والد گرامی آپ کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے، نام رکھنے کی ذمہ داری آپ کی والدہ محترمہ ہی پر آ گئی۔ اس کی تائید ابن سعد کی اُس روایت سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے واقدی کی سند سے ابوجعفر محمد بن علی رحمہ اللہ سے نقل کی ہے۔ انھوں نے کہا: ''محترمہ آمنہ کو، جبکہ محمد ﷺ ابھی ان کے بطن میں تھے، یہ حکم دیا گیا کہ اس بچے کا نام ''احمد'' رکھیں۔''[3] مزید تائید ابونعیم کی روایت سے ہوتی ہے جو انھوں نے حضرت بریدہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے نقل کی ہے کہ ''محترمہ آمنہ نے خواب میں دیکھا۔ ان سے کہا گیا کہ تمھارے بطن میں وہ بچہ ہے جو مخلوق میں سب سے بہترین اور سب جہانوں کا سردار ہے۔ جب یہ بچہ پیدا ہو تو اس کا نام ''احمد'' اور ''محمد'' رکھنا......''[4]

ابن اسحاق نے ایک روایت نقل کی ہے جسے اُن کے حوالے سے امام بیہقی نے بھی اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے: ''حضرت آمنہ بیان فرماتی تھیں کہ جب میں حاملہ ہوئی اور محمد نے میرے بطن میں سانس لیا تو مجھ سے کہا گیا: ''جب یہ بچہ پیدا ہو تو اُس کا نام ''محمد'' رکھنا کیونکہ اس کا نام تورات و انجیل میں ''احمد'' ہے۔ زمین و آسمان کے سب لوگ اس کی تعریف کریں گے اور اس کا نام قرآن میں ''محمد'' ہوگا۔''[5]

---

[1] الطبقات الكبرٰى: 104/1. [2] آل عمرٰن 144:3، والأحزاب 40:33، ومحمد 2:47، والفتح 29:48، والصف 6:61. [3] الطبقات الكبرٰى: 104/1. [4] دلائل النبوة لأبي نعيم: 37,36/1.
[5] السيرة النبوية لابن هشام: 210/1. ابن ہشام کے الفاظ ابونُعیم کے الفاظ کے قریب ہیں اور یہ روایت بلا سند ہے جو ضعیف ہے۔ ودلائل النبوة للبيهقي: 112,111/1.

اسی لیے انھوں نے یہ نام رکھا۔ اس روایت کے آخر میں ہے کہ آپ ﷺ کی والدہ نے آپ کے دادا عبدالمطلب کو بتا دیا تھا کہ مجھے اس بچے کا یہ نام رکھنے کا حکم دیا گیا ہے تو انھوں نے چند شعر کہے جن کا آخری مصرع ہے:

«أَحْمَدُ مَكْتُوبٌ عَلَى اللِّسَانِ» ”لفظ احمد منجانب اللہ زبان پر رکھا گیا ہے۔“

یہ روایت ابن عساکر نے بھی نقل کی ہے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ کی کنیت ابوالقاسم تھی۔ [2] آپ ﷺ نے فرمایا: ”میرے نام پر اپنا نام تو رکھ سکتے ہو مگر میری کنیت پر اپنی کنیت نہ رکھو۔“ [3] حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ کی کنیت ”ابوابراہیم“ رکھی تھی لیکن آپ نے اپنی معروف کنیت ترک کرنی پسند نہ فرمائی۔ [4] اس امر پر علماء کا اختلاف ہے کہ کیا اب رسول ﷺ والی کنیت رکھی جا سکتی ہے؟ اور کیا آپ کے نام اور کنیت دونوں کسی شخص کے لیے اکٹھے کیے جا سکتے ہیں؟ جواب میں کہا گیا ہے: ”آپ ﷺ والی کنیت کی ممانعت صرف آپ کی زندگی میں تھی، البتہ آپ کے نام اور کنیت کو جمع کرنا درست نہیں۔“ [5]

”احمد“ نام آپ سے پہلے عرب میں معروف نہیں تھا، البتہ بعض لوگوں نے اپنے بیٹوں کے نام ”محمد“ رکھے ہوئے تھے، کیونکہ آپ کی ولادت سے قبل ہی یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ ایک نبی آنے والا ہے جس کا نام نامی ”محمد“ ہوگا۔ [6]

---

[1] تاریخ دمشق الکبیر: 404/1. [2] صحیح مسلم، الآداب، باب النهي عن التكني بأبي القاسم وبيان مايستحب من الأسماء، حديث: 2133، و مسند أحمد: 433/2 و 301/3، والطبقات الكبرى: 107/1. [3] صحيح البخاري، الأدب، باب قول النبي ﷺ: «سمّوا باسمي ولا تكنوا بكنيتي»، حديث: 6187، وصحيح مسلم، الآداب، باب النهي عن التكني بأبي القاسم......، حديث: 2134. رسول اللہ ﷺ کی کنیت کے بارے میں دیگر روایات کے لیے ملاحظہ کیجیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 162/1-164) [4] تاریخ دمشق الکبیر: 27/1-36. روایت کی سند حسن ہے۔ [5] تاریخ دمشق الکبیر: 26-34، والوفا لابن الجوزي، ص: 103,102. [6] السيرة الشامية: 503/1.

یتیمی میں دادا اور چچا کی کفالت

مؤرخین رسول اللہ ﷺ کے والدِ محترم کی وفات کی تاریخ کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ ابن اسحاق کے بقول جسے ابن سعد نے بھی ترجیح دی ہے، اُن کی وفات کے وقت آپ ﷺ اپنی والدہ محترمہ کے بطن میں تھے۔[1] مشہور قول یہی ہے اور اکثر علماء نے اسی کو ترجیح دی ہے۔[2] قرآن مجید کی یہ آیت بھی اس امر کی تائید کرتی ہے کہ آپ ﷺ یتیم پیدا ہوئے تھے: ﴿ أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ﴾ ''کیا اللہ نے آپ کو یتیم نہ پایا، پھر ٹھکانا دیا۔''[3]

علامہ سہیلی نے آپ ﷺ کے والدِ محترم کی وفات کے بارے میں لکھا ہے: ''بتایا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کے والدِ محترم فوت ہوئے تو آپ اپنی والدہ کے پیٹ میں تھے لیکن اکثر علماء اس بات کے قائل ہیں کہ آپ اُس وقت پیدا ہو چکے تھے اور جھولے میں تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ دو ماہ کے تھے۔ بعض نے اس سے زائد بھی کہا ہے، مثلاً: ایک قول یہ ہے کہ آپ اٹھائیس ماہ کے تھے کہ آپ کے والد فوت ہوئے۔ اس کی تائید میں حضرت عبدالمطلب کے یہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن میں وہ ابوطالب سے کہتے ہیں:

أُوصِيكَ يَا عَبْدَ مَنَافٍ بَعْدِي بِمُوْتَمٍ بَعْدَ أَبِيهِ فَرْدِ
فَارَقَهُ وَهُوَ ضَجِيعُ الْمَهْدِ

''اے عبد مناف (ابوطالب کا نام)! میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ میرے بعد اس یتیم کا خیال رکھنا۔ اسے اُس کا باپ جھولے میں پڑا چھوڑ گیا ہے۔''[4]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 210/1. روایت بلا سند ہے، چنانچہ ضعیف قرار دی جائے گی۔ والطبقات الکبرٰی: 100,99/1. روایت کی سند ضعیف ہے۔ [2] البداية والنهاية: 286,285/2. [3] الضحٰی 6:93. [4] الروض الأنف: 184/1.

عبدالمطلب، ابو طالب سے اٹھارہ سال بڑے تھے۔ شامی نے علامہ سُہیلی کے اس بیان پر جس سے متعدد علماء متفق ہیں، تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''میں کہتا ہوں: حقیقت یہ ہے کہ یہ اکثر علماء کا قول نہیں، البتہ بہت سے علماء اس کے قائل ہیں۔''[1]

پرورش

جب رسول اللہ ﷺ کے والد فوت ہوئے تو آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی پرورش کا ذمہ لے لیا، تاہم آپ کی نگرانی اور دیکھ بھال آپ کی والدہ ماجدہ ہی کرتی تھیں۔[2] آپ ﷺ کے والدِ محترم مدینہ منورہ میں فوت ہوئے جہاں اُن کے ننھیال، یعنی اُن کے والد عبدالمطلب کے ماموں، بنو عدی بن نجار رہتے تھے۔ انھیں حضرت عبدالمطلب نے کھجوریں خریدنے مدینہ بھیجا تھا۔[3] آپ کو دارِ نابغہ میں دفن کیا گیا۔ اگر کوئی دارِ نابغہ میں داخل ہو تو اُس کے بائیں ہاتھ دوسرے کمرے کی چوکھٹ کے پاس اُن کا مدفن ہے۔ اُن کی وفات پچیس سال کی عمر میں ہوئی۔[4]

بنوسعد کے علاقے سے واپسی کے بعد آپ ﷺ اپنی والدہ ماجدہ کی نگرانی اور دادا محترم کی سرپرستی میں رہے۔ جب آپ ﷺ کی عمر چھ سال ہوئی تو آپ کی والدہ آمنہ

[1] سبل الھدٰی والرشاد: 398/1. [2] یہ امر کئی ایک روایات کے ذریعے سے، جو حسن لغیرہ کے درجے تک پہنچتی ہیں، ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی کفالت آپ کے دادا نے کی تھی۔ اس حوالے سے ملاحظہ ہو: (صحیح السیرة النبویة لابن طرھوني، حاشیة: 132و141و161و167) [3] الاستیعاب لابن عبد البر: 14/1. ابن عبدالبر نے یہ روایت زہری کے حوالے سے نقل کی ہے جس کی سند مرسل ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے عبداللہ کو تجارت کی غرض سے شام روانہ کیا تھا، غزہ سے واپسی پر وہ بیمار ہوئے اور مدینہ آکر وفات پا گئے، دیکھیے: (الطبقات الکبرٰی: 99/1) ابن سعد کی روایت واقدی سے ہے۔ [4] الطبقات الکبرٰی: 99/1، وتاریخ المدینة: 117,116/1.

بمقام ابواء وفات پا گئیں۔ (27) وہ رسول اللہ ﷺ کو لے کر آپ کے دادا کے ننھیال بنوعدی بن نجار کے پاس مدینہ منورہ گئی تھیں، (28) واپسی پر ان کی وفات کا واقعہ پیش آ گیا۔ [1] آپ ﷺ کی دایہ ام ایمن، جو آپ کے والد کی لونڈی تھیں، آپ کو لے کر آپ کے دادا عبدالمطلب کے پاس مکہ پہنچیں۔ دادا نے اپنی وفات تک آپ ﷺ کو بڑی شفقت اور محبت سے رکھا۔ اُن کی وفات کے وقت آپ ﷺ کی عمر آٹھ سال تھی۔ [2] انھوں نے وفات کے وقت آپ ﷺ کو آپ کے چچا ابوطالب کے

(27) ابواء: یہ ایک بستی کا نام ہے۔ اس کے اور جحفہ کے درمیان 23 میل کا فاصلہ ہے۔ جحفہ مدینہ کے قریب ہی واقع ہے، دیکھیے: (معجم البلدان: 79/1) دیگر جغرافیہ دانوں کے نزدیک ابواء تہامی حجاز کی ایک وادی ہے جہاں دو وادیوں فرع اور قاحہ کا ملاپ ہوتا ہے۔ یہ وادی مستورہ شہر کے پاس سے گزرتے ہوئے اترائی میں سمندر تک جا پہنچتی ہے، دیکھیے: (معجم المعالم الجغرافية في السيرة لعاتق البلادي)

(28) بنوعدی بن نجار: یہ عبدالمطلب کے ننھیال یوں بنے کہ ہاشم بن عبدمناف نے مدینہ میں سلمٰی بنت عمرو سے شادی کر رکھی تھی جن کا تعلق قبیلۂ نجار سے تھا۔ انھی سلمٰی کے بطن سے عبدالمطلب (شیبہ) نے جنم لیا، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 223/1، ودلائل النبوة للبيهقي: 188/1)

[1] الطبقات الكبرىٰ: 116/1. ابن سعد نے یہ روایت واقدی کی سند سے نقل کی ہے۔ ابن ہشام نے یہ روایت ابن اسحاق کے حوالے سے نقل کی جس کی سند مرسل صحیح ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 223,222/1)، والمصنف لعبدالرزاق: 318/5. عبدالرزاق کی سند بھی مرسل صحیح ہے۔ ابواء میں رسول اللہ ﷺ کی والدہ ماجدہ آمنہ کی وفات کے متعلق روایت کئی سندوں سے نقل ہوئی ہے۔ یہ سندیں آپس میں ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہوئے حسن لغیرہ کے درجے تک جا پہنچتی ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (صحيح السيرة النبوية لابن طرهوني، حاشية: 166,165) [2] السيرة النبوية لابن هشام: 223/1. ابن ہشام نے یہ روایت ابن اسحاق کے حوالے سے درج کی جس کی سند مرسل ہے۔ وأخبار مكة: 315,314/1. ازرقی کی سند حسن ہے۔ وتاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 25/1. ذہبی کی سند معلق ہے۔ اس روایت کی تائید میں ایک شاہد بیہقی کی روایت ہے جو انھوں نے صحیح سند سے نقل کی ہے اور دوسرا شاہد عبدالرزاق کی روایت ہے جس کی سند مرسل صحیح ہے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 22/2، والمصنف لعبدالرزاق: 318/5)

سپرد کر دیا۔ [1]

حضرت عبدالمطلب آپ ﷺ پر انتہائی شفقت فرماتے اور آپ سے غایت درجہ محبت رکھتے تھے۔ ان کی محبت و شیفتگی کے کئی واقعات منقول ہیں۔ ایک واقعہ ابو یعلیٰ نے بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ عبدالمطلب نے آپ ﷺ کو گم شدہ اونٹ ڈھونڈنے بھیجا۔ اونٹ کی تلاش میں آپ کو دیر ہوگئی تو دادا نہایت غمگین ہوئے۔ انھوں نے فوراً بیت اللہ کا طواف شروع کر دیا اور بار بار یہی شعر پڑھتے رہے:

رَبِّ رُدَّ إِلَيَّ رَاكِبِي مُحَمَّدًا   يَا رَبِّ رُدَّهُ وَاصْنَعْ عِنْدِي يَدًا

''رب کریم! میرے سوار محمد کو میرے پاس واپس بھیج دے۔ رب کریم! اُسے ضرور واپس بھیج دے اور مجھ بوڑھے پر احسان فرما۔''

اور جب آپ ﷺ اونٹ لے کر واپس آگئے تو عبدالمطلب نے قسم کھائی کہ آج کے بعد آپ کو کبھی کسی کام کے لیے نہیں بھیجوں گا نہ کبھی اپنے سے جدا کروں گا۔ [2]

وہ آپ ﷺ کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جب آپ سوئے ہوتے تو وہ آپ کی خواب گاہ تک کسی کو نہ جانے دیتے۔ عبدالمطلب کی خصوصی مسند پر ان کے سوا کوئی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ کعبہ کے سائے میں اُن کی مسند بچھی ہوتی اور اُن کے بیٹے اردگرد بیٹھے ہوتے

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 235/1. ابن ہشام نے یہ روایت بلا سند نقل کی ہے۔ والطبقات الكبرٰى: 188/1. ابن سعد نے یہ روایت واقدی کی سند سے نقل کی ہے۔ وتاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 50/1. من جملہ ان روایات کے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس امر کی واقعی کوئی نہ کوئی اصل ہے، ایک روایت وہ ہے جس میں یہ تذکرہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے بچپن میں چچا ابو طالب کے ہمراہ شام کا سفر کیا اور وہاں آپ کی ملاقات بحیرا راہب سے ہوئی۔ یہ واقعہ بالکل صحیح ہے اور اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔ [2] مجمع الزوائد: 244/8. ہیثمی نے اس سند کو حسن قرار دیا ہے۔ والمستدرك للحاكم: 604,603/2. حاکم نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ ودلائل النبوة للبيهقي: 21,20/2. بیہقی نے اسے دو سندوں سے روایت کیا ہے جن میں سے ایک سند حاکم کی ہے۔

مگر آپ ﷺ اپنے دادا کے ساتھ مسند پر بیٹھتے تھے۔ [1]

سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت ابوطالب بھی آپ ﷺ سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ سوتے تو آپ کو اپنے قریب سلاتے۔ باہر جاتے تو آپ کو ساتھ لے کر جاتے۔ جب تک آپ نہ آتے کھانا نہ کھاتے اور آپ کے لیے خصوصی کھانا پکواتے تھے۔ [2] ساری زندگی آپ ﷺ کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کی حتی کہ ہجرت سے تین سال پہلے وفات پا گئے۔

یتیمی کی حکمت

* اللہ تعالیٰ کا منشا یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ یتیم پیدا ہوں اور اپنے والد، والدہ اور دادا کے دائرۂ تربیت سے دور رہیں۔ آپ ﷺ کے والدِ محترم تو آپ کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے، پھر آپ ﷺ نے اپنے ابتدائی بچپن کا اکثر حصہ اپنے خاندان سے دُور بنوسعد کے صحرا میں بسر کیا۔ وہاں سے واپس آئے تو کچھ مدت بعد ہی آپ ﷺ کی والدہ بھی انتقال کر گئیں۔ آپ ﷺ ان کی خدمت میں بہت کم رہے اور والدہ محترمہ کی وفات کے کچھ عرصے بعد آپ کے دادا بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یقیناً اس میں کئی حکمتیں ہوں گی۔ سب سے بڑی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ کوئی باطل پرست

[1] أخبار مكة: 315,314/1. ازرقی کی سند حسن ہے اور اس کی تائید میں کئی ایک شواہد بھی روایت کیے گئے ہیں۔ والسيرة النبوية لابن هشام: 223/1. ابن ہشام نے اس روایت کو ابن اسحاق کے حوالے سے بلاسند نقل کیا ہے۔ [2] الطبقات الكبرىٰ: 120,119/1. ابن سعد نے یہ روایت واقدی کی سند سے نقل کی ہے۔ واقدی متروک الحدیث ہے، چنانچہ یہ سند بہت ضعیف ہے۔ من جملہ ان روایات کے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقدی کی اس روایت کی واقعی کوئی اصل ہے، ایک صحیح روایت ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے بچپن میں چچا ابوطالب کے ہمراہ شام کا سفر کیا جہاں آپ کی ملاقات بحیرا راہب سے ہوئی۔ اس واقعے کی تفصیلات اپنی جگہ آ رہی ہیں۔

دلوں میں یہ شک پیدا نہ کر سکے اور لوگوں کے دلوں میں یہ وہم نہ ڈال سکے کہ آپ ﷺ نے اپنی دعوت و رسالت کا سبق بچپن ہی سے اپنے والدین یا دادا سے حاصل کیا تھا تاکہ نبوت کا کھٹ راگ رچا کر دنیا میں عزت و جاہ حاصل کر سکیں کیونکہ آپ کے دادا محترم کو اپنی قوم میں قابلِ فخر مقام حاصل تھا۔ حاجیوں کو پانی پلانے اور کھانا کھلانے کی سعادت اور عہدے انھیں حاصل تھے۔ [1]

* آپ کی یتیمی میں ہر دور اور ہر مقام کے یتیموں کے لیے یہ اسوہ ہے کہ یتیمی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا اور عذاب نہیں کہ وہ یتیم کو اعلیٰ مراتب پر فائز ہونے سے روک دے۔

بوقتِ ولادت نبوت کے ارہاصات و اشارات

آپ ﷺ کی پیدائش کے ساتھ ہی ایسے اشارات ظاہر ہونے لگے جو آپ ﷺ کے نبی بننے پر دلالت کرتے تھے۔ بعض تو انتہائی صحیح سندوں کے ساتھ ثابت ہیں، مثلاً خود آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا نتیجہ ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری کا مصداق ہوں۔ میں بطن مادر ہی میں تھا، میری والدہ کو خواب میں نظر آیا کہ اُن کے وجود مبارک سے ایک نور نکلا جس سے علاقہ شام میں بصریٰ شہر کے محل چمک اٹھے۔'' [2]

ابن اسحاق، ابن سعد، امام حاکم اور امام احمد بن حنبل کی ایک روایت میں آپ ﷺ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ سعدیہ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کی والدہ محترمہ حضرت آمنہ نے فرمایا: ''جب میں نے اپنے بچے (محمد) کو جنم دیا تو اس نے اپنے ہاتھ زمین پر رکھے

[1] عبدالمطلب کے سقایہ ورفادہ کے عہدوں پر فائز ہونے کے متعلق ابن اسحاق نے روایت کیا ہے۔ ان کی روایت بلا سند ہے۔ السيرة النبوية لابن هشام: 192/1، نیز دیکھیے: (فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 51,50) [2] مسند أحمد: 127/4، 262/5، ومجمع الزوائد: 212/8.

ہوئے تھے اور سر آسمان کی طرف اٹھا رکھا تھا۔" [1]

دوسری روایت میں ہے کہ جب آپ ﷺ کی والدہ نے آپ کو جنم دیا تو آپ کو اس زمانے کے رواج کے مطابق ایک ہنڈیا کے نیچے رکھا گیا۔ صبح ہوئی تو آپ ﷺ کی والدہ نے دیکھا کہ ہنڈیا دو ٹکڑے ہو چکی ہے اور آپ نظر اوپر اٹھائے آسمان کو تک رہے ہیں۔ [2]

بعض ایسی باتیں بھی ہیں جو اگرچہ صحیح سندوں کے ساتھ ثابت نہیں مگر مشہور ہیں، مثلاً یہ کہ جب آپ ﷺ پیدا ہوئے تو کسریٰ کے محل کے چودہ کنگرے ٹوٹ گئے اور مجوسیوں نے اپنے بڑے عبادت خانے میں عبادت کے لیے جو آگ جلا رکھی تھی وہ بجھ گئی۔ جھیل ساوہ (29) کا پانی خشک ہو کر گہرا ہو گیا اور ارد گرد کے بت خانے گر گئے۔ [3]

رسول اللہ ﷺ کا دورِ رضاعت

تمام مؤرخین کے نزدیک مشہور ہے کہ آپ ﷺ کو دودھ پلانے والی خواتین میں سے

(29) ساوہ: رَے اور ہمدان کے درمیان ایک شہر ہے جو ان دونوں سے تیس فرسنگ (166 کلومیٹر تقریبا) کے فاصلے پر ہے۔ اس کے باسی شافعی المسلک ہیں۔ اس کے قریب ہی شیعہ باسیوں کا ایک شہر "آوہ" کے نام سے آباد ہے۔ 617ھ - 1220ء میں تاتاریوں نے ان دونوں شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور تمام شہریوں کو قتل کر دیا۔ اس وقت ساوہ میں بہت بڑا کتب خانہ قائم تھا اسے بھی تاتاریوں نے جلا دیا، دیکھیے: (معجم البلدان: 179/3)

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 219/1. ابن اسحاق کی اس روایت کی سند منقطع ہے اور اس میں ایک راوی فضالہ ضعیف ہے۔ والطبقات الكبرىٰ: 202/1. سند مرسل ہے۔ والمستدرك للحاكم: 616/2. حاکم نے اپنی روایت کو صحیح قرار دیا اور کہا کہ یہ امام مسلم کی شرط کے مطابق ہے۔ ذہبی نے اس پر ان کی موافقت کی ہے۔ ومسند أحمد: 184/4. سند حسن ہے۔ [2] الطبقات الكبرىٰ: 113/1. سند مرسل ہے۔ ودلائل النبوة لأبي نعيم: 138/1، ودلائل النبوّة للبيهقي: 113/1. سند مرسل اور قابلِ اعتماد ہے جیسا کہ ابن طرہونی نے کہا ہے، دیکھیے: (صحيح السيرة النبوية لابن طرهوني: 286/1) [3] دلائل النبوة للبيهقي: 126/1-129. کتاب کے محقق کا کہنا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

ممتاز حضرت حلیمہ بنت ابی ذؤیب سعدیہ ہیں۔ وہ آپ ﷺ کو اپنے ساتھ اپنی قوم بنوسعد کے علاقے میں لے گئیں اور آپ اُن کے پاس چار سال رہے، پھر وہ آپ ﷺ کو واپس آپ کی والدہ محترمہ کے پاس چھوڑ گئیں۔

حضرت حلیمہ کے دودھ پلانے اور اُن کے ہاں آپ ﷺ کے رہنے کا واقعہ صرف ابن اسحاق نے بیان کیا ہے۔[1] سیرت ابن ہشام کے دونوں محققین اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کی سند ضعیف قرار دی ہے۔[2]

مؤرخ ابن اسحاق کے الفاظ یہ ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کی رضاعی ماں حضرت حلیمہ بنت ابی ذؤیب سعدیہ بیان کرتی ہیں: ''میں اپنے خاوند کے ساتھ اپنے علاقے سے نکلی۔ میرے ساتھ میرا ایک دودھ پیتا بچہ تھا۔ ہمارے خاندان بنوسعد بن بکر کی اور بھی بہت سی عورتیں تھیں۔ ہمارا مقصد دودھ پینے والے بچے تلاش کرنا تھا۔ ان دنوں قحط پڑا ہوا تھا۔ ہمارے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں بچی تھی۔ میں اپنی چتکبری گدھی پر سوار تھی۔ ہمارے ساتھ ہماری ایک اونٹنی بھی تھی مگر، اللہ کی قسم، وہ دودھ کا ایک قطرہ نہیں دیتی تھی۔ ہمارا بچہ بھوک کے مارے ساری رات روتا رہتا تھا۔اس کی وجہ سے ہم بھی ساری رات نہیں سو سکتے تھے۔ نہ میری چھاتی میں اتنا دودھ تھا جو اسے کفایت کرتا اور نہ ہماری اونٹنی کے تھنوں میں جو اس کی غذا بنتا، البتہ ہم اللہ تعالیٰ سے بارش اور خوشحالی کے امیدوار تھے۔ میری گدھی کمزوری اور بھوک کی وجہ سے تیز نہیں چل سکتی تھی۔ قافلے والے مجھ سے تنگ آگئے تھے۔ بالآخر ہم گرتے پڑتے مکہ پہنچ گئے۔ ہم سب عورتیں بچے تلاش کرنے لگیں۔ ہم میں سے ہر عورت کو محمد (رسول اللہ ﷺ) کی پیش کش کی گئی۔ جب یہ کہا جاتا کہ بچہ یتیم ہے تو ہر عورت لینے سے انکار کر دیتی کیونکہ بچے کے باپ سے تو کچھ ملنے کی امید

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 214/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 214/1، ودفاع عن الحديث النبوي والسيرة، ص: 38.

ہوتی تھی۔ ہم کہتیں: ”یتیم بچہ! بھلا اس کی ماں اور دادا ہمیں کیا دے سکتے ہیں؟“ اس لیے ہم اُسے لینا نہیں چاہتی تھیں۔ میرے ساتھ آنے والی دوسری تمام عورتوں کو کوئی نہ کوئی بچہ مل گیا مگر میں خالی ہاتھ تھی۔ جس رات واپسی کا پروگرام بنا، میں نے اپنے شوہر سے کہا: ”بخدا! میں یہ نہیں چاہتی کہ سب عورتیں تو بچے لے جائیں اور میں خالی ہاتھ جاؤں۔ میں اُسی یتیم کو لے آتی ہوں۔“ میرے شوہر نے کہا: ”کوئی حرج نہیں، لے آؤ۔ شاید اللہ تعالیٰ ہمارے لیے اُسی میں برکت رکھ دے۔“ میں اُسے لے آئی۔ اللہ کی قسم! میں نے اسے مجبوراً لیا تھا کیونکہ مجھے کوئی اور بچہ نہیں ملا تھا۔ جب میں محمد (ﷺ) کو لے کر اپنے خیمے میں واپس آئی اور اس کا منہ پستان سے لگایا تو دودھ اُترنے لگا اور اس نے جی بھر کر دودھ پیا، میرے بچے نے بھی خوب سیر ہو کر دودھ پیا اور دونوں سکون سے سو گئے جبکہ اس سے پہلے ہمیں نیند ہی نہیں آتی تھی۔ میرا خاوند اپنی اونٹنی کی طرف بڑھا تو دیکھا کہ اُس کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہیں۔ اُس نے خوب دودھ دوہا۔ اُس نے بھی سیر ہو کر پیا اور میں نے بھی۔ ہم سب خوب سیراب ہوئے اور ہماری وہ رات عرصہ دراز کے بعد خوب گزری۔ میرا شوہر کہنے لگا: ”حلیمہ! اللہ کی قسم! سچ پوچھو تو تم نے بڑی مبارک روح حاصل کی ہے۔“ میں نے کہا: ”اللہ کی قسم! میرا بھی یہی یقین ہے۔“ پھر ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ میں آپ ﷺ کو لے کر اُسی گدھی پر بیٹھ گئی۔ اللہ کی قسم! میں تو سارے قافلے سے آگے نکل گئی۔ کوئی جانور میری گدھی کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ میری ساتھی عورتیں تعجب سے کہتی تھیں: ”ابوذویب کی بیٹی! تیرا ستیاناس! ذرا ہم پر ترس کھا۔ کیا یہ وہی گدھی ہے جس پر تو آئی تھی؟“ میں انھیں کہتی: ”واللہ! یہ وہی گدھی ہے۔“ وہ حیرانی سے کہتیں: ”اللہ کی قسم! اس میں کوئی خاص بات ہے۔“ ہم اسی طرح اُڑتے چلے آئے اور بنوسعد کے علاقے میں اپنے گھر جا پہنچے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں سے کوئی علاقہ ہمارے علاقے سے بڑھ کر قحط زدہ نہیں تھا مگر آپ ﷺ کو ساتھ لانے کے

بعد ہماری بکریاں دودھ سے بھری رہتی تھیں۔ ہم خوب دودھ دوہتے اور خوب سیر ہو کر پیتے جبکہ کسی دوسرے گھر کو دودھ کا ایک قطرہ بھی نصیب نہ ہوتا۔ تھن خالی ہو چکے تھے اور قبیلے کے لوگ اپنے چرواہوں سے کہتے: ''تمھارا بیڑا غرق ہو! وہاں جانور چرایا کرو جہاں حلیمہ کی بکریاں چرتی ہیں۔'' لیکن اُن کی بکریاں بھوکی واپس آتیں اور ایک قطرہ دودھ کا نہیں دیتی تھیں جبکہ میری بکریاں سیر ہو کر واپس آتیں اور خوب دودھ دیتیں، پھر خیرو برکت بڑھتی ہی چلی گئی۔ محمد (ﷺ) کے دو سال پورے ہوگئے تو میں نے اس کا دودھ چھڑا دیا۔ وہ اتنی تیزی سے جوان ہو رہا تھا کہ دوسرے بچے اس طرح جوان نہیں ہوتے۔ ابھی وہ دو سال کا بھی نہیں ہوا تھا مگر دیکھنے میں چار سال کا مضبوط صحت مند بچہ لگتا تھا۔ ہم مجبوراً اسے اس کی والدہ کے پاس لے تو آئے لیکن ہماری شدید خواہش تھی کہ وہ ہمارے ساتھ ہی رہے کیونکہ ہم نے اس کی برکت کا خوب مشاہدہ کیا تھا۔ ہم نے محمد (ﷺ) کی والدہ سے درخواست کی کہ آپ اپنے صاحبزادے کو کچھ دیر اور ہمارے پاس رہنے دیں تاکہ یہ خوب مضبوط اور جوان ہو جائے۔ مکہ کی آب و ہوا اچھی نہیں، کہیں یہ کمزور نہ ہو جائے۔ اس کی والدہ دوبارہ بھیجنے پر راضی نہیں تھیں مگر ہمارے اصرار کے آگے انھوں نے محمد (ﷺ) کو دوبارہ ہمارے ساتھ بھیج دیا۔'' اس کے بعد حضرت حلیمہ نے آپ ﷺ کے شقِ صدر کا معجزہ بیان کیا ہے۔

اگرچہ اس واقعے کی سند پر تنقید کی گئی ہے مگر یہ بات ہر شک و شبہ سے بالا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے بنوسعد کے صحرائی علاقے میں مدتِ رضاعت بسر کی تھی کیونکہ صحیح مسلم کی روایت ابن اسحاق کی روایت کی اس حد تک تو تائید کرتی ہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے شقِ صدر کا واقعہ بنوسعد کے علاقے میں رضاعت کے دوران پیش آیا۔[1] اسی طرح حاکم، احمد اور ابن اسحاق رحمہ اللہ کی ایک روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

[1] صحیح مسلم، الإیمان، باب الإسراء برسول اللهﷺ إلى السموات......، حدیث: 162.

«أَنَا دَعْوَةُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ...... وَاسْتَرْضَعْتُ فِي بَنِي سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ»

''میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا نتیجہ ہوں...... اور میں نے بنوسعد بن بکر کے علاقے میں مدت رضاعت گزاری ہے۔'' [1]

ابن اسحاق کی ایک حسن روایت میں ہے کہ جب آپ غزوۂ حنین سے واپسی پر جعرانہ ٹھہرے ہوئے تھے تو بنوہوازن کے وفد نے آپ سے استدعا کی تھی: حضور! ان قیدیوں میں آپ کی پھوپھیاں، خالائیں اور خادمائیں بھی ہیں جو آپ کو اپنی گود میں کھلایا کرتی تھیں......۔'' [2]

اس روایت میں صراحت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوہوازن کے ہاں دودھ پیا تھا اور حضرت حلیمہ بنت ابی ذؤیب کی قوم بنوسعد بھی انھیں میں سے تھی۔ [3]

مؤرخ ابن سعد نے اپنی سند کے ساتھ ابن قبطیہ کے حوالے سے روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنوسعد بن بکر کے ہاں دودھ پیتے رہے ہیں۔ [4] ابن سعد ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ نے آپ کو بنوسعد کی ایک عورت کے سپرد کیا تھا جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا۔ [5]

[1] المستدرك للحاكم: 600/2. حاکم نے اپنی سند کو صحیح قرار دیا اور ذہبی نے اس حکم کو برقرار رکھا ہے۔ ومسند أحمد: 128,127/4. احمد کی سند ابن اسحاق سے مختلف ہے۔ ہیثمی نے لکھا: ''احمد کی سند حسن ہے اور اس کی تائید دیگر روایات سے بھی ہوتی ہے۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 222/8)، والسيرة النبوية لابن هشام: 220,219/1) سند مرسل ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اس سند کو جید قرار دیا ہے، دیکھیے: (البداية والنهاية: 299/2) [2] السيرة النبوية لابن هشام: 183/4-185. [3] حلیمہ بنت ابی ذؤیب سعدیہ کے نسب نامے کے لیے ملاحظہ کیجیے: (السيرة النبوية لابن حبان، ص: 54,53) ابن حبان نے نسب نامہ بلا سند نقل کیا ہے۔ والسيرة النبوية لابن هشام: 213/1. یہاں بھی نسب نامہ بغیر سند کے نقل ہوا ہے۔ [4] الطبقات الكبرىٰ: 113/1. یہ سند بھی مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے، تاہم اس کے راوی ثقہ ہیں۔ [5] الطبقات الكبرىٰ: 113/1. یہ سند بھی مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے اور اس کا ایک راوی عمرو بن عاصم کلابی صدوق (نہایت سچا) تو ہے لیکن اس کے حافظے میں کچھ خرابی ہے۔

ان کے علاوہ ایسی روایات بھی موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ آپ ﷺ کے رضاعی ماں باپ آپ کے پاس آئے تھے اور آپ نے اپنی رضاعی بہن شیما کو پہچان لیا تھا جو غزوۂ حنین کے قیدیوں میں آئی تھیں۔[1] جب تک رسول اللہ ﷺ حضرت حلیمہ سعدیہ کے زیرِنگرانی رہے آپ کی برکت، حفاظت اور خصوصیت کی بہت سی علامات سامنے آتی رہیں۔

اس کے بارے میں مشہور ترین وہ طویل روایت ہے جو حلیمہ سعدیہ نے خود بیان کی ہے۔ اُس روایت میں ذکر ہے کہ آپ کی ان میں تشریف آوری سے اُن کی چھاتیاں دودھ سے بھر گئیں۔ چنانچہ آپ ﷺ بھی سیر ہو کر دودھ پیتے تھے اور آپ کا رضاعی بھائی بھی۔ جبکہ اس سے پہلے وہ بھوک سے بلکتا رہتا تھا کیونکہ حضرت حلیمہ کا دودھ خشک ہو چکا تھا۔ نہ وہ خود سوتا تھا نہ گھر والوں کو سونے دیتا تھا۔ اور ان کی اونٹنی کے تھن بھی، جو پہلے خشک تھے، دودھ سے بھر گئے۔ سارا گھر خوب دودھ پیتا تھا۔ سواری والی گدھی بھی بہت قوی اور چست ہوگئی۔ وہ پورے قافلے سے آگے آگے چلنے لگی جبکہ پہلے وہ تھکی ماندی پورے قافلے سے بہت پیچھے رہ جاتی تھی)، پھر جہاں حلیمہ کے جانور چرنے جاتے وہاں انھیں چرنے کو خوب سبزہ ملتا جبکہ دوسرے لوگوں کے جانور خالی پیٹ واپس آتے۔ آپ ﷺ عام بچوں کے برعکس تیزی سے نشوونما پا کر بڑھ رہے تھے۔

[1] ان روایات کا تفصیلی ذکر غزوۂ حنین کے واقعات میں ہوگا، نیز دیکھیے: (البداية والنهاية: 301/2) امام بیہقی کی کتاب دلائل النبوة کے محقق کے مطابق ان عورتوں کی مجموعی تعداد دس ہے جنھوں نے نبیٔ کریم ﷺ کو شیر خواری کے زمانے میں دودھ پلایا تھا۔ فاضل محقق نے ان کے نام اور ان کے مآخذ بھی درج کیے ہیں۔ مکہ میں نبی کریم ﷺ کے چچا ابولہب کی لونڈی ثویبہ نے آپ کو اور ابوسلمہ کو ایک ہی زمانے میں دودھ پلایا تھا، دیکھیے: (صحيح البخاري، النكاح، باب: ﴿ أُمَّهَٰتُكُمُ ٱلَّٰتِيٓ أَرۡضَعۡنَكُمۡ ﴾، حديث: 5101,5100، وصحيح مسلم، الرضاع، باب تحريم الربيبة وأخت المرأة، حديث: 1449.

دیہات میں دودھ پلانے کی حکمت

شہر میں رہنے والے عربوں کی عادت تھی کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلوانے کے لیے دیہات میں بھیج دیتے تھے تاکہ وہ شہری بیماریوں سے محفوظ رہیں، اُن کے جسم مضبوط ہو جائیں اور وہ بچپن ہی سے اپنے آپ پر اعتماد کرنے کے عادی ہو جائیں۔ ماؤں، نانیوں، دادیوں اور دوسرے رشتہ داروں کے لاڈ پیار سے بچے رہیں اور اُن کی زبان لہجے کی خرابیوں اور غلطیوں سے محفوظ رہے۔[1]

بادیہ بنی سعد میں رضاعت اور واقعۂ شقِ صدر

بنوسعد کے علاقے میں پرورش کے دوران میں رسول اللہ ﷺ کے شقِ صدر کا واقعہ پیش آیا۔ حافظ ابن کثیر نے ابونعیم کی روایت سے اس کی صراحت خود نبیٔ اکرم ﷺ کی زبانی یوں کی ہے: ''......میری پرورش کرنے والی رضاعی ماں بنوسعد بن بکر سے تھیں۔ ایک دفعہ میں اور میرا رضاعی بھائی بکریاں لے کر گئے لیکن کھانے پینے کی کوئی چیز ساتھ لے کر نہ گئے۔ میں نے کہا: ''بھائی! تم جاؤ اور امی جان سے کھانے پینے کی کوئی چیز لے آؤ۔'' میرا بھائی چلا گیا۔ میں بکریوں کے پاس ٹھہرا رہا۔ اچانک دو سفید پرندے اڑتے نظر آئے۔ ان کی شکل گدھ جیسی تھی۔ وہ سیدھے میری طرف آئے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: ''کیا یہ وہی ہے؟'' دوسرے نے کہا: ''ہاں!'' انھوں نے مجھے پکڑا اور چت لٹا دیا، پھر میرا پیٹ چیرا اور دل نکالا، اُسے بھی چیرا دیا اور سیاہ رنگ کے دو ٹکڑے نکال کر پھینک دیے، پھر ایک دوسرے سے کہنے لگا: ''برف کا پانی لاؤ۔'' وہ پانی لایا تو انھوں نے اُس سے میرا پیٹ دھویا، پھر ایک نے کہا: ''اولوں کا پانی لاؤ۔'' پھر انھوں نے اِس پانی سے میرا دل دھویا، پھر اُس نے کہا: ''سکینت لاؤ'' اور اُسے میرے دل میں چھڑک دیا، پھر ایک

[1] الرّوض الأنف:1/187،188.

نے دوسرے سے کہا: ''اسے سی دو۔'' اُس نے میرا پیٹ سی دیا اور میرے دل پر مہر نبوت لگا دی، پھر ایک دوسرے سے کہنے لگا: ''اسے ترازو کے ایک پلڑے میں ڈالو اور دوسرے پلڑے میں اس کی اُمت کے ایک ہزار افراد ڈالو۔'' مجھے وہ ہزار والا پلڑا اتنا اونچا نظر آتا تھا کہ مجھے خطرہ ہوا مبادا وہ مجھ پر گر پڑیں۔ وہ کہنے لگا: ''اگر تم ساری امت کو بھی اس کے برابر تولو گے تو یہ سب سے وزنی ثابت ہوگا۔'' پھر وہ مجھے چھوڑ کر چل دیے۔ میں سخت گھبرا گیا اور اپنی امی کے پاس پہنچا۔ اُنھیں سارا واقعہ سنایا۔ وہ گھبرا گئیں مبادا یہ کوئی شیطانی کارروائی ہو۔ کہنے لگیں: ''میں تجھے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دیتی ہوں۔'' پھر انھوں نے اونٹ پر پالان کسا، مجھے اپنی گود میں پالان پر بٹھایا اور ہم چل دیے حتی کہ ہم اپنی حقیقی والدہ کے پاس پہنچ گئے۔ میری رضاعی ماں کہنے لگیں: ''لیجیے اپنی امانت۔ میں نے اپنی ذمہ داری پوری کی۔'' پھر انھوں نے مجھ پر بیتنے والا سارا واقعہ سنایا۔ لیکن میری والدہ مطلق پریشان نہ ہوئیں بلکہ کہنے لگیں: ''جب یہ میرے پیٹ میں تھا تو میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ مجھ سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے محل چمک اٹھے۔''[1]

امام مسلم نے یہ واقعہ اختصار سے نقل کیا ہے۔ انھوں نے اس واقعے کا ماخذ بھی نہیں بتایا۔ یہ واقعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے صحیح مسلم میں اس طرح ہے: ''اللہ کے رسول ﷺ کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام آئے۔ اُس وقت آپ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ انھوں نے آپ کو پکڑا اور زمین پر لٹا لیا، پھر سینہ چاک کر کے آپ کا دل نکالا۔ دل چیر کر اُس میں سے ایک ٹکڑا نکالا اور کہا: ''یہ رہا شیطان کا حصہ'' پھر دل کو سونے کے ایک تھال میں رکھ کر زمزم کے پانی سے دھویا، پھر اُسے سی کر دوبارہ اُس کی اصل جگہ رکھ دیا۔ دوسرے بچے بھاگتے ہوئے آپ ﷺ کی رضاعی ماں کے پاس گئے اور شور مچانے لگے

[1] البداية والنهاية: 299/2. امام ذہبی نے اس کے متعلق لکھا کہ یہ صحیح ہے، دیکھیے: (تاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 40/1)

کہ ''محمد کو قتل کر دیا گیا۔'' گھر والے بھاگتے ہوئے آئے تو آپ ﷺ اُن کو سامنے سے آتے دکھائی دیے۔ آپ کا رنگ اڑا ہوا تھا۔'' حضرت انس نے فرمایا: ''میں سلائی کے نشانات آپ کے سینۂ مبارک پر دیکھا کرتا تھا۔''[1]

کچھ کتابوں میں یہ تعین نہیں کیا گیا کہ اس واقعے کے وقت آپ کی عمر کتنی تھی[2] بعض حضرات نے تحدید کی ہے مگر کسی معین عمر پر اتفاق نہیں ہو سکا۔ ابن اسحاق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت آپ کی عمر دو سال سے کچھ اوپر تھی کیونکہ حضرت حلیمہ کہتی ہیں: ''ابھی محمد (ﷺ) دو سال کی عمر کو نہیں پہنچا تھا کہ اس کا جسم لڑکوں کی طرح تنومند ہو چکا تھا......، اللہ کی قسم! (اسے اس کی ماں کے ہاں سے دوبارہ لانے کے) چند ماہ بعد ہی کی بات ہے کہ وہ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ ہمارے گھروں کے پچھواڑے ہماری بکریوں کے پاس تھا......''[3] لیکن ابن سعد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کے پیش آنے پر آپ کی عمر چار سال تھی۔[4] ابونعیم نے بھی یہی بات کہی ہے، البتہ ان کی سند ضعیف ہے۔[5] دیگر سیرت نگاروں نے اسے پانچویں سال بلکہ اس سے بھی بعد کا واقعہ بتایا ہے۔[6]

---

[1] صحيح مسلم، الإيمان، باب الإسراء برسول اللهﷺ......، حديث: 162. [2] صحیح مسلم میں انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں رسول اللہ ﷺ کی عمر کی تحدید نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ کے دور رضاعت کا واقعہ ہے۔ [3] السيرة النبوية لابن هشام: 214/1. یہ روایت ضعیف ہے۔ [4] الطبقات الكبرٰى: 112/1. ابن سعد نے یہ روایت اپنے استاد واقدی کی سند سے نقل کی ہے جو نہایت ضعیف ہے۔ [5] دلائل النبوّة لأبي نعيم: 160,159/1. [6] دلائل النبوة لأبي نعيم: 162/1. ابونُعیم نے ''پانچویں سال'' والا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا لیکن اس کی کوئی سند بیان نہیں کی۔ ابونعیم نے یہ بھی بتایا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ دیگر راویوں کا کہنا ہے کہ حلیمہ سعدیہ واقعۂ شق صدر کے پیش آنے کے بعد ہی نبی ﷺ کو واپس آپ کی والدہ کے پاس لائیں جبکہ آپ کی عمر چار سال تھی، نیز دیکھیے: (المواهب اللّدنّية بشرح الزرقاني: 150,149/1، والبداية والنهاية: 301,300/2)

ہم زرقانی کی بات سے متفق ہیں اور ابن سعد کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں کہ یہ چار سال کی عمر کا واقعہ ہے کیونکہ کم از کم اسی عمر میں بکریاں چرانے کا کام کیا جا سکتا ہے اور اردگرد کے واقعات کو سمجھا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو اس کے علاوہ بھی کئی دفعہ شق صدر کا واقعہ پیش آیا۔ امام احمد کی روایت کے مطابق شق صدر کا واقعہ اُس وقت بھی پیش آیا جب آپ کی عمر دس سال سے چند ماہ اوپر تھی۔ [1] صحیح بخاری، صحیح مسلم وغیرہ کی صحیح روایات میں ہے کہ شق صدر کا واقعہ اُس وقت بھی پیش آیا جب آپ ﷺ کی عمر مبارک پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی جبکہ آپ کو بیت المقدس لے جایا گیا۔ [2] امام ذہبی نے ایسی روایات بیان کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شق صدر دو دفعہ ہوا۔ بچپن میں اور معراج کے وقت۔ [3] بعض مؤرخین نے اس واقعے کا صدور چوتھی مرتبہ بھی بیان کیا ہے۔ [4]

بعض عقلیت پرست مستشرقین اور اُن سے مرعوب مسلمان مؤرخین نے شق صدر کے واقعے کی تاویل کی ہے کہ یہ معنوی چیز تھی اور حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بعض نے تو اسے محض ایک کہانی قرار دیا ہے۔ [5]

◄◄ حافظ ابن کثیر نے اموی کی ایک مرسل روایت نقل کی ہے جو ابن میسب تک پہنچتی ہے۔ یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کی سند میں عثمان وقاصی ہے جس کے متعلق ابن کثیر ہی کا کہنا ہے کہ وہ ضعیف ہے۔ اموی نے بتایا ہے کہ شق صدر کے وقت آنحضرت ﷺ کی عمر چھ سال تھی۔ [1] الفتح الرباني:195/20. ساعاتی کا کہنا ہے کہ اس کی سند کے راوی ثقہ ہیں۔ دیگر محققین کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے، دیکھیے: (الموسوعة الحديثية:182/35، حديث:21261) [2] صحيح البخاري، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة صلوات الله عليهم، حديث: 3207، وصحيح مسلم، الإيمان، باب الإسراء برسول الله ﷺ......، حديث: 162. [3] تاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي:49/1. [4] دلائل النبوة للبيهقي:6/2، والفتح الرباني:196,195/20. [5] السيرة النبوية في ضوء الكتاب والسنة لأبي شهبة:199/1-203.

واقعۂ شق صدر کے سلسلے میں خوبصورت اور مختصر ترین بات حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ہے، لکھتے ہیں: ''سینہ چیرنے، دل کے نکالنے اور دوسرے خرقِ عادت واقعات کے بارے میں جو تفصیلات روایات میں موجود ہیں ان کو حقیقتِ واقعی تسلیم کرنا ضروری ہے۔ ان کی دوراز کار تاویلات کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ معجزات اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت ظہور پذیر ہوتے ہیں اور مافوق الفطرت معجزے کا ظاہر کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے محال نہیں ہے۔''[1]

ہر مسلمان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کسی روایت کی قبولیت کا معیار اُس کا صحیح سند کے ساتھ ثبوت ہے۔ اگر کوئی واقعہ صحیح سند سے ثابت ہے تو اس کی غیر حقیقی تاویل کا کوئی فائدہ نہیں جیسا کہ عقلیت پرست مستشرقین حقائق کا انکار کر کے اُن کی قبیح عقلی تاویلیں کرتے ہیں۔

شق صدر اور بچپن میں بکریاں چرانے کی حکمت

* یہ واقعہ محمد ﷺ کی رسالت کا اظہار تھا اور اس کا مقصد آپ ﷺ کو بچپن ہی سے معصوم بنانا اور وحی کا بار اٹھانے کے لیے تیار کرنا تھا۔ اسے مادی صورت میں اس لیے ظاہر کیا گیا کہ لوگوں کے لیے آپ پر ایمان لانا اور آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کرنا آسان ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان لوگوں کی آنکھوں اور کانوں تک پہنچ جائے۔[2]
* رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کا بار اٹھانے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔
* اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری اٹھائی کہ وہ اپنے رسول کو انسان کے طبعی اغلاط سے پاک کرے گا اور شیطان کی ریشہ دوانیوں سے اس کی حفاظت کرے گا۔ واقعۂ شقِ صدر کا ایک مقصد اس ذمہ داری اور عہد کا اظہار بھی تھا۔

[1] فتح الباري:52/15. [2] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص:52.

امام بخاری رحمہ اللہ نے بسند حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا رَعَى الْغَنَمَ» فَقَالَ أَصْحَابُهُ: وَأَنْتَ؟ فَقَالَ: «نَعَمْ! كُنْتُ أَرْعَاهَا عَلٰى قَرَارِيطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ»

''جو بھی نبی ہو گزرا ہے اس نے بکریاں چرائی ہیں۔'' صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: ''جنابِ رسول! آپ نے بھی؟'' فرمایا: ''ہاں! میں اجرت لے کر اہل مکہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔''[1]

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بکریاں چرائی ہیں۔[2]

* حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اہل علم نے کہا ہے کہ نبوت سے قبل انبیائے کرام کے دلوں میں بکریاں چرانے کا شوق پیدا کرنے کی حکمت یہ ہے کہ بکریاں چرانے سے ان کو اپنی امت کو سدھارنے کا فریضہ انجام دینے کی مشق ہو جائے کیونکہ یہ ایسا کام ہے جس سے ان میں حلم و شفقت کے جذبات پیدا ہوں گے۔ بکریاں چرانے میں بڑا صبر کرنا پڑتا ہے، مثلاً: ان کو چرانا، چراگاہ میں ان کے ادھر ادھر بکھر جانے کے بعد ان کو اکٹھا کرنا، ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ میں لے جانا، درندوں اور چوروں سے ان کی حفاظت کرنا، ان کی مختلف طبیعتوں کو سمجھنا، ان کا گھڑی گھڑی بکھر جانا، ان کی فطری کمزوری کی بنا پر ان کا بہت خیال رکھنا، یہ سب ایسے کام ہیں کہ ان کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کو اپنی امت کی تربیت و رہنمائی کے معاملے میں صبر کرنا آسان ہو جاتا

[1] صحيح البخاري، الإجارة، باب رعي الغنم على قراريط، حديث: 2262. [2] صحيح البخاري، الأطعمة، باب الكباث وهو ثمر الأراك، حديث: 5453، وصحيح مسلم، الأشربة، باب فضيلة الأسود من الكباث، حديث: 2050.

ہے۔ نبی کریم ﷺ کا خود اپنی ہی زبان مبارک سے بکریاں چرانے کا تذکرہ کرنا اس حقیقت کی بڑی مستند پہچان ہے کہ آپ انتہائی متواضع اور احسان شناس شخصیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام انسانوں میں سب سے بڑھ کر معظم و مشرف بنایا تھا لیکن پھر بھی آپ کی ذاتِ گرامی میں بے حد انکسار تھا۔'' [1]

* آپ کے بکریاں چرانے سے ہمیں آپ کے ذوقِ سلیم اور احساسِ ذمہ داری کا اندازہ ہوتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو متصف فرمایا تھا کہ جونہی آپ کو اندازہ ہوا کہ میں کچھ کام کرنے کے قابل ہوگیا ہوں، آپ نے اپنے چچا محترم سے اُن کا بوجھ بٹانے کے لیے خود کام کاج شروع کر دیا۔ آپ ﷺ کے چچا محترم عیالدار شخص تھے، تاہم انھوں نے آپ ﷺ کے لیے زندگی کے بہترین وسائل مہیا کر رکھے تھے۔
* اللہ تعالیٰ کے لیے ہرگز مشکل نہ تھا کہ وہ آپ ﷺ کے لیے راحت بخش زندگی بسر کرنے کے تمام وسائل خود مہیا کر دیتا اور آپ کو روزی کی دوڑ دھوپ اور محنت و مشقت سے بے نیاز کر دیتا مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ لوگون کو پتہ چل جائے کہ انسان کا بہترین مال وہ ہے جو وہ اپنی محنت و مشقت سے کمائے اور مفید انسان وہ ہے جو اپنی طاقت اور بساط کے مطابق معاشرے کو اپنی خدمات سے فیضیاب کرے۔ اسی سے انسان کی شان و شوکت قائم ہوتی ہے۔
* دعوت اور تبلیغ و تحریک کا کام کرنے والے اُس وقت تک اپنا وقار قائم نہیں رکھ سکتے جب تک اپنی روزی خود نہ کمائیں۔ اگر اُن کا گزارا لوگوں کے عطیات و صدقات اور خیرات پر ہوگا تو وہ لوگوں کے نزدیک بے وقعت ہو کر رہ جائیں گے۔ اسی لیے ہر صاحبِ دعوت کے لیے ضروری ہے کہ اپنی معیشت کے سلسلے میں وہ اپنی ذات اور محنت پر اعتماد رکھے اور مانگنے سے پرہیز کرے تاکہ دنیوی طور پر کسی شخص کا اس پر کوئی

[1] فتح الباري: 6,5/10.

احسان نہ ہو اور وہ اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ پوری قوت اور بے باکی سے ادا کر سکے۔ [1]

شام کا سفر

امام ترمذی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت کی ہے:

''حضرت ابوطالب شام کی طرف روانہ ہوئے تو اُن کے ساتھ رسول اللہ ﷺ بھی تھے۔ قریش کے چند دیگر سردار بھی ہمرکاب تھے۔ جب وہ راستے میں بحیرا راہب کے قریب پہنچے تو انھوں نے وہاں پڑاؤ کیا۔ راہب اُن کے پاس آیا۔ وہ اس سے پہلے بھی اس کے پاس سے گزرتے تھے لیکن وہ کبھی اُن کے پاس نہیں آتا تھا اور نہ ان کی طرف توجہ کرتا تھا۔ ابھی وہ اپنا سامان اتار ہی رہے تھے کہ راہب آیا اور اُن کے درمیان گھومنے پھرنے لگا حتی کہ اُس نے رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا:

«هٰذَا سَيِّدُ الْعَالَمِينَ، بَعَثَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ»

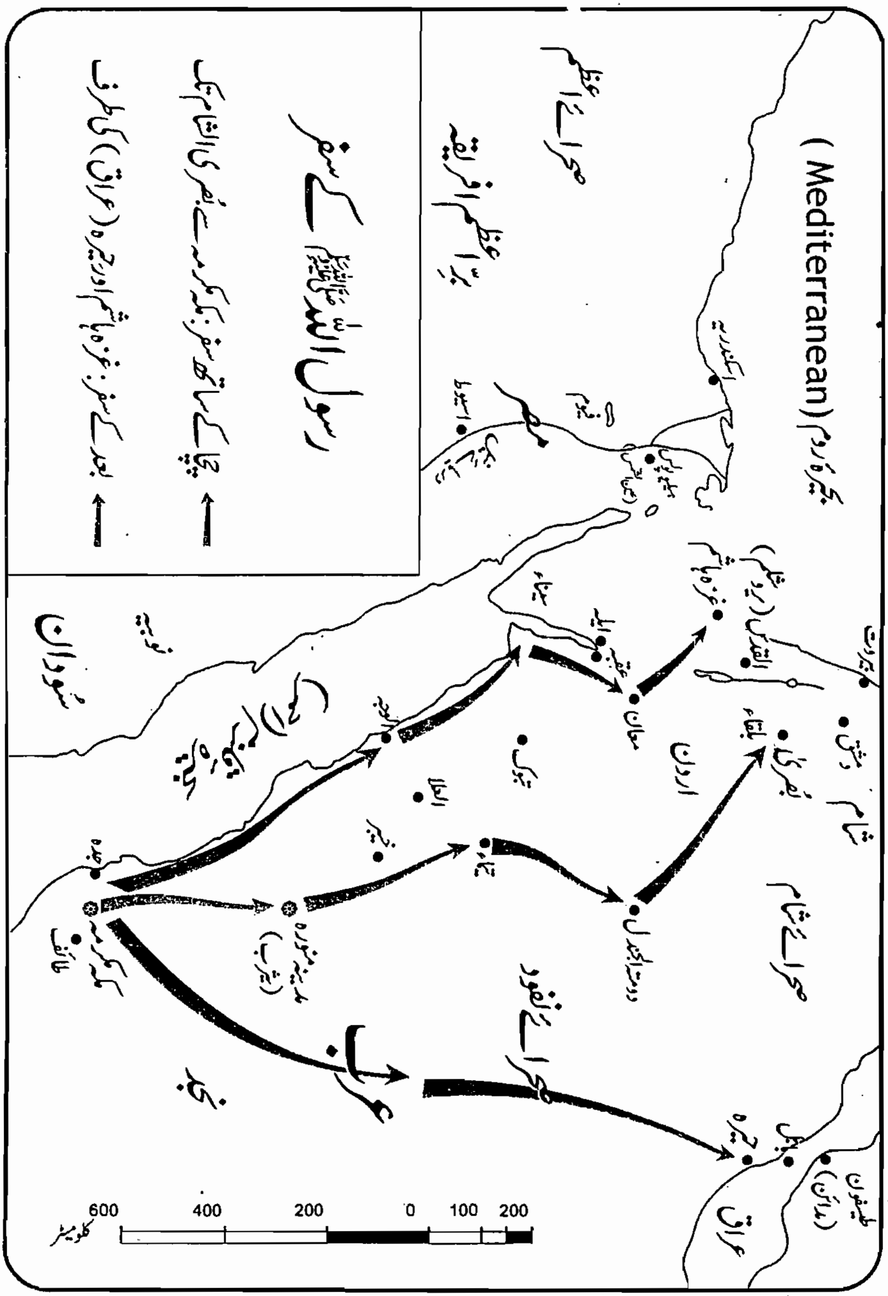
''یہ تمام جہانوں کا سردار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سب جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

قریش کے سردار کہنے لگے: ''تجھے کیا علم ہے؟'' اُس نے کہا: ''جب تم اس گھاٹی سے اترے تھے تو ہر درخت اور ہر پتھر سجدے میں گر گیا تھا۔ یہ قطعی بات ہے کہ یہ بے جان چیزیں نبی کے علاوہ کسی کو سجدہ نہیں کرتیں۔ میں نے اسے کندھے کی ہڈی کے نیچے لگی مہرِ نبوت سے پہچانا ہے۔'' پھر وہ واپس گیا اور سب کے لیے کھانا تیار کیا۔ جب وہ کھانا لے کر آیا تو رسول ﷺ اونٹوں کو چرانے گئے ہوئے تھے۔ وہ کہنے لگا: ''اسے بلاؤ۔'' رسول ﷺ تشریف لائے تو ایک بادل آپ پر سایہ کیے ہوئے تھا اور آپ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ جب آپ قریب پہنچ گئے تو اُس نے کہا: ''دیکھو! اُس پر بادل نے

[1] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص:55,54.

سایہ کر رکھا ہے۔'' جب رسول اللہ ﷺ مجلس میں پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ آپ کے آنے سے پہلے درخت کے سائے پر قبضہ کر چکے ہیں۔ آپ ویسے ہی بیٹھ گئے تو درخت نے آپ کی طرف جھک کر آپ پر سایہ کر دیا۔ راہب نے پکارا: ''دیکھو! درخت نے جھک کر اس پر سایہ کر دیا ہے۔'' کھانے سے فراغت کے بعد وہ ان سے اصرار کرنے لگا کہ اسے روم نہ لے جاؤ کیونکہ رومی جب اسے دیکھیں گے تو اس کی خاص علامات سے اسے پہچان لیں گے اور بس چلا تو قتل کر دیں گے۔ ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اُسے سات رومی آتے دکھائی دیے۔ وہ بھاگ کر اُن سے ملا اور پوچھا: ''تم کیسے آئے ہو؟'' وہ کہنے لگے: ''ہمیں پتہ چلا ہے کہ آخری نبی اس مہینے ادھر آنے والا ہے۔ اس لیے ہر راستے کی طرف لوگ بھیج دیے گئے ہیں (تاکہ اسے گرفتار کر سکیں) اور ہمیں خصوصاً بتلایا گیا ہے کہ وہ نبی اس راستے سے آنے والا ہے اس لیے ہم آئے ہیں۔'' راہب کہنے لگا: ''کیا (فہم و فراست کے لحاظ سے) تم سے کوئی بہتر شخص پیچھے مرکز میں موجود ہے؟ اس حوالے سے اسے قائل کیا جائے۔'' انھوں نے کہا: ''نہیں۔ ہمیں تو صرف یہ خبر ملی ہے کہ وہ اسی راستے سے آرہا ہے۔'' راہب کہنے لگا: ''ذرا سوچو! اگر اللہ تعالیٰ نے ایک کام کا فیصلہ کر لیا ہے تو کیا کوئی شخص اسے روک سکتا ہے؟'' وہ کہنے لگے: ''نہیں۔'' بالآخر انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کر لی اور اُس راہب ہی کے پاس ٹھہر گئے، پھر راہب نے پوچھا: ''اس کا سرپرست کون ہے؟'' انھوں نے کہا: ''ابوطالب۔'' وہ ان کی منتیں کرتا رہا کہ اسے ضرور واپس بھیج دو۔ آخر کار ابوطالب نے رسول اللہ ﷺ کو واپس بھیج دیا اور آپ کے ساتھ ابوبکر اور بلال رضی اللہ عنہما کو بھی روانہ کر دیا۔ واپسی پر راہب نے رسول اللہ ﷺ کو کیک اور زیتون کا تیل بطور زادِ راہ دیے۔''[1]

[1] صحيح سنن الترمذي: 191/3. البانی نے اس کے متعلق کہا کہ یہ روایت صحیح ہے، تاہم اس میں بلال رضی اللہ عنہ کا جو تذکرہ کیا گیا ہے وہ قابلِ اعتبار نہیں ہے۔


رسول اللہ ﷺ کے سفر
بحیرۂ روم (Mediterranean)
صحرائے شام
صحرائے نفود
شام
دمشق
اردن
معان
مدینہ منورہ (یثرب)
مکہ مکرمہ
طائف
جدہ
یمن
عراق
مصر
سوڈان
600 400 200 0 100 200
کلومیٹر

علماء کا اس واقعے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ترمذی نے اس روایت کو حسن اور امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔[1] حافظ ابن حجر اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی امام حاکم کی تائید کی ہے۔[2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اس روایت کے راوی ثقہ ہیں۔ اور ابوبکر و بلال کے ذکر کے علاوہ اس روایت میں کوئی خامی نہیں۔ ہوسکتا ہے کسی راوی کو وہم ہوا ہو اور اس نے کسی دوسری روایت کے کچھ الفاظ اس میں شامل کر دیے ہوں۔''[3]

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے بھی کہا: ''اس روایت میں ابوبکر و بلال کا ذکر کسی راوی کی فاش غلطی ہے۔''[4]

حافظ ذہبی نے اس واقعے کا سرے سے انکار کر دیا ہے۔[5] اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: ''یہ حدیث انتہائی ضعیف ہے۔ ابوبکر وہاں کہاں تھے؟ وہ تو بمشکل دس سال کے ہوں گے کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ سے اڑھائی سال چھوٹے تھے، پھر بلال اُس وقت کہاں سے آ گئے؟ ان کو تو حضرت ابوبکر نے خریدا ہی بعثت کے بعد ہے بلکہ وہ تو اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، پھر اگر بادل آپ کے سر پر سایہ کرتا آ رہا تھا تو درخت کے جھکنے اور سایہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ بادل کا سایہ تو درخت کے سائے میں ویسے ہی ختم ہو جاتا ہے، پھر یہ بات کسی روایت میں نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی ابوطالب کو

[1] المستدرك للحاكم: 616/2. امام حاکم کا کہنا ہے کہ یہ روایت شیخین (بخاری و مسلم) کی شرط کے مطابق ہے۔ [2] دفاع عن الحديث النبوي والسيرة، ص: 62-72. علامہ البانی رقم طراز ہیں: ''اس روایت کی سند امام جزری کے بقول صحیح ہے، تاہم اس میں جو ابوبکر اور بلال رضی اللہ عنہما کی موجودگی کا ذکر ہے وہ نا قابلِ اعتبار ہے۔ بزار کی روایت میں اس بیان ''آپ کے ساتھ ابوبکر اور بلال کو بھی روانہ کر دیا'' کے بجائے یہ بیان ہے کہ ابوطالب نے آپ ﷺ کے ساتھ ایک آدمی روانہ کیا۔''
[3] شرح الزرقاني للمواهب اللدنية: 196/1. [4] زاد المعاد: 76/1. [5] تاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 57/1.

راہب کی بات یاد دلائی ہو، نہ کبھی قریش نے اس واقعے کا ذکر کیا اور نہ ان قریشی افراد میں سے کسی نے بیان کیا، حالانکہ وہ اس قسم کے واقعات نقل کرنے میں بڑے تیز اور پرجوش تھے۔ اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہوتا تو لازماً ہر طرف مشہور ہو جاتا اور اللہ کے رسول ﷺ کو اپنے نبی ہونے کا یقین رہتا۔ اور جب پہلی دفعہ آپ ﷺ پر غارِ حرا میں وحی آئی تو آپ قطعاً پریشان نہ ہوتے اور ڈرتے ڈرتے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس نہ آتے۔ اس کے علاوہ اگر ابو طالب نے راہب کی باتوں سے ڈر کر آپ کو واپس کر دیا ہوتا تو وہ دوبارہ آپ ﷺ کو خدیجہ کا مال لے کر تجارت کے لیے شام کی طرف کیوں جانے دیتے؟'' اس حدیث کی زبان بھی عجیب سی ہے۔ جو صوفیاء کی زبان اور انھی کی اصطلاحات سے ملتی جلتی ہے۔ ابن عائذ نے اسی قسم کی روایت اپنے مغازی میں ابوبکر اور بلال کے ذکر کے بغیر بیان کی ہے۔''

مؤرخ ابن اسحاق نے بھی یہ واقعہ ترمذی ہی کی روایت کی طرح بیان کیا ہے لیکن اُس میں بھی ابوبکر اور بلال کا ذکر نہیں، البتہ انھوں نے سند بیان نہیں کی۔ لیکن چونکہ وہ امام مغازی ہیں، ان کی روایت کو مانا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی ان کی غیر مسند روایات کی کوئی نہ کوئی اصل ضرور ہوتی ہے۔ [1]

اموی نے مغازی میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا زبیر بن عبدالمطلب کے ساتھ یمن کی طرف ایک تجارتی سفر کیا تھا۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر تیرہ چودہ سال تھی۔ قافلے والوں نے بیان کیا کہ انھوں نے اس سفر میں کئی غیر معمولی نشانیاں دیکھیں، مثلاً: جس راستے سے وہ گزر رہے تھے وہ راستہ ایک خوفناک اونٹ نے بند کر رکھا تھا۔ لیکن جونہی اس اونٹ نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، وہ فوراً بیٹھ گیا اور ادب و عاجزی کے

[1] تفصیل کے لیے اسی کتاب کے ابتدائی باب ''سیرت کے مآخذ'' میں ابن اسحاق کے متعلق ناقدین کے اقوال ملاحظہ کیجیے۔

ساتھ اپنا سینہ زمین پر رگڑنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ اس پر سوار ہو گئے۔ اسی طرح ایک دفعہ راستے میں شدید سیلاب سے سابقہ پیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے سارا پانی خشک کر دیا اور وہ وادی سے صحیح سلامت گزر گئے۔ [1]

حضرت محمد ﷺ کی صفات کے متعلق اہل کتاب کے اقوال کی حکمت

بحیرا راہب کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب رسول اللہ ﷺ کی صفات اور آپ کے زمانے کو اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ یہ سب کچھ اُن کی کتابوں میں لکھا ہوا تھا۔ یہ واقعہ قرآنِ مجید کی اُس آیت کی تفسیر کرتا ہے جو یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی:

﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

''جب اُن کے پاس اللہ کی طرف سے ایک کتاب آئی جو اس (کتاب) کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس ہے اور اس سے پہلے وہ ان لوگوں کے خلاف فتح مانگتے تھے جنھوں نے کفر کیا، پھر جب ان کے پاس وہ (حق) آ گیا جسے انھوں نے پہچان لیا تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا، لہٰذا کافروں پر اللہ کی لعنت ہے۔'' [2]

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عطاء بن یسار کی حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: قرآنِ مجید کی یہ آیت:

---

[1] ابنِ کثیر نے یہ روایت سعید بن یحییٰ اموی کے حوالے سے نقل کی ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی عثمان وقاصی ضعیف ہے، یوں بھی یہ سند مرسل ہے اور ابن المسیب تک پہنچ کر موقوف ہو جاتی ہے، دیکھیے: (البداية والنهاية:301,300/2) [2] البقرة 89:2. اس آیت کی تفسیر کے بارے میں بیان کی گئی روایات کے متعلق ملاحظہ ہو: (تفسير الطبري (تحقيق أحمد شاكر) : 332/2-336) یہ روایات آپس میں ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ہوئی حسن لغیرہ کے درجے تک جا پہنچتی ہیں۔

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ۝ ﴾

''اے نبی! ہم نے تمھیں خوشخبری دینے والا، ڈرانے والا اور گواہ بنا کر بھیجا ہے۔''[1]

تورات میں یوں آتی ہے: ''اے نبیٔ کریم! ہم نے تمھیں خوشخبری دینے والا، ڈرانے والا اور گواہ بنا کر بھیجا ہے اور امیوں (عربوں) کے لیے پناہ بنایا ہے۔ تم میرے بندے اور رسول ہو۔ میں نے تمھارا نام متوکل رکھا ہے۔ نہ تم بدخلق ہو، نہ سخت طبیعت، نہ بازاروں میں شور مچانے والے۔ تم برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ معاف کرتے ہو اور درگزر کرتے ہو۔ اللہ اس کی روح قبض نہیں کرے گا جب تک اس کے ذریعے سے ایک گمراہ امت کو راہِ راست پر نہ لے آئے یہاں تک کہ وہ پکار اٹھیں: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه» پھر اللہ تعالیٰ اس کلمہ کے ساتھ اندھی آنکھیں، بہرے کان اور بند دل کھول دے گا۔''[2]

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا سبب یہی بنا تھا کہ وہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں اور علامات و صفات یہودی علماء اور عیسائی راہبوں سے پوچھتے رہتے تھے۔ بہت سے دوسرے صحابہ کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ یہ بات بھی معروف ہے کہ اہلِ کتاب نے بعد میں اپنی کتابوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات مٹانے کی کوشش کی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے، تا کہ اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت لے لیں۔''[3]

نیز اس فرمان میں ہے:

''اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمھاری طرف اللہ کا

[1] الأحزاب 33:45. [2] صحيح البخاري، التفسير، باب: ﴿ إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ۝ ﴾، حديث:4838. [3] البقرة 2:79.

رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس (کتاب) تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہے، پھر جب وہ (رسول) ان کے پاس کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ بولے: یہ تو کھلا جادو ہے۔'' [1]

فرمان الٰہی ہے:

''وہ لوگ جو اس رسول امی، نبی کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔'' [2]

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے اہل کتاب! ہمارا رسول تمھارے پاس آچکا ہے۔ وہ تمھارے لیے اللہ کی کتاب کی بہت سی ایسی باتیں ظاہر کرتا ہے جنھیں تم چھپائے بیٹھے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔ یقیناً تمھارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور واضح کرنے والی کتاب آچکی ہے۔'' [3]

لیکن وہ اپنی کوششوں کے باوجود پوری حقیقت کو نابود نہیں کر سکے جیسا کہ ان عبارات سے واضح ہوتا ہے جو عیسائیوں کی بعض انجیلوں میں اب تک موجود ہیں۔ جن میں ''نبی منتظر'' کا نام، اس کی صفات اور زمان و مکان تک کی واضح نشاندہی موجود ہے۔ [4] جن لوگوں نے براہِ راست اس موضوع (حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کے بارے میں تورات وانجیل کی بشارتیں) پر تفصیل سے لکھا ان کے نام اور کام حسبِ ذیل ہیں:

* پروفیسر ابراہیم خلیل احمد: یہ پہلے مصر کے بڑے پادری تھے۔ ان کا سابقہ نام ابراہیم خلیل فلپس تھا۔ چالیس سال پہلے جب انھوں نے اسلام اور دوسرے آسمانی ادیان کا

[1] الصّفّ 6:61. [2] الأعراف 157:7. [3] المآئدة 15:5. [4] قراءة جديدة للسيرة النبوية للدكتور قلعجي، ص: 39.

تقابلی مطالعہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں ہدایت نصیب فرمائی۔ انھوں نے اپنے مطالعے کے نتائج اپنی کتاب محمد في التوراة والإنجيل والقرآن میں تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان کو عہد نامۂ قدیم (تورات) اور عہد نامۂ جدید (انجیل) کی گہری واقفیت حاصل تھی جس کی مدد اور صحیح مطالعے اور تجزیے سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام ہی دین حق ہے، چنانچہ انھوں نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ اس کے عظیم داعی بھی بن گئے۔ وہ اپنے اس گرانقدر مقالے میں لکھتے ہیں: ''ہم اس تنقیدی اور تفصیلی جائزے کے بعد آسانی سے مکمل اور صحیح صورت حال بیان کر سکتے ہیں جو ''کتاب مقدس'' کی صریح عبارات سے حاصل ہوتی ہے۔ جس پر کوئی تحریف، تغیر یا تبدیلی اثر انداز نہیں ہوئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کی خاطر ان باتوں کو محفوظ رکھا ہے۔ اسی بنا پر ہم ''رسول نبی اُمی'' کی نمایاں تصویر حاصل کر سکتے ہیں جو تورات و انجیل میں اہل کتاب کے ہاں واضح لکھی ہوئی پائی جاتی ہے۔'' یہ ''رسولِ اُمی'' اپنی واضح اور بلند پایہ خوبیوں کے باعث ممتاز نظر آتے ہیں۔ یہ خصوصیات دو طرح کی ہیں:

اولاً: محمد ﷺ آخری رسول اور نبی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

ثانیاً: محمد ﷺ تمام جہانوں کے لیے اللہ کے آخری رسول ہیں کیونکہ:

* آپ ﷺ مضبوط حکمران اور رحم دل شخصیت ہیں۔
* آپ ﷺ امتِ مسلمہ کی بنیاد حق اور نیکی پر رکھنے والے ہیں۔
* آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے فضل سے تمام امتوں کے لیے نورِ ہدایت ہیں۔
* آپ ﷺ قیدار بن اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کی نسل سے واضح نسلی تعلق رکھتے ہیں۔

یہ چاروں حقائق کتاب اشعیاء (42:1-11) سے لیے گئے ہیں۔

* آپ ﷺ حضرت اسماعیل کی نسل سے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام کے بھائی ہیں۔ اس لحاظ سے اسماعیل علیہ السلام تمام عبرانیوں کے چچا لگتے ہیں۔

* آپ ﷺ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے وہ تمام وعدے پورے ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے کیے۔
* آپ ﷺ کی بدولت زمین کی تمام قوموں کو برکت حاصل ہوئی۔
* آپ ﷺ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حقیقی وارث ہیں اور اسماعیل حضرت ابراہیم کے پہلوٹے بیٹے تھے، چنانچہ آپ ﷺ ہی ''بڑے حصے'' کے حقدار ہیں۔
* آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست وحی حاصل کرنے والے ہیں۔

یہ حقائق کتاب تکوین (17:20-22 ، 22:16-18) اور کتاب تثنیہ (21:15-17، 18:15-19) سے لیے گئے ہیں۔

* آپ ﷺ حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی رسالت کے اختتام پر تشریف لائے۔
* آپ ﷺ نے حضرت مسیح کے صاحبِ ایمان پیروکاروں کو تسلی اور ہدایت دی۔

(یہ فارقلیط کا مفہوم ہے۔ اسے انگریزی میں Paraclete اور عبرانی میں البارا قلیط کہتے ہیں۔)

* آپ ﷺ کے افعال، اقوال اور خصائل ببانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ آپ ہی ''محمد'' ہیں۔ (انگریزی میں ''محمد'' کو The Praised One(Pericyte) کہا گیا ہے۔)
* آپ ﷺ صادق و امین ہیں۔ صدق و امانت میں آپ کی شہرت عالم گیر ہے۔
* آپ ﷺ کا پیغام اور رسالت ابدی اور دائمی ہے۔
* آپ ﷺ کامل حق کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں۔
* آپ ﷺ نے حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام اور اُن کی والدہ محترمہ کا پورا پورا دفاع کیا اور اُن کے بارے میں شبہات دور کیے (وہ میری بزرگی بیان کریں گے۔)

یہ حقائق انجیل یوحنا (14:16،17 و 14:45 و 14:26) انجیل یوحنا (15:26،27) انجیل یوحنا (16:13،14) سے ماخوذ ہیں۔

مندرجہ بالا مختصر شواہد سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یہ آخری نبی دوسرے عبرانی انبیاء سے کم از کم تین بنیادی امور میں ممتاز ہیں:

* وہ آخری نبی عالمگیر رسالت کا حامل ہوگا۔
* وہ حقیقتاً آخری نبی ہوگا۔ اس کے بعد کسی قسم کی نبوت باقی نہیں رہے گی۔
* وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہوگا جسے بنواسرائیل نے اپنے سے جدا کر دیا تھا، نیز قیدار بن اسماعیل کی نسل سے ہوگا۔

یہ حقائق انجیل یوحنا (16:12-14) اور کتاب اشعیاء (60:1-7) سے لیے گئے ہیں۔

پروفیسر ابراہیم نے اپنی اس کتاب میں حضرت محمد ﷺ کی رسالت و نبوت کے بارے میں تورات اور انجیل کی بہت سی بشارتیں نقل کی ہیں۔[1]

یہ کتاب شایانِ مطالعہ ہے کیونکہ ان حقائق کی نقاب کشائی میں جو عام لوگوں سے اوجھل ہیں، یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے:

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس (نبی) کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور بے شک ان میں سے ایک گروہ ضرور حق کو چھپاتا ہے، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔"[2]

اور فرمایا:

"اور بلاشبہ وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ اُن کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔"[3]

* دکتور شفیع ماحی احمد، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ، ٹریننگ کالج، کنگ سعود یونیورسٹی

---

[1] محمّد في التوراة والإنجيل لإبراهيم خليل أحمد، ص: 62,61. [2] البقرة 2:146.
[3] البقرة 2:144.

(الریاض): اُن کی کتاب کا عنوان ہے: محمد ﷺ في بشارات التوراة والإنجيل اسے جامعۃ الملک سعود ہی نے شائع کیا ہے۔ ان کی تحقیق کا مقصد اُن بشارتوں کا جائزہ لینا ہے جو بنی اسرائیل کے انبیاء نے محمد ﷺ کی تشریف آوری کے بارے میں دی ہیں اور تورات و انجیل میں مرقوم ہیں۔ ان میں آپ ﷺ کے زمانۂ ظہور، علاقۂ رہائش و نبوت، نامِ نامی، صفات و احوال، آخری رسالت کا طریقۂ کار، امتِ مسلمہ اور تا قیامت حکمرانی کے متعلق صراحت ملتی ہے۔

احمد دیدات رحمہ اللہ کی کتاب جس کا ترجمہ: ماذا يقول الكتاب المقدس عن محمد ﷺ کے نام سے پروفیسر ابراہیم خلیل احمد نے کیا۔ محمود شرقاوی کی کتاب محمد ﷺ في بشارات الأنبياء، رحمت اللہ بن ابراہیم خلیل الرحمٰن ہندوستانی کی کتاب «إظهار الحق» جس کی تحقیق دکتور محمد احمد عبدالقادر ملکاوی نے کی اور اس پر حواشی بھی لکھے۔ اسے ''ادارۂ بحوث علمیہ والافتاء والدعوۃ والارشاد'' کے سیکرٹریٹ نے الریاض سے 1410ھ /1989ء میں شائع کیا۔ اس کی چار جلدیں ہیں۔ چوتھی جلد کے چھٹے باب میں صفحہ 1116 سے 1198 تک ''آپ ﷺ کی نبوت کے بارے میں گزشتہ انبیاء کی پیش گوئیاں'' کے تحت تورات و انجیل کی اصل عبارات سے اٹھارہ بشارتیں مذکور ہیں۔ دکتور ملکاوی کو اس تحقیق کی بنیاد پر امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی، الریاض کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔ موصوف ہمارے ساتھ کنگ سعود یونیورسٹی کے شعبہ ثقافت اسلامیہ میں کام کرتے رہے ہیں۔

یہ بات نہیں کہ صرف اہل کتاب ہی خاتم النبیین نبیٔ عربی ﷺ کے نام و صفات کو بخوبی جانتے تھے، اہل کتاب کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اُن سے پہلے یہ سب کچھ جانتے تھے۔ میں نے انگریزی زبان میں ایک معتبر مقالہ پڑھا ہے جو اصل ہندی ماخذوں سے استفادہ کر کے لکھا گیا ہے۔ اسے پروفیسر انور حسین اور وقار عظیم ندوی نے ''حضرت

محمد ﷺ ...... مقدس ہندی کتابوں میں'' [Muhammad (P.B.U.H) in Hindu's Sacred Books] کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

* لفظ ''محمد'' کے معانی، سنسکرت زبان میں اس کے لکھنے کی شکل اور اس کا تلفظ، یہ سب کچھ مقدس ہندی کتابوں میں موجود ہے۔ تفصیل یہ ہے:

❶ رگ وید، کنڈ:5، منڈل:27، منتر:1.

❶ Riga Veda, Kand5, Mandal27, Mentra1.

❷ اتھر وید، کنڈ:20، سکت:127، منتر:3.

❷ Atharva Veda, Kand 20, Sukt 127, Mantra3.

❸ بھوشا پُرانا، کنڈ:3، سورگ:3/3، منتر:5 و 12.

❸ Bhavishya Purana, Kand3, Surg 3/3, Mantra 5 and 12.

❹ سری مد بھگوت، مہتم پرانا، باب:2: اشلوک:76.

❹ Srimad Bhagawat, Mahtampurana, Chapter 2, Shlok 76.

❺ تلسی کی رام چرتری مانس، سنگم پرانا سے ماخوذ، کنڈ:12، باب:6.

❺ Talasi's Ramacharitramanas, deriving from Sangrampurana, Kand 12, Chapter 6.

لفظ ''احمد'' اس کے معانی اور سنسکرت زبان میں اس کے لکھنے کی شکل اور اس کا تلفظ یہ سب کچھ مقدس ہندی کتابوں میں موجود ہے۔ تفصیل یہ ہے:

❶ رگ وید، منڈل:8، منتر:10.

❶ Riga Veda, Mandal 8, Mantra 10.

❷ سام وید، پراپ تھک:2، دشتی:6، منتر:8.

❷ Sama Veda, Prapathak 2, Dashti 6, Mantra 8.

❸ اتھر وید، کنڈ:20، سکت:126، منتر:14.

❸ Atharua Veda, Kand 20, Sukt. 126, Mantra 14.

❹ یجر وید، سکت:31، منتر:18.

❹ Yajur Veda, Sukt 31, Mantra 18.

▪ مقدس ہندی کتابوں میں جو تورات و انجیل سے پہلے کی ہیں، نبی کریم محمد ﷺ کے کئی ایک اوصاف اور آپ سے متعلقہ چند واقعات بیان کیے گئے ہیں جو سیرت نبوی کے مطابق ہیں، مثلاً: ❶ وہ اونٹ پر سوار ہوگا۔ ❷ وہ بارہ عورتوں سے شادی کرے گا (دونوں محققین نے ان کا ذکر کیا ہے: خدیجہ، سودہ، عائشہ، حفصہ، زینب بنت خزیمہ، ام سلمہ، زینب بنت جحش، ام حبیبہ، صفیہ، جویریہ، ریحانہ، میمونہ رضی اللہ عنہن ❸ وہ ختنے والا اور ڈاڑھی والا ہو گا۔ ❹ اس کا دشمنوں سے مقابلہ ہوگا جن کی تمام جنگوں میں مجموعی تعداد 60090 ہوگی۔ (دونوں محققین نے اس کی بھی تفصیل بیان کی ہے۔) ❺ وہ غیر معمولی سرعت کے ساتھ آسمان پر چڑھے گا اور پھر واپس آجائے گا۔ ❻ ان کتب مقدسہ نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے خصائل، ان کی جماعتوں کی حقیقی تعداد اور ان کی اقسام بھی بیان کی ہیں۔ ❼ ان کتابوں میں نبی کریم محمد ﷺ کے والد محترم اور والدہ محترمہ کے ناموں کا مطلب بھی بیان کیا گیا ہے۔

دونوں فاضل مؤلفین نے آخر میں مزید مطالعہ کے لیے اس موضوع کے متعلق پانچ اردو کتب و مراجع کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

❶ ڈاکٹر کملا کانت تواڑی کی ''کالی یوگا کی انتمارِشی۔''

❶ Doctor Kamalakant Tiwari, Kali Yuga Ke Antima Rishi.

❷ پنڈت دھرم ویدا پادھیا کی ''انتم شوور دوت۔''

❷ Pundit Dharam Veda Upadhyay, Antim Shwer Doot.

❸ وید پرکاش اپادھیا کی ''کلکی اوتار۔''

❸ Veda Prakash Upadhyay, Kalki Avatara.

❹ ابن اکبر اعظمی کی ''محمد ﷺ ہندو کتابوں میں۔''

❹ Ibn Akber Azami, Muhammad (P.B.U.H) Hindu Kitabon mein.

❺ شمس نوید عثمانی کی ''اب بھی نہ جاگے تو۔''

❺ Shams Navid Usmani, Ab Bhi Na Jage To.

دونوں محققین نے وضاحت کی ہے کہ اس مقالے کی بنیادی معلومات ابن اکبر اعظمی کی کتاب ''محمد ﷺ ہندو کتابوں میں'' (مذکورہ بالا نمبر 4) سے لی گئی ہیں۔ یہ کتاب ''دار الصفہ'' لاہور کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔

جاہلانہ باتوں سے رسول اللہ ﷺ کی خصوصی حفاظت اور اس کی حکمت

جب کعبہ کی عمارت منہدم ہوگئی تو اس کی تعمیر نو میں رسول اللہ ﷺ بھی بنفسِ نفیس شریک ہوئے۔ آپ لوگوں کے ساتھ تعمیر کے لیے پتھر لاتے تھے۔ آپ ﷺ نے تہ بند باندھا ہوا تھا۔ آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس نے آپ سے تقاضا کیا کہ ازار (تہبند) کھول کر کندھے پر رکھ لیں تاکہ کندھا پتھر سے زخمی نہ ہو جائے۔ جونہی آپ ﷺ نے ازار اتارا آپ بے ہوش ہوکر گر پڑے، اس کے بعد کبھی بغیر کپڑے کے نظر نہ آئے۔ [1]

ایک دن آپ قریشی بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ کسی ضرورت سے پتھر اٹھانے کی نوبت آئی۔ آپ نے اپنا ازار کھولا اور گردن پر رکھ لیا۔ جونہی ننگے ہوئے، کسی غیبی قوت نے آپ کو زور سے تھپڑ مارا اور کہا: ''اپنا ازار اپنے اوپر باندھو'' آپ نے فوراً باندھ لیا۔ دوسرے بچوں کو اس واقعے کا کوئی علم ہی نہیں ہوا۔ (گویا علیحدگی میں کپڑے اتارے تھے) یہ بچپنے کی بات ہے۔ [2]

[1] صحيح البخاري، الصّلاة، باب كراهية التعرّي في الصّلاة، حديث: 364، وصحيح مسلم، الحيض، باب الاعتناء بحفظ العورة، حديث: 340. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 241/1.

روایت ہے، ایک دو دفعہ ایسا ہوا کہ آپ نے عام نوجوانوں کی طرح رات کو قصہ کہانی کی مجلس میں بیٹھنا چاہا لیکن اللہ تعالیٰ نے غیبی طریقے سے آپ کو ایسی مجلس میں جانے کا موقع نہ دیا۔ علماء نے اس واقعے کی صحت میں اختلاف کیا ہے مگر امام حاکم اور علامہ ذہبی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔[1] حافظ ابن کثیر اور علامہ البانی نے بعض وجوہ کی بنا پر اسے کمزور قرار دیا ہے اور ان کے دلائل قوی ہیں۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے اپنی قوم کی غلط باتوں کی مخالفت بھی کی۔ زمانۂ جاہلیت میں حرم میں رہنے والے جو اپنے آپ کو ''حمس'' (30) کہتے تھے، دورانِ حج میں عرفات کے بجائے مزدلفہ ہی سے واپس آ جاتے تھے لیکن آپ عرفات سے واپس آئے۔ جبیر بن مطعم نے نبی اکرم ﷺ کے اس عمل پر اظہارِ تعجب کیا۔[3] اسلام آیا تو اس نے قریش کی اس

(30) حُمْس: ان سے مراد خاص طور پر وہ عرب اور ان کی اولادیں ہیں جو حرم میں رہائش پذیر تھے۔ کنانہ و جدیلہ جیسے وہ عرب قبائل بھی ان میں شامل ہیں جو حرم کی رہائش میں ان کے شریک رہے۔ حرم میں رہنے والے عربوں کا خیال تھا کہ اُن کا مرتبہ دیگر عرب اقوام و قبائل سے بلند تر ہے، چنانچہ انھوں نے اپنے آپ کو دوسروں سے نمایاں اور ممتاز رکھنے کے لیے یہ راستہ اپنایا کہ حج کے دوران میں میدانِ عرفہ کا وقوف اور وہاں سے افاضہ ترک کر دیا، دیکھیے: (صحیح البخاري، الحج، باب الوقوف بعرفة، حدیث: 1665، وصحیح مسلم، الحج، باب في الوقوف......، حدیث: 1219، والسیرة النبویة لابن هشام: 256/1، والبدایة والنهایة: 313/2) یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نام ''حُمس'' اس لیے پڑا کہ وہ بزعم خویش اپنے دین کے معاملے میں بڑے پرجوش اور جذباتی تھے۔ یہ حماسۃ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: پرجوش، جذباتی اور شدت پسند ہونا۔

◄◄ ابنِ ہشام نے اس روایت کو ابنِ اسحاق کے حوالے سے بغیر سند کے نقل کیا ہے۔ [1] المستدرك للحاكم: 254/4. حاکم نے اسے صحیح کہا اور ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے۔ تلیدی نے اسے حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (تهذیب الخصائص الکبریٰ للسیوطي، ص: 70,69) تلیدی نے مزید کہا ہے کہ حافظ ابنِ حجر نے اس کی سند کے متعلق کہا کہ وہ حسن ہے۔ [2] البدایة والنهایة: 312/2، ودفاع عن الحدیث النبوي و السیرة، ص: 13. [3] صحیح البخاري، الحج، باب الوقوف بعرفة، حدیث: ◄◄

بدعت کو ختم کر کے حکم دیا:

﴿ ثُمَّ اَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ ﴾

''پھر تم وہاں سے واپس آؤ جہاں سے دوسرے لوگ واپس آتے ہیں۔'' [1]

لیکن اس حکم کے نازل ہونے سے قبل ہی آپ ﷺ کا عرفات سے واپس آنا اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق کا نتیجہ تھا۔ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد یہ واقعہ بیان کیا تھا۔ [2]

امام بیہقی رحمہ اللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی بت کو نہیں چھوا بلکہ آپ ﷺ لوگوں کو نزول وحی سے پہلے بھی اس فعل سے روکا کرتے تھے۔ آپ نے طواف کے وقت اساف اور نائلہ کے بت کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا تھا جبکہ اہلِ جاہلیت ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ [3]

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ جب بحیرا راہب نے قریش کے طریقۂ کار کے مطابق لات وعزیٰ کی قسم کھائی تو آپ ﷺ نے اس سے کہا:

«لَا تَسْأَلْنِي بِاللَّاتِ وَالْعُزّٰى شَيْئًا، فَوَاللّٰهِ! مَا أَبْغَضْتُ بُغْضَهَا شَيْئًا قَطُّ»

''لات وعزیٰ کا نام لے کر مجھ سے کسی چیز کا مطالبہ نہ کرو۔ اللہ کی قسم! مجھے جتنی نفرت ان سے ہے کسی اور چیز سے نہیں۔'' [4]

[1] البقرة 2:199. [2] صحيح مسلم، الحج، باب في الوقوف......، حديث: 1220. وصحيح مسلم، الحج، باب في الوقوف......، حديث: 1220. ◄◄ 1664، السيرة النبوية لابن هشام:1/262,261. ابن ہشام نے اسے ابنِ اسحاق کی روایت سے نقل کیا ہے۔ [3] دلائل النبوة للبيهقي: 2/34، والبداية والنهاية: 2/312، وتاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 1/81. ذہبی نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔ [4] السيرة النبوية لابن هشام: 1/238. روایت کی سند معلق ہے، دیکھیے: (البداية والنهاية: 2/312,313، ودلائل النبوة للبيهقي: 2/28-35) تمام سندیں ضعیف ہیں، تاہم ◄◄

اللہ تعالیٰ نے آپ کو جاہلیت اور اسلام کے دونوں ادوار [1] میں شیاطین کے حربوں سے محفوظ رکھا۔ [2]

قریش ہر سال ''بوانہ'' بت کے پاس عید منایا کرتے تھے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس بت کے پاس ٹھہرنے سے انکار کر دیا۔ اس وجہ سے آپ کی پھوپھیاں اور چچا ابوطالب آپ سے بہت ناراض ہوئے۔ آپ نے مجبوراً اُن کی بات مان لینے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بتوں کو چھونے سے بچا لیا۔ ایک سفید رو لمبے قد کا آدمی آپ کے سامنے ظاہر ہوا۔ اس نے آپ کو بت چھونے سے روک دیا۔ اس طرح آپ اپنی زندگی میں قریش کی کسی عید میں کبھی شریک نہ ہوئے۔ [3]

بیہقی کی روایت ہے کہ دو فرشتوں نے (وحی سے پہلے) آپ کو مشرکین کے ساتھ اُن کے میلوں میں جانے سے روک دیا تھا، چنانچہ آپ کبھی کسی میلے اور کھیل تماشے میں نہیں گئے۔ [4]

»» رسول اللہ ﷺ کا لات وعزیٰ سے نفرت کرنا اور اُن کا نام لے کر قسم نہ کھانا صحیح سندوں سے ثابت ہے۔ اس کے لیے دیکھیے: (مسند أحمد: 222/4، ومجمع الزوائد: 225/8) ہیثمی نے اس روایت کے متعلق کہا کہ اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ [1] دلائل النبوّة لأبي نعیم: 192/1-212. راوی حسین بن عبداللہ کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس روایت کی دونوں سندیں ضعیف ہیں، تاہم بعض صحیح اور ضعیف روایات رسول اللہ ﷺ کے بتوں سے نفرت کرنے کی نسبت اس کی تائید کرتی ہیں، چنانچہ یہ روایت قوی ہوجاتی ہے۔ [2] دلائل النبوّة لأبي نعیم: 191/1، والإصابة: 389/2، ومسند أحمد: 419/3. اس کے راوی ثقہ ہیں۔ دلائل النبوة لأبي نعیم کے محققین نے یہی کہا ہے۔ لیکن الموسوعة الحدیثیة (مسند أحمد): 200/24، حدیث: 15460 کے محققین نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ [3] الطبقات الکبریٰ: 158/1. یہ واقدی کی سند سے ہے چنانچہ ضعیف ہے۔ لیکن اس میں جو مضمون بیان ہوا وہ بالکل صحیح ہے۔ [4] دلائل النبوة للبیهقي: 35/2، والبدایة والنهایة: 312/2. یہ روایت امام عثمان بن ابی شیبہ کی سند سے نقل کی گئی ہے۔ ابنِ کثیر نے اس کے متعلق لکھا: ''کئی »»

اہم امور

* ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بعثت سے پہلے اور بعد میں بھی جاہلیت کے قبیح کاموں سے محفوظ رہے۔ یہ آپ پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت تھی تاکہ ایسے کاموں سے آپ کی شخصیت اور دعوت ہر طرح محفوظ رہے۔
* یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگوں کی موجودگی میں ننگا ہونا اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی قبیح فعل ہے۔ اسلام نے اشد مجبوری، مثلاً: علاج وغیرہ کے علاوہ اسے سختی سے حرام قرار دیا ہے۔[1]
* اللہ تعالیٰ کا رسول ﷺ کو ان امور سے محفوظ رکھنا اس بات کی دلیل تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو ایک نہایت عظیم الشان مقصد کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔

« ائمۂ حدیث نے اس روایت کی وجہ سے عثمان بن ابی شیبہ پر نکتہ چینی کی ہے۔'' امام بیہقی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بعثت سے قبل اُن افراد کے ساتھ گئے جو بتوں کا استلام کرتے (انھیں تبرک کی خاطر چھوتے) تھے۔ واللہ أعلم، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 36/2) امام ذہبی نے لکھا ہے کہ عثمان بن ابی شیبہ کا شمار اُن راویوں میں ہوتا ہے جن پر بخاری و مسلم نے اپنی کتابوں میں روایت کرتے ہوئے اعتماد کیا ہے۔ انھوں نے عقیلی اور ازدی کے اُس بیان کی تردید کی ہے جس میں انھوں نے عثمان بن ابی شیبہ کی حدیث کو ضعیف قرار دیا تھا، دیکھیے: (ميزان الاعتدال: 35/3) دلائل النبوة کے محقق دکتور عبد المعطي قلعجي نے جن کا اپنا رجحان اس روایت کے صحیح ہونے کی طرف ہے، اس کی تحقیق میں کہا: ''اس روایت کو ابویعلیٰ، ابن عدي اور ابن عساکر نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کے حوالے سے نقل کیا ہے۔'' شیخ طرہونی نے اس روایت کی سند کو حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (صحيح السيرة النبوية، حاشية: 109)

[1] فتح الباري: 24/3.

عنفوان شباب

جنگ فجار

بنو کنانہ اور قریش، اور ایک لحاظ سے قیس عیلان کے درمیان ایک جنگ ہوئی جسے فجار کا نام دیا گیا کیونکہ اس جنگ میں فریقین نے باہمی حرمتوں کی پامالی روا رکھی تھی۔[1] سبب صرف یہ تھا کہ ایک قریشی مارا گیا تھا۔ اس بنا پر احلاف نے اپنے لوگوں سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ جنگ کا بازار گرم کریں۔[2]

مؤرخ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ جب یہ جنگ بھڑکی تو رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک بیس سال تھی۔[3] ابن ہشام نے چودہ یا پندرہ سال عمر بتائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی چند دن اپنے چچاؤں کے ساتھ اس میں شریک ہوئے۔ آپ ﷺ نے خود فرمایا:

«كُنْتُ أَنْبُلُ عَلٰى أَعْمَامِي» ''میں اپنے چچاؤں کو تیر پکڑاتا تھا۔''[4]

جنگ فجار طویل عرصے تک جاری رہی، چنانچہ ابن اسحاق اور ابن ہشام کے اقوال میں تطبیق بھی ممکن ہے کہ اس جنگ کی ابتدا کے وقت آپ کی عمر تقریباً پندرہ سال اور اختتام کے وقت بیس سال تھی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس جنگ میں براہِ راست لڑائی میں حصہ لینے کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے، حالانکہ آپ لڑائی کی عمر، یعنی بلوغت کو پہنچ

[1] فتح الباري: 24/3. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 1/241-243. روایت بلا سند ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ [3] السيرة النبوية لابن هشام: 243/1. روایت بلا سند ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ [4] السيرة النبوية لابن هشام: 241/1. رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب یہ حدیث سند کے منقطع ہونے کی بنا پر ضعیف ہے۔

چکے تھے۔ علامہ سہیلی نے اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ یہ جنگ کافروں کے درمیان تھی اور اللہ تعالیٰ نے کسی مومن کو اجازت نہیں دی کہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے لڑائی کرے۔ [1]

میرا خیال ہے کہ اگر چچاؤں کو تیر پکڑانے والی روایت صحیح بھی ہو تب بھی اللہ کے رسول ﷺ کی اس جنگ میں شرکت محض علامتی تھی۔ آپ براہ راست قتال میں شریک نہیں ہوئے۔ اس کا جواز صرف یہی ہو سکتا ہے کہ آپ کا اس محاربے میں شریک ہونا مقامات مقدسہ اور دیگر محارم کے دفاع میں تھا، خصوصاً جبکہ قیس عیلان ہی نے ابتدا میں ظلم کا ارتکاب کیا تھا اور مظلوم کی مدد کرنا تمام انبیاء اور مصلحین کا امتیاز رہا ہے۔

حِلف الفضول میں شرکت

اسے مُطَیَّبِین کا حلف بھی کہتے ہیں۔ مسند احمد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اپنے چچاؤں کے ساتھ مُطَیَّبِین (31) کے حلف میں شریک ہوا تھا۔ اس وقت

(31) مُطَیَّبِین: ان سے مراد ہاشم، زہرہ اور مخزوم کے قبائل ہیں۔ اس کا یہ مطلب ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے بعض راویوں نے بیان کیا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو امام بیہقی نے نقل کیا ہے۔ امام بیہقی کا کہنا ہے کہ مُطَیَّبِین کا یہ مطلب اصحابِ حدیث سے اسی طرح روایت کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ یہ کس نے بیان کیا ہے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 38/2) یہ بات پیچھے گزر چکی ہے کہ ابنِ اسحاق نے حِلف المُطَیَّبِین کا اشارتاً ذکر کیا ہے۔ دراصل قصی کی وفات کے بعد قریشی قبائل کا آپس میں اختلاف ہو گیا جس کے نتیجے میں قریش کے دو فریق ایک دوسرے کے مدمقابل کے طور پر سامنے آئے۔ پہلا فریق بنی عبد مناف اور ان کے حلیفوں اور دوسرا فریق بنی عبدالدار اور اُن کے حلیفوں پر مشتمل تھا۔ بنی عبد مناف خوشبو سے بھرا ہوا ایک ٹب کعبہ میں لائے اور اپنے ہاتھ خوشبو میں ڈال کر حلف اٹھایا، پھر بطورِ تاکید خوشبو سے بھرے ہاتھ کعبہ سے مس کیے۔ عربی زبان میں خوشبو کو طِیب کہتے ہیں، چنانچہ بنی عبد مناف اور ان کے حلیفوں (اتحادیوں) کو مُطَیَّبِین کے لقب سے یاد کیا گیا۔ دوسری «

[1] الرّوض الأنف: 209/1.

میں نوجوان تھا۔ مجھے کوئی سرخ اونٹوں کا ریوڑ بھی دے تو میں وہ عہد توڑنا پسند نہ کروں۔"[1]

بیہقی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں حلف المطیبین کے علاوہ قریش کے کسی معاہدے میں شریک نہیں ہوا۔ سرخ اونٹوں کے عوض بھی مجھے وہ عہد توڑنا گوارا نہیں۔"[2]

امام بیہقی نے اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چند سیرت نگاروں نے کہا ہے: "اس عہد سے مراد "خلف الفضول" ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حلف المطیبین کا دور نہیں پایا۔"[3]

میرے نزدیک سیرت نگاروں کی یہ بات صحیح ہے۔ خود امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں یہی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حلف المطیبین کا دور نہیں پایا۔[4]

احمد، بیہقی اور اہل سیر کی روایت میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں حلف المطیبین کی تجدید کر کے اس کا نام حلف الفضول رکھ دیا گیا۔[5] واللّٰہ أعلم.

مسند حمیدی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میں عبداللہ بن جدعان (32) کے گھر میں ایک معاہدے میں موجود تھا۔ اگر آج بھی مجھے اس معاہدے میں شرکت کی دعوت دی جائے تو ضرور قبول کروں گا۔ اس معاہدے کے شرکاء نے عہد کیا تھا کہ

◄◄ طرف بنی عبدالدار اور ان کے حلیف قبائل نے بھی کعبہ میں حلف اٹھایا کہ ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے، نہ ہم میں سے کوئی اپنے کسی حلیف کو دشمن کے حوالے کرے گا۔ یہ احلاف کہلائے۔

(32) عبداللہ بن جدعان: یہ قبیلہ بنو تیم سے تعلق رکھتے تھے اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے قریبی رشتے دار تھے۔ ان کی کنیت ابوزہیر ہے۔

[1] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 121/3. احمد شاکر نے اس حدیث کی سند کو صحیح کہا ہے۔ [2] دلائل النبوة للبيهقي: 38,37/2، والبداية والنهاية: 315/2. ابن کثیر نے بیہقی کی سند اور چند دیگر سندوں سے یہ روایت نقل کی ہے جو قوی ہے۔ [3] دلائل النبوة للبيهقي: 38/2. [4] السنن الكبرى للبيهقي: 367/6. [5] النهاية في غريب الحديث والأثر: 456/3، مادة الفاء مع الضاد، وحاشية مسند أحمد. (تحقيق أحمد شاكر): 122/3، وسبل الهدى والرّشاد: 209/2.

ہر حق والے کو اس کا حق دلایا جائے گا اور کوئی ظالم کسی پر کوئی زیادتی نہیں کر سکے گا۔''[1]

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ایک معاہدے میں موجود تھا۔ مجھے پسند نہیں کہ مجھے اُس معاہدے میں شرکت کے بجائے سرخ اونٹ ملتے۔ اور اگر اسلام میں بھی مجھے اس قسم کے معاہدے کی دعوت دی جائے تو میں ضرور قبول کروں گا۔''[2]

یہ باہمی معاہدہ بنوہاشم، بنوعبدالمطلب، بنواسد، بنوزہرہ اور بنوتیم نے کیا تھا کہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور ظالم سے مظلوم کا حق لے کر دیں گے۔[3] یہ ماہِ ذیقعد میں بعثت سے بیس سال پہلے کا واقعہ ہے جب قریش جنگ فجار سے واپس آئے تھے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کی عمر بیس برس تھی۔ اس معاہدے کے اولین داعی نبیٔ اکرم ﷺ کے چچا زبیر بن عبدالمطلب تھے۔

اس کا سبب یہ تھا کہ زُبید قبیلے کا ایک آدمی اپنا تجارتی سامان لے کر مکہ مکرمہ آیا۔ عاص بن وائل سہمی نے اس سے وہ سامان خرید لیا۔ عاص بہت بڑا سردار تھا۔ اپنی سرداری کے زعم میں اس نے اس غریب کی رقم دبا لی۔ زبید کے آدمی نے احلاف کے قبائل عبدالدار، مخزوم، جُمَح اور سہم سے مدد طلب کی۔ انھوں نے نہ صرف اس بے چارے کی مدد سے انکار کیا بلکہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کی۔ جب اس زبیدی نے خطرہ محسوس کیا تو وہ طلوع

---

[1] البداية والنهاية: 315/2. ابنِ کثیر نے یہ روایت حمیدی کے حوالے سے نقل کی ہے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ شامی نے اپنی کتاب سیرت میں اور دکتور قلعجی نے لکھا کہ اس روایت کے ان الفاظ: ''اس معاہدے کے شرکاء نے عہد کیا تھا'' سے آخر تک کے الفاظ حدیث کا حصہ نہیں ہیں، کسی راوی نے یہ الفاظ اس میں داخل کر دیے ہیں، چنانچہ ان الفاظ سے کسی قسم کی کوئی دلالت حاصل نہیں ہوتی۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 183,182/1. اس روایت کی سند صحیح مرسل ہے۔ حمیدی کی روایت اس کی تائید کرتی ہے جس کی بنا پر یہ روایت قوی ہو جاتی ہے۔ [3] السيرة النبوية لابن هشام: 182/1. ابنِ اسحاق نے اس روایت کو بلاسند بیان کیا ہے۔

شمس کے وقت جبل ابوقبیس پر چڑھ گیا، اس وقت قریشی کعبہ کے اردگرد اپنی مجلسوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے بڑی رقت اور بلند آہنگی سے یہ شعر پڑھے:

يَا آلَ فِهْرٍ لِّمَظْلُومٌ بِضَاعَتَهُ   بِبَطْنِ مَكَّةَ نَائِي الدَّارِ وَالنَّفَرِ

وَمُحْرِمٌ أَشْعَثَ لَمْ يَقْضِ عُمْرَتَهُ   يَا لَلرِّجَالِ وَبَيْنَ الْحِجْرِ وَالْحَجَرِ

إِنَّ الْحَرَامَ لِمَنْ تَمَّتْ مَكَارِمُهُ   وَلَا حَرَامَ لِثَوْبِ الْفَاجِرِ الْغَدِرِ

''اے آل فہر! (قریشیو!) اس مظلوم کی مدد کرو جس کا تجارتی مال وادئ مکہ میں چھین لیا گیا وہ یہاں غریب الوطن اور اپنے لوگوں سے دور ہے۔ اس نے احرام باندھ رکھا ہے۔ پراگندہ سر ہے۔ ابھی تک اس نے عمرہ بھی پورا نہیں کیا۔ اے حجر اسود اور حجر کے مابین بیٹھے ہوئے لوگو! (میری مدد کرو۔) عزت وحرمت تو اس شخص کی ہے جس کے کام اچھے ہیں۔ غدار اور بدکار (عاص بن وائل) کی چادر کی کوئی عزت نہیں۔''

یہ سن کر زبیر بن عبدالمطلب اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ''کیا اسے بے یارومددگار چھوڑا جا سکتا ہے؟'' اس پر قریش، زہرہ اور تیم عبداللہ بن جدعان کے گھر اکٹھے ہوئے اور آپس میں معاہدہ کیا کہ وہ مظلوم کی مدد کے لیے یک جان رہیں گے حتی کہ ظالم مظلوم کا حق واپس کر دے۔ وہ اس معاہدے پر اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک سمندر میں پانی کی ایک بوند بھی باقی ہے اور جب تک ثبیر اور حرا پہاڑ اپنی جگہ قائم ہیں۔ اور یہ کہ وہ امورِ روزگار میں بھی ایک دوسرے کی ڈھارس بندھائیں گے۔

یہ معاہدہ ماہِ حرام ذیقعد میں طے ہوا۔ اور قریش نے اس معاہدہ کو ''حلف الفضول'' کا نام دیا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ یہ لوگ ایک فضیلت والے کام پر اکٹھے ہوئے ہیں، پھر یہ لوگ عاص بن وائل کے پاس گئے اور اس سے مظلوم کا سامان چھین

کر اس کے سپرد کر دیا۔[1]

حلف الفضول میں رسول ﷺ کی شرکت کی حکمت

* اگر اہل جاہلیت اپنے فطری جذبات کی بنیاد پر ظلم کے سدباب کے لیے اٹھ سکتے ہیں تو اہل اسلام کے لیے تو ناگزیر ہے کہ وہ اپنے عقیدے کی بنیاد پر ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں کیونکہ اسلام کی تو دعوت ہی یہ ہے کہ ظلم کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اسلام فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے اور اسے ہر قسم کی کجی اور انحراف سے بچانا چاہتا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس معاہدے کی اہمیت پر زور دیں کیونکہ اس معاہدے کا مضمون سراسر اسلام کی دعوت ہے کہ حق کو قائم رکھا جائے اور باطل اور ظلم کو مٹا دیا جائے۔
* رسول اللہ ﷺ کے چچا زبیر نے اس معاہدے میں جو کردار ادا کیا وہ اس حقیقت کی بڑی روشن دلیل ہے کہ ہاشمی خاندان کے لوگ جوان مرد تھے اور ایسے مواقع پر وہ دوسروں سے افضل ثابت ہوتے تھے۔ اس خاندان کے شرف و فضل کے لیے یہ یگانہ عظمت ہی بہت کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اسی خاندان سے ہیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی

حضرت خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی بن کلاب نہایت شریف النفس اور بالغ نظر خاتون تھیں۔ نسب کے لحاظ سے بلند، شان و شرف میں عظیم اور دولت و ثروت میں بہت ممتاز تھیں۔ اُن کی قوم کے لوگ ان سے شادی کو ترستے تھے۔ وہ لوگوں کو اپنا تجارتی مال دے کر روانہ کرتی تھیں اور اُنھیں منافع میں شریک کرتی تھیں۔ جب انھیں

[1] البدایة والنهایة: 316,315/2. ابنِ کثیر نے اس روایت کی سند بیان نہیں کی۔ ابنِ سعد نے یہ روایت واقدی کی سند سے اختصار کے ساتھ نقل کی ہے، دیکھیے: (الطبقات الکبریٰ: 129,128/1)

رسول اللہ ﷺ کی امانت و دیانت اور صدق و صفا کی اطلاعات ملیں اور آپ ﷺ کے عدیم النظیر اخلاق و آداب کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے آپ کو پیغام بھیجا اور شام کی طرف تجارتی مال لے جانے کی پیش کش کی اور وعدہ کیا کہ آپ کو دوسرے تاجروں کے مقابلے میں زیادہ حصہ دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ راضی ہو گئے اور اُن کے غلام میسرہ کو ہمراہ لے کر شام کے تجارتی سفر پر تشریف لے گئے۔ میسرہ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دورانِ سفر جن خرقِ عادت واقعات اور کرامات کا مشاہدہ کیا وہ اس نے من وعن سیدہ خدیجہ کی خدمت میں بیان کر دیے۔ نتیجتاً سیدہ خدیجہ بے حد متاثر ہوئیں اور آپ ﷺ کو شادی کا پیغام بھیج دیا۔ [1]

ان واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہوا کہ جب رسول اللہ ﷺ شام کے شہر بصریٰ پہنچے تو ایک درخت کے سائے میں فروکش ہوئے۔ وہاں کا نسطورر اہب کہنے لگا: ''اس درخت کے نیچے آج تک نبی کے سوا کوئی شخص نہیں ٹھہرا۔'' پھر اس نے میسرہ سے پوچھا: ''کیا ان کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ہیں؟'' میسرہ نے کہا: ''جی ہاں! یہ تو ہر وقت آپ کی آنکھوں میں ہوتے ہیں۔'' وہ کہنے لگا: ''یہ نبی ہیں آخری نبی!'' میسرہ دیکھتا تھا کہ سخت دھوپ کے وقت دو فرشتے آپ کے سر پر سایہ کیے رہتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ جب آپ عین دوپہر کے وقت واپس مکہ پہنچے تو حضرت خدیجہ نے یہ منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ قصہ بھی منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک آدمی کے ساتھ کسی سودے میں تنازع ہو گیا۔ اس نے کہا: ''آپ لات و عزّٰی کی قسم کھائیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَا حَلَفْتُ بِهِمَا قَطُّ، وَإِنِّي لَأَمُرُّ فَأُعْرِضُ عَنْهُمَا»

''میں نے کبھی اُن کی قسم نہیں کھائی بلکہ میں تو اُن کے پاس سے گزرتے وقت منہ پھیر لیتا ہوں۔''

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 245,244/1. ابنِ اسحاق نے اس روایت کو بلا سند بیان کیا ہے۔

وہ آدمی میسرہ سے کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! یہ شخص نبی ہے۔ ہمارے علماء اس کے اوصاف اپنی کتابوں میں لکھے پاتے ہیں۔'' یہ بھی منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس تجارتی سفر میں دوسرے لوگوں سے دُگنا منافع ہوا۔ حضرت خدیجہ نے آپ ﷺ کو اپنے وعدے سے بھی دُگنا حصہ دیا، حالانکہ وعدہ عام تاجروں سے دُگنے منافع کا تھا۔ گویا آپ کو عام تاجروں سے چار گُنا زیادہ حصہ دیا گیا۔

سیدہ خدیجہ نے اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل سے نسطورا راہب کا انکشاف بیان کیا جو میسرہ نے اُس سے سنا تھا کہ ''اس درخت کے نیچے نبی کے علاوہ کبھی کوئی شخص نہیں ٹھہرا۔'' مزید برآں اُن سے فرشتوں کے سایہ کرنے کا بھی ذکر کیا تو ورقہ بن نوفل کہنے لگے: ''خدیجہ! اگر یہ باتیں سچی ہیں تو محمد (ﷺ) اس امت کے نبی ہوں گے۔ مجھے بھی علم ہے کہ اس امت میں نبی آنے والا ہے جس کا انتظار ہو رہا ہے۔ اب اس نبی کا زمانہ آچکا ہے۔'' [1]

میسرہ سے یہ باتیں سن کر اور ورقہ بن نوفل کی تصدیق و تائید سے حضرت خدیجہ کے دل میں آپ ﷺ کے حسنِ اخلاق اور عظمت و جلالت کا یقین جم گیا۔ انھوں نے آپ سے شادی کا قطعی فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے اپنی سہیلی نفیسہ بنت مُنْيَہ کو اس پیش کش کا پیام دے کر آپ ﷺ کے ہاں بھیجا۔ رسول اللہ ﷺ بھی راضی ہو گئے۔ اس طرح یہ مبارک شادی انجام پائی۔ [2]

[1] امام ہیثمی نے کہا: ''امام طبرانی نے اس قصے کو اپنی کتاب الأوسط میں روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 256/8) [2] اسے محاملی نے نفیسہ بنت مُنْيَہ کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ ذہبی نے نفیسہ کے حوالے سے روایت کیے گئے اس سارے قصے کا انکار کیا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے تجارت کی غرض سے شام کی طرف روانہ ہونے کا ذکر ہے اور یہ بھی کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نفیسہ کو بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کی طرف سے شادی کا پیغام دے۔ ذہبی کے نزدیک یہ ساری روایت ضعیف ہے، دیکھیے: (تاریخ الإسلام (السیرۃ) للذہبي: 64/1)

مسند بزار اور طبرانی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت خدیجہ کی ایک بہن نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک دوسرے آدمی کو اجرت پر رکھا تھا۔ جب یہ دونوں سفر سے واپس آئے اور حساب کتاب کیا گیا تو خدیجہ کی بہن کے ذمے ان کا کچھ مال نکلتا تھا۔ دوسرا تاجر تو اکثر ان کے گھر جاتا اور ان سے اپنی رقم کا مطالبہ کرتا تھا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسی طرح تقاضا کرنے کو کہتا تو آپ یہ عذر پیش کرتے کہ مجھے شرم آتی ہے۔ خدیجہ کی بہن نے یہ بات خدیجہ کو بتائی تو اُن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عالی ظرفی بہت بھائی۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگیں: ''آپ میرے والدِ محترم سے ملیں اور مجھ سے نکاح کی بات کریں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آپ کے والد بہت مالدار ہیں۔ وہ اس بات پر کبھی راضی نہ ہوں گے۔'' وہ کہنے لگیں: ''آپ اُن سے ملیں اور بات کریں۔ باقی معاملہ میں سنبھال لوں گی۔ لیکن آپ اُن کے پاس اُس وقت جائیں جب وہ نشے کی حالت میں ہوں۔'' [1]

حضرت خدیجہ کا پہلا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوا تھا اور ایک بچی بھی پیدا ہوئی تھی۔ دوسرا نکاح ابوہالہ بن نباش تمیمی سے ہوا جس سے ایک بیٹا ہند اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ ابوہالہ دورِ جاہلیت ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ [2]

مؤرخ ابن سعد نے ذکر کیا ہے کہ اُن کا پہلا نکاح ابوہالہ سے ہوا تھا اور ابوہالہ کا نام ہند بن نباش بن زرارہ تھا۔ اُس سے ہند نامی ایک لڑکا پیدا ہوا، پھر عتیق بن عائذ بن عبداللہ مخزومی سے دوسرا نکاح ہوا جس سے ہند نامی ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ جس کا نکاح بعد میں صیفی بن امیہ بن عائذ بن عبداللہ سے ہوا۔ [3]

[1] كشف الأستار للبزار: 237/3، ومجمع الزوائد: 222/9. روایت کی سند کم از کم حسن درجے کی ہے۔ [2] فتح الباري: 287/14، وتاريخ دمشق الكبير، القسم الأول: 140و142 و148 و149. یہ ابنِ اسحاق کی روایت ہے، دیکھیے: (السير والمغازي، ص: 245، والطبقات الكبرى: 15/8، والإكمال: 1/6) [3] الطبقات الكبرى: 15,14/8.

مصنف کتاب کہتا ہے: ''محمد بن صفی کے حالات الإصابة اور الاستیعاب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کا سب سے پہلا نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہی سے ہوا۔ جب تک وہ زندہ رہیں آپ ﷺ نے کسی اور عورت سے نکاح نہیں کیا۔ [1] جمہور مؤرخین کے قول کے مطابق اس نکاح کے وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک پچیس سال تھی۔ [2]

علماء کا اس بات میں اختلاف ہے کہ حضرت خدیجہ کی طرف سے ولی کون تھا؟ امام بیہقی نے لکھا ہے کہ اُن کے والد خویلد ہی نے اُن کا نکاح کرایا تھا اور وہ اُس وقت نشے کی حالت میں تھے۔ روایت کے آخر میں راوی عمر بن ابی بکر مُوملی نے کہا ہے: ''حضرت خدیجہ کے چچا عمرو بن اسد نے ولایت کا فریضہ انجام دیا۔'' [3] لیکن علامہ ہیثمی نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ اس کا راوی عمر بن ابی بکر مولمی متروک ہے۔ [4] مؤرخ ابن اسحاق نے بھی تائید کی ہے کہ اُن کے نکاح کے ولی اُن کے والد خویلد ہی تھے۔ [5] سُہیلی، ابن کثیر، اور شامی نے کہا ہے کہ ''مؤرخ ابن اسحاق نے سیرت میں ذکر کیا ہے کہ ولایت کا فریضہ حضرت خدیجہ کے بھائی عمرو بن خویلد نے انجام دیا تھا۔'' [6] لیکن ہم نے

---

[1] صحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل خديجة أم المؤمنين رضي الله عنها، حديث:2436.

[2] فتح الباري:14/286-295. [3] دلائل النبوة للبيهقي:2/71,72. اس روایت کی سند نہایت ضعیف ہے۔ ابنِ اسحاق نے بھی یہ روایت بیان کی ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 246/1) اس کی تائید دیگر شواہد سے ہوتی ہے۔ [4] مجمع الزوائد: 9/220,221. امام بیہقی نے مولمی کی سند سے روایت کیا ہے کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے والد ہی نے، جبکہ وہ نشے میں تھے، اُن کا نکاح کرایا تھا۔ کتاب کے محقق کا کہنا ہے کہ امام احمد نے یہ روایت بسند ضعیف تفصیل سے بیان کی ہے، دیکھیے: (مسند أحمد: 312/1) ہیثمی نے یہ روایت احمد اور طبرانی کے حوالے سے نقل کرنے کے بعد لکھا: ''احمد کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 220/9) [5] السيرة النبوية لابن هشام: 246/1.

[6] الروض الأنف:214/1، والبداية والنهاية:320/2، وسبل الهدٰى والرّشاد:225/2.

یہ بات ابن اسحاق کی مطبوعہ ''سیرتِ نبوی'' میں نہیں پائی۔ واقدی نے ذکر کیا ہے کہ اُن کے چچا عمرو بن اسد نکاح میں اُن کے ولی تھے جس نے کسی اور ولی کا ذکر کیا ہے اُس نے غلطی کی ہے کیونکہ ان کے والد خویلد جنگِ فجار سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔[1] اس بات کو سُہیلی، ابن سید الناس، ابن عبدالبر اور شامی نے بھی تسلیم کیا ہے۔[2]

اگر اُن کے والد کی وفات جنگِ فِجار سے قبل ثابت ہو جاتی ہے تو لازمی بات ہے کہ اُن کے چچا ہی نکاح کے وقت ولی تھے لیکن اُن کے والد کی ولایت نکاح کی روایات زیادہ قوی ہیں کیونکہ یہ روایات متعدد سندوں سے آنے کی بنا پر تقویت پا کر حسن لغیرہ کے درجے تک پہنچ جاتی ہیں اور اس تأثر کی تائید کرتی ہیں کہ ان کی کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ واللّٰہ أعلم.[3]

رسول اللہ ﷺ سے نکاح کے سلسلے میں بات چیت کرنے کے لیے حضرت حمزہ، حضرت خدیجہ کے گھر گئے تھے۔ نبیٔ اکرم ﷺ کے دل میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لیے بڑی عزت تھی۔ صحیحین وغیرہ میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مناقب میں کئی احادیث مروی ہیں[4] اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا میں بہت سے خصائل حمیدہ پائے جاتے تھے جن میں سے کچھ خصائل کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ مزید برآں وہ

[1] الطبقات الكبرٰى:133,132/1، وتاريخ الطبري:282/2. [2] الرّوض الأنف:213/1، وعيون الأثر:50/1، والاستيعاب لابن عبدالبر:280/4، وسبل الهدٰى والرشاد:224/2. یہاں شامی لکھتے ہیں: ''یہ جو بات گزری کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے اُن کے چچا نے کرایا تھا۔ اکثر اہلِ سیَر نے یہی لکھا ہے۔ سہیلی کا کہنا ہے کہ یہی صحیح ہے۔'' [3] محمد بن رزق بن طرہونی نے اس واقعے کو حسن قرار دیا ہے کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نکاح اُن کے والد نے، جبکہ وہ نشے میں تھے، کرایا تھا، دیکھیے: (صحيح السيرة النبوية للطرهوني:216,215/1) [4] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب تزويج النبي ﷺ خديجة وفضلها رضي الله عنها، حديث:3815-3820، وصحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل خديجة أم المؤمنين رضي الله عنها، حديث:2430-2437.

اپنی قوم میں ''عفیفہ و طاہرہ'' کے لقب سے معروف تھیں۔[1] پھر آپ ﷺ کی تمام اولاد، سوائے ابراہیم کے، انھی سے ہوئی۔[2] حضرت ابراہیم، حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔[3]

حضرت خدیجہ سے پیدا ہونے والے بچوں کی ترتیب یہ ہے: سب سے پہلے قاسم پیدا ہوئے۔ انھی کی نسبت سے رسول اللہ ﷺ کی کنیت ابوالقاسم تھی۔ یہ بچپنے ہی میں فوت ہوگئے۔ نبوت سے پہلے فوت ہوئے یا بعد میں؟ اس میں اختلاف ہے، پھر چار بیٹیاں ہوئیں: زینب، رقیہ، ام کلثوم، اور فاطمہ رضی اللہ عنہن۔ کہا جاتا ہے کہ ام کلثوم فاطمہ سے چھوٹی تھیں، پھر آپ کے بیٹے عبداللہ پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش بعثت کے بعد ہوئی۔ انھی کو طیب اور طاہر کہا جاتا تھا۔[4] بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ دونوں عبداللہ کے بھائی تھے۔[5] اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت خدیجہ سے ہونے والے سب بیٹے بچپن ہی میں فوت ہوگئے،[6] بیٹیاں نہ صرف مسلمان ہوئیں بلکہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت بھی کی۔[7]

---

[1] تاریخ دمشق الکبیر: 109-159. [2] فتح الباري: 291/14، وتاریخ الإسلام (السیرة) للذھبي، ص: 66,65، والسیرة النبویة لابن ھشام: 246/1. ابنِ اسحاق نے بلاسند بیان کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی نرینہ اولاد قاسم، طیب اور طاہر تھے۔ [3] فتح الباري: 291/14، والسیرة النبویة لابن ھشام: 247/1. ابنِ اسحاق نے یہ روایت بلاسند بیان کی ہے۔ ابن سعد نے یہ روایت مختلف سندوں سے نقل کی ہے جن میں سے بعض سندوں میں واقدی ہے۔ عام طور پر یہ روایت مشہور ہے اور اس میں کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں ہے، دیکھیے: (الطبقات الکبریٰ: 135,134/1) [4] تاریخ دمشق الکبیر: 108و117. [5] تاریخ دمشق الکبیر: 108/1و118,117. [6] فتح الباري: 291/14، والبدایة والنھایة: 319,318/2، ودلائل النبوة للبیھقي: 70/2. راوی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں۔ اس کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن عثمان ہے جو متروک ہے۔ اس بنا پر یہ سند نہایت ضعیف ہے۔ ابن اسحاق نے یہ روایت بلاسند بیان کی ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن ھشام: 248,247/1) [7] البدایة والنھایة: 319/2، ودلائل النبوّة للبیھقي: 69/2.

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا پینسٹھ سال کی عمر میں انتقال فرما گئیں۔ [1] یہ بھی متفقہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کے وقت اُن کی عمر چالیس سال تھی۔ [2]

احکام و مواعظ

* دو فرشتوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سایہ رکھنا اور راہب کا آپ کی نبوت کی شہادت دینا یقیناً آپ کی نبوت کی محکم دلیل ہے۔
* خود حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح کی پیشکش سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اخلاق عالیہ کے باعث بہت ممتاز تھے۔
* حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت کے بارے میں وارد روایتوں سے اللہ تعالیٰ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ معززین کے نزدیک حضرت خدیجہ کی بزرگی، عظمت اور علومرتبت روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی۔
* یہ کوئی معیوب بات نہیں کہ ایک نیک خاتون کسی نیک شخص سے نکاح کی خواہش کا اظہار کرے جیسا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن کردار کے باعث خود نکاح کی پیش کش کی۔
* اس شادی سے جو پہلا سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جسمانی لذت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، ورنہ آپ بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح اپنے سے کم عمر یا کم ازکم اپنے برابر عمر کی لڑکی سے یا کنواری لڑکی سے نکاح کرتے۔ لیکن آپ نے جسم وجنس کے مطالبوں کو ہرگز قابل توجہ نہیں سمجھا۔ اس کے برعکس آپ نے سیدہ خدیجہ کی پاکبازی، حُسنِ عمل، شرافت اور عظمت کو ملحوظ رکھا کہ وہ ''عفیفہ طاہرہ'' کے لقب

---

[1] الطبقات الکبریٰ: 8/6-18. یہ روایت واقدی کی سند سے ہے اور واقدی متروک ہے۔ [2] الطبقات الکبریٰ: 8/17. یہ واقدی کی سند ہے اور واقدی متروک ہے۔

سے مشہور تھیں، پھر یہ شادی اُن کی وفات تک قائم رہی جبکہ آپ ﷺ اُس وقت پچاس سال کے ہو چکے تھے۔ عہد شباب کا یہی وہ دور ہے جس میں مردوں کو عورتوں سے خصوصی رغبت ہوتی ہے کیونکہ اس دور میں منہ زور شہوانی جذبات میں ہلچل ہوتی ہے لیکن رسول اللہ ﷺ نے کبھی اس کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ اگر آپ کی خواہش ہوتی تو آپ کو بہت سی میلان رکھنے والی آزاد عورتیں اور لونڈیاں نہایت آسانی سے مل سکتی تھیں۔

* عفیفہ و طاہرہ کا صادقِ امین کے ساتھ نکاح اور اس مبارک امتزاج سے نیک اولاد حاصل ہونا اللہ تعالیٰ کا نبی اکرم ﷺ پر بہت بڑا احسان تھا تاکہ معاشرے میں آپ ﷺ کا ایک قابل لحاظ مقام ہو جس میں کسی کی طرف سے آپ پر انگلی اٹھانے کی گنجائش نہ ہو۔

تعمیر کعبہ میں شرکت اور حجرِ اسود کی تنصیب

امام بیہقی رحمہ اللہ کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ زمین میں میرے لیے ایک گھر بناؤ۔ انھیں کچھ پریشانی محسوس ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر ''سکینت'' نازل کی جو تیز ہوا کی شکل میں تھی اور اس کا ایک سر تھا۔ وہ ہوا بیت اللہ کی جگہ آئی اور وہاں سانپ کے مانند کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔

پس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر شروع کر دی۔ وہ ہر روز ایک رَدّا بناتے تھے۔ جب تعمیراتی کام حجر اسود والی جگہ تک پہنچ گیا تو انھوں نے اپنے بیٹے سے فرمایا: ''کوئی پتھر ڈھونڈ کر لاؤ۔'' جب اسماعیل پتھر تلاش کر کے لائے تو دیکھا کہ وہاں پہلے ہی ایک پتھر نصب ہے۔ انھوں نے پوچھا: ''یہ پتھر کون لایا؟'' حضرت ابراہیم نے فرمایا: ''اسے وہ لایا جسے تمھاری تعمیر (کی تکمیل) پر اعتماد نہیں تھا۔'' دراصل وہ پتھر جبریل علیہ السلام

لائے تھے۔ اس طرح بیت اللہ کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ [1]

بیہقی ہی کی روایت میں ہے کہ جب بیت اللہ کی عمارت منہدم ہوگئی تو عمالقہ نے اسے تعمیر کیا۔ دوبارہ عمارت منہدم ہوئی تو بنو جرہم نے تعمیر کیا، پھر جب تیسری دفعہ عمارت مسمار ہوئی تو قریش نے اُسے بنانے کی ٹھانی۔ اُس وقت رسول اللہ ﷺ بھرپور جوان تھے۔ جب قریش نے باقی ماندہ عمارت کو گرانا چاہا تو دیوار پر ایک سانپ آبیٹھا اور پھنکارنے لگا۔ وہ سب ڈر گئے اور پیچھے ہٹ گئے، پھر قریش کے سب لوگ بیت اللہ کے پاس اکٹھے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے گریہ وزاری شروع کی کہ ”یا اللہ! اس بلا کو دور فرما۔“ اللہ تعالیٰ نے ایک پرندہ بھیجا، اس نے سانپ کی گردن میں پنجے گاڑ دیے، پھر اُسے گھسیٹتا ہوا لے اڑا اور اُسے اجیاد کی طرف جا پھینکا۔ اس طرح قریش نے تعمیر نو کے لیے بیت اللہ کی باقی ماندہ عمارت گرا دی اور نئی تعمیر شروع ہوگئی۔ [2] جب حجر اسود کو اس کی جگہ نصب کرنے کا وقت آیا تو آپس میں جھگڑا ہوگیا۔ بالآخر اس بات پر اتفاق ہوا کہ اس گلی سے جو شخص سب سے پہلے آئے گا اُسے فیصل مان لیا جائے گا اور اسی کا فیصلہ سب کے لیے قابلِ قبول ہوگا۔ اس گلی سے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ آپ نے فیصلہ فرمایا کہ حجر اسود کو ایک چادر میں رکھ لیا جائے اور سب سردار مل کر اس چادر کو اٹھائیں۔ [3]

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 55/2، وتفسير الطبري: 3/69-71، والمستدرك للحاكم: 293,292/2. امام حاکم کا کہنا ہے کہ یہ روایت مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے لیکن بخاری و مسلم دونوں نے اسے نقل نہیں کیا۔ امام ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے۔ [2] یہ ایک روایت کا حصہ ہے جسے امام عبدالرزاق نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، دیکھیے: (المصنَّف لعبد الرزاق: 102/5، حديث: 9106) امام ذہبی نے اسی کے مانند ایک روایت نقل کی جس کی سند صحیح ہے، دیکھیے: (تاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 77/1) [3] دلائل النبوة للبيهقي: 2/51-56، والمستدرك للحاكم: 458/1. امام حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا اور ذہبی نے ان کے اس حکم کو برقرار رکھا ہے۔

امام احمد اوراہل سیر کی روایت ہے کہ جب قریش میں حجر اسود کو اس کی جگہ نصب کرنے کے لیے اختلاف ہوا تو وہ کہنے لگے: ''کسی ایک کو حکَم مان لو۔'' اتفاق رائے سے طے پایا کہ جوشخص سب سے پہلے اس راستے سے آئے گا وہی فیصل ہوگا۔ اس راستے سے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ ہی تشریف لائے۔ آپ ﷺ کو دیکھ کر سب بے ساختہ پکار اٹھے: ''امین آ گیا، امین آ گیا۔'' انھوں نے آپ سے درخواست کی تو آپ نے حجرِ اسود کو ایک کپڑے میں رکھا، پھر ہر قبیلے کے سردار کو بلایا، تمام سرداروں نے کپڑے کو کناروں سے مل کر اٹھایا۔ جب مطلوبہ جگہ تک پہنچے تو نبیٔ کریم ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اُسے اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ [1]

اگر اللہ تعالیٰ اپنے رسولِ کریم ﷺ کو یہ حکیمانہ حل نہ سجھاتے تو وہاں خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔ روایت ہے کہ حجر اسود نصب کرنے کا اختلاف اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ بنوعبدالدار نے خون سے بھرا ہوا ایک پیالہ درمیان میں رکھ کر بنوعدی سے معاہدہ کیا۔ انھوں نے اپنے ہاتھ خون میں ڈبو کر آپس میں عہد کیا کہ مر جائیں گے، پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ چار پانچ دن اسی کیفیت میں گزر گئے۔ اتفاق و صلح کی کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی حتی کہ رسول اللہ ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے اس فتنے کی آگ بجھ گئی۔ [2]

پھر جب انھوں نے کعبہ کی عمارت مکمل گرا لی تو اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ایک بڑا بحری جہاز جو رُوم سے آ رہا تھا جدہ کے قریب طوفان کی زد میں آ کر ٹوٹ پھوٹ گیا۔ قریش نے اس موقع کو غنیمت جانا اور جہاز کی لکڑی حاصل کرنے کے لیے بھاگے۔ وہاں انھیں

[1] مسند أحمد: 425/3. علامہ البانی نے اس روایت کی سند کو حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (حاشية فقه السيرة للغزالي، ص: 84)، والسيرة النبوية لابن هشام: 255,254/1. ابن اسحاق نے یہ روایت سند کے بغیر بیان کی ہے۔ احمد، حاکم اور ذہبی کی روایات اس کی تائید کرتی ہیں۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 254/1. ابن اسحاق نے یہ روایت بلا سند بیان کی ہے۔

ایک رومی بڑھئی ملا۔ انھوں نے اُس کی اجازت سے لکڑی اٹھائی اور رومی بڑھئی سمیت مکہ مکرمہ آ گئے تا کہ اس لکڑی سے بیت اللہ کی چھت بنائی جا سکے۔ اس رومی بڑھئی نے اپنی مہارت بروئے کار لا کر اُس لکڑی سے بیت اللہ کی چھت تیار کر دی۔ [1]

امام عبدالرزاق اور مؤرخ ابن اسحاق نے پورے وثوق سے لکھا ہے کہ اُس وقت نبیِ اکرم ﷺ کی عمر مبارک پینتیس سال تھی [2] اور یہی درست ہے۔ [3]

فقہی نتائج

* قریش کا رسول اللہ ﷺ کو حجرِ اسود کی تنصیب جیسے اہم معاملے میں حَکَم تسلیم کرنا اور آپ کو علی الاعلان ''الامین'' کہنا اس امر کی بین دلیل ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نبیٔ کریم ﷺ کی بہترین تربیت فرمائی تھی اور آپ صدق و امانت اور دوسرے اخلاقِ عالیہ میں انتہائی بلند رُتبے پر فائز تھے۔
* اس پیچیدہ مسئلے کا یہ بہترین حل اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق سے تھا تا کہ لوگ یہ سمجھ سکیں کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو عظیم امور کے لیے منتخب فرمائے گا جیسا کہ بعد میں آپ کو لوگوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے اور اسلام کا عظیم الشان پیغام پہنچانے کا فرض سونپا گیا۔
* اس دور میں اہل مکہ کو درپیش عظیم مسائل کے حل میں آپ ﷺ کی شرکت بہت دور رس نتائج کی حامل تھی۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ آپ کو ہر چیز کا تجربہ ہو جائے اور

---

[1] یہ ایک روایت کا ٹکڑا ہے جسے عبدالرزاق نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ یہ روایت بالکل صحیح ہے، دیکھیے: (المصنَّف لعبد الرزاق: 102/5، حديث: 9106) [2] المصنَّف لعبد الرزاق: 102/5. اس روایت کی سند صحیح ہے۔ والسيرة النبوية لابن هشام: 249/1. روایت بلا سند ہونے کی بنا پر ضعیف ہے۔ [3] البداية والنهاية: 324/2، وتاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 77/1. یہ روایت عبدالرزاق کی ہے جسے حاکم نے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، دیکھیے: (المصنَّف لعبد الرزاق: 103,102/5، حديث: 9106)

آپ کی کوشش ہر جہت میں کارگر ہو۔ اس ہمہ جہت کارکردگی کے نتیجے میں آپ ایسے جامع الصفات اور جامع الجہات فردِ مزید کی حیثیت سے جلوہ گر ہوں جو ہر مشکل مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، ساتھ ہی ساتھ ادائے حقوق میں بے نظیر ہو اور عدل و انصاف کے تقاضے بہ تمام و کمال پورے کر دکھائے۔ تعمیر کعبہ میں آپ کی شرکت اور حجرِ اسود کی تنصیب کے پیچیدہ مسئلے کا خوبصورت حل آپ ﷺ کی اجتماعی دلچسپی کی دو نمایاں مثالیں ہیں۔ آپ نے اس قسم کے اور بھی کئی معاشرتی اجتماعی مسائل حل کرنے میں شاندار کردار ادا کیا۔ نتیجتاً آپ ﷺ کو آئندہ زندگی کے پیش آمدہ حالات و حوادثات سے بخوبی نمٹنے کی صلاحیت حاصل ہوگئی۔ [1]

ارہاصات واشاراتِ نبوت

اہل کتاب اور عرب کاہنوں کے ہاں ارہاصات واشاراتِ نبوت

ابن اسحاق نے باقاعدہ ایک باب باندھا ہے جس میں اُس دور کے عرب کاہنوں، یہودی علماء اور عیسائی راہبوں کے بہت سے ایسے اقوال نقل کیے گئے ہیں جن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ ''نبی منتظر ﷺ'' کی بعثت کا وقت قریب آچکا ہے۔ [2]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند کے ساتھ روایت منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری (بعثت) سے قبل جنوں پر شہاب ثاقب پھینکے جانے لگے تھے تاکہ کہانت کا قلع قمع کر دیا جائے کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں کہانت کا دارو مدار جنوں کی اطلاعات ہی پر تھا۔ [3]

[1] دراسة في السيرة للدكتور عماد الدين خليل، ص: 48,49. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 262/1. [3] صحيح مسلم، السلام، باب تحريم الكهانة وإتيان الكهان، حديث: 2229.

ایک مشہور کاہن سواد بن قارب ازدی سدوسی جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا، اس نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو خود بتایا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کچھ دیر قبل شیاطین نے کاہنوں کو خبریں بتانی بند کر دی تھیں اور وہ انتہائی ذلیل اور عاجز ہو گئے تھے۔[1] اس کاہن کے اسلام لانے کا سبب وہ اشارات ہی تھے جو اُس نے کہانت اور جنوں کے ذریعے معلوم کیے تھے اور اُس نے خود اس کی تفصیل بیان کی تھی۔ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا اعتراف اس طرح منقول ہے: ''اللہ کی قسم! میں قریش کے چند ساتھیوں سمیت دورِ جاہلیت کے ایک بہت بڑے بت کے پاس موجود تھا۔ ایک شخص نے اُس بت کے نام پر ایک بچھڑا ذبح کیا۔ ہم اُس کے گوشت کی تقسیم کے منتظر تھے تا کہ ہمیں بھی اپنا حصہ ملے۔ اچانک میں نے اُس بچھڑے کے پیٹ سے زبردست آواز سنی، اس سے بلند کوئی آواز میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔ اُس آواز کے الفاظ یہ تھے: ''او بے شرم شخص! نجات والی چیز آ چکی ہے۔'' ایک شخص بآواز بلند کہہ رہا ہے: ''اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں۔'' یہ ظہور اسلام سے صرف ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔[2]

ابن اسحاق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہود کی پیش گوئیوں کے بارے میں روایت نقل کی ہے کہ بنو عبدالاشہل کے پڑوسیوں میں سے ایک یہودی نے انھیں بعث بعد الموت اور جزا و سزا کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں۔ انھوں نے اس کا انکار کیا اور اُس سے کوئی

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 268/1. ابن ہشام نے یہ مکمل روایت منقطع سند کے ساتھ نقل کی ہے۔ کاہن کا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکالمہ بخاری نے بھی روایت کیا ہے، دیکھیے: (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب إسلام عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، حديث: 3866) البتہ بخاری نے صراحت سے نہیں بتایا کہ یہ کاہن سواد ہی تھا لیکن ابن حجر نے کئی ایک روایات نقل کر کے جو ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ہیں، واضح کیا ہے کہ یہ کاہن سواد ہی تھا، دیکھیے: (فتح الباري: 22/15)

[2] فتح الباري: 25/15، ودلائل النبوّة للبيهقي: 2/249-251. یہ روایت دیگر اسانید اور الفاظ کے ساتھ بھی منقول ہے، دیکھیے: (الموسوعة الحديثية (مسند أحمد): 204/24)

نشانی بتانے کو کہا۔ اس پر وہ یہودی مکہ اور یمن کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا: ''اس علاقے کی طرف سے ایک نبی آنے والا ہے۔'' [1] ابن اسحاق نے نقل کیا ہے کہ ثعلبہ بن سعیہ، اُسید بن سعیہ اور اسد بن عبید، بنوقریظہ کے قریبی بنو ہدل کے یہودیوں میں سے تھے۔ اُن کے اسلام لانے کا سبب ایک یہودی ابن الهَیِّبان کی باتیں بن گئیں۔ یہ شخص بعثت سے کئی سال پہلے شام سے مدینہ آیا تھا۔ اس نے بتایا: ''میرے مدینہ آنے کا سبب یہ ہے کہ مجھے توقع تھی کہ آخری نبی آچکے ہیں۔ میں اُن کا پیروکار بننا چاہتا تھا۔ اس نے یہودیوں کو تاکید کی کہ اس نبی کی پیروی کرنا۔ اس کام میں کوئی شخص تم سے سبقت نہ لے جائے۔'' اس نے انھیں آپ ﷺ کی بعض نشانیاں بھی بتا دی تھیں۔ بنوقریظہ کے محاصرے کے دوران میں ان حضرات نے وہ نشانیاں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو وہ مسلمان ہو گئے۔ [2]

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا قصہ مشہور ہے۔ وہ دین حق کی تلاش میں تھے۔ اپنے علاقے سے نکلے اور مدینہ منورہ پہنچے۔ اس دوران میں انھیں غلامی کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ [3]

حضرت ورقہ بن نوفل اور زید بن عمرو بن نفیل بھی دین حق کی تلاش میں مکہ سے نکلے۔

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 270/1. اس روایت کی سند حسن ہے۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 172/1. یہ روایت متابعت (کسی اور راوی کی تائید) کی بنا پر قوی اور دلیل بنائے جانے کے قابل ہے۔ بخاری و مسلم نے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بنوقریظہ کے بعض افراد رسول اللہ ﷺ سے آن ملے اور وہ مسلمان ہو گئے، دیکھیے: (صحيح البخاري، المغازي، باب حديث بني النضير......، حديث: 4028، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب إجلاء اليهود من الحجاز، حديث: 1766)

[3] السيرة النبوية لابن هشام: 273/1-282. ابن ہشام نے ابن اسحاق کی حسن سند سے یہ سارا قصہ درج کیا ہے۔ بخاری نے اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی کہ وہ خود کو مکاتبت کے ذریعے سے غلامی سے آزاد کرائیں، دیکھیے: (فتح الباري: 280/9)

موصل شہر کے ایک راہب سے ملے۔ راہب نے کہا: ''جو چیز تم تلاش کرتے پھرتے ہو وہ خود تمھارے ہی علاقے میں عنقریب ظاہر ہوگی۔'' [1]

اس قسم کے واقعات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت کے یہود و نصاریٰ کو پورا یقین تھا کہ ''نبی ﷺ'' کا ظہور ہونے والا ہے۔ یہودی علماء اور عیسائی راہبوں سے آپ ﷺ کی صفات سُن کر ہی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تھے۔

صحیح روایات میں ہے کہ ایک یہودی عالم زید بن سعنہ کہنے لگا: ''میں نبوت کی تمام نشانیاں حضرت محمد ﷺ کے چہرۂ مبارک میں دیکھ چکا ہوں۔ صرف دو باتیں باقی ہیں، اولاً: یہ کہ آپ ﷺ کا حلم (تحمل و بردباری) آپ ﷺ کے غصے پر غالب ہوگا۔ ثانیاً: یہ کہ آپ ﷺ سے جس قدر جہالت آمیز سلوک کیا جائے گا اتنا ہی آپ ﷺ کے حلم میں اضافہ ہوگا۔'' پھر وہ کچھ عرصہ آپ کے ساتھ رہا۔ یہ دونوں نشانیاں بھی ثابت ہوگئیں تو وہ مسلمان ہوگیا۔ [2]

ایسی روایات بھی آئی ہیں کہ حضرت عامر بن ربیعہ عدوی کے مسلمان ہونے کا سبب

[1] یہ تمام قصہ مستدرک حاکم میں موجود ہے، امام حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 439/3) محدث ابو داود طیالسی نے بھی اسے حسن لغیرہ سند کے ساتھ روایت کیا ہے، دیکھیے: (مسند أبي داود الطيالسي (ترتيب البناء): 161/2) زید کی شام کی طرف روانگی کے بارے میں تفصیلات کے لیے دیکھیے: (صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب حديث زيد بن عمرو بن نفيل، حديث: 3827) [2] محدث ذہبی نے یہ تمام قصہ روایت کیا ہے۔ سیرت ذہبی کے دونوں محققین نے اس کی تحقیق و تخریج میں کہا: ''اس روایت کو امام ابن حبان نے اپنی کتاب الصحیح (زوائد ابن حبان، ص: 516) میں درج کیا ہے۔'' دیکھیے: (تاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 91-93) محدث طبرانی اور حاکم نے بھی یہ روایت اپنی اپنی کتابوں میں درج کی ہے، دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 604/3) امام حاکم نے لکھا: ''اس حدیث کی سند صحیح ہے جسے بخاری و مسلم نے اپنی کتابوں میں درج نہیں کیا، حالانکہ یہ بہت نمایاں احادیث میں سے ایک ہے۔''

وہ باتیں ہیں جو زید بن عمرو بن نفیل کہا کرتے تھے کہ وہ ایک نبی کا انتظار کر رہا ہے جو حضرت اسماعیل کی اولاد اور عبدالمطلب کی نسل سے ہوگا۔ اس کا نام احمد ہوگا۔ لیکن امید نہیں کہ وہ اُسے پا سکیں۔ وہ لوگوں کو اس نبی (محمد ﷺ) کی نشانیاں بتایا کرتے تھے۔ یہ ساری نشانیاں انھوں نے اہل کتاب سے سنی تھیں۔ [1]

قُس بن ساعدہ ایادی کہا کرتے تھے: ''قس نے بالکل سچی قسم کھائی ہے جس میں رتی بھر جھوٹ نہیں۔ روئے ارض پر کوئی بھی دین مجھے اُس دین سے زیادہ پسند نہیں جس کا دور آنے ہی والا ہے۔ وہ تمھیں پا کے رہے گا۔ مبارک ہو اُس شخص کو جو اُس دین کو پائے اور اس کی پیروی کرے اور بربادی ہے اس شخص کے لیے جو اُسے پائے لیکن قبول نہ کرے۔'' [2]

مفسرین اور اہل سیرت کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

''جب اُن کے پاس اللہ کی طرف سے ایک کتاب آگئی جو اُس (کتاب) کی تصدیق کرنے والی ہے جو اُن کے پاس ہے، حالانکہ وہ اس سے پہلے ان لوگوں کے خلاف فتح طلب کیا کرتے تھے جنھوں نے کفر کیا، پھر جب اُن کے

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب حديث زيد بن عمرو بن نُفيل، حديث: 3826، والطبقات الكبرٰى: 161/1. دلائل النبوة لأبي نعيم کے دونوں محققین نے ابن حجر کی سند کے متعلق لکھا: ''ظاہر ہے کہ اس روایت کی سند ابن حجر کے ہاں مقبول ہی ہے کیونکہ انھوں نے فتح الباری کے مقدمے (هدي الساري: 16/1، والخصائص الكبرٰى للسيوطي: 16/1) میں یہ شرط بیان کی ہے کہ وہ صرف ایسی حدیث بیان کریں گے جس میں صحیح یا حسن کی شروط موجود ہوں۔'' دیکھیے: (دلائل النبوة لأبي نعيم: 100/1) [2] قس بن ساعدہ ایادی کی روایت کے لیے دیکھیے: (دلائل النبوة لأبي نعيم: 105,104/1) کتاب کے محققین نے اس روایت کی جو تحقیق پیش کی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت حسن درجے کی ہے۔

پاس وہ چیز آ گئی جسے انھوں نے پہچان لیا تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔ پس کافروں پر اللہ کی لعنت ہے۔''[1]

اُن یہودیوں کے بارے میں نازل ہوا جو اوس و خزرج سے برسر پیکار رہتے تھے اور جب اوس اور خزرج اُن کی مرمت کرتے تو وہ کہتے: ''نبی آخر الزمان کا وقت قریب آ چکا ہے، ہم اس کے ساتھ مل کر تمھیں اس طرح نیست و نابود کریں گے جس طرح عاد و ارم کو نابود کر دیا گیا تھا۔'' لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جب آپ ﷺ تشریف لے آئے تو اوس و خزرج تو آپ ﷺ کے پیروکار بن گئے اور یہودیوں نے انکار کی راہ اختیار کی۔[2]

ابوسفیان کے ساتھ ہرقل کا واقعہ بھی اس کی واضح دلیل ہے، خصوصاً ہرقل کی یہ بات: ''ابوسفیان! جو باتیں تم نے بتائی ہیں اگر وہ سچ ہیں تو وہ شخص (نبیٔ کریم ﷺ) میرے اس پایۂ تخت پر حکمرانی کرے گا۔''[3]

اس مفہوم کی واضح احادیث موجود ہیں کہ بحیثیت نبی حضرت محمد ﷺ کو انسان کی پیدائش سے پہلے ہی نبی لکھ دیا گیا تھا۔ امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوحِ وَالْجَسَدِ»

''(میں اس وقت بھی نبی تھا) جب حضرت آدم علیہ السلام ابھی جسم و روح کے درمیان تھے۔''[4]

[1] البقرة 2:89. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 1/70. ابنِ اسحاق کی اس سند میں ایک مجہول راوی ہے، تاہم یہ سند متابعت کی بنا پر قوی ہے۔ اور دیکھیے: (تفسير الطبري (تحقيق أحمد شاكر): 2/333).
[3] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب دعاء النبي ﷺ إلى الإسلام والنبوة ......، حديث: 2941 و4553، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب: كتب النبي ﷺ إلى هرقل ملك الشام يدعوه إلى الإسلام، حديث: 1773. [4] مسند أحمد: 4/66، 5/379، وجامع الترمذي، المناقب، باب ماجاء في فضل النبي ﷺ، حديث: 3609.

مسند احمد میں حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”(میں نبی تھا) جبکہ آدم اپنے گارے میں (جس سے ان کی تخلیق ہوئی) پڑے تھے۔“ [1]

ایک وضاحت

* مختصر یہ کہ یہودی اور عیسائی علماء رسول اللہ ﷺ کو آپ کی بعثت سے پہلے ہی آپ کے اوصاف کے باعث جانتے تھے۔ تورات وانجیل میں آپ کے اوصاف اور آپ کے زمانۂ بعثت کا واضح ذکر موجود تھا۔ قرآن مجید نے بھی اس حقیقت کی طرف کئی آیات میں اشارہ کیا ہے۔ [2] اسی بنا پر کئی یہودی جن میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نمایاں ہیں اور کئی عیسائی جن میں حضرت نجاشی، شاہ حبشہ بہت نمایاں ہیں، مسلمان ہوگئے۔ اور جو مسلمان نہیں ہوئے ان کے پیش نظر صرف اپنے سیاسی و مالی مفادات تھے۔ اسی باعث وہ اسلام قبول کرنے سے رُکے رہے جیسا کہ حُيَيّ بن اخطب، ہرقل شاہِ روم اور مقوقس شاہِ مصر کے واقعات سے صاف ظاہر ہے۔
* رسول اللہ ﷺ کے سفر شام کے ضمن میں ہم نے جو احکام و مواعیظ بیان کیے ان سے یہاں بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

غارِ حرا میں اعتکاف و عبادت

رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے سب سے الگ تھلگ غارِ حرا میں عبادت کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں تنہائی اور خلوت گزینی کا ذوق

[1] مسند أحمد: 128/4. [2] ارشاد ربانی ہے: ”وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی، اس (نبی) کو یوں پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بلاشبہ ان کا ایک فریق حق کو یقیناً چھپاتا ہے، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔“ (البقرة 146:2)

بیدار کر دیا تھا۔ آپ مسلسل کئی کئی دن اور راتیں اس غار میں قیام کرتے رہے یہاں تک کہ اسی غار میں آپ پر وحی اُترنی شروع ہوئی۔ [1] اُس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک چالیس سال تھی۔ [2]

آپ ہر سال ایک ماہ غارِ حرا میں بسر کیا کرتے تھے۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق قریش دورِ جاہلیت میں اس عبادت کے قائل اور اس پر عامل تھے۔ [3] اس دوران جو مسکین آپ کے پاس آتا آپ ﷺ اُسے کھانا کھلاتے تھے۔ جب آپ اپنا اعتکاف پورا کر لیتے تو سب سے پہلا کام یہ کرتے کہ بیت اللہ کا طواف کرتے۔ [4] علماء کا اختلاف ہے کہ بعثت سے پہلے آپ کی عبادت کسی شریعت کے مطابق تھی یا نہیں؟ اگر کسی شریعت کے مطابق تھی تو وہ کون سی شریعت تھی؟ زیادہ صحیح اور قوی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے مطابق تھی۔ یہ بھی کہا گیا کہ نوح علیہ السلام کی شریعت کے مطابق تھی۔ یہ بھی کہا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق تھی۔ یہ بھی کہا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق تھی اور یہ بھی کہا گیا کہ آپ جس چیز کو شریعت سمجھتے تھے اُسی پر عمل کرتے تھے۔ مگر ان اقوال کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔ [5]

بعثت سے بالکل تھوڑا عرصہ پہلے ارہاصات واشارات نبوت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ”رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی۔ آپ جو بھی خواب دیکھتے وہ روزِ روشن کی طرح پیش آ جاتا، پھر آپ کو تنہائی بہت عزیز

[1] صحيح البخاري، التعبير، باب: أول مابدئ به رسول الله ﷺ من الوحي الرؤيا الصالحة، حديث: 6982. [2] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3902. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 298/1. ابن اسحاق کی اس روایت کی سند حسن ہے۔ [4] السيرة النبوية لابن هشام: 298/1. ابن اسحاق کی اس روایت کی سند حسن ہے۔
[5] البداية والنهاية: 7/3.

رہنے لگی۔ آپ غارِ حرا میں خلوت گزیں رہتے تھے۔ گھر واپس آنے سے پہلے کئی راتیں عبادت میں گزار دیتے تھے۔ آپ اپنی مدتِ قیام کے لیے کھانے پینے کا سامان لے جاتے، پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس واپس آ جاتے، مزید ایام کے لیے کھانے پینے کا سامان لیتے اور غارِ حرا چلے جاتے۔ ایک دن آپ غارِ حرا ہی میں تھے کہ اچانک آپ ﷺ کے پاس ''حق'' آ گیا۔ [1]

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي لَأَعْرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ، كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ أُبْعَثَ، إِنِّي لَأَعْرِفُهُ الْآنَ»

''میں مکہ میں ایک پتھر کو جانتا ہوں، وہ میری بعثت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا۔ میں اب بھی اُسے پہچانتا ہوں۔'' [2]

یہ بھی روایت ہے کہ دو فرشتے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ اُس وقت آپ مکہ مکرمہ کی ایک وادی میں تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: ''اسے ایک آدمی کے وزن سے تولو۔'' آپ کو تولا گیا تو حضرت محمد ﷺ اس سے بھاری رہے حتی کہ آپ کو آپ کی امت کے ایک ہزار افراد کے مقابلے میں تولا گیا تب بھی آپ اُن سب سے وزنی نکلے۔ اُس فرشتے نے کہا: ''اگر تم انھیں ساری امت کے مقابلے میں بھی تولو گے تب بھی یہی بھاری رہیں گے۔'' پھر ایک نے دوسرے سے کہا: ''اس کا پیٹ چیرو۔'' اس نے آپ کا پیٹ چیرا اور شیطان کا حصہ نکال پھینکا جو خون کے ایک لوتھڑے کی شکل میں تھا، پھر ایک

[1] صحيح البخاري، التعبير، باب أول ما بُدئ به رسول الله ﷺ من الوحي الرؤيا الصالحة، حديث: 6982، وصحيح مسلم، الإيمان، باب بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ، حديث: 160.

[2] صحيح مسلم، الفضائل، باب فضل نسب النبي ﷺ وتسليم الحجر عليه قبل النبوة، حديث: 2277، وصحيح سنن الترمذي (للألباني)، ص: 192/3، حديث: 2865.

فرشتے نے دوسرے سے کہا: ''ان کا پیٹ اچھی طرح دھو ڈالو جیسے برتن دھویا جاتا ہے۔'' اس نے خوب دھویا، پھر ''سکینت'' منگوائی اور آپ ﷺ کے دل میں بھر دی، پھر ایک فرشتے نے دوسرے سے کہا: ''اب پیٹ سی دو۔'' اس نے سی دیا، پھر دونوں نے آپ ﷺ کے کندھوں کے درمیان مہر لگا دی۔

بعدازاں وہ دونوں چلے گئے۔ اس دوران آپ ﷺ کو یوں محسوس ہوتا رہا کہ آپ ﷺ یہ سارا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ [1]

یہ بھی روایت ہے کہ آپ ﷺ حضرت خدیجہ سے رخصت ہوئے، پھر واپس آئے اور انھیں بتایا کہ میرا پیٹ چیرا گیا ہے۔ اسے بڑی صفائی سے دھویا گیا ہے، پھر سی کر حسبِ سابق بند کر دیا گیا ہے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا (فرطِ مسرت سے جگمگا کر) کہنے لگیں: ''واللہ! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ خوش ہو جائیے (کہ آپ کو نبوت ملنے والی ہے۔)'' [2]

نبیِ کریم ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''مجھے روشنی سی نظر آتی ہے اور میں ایک آواز بھی سنتا ہوں، کبھی کبھی مجھے خیال گزرتا ہے کہ کہیں مجھے جنون تو نہیں؟''

حضرت خدیجہ نے فرمایا: ''ابن عبداللہ! ہر گز نہیں، اللہ تعالیٰ آپ سے ایسا سلوک

[1] یہ ابن عساکر کی روایت ہے جسے ابن کثیر اور بزار نے روایت کیا ہے۔ بزار کی روایت ہیثمی نے نقل کی ہے، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 255/8) اس روایت کی سند تو ضعیف ہے لیکن زہری کی روایت جس کا ذکر ابھی آئے گا اس کی تائید کرتی ہے جس کی بنا پر یہ قوی ہو جاتی ہے۔ [2] اس روایت کو بیہقی نے اپنی کتاب میں دو سندوں دو سندوں سے نقل کیا ہے، دیکھیے: (دلائل النبوّة للبيهقي: 142/2 و 146,145) پہلی سند میں زہری نے سعید بن مسیب سے روایت کی ہے اور یہ سند مرسل ہے۔ دوسری سند میں ابن لہیعہ نے ابو اسود سے، انھوں نے عروہ سے روایت کی، یہ سند بھی مرسل ہے۔ یہ دونوں سندیں ضعیف ہیں لیکن ان دونوں سندوں کی بدولت ابن عساکر اور بزار کی روایات قوت حاصل کرتی ہیں، دیکھیے: (القصيمية، دراسة نقدية لنصوص السيرة النبوية لمحمد الصوياني، ص: 187-189)

نہیں کرے گا۔''

پھر وہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ انھیں پوری تفصیل بتائی تو وہ کہنے لگے: ''اگر یہ سچ ہے تو پھر یہ اسی فرشتے کی طرح ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترتا تھا۔ اگر میری زندگی میں انھیں نبی بنا دیا گیا تو میں ان کی پوری تائید کروں گا، بھرپور مدد کروں گا اور ان پر ایمان لاؤں گا۔''[1]

اہم نکات

* یہ علامات و معجزات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہر ہوئے دراصل اس امر کے غیبی اشارات تھے کہ آپ اپنے دور کے دوسرے حنیفیوں سے ممتاز ہیں اور اللہ تعالیٰ عنقریب آپ کو ایک رفیع الشان ذمہ داری سونپنے والا ہے۔
* ''سچا خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے'' یہ اس طرح ثابت ہوا کہ سارا دورِ وحی تیئیس سال پر محیط تھا۔ اُس میں سے چھ ماہ تک آپ کو مسلسل سچے خواب آتے رہے۔ یہ عرصہ فی الواقع دورِ وحی کا چھیالیسواں حصہ ہے۔
* اور خلوت گزینی ہر مسلمان کے لیے سود مند ہے تاکہ وہ یکسوئی سے حالات کی رفتار کا جائزہ لے اور معاشرتی قباحتوں کے ازالے کا کوئی مثبت حل سوچ سکے، البتہ ہمیشہ کے لیے معاشرے سے الگ تھلگ ہو جانا جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں ایک فرقے نے یہ شیوہ اختیار کر رکھا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور عملی سنت کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہیں یہ منقول نہیں کہ آپ معاشرے سے کبھی کلی طور پر الگ تھلگ ہو گئے ہوں بلکہ اس قسم کے رجحانات ختم کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ مومن جو لوگوں کے ساتھ گھل مل کر رہتا ہے اور اُن کی طرف سے پہنچنے والی

[1] الفتح الرباني: 20/207. اس روایت کی سند حسن درجے کی ہے۔

تکالیف پر صبر کرتا ہے، اس شخص سے بہت زیادہ ثواب حاصل کرتا ہے جو ان کے ساتھ مل جل کر نہیں رہتا۔ اس طرح اسے لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی تکالیف پر صبر کا موقع نہیں ملتا۔''[1]

نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''مومن لوگوں سے الفت رکھتا ہے اور اس سے الفت کی جاتی ہے۔ جو شخص لوگوں سے الفت نہیں رکھتا اور نہ کوئی اس سے الفت رکھتا ہے، ایسے شخص میں کوئی بھلائی نہیں۔ لوگوں میں بہترین شخص وہ ہے جو لوگوں کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو۔''[2]

[1] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 94/7. سند صحیح ہے، اسے دوسرے محدثین نے بھی روایت کیا ہے۔ [2] الجامع الصغير: 184/2. سیوطی نے لکھا ہے کہ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔

باب

3

بعثت نبوی اور مشرکین کی مخالفت

- نزولِ وحی
- دعوتِ دین
- دعوتِ اسلام کی مخالفت
- مسلمانوں پر تشدّد

ABU UMAIMAH OWAIS

***

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ ﴾

''اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو ایک جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب ہی سب سے زیادہ کرم والا ہے۔ وہ جس نے قلم کے ساتھ سکھایا۔ اس نے انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

[العلق 96:1-5]

«يَا عَمِّ! وَاللّٰهِ! لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِي يَمِينِي وَالْقَمَرَ فِي يَسَارِي عَلٰى أَنْ أَتْرُكَ هٰذَا الْأَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللّٰهُ أَوْ أَهْلِكَ فِيهِ، مَا تَرَكْتُهُ»

''چچا جان! اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں اور مطالبہ کریں کہ میں دین کی تبلیغ روک دوں تب بھی میں اللہ رب العزت کے دین کی دعوت دینے سے باز نہیں آؤں گا حتی کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو غالب کر دے یا میں اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دوں۔''

[السيرة النبوية لابن هشام: 1/329، 330]

نزولِ وحی

پہلی دفعہ فرشتۂ وحی جبریل امین علیہ السلام پیر کے دن، رمضان المبارک کی 21 تاریخ کو رسول اللہ ﷺ کی پیدائش سے ساڑھے چالیس سال بعد آپ ﷺ کے پاس آئے۔ اُس وقت آپ غارِ حرا میں عبادت میں مشغول تھے۔ وہ آپ سے کہنے لگے: ''پڑھیے۔'' آپ نے کہا: ''میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔'' رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''اس فرشتے نے مجھے پکڑ کر زور سے دبایا جس سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی، پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور دوبارہ کہا: ''پڑھیے۔'' میں نے کہا: ''میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔'' اُس نے دوبارہ مجھے پکڑ کر زور سے دبایا حتی کہ مجھے شدید تھکاوٹ پہنچی، پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا: ''پڑھیے۔'' میں نے کہا: ''میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔'' اس نے مجھے تیسری دفعہ پکڑ کر زور سے دبایا حتی کہ مجھے شدید تھکاوٹ پہنچی، پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ ﴾

''اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو ایک جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب ہی سب سے زیادہ کرم والا ہے۔ وہ جس نے قلم کے ساتھ سکھایا۔ اس نے انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔''[1]

[1] العلق 96:1-5.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ''آپ یہ آیات پڑھتے ہوئے گھر کو چلے۔ آپ کے شانے لرز رہے تھے۔ حضرت خدیجہ کے پاس آئے اور فرمایا: ''مجھے لحاف اوڑھا دو۔'' انھوں نے آپ ﷺ کو لحاف اوڑھا دیا۔ جب آپ کا خوف دُور ہوا تو آپ نے فرمایا: ''خدیجہ! مجھے کیا ہوگیا ہے؟'' اور پھر انھیں پورا واقعہ سنایا، نیز فرمایا: ''مجھے تو اپنی جان جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔'' حضرت خدیجہ کہنے لگیں: ''ہرگز نہیں! اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ تو رشتے جوڑتے ہیں، ہمیشہ سچ بولتے ہیں، عاجز لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، فقیروں اور ناداروں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور ناگہانی آفات میں متاثرین کی مدد کرتے ہیں۔'' پھر وہ مزید اطمینانِ قلب کے لیے آپ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزّٰی کے پاس لے گئیں۔ یہ دورِ جاہلیت میں عیسائی ہو چکے تھے۔ عبرانی زبان جانتے تھے اور انجیل کو عبرانی زبان میں اچھی طرح لکھ سکتے تھے۔ بہت بوڑھے ہونے کی وجہ سے نابینا ہوگئے تھے۔ حضرت خدیجہ کہنے لگیں: ''اپنے بھتیجے سے سنیے یہ کیا کہتے ہیں۔'' انھوں نے پوچھا: ''بھائی! تمھیں کیا نظر آتا ہے؟'' رسول اللہ ﷺ نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ ورقہ پکار اٹھے: ''یہ تو وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ کے پاس آیا کرتا تھا۔ کاش! میں قوی ہوتا اور اُس وقت تک زندہ رہتا جب تمھیں تمھاری قوم نکال دے گی۔'' آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا یہ مجھے نکال دیں گے؟'' وہ کہنے لگے: ''ہاں! جو بھی تم جیسا پیغام لے کر آیا اُس سے دشمنی کی گئی، مخالفت کی گئی اور اُسے تکلیفیں سہنی پڑیں۔ اگر مجھے تمھارے اعلانِ نبوت کا دن دیکھنا نصیب ہوا تو میں تمھاری بھرپور مدد کروں گا اور ساتھ دوں گا۔'' پھر تھوڑے ہی عرصے بعد ورقہ بن نوفل وفات پا گئے۔''[1]

[1] صحيح البخاري، التعبير، باب: أول مابدئ به رسول الله ﷺ من الوحي الرؤيا الصالحة، حديث: 6983,6982، وصحيح مسلم، الإيمان، باب بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ، حديث: 160.

وہ روایت جو مؤرخ ابن اسحاق نے ابتدائے وحی کی کیفیت کے بارے میں بیان کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں: ''میں سویا ہوا تھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام ریشم کے ایک کپڑے میں لکھی ہوئی تحریر لائے اور مجھ سے کہا: ''اسے پڑھو......'' یہ بظاہر بخاری و مسلم کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے خلاف ہے جس میں یہ صراحت ہے کہ نزولِ وحی کی ابتدا بیداری کی حالت میں ہوئی۔ خوابوں کے واقعات نزول وحی سے پہلے کے ہیں۔ [1] اسی لیے سہیلی نے لکھا ہے: ''دونوں احادیث میں تطبیق یوں ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیداری سے پہلے ایک دفعہ خواب میں بھی حضرت جبریل آئے تھے تاکہ آپ کے لیے نزول وحی کو برداشت کرنا آسان ہو جائے کیونکہ نبوت کا معاملہ بہت عظیم اور اس کا بوجھ بہت بھاری ہے۔ انسان بہرصورت ضعیف و کمزور ہے۔ گویا یہ نزولِ وحی کی تمہید تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی!'' [2]

ابن کثیر بھی سہیلی سے متفق ہیں۔ انھوں نے مزید لکھا ہے: ''مغازی موسیٰ بن عقبہ میں زہری کی صریح روایت ہے کہ آپ نے یہ سب کچھ پہلے خواب میں دیکھا تھا، پھر جاگتے میں فرشتہ آپ کے پاس آیا۔'' [3] ابن کثیر ہی نے ایک دوسری جگہ لکھا: ''ممکن ہے نیند والا واقعہ اُس رات کی صبح کو بعد میں پیش آیا ہو جس رات آپ نے فرشتے کو بحالتِ بیداری دیکھا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے خواب خاصی مدت بعد آیا ہو۔ واللّٰہ أعلم'' [4]

وحی کے اثرات

* غار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اُس پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ردِعمل ان کی عقلِ سلیم، بالغ نظری اور حسن تدبر کی گواہی دیتا ہے۔ اس موقع پر انھوں نے

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 1/299-302. [2] الروض الأنف: 1/269. [3] البداية والنهاية: 3/504. ابن عقبہ کی روایت کو ابنِ کثیر نے نقل کیا ہے، دیکھیے: (البداية والنهاية: 3/14، 15) [4] البداية والنهاية: 3/14.

رسالت مآب ﷺ کی جس طرح دلجوئی کی وہ ان کی شخصی فضیلت اور ان کے سلیم الفطرت ہونے کی بڑی مستند پہچان ہے۔

* حضرت ورقہ بن نوفل نے اس صورتحال کا جس طرح تجزیہ کیا وہ ان کے علم و فضل کی روشن دلیل ہے۔

* رسول اللہ ﷺ کا حضرت جبریل علیہ السلام کو اپنی آنکھوں سے جاگتے میں دیکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ وحی انسان کا ذاتی اور داخلی معاملہ نہیں کہ اس کا تعلق وارداتِ قلبی سے ہو بلکہ یہ ایک خارجی حقیقت کو قبول کرنے کا نام ہے جس کا قلبی واردات سے کوئی تعلق نہیں۔ فرشتے کا آپ کو تین دفعہ دبانا، پھر چھوڑ کر ''اقرأ'' کہنا، اس خارجی حقیقت کو قبول کرنے کی مزید تاکید ہے اور اس سے اس خیال کی ہر ممکن نفی ہوتی ہے کہ وحی داخلی خیالات سے ماورا کوئی چیز نہیں۔

* اس واقعے میں نبیٔ اکرم ﷺ کا خوف اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کو رسالت کی کوئی توقع نہیں تھی جس کا پیغام دنیا میں پھیلانے کی ذمہ داری آپ کو سونپی گئی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وحی سے آپ کے کسی اندرونی خیال یا منصوبے کی تکمیل نہیں ہوئی بلکہ یہ تو ایک ایسی چیز تھی جو اچانک آپ ﷺ پر طاری کر دی گئی۔ آپ کے دل میں پہلے سے اس کا خیال تک نہیں گزرا تھا۔ یہ حالت اس شخص کی نہیں ہو سکتی جو پہلے سے اس سوچ بچار میں مبتلا ہو اور تدریجی کشف کے ساتھ اُس کا ایک عقیدہ بن جائے جس کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دینے لگے۔ بعض مستشرقین نے آپ کے بارے میں اس قسم کے خود ساختہ خیالات ظاہر کیے ہیں۔ [1]

* اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ اپنے رسول ﷺ کے دل کو مضبوط کر دیتا اور اسے

[1] مثال کے طور پر فرانسیسی مستشرق کارڈوا کا نام پیش کیا جا سکتا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے: (حاضر العالم الإسلامي: 39/1)

اطمینان دلا دیتا کہ تجھ سے کلام کرنے والا جبریل ہی ہے اور وہ تجھے یہ بتلانے آیا ہے کہ تو بنی نوع انسان کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی روشن حکمت یہ چاہتی تھی کہ بعثت سے قبل آپ کی شخصیت اور بعثت کے بعد آپ کی شخصیت میں مکمل فرق واضح کر دیا جائے۔ اور یہ بات اظہر من الشمس ہو جائے کہ اسلامی عقیدے کے ارکان میں سے کوئی رکن اور شریعت اسلامیہ کا کوئی بھی مسئلہ اس سے پہلے آپ کے ذہن میں نہیں آیا، نہ کبھی آپ ﷺ کے دماغ میں اس کی دعوت دینے کا کوئی تصور گزرا۔

* اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے جائیں تاکہ اُن کی طرف سے آپ کو یہ یقین دہانی کرا دی جائے کہ آپ ﷺ کی ذات بابرکات پر جو یہ واقعہ اچانک گزرا ہے، یہ درحقیقت وحی الٰہی ہے جو اللہ تعالیٰ پہلے انبیاء پر نازل کرتے رہے ہیں۔ اور آپ کے دل سے خوف اور خدشات دور کر دیے جائیں جو اس واقعے سے آپ کے ذہن میں آئے تھے۔

* اگر وحی کوئی داخلی چیز ہوتی تو قرآنِ مجید میں ایسی آیات نہ ہوتیں جن میں آپ کو کسی کام پر ٹوکا گیا ہے یا اظہار ناراضی کیا گیا ہے، مثلاً: ایک دفعہ جب آپ سردارانِ قریش سے محوِ گفتگو تھے تو نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ سے کچھ اعراض کیا تھا، حالانکہ وہ آپ کی خدمت میں دین کی باتیں پوچھنے آئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اظہارِ ناراضی کیا بلکہ اس سورت کا نام بھی ایسا رکھا گیا جس سے اس واقعے کے مضمون پر صریح دلالت ہوتی ہے، یعنی سورۂ عبس۔ اسی طرح بدر کے قیدیوں کے بارے میں بھی آپ کو سخت الفاظ میں تنبیہ کی گئی۔ حضرت زینب بنت جحش سے نکاح کے سلسلے میں بھی آپ کو فہمائش کی گئی۔ غزوۂ تبوک میں آپ نے بعض جھوٹے معذوروں کو جنگ کے لیے جانے سے رخصت دے دی تھی، اس سلسلے میں بھی آپ پر اعتراض کیا گیا: ''(اے نبی!) اللہ نے تمھیں معاف کر دیا ہے، تم نے اُن (منافقین) کو رخصت

کیوں دی؟ (تم رخصت نہ دیتے) یہاں تک کہ تمھارے لیے وہ لوگ ظاہر ہو جاتے جنھوں نے سچ بولا اور تم جھوٹوں کو جان لیتے۔''[1]

ایک دفعہ کفارِ قریش نے آپ سے مطالبہ کیا کہ جب ہم آیا کریں تو آپ ان غلاموں اور رکمیوں کو اُٹھا دیا کریں۔ آپ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ چلو وقتی طور پر ایسا کر لیا جائے تو کیا حرج ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں تنبیہ فرمائی:

﴿ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ﴾

''ان لوگوں کو (حقارت سے) دور مت ہٹائیے جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور وہ اس (اپنے رب) کا چہرہ چاہتے ہیں۔''[2]

اس کی تفصیل کے لیے تفسیر طبری میں اس آیت کی تفسیر سے متعلقہ روایات: 374/11 تا 380/11 ملاحظہ کریں۔ ان میں ایک روایت 13258 اپنے تمام طرق کے ساتھ صحت کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے بلکہ اس کا کچھ حصہ صحیح بخاری میں بھی موجود ہے۔

* اگر وحی داخلی چیز ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم کو یوں خطاب نہ کرتا: ''پھر اگر تو اس (کتاب) کے متعلق شک میں ہے جو ہم نے تیری طرف نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھتے تھے، یقیناً تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے حق آ گیا ہے، لہٰذا تو ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔''[3]

* اگر وحی داخلی چیز ہوتی تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کئی دفعہ سائلین کے جواب میں خاموشی اختیار کر لیتے تھے اور بعض اوقات تو کئی کئی دن یہ حالت برقرار رہتی تھی بلکہ آپ کو بعض اوقات بڑی مشقت اور پریشانی بھی اٹھانی پڑتی تھی۔ واقعۂ افک میں آپ مہینہ بھر پریشان رہے۔ جب تک وحی نہیں آئی، معاملہ صاف نہیں ہوا۔

* یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ آپ اُمّی رہیں اور لکھنا پڑھنا نہ سیکھیں تاکہ

[1] التوبة 43:9. [2] الأنعام 52:6. [3] یونس 94:10.

قرآن کے مبدأ اور اس کے سرچشمے کے بارے میں کسی ذہن میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے۔ خود اللہ عز وجل نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَٰبٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ۝ ﴾

''اور تو اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتا تھا اور نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا، (اگر ایسا ہوتا) تو باطل پرست یقیناً شک کرتے۔'' [1]

وحی کا رُکنا اور پھر جاری ہونا

اس واقعے کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام نبیٔ اکرم ﷺ کی خدمت میں آنے سے رُکے رہے۔ کتنی مدت تک رکے رہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ دکتور بوطی نے لکھا: ''راجح وہ ہے جو امام بیہقی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ یہ مدت چھ ماہ تھی۔'' [2] بعض سیرت نگاروں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کو زیادہ درست قرار دیا ہے جس میں یہ مدت چالیس دن بتلائی گئی ہے۔ [3] یہ بھی کہا گیا ہے کہ وحی چند دن منقطع رہی۔ [4]

رسول اللہ ﷺ وحی رُک جانے سے بہت پریشان ہوئے۔ روایات میں ہے کہ آپ نے کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ کسی پہاڑ کی چوٹی سے کود جائیں۔ [5] علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس

[1] العنكبوت 29:48. [2] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 67. دکتور بوطی نے یہ نہیں بتایا کہ یہ اقتباس انھوں نے بیہقی کی کس کتاب سے لیا ہے، تاہم ہم نے السنن الکبریٰ میں دیکھا، بیہقی نے لکھا ہے: ''وحی رک گئی۔'' لیکن انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ انقطاعِ وحی کی مدت چھ ماہ ہے، دیکھیے: (السنن الكبرىٰ للبيهقي: 6/9) [3] شرح المواهب اللّدنية للزرقاني: 236/1. زرقانی نے انقطاعِ وحی کی مدت کے حوالے سے وارد ہونے والے مختلف اقوال ذکر کیے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی قول کسی مناسب دلیل کی روشنی میں نہیں کہا گیا۔ اور دیکھیے: (من معين السيرة للشامي، ص: 29)
[4] فتح الباري: 205/26. [5] صحيح البخاري، التعبير، باب: أول ما بدئ به رسول الله ﷺ من الوحي الرؤيا الصالحة، حديث: 6982.

بات کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ اولاً: یہ امام زہری سے اوپر بلاسند ہے۔ ثانیاً: خودکشی انبیاء کی شان کے خلاف ہے۔ انبیاء معصوم ہوتے ہیں۔ [1]

انقطاع وحی کا دور گزر جانے کے بعد وحی کا نزول دوبارہ شروع ہوا۔ اس کی تفصیل خود رسول اللہ ﷺ کی زبانی سنیے: ”ایک دفعہ میں جا رہا تھا کہ اچانک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی۔ میں نے اپنی نظر اٹھائی تو وہی فرشتہ نظر آیا جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا۔ وہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں ڈر گیا اور واپس گھر چل دیا، میں نے گھر پہنچتے ہی کہا: ”مجھے لحاف اوڑھا دو، مجھے لحاف اوڑھا دو۔“ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں:

﴿ يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ ﴾

”اے کمبل اوڑھ کر لیٹنے والے! اٹھ کھڑا ہو اور (لوگوں کو) ڈرا، اور اپنے رب ہی کی بڑائی بیان کر، اور اپنے کپڑے پاک رکھ اور ناپاکی چھوڑ دے۔“ [2]

اس کے بعد وحی تواتر اور باقاعدگی سے آنے لگی۔ [3]

وحی رُکنے کی حکمت

* انقطاعِ وحی کی حکمت یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے دل میں حصولِ وحی کا ذوق شوق پیدا ہو جائے کیونکہ اب آپ ﷺ پر یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو چکی تھی کہ میں نبی

[1] دفاع عن الحدیث النبوي والسیرة، ص: 40. البانی رحمہ اللہ نے یہ بھی بتایا کہ زہری کی وہ روایات جو اُن سے اوپر بلاسند ہیں اور بلاغاتِ زہری کے نام سے معروف ہیں، اُن کے ضعیف ہونے کا ادراک سب سے پہلے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کو ہوا۔ [2] المدثر 74:1-5. [3] صحیح البخاري، بدء الوحي، باب: کیف کان بدء الوحي......؟ حدیث: 4 و4925، وصحیح مسلم، الإیمان، باب بدء الوحي إلی رسول اللہ ﷺ، حدیث: 161.

بنا دیا گیا ہوں۔[1]

* وحی کے ایک دفعہ رک جانے اور پھر کچھ عرصہ بعد جاری ہونے سے اُس حقیقت کی مزید تائید ہوتی ہے جس کا ہم گزشتہ صفحات میں تذکرہ کر چکے ہیں کہ وحی رسول اللہ ﷺ کی ذات سے ایک جداگانہ چیز ہے۔ آپ کے ذاتی خیالات و تصورات کا نام وحی نہیں ہے۔

وحی کے طریقے

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کے لیے وحی کے تمام طریقے استعمال کیے ہیں، مثلاً:

* سچا خواب: آپ ﷺ پر وحی کی ابتدا اسی طریقے سے ہوئی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے: ''رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ روزِ روشن کی طرح رونما ہو جاتا۔''[2]

* کبھی فرشتہ رسول اللہ ﷺ پر ظاہر ہوئے بغیر آپ کے دل و دماغ میں کوئی چیز ڈال دیتا۔ خود نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: ''روح القدس نے میرے دل میں یہ ڈالا کہ کوئی شخص اُس وقت تک فوت نہیں ہوتا جب تک وہ اپنا پورا رزق حاصل نہیں کر لیتا، لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور حلال اور اچھے طریقے سے رزق طلب کرو۔''[3]

* کبھی فرشتہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک آدمی (دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ) کی (مشابہ) صورت میں ظاہر ہوتا۔ آپ سے باتیں کرتا اور آپ ﷺ اُس کی بات یاد کر لیتے۔ اس صورت

[1] فتح الباري:26/205,206. [2] صحيح البخاري، التعبير، باب أول ما بدئ به رسول اللهﷺ من الوحي الرؤيا الصّالحة، حديث:6982، وصحيح مسلم، الإيمان، باب بدء الوحي إلى رسول اللهﷺ، حديث:160. [3] یہ حدیث متابعت اور شواہد کی بنا پر قوی ہے۔ علامہ البانی نے اس حدیث کو محمد غزالی کی کتاب کے حاشیے میں درج کرنے کے بعد لکھا: ''یہ حدیث صحیح ہے۔'' دیکھیے: (فقه السيرة، ص:96)

میں کبھی کبھی صحابہ بھی اُسے دیکھ لیتے تھے۔ [1]

* کبھی رسول اللہ ﷺ کی طرف وحی گھنٹی کی ٹن ٹن کے مانند آتی تھی اور یہ صورت آپ ﷺ پر بہت گراں گزرتی تھی۔ فرشتۂ وحی اس آواز میں آملتا۔ وحی کی شدت کی وجہ سے آپ ﷺ کی پیشانی پر پسینہ چمک اٹھتا اور آپ کی اونٹنی زمین پر گھٹنے ٹیک دیتی تھی۔ [2]

* کبھی رسول اللہ ﷺ فرشتے کو اُس کی اصلی صورت میں دیکھتے اور وہ آپ پر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق وحی کرتا۔ ایسا صرف دو مرتبہ ہوا، سورۂ نجم میں صراحت موجود ہے۔ [3]

* اللہ تعالیٰ نے اُس وقت آپ ﷺ پر براہِ راست وحی کی جب شب معراج میں آپ آسمانوں کے اوپر تھے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کیں اور مزید باتیں بھی ہوئیں۔

* اللہ تعالیٰ کا فرشتے کے توسط کے بغیر براہِ راست کلام کرنا بالکل ویسے ہے جیسے اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے براہِ راست ہم کلام ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ منزلت قرآن کی صریح عبارت سے ثابت ہے:

﴿ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴾ ''اور اللہ نے موسیٰ سے واقعی کلام کیا۔'' [4]

یہ عالی مرتبہ ہمارے نبی کریم ﷺ کو معراج کی رات حاصل ہوا۔ رسالت مآب ﷺ نے فرمایا: ''پھر مجھے اور اونچا لے جایا گیا حتی کہ میں ایک مقام پر پہنچا جہاں مجھے قلموں کی سرسراہٹ سنائی دیتی تھی۔'' [5]

[1] صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان الإيمان......، حديث: 8. [2] صحيح البخاري، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة......، حديث: 3215، وصحيح مسلم، الفضائل، باب عرق النبي ﷺ في البرد ......، حديث: 2333. [3] صحيح مسلم، الإيمان، باب معنى قول الله عزّوجلّ: ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴾ وهل رأى النبي ﷺ ربّه ......، حديث: 177. [4] النسآء 4:164. [5] صحيح مسلم، الإيمان، باب الإسراء برسول الله ﷺ إلى السمٰوات وفرض الصلوات، حديث: 163.

نمازوں کی تعداد میں تخفیف کے لیے بار بار اوپر جانے سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اُس وقت اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ سے براہِ راست محوکلام تھا۔ [1]

دعوتِ دین

اسلامی دعوت کے مراتب و مراحل

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے اس کے پانچ مراتب بیان کیے ہیں:

* نبوت۔
* اپنے قریبی رشتے داروں کو عذابِ الٰہی سے ڈرانا۔
* اپنی قوم کو ڈرانا۔
* ان لوگوں کو ڈرانا جن کے پاس اس سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا، یعنی تمام عرب۔
* اور قیامت تک کے تمام لوگوں کو ڈرانا جن تک آپ ﷺ کی دعوت پہنچے، چاہے وہ انسان ہوں یا جن۔ [2]

دعوت نبوی کے مراحل

پہلا مرحلہ: خفیہ دعوت دینا، یہ مرحلہ ابتدائی تین سال تک جاری رہا۔

دوسرا مرحلہ: علانیہ دعوت دینا لیکن لڑائی سے پرہیز کرنا، یہ مرحلہ ہجرتِ مدینہ تک جاری رہا۔

تیسرا مرحلہ: علانیہ دعوت دینا اور اُن لوگوں سے ڈٹ کر مقابلہ کرنا جو خود لڑائی کی ابتدا کریں۔ یہ مرحلہ صلح حدیبیہ تک جاری رہا۔

[1] زاد المعاد: 1/78-80، و شرح السنة للبغوي: 13/321. [2] زاد المعاد: 1/86.

چوتھا مرحلہ : علانیہ دعوت دینا اور ہر اُس شخص سے ڈٹ کر لڑنا جو اسلامی دعوت کے راستے میں رکاوٹ بنے۔[1]

دعوتِ نبوی کے مراحل کی ترتیب موجودہ دور میں؟

رسول اللہ ﷺ کے ان مراحل دعوت سے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا موجودہ دور میں حکومتِ اسلامیہ کے قیام کی خاطر دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے ان مراحل کی بہ لحاظ ترتیب زمانی مرحلہ وار پابندی ضروری ہے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہوگا کہ موجودہ دور کے داعیانِ اسلام کے لیے ان مراحل کی پابندی ضروری نہیں جن سے رسول اللہ ﷺ کو گزرنا پڑا[2] کیونکہ ان مراحل کی یہ زمانی ترتیب منجاب اللہ مقدر میں تھی۔ اس میں کسی انسانی کاوش کو کوئی دخل نہ تھا۔[3] پس درپیش معاملات سے عہدہ برآ ہونے اور حوادثِ زمانہ کا مقابلہ کرنے کے لیے تحریک اسلامی کو ان مراحل کا پابند کرنا درست نہیں۔ تحریکِ اسلامی کے دوران رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ داعیانِ اسلام کے لیے مختلف راستے اختیار کرنے کے درخشندہ نمونے دکھاتی ہے بشرطیکہ وہ اس بے مثال دعوت کے مزاج کے مطابق ہوں۔ دعوت دینا، مدد و نصرت طلب کرنا یا ہجرت کرنا تو وہ وسائل و ذرائع ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے دعوت و تبلیغ کے لیے مخصوص حالات میں اختیار کیے، مثلاً: ہمارے موجودہ دور میں مغربی غیر مسلم جمہوری حکومتیں کسی بھی دین اور مذہب کے داعیوں کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتیں، اس لیے اب خفیہ دعوت دینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی، البتہ اشتراکی حکومتیں کسی مسلمان کو کسی قسم کے دعوتی یا سیاسی عمل کی اجازت نہیں دیتیں، لہٰذا ضروری ہے کہ ان ممالک میں دینی تبلیغ خفیہ طریقے

[1] فقه السيرة النبوية للبوطي: 57، والرحيق المختوم، ص:84. [2] عثرات و سقطات في كتاب المنهج الحركي للسيرة النبوية لزهير سالم، ص: 29. [3] المنهج الحركي للسيرة النبوية للغضبان، ص: 9.

سے کی جائے بلکہ اپنے دین کو بھی ظاہر نہ کیا جائے یہاں تک کہ کچھ قوت حاصل ہو جائے۔ ایسے حالات میں سری دعوت اختیار کرنا مجبوری ہے۔ اسی طرح اگر حکمت کا تقاضا ہو کہ دین کا کوئی کام خفیہ کیا جائے اور کوئی علانیہ تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، مثلاً: اُن ممالک میں جہاں مسلمانوں کو محدود دائرے میں اپنا کردار ادا کرنے کی اجازت ہے، فی الجملہ دین کا یہ فریضہ خفیہ طور پر بھی ادا کیا جا سکتا ہے اور حالات ساز گار ہوں تو دعوت و تبلیغ کا کام علانیہ بھی کیا جا سکتا ہے۔[1]

خفیہ دعوت: رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ان تمام احکام پر عمل کیا جو تبلیغ کے سلسلے میں صادر ہوئے، مثلاً: سورۂ علق کی ابتدائی آیات کے بعد نازل ہونے والی آیات ملاحظہ ہوں:

﴿ يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ ﴾

”اے کمبل اوڑھنے والے! اٹھ کھڑا ہو اور ڈرا، اور صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کر، اور اپنے کپڑے پاک رکھ، اور ناپاکی چھوڑ دے، اور حصول کثرت کے لیے احسان نہ کر اور اپنے رب ہی کے احکام پر صبر کر۔“[2]

ان آیات نے اُس دعوت کا مضمون بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے جسے لوگوں تک پہنچانے کی اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی تھی۔

---

[1] عثرات وسقطات في كتاب المنهج الحركي للسيرة النبوية لزهير سالم، ص: 28-35. یہاں زہیر سالم نے غضبان کی اس بات پر گرفت کی ہے کہ مبلغ کے لیے خفیہ دعوت کے مرحلے سے گزرنا لازمی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غضبان نے یہ بات بعض استبدادی تنظیموں کے طرزِ عمل کو سامنے رکھتے ہوئے کہی اور کئی مغربی ممالک میں حریت دعوت و تبلیغ کی جو صورت حال ہے وہ ان کی نظروں سے اوجھل رہی، چنانچہ وہ خفیہ دعوت کا عمومی قاعدہ وضع کرتے ہوئے لغزش کا شکار ہو گئے۔ اور دیکھیے: (فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 77,76) [2] المدثر 74: 1-7.

مکہ مکرمہ میں اترنے والی تمام آیاتِ قرآنی اسی اسلوب کی حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿ يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴾ میں اشارہ ہے کہ کمبل اوڑھ کر لیٹنے اور بیوی بچوں کے درمیان راحت کی زندگی گزارنے کا وقت گزر چکا۔ اب ہر قسم کی مادی اور معنوی جدو جہد کا مرحلہ آ گیا ہے۔ ﴿ قُمْ فَأَنذِرْ ﴾ میں اشارہ ہے کہ اب تم پر فرض عائد ہو گیا کہ تم عالم گیر انسانیت کو اسلام کی دعوت دو۔ ﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾ میں اشارہ ہے کہ کائنات میں کوئی چیز خالق کائنات اللہ تعالیٰ سے بڑی نہیں ہے، اس لیے تم پر لازم ہے کہ اس حقیقت کو علی الاعلان بیان کر دو تاکہ سب لوگ بزرگ و برتر اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی اور تواضع اختیار کریں۔ یہی توحید مطلق ہے۔ ﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴾ میں اشارہ ہے کہ اللہ کے داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ظاہری اور باطنی طور پر پاک صاف رکھے تاکہ وہ اپنے پیروکاروں کے لیے ہمہ جہت طہارت کا بے مثال نمونہ بن سکے۔ ﴿ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴾ میں اشارہ ہے کہ خالص توحید اس بات کی متقاضی ہے کہ اللہ عزوجل کے سوا کسی چیز اور کسی فرد و بشر کی تقدیس و تعظیم نہ کی جائے۔ ﴿ وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ ﴾ میں اشارہ ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) کا خصوصی امتیاز یہ ہونا چاہیے کہ وہ زیادہ لینے کی نیت سے کسی کو کوئی چیز نہ دے کیونکہ وہ اعلیٰ اخلاق و آداب کا مکلف ہے تاکہ پوری انسانیت کے لیے عظیم مثال بن سکے، اس لیے کہ رسول انسانیت کو مکارم اخلاق کی دعوت دینے والا ہوتا ہے۔

ان اہم امور کو انجام دینے اور ان سے مطلوبہ فوائد حاصل کرنے کے لیے ایک اہم حقیقت کا ادراک ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس انداز سے دعوت دینے کی ذمہ داری طرح طرح کی مشکلات اور مخالفین کی طرف سے ہر ممکن تکالیف پر صبر کیے بغیر ادا نہیں کی جا سکتی۔ اور متبعین کی تربیت کے لیے بھی صبر کی اشد ضرورت ہے۔ اس پر آزمائشیں مستزاد ہیں، اُن پر بھی صبر کرنا ہوگا۔ اس لیے سلسلۂ کلام کو اس نصیحت پر ختم فرمایا: ﴿ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ﴾ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ دامن جھاڑ کر اپنے بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور تین سال

تک مسلسل اسی انداز سے خفیہ طور پر دعوت دیتے رہے۔ مؤرخ ابن اسحاق لکھتے ہیں: ''مجھے ملنے والی معلومات کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی سری دعوت کا دور آغازِ نبوت سے تین سال تک جاری رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو علانیہ تبلیغ اور اظہارِ دین کا حکم دیا۔''[1]

حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا میں رسول اللہ ﷺ نے دعوت کا کام رازداری سے کیا۔ وہ کہتے ہیں: ''میں بعثت کے ابتدائی دور میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس وقت آپ مکہ مکرمہ میں چھپے ہوئے تھے......''[2]

آپ ﷺ نے تبلیغ کی ابتدا توحید کی دعوت اور شرک سے براءت و بیزاری سے کی۔ اس دور میں آپ کی ساری تگ و تاز انھی لوگوں تک محدود رہی جن سے آپ کا کوئی نہ کوئی رشتہ یا تعلق تھا، مثلاً: بیوی، بیٹیاں، آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ، گھر پرورش پانے والے حضرت علی بن ابی طالب اور دوست یا جن پر آپ کو اعتماد تھا کہ وہ راز افشا نہیں کریں گے۔[3] پس وہ اولین لوگ جو دین اسلام میں داخل ہوئے مندرجہ ذیل ہیں:

ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا: آپ مشہور قول کے مطابق سب سے پہلے مسلمان ہوئیں اور نبی ﷺ کی رسالت کو قبول کر لیا۔ وہ کافروں کی مخالفت اور بدسلوکی پر آپ ﷺ کی ہمت بندھاتی تھیں، اسی لیے وہی سب سے پہلی شخصیت ہیں جنھیں جنت کی خوشخبری دینے کا آپ ﷺ کو حکم دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''مجھے حکم دیا گیا کہ میں خدیجہ کو جنت میں ایک گھر کی خوشخبری دوں جو اکیلے کھوکھلے موتی سے بنا ہوگا اُس میں کوئی

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 325/1. یہ روایت بلاسند ہے۔ [2] صحيح مسلم، صلاة المسافرين وقصرها، باب إسلام عمرو بن عبسة، حديث: 832. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 309/1. ابن ہشام نے یہاں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ بیان کیا ہے۔

شوروغل ہوگا نہ کسی قسم کی کوئی تکلیف ہوگی۔'' [1]

اُن کی فضیلت اور خصائل کے بارے میں کئی اور احادیث بھی مروی ہیں۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ: وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا جناب ابوطالب کے بیٹے تھے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے گھر پرورش پا رہے تھے، اُس وقت اُن کی عمر صحیح ترین قول کے مطابق دس سال تھی۔ [2]

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کے والد انھیں اپنے ساتھ گھر لے جانے کے لیے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنْ شِئْتَ فَأَقِمْ عِنْدِي، وَإِنْ شِئْتَ فَانْطَلِقْ مَعَ أَبِيكَ»

''زید! تم چاہو تو میرے پاس ٹھہرو۔ چاہو تو اپنے والدِ محترم کے ساتھ چلے جاؤ۔''

زید بولے: ''میں تو آپ ہی کے پاس رہوں گا۔'' [3] پھر وہ آپ ہی کے پاس رہے حتی کہ اُنھیں ''زید بن محمد'' کہا جانے لگا۔ بعد میں وہ دوبارہ زید بن حارثہ کہلائے اور متبنیٰ بنانے کا رواج موقوف ہوگیا جب یہ آیات اتریں:

﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ ﴾

''ان (لے پالکوں) کو ان کے (حقیقی) باپوں کی نسبت سے پکارو، اللہ کے نزدیک یہ بہت انصاف کی بات ہے۔'' [4]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ: یہ مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ انھی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

---

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب تزويج النبي ﷺ خديجة وفضلها ﷺ، حديث: 3819، وصحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل خديجة [أم المؤمنين] ﷺ، حديث: 2433، والسيرة النبوية لابن هشام: 306,305/1. ابن اسحاق نے اس روایت کو حسن سند کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ الفاظ انھی کے روایت کردہ ہیں۔ [2] السير والمغازي لابن إسحاق: 137. اس قول کی سند حسن ہے۔ [3] صحيح سنن الترمذي للألباني: 231/3، حديث: 4085. [4] الأحزاب 5:33.

«إِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِي إِلَيْكُمْ فَقُلْتُمْ: كَذَبْتَ، وَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: صَدَقَ»

''اللہ تعالیٰ نے مجھے تمھاری طرف مبعوث کیا تو تم سب نے کہا: تو جھوٹ بولتا ہے جبکہ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے کہا: (آپ نے) سچ فرمایا۔''[1]

مزید فرمایا: ''میں نے جس شخص کو بھی اسلام کی دعوت دی، وہ ڈانوا ڈول ہوا، ہچکچایا، تذبذب میں پڑ گیا اور غور کرتا رہا مگر جب میں نے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو دعوت دی تو نہ اُس نے کوئی تردد کیا نہ دیر کی (فوراً اسلام قبول کر لیا۔)''[2]

خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے، جب وہ خلیفہ بنے، فرمایا: ''لوگو! کیا میں سب لوگوں سے زیادہ خلافت کا اہل اور حقدار نہیں؟ کیا میں سب سے پہلے مسلمان نہیں ہوا؟......۔''[3]

خفیہ تبلیغ کے ضمن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے رشتہ داروں، حلیفوں، دوستوں اور قابلِ اعتماد لوگوں کے گھر جا کر ان پر محنت کی جس کے نتیجے میں معززین کی ایک جماعت دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئی، مثلاً: عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبیداللہ، سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمن بن عوف[4]، عثمان بن مظعون، ابوعبیدہ بن جراح، ابوسلمہ بن عبدالاسد اور ارقم بن ابی الارقم رضی اللہ عنہم[5] حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کی مساعی سے دائرۂ اسلام

[1] صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب قول النبي ﷺ: «لو كنت متخذًا خليلًا»، حديث: 3661. [2] السير والمغازي لابن إسحاق: 139. یہ منقطع سند سے مروی ہے۔ [3] جامع الترمذي، المناقب، باب قول أبي بكر: ألست أحق الناس بها......، حديث: 3667. اس امر کے متعلق بکثرت صحیح احادیث روایت ہوئی ہیں کہ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، دیکھیے: (البداية والنهاية: 3/30-32) [4] ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت سے مسلمان ہونے والوں میں عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبیداللہ، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمن بن عوف کا ذکر ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں کیا ہے اور ابن ہشام نے بھی ان اصحاب کے نام بلاسند نقل کیے ہیں، دیکھیے: (السير والمغازي لابن إسحاق: 140، والسيرة النبوية لابن هشام: 1/317،318) [5] ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے اسلام لانے والوں میں عثمان بن مظعون، ابوعبیدہ بن جراح، ابوسلمہ بن عبدالاسد »

میں داخل ہوئے۔

ان لوگوں کے تعلقات و روابط کے نتیجے میں اسلام آہستہ آہستہ مکہ مکرمہ میں بلکہ مکہ سے باہر بھی پھیلنے لگا[1] اور تقریباً قریش کے تمام قبائل میں سے اکا دکا لوگ مسلمان ہوگئے۔ غلاموں میں سب سے پہلے مسلمان ہونے والے مشہور احباب یہ ہیں: بلال بن رباح، صہیب بن سنان، عمار بن یاسر، اُن کے والد یاسر اور اُن کی والدہ سمیہ بنت خباط رضی اللہ عنہم اجمعین۔[2]

مختصر عرصے میں قریش کے مختلف خاندانوں میں سے اسلام لانے والوں کی تعداد چالیس سے زیادہ ہوگئی۔ مؤرخ ابن ہشام نے ان کی یہی تعداد بتائی ہے[3] جبکہ یعمری نے پچاس سے زائد افراد کا تذکرہ کیا ہے۔[4]

یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچا ہے کہ حضرت ورقہ بن نوفل بھی اولین مسلمانوں میں شامل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے انھیں خواب میں دیکھا۔ انھوں نے سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اگر وہ جہنمی ہوتے تو سفید کپڑوں میں ملبوس نہ ہوتے۔''[5]

« اور ارقم بن ابی ارقم کا ذکر صرف ابن کثیر نے کیا ہے، ان اصحاب کا تذکرہ ابنِ کثیر کے علاوہ کسی مؤرخ اور سیرت نگار نے نہیں کیا، دیکھیے: (البداية والنهاية:3/33) [1] عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کی روایت جسے امام مسلم نے نقل کیا اور جس کا تذکرہ پچھلے صفحات میں ہوا، اس امر کی شاہد ہے کہ اسلام کی خبریں مکہ سے باہر بھی پہنچ چکی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی عمرو سے کہا تھا: ''اب تم اپنی قوم کی طرف لوٹ جاؤ اور جب تمھیں خبر ملے کہ میں غالب آگیا ہوں تو میرے پاس آجاؤ۔'' دیکھیے: (صحيح مسلم، صلاة المسافرين ......، باب إسلام عمرو بن عبسة، حديث: 832) [2] ان اصحاب کا ذکر ایک روایت میں ہے جو مجاہد تابعی پر موقوف ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ امام احمد بن حنبل نے بھی متصل اور حسن درجے کی سند سے ان کا تذکرہ کیا ہے اور دیگر مؤرخین نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے، دیکھیے: (فضائل الصحابة: 182/1) [3] السيرة النبوية لابن هشام: 1/318-324. [4] عيون الأثر: 1/93-98، اور دیکھیے: (جوامع السيرة لابن حزم، ص: 44-51) [5] الفتح الرباني: 20/174. ساعاتی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔

ایک دوسری روایت میں اس سے بھی زیادہ صریح الفاظ ہیں: ''میں نے انھیں خواب میں دیکھا۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس تھے۔ میں نے انھیں جنت کے درمیان دیکھا۔ انھوں نے ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔''[1]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''ورقہ کو بُرا نہ کہو، میں نے خواب میں ان کے ایک یا دو باغ دیکھے ہیں۔''[2]

مزید فرمایا: ''وہ قیامت کے دن اکیلے ایک امت کی حیثیت سے اٹھائے جائیں گے۔''[3]

سب سے پہلے مسلمان ہونے والے سابقین اولین کے ناموں سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ وہ اپنی قوم کے بہترین افراد تھے۔ یہ بات درست نہیں کہ ابتدائی مسلمان عموماً فقراء، کمزور اور غلام قسم کے لوگ تھے جو اپنی آزادی اور حصول شرف کے لیے مسلمان ہوگئے تھے۔ جن مسلم اور غیر مسلم مؤرخین نے یہ بات لکھی ہے وہ صریحاً غلطی پر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن صحابہ رضی اللہ عنہم کو اسلام کی خاطر شدید عذاب اور تکلیف کی انتہائی شرمناک صورتوں کا سامنا کرنا پڑا وہ غلام یا آزاد کردہ غلام تھے۔ اُن پر سب لوگوں کے سامنے ہولناک تشدد ہوا، اس لیے یہ زیادہ مشہور ہوگئے جبکہ خاندانی لوگ اپنے خاندان کی وجہ سے محفوظ رہے۔ اگر اُن میں سے کسی کو اذیت کا شکار ہونا بھی پڑا تو وہ صرف اُن کے خاندان ہی کی حد تک تھا، اس لیے ان کا معاملہ خفیہ رہا اور وہ زیادہ مشہور نہیں ہوئے۔[4]

اس مفہوم کی کئی احادیث مذکور ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد

[1] ابن کثیر نے اس حدیث کو ابویعلیٰ سے روایت کیا اور حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (البداية والنهاية: 10/3) [2] ابن کثیر نے لکھا کہ اس حدیث کو بزار نے روایت کیا ہے۔ اور اس کی سند جید ہے، دیکھیے: (البداية والنهاية: 10/3) حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا اور ذہبی نے اس پر اُن کی موافقت کی ہے، دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 409/2) [3] مجمع الزوائد: 416/9. امام ہیثمی کا کہنا ہے: ''اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔'' [4] من معين السيرة للشامي، ص: 36,35.

نقل کیا ہے: ''سب سے پہلے سات حضرات نے اپنے اسلام کا اعلان کیا: رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، عمار، ان کی والدہ سمیہ، بلال، صہیب اور مقداد رضی اللہ عنہم۔[1] رسول اللہ ﷺ اپنے چچا ابوطالب کی وجہ سے محفوظ رہے۔ حضرت ابوبکر بھی اپنی قوم کی بنا پر بچے رہے۔ باقی پانچوں کو مشرکین نے جکڑ لیا، انھیں لوہے کی قمیصیں پہنا کر تپتی دھوپ میں لٹاتے رہے......''

مؤرخ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ قریش اسلام کا اعلان کرنے والوں پر ٹوٹ پڑے اور ہر قبیلہ اپنے درمیان مسلمان ہو جانے والے شخص پر ٹوٹ پڑتا تھا۔[2] نیز یہ بھی بیان کیا کہ جب حضرت ولید بن ولید مسلمان ہوگئے تو بنومخزوم کے کچھ لوگ ہشام بن ولید کے پاس پہنچے تاکہ وہ ہشام سے یہ اجازت لے لیں کہ وہ حضرت ولید اور اس قبیلے کے دیگر مسلمان نوجوانوں کو دین اسلام سے باز رکھنے کے لیے ان کے خلاف اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرسکیں۔ ہشام نے اُنھیں اجازت دے دی، اور تنبیہ کر دی کہ خبردار! اُسے جانی نقصان نہ پہنچے۔ اس قبیلے میں سے سلمہ بن ہشام اور عیاش بن ابی ربیعہ بھی مسلمان ہو چکے تھے۔[3]

ابن اسحاق نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہجرت کے واقعے میں لکھا ہے کہ قریش نے ہشام بن عاص بن وائل سہمی کو حضرت عمر اور عیاش کے ساتھ ہجرت کرنے سے بلطائف الحیل (بہترین بہانوں کے ذریعے سے) روک دیا تھا اور وہ اُن کے جھانسے میں آ گیا تھا، پھر وہ حیلے بہانے سے عیاش کو بھی جکڑ کر مدینے سے مکہ واپس لے آئے تھے۔[4]

[1] فضائل الصّحابة: 182/1. محقق وصی اللہ نے اس روایت کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ والطبقات الکبرٰی: 233/3. ابن سعد نے اس روایت کو تابعی مجاہد کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ یہ سند مرسل ہے۔ ابن سعد نے اپنی روایت میں مقداد کے بجائے خباب کا ذکر کیا ہے۔ [2] السیر والمغازي لابن إسحاق: 148، والسیرة النبویة لابن هشام: 392/1. ابن ہشام نے یہ روایت ابن اسحاق کے حوالے سے نقل کی ہے جو بلاسند ہے۔ [3] السیرة النبویة لابن هشام: 396/1. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے۔ اس کی سند منقطع ہے۔ [4] السیرة النبویة لابن هشام: 129/1. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند حسن ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے قبل اپنے چچا زاد بھائی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو باندھ دیا کرتے تھے اور اُسے اسلام چھوڑنے پر مجبور کرتے تھے۔ [1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مظلوم مسلمانوں کے لیے کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد بھی دعا کے علاوہ ان کے حق میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ آپ ان کے لیے یوں دست بدعا رہتے: ''اے اللہ! ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ اور مکہ میں دوسرے مظلوم مسلمانوں کو نجات عطا فرما۔ اے اللہ! کفارِ قریش پر سخت سزا لاگو فرما اور ان پر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے جیسا قحط مسلط فرما۔'' [2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حدیثِ ہرقل میں ابوسفیان کے دو الفاظ ''ضعفاء'' اور ''شرفاء'' کی وضاحت کی ہے۔ ان کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ رسولوں کے پیروکار عموماً نرم طبیعت اور نرم مزاج لوگ ہوتے ہیں۔ متکبر اور تند مزاج لوگ نہیں ہوتے جو حسد اور ظلم کی بنا پر انبیاء کی مخالفت پر کمر بستہ رہتے ہیں، جیسے ابوجہل اور اُس کے ساتھی۔ گویا اس روایت میں شرف سے تکبر مراد ہے۔ اسی تفسیر کی روشنی میں ہمیں اُن عبارات کا مفہوم متعین کرنا چاہیے جن میں ''شرفاء'' اور ''مستضعفین'' جیسے الفاظ مذکور ہیں۔ [3]

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ سرسٹھ ''سابقون اولون'' میں سے صرف تیرہ صحابہ فقراء، مستضعفین، آزاد کردہ، غلام یا عجمی تھے اور یہ کل تعداد کا پانچواں حصہ ہے۔ ظاہر ہے اتنی قلیل تعداد کو أَكْثَرُهُمْ یا مُعْظَمُهُمْ یا عَامَتُهُمْ یعنی اکثریت نہیں کہا جا سکتا۔ [4]

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار ، باب إسلام سعيد بن زيد رضی اللہ عنہ ، حديث: 3862.
[2] صحيح البخاري ، التفسير، باب: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ﴾ ،حديث: 4560، وصحيح مسلم، المساجد ومواضع الصلاة، باب استحباب القنوت في جميع الصلوات......، حديث: 675، ومسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 250/12. محدّث احمد شاکر کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ [3] فتح الباري: 36,35/1. [4] من معين السيرة للشامي، ص: 37 - 39، وأضواء على السيرة، ص: 74. اس حوالے سے شامی نے جو کچھ لکھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

خفیہ دعوت کی حکمت

* جنابِ رسول اللہ ﷺ نے ابتدا میں اسلام کی دعوت دینے میں جو مخفی طریق کار اختیار کیا اُس میں دراصل ہر زمان و مکان کے داعیانِ اسلام کے لیے یہ ہدایت اور تعلیم مضمر ہے کہ احتیاط اور ظاہری اسباب کا خیال رکھنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ دعوتِ اسلامی کے مقاصد کے حصول کے لیے وہ تمام وسائل اختیار کرنے چاہئیں جو عقلِ سلیم کی روشنی میں ضروری نظر آئیں، البتہ یہ سوچ توکل علی اللہ پر غالب نہیں آنی چاہیے۔ انسان کو وسائل و اسباب ضرور اختیار کرنے چاہئیں مگر ان اسباب پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ بھروسا صرف اللہ کی ذات عالی پر رکھنا چاہیے۔ اسباب و تدابیر پر یقین رکھنا ایمان باللہ اور اسلامی دعوت کے مزاج کے منافی ہے۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ اس دور میں نبیٔ اکرم ﷺ کی تبلیغ و دعوت کا یہ انداز ایک رہبر اور قائد کی سیاست کا تقاضا تھا، بحیثیت نبی منجاب اللہ آپ کو ایسی کوئی ہدایت نہیں ملی تھی۔[1]

* جمہور فقہائے مسلمین کا اجماع و اتفاق ہے کہ ''جب مسلمان کم تعداد یا تھوڑے سے جنگی سازوسامان کی بنا پر اس پوزیشن میں نہ ہوں کہ دشمن پر کوئی کاری ضرب لگا سکیں بلکہ خود اُن کے بے فائدہ مارے جانے کا اغلب گمان ہو تو ایسی صورت میں اپنی جان بچانے کی مصلحت پر عمل کیا جائے کیونکہ جنگ کی صورت میں وہ فائدہ حاصل نہیں ہوگا جو جنگ سے مقصود ہے، یعنی دین کی حفاظت و اشاعت۔ مشہور فقیہ عزالدین بن عبدالسلام نے یہ بات خوب اچھی طرح واضح کی ہے۔[2] دکتور بوطی اس پر تبصرہ کرتے

[1] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 76. [2] قواعد الأحكام في مصالح الأنام: 1/ 111,112، وضوابط المصلحة في الشريعة الإسلامية للبوطي، ص: 261، وفقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 77.

ہوئے لکھتے ہیں: ''گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ درحقیقت دین کا مفاد ہے کیونکہ دینی مصلحت بھی ایسی صورت میں یہی تقاضا کرتی ہے کہ مسلمانوں کی جانیں محفوظ رہیں تاکہ وہ آگے بڑھ کر اُن دوسرے میدانوں میں جدوجہد کریں جن میں فائدے کا زیادہ امکان ہو ورنہ اگر وہ مارے جاتے ہیں تو اس میں خود دین کا نقصان ہوگا اور کافروں کو کھل کھیلنے کا موقع مل جائے گا اور وہ آسانی کے ساتھ دین کا خاتمہ کر دیں گے۔ گویا ایسے حالات میں جنگ نہ کرنا دین کے ایک اہم یقینی فائدے کو ایک موہوم فائدے پر ترجیح دینا ہے۔''[1]

علانیہ دعوت: مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیت: ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ ''اور اپنے سب سے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔'' اتری تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سارے خاندان کو اکٹھا کیا۔ تقریباً تیس آدمی جمع ہوئے۔ آپ نے کھانے پینے کا اہتمام بھی کیا تھا۔ کھانے سے فراغت کے بعد آپ نے اُن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''کون میرے دین اور میرے وعدوں کی ذمہ داری قبول کرے گا؟ ایسا شخص میرے ساتھ جنت میں ہوگا اور میرا نائب بنے گا۔''

ایک آدمی کہنے لگا: ''اے اللہ کے رسول! آپ تو ایک سمندر ہیں۔ بھلا اتنا بل بوتا کس میں ہے جو اتنا بوجھ اٹھا سکتا ہے؟'' آپ نے یہی پیشکش اپنے اہل خانہ کو کی تو حضرت علی نے کہا: ''میں (ذمہ داری اٹھاتا ہوں۔)''[2]

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا تھا: ''اے بنوعبدالمطلب! اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا کہ کوئی عربی جوان اپنی قوم کے لیے اس قدر بہترین چیز لایا ہو جو میں تمھارے پاس لایا ہوں۔ میں تمھارے پاس دنیا و آخرت (کی

[1] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 77. [2] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 2/166,165. محدث احمد شاکر کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند حسن ہے۔

سرفرازی) کا دین لے کر آیا ہوں۔‘‘ [1]

پھر رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ایک اور قدم اٹھایا۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب آیت ﴿ وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴾ «وَرَهْطَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ» ’’اور اپنے سب سے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ‘‘ [2] اور ان میں سے اپنے قبیلے کے خاص لوگوں کو بھی۔‘‘ [3] اتری تو رسول اللہ ﷺ صفا پر چڑھ گئے اور بلند آواز سے فرمایا: ’’خبردار! صبح کا حملہ۔‘‘ لوگ کہنے لگے: ’’یہ کون پکار رہا ہے؟‘‘ لوگ اکٹھے ہوئے تو آپ نے فرمایا: ’’لوگو! اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک لشکر نکل کر تم پر حملہ آور ہوگا تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟‘‘ وہ سب پکار اُٹھے: ’’ضرور! ہم نے آپ سے کبھی کوئی جھوٹ نہیں سنا۔‘‘ فرمایا: ’’پھر میں تمھیں اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب سے ڈراتا ہوں۔‘‘ ابولہب کہنے لگا: ’’تو تباہ ہو! تو نے ہمیں اس لیے اکٹھا کیا تھا؟‘‘ پھر وہ اٹھ کر چلا گیا۔ ادھر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ﴾

’’ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ (خود) تباہ ہو گیا۔‘‘ [4]

[1] السیر والمغازي لابن إسحاق: 146,145. طبری نے اس روایت کو بسند متصل نقل کیا ہے، دیکھیے: (تفسیر الطبري: 75/19) ان دونوں جگہوں پر اس روایت کی سند ضعیف ہے، تاہم یہ شواہد (تائیدی روایات) کی بنا پر قوی ہے۔ اس کے شواہد میں ایک تو مسند احمد کی روایت شامل ہے جس کا ذکر اس کی دونوں سندوں سمیت کیا گیا ہے، دوسری روایت ابن ابی حاتم کی ہے جو ان کی سند سے علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں یہ روایت ابن ابی حاتم کے حوالے سے نقل کی ہے، دیکھیے: (تفسیر ابن کثیر: 181,180/6) [2] الشعراء 214:26. [3] امام نووی فرماتے ہیں: ’’واضح رہے کہ یہ آیت قرآن کا حصہ تھی۔ بعدازاں اس کی تلاوت منسوخ کر دی گئی۔‘‘ دیکھیے: (شرح النووي: 83,82/3) [4] اللھب 1:111. صحیح البخاري، التفسیر، سورۃ ﴿ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ﴾، حدیث: 4972,4971، وصحیح مسلم، الإیمان، باب في قوله تعالیٰ: ﴿ وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ ﴾ ◄◄

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیت: ﴿ وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ﴾ ''اور اپنے سب سے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔'' اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام قریش کو بلایا اور وہ سب آ گئے۔ آپ نے ان سے عمومی خطاب بھی فرمایا اور نام لے لے کر بھی خبردار کیا: ''اے بنوکعب بن لؤی! اپنے آپ کو آگ سے بچا لو، اے بنو مرہ بن کعب! اپنے آپ کو آگ سے بچا لو، اے بنوعبد شمس! اپنے آپ کو آگ سے بچا لو، اے بنوعبد مناف! اپنے آپ کو آگ سے بچا لو۔ اے بنو ہاشم! اپنے آپ کو آگ سے بچالو، اے بنوعبدالمطلب! اپنے آپ کو آگ سے بچالو، اے فاطمہ! اپنے آپ کو آگ سے بچالے، میں تمھیں اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکوں گا، البتہ تم سے میری جو رشتہ داری ہے میں اُس کا حق ادا کرتا رہوں گا۔'' [1]

آپ کی یہ بلند پکار آخری درجے کی تبلیغ تھی۔ آپ نے اپنی قوم کو دین کی دعوت غیر مبہم الفاظ میں علانیہ پہنچا دی اور اپنے انتہائی قریبی اہل خاندان پر واضح کر دیا کہ میرے اس پیغام اور دعوت کی تصدیق ہی سے میرے اور تمھارے باہمی تعلقات قائم رہ سکتے ہیں۔ باقی رہی قومی اور قرابت داری کی عصبیت جس کے عرب داعی ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے اس پیغام کی حرارت سے پگھل چکی ہے۔ [2]

اہم نکات

* اس دور میں اسلامی دعوت کے جواب میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش کا عموماً اور آپ کے خاندان کا خصوصاً منفی رویہ اختیار کرنا اس بات کی قاطع دلیل ہے کہ وہ لوگ صریحاً بڑی غلطی پر ہیں جو دین اسلام کو عرب قومیت کا مظہر سمجھتے اور یہ دعویٰ کرتے

[1] صحيح البخاري، التفسير، باب: ﴿ وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ﴾، حديث: 4770، وصحيح مسلم، الإيمان، باب في قوله تعالىٰ: ﴿ وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ﴾، حديث: 204، واللفظ له. « الۡاَقۡرَبِيۡنَ ﴾، حديث: 208. [2] فقه السيرة للغزالي، ص: 101.

ہیں کہ اس دعوت سے نبی ﷺ کا مقصد عربوں کی امیدوں اور مفادات کا تحفظ اور حصول تھا۔

* لوگوں کی دعوت اسلام سے بے اعتنائی اس بات کی دلیل ہے کہ دورِ جاہلیت کے معاشروں میں تقلید پوری قوت سے رچ بس چکی تھی اور اُن کی فطرت مسخ ہوگئی تھی۔ اس صورت حال سے ہر دور کے داعیانِ حق اور مصلحین کو سابقہ پیش آتا ہے حتی کہ اسلامی معاشروں میں بھی یہ خرابی بڑی شدت سے موجود ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان معاشروں میں رسول اللہ ﷺ کی صدائے دعوت طاق نسیاں ہو چکی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں رسم و رواج اور تقلید کے اثرات معاشرے کی تمام جہات میں نہایت گہرے ہو جاتے ہیں اور جو لوگ رسم و رواج اور تقلید کے پنجے میں پھنس جاتے ہیں وہ نبیٔ اکرم ﷺ اور سلف صالحین کی سنت اور عقل و دانش کی بات کو اجنبی اور اچنبھے کی بات سمجھنے لگتے ہیں اور زور شور سے اس کا انکار کر دیتے ہیں۔

* اپنے قبیلے اور رشتے داروں کو تبلیغ کے خصوصی حکم سے اُس ذمہ داری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو ہر مسلمان پر عموماً اور داعیانِ دین پر خصوصاً عائد ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر یہ ذمہ داری کئی لحاظ سے عائد تھی، یعنی مکلّف ہونے کے لحاظ سے، قبیلے اور خاندان کا اہم فرد اور رشتے دار ہونے کے لحاظ سے اور نبی و رسول ہونے کے اعتبار سے۔ مکلّف ہونے کے لحاظ سے تو آپ صرف اپنی ذات کے ذمہ دار تھے لیکن رشتہ داری کے لحاظ سے اپنے تمام اہل خانہ اور پورے خاندان کو دعوت دینے کے پابند تھے اور نبی و رسول ہونے کے لحاظ سے تمام انسانوں تک دعوت پہنچانے کے ذمہ دار تھے۔ پہلی ذمہ داری میں تو ہر مکلّف آپ کے ساتھ شریک ہے، البتہ دوسری ذمہ داری میں خاندان کا ہر اہم فرد اور تیسری ذمہ داری میں تمام علماء و حکمران آپ ﷺ کے شریک و سہیم ہیں۔ [1]

[1] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص:82,81.

دعوتِ اسلام کی مخالفت

﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ ﴾ کی صدائے مقدس ابھی مکہ مکرمہ میں چاروں طرف سنائی دے رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کا ایک اور فرمان نازل ہوا:

﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) آپ کو جو حکم دیا گیا، کھول کر سنا دیں اور مشرکین سے بے رخی برتیں۔''[1]

پس رسول اللہ ﷺ کمر کس کر دعوتِ دین کے کام پر لگ گئے اور آپ نے بت پرستی کی سرعام مذمت شروع کر دی۔ بتوں کے پجاریوں پر زبردست تنقید کی، حقائقِ اسلام کی وضاحت فرمائی اور باطل عقائد کی شام و سحر بیخ کنی کرنے لگے۔ جب قریش نے دیکھا کہ یہ نئی دعوت بت پرستی کے خلاف اٹھنے والی سابقہ آوازوں کی طرح محدود اور کمزور نہیں ہے بلکہ اس کے اثرات پورے معاشرے میں پھیل چکے ہیں تو وہ آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے لوگوں کو راہِ اسلام سے روکنے کے لیے ترغیب و ترہیب کے تمام ہتھکنڈے اور وسائل استعمال کیے کیونکہ اس دعوت سے اُن کے ان مفادات پر زد پڑنے لگی جو انھیں حرم میں رہنے کی بدولت حاصل تھے۔ صدائے اسلام سے اُن کی سیادت و فضیلت ختم ہونے لگی اور اُن کے ظلم و ستم اور شہوانی کرتوتوں میں خلل پڑنے لگا۔ اب مخالفانہ ہتھکنڈوں کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے:

پہلا حربہ: ابو طالب سے شکایت

دعوتِ حق کی مخالفت کا اولین طریقِ کار انھوں نے یہ اختیار کیا کہ آپ ﷺ کے چچا

[1] الحجر 15:94.

ابوطالب پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی تاکہ وہ ڈر کر آپ ﷺ کو دعوتِ حق سے روک دیں یا آپ کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں۔ اُن کے بڑے بڑے سردار آپ ﷺ کے چچا کے پاس گئے اور کہنے لگے: ''آپ کا بھتیجا ہمارے معبودوں کو بُرا کہتا ہے، ہمارے دین کی تردید کرتا ہے، ہمیں بے وقوف بتاتا ہے اور ہمارے آباء واجداد کی نسبت کہتا ہے کہ وہ گمراہ تھے۔ آپ اُسے روک لیں ورنہ ہمیں اُس سے نبرد آزما ہونے دیں۔ آخر آپ بھی تو ہماری طرح اُس کے دین کے مخالف ہیں۔ آپ کے بجائے اُس سے ہم خود ہی نمٹ لیتے ہیں۔'' ابوطالب نے انھیں نرمی سے تسلی دی۔ احسن طریقے سے مطمئن کر دیا اور وہ لوگ واپس چلے گئے۔ [1]

دوسرا حربہ: ابوطالب کو دھمکی

رسول اللہ ﷺ اپنے طریق کار کے مطابق بدستور دعوتِ دینِ حق دیتے رہے تو قریش غضبناک ہوگئے اور آپ سے دشمنی پر اُتر آئے۔ اُن کی مجالس میں آپ ہی کا چرچا ہونے لگا۔ وہ دوبارہ اکٹھے ہوکر آپ ﷺ کے چچا کے پاس پہنچے اور سختی سے کہنے لگے: ''جناب ابوطالب! آپ عمر اور شرف کے لحاظ سے بڑا ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ہم نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ اپنے بھتیجے کو روک لیں، مگر آپ نے نہیں روکا۔ ہم قسم کھاتے ہیں کہ ہم اُسے اس کا کام نہیں کرنے دیں گے۔ آپ اُسے روک لیں بصورتِ دیگر آپ کے اور اُس کے ساتھ ہماری جنگ ہوگی۔ اتنی فیصلہ کن جنگ کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک فریق ختم ہو جائے گا۔'' بات اس حد تک پہنچی تو ابوطالب گھبرا گئے۔ اُن کے لیے اپنی قوم سے جدا ہونا اور ان کی دشمنی مول لینا بڑا مشکل تھا۔ وہ یہ بھی برداشت نہ کر سکتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو ان ظالموں کے رحم و کرم پر تنہا بے یار و مددگار

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 328/1. یہ روایت ابنِ اسحاق کی ہے اور بلاسند ہے۔

چھوڑ دیں۔[1] اس لیے انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو قوم کا پیغام سنایا اور کہا: ''بھتیجے! مجھ پر اور اپنی ذات پر رحم کرو۔ مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ میں اٹھا نہ سکوں۔''[2] ابن اسحاق کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ چچا جان میرا بوجھ اٹھانے کی سکت نہیں رکھتے، اس لیے معاً فرمایا:

«يَا عَمِّ! وَاللّٰهِ! لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِي يَمِينِي وَالْقَمَرَ فِي يَسَارِي عَلٰى أَنْ أَتْرُكَ هٰذَا الْأَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللّٰهُ أَوْ أَهْلِكَ فِيهِ، مَا تَرَكْتُهُ»

''چچا جان! اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں اور مطالبہ کریں کہ میں دین کی تبلیغ روک دوں تب بھی میں اللہ رب العزت کے دین کی دعوت دینے سے باز نہیں آؤں گا حتی کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو غالب کر دے یا میں اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دوں۔''

اس وقت شدتِ جذبات سے آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو آپ اٹھ کر چل پڑے۔ جونہی آپ نے منہ موڑ کر قدم آگے بڑھایا، چچا نے بے قرار ہو کر کہا: ''بھتیجے! واپس آؤ۔'' آپ واپس ہوئے۔ چچا نے پورے جوش و خروش سے کہا: ''بھتیجے! جاؤ جو جی میں آتا ہے کہو۔ اللہ کی قسم! میں جیتے جی تمھیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔''[3]

ابن اسحاق کی ایک دوسری روایت جو عقیل بن ابی طالب سے ہے کہ کفارِ قریش کی دھمکی کے بعد ابا جان نے مجھے رسول اللہ ﷺ کو بلانے بھیجا۔ جب آپ تشریف لائے تو

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 328/1، والسير والمغازي لابن إسحاق: 145. دونوں ماخذوں میں ابن اسحاق کی سند معلّق ہے۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 329/1. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند منقطع ہے۔ [3] السيرة النبوية لابن هشام: 330,329/1، والسير والمغازي لابن إسحاق، ص: 154. یہاں ابن اسحاق کی سند مُعْضَل ہے۔ (محدثین کی اصطلاح میں معضل وہ سند ہے جس کے دو یا دو سے زائد راوی پے در پے ساقط ہوں۔ معضل کا شمار ضعیف کی اقسام میں ہوتا ہے۔)

اباجان نے کہا: ''بھتیجے! یہ تمھاری قوم کے لوگ کہتے ہیں کہ تم انھیں ان کی مجلسوں اور بیت اللہ میں تکلیف دیتے ہو۔ بھتیجے! انھیں تکلیف مت دو۔''

رسول اللہ ﷺ نے نظر آسمان کی طرف اٹھائی اور فرمایا: ''آپ سورج کو دیکھتے ہیں؟'' وہ بولے: ''ہاں!'' آپ نے فرمایا: ''جس طرح آپ اس سے کوئی شعلہ نہیں لا سکتے، اسی طرح میں بھی اپنا کام نہیں چھوڑ سکتا۔'' ابوطالب سردارانِ قریش سے کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! میرے بھتیجے نے کبھی کوئی غلط بات نہیں کی۔ جاؤ! چلے جاؤ۔'' یہ روایت صحیح ہے۔ [1]

یہاں ایک اہم نکتہ ہے کہ قریش کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کا انتہائی محکم موقف یقیناً اللہ تعالیٰ کی وحی اور حکم کی بنا پر تھا۔ مگر حضرت ابوطالب کا موقف انتہائی تعجب انگیز ہے کہ انھیں کس چیز نے اتنا جری بنا دیا؟ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل میں آپ ﷺ کی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی، البتہ یہ محبت طبعی تھی شرعی نہیں تھی۔ اُن کا اپنی قوم کے دین پر قائم رہنا بھی اللہ تعالیٰ ہی کی عظیم حکمت پر مبنی تھا۔ اگر ابوطالب بھی مسلمان ہو جاتے تو مشرکین قریش کے نزدیک اُن کا کوئی شرف و مرتبہ باقی نہ رہتا، نہ وہ اُن سے ڈرتے، نہ اُن کا احترام کرتے بلکہ جرأت کرکے آپ ﷺ کے ساتھ بھی دست درازی اور گستاخیاں کرنے لگتے۔ ربِ عظیم جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو بہتر ہوتا ہے وہی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی طبیعت مختلف بنائی ہے۔ دونوں ابوطالب اور ابولہب آپ کے کافر چچا ہیں۔ دونوں میں سے ایک چچا (ابوطالب) تو صرف ٹخنوں تک آگ میں ہوگا [2]

[1] السیر والمغازي لابن إسحاق، ص:155. اس روایت کی سند حسن ہے۔ [2] یہ بخاری و مسلم کی اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جو عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی کہ انھوں نے پوچھا: ''اللہ کے رسول! کیا آپ نے ابوطالب کو کچھ فائدہ پہنچایا کیونکہ وہ آپ کی حفاظت کرتا اور آپ کے لیے غصے ہوتا تھا؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، وہ ٹخنوں تک آگ میں ہیں اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ آگ کے سب ◄◄

مگر دوسرا چچا (ابولہب) جہنم کے سب سے گہرے گڑھے میں ہوگا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ایک سورت اتاری جو منبر و محراب میں گونجتی ہے، وعظ اور خطبوں میں پڑھی جاتی ہے اور ابد تک پڑھی جاتی رہے گی۔

اس سورت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا اور اُس کی بیوی بھی جو ایندھن اٹھائے پھرتی ہے۔ [1]

ابوطالب زندگی بھر رسول اللہ ﷺ کے لیے کفار کے سامنے دیوار بن کر کھڑے رہے۔ انھوں نے آپ ﷺ کو گرم ہوا تک نہیں لگنے دی، البتہ علانیہ قبول اسلام سے گریزاں رہے۔ روایت ہے کہ یہ آیت اُنھی کے بارے میں اتری ہے: [2]

﴿ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ﴾

''اور وہ (دوسروں کو) اس (نبی) سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں۔'' [3]

تیسرا حربہ: جھوٹے الزامات

* کفار و مشرکین نے لوگوں کو دین اسلام سے روکنے کے لیے آپ ﷺ پر جنون کی تہمت لگائی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ۝ ﴾

''اور انھوں نے کہا: اے وہ شخص جس پر یہ ذکر نازل کیا گیا ہے! تو تو مجنون

»» سے نچلے گڑھے میں ہوتے۔'' دیکھیے: (صحیح البخاري، مناقب الأنصار، باب قصة أبي طالب، حديث: 3883، وصحيح مسلم، الإيمان، باب شفاعة النبي ﷺ لأبي طالب والتخفيف عنه بسببه، حديث: 209) [1] البداية والنهاية: 46,45/3. ہم یہ بتا چکے ہیں کہ سورۂ لہب، بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق، ابولہب ہی کے متعلق نازل ہوئی۔ [2] زاد المسير: 27/3، وتفسير الطبري: 315-311/11. [3] الأنعام 26:6.

(دیوانہ) ہے۔''[1]

اُن کی یہ بات بھی نقل فرمائی:

﴿ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝ ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو پاگل ہے۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے سورۂ قلم میں انھیں جواب دیا:

﴿ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ ﴾

''آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔''[3]

* دوسرا الزام ''جادو'' کا لگایا، اس سلسلے میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ ﴾

''ان لوگوں کو تعجب ہے کہ اُن کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آیا، اور کافروں نے کہا: یہ سخت جھوٹا جادوگر ہے۔''[4]

دوسری جگہ وضاحت فرمائی:

﴿ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ ﴾

''اور ظالموں نے کہا کہ تم تو محض ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کرتے ہو۔''[5]

ولید بن مغیرہ حیران تھا کہ قرآن مجید کے بارے میں کیا کہے۔ جب حج کا موسم قریب آیا تو اس نے اپنے گروہ کے شدید مخالفین کو اکٹھا کیا اور کہا: ''قریشیو! موسم حج آرہا ہے۔ عرب کے تمام علاقوں سے لوگ آئیں گے۔ اُن سب لوگوں نے تمھارے اس ''نبی'' کے بارے میں سب کچھ سن رکھا ہے۔ اب تم سوچو سمجھو اور اتفاق کر لو (کہ اس کے بارے میں انھیں کیا کہو گے) ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی کچھ کہتا رہے اور کوئی کچھ...... اس طرح تم خود ہی ایک دوسرے کی تکذیب کرتے رہو گے۔''...... غرضیکہ اسی موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔

[1] الحجر 15: 6. [2] القلم 68: 51. [3] القلم 68: 2. [4] صٓ 38: 4. [5] الفرقان 25: 8.

کافر لوگ یہ اعتراف کرتے رہے کہ وہ کاہن، شاعر یا جادوگر نہیں ہوسکتا۔ بالآخر انھیں اس بات پر اتفاق کرنا پڑا کہ وہ لوگوں سے کہیں گے کہ یہ جادوگر ہے کیونکہ وہ رشتے داروں میں جدائی ڈال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ولید کے بارے میں وحی نازل فرمائی:

﴿ ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۝ ﴾

''چھوڑ مجھے اور اس کو جسے میں نے اکیلا ہی پیدا کیا۔''[1]

پھر وہ ہر آنے والے حاجی کے پاس خود جاتے اور اُسے آپ ﷺ کی پیروی سے ڈراتے تھے لیکن اس کا الٹا نتیجہ نکلا۔ حاجی واپس گئے تو سارے عرب میں آپ ہی کا چرچا ہوگیا اور بہت سے لوگ حج کے دنوں ہی میں مسلمان ہونے لگے۔[2] حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔[3]

اُن کا واقعہ یوں ہے کہ وہ مکہ آئے تو کفار قریش میں سے کچھ لوگ اُن کے پاس جا پہنچے۔ حضرت طفیل نہایت عقلمند، شاعر اور سر برآوردہ شخص تھے۔ کفار کہنے لگے: ''جنابِ طفیل! آپ ہمارے شہر میں آئے ہیں۔ آپ کو مطلع کرنا ضروری ہے کہ یہاں ایک شخص ہمارے لیے مصیبت بن گیا ہے۔ اُس نے ہماری جمعیت کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔ ہم میں تفریق ڈال دی ہے۔ اُس کی باتیں جادو کا اثر رکھتی ہیں۔ وہ اپنی باتوں سے باپ بیٹے، بھائی بھائی اور خاوند بیوی کو جدا کر دیتا ہے۔ ہمیں خوف ہے مبادا وہ آپ کی قوم سے بھی ایسا سلوک کرے پس آپ اُس سے کوئی بات کریں نہ اُس کی کوئی بات سنیں۔'' وہ مسلسل

[1] المدثر 74:11۔ [2] تفسیر الطبري: 157/14. طبری کی یہ روایت ابن اسحاق کی سند سے ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے۔ ابن اسحاق نے صراحت سے بتایا کہ انھوں نے یہ روایت سنی ہے۔

[3] السیرة النبویة لابن هشام: 25/2. یہ روایت بلا سند ہے۔ سیوطی نے لکھا: ''ابن اسحاق نے اس روایت کو المغازی کے بعض نسخوں میں صالح بن کیسان از طفیل بن عمرو کی سند سے متصل بیان کیا ہے جبکہ باقی تمام نسخوں میں یہ روایت سند کے بغیر ہی ہے۔'' دیکھیے: (الخصائص الکبریٰ: 337/1)

انھیں ڈراتے رہے حتی کہ انھوں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی۔ لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جب رسولِ اکرم ﷺ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے تو انھیں آپ ﷺ کی قراءت سننے کا اتفاق ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف وہ بلکہ ان کی قوم کے بھی بہت سے افراد مسلمان ہو گئے۔

* جھوٹ بولنے کا الزام: اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ ﴾

''کافروں نے کہا: یہ بڑا جھوٹا جادوگر ہے۔'' [1]

نیز ارشاد باری ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ ﴾

''کافروں نے کہا: یہ سب جھوٹ ہے جو اس نے خود ہی گھڑ لیا ہے اور اس کام میں دوسرے لوگوں نے بھی اس کی مدد کی ہے۔'' [2]

* قصے کہانیاں گھڑنے کا الزام: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ ﴾

''انھوں نے کہا: یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو اس نے لکھوائی ہیں تو وہ پہلے اور پچھلے پہر اس پر پڑھی جاتی ہیں۔'' [3]

[1] صٓ 4:38. [2] الفرقان 4:25. ان آیات کی تفسیر کے لیے ملاحظہ کیجیے: (زاد المسیر: 73,72/6) تابعی مفسر مجاہد رحمہ اللہ نے ﴿ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ ﴾ کی تفسیر میں کہا کہ ان ''دوسرے لوگوں'' سے ان کی مراد یہود ہیں۔ مفسر مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: ''مشرکینِ مکہ کا اشارہ حُوَیطب کے آزاد کردہ غلام عداس، عامر بن حضرمی کے غلام یسار اور عامر کے آزاد کردہ غلام جبر کی طرف ہے جو تینوں اہل کتاب سے تعلق رکھتے تھے۔'' [3] الفرقان 5:25. مفسرین قرآن کا کہنا ہے کہ یہ الزام نضر بن حارث نے ◄◄

* انھوں نے یہ بھی کہا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل نہیں ہوا بلکہ یہ انسانی تخلیق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾

''اور بلاشبہ یقیناً ہم جانتے ہیں کہ وہ (کافر) کہتے ہیں: اسے تو ایک آدمی ہی سکھاتا ہے۔ اس کی زبان جس کی طرف وہ غلط نسبت کر رہے ہیں، عجمی ہے جبکہ یہ فصیح عربی زبان ہے۔''[1]

* انھوں نے مومنوں کے گمراہ ہونے کا بھی پروپیگنڈا کیا:

﴿ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۝ ﴾

''جب یہ کافر مومنین کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں بلاشبہ یہ لوگ گمراہ ہیں۔''[2]

چوتھا حربہ: مذاق، طعنہ زنی، استہزا اور تکبر

اللہ تعالیٰ نے مومنین کے ساتھ اُن کے استہزا کا ذکر یوں فرمایا ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝ ﴾

''اور اس طرح ہم نے بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ وہ (کافر انھیں دیکھ کر) کہیں: کیا ہمارے درمیان میں یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے، کیا اللہ کو خوب علم نہیں کہ کون اُس کے شکرگزار بندے ہیں؟''[3]

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک عورت نے مذاق اڑاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے کہا

«« لگایا تھا، دیکھیے: (زاد المسیر: 63/6) [1] النحل 103:16. [2] المطففین 32:83. وہ مومنین جن کے متعلق یہ پروپیگنڈہ کیا گیا، ان میں عمار، بلال اور خباب رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں، دیکھیے: (زادالمسیر: 60/9) [3] الأنعام 53:6.

تھا: ”مجھے امید ہے کہ تیرا شیطان (جن) تجھے چھوڑ گیا ہے کیونکہ میں دیکھتی ہوں وہ دو تین دن سے تیرے پاس نہیں آیا۔“ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں:

﴿وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝﴾

”چاشت کے وقت کی قسم! اور رات کی جب وہ اچھی طرح چھا جائے! تیرے رب نے نہ تجھے چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔“[1]

صحیح بخاری کی ایک اور روایت میں ہے کہ ابوجہل نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا: ”اے اللہ! اگر یہ (قرآن) حقیقتاً تیری طرف سے آیا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب نازل کر۔“ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾

”اور اللہ ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے جبکہ آپ ان کے اندر (موجود) ہوں، اور اللہ انھیں عذاب دینے والا نہیں جبکہ وہ استغفار کرتے ہوں۔ اور انھیں کیا ہے کہ اللہ انھیں عذاب نہ دے جبکہ وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں؟“[2]

ابن اسحاق نے اِراشی کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اُس سے ابوجہل نے اونٹ خریدا تھا لیکن قیمت دینے سے ٹال مٹول کرنے لگا۔ اُس نے قریش سے مدد مانگی تو انھوں نے ازراہِ مذاق اُسے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیج دیا کہ وہ تجھے انصاف دلائیں گے، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ابوجہل آپ ﷺ کا جانی دشمن ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب وہ غریب شکایت لے کر آپ کی خدمت میں پہنچا تو آپ اُس کے ساتھ چل پڑے۔ ابوجہل کے گھر پہنچے اور اُس کا حق اُسے دلایا۔ بعد کو قریش نے ابوجہل سے پوچھا کہ تو نے اتنی آسانی سے قیمت

[1] الضحیٰ 93:1-3. صحيح البخاري، التفسير، باب قوله: ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى﴾، حديث: 4950. [2] الأنفال 8:32-34. صحيح البخاري، التفسير، باب قوله: ﴿وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ﴾، حديث: 4648.

کیوں دے دی؟ ہم تو تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔

وہ کہنے لگا: ''تم سب کا ستیاناس ہو! اللہ کی قسم! جونہی انھوں نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور میں نے محمد ﷺ کی آواز سنی تو میں مرعوب ہو گیا۔ میں باہر نکلا تو میں نے ان کے سر سے اوپر ایک زبردست نر اونٹ دیکھا۔ میں نے اتنا بڑا سر، اتنی موٹی گردن اور اتنے خوفناک دانت کسی بڑے سے بڑے اونٹ کے بھی نہیں دیکھے۔ اگر میں قیمت دینے سے انکار کرتا تو وہ اونٹ مجھے کچا چبا جاتا۔''[1]

کافروں کے ہنسی مذاق اور اشارے کنائے کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ۝ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ۝ وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ۝﴾

''بلاشبہ مجرم لوگ ایمان والوں پر ہنسا کرتے تھے، اور جب وہ اُن (مسلمانوں) کے پاس سے گزرتے تھے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے اور جب اپنے اہل و عیال کے پاس لوٹتے تو دل لگی کرتے لوٹتے۔''[2]

صحیح سندوں سے ثابت ہے کہ قریشی سردار ایک دن حطیم میں بیٹھے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دین کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک رسول اللہ ﷺ طواف کے لیے تشریف لے آئے۔ آپ اُن کے پاس سے گزرے تو وہ باتوں باتوں میں آپ پر طنز کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا:

«يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ! أَمَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِالذَّبْحِ»

''قریشیو! قسم اُس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں تمھارے پاس ذبح (کا حکم) لے کر آیا ہوں۔''

---

[1] السِّيَر والمغازي لابن إسحاق: 195، 196. اس روایت کی سند منقطع ہے۔ [2] المطففين 83:29-31.

آپ کے یہ الفاظ سن کر وہ خوفزدہ ہو گئے۔ [1]

یہ بھی مشرکین کے تکبر اور استہزا ہی کا مظاہرہ تھا کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا: ''ہم صہیب، بلال اور خباب جیسے لوگوں کی موجودگی میں آپ کے پاس نہیں بیٹھ سکتے۔ انھیں اپنے پاس سے اٹھا دیں۔'' آپ ﷺ نے اس امید میں کہ شاید اس طرح یہ اور دوسرے قریشی مسلمان ہو جائیں ایسا کرنے کا ارادہ فرما بھی لیا مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: [2]

﴿ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ط...... ﴾

''(اے نبی مکرم!) ان لوگوں کو دور نہ ہٹاؤ جو اپنے رب کو پہلے اور پچھلے پہر پکارتے ہیں، وہ اس کا چہرہ چاہتے ہیں......۔'' [3]

ایک دن رسول اللہ ﷺ چند سردارانِ قریش کے پاس سے گزرے۔ انھوں نے آپ پر طنز کی۔ آپ کا دل بہت رنجیدہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے بطور تسلی یہ آیت نازل فرمائی: [4]

﴿ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ﴾

''اور یقیناً آپ سے پہلے بھی رسولوں سے استہزا کیا گیا تھا، پھر ان لوگوں کو جنھوں نے ان (رسولوں) سے استہزا کیا تھا، اس (عذاب) نے گھیر لیا جس کا وہ

[1] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 227/11. محدّث احمد شاکر نے اس روایت کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ والمصنَّف لا بن أبي شيبة: 297/14، و السيرة النبوية لابن هشام: 358/1. ابن اسحاق نے اس روایت کو بسند حسن بیان کیا ہے۔ [2] تفسير الطبري: 374/11-388. امام طبری نے اس حوالے سے نقل کی گئی روایات جمع کی ہیں جن کی تحقیق و تخریج محدث احمد شاکر نے کی۔ اس ضمن میں ہم نے جو کچھ نقل کیا وہ روایت نمبر 13258 کا مضمون ہے جس کی سند صحیح ہے۔ [3] الأنعام 52:6. [4] السيرة النبوية لابن هشام: 42/2. یہ روایت ابن اسحاق کی بلاغات میں سے ہے۔ مفسرین نے اس آیت کی کوئی خاص شان نزول بیان نہیں کی۔

استہزا کرتے تھے۔''[1]

مذاق اور استہزا کرنے والے نمایاں لوگ یہ تھے: اسود بن عبدالمطلب بن اسد[2]، اسود بن عبد یغوث بن وہب زہری، ولید بن مغیرہ مخزومی، عاص بن وائل سہمی[3] اور حارث بن طلاطلہ خزاعی۔[4] ابونعیم کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں یہ آیت اتاری:[5]

﴿إِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ﴾

''بلاشبہ ہم استہزا کرنے والوں کے مقابلے میں آپ کو کافی ہیں۔''[6]

روایت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے اسود بن عبدالمطلب کے چہرے پر ایک سبز پتا مارا جس سے وہ اندھا ہوگیا۔ اسود بن عبد یغوث کا وہاں سے گزر ہوا تو جبریل علیہ السلام نے اُس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا تو اُسے استسقا کی بیماری لگ گئی اور وہ اسی بیماری سے مرگیا۔[7] ولید بن مغیرہ گزرا تو جبریل نے اُس کے پاؤں کے ٹخنے کے نیچے ایک زخم کی طرف اشارہ کیا۔ یہ زخم اُسے دو سال قبل لگا تھا۔ اشارے سے وہ زخم پھوٹ پڑا اور اس کی

---

[1] الأنعام 10:6. [2] دلائل النبوة لأبي نعيم: 268/1، 57/2. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے اور ابونعیم کی سند حسن مرسل ہے۔ [3] السيرة النبوية لابن هشام: 438/1. [4] دلائل النبوة لأبي نعيم: 268/1. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے اور ابونعیم کی سند حسن مرسل ہے۔ [5] دلائل النبوّة لأبي نعيم: 268/1. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے اور ابونعیم کی سند حسن مرسل ہے۔ والسير والمغازي لابن إسحاق، ص: 196,195. سند منقطع ہے۔ [6] الحجر 95:15. [7] سیرت نگار شامی نے اپنی کتاب میں اسود بن عبد یغوث، جو رسول اللہ ﷺ کا ماموں زاد تھا، کے قصے کے متعلق لکھا کہ یہ طبرانی، بیہقی اور ضیاء مقدسی کی روایت ہے جس کی سند صحیح ہے۔ انھوں نے مزید لکھا: ''اور ابن ابی حاتم اور بلاذری نے صحیح سند کے ساتھ عکرمہ سے روایت کی کہ جبریل علیہ السلام نے اسود کی کمر کو اتنا مروڑا کہ اس کے سینے کی ہڈیاں ٹیڑھی ہو گئیں، اس پر رسول اللہ ﷺ پکار اٹھے: '' میرا ماموں، میرا ماموں۔'' جبریل نے کہا: '' محمد! اسے چھوڑ دیجیے، اپنے سے علیحدہ کر لیجیے، آپ کو اس کی طرف سے بے فکر کر دیا گیا ہے۔'' دیکھیے: (سبل الهدى والرشاد: 606/2، وأنساب الأشراف: 132/1)

موت کا سبب بن گیا۔ عاص بن وائل گزرا تو اُس کے پاؤں کے تلوے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اپنے گدھے پر سوار ہو کر طائف جانے لگا، گدھا راستے میں نرم گھاس پر بیٹھ گیا تو اس کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ گیا جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ حارث بن طلاطلہ کا گزر ہوا تو اس کے سر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے سر میں پیپ پڑ گئی جس سے وہ جہنم رسید ہوگیا۔[1]

؎ خس کم جہاں پاک۔

ولید بن مغیرہ کہا کرتا تھا: ''تعجب کی بات ہے، وحی محمد ﷺ پر اترتی ہے مجھ پر نہیں، حالانکہ قریش کا بزرگ اور سردار میں ہوں۔ ابو مسعود عمرو بن عمیر ثقفی پر نہیں اترتی جو ثقیف کا سردار ہے۔ ان دونوں بستیوں کے سردار تو ہم ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلے میں وحی نازل فرمائی:

﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ○﴾

''انھوں نے کہا: یہ قرآن ان دونوں بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اتارا گیا؟''[2]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 59,58/2. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے، اس کی سند کے راوی ثقہ ہیں، ابن اسحاق نے صراحت سے یہ بتایا تو ہے کہ انھوں نے یہ روایت سنی تھی لیکن یہ سند مرسل ہے۔ محدث ذہبی نے اپنی کتاب میں ثوری کی حدیث کو صحیح قرار دیا جو انھوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے ابن اسحاق کی سند کے علاوہ ایک دوسری سند سے روایت کی ہے، دیکھیے: (تاریخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 224/1) بیہقی کی سند کے رجال سوائے ابن رزین کے ثقہ ہیں۔ ابن رزین صدوق راوی ہے۔ بایں ہمہ اس سند کے ذریعے سے روایت کی گئی حدیث کو بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے، دیکھیے: (السنن الكبرىٰ للبيهقي: 8/9) شامی نے لکھا: ''اس حدیث کی سند میں ایک راوی حارث بن قیس سہمی ابن عنطلہ ہے جو باپ کے بجائے اپنی ماں کی طرف منسوب ہے۔'' دیکھیے: (سبل الهدىٰ والرشاد: 606/2) [2] الزّخرف 31:43.

ویسے ان دو آدمیوں کے تعین میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ [1]

مذاق و استہزا کرنے والے بڑے کفار و مشرکین میں ابوجہل، امیہ بن خلف، نضر بن حارث، اخنس بن شریق اور ابی بن خلف بھی شامل ہیں۔ [2]

پانچواں حربہ: تشویش میں ڈالنا اور پریشان کرنا

مشرکین ایک دوسرے کو آمادہ کرتے تھے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو زور زور سے چیخیں مارو اور شور وغل کرو تاکہ قرآن سنا ہی نہ جا سکے، یعنی ایسا نہ ہو کہ کوئی روشن دماغ اور پاکیزہ دل شخص قرآن سے متاثر ہو جائے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ۝ ﴾

”اور کافروں نے کہا کہ اس قرآن کو مت سنو اور اس (کی قراءت کے دوران) میں (خواہ مخواہ کا) شور شرابا کرو شاید کہ اس طرح تم غالب آ جاؤ۔“ [3]

چھٹا حربہ: معجزات اور مافوق البشر صلاحیتوں کا مطالبہ

کفار مکہ کہا کرتے تھے:

[1] تفسیر ابن کثیر: 213,212/7. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 1/437-447، ودلائل النبوة للبيهقي: 2/316-318. یہ روایت سعید بن جبیر کی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے۔ امام سیوطی نے اپنی کتاب میں لکھا: ”اس کو طبرانی نے اپنی کتاب الاوسط میں اور ابن مردویہ نے بسند حسن روایت کیا ہے۔ ضیاء مقدسی نے بھی اپنی کتاب حدیث المختارة میں اسے روایت کیا ہے۔“ دیکھیے: (تفسیر الدرالمنثور: 107/4) ابن جریر طبری نے اس روایت کو سعید بن جبیر کے حوالے سے مرسل سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ابن عباس کی حدیث کے متعلق محدث ہیثمی کا کہنا ہے: ”اسے طبرانی نے الاوسط میں روایت کیا ہے۔ اس میں ایک راوی محمد بن عبدالحکیم نیشاپوری ہے جسے میں نہیں جانتا، باقی راوی ثقہ ہیں، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 47/7، وصحيح السيرة للألباني، ص: 222) [3] حمٓ السجدة 26:41.

﴿مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ﴾

''اس رسول کو کیا ہے کہ کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ اس کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہ نازل کیا گیا کہ وہ اس کے ساتھ ڈرانے والا ہوتا؟ یا اس پر کوئی خزانہ اتارا جاتا، یا اس کا کوئی باغ ہوتا جس میں سے وہ (پھل) کھاتا۔'' [1]

﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ﴾

''اور جب ان پر ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، کہنے لگتے ہیں: اس کے بجائے کوئی اور قرآن ہمارے پاس لاؤ یا اسے بدل دو۔'' [2]

اللہ تعالیٰ نے اسی آیت میں انھیں جواب دیا:

﴿قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝﴾

''(اے نبیِ مکرم!) کہہ دو: میرے لائق نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اُسی چیز کا اتباع کروں گا جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔'' [3]

اور انھوں نے کہا:

﴿وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَاۗءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ

[1] الفرقان 25:8,7۔ [2] یونس 10:15۔ [3] یونس 10:15۔

اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ط وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ط﴾

’’اور انھوں نے کہا: ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتی کہ تو ہمارے لیے زمین سے ایک چشمہ جاری کر دے۔ یا تیرا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، پھر تو اس کے درمیان جا بجا نہریں جاری کر دے۔ یا تو جیسا کہ تو نے دعویٰ کیا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے، یا اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آ، یا تیرا سونے کا ایک گھر ہو، یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور ہم تیرے چڑھ جانے پر بھی ایمان نہیں لائیں گے حتی کہ تو ہم پر ایک کتاب اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔‘‘[1]

اس کا جواب اسی آیت میں ہے:

﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ○﴾

’’(نبیِ مکرم!) آپ کہہ دیں: میرا رب پاک ہے، میں تو ایک بشر (اور) رسول ہوں۔ جب بھی لوگوں کے پاس ہدایت آئی، انھیں ایمان لانے سے صرف اس بات نے منع کیا کہ انھوں نے کہا: کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟‘‘[2]

انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ مکہ کے پہاڑوں کو چلا دیں اور زمین ہموار کر دیں تاکہ ہم یہاں کاشت کاری کر سکیں اور ہمارے فوت شدہ آباء و اجداد، مثلاً: قصی کو زندہ کر دیں تاکہ اُن سے محمد (ﷺ) کی باتوں کی تصدیق کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب ارشاد فرمایا:[3]

﴿وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ط بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ط﴾

---

[1] بني إسرآءيل 17:90-93. [2] بني إسرآءيل 17:93،94. [3] تفسير الطبري (تحقيق أحمد شاكر): 16/446-450.

''اور اگر واقعی کوئی ایسا قرآن ہوتا جس کے ذریعے سے پہاڑ چلائے جاتے یا اس کے ذریعے سے زمین قطع کی جاتی، یا اس کے ذریعے سے مُردوں سے کلام کیا جاتا (تو بھی وہ ایمان نہ لاتے) بلکہ اللہ ہی کے لیے سارا اختیار ہے۔''[1]

یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر ان میں سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ دراصل اُن کے یہ مطالبات ضد وعناد کی بنا پر تھے۔ اُن کا مقصود رشد و ہدایت حاصل کرنا نہیں تھا۔ اس لیے اُن کے اس قسم کے اکثر مطالبات پورے نہیں کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○﴾

''اور انھوں نے اللہ کے نام کی بڑی مضبوط قسمیں کھائیں (کہ) اگر اُن کے پاس کوئی نشانی (معجزہ) آجائے تو وہ اس پر ضرور ضرور ایمان لے آئیں گے۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: نشانیاں تو صرف اللہ کے پاس ہیں اور تمھیں کون سمجھائے کہ یہ (نشانی) جب آجائے گی تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''[2]

﴿وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰۗئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ○﴾

''اور اگر بلاشبہ ہم ان کی طرف فرشتے نازل کرتے اور مردے ان سے کلام کرتے اور ہم ہر چیز کو ان کے سامنے لا اکٹھا کرتے تو بھی وہ (ایسے) نہیں تھے کہ ایمان لے آتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، اور لیکن ان کے اکثر جہالت سے کام لیتے ہیں۔''[3]

اور فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ﴾

''اور ہمیں منع نہیں کیا (اس سے) کہ ہم نشانیاں بھیجیں مگر (اس بات نے) کہ

[1] الرعد 13:31. [2] الأنعام 6: 109و111. [3] الأنعام 6:111.

پہلے لوگوں نے انھیں جھٹلایا تھا۔''[1]

امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث بیان کی ہے کہ مکہ والوں نے رسول اللہ ﷺ سے مطالبہ کیا تھا کہ آپ صفا کو سونے کا پہاڑ بنا دیں اور ارد گرد کے پہاڑوں کو کھسکا کر دور دور کر دیں تاکہ یہاں کاشتکاری ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو کہا گیا: ''آپ چاہیں تو مزید انتظار کریں اور چاہیں تو ان کا مطالبہ پورا کر دیں۔ لیکن اگر انھوں نے مطالبہ پورا ہونے کے باوجود بھی کفر کیا تو یہ لوگ اسی طرح ملیامیٹ کر دیے جائیں گے جیسے پہلی قومیں کی گئیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! میں مزید انتظار کر لیتا ہوں۔'' اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی:

﴿وَمَا مَنَعَنَآ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ‌ؕ وَاٰتَيۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَةَ مُبۡصِرَةً فَظَلَمُوۡا بِهَا‌ ؕ ......﴾

''اور ہمیں منع نہیں کیا (اس سے) کہ ہم نشانیاں بھیجیں مگر (اس بات نے) کہ پہلے لوگوں نے انھیں جھٹلایا تھا اور ہم نے ثمود کو اونٹنی واضح نشانی کے طور پر دی تو انھوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا......''[2]

یہ بھی روایت ہے کہ انھوں نے آپ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ ایک مخصوص پہاڑ کو سونا بنا دیں تاکہ وہ اُسے کاٹ کاٹ کر سونا لاتے رہیں اور انھیں موسم سرما و گرما کے تجارتی سفر کی ضرورت نہ رہے۔[3] اسی طرح انھوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ہمیں کوئی معجزہ دکھائیں۔

[1] بنيٓ إسرآء يل 59:17. [2] بنيٓ إسرآء يل 59:17. الفتح الرّباني: 223,222/20. امام احمد نے اس حدیث کو دو سندوں سے روایت کیا ہے جس کے بارے میں ابن کثیر نے لکھا: ''یہ دونوں سندیں جید ہیں۔'' دیکھیے: (البداية والنهاية: 57/3) حاکم نے کہا: ''یہ حدیث صحیح مسلم کی شرط کے مطابق ہے مگر شیخین نے روایت نہیں کیا جبکہ ذہبی نے بھی اسے برقرار رکھا ہے۔'' شامی نے کہا ہے کہ ضیاء مقدسی نے بھی اسے اپنی صحیح میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (سبل الهدٰى والرشاد: 458/2)
[3] سبل الهدٰى والرّشاد: 457/2. شامی کا کہنا ہے کہ یہ روایت ابو یعلیٰ اور ابو نعیم کی ہے جو انھوں ◄◄

آپ ﷺ نے انھیں چاند دو ٹکڑے کر دکھایا۔ [1]

ساتواں حربہ: سودے بازی

دراصل قریش کا مقصد یہ تھا کہ اسلام اور جاہلیت آپس میں گڈ مڈ ہو جائیں۔ مشرکین اپنی بعض باتیں چھوڑ دیں اور نبیِ کریم ﷺ بھی اپنی کچھ باتوں سے دست بردار ہو جائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ۝﴾

''انھوں نے چاہا، کاش! آپ کچھ نرمی کریں تو وہ بھی نرمی اختیار کر لیں۔'' [2]

اسی سلسلے میں انھوں نے یہ پیشکش کی کہ ایک دن آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کیا کریں اور ایک دن ہم آپ کے معبود کی عبادت کیا کریں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ کافرون نازل فرمائی:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۝ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ ۝ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۝﴾

''کہو: اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ میں اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے۔'' [3]

اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس فضول سودے بازی اور بھاؤ تاؤ کا قصہ ہی تمام کر دیا۔

«« نے زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما کے حوالے سے نقل کی ہے۔ [1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب انشقاق القمر، حديث: 3868، وصحيح مسلم، صفات المنافقين وأحكامهم، باب انشقاق القمر، حديث: 2802. [2] القلم 68:9. [3] الكٰفرون 109:1-6.

ان لوگوں نے آپ ﷺ کے چچا کے ساتھ بھی ایسی ہی سودے بازی کی کوشش کی تھی اور یہ پیشکش کی تھی کہ ہم ولید بن مغیرہ کا بیٹا عمارہ آپ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ آپ اُس کے بدلے محمد ﷺ ہمارے سپرد کر دیں، پھر ہم جانیں اور ہمارا کام۔ [1]

جب ابوطالب بیمار ہوئے اور قریش کو اُن کی شدت مرض کا پتہ چلا تو آپس میں کہنے لگے: ''حمزہ اور عمر دونوں مسلمان ہو چکے ہیں اور محمد کا دین تمام قریشی قبائل میں پھیل چکا ہے۔ آؤ ابوطالب کے پاس چلیں اور اُن سے کہیں کہ محمد کے ساتھ ہمارا معاہدہ کروا دیں۔ اللہ کی قسم! ہمیں خطرہ ہے کہیں مسلمان ہمارے دین پر غالب نہ آ جائیں۔'' جب اُن کا وفد ابوطالب کے پاس پہنچا اور اُن سے بات چیت کی تو حضرت ابوطالب نے نبیِ اکرم ﷺ سے کہا: ''بھتیجے! یہ تیری قوم کے سردار آئے بیٹھے ہیں تاکہ تجھ سے کچھ لیں اور کچھ دیں (تجھ سے معاہدہ کریں۔)''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جی ہاں۔ یہ لوگ صرف ایک کلمہ مجھے دے دیں اس کے ذریعے سے یہ پورے عرب کے بادشاہ بن جائیں گے اور سارے عجم ان کے مطیع ہو جائیں گے۔''

ایک دوسری روایت میں ہے: ''اس کے ذریعے سے عرب ان کے ماتحت ہو جائیں گے اور عجم ان کو جزیہ دیا کریں گے۔''

وہ لوگ آپ کی بات سن کر حیران پریشان ہو گئے۔ کہنے لگے: ''صرف ایک کلمہ؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں صرف ایک کلمہ۔'' ابوجہل کہنے لگا: ''ہاں! تمھارے باپ کی قسم! دس کلمے لے لو۔'' آپ نے فرمایا: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه کہہ دو اور اللہ کے سوا اپنے تمام معبودوں سے دست بردار ہو جاؤ۔'' وہ حیرت سے ہاتھ بجانے لگے، پھر کہنے لگے: ''اے محمد! تم ہمارے تمام معبودوں کی بجائے صرف ایک معبود بنانے لگے ہو۔ یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔''

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 330/1. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جو سند کے بغیر ہے۔

پھر وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے: ''یہ شخص تمھیں تمھارے مطلب کی کوئی چیز نہیں دے گا۔ اٹھو اور اپنے دین پر جمے رہو حتی کہ اللہ تعالیٰ ہی تمھارے اور اس کے درمیان کوئی فیصلہ فرما دے۔'' پھر وہ اٹھ کر چلے گئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے بارے میں سورۂ صٓ کی ابتدائی آیات نازل کیں۔ [1]

آٹھواں حربہ: گالی گلوچ

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''جب آیت: ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا﴾ اتری تو رسول اللہ ﷺ چھپ چھپ کر تبلیغ کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کو کبھی اونچی آواز سے نماز پڑھاتے تو مشرکین قرآن، اسے اتارنے والے اور اسے لانے والے سب کو گالیاں دیتے۔ اس صورت حال پر اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے فرمایا: ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ﴾ ''اور اپنی نماز (قراءت) کے ساتھ آواز بلند مت کرو۔'' کہ مشرکین سن کر گالیاں دیں، ﴿وَلَا تُخَافِتْ بِهَا﴾ ''اور نہ اس (قراءت) کے ساتھ آواز بہت آہستہ کرو۔'' مبادا آپ کے ساتھیوں کو سنائی نہ دے۔ ﴿وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا﴾ ''اور اس کے درمیان کوئی راستہ تلاش کرو۔'' [2]

مؤرخ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں زیادہ بلند آہنگی سے قراءت کرتے تو کافر ادھر ادھر کھسک جاتے اور قرآن سننے سے انکار کر دیتے، البتہ اگر کوئی شخص نماز میں آپ ﷺ کی قراءت سننے کا خواہش مند ہوتا تو وہ دیگر مشرکین سے ڈرتے ڈرتے اور چھپ چھپ کر سنتا تھا۔ اگر اُسے معلوم ہو جاتا کہ کفار کو پتہ چل گیا ہے تو وہ اُن کی سزا کے ڈر سے ادھر ادھر چھپ جاتا اور آپ کی قراءت نہ سن پاتا۔ جب آپ آہستہ

[1] مسند أحمد: 3/314،315. [2] صحيح البخاري، التفسير، باب: ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ﴾، حديث: 4722.

قراءت کرتے اور چھپ کر قراءت سننے والا سمجھتا کہ آپ کی قراءت صرف میں ہی سن رہا ہوں اور دوسرے نہیں سن سکتے تو پھر وہ پوری توجہ سے آپ ﷺ کی قراءت سنتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:[1] ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ﴾ ''اور اپنی نماز کے ساتھ آواز بلند مت کرو۔'' کہ وہ اٹھ کر چلے جائیں ﴿وَلَا تُخَافِتْ بِهَا﴾ ''اور نہ اس (قراءت) کے ساتھ آواز بہت آہستہ کرو۔'' کہ قصداً سننے والا شخص بھی نہ سن سکے۔ ﴿وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا﴾ ''اور اس کے درمیان کوئی راستہ اختیار کرو۔''[2]

جب مسلمان کفار کے بتوں کو برا کہتے تو مشرکین ضد میں آ کر جہالت سے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدس کو برا کہنے لگتے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم اتارا:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾

''اور ان کو گالی مت دو جنھیں وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، تب وہ بغیر علم کے حد سے گزرتے ہوئے اللہ کو گالی دیں گے۔''[3]

[1] السیر والمغازي لابن إسحاق: ص:206. اس روایت کی سند ضعیف ہے۔ داود بن حصین، عکرمہ سے روایت کرنے میں ضعیف ہے۔ [2] بنيّ إسرآءيل 17:110. [3] الأنعام 6:108. امام طبری نے اس آیت کی شانِ نزول کے متعلق کئی روایات نقل کی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت طبری کی اپنی سند سے ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما تک پہنچتی ہے۔ دو روایات قتادہ کے حوالے سے دو مختلف اور مرسل سندوں سے منقول ہیں۔ ان کے علاوہ سُدّی کے حوالے سے ایک مرسل روایت ہے۔ قتادہ کی دونوں مرسل روایات ضعیف ہیں کیونکہ انھوں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے سوا کسی صحابی سے حدیث نہیں سنی۔ سدی کی روایت اس لیے ضعیف ہے کہ ایک تو محدثین نے اس پر تنقید کی ہے۔ دوسرے وہ ابن عباس اور انس رضی اللہ عنہم جیسے صغار صحابہ سے روایت کرتا ہے اور اس کا شمار صغار تابعین میں ہوتا ہے۔ تفسیر قرآن کے اعتبار سے وہ سند سب سے بڑھ کر قابل اعتماد اور بہترین ہے جس میں معاویہ بن صالح، علی بن ابی طلحہ سے اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کریں، دیکھیے: (تفسیر الطبري (تحقیق أحمد شاکر): 35-33/12) صحاح ستہ کے مؤلفین نے اپنی کتابوں میں تفسیر قرآن کے متعلق روایات نقل کرتے ہوئے اسی سند پر اعتماد کیا ہے، دیکھیے: (التفسیر والمفسرون للذھبي: 78,77/1)

مشرکین کے معبودوں کو برا کہنا اگرچہ درست تھا مگر اس سے اس لیے روک دیا گیا کہ اس کے نتیجے میں ایک بڑی خرابی واقع ہو رہی تھی کہ مشرکین معبودِ برحق کو گالیاں دیتے تھے۔ [1]

بڑی خرابی سے بچنے کے لیے ایک جائز چیز کو چھوڑ دینا شریعت کا مسلمہ اصول ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مِنَ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ»

''آدمی کا اپنے والدین کو گالی بکنا گناہِ کبیرہ ہے۔''

حاضرین نے عرض کی: ''اللہ کے رسول! بھلا کوئی اپنے والدین کو بھی گالی بکتا ہے؟'' فرمایا:

«نَعَمْ يَسُبُّ أَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ أَبَاهُ، وَيَسُبُّ أُمَّهُ، فَيَسُبُّ أُمَّهُ»

''ہاں، ایک شخص کسی کے باپ کو گالی بکے گا تو وہ اس کے باپ کو گالی بکے گا۔ یہ اس کی ماں کو گالی بکے گا تو وہ اس کی ماں کو گالی بکے گا۔'' [2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: ''اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تیری قوم کا دور کفر حال ہی میں گزرا ہے تو میں کعبے کی عمارت گرا کر اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر تعمیر کرتا۔'' [3]

اسی حدیث کی بنا پر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کعبہ کو ابراہیمی بنیادوں کے مطابق تعمیر کر دیا تھا۔

نواں حربہ: یہودیوں سے رابطہ اور سوالات

قریش نے اپنے کچھ لوگ نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کی سرکردگی میں

[1] تفسير ابن كثير: 306/3. [2] صحيح مسلم، الإيمان، باب الكبائروأكبرها، حديث: 90، وتفسير ابن كثير: 308/3. [3] صحيح البخاري، الحج، باب فضل مكة وبنيانها......، حديث: 1586، وصحيح مسلم، الحج، باب نقض الكعبة و بنائها، حديث: 1333.

مدینہ منورہ بھیجے تاکہ وہ یہودیوں سے مل کر ایسے سوالات سیکھ کر آئیں جن کا جواب رسول اللہ ﷺ نہ دے سکیں۔ یہودیوں نے کہا: ''تم اُن سے اصحابِ کہف، ذوالقرنین اور روح کے بارے میں سوالات پوچھو۔'' لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کی یہ تدبیر بھی ناکام کر دی اور ان سوالات کے بارے میں بذریعہ وحی آپ ﷺ کو صحیح جوابات سے آگاہ کر دیا۔ [1]

دسواں حربہ: ترغیبات (لالچ)

قریش نے فیصلہ کیا کہ ترغیب کا طریقہ بھی اختیار کیا جائے۔ انھوں نے ایک سردار عتبہ بن ربیعہ کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا۔ وہ آ کر کہنے لگا: ''بھتیجے! تو نسب کے لحاظ سے بڑا عالی مرتبت ہے لیکن تو نے ایک نیا دین پیش کر کے قوم میں تفریق ڈال دی ہے۔ غور سے سن۔ میں تجھے چند چیزوں کی پیشکش کرتا ہوں شاید اُن میں سے کوئی ایک تیرے لیے قابلِ قبول ہو۔ اگر تو اپنی تحریک کے ذریعے سے مال حاصل کرنا چاہتا ہے تو ہم بخوشی تجھے اتنا مال جمع کر دیتے ہیں کہ تو ہم سب سے زیادہ مالدار ہو جائے گا۔ اگر تو سرداری کا منصب چاہتا ہے تو ہم تجھے اپنا سربراہ مان لیتے ہیں۔ ہم تجھ سے پوچھے بغیر کوئی معاملہ طے نہیں کریں گے۔ اگر تو بادشاہت چاہتا ہے تو ہم تجھے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیتے ہیں۔ اگر تجھے کوئی دماغی عارضہ ہے جس کے آگے تو بے بس ہے تو ہم تیرا علاج کرا دیتے ہیں،

[1] الفتح الرّباني: 18/196،197. اس روایت کی سند صحیح ہے۔ وجامع الترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة بني إسرآئيل ، حديث: 3140،3141. اس روایت میں سوال صرف روح کے متعلق کیا گیا ہے۔ بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر، اور ابن منذر نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے جب روح کے متعلق پوچھا تھا تو اس وقت آپ مدینہ میں تھے اور اسی سوال کے متعلق سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر: 85 نازل ہوئی تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جو جامع ترمذی نے نقل کی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے درمیان یہ کہہ کر تطبیق دی گئی ہے کہ اس آیت کی شان نزول ایک سے زائد ہیں۔

چاہے اس کام میں کتنا ہی مال خرچ کرنا پڑے۔ ہم سارا خرچ برداشت کریں گے۔''

جب عتبہ اپنی بات ختم کر چکا تو رسول اللہ ﷺ نے سورۂ حم السجدہ کے آغاز سے لے کر آیت نمبر 13 تک تلاوت فرمائی۔ قومِ عاد وثمود پر تباہی والی آیات سن کر عتبہ نے اپنا ہاتھ اپنے پہلو پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے قوم عاد وثمود والی کڑک ابھی اس پر آنے والی ہے۔ قریش کے پاس پہنچا اور بولا: ''جو کچھ میں نے سنا ہے، وہ شعر ہے نہ جادو نہ کہانت۔ میں تم سے اپیل کرتا ہوں کہ محمد کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔''[1] بیہقی، ابن ابی شیبہ اور ابن حمید نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ زائد الفاظ بھی بیان کیے ہیں: ''اگر تجھے شہوت کا مسئلہ درپیش ہے تو قریش کے جن خاندانوں میں سے تو پسند کرے ہم تجھ سے دس عورتوں کی شادی کر دیں گے۔'' اور ایک روایت میں ہے کہ ولید بن مغیرہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ جب آپ نے اُسے قرآن سنایا تو وہ بہت متاثر ہوا۔ ابوجہل کو پتہ چلا تو وہ ولید کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''چچا! تمھاری قوم کے لوگ پروگرام بنا رہے ہیں کہ تمھارے لیے چندہ جمع کریں۔'' اُس نے پوچھا: ''کیوں؟'' وہ کہنے لگا: ''تمھیں دینے کے لیے کیونکہ سنا ہے تم محمد کے پاس گئے تھے تاکہ اسے ایسی پیشکش کرو کہ وہ فوراً راضی ہو جائے۔'' ولید بن مغیرہ نے آپ ﷺ سے جو کچھ سنا تھا اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! اس کی باتوں میں بڑی حلاوت وطراوت ہے۔ اُس کے کلام کا بالائی حصہ پھل دینے والا ہے اور زیریں حصہ تروتازہ ہے۔ وہ ہر چیز پر

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 1/363,362. ابن اسحاق نے یہ روایت بیان کی اور اس کی سند منقطع ہے۔ محدث عبد بن حمید نے بھی یہ روایت نقل کی ہے، دیکھیے: (المنتخب من مسند عبد بن حميد (تحقيق السامرائي والصعيدي)، ص: 337، حديث: 1123) محدث البانی نے اس روایت کی سند کو حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (فقه السيرة للغزالي، ص: 113) ابن اسحاق کی سند کے متعلق البانی کا کہنا ہے کہ وہ حسن مرسل ہے۔

غالب ہے اور ہر شے کو زیر و زبر کرنے والا ہے۔" [1]

گیارھواں حربہ: دھمکیاں اور تشدد

ابوجہل جب سنتا کہ فلاں شخص مسلمان ہوگیا ہے، اگر وہ طاقت اور عزت والا ہوتا تو اُسے ملامت کرتا، اُس کی بے عزتی کرتا اور کہتا: "تو نے اپنے باپ کا دین چھوڑ دیا ہے، حالانکہ تیرا باپ تجھ سے بہتر تھا، ہم تجھے پاگل سمجھتے ہیں، تیری رائے کو ہیچ سمجھتے اور تیرے عزوشرف کو تسلیم نہیں کرتے۔" اگر وہ تاجر ہوتا تو اُسے کہتا: "ہم تیری تجارت ناکام بنا دیں گے اور تیرا مال تباہ کر دیں گے۔" اور اگر کمزور اور کم مرتبہ شخص ہوتا تو ابوجہل اُسے مارتا اور لوگوں کو اُس کے خلاف بھڑکاتا تھا۔ [2]

مسلمانوں پر تشدد

رسول اللہ ﷺ پر تشدد

جب مشرکین مکہ کے تمام حربے بے کار ثابت ہوئے اور رسول اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام کو دینِ اسلام کی تبلیغ سے نہ روک سکے تو انھوں نے جسمانی تشدد کا حربہ اختیار کر لیا۔ علانیہ تبلیغ کے دور میں جب رسول اللہ ﷺ نے شعائرِ دینیہ کا اظہار شروع کر دیا اور نماز

[1] امام حاکم نے اسے متصل سند سے روایت کیا اور کہا: "اس حدیث کی سند بخاری کی شرط کے مطابق صحیح ہے اور بخاری و مسلم دونوں نے اسے نقل نہیں کیا۔" دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 507,506/2) بیہقی نے یہ حدیث حاکم کی سند کے علاوہ دیگر مرسل سندوں کے ذریعے سے نقل کی ہے۔ انھوں نے روایت کی تمام سندیں نقل کرنے کے بعد لکھا: "یہ سندیں ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔" دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 199,198/2) [2] السيرة النبوية لابن هشام: 395/1. ابن اسحاق نے اس روایت کو معلق سند سے بیان کیا ہے۔

کعبہ کے پاس پڑھنا شروع کر دی تو قریش کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو تکلیف دینے کی انتہا کر دی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''ایک دفعہ ابوجہل اپنے ساتھیوں سے پوچھنے لگا: ''کیا محمد تمھاری موجودگی میں بیت اللہ کے پاس عبادت کرتا ہے؟'' وہ بولے: ''ہاں۔'' ابوجہل کہنے لگا: ''لات وعزیٰ کی قسم! اگر میں نے اُسے ایسا کرتے دیکھا تو میں اس کی گردن اپنے پاؤں سے مسل ڈالوں گا یا اس کا چہرہ مٹی سے آلودہ کر دوں گا۔'' ایک دن آپ نماز پڑھ رہے تھے کہ وہ آ گیا۔ وہ آپ کی گردن پر پاؤں رکھنے کی نیت سے آگے بڑھا لیکن اچانک وہ ہاتھ آگے بڑھائے اُلٹے پاؤں واپس بھاگنے لگا۔ اُس سے پوچھا گیا: ''تجھے کیا ہوا؟'' کہنے لگا: ''واللہ! میرے اور اُس کے درمیان آگ کی خندق بھڑک اُٹھی تھی جو انتہائی ہولناک تھی اور فرشتے پر مار رہے تھے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! اگر وہ میرے قریب آ جاتا تو فرشتے اُس کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝ اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۝ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۝ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ۝ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ۝ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝ كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝ ﴾

''ہرگز نہیں! بلاشبہ انسان تو سرکشی پر اتر آتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے کہ غنی ہو گیا ہے۔ یقیناً تیرے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے۔ ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ کیا تو نے دیکھا اگر وہ ہدایت پر ہو یا اس نے پرہیزگاری کا حکم دیا ہو۔ کیا تو نے دیکھا اگر اس نے جھٹلایا اور روگردانی کی تو کیا اس نے یہ نہ جانا یقیناً اللہ دیکھ رہا ہے، ہرگز نہیں! اگر

وہ باز نہ آیا تو ہم ضرور (اُسے) پیشانی کے بالوں سے (پکڑ کر) گھسیٹیں گے، پیشانی کے ان بالوں کے ساتھ جو جھوٹے خطا کار ہیں۔ پس وہ اپنی مجلس کو بلالے۔ ہم عنقریب جہنم کے فرشتوں کو بلالیں گے۔ ہرگز نہیں! اُس کی اطاعت نہ کرو اور سجدہ کرو اور (اللہ تعالیٰ کا) قرب حاصل کرو۔'' [1]

امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت عروہ بن زبیر رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ مشرکین مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدترین سلوک کیا کیا تھا؟'' وہ فرمانے لگے: ''میں نے دیکھا کہ عقبہ بن ابی معیط نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ اُس نے اپنی چادر آپ کی گردن مبارک میں ڈال کر بل دینے شروع کر دیے اور آپ کا گلا بہت زیادہ گھونٹ دیا۔ اتنے میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آ گئے۔ انھوں نے اُسے دھکا دے کر دور کیا اور فرمایا:

﴿ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ﴾

''کیا تم ایک شخص کو محض اس لیے قتل کرنے کے درپے ہو کہ وہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے اور وہ تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس کھلے دلائل و براہین لے کر آیا ہے؟'' [2]

---

[1] العلق 96:6-19. صحيح مسلم، صفات المنافقين وأحكامهم، باب قوله: ﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝﴾، حديث: 2797. امام بخاری نے اس حدیث کو اختصار کے ساتھ روایت کیا ہے، دیکھیے: (صحيح البخاري، التفسير، حديث:4958) [2] المؤمن40:28. صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب قول النبي ﷺ: «لو كنت متخذًا خليلًا......»، حديث: 3678. مؤرخ شامی نے لکھا: ''ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عقبہ بن ابی معیط کے لیے بددعا کرنے کا سبب یہ تھا کہ آپ نے فرمایا: ''وہ اس کا انکار کرتا ہے جو قریب ہوا اور اتر آیا تو وہ دو کمانوں کے بقدر (قریب) ہو گیا بلکہ (اس سے بھی) زیادہ قریب۔'' یہ الفاظ ہبار کی روایت کے ہیں۔ طاؤس اور ابوالضحیٰ کی روایت جو ان سے ابونعیم نے نقل کی ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں: ''وہ ربِّ نجم کا انکار کرتا ««

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسولِ اکرم ﷺ بیت اللہ کے قریب نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل اپنے ساتھیوں سمیت بیٹھا ہوا تھا۔ ایک دن قبل ایک اونٹنی ذبح کی گئی تھی۔ ابوجہل کہنے لگا: ”تم میں سے کون ہمت کرے گا کہ بنوفلاں کی ذبح شدہ اونٹنی کی جیر اٹھا لائے اور جب محمد سجدے میں جائے تو اس کے کندھوں پر لاد دے۔“ قریش میں سے ایک انتہائی بدبخت شخص (عقبہ بن ابی معیط) اٹھ کھڑا ہوا اور وہ جیر اٹھا لایا۔ جب آپ ﷺ سجدے میں گئے تو اُس نے وہ جیر آپ کے کندھوں کے درمیان رکھ دی، پھر وہ بدبخت خوب ہنسے، وہ قہقہے لگاتے لگاتے ایک دوسرے پر گرتے تھے۔ میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ کاش! مجھ میں قوت ہوتی کہ میں رسولِ اکرم ﷺ کے کندھوں سے وہ گندگی اتار دیتا۔

نبیِ کریم ﷺ سجدے کی حالت ہی میں رہے۔ سر نہیں اٹھایا حتی کہ ایک شخص گیا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خبر دی۔ اس وقت وہ نوعمر لڑکی تھیں، بھاگتی ہوئی آئیں۔ انھوں نے آپ ﷺ کے کندھوں سے گندگی اتاری اور اُن ظالموں کو شرم دلانے لگیں۔ جب نبیِ کریم ﷺ نے نماز مکمل کر لی تو بلند آواز سے نام لے کر اُن کے خلاف بددعا کی۔ قسم اس ذات کی جس نے حضرت محمد ﷺ کو سچا نبی بنایا! میں نے اُن تمام لوگوں کو، جن کے خلاف آپ نے بددعا فرمائی تھی، بدر کے دن دیکھا وہ قتل ہو کر گرے پڑے تھے۔ ان کی متعفن لاشیں گھسیٹ گھسیٹ کر بدر کے ایک کچے کنویں میں پھینک دی گئیں۔ [1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ مسند ابویعلی اور مسند بزار میں صحیح سند کے ساتھ

◄◄ ہے۔“ دیکھیے: (سبل الهدٰی والرشاد: 10/740) [1] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب الدّعاء على المشركين بالهزيمة والزلزلة، حديث: 2934، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب مالقي النبي ﷺ من أذى المشركين والمنافقين، حديث: 1794.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''ایک دفعہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو اتنا مارا کہ آپ بے ہوش ہو گئے۔ ابوبکر آئے انھیں لعن طعن کی، فرمایا: ''تم تباہ و برباد ہو جاؤ! کیا تم ایک شخص کو محض اس لیے قتل کر رہے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟'' انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو تو چھوڑ دیا مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑے۔''[1]

ایک دفعہ عتیبہ بن ابی لہب رسول اللہ ﷺ سے ہاتھا پائی کرنے لگا۔ اُس نے آپ کی قمیص پھاڑ دی اور آپ کے مقدس چہرے پر تھوکا مگر اس ناپاک کا تھوک آپ تک نہ پہنچ سکا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے بد دعا کی:

«اَللّٰهُمَّ! سَلِّطْ عَلَيْهِ كَلْبًا مِّنْ كِلَابِكَ»

''اے اللہ! اپنے پیدا کردہ کتوں میں سے کوئی وحشی کتا اس پر مسلط فرما دے۔''

آپ ﷺ کی دعا قبول ہوئی۔ وہ شام کے علاقے زرقا میں تھا کہ اُسے ایک درندے نے چیر پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

ابولہب کی بیوی، ابوسفیان کی بہن، ام جمیل اروٰی (یا عورا) بنت حرب آپ ﷺ کو مارنے کے لیے پتھر اٹھائے پھرتی رہی مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اُس کے ناپاک ہاتھوں سے محفوظ رکھا۔[2] وہ آپ کے راستے میں بچھانے کے لیے کانٹے دار لکڑیاں اکٹھی کر کے لایا کرتی تھی۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم کی سورۂ لہب میں بیان فرمائی ہے۔

مسند احمد کی روایت ہے کہ ایک دفعہ قریش کے بڑے سردار حطیم میں اکٹھے ہوئے اور لات، عزّیٰ، تیسری گھٹیا منات، نائلہ اور اساف کی قسم کھائی اور باہم عہد کیا کہ اگر ہم نے محمد کو (بیت اللہ کے قریب عبادت کرتے) دیکھ لیا تو ہم سب ایک دم اُس پر ٹوٹ پڑیں گے اور جب تک وہ مر نہ جائے، اُسے نہیں چھوڑیں گے۔ آپ ﷺ کی صاحبزادی

[1] فتح الباري: 11/15، حديث: 3856، ومسند أبي يعلٰى، حديث: 3691. [2] دلائل النبوة للبيهقي: 196/2. اس روایت کی سند حسن لغیرہ ہے کیونکہ یہ ایک دوسری روایت سے تقویت حاصل کرتی ہے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو اُن کے اس ناپاک معاہدے سے مطلع کیا۔ آپ تشریف لے گئے اور مٹھی بھر مٹی اُن پر پھینک دی۔ جس کسی پر اُس مٹی کا ایک ذرہ بھی پڑ گیا وہ جنگ بدر کے دن کفر کی حالت میں قتل ہوا۔ [1]

امام احمد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ ایک دن حضرت جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ آپ غمگین بیٹھے تھے۔ خون سے آپ کا جسم رنگین تھا۔ مکہ کے کسی نابکار شخص نے آپ کو مارا تھا۔ حضرت جبریل نے پوچھا: ''آپ کو کیا ہوا؟'' فرمایا: ''میرے ساتھ ان لوگوں نے یہ سلوک کیا۔'' جبریل علیہ السلام نے کہا: ''آپ فرمائیں تو میں آپ کو ایک معجزہ دکھاؤں؟'' فرمایا: «نَعَمْ!» ''ہاں!'' انھوں نے وادی سے پرے ایک درخت کو دیکھا اور آپ سے کہا: ''اس درخت کو بلائیے۔'' آپ نے بلایا تو وہ درخت چل پڑا اور آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ جبریل کہنے لگے: ''اسے حکم دیجیے واپس چلا جائے۔'' آپ نے واپس جانے کا حکم دیا تو وہ واپس اپنی جگہ پہنچ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «حَسْبِي» ''مجھے یہ کافی ہے۔'' [2]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اکثر جسمانی تشدد اور گستاخیاں آپ کے چچا حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد کی گئیں۔ [3]

قریشی صحابۂ کرام پر تشدد

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ انھوں نے اپنا دین بچانے کے لیے حبشہ کو ہجرت کر جانے کی ٹھانی۔ [4] ایک دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسجد حرام میں تقریر کرنے لگے تو

[1] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 269/4. محدث احمد شاکر کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ [2] الفتح الربّاني: 221,220/20. ساعاتی نے کہا: ''میری معلومات کی حد تک امام احمد کے علاوہ اس حدیث کو کسی نے روایت نہیں کیا جبکہ اس کے راوی صحیحین کے راوی ہیں۔'' [3] البداية والنّهاية: 148/3. [4] صحيح البخاري، الكفالة، باب جوار أبي بكر في عهد رسول الله ﷺ ◄◄

مشرکین نے ان کو بہت زدوکوب کیا۔ اُنھیں مارنے والوں میں عتبہ بن ربیعہ بھی شامل تھا۔ وہ ان کے چہرۂ مبارک پر اپنے جوتے مارتا رہا۔ اس قدر مارا کہ آپ کے ناک نقشے کی پہچان دشوار ہوگئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قوم بنوتیم کے لوگوں کو پتا چلا تو وہ بھاگتے ہوئے آئے۔ انھیں دیکھ کر مشرکین نے ابوبکر کو چھوڑ دیا اور دوڑ لگا دی۔ بنوتیم نے آپ کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر اٹھایا اور گھر لائے۔ ایسا لگتا تھا کہ آپ بچ نہ سکیں گے۔ پورے قبیلے نے قسم کھائی کہ اگر ابوبکر مر گئے تو ہر حال میں عتبہ بن ربیعہ کو قتل کر ڈالیں گے۔ [1]

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مکہ مکرمہ میں بلند آواز سے قرآن پڑھنے والے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ مسلمانوں نے انھیں تنبیہ بھی کی کہ بلند آہنگی سے قرآن پڑھنے کی صورت میں مشرکین آپ پر تشدد کریں گے۔ انھوں نے بلند آواز سے قرآن پڑھنا شروع کیا تو مشرکین اُن پر پل پڑے۔ ان کا چہرہ زخمی کر دیا۔ دوسرے صحابہ نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا: ''ہمیں اسی بات کا خطرہ تھا'' تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''اب تو مجھے اللہ کے یہ دشمن بہت ہی ذلیل وحقیر معلوم ہوتے ہیں۔ اگر تم اجازت دو تو میں کل کو بھی اسی طرح قرآن پڑھوں گا۔'' صحابہ کہنے لگے: ''ہرگز نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے۔ آپ نے اُن کو وہ پیغام سنا دیا جو وہ سننا نہیں چاہتے تھے۔'' [2]

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا چچا انھیں کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائی میں لپیٹ دیتا تھا، پھر نیچے سے آگ کا دھواں چھوڑتا اور اُن کے نتھنوں میں ڈالتا تھا۔ [3] روایت ہے کہ جب وہ مسلمان ہوئے تو اُن کے چچا حکم بن ابی العاص بن امیہ نے انھیں پکڑ کر

◄◄ وعقدہ، حدیث: 2297. [1] البداية والنهاية: 34,33/3. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 389,388/1. ابن اسحاق نے اس قصے کو حسن مرسل سند سے روایت کیا ہے جو عروہ بن زبیر پر موقوف ہے۔ [3] رحمة للعالمين: 52/1. سید منصور پوری کے ماخذ کا ہمیں علم نہیں ہوسکا کہ انھوں نے یہ روایت کہاں سے نقل کی ہے۔

باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک تو اسلام نہیں چھوڑے گا میں تجھے نہیں کھولوں گا۔ حضرت عثمان نے بھی قسم کھائی کہ میں ہرگز اسلام نہیں چھوڑوں گا۔ جب چچا نے دیکھا کہ یہ تو اپنے دین پر بہت پکا ہے تو انھیں چھوڑ دیا۔[1]

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی والدہ کو اُن کے اسلام لانے کا پتہ چلا تو اُس نے اُن کا کھانا بند کر دیا اور گھر سے نکال دیا۔ یہ بہت ناز و نعمت میں پلے تھے۔ بھوک اور موسمی شدائد کی وجہ سے ان کی جلد سوکھ کر یوں چٹخنے لگی جیسے سانپ کی کھال سوکھ کر اترنے لگتی ہے۔ وہ اس قدر کمزور ہو گئے کہ اُن کے ساتھی انھیں اپنی کمانوں پر اٹھا کر لائے۔[2]

جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو مشرکین اُن پر ٹوٹ پڑے۔ اگر اللہ تعالیٰ انھیں عاص بن وائل کی حمایت و پناہ مہیا نہ فرماتا تو وہ انھیں قتل ہی کر دیتے۔[3]

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بھی قبول اسلام کی پاداش میں مبتلائے تشدد ہوئے۔ روایت ہے کہ جب وہ حبشہ کی ہجرت سے واپس آئے تو ولید بن مغیرہ کی پناہ میں آگئے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مشرکین دوسرے مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بناتے ہیں اور میں آرام سے رہ رہا ہوں تو انھوں نے ولید کی پناہ کالعدم کر دی اور خوشی خوشی تکالیف برداشت کیں۔ مشہور شاعر لبید بن ربیعہ مکہ آیا۔ اس نے قریش کی ایک مجلس میں اپنا کلام سنایا۔ جب اس نے پڑھا: «أَلَا! كُلُّ شَيْءٍ مَّاخَلَا اللّٰهَ بَاطِلُ» ''خبردار! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز فانی ہے۔'' تو عثمان بن مظعون نے فرمایا: ''بالکل سچ ہے۔'' جب اس نے اگلا مصرعہ پڑھا «وَكُلُّ نَعِيمٍ لَّا مَحَالَةَ زَائِلُ» ''اور ہر نعمت لازماً زائل ہو جائے گی۔''

[1] الطبقات الكبرٰى: 55/3. یہ روایت واقدی کی ہے۔ [2] السير والمغازي لابن إسحاق، ص: 193. اس روایت کی سند معضل ہے جس کا شمار ضعیف روایت کی اقسام میں ہوتا ہے۔ [3] یہ روایت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعے میں تفصیل سے بیان کی جائے گی۔ اس کی سند حسن ہے اور یہ ابن اسحاق کی روایت ہے۔

تو عثمان کہنے لگے: ''یہ جھوٹ ہے۔ جنت کی نعمتیں کبھی ختم نہیں ہونگی۔'' لبید کہنے لگا: ''قریشیو! اس سے پہلے تو تمھارے ہاں مہمان کی توہین نہیں کی جاتی تھی۔ یہ نیا رواج تم میں کب سے شروع ہوا؟'' ایک آدمی کہنے لگا: ''یہ اور اس جیسے چند دوسرے بے وقوف ہمارے دین سے نکل چکے ہیں۔آپ اس کی بات کا بُرا نہ مانیے۔'' حضرت عثمان نے بھی اُسے سخت جواب دیا تو بات بڑھ گئی۔ وہ آدمی اٹھا اور حضرت عثمان کی آنکھ پر تھپڑ مارا۔ اُن کی آنکھ پر نیل پڑ گیا۔ ولید بن مغیرہ قریب بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا: ''بھتیجے! اللہ کی قسم! تیری آنکھ کو یہ تکلیف ہرگز نہیں پہنچ سکتی تھی۔تو مضبوط پناہ میں تھا۔'' عثمان کہنے لگے: ''واللہ! میری تو دوسری آنکھ بھی آرزو مند ہے کہ اُسے بھی اللہ کے راستے میں ایسی ہی تکلیف پہنچے۔ جنابِ ابوعبدشمس! میں آپ سے کہیں زیادہ قوی اور قدیر ذات کی پناہ میں ہوں۔'' ولید کہنے لگا: ''بھتیجے! چاہو تو دوبارہ میری پناہ میں آجاؤ۔'' عثمان نے کہا: ''نہیں۔'' [1]

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو اُن کا چچا طیش میں آ گیا۔ وہ اُنھیں چٹائی میں باندھ کر لٹکا دیتا، نیچے سے آگ کا دھواں چھوڑتا اور کہتا: ''دوبارہ کافر بن جا۔'' حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کہتے: ''ہرگز نہیں۔ میں کفر کے قریب بھی نہیں بھٹکوں گا۔'' [2]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 2/10-12. ابن اسحاق نے اسے منقطع سند سے بیان کیا ہے۔ بیہقی نے یہ روایت موسیٰ بن عقبہ کی سند سے نقل کی ہے۔ ابن عقبہ نے یہ نہیں بتایا کہ ان سے یہ روایت کس نے بیان کی، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 2/292،293، والمعجم الكبير للطبراني: 9/21-24) طبرانی کی سند مرسل ہے جو عروہ تک پہنچتی ہے۔اس سند میں ابن لہیعہ بھی ہے۔ ہیثمی نے یہ روایت طبرانی سے نقل کی ہے، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 6/32-34) اس کی تمام سندیں ضعیف ہیں۔ [2] المستدرك للحاكم: 3/360. حاکم و ذہبی دونوں نے اس روایت کی سند کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے۔اس کی سند میں ابواسود ہے جو عن سے روایت کر رہا ہے، پھر یہ سند مرسل بھی ہے اور عروہ تک پہنچتی ہے۔ وحلية الأولياء لأبي نعيم: 1/89. ابونعیم کی سند بھی مرسل ہے، »

حضرت سلمہ بن ہشام رضی اللہ عنہ جب حبشہ سے واپس آئے تو اُن کے بھائی ابوجہل نے انھیں قید کر دیا۔ کھانا پینا بھی روک دیا۔ وہ بے چارے بڑی مشکل سے نکل بھاگے۔ غزوۂ خندق کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ [1] یہ بھی اُن مظلومین میں شامل تھے جن کی رہائی کے لیے رسول اللہ ﷺ قنوت میں دعا فرمایا کرتے تھے۔ [2]

مکہ سے باہر مسلمان ہونے والوں پر تشدد

جسمانی تشدد صرف مکہ کے مسلمانوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ مکہ سے دور رہنے والے قبائل میں سے بھی اگر کوئی مسلمان ہو جاتا تو اُسے تشدد کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ مؤرخ ابن سعد کی روایت ہے کہ جب حضرت اُم شریک غزیہ بنت جابر بن حکیم رضی اللہ عنہا اپنے خاوند کے ساتھ مسلمان ہو گئیں اور اُن کا خاوند ابو عِکر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور اپنی قوم کے دوسرے افراد کے ساتھ [illegible] منورہ ہجرت کر گیا تو اس کے رشتہ دار حضرت ام شریک کے پاس آئے اور پوچھا: ''[illegible] بھی اپنے خاوند کے دین پر ہے؟'' انھوں نے اعتراف کیا کہ میں بھی مسلمان ہو چکی ہوں۔ انھوں نے قسم کھائی کہ اگر تو دین اسلام نہ چھوڑے گی تو تجھے سخت عذاب دیں گے۔ وہ نہ مانی۔ جب وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئے تو اُسے انتہائی شریر اور اڑیل جانور پر سوار کیا، پھر انھوں نے اسے روٹی اور شہد کھلایا لیکن پانی نہ پینے دیا اور کڑی دھوپ میں لا کھڑا کیا حتی کہ اُس کی عقل جواب دے گئی۔ آنکھوں اور کانوں نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا۔ یہ عمل انھوں نے تین دن دہرایا۔ تیسرے دن انھوں نے اُس سے پھر دین اسلام چھوڑنے کا مطالبہ کیا لیکن وہ نہ مانی بلکہ اپنی انگلی سے آسمان

◄◄ تاہم اس کے راوی ثقہ ہیں۔ [1] الطبقات الکبریٰ: 130/4. یہ ابن اسحاق اور واقدی کی روایت ہے۔ ابن سعد نے اس کی سند نہیں درج کی۔ [2] صحیح البخاري، التفسیر، باب: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ﴾، حدیث: 4560، والطبقات الکبریٰ: 130/4. اس روایت کے متعلق ابن سعد کی سندیں صحیح ہیں۔

کی طرف توحید، یعنی اللہ کے ایک ہونے کا اشارہ کیا۔ اس محترم خاتون پر بے ہوشی اور تھکاوٹ طاری ہونے کی وجہ سے اُس کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اُس پر کرم فرمایا اور پانی کا ایک ڈول بھیج دیا جس سے اُس نے اپنی پیاس بجھائی۔ یہ واقعہ دیکھ کر اُس کے خاوند کے رشتہ دار بھی مسلمان ہوگئے اور انھوں نے بھی نبی کریم ﷺ کی طرف ہجرت کی۔ [1]

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ مکہ میں ایک شخص نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو وہ مکہ مکرمہ آئے اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق پوچھ گچھ کرنے لگے۔ مکہ والوں نے انھیں اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہوگئے اور مرنے کے قریب پہنچ گئے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے انھیں ظالموں سے چھڑایا۔ [2] اُن کے اسلام لانے کا واقعہ امام مسلم، امام احمد، ابونعیم اور امام حاکم نے تفصیل سے روایت کیا ہے۔ اس واقعے میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت ابوذر وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں جیسا سلام کہا: «اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ» رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا: «وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ» [3]

[1] یہ واقدی کی روایت ہے جو متروک ہے، اس بنا پر یہ سند نہایت ضعیف ہے۔ [2] یہ بخاری و مسلم کی ایک روایت کا اقتباس ہے جس میں ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، دیکھیے: (صحيح البخاري، المناقب، باب قصة أبي ذرّ الغفاري رضی اللہ عنہ، حديث: 3522، وصحيح مسلم، فضائل الصّحابة، باب من فضائل أبي ذرّ رضی اللہ عنہ، حديث: 2474) [3] صحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل أبي ذرّ رضی اللہ عنہ، حديث: 2473، ومسند أحمد: 175,174/5. موسوعہ حدیثیہ کے محققین کا کہنا ہے کہ اس روایت کی سند مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔ ودلائل النبوّة لأبي نعيم: 256-253/1، حديث: 197، والمستدرك للحاكم: 351-339/3. حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ احمد کی روایت کے الفاظ ہیں: «عَلَيْكَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ»

غلاموں پر تشدد

کفار نے اسلام اور مسلمانوں سے بغض کی وجہ سے اسلام قبول کرنے والے غلاموں پر زبردست تشدد کیا کیونکہ اُن بے چاروں کی کوئی حمایت کرنے والا نہیں تھا، چنانچہ انھیں انتہائی سنگین عذاب میں مبتلا ہونا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے ان مظلوموں کو معذور قرار دیا کہ جب اُن پر ظلم کی انتہا ہو جائے تو وہ کچھ بھی کہہ کر اپنی جان چھڑا سکتے ہیں۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: ''کیا مشرکین صحابۂ کرام کو اس قدر عذاب میں ڈالتے تھے کہ اُن کو ترکِ دین تک معذور قرار دیا گیا؟'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''ہاں، اللہ کی قسم! وہ اُن کو اتنا مارتے اور اس قدر بھوکا پیاسا رکھتے تھے کہ وہ بے چارے سیدھے بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے اور اُن کو کفار کا مطالبہ پورا کرنا پڑتا تھا حتی کہ وہ انھیں کہتے: ''کیا لات وعزیٰ، اللہ کی بجائے تیرے معبود ہیں؟'' انھیں مجبوراً کہنا پڑتا ''ہاں'' تاکہ وہ اُن کے ظلم سے جان چھڑا سکیں۔''[1] علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا: ''انھی حالات کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم اتارا:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○﴾

''جو اللہ کے ساتھ اپنے ایمان لانے کے بعد کفر کرے، سوائے اُس کے جسے مجبور کر دیا گیا ہو جبکہ اُس کا دل ایمان پر مطمئن ہو، لیکن جو کھلے دل سے کفر کرے تو ان پر اللہ کا بڑا غضب ہوگا اور اُن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''[2]

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اسلام کا اعلان

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 396/1. اس سند میں حکیم بن جبیر ہے جو ضعیف ہے جیسا کہ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی کہا، دیکھیے: (التقريب، ص: 176) [2] النحل 106:16، البداية والنهاية: 65/3.

کیا وہ سات تھے۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، عمار، اُن کی والدہ سمیہ، صہیب، بلال اور مقداد رضی اللہ عنہم۔ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کا سامان تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے چچا کے ذریعے سے کر دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی قوم کی وجہ سے محفوظ رہے۔ باقی بے چاروں کو مشرکین نے پکڑ لیا، انھیں لوہے کی قمیصیں پہنائیں اور اُن کی چربی کو دھوپ میں پگھلایا گیا۔ اِن میں سے ہر ایک کو مجبوراً اُن کا مطالبہ ماننا پڑا، البتہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اُن کی بات نہیں مانی اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنی جان کی کوئی پروا نہیں کی۔ قریش بھی اُن کی پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ انھیں پکڑ کر بچوں کے سپرد کر دیتے۔ بچے اُنھیں مکہ کی پہاڑی گھاٹیوں میں گھسیٹتے پھرتے اور بلال رضی اللہ عنہ لگاتار أَحَد أَحَد پکارتے رہتے تھے۔''[1]

بجرمِ عشق تو می کشند غوغائیست!

تو نیز بر سربام آکہ خوش تماشائیست

مکہ میں تشدد کا نشانہ بننے والے مشہور غلام

آل یاسر: یہ خاندان تاریخ اسلام میں بدترین تشدد برداشت کرنے والے مظلومین میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا۔ بنومخزوم تپتی دوپہر میں ان بے چاروں کو نکال کر لے جاتے اور مکہ کے آگ بنے ہوئے پتھروں پر لٹا کر انھیں ہولناک تشدد کا نشانہ بناتے۔[2]

ایک دن رسول اللہ ﷺ ان کے پاس سے گزرے، اُس وقت اُن پر تشدد کیا جا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

[1] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 319/5. احمد شاکر کا کہنا ہے کہ اس روایت کی سند صحیح ہے۔

[2] السيرة النبوية لابن هشام: 395/1. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے اور بلاسند ہے۔ آل یاسر کو پانی میں غوطے دینے کا واقعہ ابن سیرین کی روایت سے منقول ہے، دیکھیے: (السير والمغازي لابن إسحاق، ص: 192)

«أَبْشِرُوا آلَ عَمَّارٍ وَّ آلَ يَاسِرٍ! فَإِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةُ»

''آل عمار اور آل یاسر! خوش ہو جاؤ کہ تمھارا ٹھکانا جنت ہے۔''[1]

اس خاندان سے خصوصاً اور اہل اسلام میں سے عموماً سب سے پہلی شہید ہونے والی شخصیت حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت سمیہ بن خباط رضی اللہ عنہا تھیں۔ ابوجہل لعین نے اُن کی شرمگاہ میں نیزہ یا برچھا مارا۔ اس شرمناک ظلم کے نتیجے میں وہ شہید ہوگئیں۔[2]

اُن کے شوہر حضرت یاسر رضی اللہ عنہ بھی کافروں کا عذاب سہتے سہتے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کے بیٹے عبداللہ بن یاسر کو تیر مار کر شہید کر دیا گیا۔[3]

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو مختلف طریقوں سے تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور انھیں کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اکثر مفسرین نے مندرجہ ذیل آیت کا سبب نزول حضرت عمار کو پیش آنے والی اسی صورتحال کو بتایا ہے۔[4]

[1] المستدرك للحاكم: 388/3. حاکم کا کہنا ہے کہ یہ حدیث مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے جبکہ بخاری و مسلم نے اسے نقل نہیں کیا۔ ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے۔ [2] مسند أحمد: 404/1. یہ مجاہد تابعی کی مرسل روایت ہے۔ [3] الإصابة: 648/3. حافظ ابن حجر نے یہ روایت نقل کر کے ابن کلبی کا حوالہ دیا ہے۔ [4] مفسر ابن الجوزی نے اس امر کے متعلق چار مختلف اقوال بیان کیے ہیں کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کی بابت نازل ہوئی، دیکھیے: (زاد المسير: 495/4) ابن جریر طبری نے ایک روایت درج کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمار رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''تم اپنے دل کو کیسا پاتے ہو؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ایمان پر مطمئن۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: ''اگر وہ دوبارہ ایسا کریں تو تم بھی دوبارہ ایسا کہو۔'' البانی نے اس روایت کو مرسل ہونے کی بنا پر ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن انھوں نے اس آیت کی شانِ نزول عمار رضی اللہ عنہ کو پیش آنے والی صورتحال کو بتانا صحیح قرار دیا ہے کیونکہ یہ امر کئی سندوں سے، جنھیں ابن جریر نے درج کیا ہے، پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے، دیکھیے: (حاشية فقه السيرة للغزالي، ص: 108) حافظ ابن حجر نے لکھا: ''عمار عرب اور عنسی تھے۔ انھیں بیرون عرب سے قیدی یا غلام بنا کر نہیں لایا گیا تھا۔ دراصل بات ◄◄

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾

''جو شخص اللہ کے ساتھ کفر کرے اپنے ایمان کے بعد، سوائے اس کے جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔''[1]

حضرت بلال رضی اللہ عنہ: حضرت بلال رضی اللہ عنہ بنو جُمح کے ایک شخص کے غلام تھے۔ ان کے والد کا نام رَباح اور والدہ کا نام حمامہ ہے۔ مشہور قول یہ ہے کہ وہ حبشی تھے جبکہ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ وہ نوبی تھے۔[2]

وہ بڑے پاکیزہ دل اور سچے مومن تھے۔ ان کا آقا امیہ بن خلف تپتی دوپہر میں انھیں وادیٔ مکہ کے جُھلسانے والے پتھروں پر چت لٹا دیتا اور ایک بھاری پتھر ان کے سینے پر رکھ دیتا۔ اور کہتا: تجھے اسی طرح تڑپا تڑپا کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ اپنی خیریت چاہتا ہے تو محمد کو چھوڑ دے اور لات و عزیٰ کی عبادت پھر سے شروع کر دے۔ لیکن وہ اس خوفناک تکلیف میں بھی أَحَد أَحَد ہی پکارتے رہتے تھے۔[3]

◄◄ یہ ہے کہ عمار کے والد یاسر نے بنی مخزوم سے حلیفانہ معاہدہ کر کے مکہ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ مخزوم نے یاسر کی شادی اپنی آزاد کردہ لونڈی سمیہ سے کر دی جن کے بطن سے عمار پیدا ہوئے۔ خیال ہے کہ مشرکین مکہ کا عمار کے ساتھ قیدیوں کا سا سلوک کرنے کی بڑی وجہ یہی تھی کہ ان کی والدہ سمیہ کا شمار بنی مخزوم کے موالی (آزاد کردہ غلاموں) میں ہوتا تھا۔'' دیکھیے: (فتح الباري: 281/9) ابن اسحاق لکھتے ہیں: ''واقعہ یہ ہے کہ یاسر بنی اشجع کی ایک شاخ بنی بکر کے غلام تھے۔ مخزوم نے انھیں خریدا اور ان کی شادی سمیہ سے کر دی جن کے بطن سے عمار نے جنم لیا۔ سمیہ مخزوم کی لونڈی تھیں۔ بعد میں انھوں نے سمیہ اور عمار دونوں کو آزاد کر دیا تھا۔'' دیکھیے: (السیر والمغازي لابن إسحاق: 192) [1] النحل 106:16. [2] فتح الباري: 248/14. بلال رضی اللہ عنہ کا شمار ان غلاموں میں ہوتا ہے جنھیں دور جاہلیت میں بیرونِ عرب سے لایا گیا تھا۔ [3] السيرة النبوية لابن هشام: 392/1. ابن اسحاق کی یہ روایت بلاسند ہے۔ اس کی تائید ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے جس کا ذکر پچھلے صفحات میں گزرا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ورقہ بن نوفل بلال رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے جبکہ ◄◄

بلاذری نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''میں ایک دفعہ بلال کے پاس سے گزرا، انھیں اذیت دی جا رہی تھی۔ گرمی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ اگر گوشت کا ٹکڑا اُن تپتے ہوئے پتھروں پر رکھ دیا جاتا تو وہ بھی بھن جاتا لیکن بلال مسلسل کہہ رہے تھے: ''میں لات وعزیٰ کو رب ماننے سے انکار کرتا ہوں۔'' اُمیہ کو اور زیادہ غصہ آ رہا تھا اور وہ انھیں بڑھ چڑھ کر پیٹ رہا تھا۔ وہ اُن کے پاس جاتا اور ان کے حلق پر تان کر مکہ مارتا، وہ بے ہوش ہو جاتے، پھر ہوش آتا تو ان کے ہونٹوں سے أَحَدٌ، أَحَدٌ ہی کا نعرۂ اُلفت بلند ہوتا تھا۔'' [1]

بلاذری نے حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ مشرکین حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی گردن میں رسی ڈال دیتے تھے اور بچوں سے کہتے تھے کہ اسے لے جاؤ اور مکہ کے پہاڑوں کے درمیان گھسیٹتے پھرو۔ بچے اسی طرح کرتے مگر بلال أَحَد، أَحَد پکارتے چلے جاتے تھے۔ [2]

بلاذری ہی نے بیان کیا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے خود بیان فرمایا: ''مشرکین نے مجھے ایک دن رات مسلسل پیاسا رکھا، پھر انتہائی گرم دن میں گرم پتھروں پر لٹا کر اذیتیں دیتے رہے۔'' [3]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں اس حال میں دیکھا تو ان کے مالکوں سے سودا کیا اور انھیں خرید کر آزاد کر دیا۔ مسند ابن ابی شیبہ میں صحیح سند سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو پانچ اوقیہ (200 درہم) میں اس وقت خریدا جبکہ وہ پتھروں کے نیچے تقریباً دفن تھے۔ [4] بلاذری نے بھی اس مفہوم کی روایت عمدہ (جید) سند

»» بلال کو مارا جا رہا تھا۔ انھوں نے کہا: ''اگر انھوں نے اس کو اسی حالت میں قتل کر دیا تو میں اس کی قبر کو زیارت گاہ بنالوں گا۔'' یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جو عروہ پر موقوف اور مرسل ہے، پھر یہ روایت بخاری و مسلم کی روایات کے مخالف ہے۔ [1] أنساب الأشراف: 185/1. [2] أنساب الأشراف: 185/1. [3] أنساب الأشراف: 186/1. [4] ابن ابی شیبہ کی یہ روایت حافظ ابن حجر نے نقل کی ہے، دیکھیے: ««

کے ساتھ نقل کی ہے۔[1]

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''جناب! اگر آپ نے مجھے اپنی خدمت کے لیے خریدا تھا تو مجھے اپنے پاس رکھ لیں اور اگر آپ نے مجھے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خریدا تھا تو مجھے اجازت دیں کہ میں جہاں چاہوں جا کر اللہ کے دین کا کام کرتا رہوں۔''[2]

خباب بن ارت رضی اللہ عنہ: خباب بن ارت بن جندلہ بن سعد بن خزیمہ...... بن تمیم تمیمی۔ بعض مؤرخین نے اُنھیں خزاعی بھی کہا ہے۔[3] یہ دورِ جاہلیت میں قیدی بنا لیے گئے، پھر انھیں مکہ لا کر فروخت کر دیا گیا۔ یہ ام انمار خزاعیہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اس بات میں تھوڑا اختلاف ہے، پھر انھوں نے بنو زہرہ سے حلیفانہ معاہدہ کر لیا۔ یہ لوہے کا کام کرتے تھے۔ نیزے اور تلواریں بنایا کرتے تھے۔[4] سابقین اولین میں شامل تھے۔

انھوں نے جب اسلام کا اعلان کیا تو مختلف قسم کی تکالیف اور عذاب سہنے پڑے۔ اور

« (فتح الباري: 248/4) محدث ابن عبدالبر نے اس روایت کو قوی سند کے ساتھ درج کیا ہے، دیکھیے: (الاستيعاب: 34/2، وسير أعلام النبلاء للذهبي: 353/1). اور دیکھیے (القصيمية، ص:367).

[1] أنساب الأشراف: 186/1. [2] صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب بلال بن رباح مولىٰ أبي بكر رضي الله عنه، حديث: 3755. ابن اسحاق نے حسن مرسل سند سے روایت کی ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بلال کو ان کے آقا سے ایک حبشی غلام کے بدلے حاصل کیا تھا، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 393/1) [3] ابن ہشام نے انھیں بغیر سند کے خزاعی لکھا ہے۔ ان کی سوانح کے لیے دیکھیے: (الإصابة في تمييز الصحابة: 416/1) بلاذری نے لکھا ہے: ''انھیں ارتّ اس لیے کہا گیا کہ عربی بولتے ہوئے ان کی زبان میں لکنت آ جاتی تھی۔'' دیکھیے: (أنساب الأشراف: 175/1-179) عربی بولتے ہوئے کسی عجمی کی زبان میں لکنت یا رکاوٹ آ جانے کو عرب رُتَّة کہتے ہیں۔ ارتّ بھی اسی سے ماخوذ ہے۔ [4] خباب رضی اللہ عنہ کی اس مہارت کا ذکر بخاری و مسلم کی روایت میں ہے جس میں خباب اور عاص بن وائل کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس کی تفصیل آ رہی ہے۔

دیگر کمزور مسلمانوں کی طرح شدید مالی اور جانی نقصان برداشت کرنا پڑا۔[1] روایت ہے کہ مشرکین انھیں سر کے بالوں سے پکڑ کر جھٹکے دیتے اور گھسیٹتے، اُن کی گردن بے دردی سے مروڑتے اور انھیں دہکتے پتھروں پر لٹا دیتے تھے، پھر سینے پر بھاری پتھر رکھ دیتے تھے تا کہ اٹھ نہ سکیں۔[2] کبھی آگ جلا کر انگاروں پر لٹا دیتے تھے وہ انگارے اُن کی کمر کی چربی پگھلنے سے بجھتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے اپنی کمر سے کپڑا اُٹھایا اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو آگ سے جلنے کے نشانات دکھائے۔[3] یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مشرکین انھیں گرم پتھروں پر لٹائے رکھتے تھے۔ اتنے لرزہ خیز مظالم کے باوجود وہ انھیں اسلام کی صداقت سے منحرف نہ کر سکے۔[4]

مکہ کے ایک سردار عاص بن وائل کے ساتھ اُن کا واقعہ مشہور ہے جسے امام بخاری، امام مسلم اور دیگر محدثین نے نقل کیا ہے۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں مکہ میں

[1] فضائل الصّحابة: 182/1. یہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ القصيميّة کے مؤلف نے اس روایت کی جو تخریج کی اس کے مطابق اسے محدث ابو نعیم نے اپنی کتاب میں صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے، دیکھیے: (القصيميّة، ص: 375، وحلية الأولياء: 143/1)

[2] تلقيح فهوم الأثر لابن الجوزي، ص: 60. [3] حلية الأولياء لأبي نعيم: 144/1. ابو نعیم نے جس سند سے یہ روایت نقل کی وہ مرسل ہے اور شعبی تک پہنچتی ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ شعبی نے خباب رضی اللہ عنہ سے حدیث سنی ہے تو یہ روایت صحیح اور متصل مانی جائے گی۔ خباب رضی اللہ عنہ کو قریش کی طرف سے اذیتیں دیے جانے کی بابت جو روایات ہم نے پیش کیں وہ اس روایت کی تائید کرتی ہیں۔ اس بنا پر ہم اسے حسن قرار دیتے ہیں۔ مؤرخ و محدث ابن سعد نے ابو لیلیٰ کندی کی ایک روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ مشرکین مکہ نے خباب رضی اللہ عنہ پر جو خوفناک تشدد کیا تھا اس کے نشانات انھوں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اپنی پیٹھ پر دکھائے تھے۔ اس روایت کی سند حسن ہے۔ ابو لیلیٰ کندی کی اسی روایت کو امام ابن ماجہ نے بھی اپنی سند سے نقل کیا ہے جس کی سند صحیح ہے، دیکھیے: (سنن ابن ماجه، المقدّمة، حديث: 153، والطبقات الكبرٰى: 165/3) محدث بوصیری اور البانی نے اس سند کو صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (الزوائد للبوصيري: 12، وصحيح سنن ابن ماجه: 31/1، حديث: 152)

[4] حلية الأولياء لأبي نعيم: 144/1. اس روایت کی سند صحیح ہے۔

لوہار کا کام کرتا تھا۔ میں نے عاص بن وائل سہمی کے آرڈر پر اس کے لیے ایک تلوار تیار کی۔ جب میں اجرت لینے گیا تو وہ کہنے لگا: ''جب تک تو محمد کے ساتھ کفر نہ کرے گا تجھے اجرت نہیں دوں گا۔'' میں نے کہا: ''میں حضرت محمد ﷺ سے ہرگز کفر نہیں کروں گا چاہے تو مر کے بھی جی اٹھے۔'' وہ کہنے لگا: ''چلو ٹھیک ہے۔ جب میں مر کر جی اٹھوں گا، ظاہر ہے مجھے مال و اولاد ملے گا تو تیری اجرت بھی ادا کر دوں گا۔'' اس ماجرے پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں:

﴿ أَفَرَءَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتَيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا ۝ أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ۝ ﴾

''تو کیا آپ نے وہ شخص دیکھا جس نے ہماری آیات کے ساتھ کفر کیا اور کہا: مجھے ضرور ہی مال و اولاد دیے جائیں گے؟ کیا وہ غیب پر مطلع ہوا ہے یا اُس نے رحمٰن کے ہاں (سے) کوئی عہد لے لیا ہے؟''[1]

جب خباب رضی اللہ عنہ اور اُن جیسے دوسرے کمزور مسلمانوں پر ظلم کی حد ہوگئی تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے حالات کی شکایت کی۔ صحیح بخاری میں خود حضرت خباب رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان اس طرح ہے: ''ہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس صورتحال کی شکایت کی۔ آپ کعبہ کے سائے میں چادر کا سرہانا بنائے لیٹے تھے۔ ہم نے عرض کی: آپ ہمارے لیے مدد طلب کیوں نہیں کرتے؟ آپ ہمارے لیے دعا کیوں نہیں کرتے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے ایسے لوگ ہو گزرے ہیں جنھیں گڑھا کھود کر زمین میں گاڑ دیا جاتا، پھر سر پر آرا رکھ کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا مگر یہ ظلم انھیں دین سے نہ روکتا۔ کسی کو لوہے کی

[1] مریم 19:77،78. صحیح البخاري، التفسیر، باب: ﴿ أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ۝ ﴾، حدیث: 4733، وصحیح مسلم، صفات المنافقین ……، باب سؤال الیهود النبي ﷺ عن الرّوح……، حدیث: 2795.

کنگھیوں سے اس طرح چھیل دیا جاتا کہ ہڈیاں اور پٹھے ننگے ہو جاتے۔ مگر یہ (ظلم) انھیں دین سے نہ روکتا۔ اللہ کی قسم! یہ دین ضرور پایۂ تکمیل کو پہنچے گا اور سوار صنعا سے حضرموت کا سفر کرے گا لیکن اُسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ خدشہ ہو گا کہ کہیں کوئی بھیڑیا میری بکریاں نہ مار دے۔ لیکن تم جلد بازی کرتے ہو۔''[1]

دوسرے مظلوم غلام: ان کے علاوہ حمامہ (بلال کی والدہ)، عامر بن فُهيرة، أم عُبيس، زِنّيرة، نهدية اور اس کی بیٹی، بنوعدی کی لونڈی جسے حضرت عمر بن خطاب (اپنے اسلام سے قبل) ایذائیں دیا کرتے تھے اور[2] بنو مُؤَمّل کی لونڈی بھی۔ یہ وہ مظلوم غلام تھے جو کفار کا نشانۂ ستم بنے رہے۔ ان سب کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کیا۔[3]

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد ابوقحافہ نے دیکھا کہ ان کا بیٹا ابوبکر مظلوم غلاموں کو خرید خرید کر آزاد کر رہا ہے تو وہ کہنے لگے: ''بیٹا! ان کمزور و ناتواں لوگوں کو آزاد کرنے کا کیا فائدہ؟ اگر تو مضبوط و توانا غلام آزاد کرتا تو تجھے کچھ فائدہ بھی ہوتا۔ کسی آڑے وقت میں وہ تیرا ساتھ دیتے اور تیرے کام آتے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ابا جان! میں تو یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے کر رہا ہوں۔'' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے بارے میں یہ آیات اتاریں:

﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ ﴾

''پھر جس نے (اللہ کی راہ میں) دیا اور تقویٰ اختیار کیا۔ اور اس نے سب سے اچھی بات کی تصدیق کی۔ تو یقیناً ہم اسے آسان راستے (نیکی) کی سہولت

[1] صحيح البخاري، المناقب، باب علامات النّبوّة في الإسلام، حديث: 3612. [2] الفصول لابن كثير، ص: 87. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 394/1. یہ ابن اسحاق کی بغیر سند کے روایت ہے۔ والسير والمغازي لابن إسحاق، ص: 191. یہاں بھی یہ روایت بلا سند ہے۔ أنساب الأشراف: 158/1 و190 و194 و196.

دیں گے۔''[1]

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زِنِّیرۃ کو آزاد کیا تو اس کی نظر جاتی رہی۔ کفارِ قریش کہنے لگے: ''اسے اپنے دین سے پھرنے کی سزا دینے کے لیے لات وعزیٰ نے اندھا کر دیا ہے۔'' زنیرہ نے کہا: ''اللہ کے مقدس گھر کی قسم! یہ جھوٹ بکتے ہیں۔ لات وعزیٰ کسی کو نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان۔'' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر لوٹا دی۔[2]

حضرت أفلح أبو فُکَیْھَة، جو بنوعبدالدار کے غلام تھے، مسلمان ہوئے تو بنوعبدالدار ان کے پاؤں رسی سے باندھ کر انھیں زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے تاکہ حضرت افلح دین اسلام چھوڑ دیں مگر انھیں ہر تکلیف گوارا تھی لیکن اسلام سے بے وفائی کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔[3]

اہل حق پر ظلم وتشدد اور ان کے صبر کی حکمتیں

* اکثر یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر اس قدر ہولناک مظالم اور اتنا زبردست تشدد کیوں ہوا جبکہ وہ حق پر تھے؟ اللہ تعالیٰ نے اُن کو تشدد سے کیوں نہیں بچایا جبکہ وہ اللہ کا لشکر تھے اور اُن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنفس نفیس موجود تھے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں انسان کی اولین حیثیت اُس کا مکلّف اور ذمہ دار ہونا ہے۔ انسان کی تخلیق کا مقصد ہی یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرے، دعوت و جہاد کا کام کرے اور یہ مکلّف ہونے کا لازمی نتیجہ ہے اور حق یہ ہے کہ مکلّف بنے بغیر اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ کی الوہیت کا مطلب ہی یہ ہے کہ

[1] الّیل 92:5-7. [2] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام:1/393,392. ابن اسحاق کی اس روایت کی سند حسن مرسل ہے۔ [3] الإصابۃ لابن حجر:4/156. روایت بلاسند ہے۔

انسان بصد عجز و نیاز اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ ﴾

''میں نے جن وانس کو صرف اس لیے تخلیق کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔'' [1]

مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ عبودیت انسان کے مکلّف ہونے کا تقاضا کرتی ہے اور مکلّف ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان اپنے نفس و خواہشات کا مقابلہ کرے اور فتنوں کے مقابلے میں ڈٹ جائے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی مشقت اٹھانی پڑے یا مبتلائے آزمائش ہونا پڑے تو دلیری، جوانمردی اور استقامت کا ثبوت دے۔

آزمائش اور مصائب کے نرغے ہی میں سچے اور جھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے اور صحیح وزنِ ایمانی معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ الٓمّٓ ۝ أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ۝ ﴾

''الٓمّٓ۔ کیا لوگوں نے گمان کیا ہے کہ وہ اسی پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ کہہ دیں ہم ایمان لائے اور انھیں آزمایا نہیں جائے گا؟ حالانکہ بلاشک وشبہ ہم نے ان لوگوں کو آزمایا جو ان سے پہلے تھے، چنانچہ اللہ ہر صورت ان لوگوں کو جان لے گا جنھوں نے سچ بولا اور انھیں (بھی) ہر صورت جان لے گا جو کذاب ہیں۔'' [2]

ارشادِ ربانی ہے:

﴿ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ۝ ﴾

''(پھر) کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو نہیں جانا جنھوں نے جہاد کیا اور یہ کہ وہ صابروں

[1] الذّٰریٰت 51:56. [2] العنکبوت 29:1-3.

کو جان لے۔''[1]

جب حقیقی اور اصل معاملہ یہ ہے تو پھر کسی مسلمان کے لیے زیبا نہیں کہ وہ آزمائش اور مشقت سے بددل ہو جائے بلکہ اس دین کا تو مزاج ہی یہ ہے کہ جس قدر بھی تکالیف ومصائب سے سابقہ پڑے مومن بہرحال خوش رہے اور اللہ کی مدد کا کامل یقین رکھے یہاں تک کہ امرِ ربی پورا ہو جائے۔ اس کی واضح دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد عالی ہے:

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝ ﴾

''(پھر) کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں یونہی داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک تمھیں ان لوگوں کے مانند (مشکلات) پیش نہیں آئیں جو تم سے پہلے گزرے۔ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی۔ اور وہ ہلا کر رکھ دیے گئے یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھ جو لوگ ایمان لائے، کہنے لگے: اللہ کی مدد کب آئے گی؟ آگاہ رہو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔''[2]

* علمائے اسلام کے نزدیک یہ بات مسلّم ہے کہ جبر و اکراہ (زبردستی) کی آزمائش میں رخصت کے بجائے عزیمت کی راہ اختیار کرنا افضل و برتر ہے۔ خصوصاً ائمۂ کرام اور قائدین کی پیشانیوں پر تو عزیمت ہی کا تاج جچتا ہے اور فقہاء اُسی اِکراہ و جبر کو معتبر سمجھتے ہیں جس میں اکراہ (زبردستی) کرنے والے کو اپنی دھمکی پر عمل درآمد کی قدرت بھی ہو۔[3]

عام مسلمانوں کا رخصت پر عمل کر لینا بھی جائز ہے اور اس سے عقیدے میں کوئی خرابی

[1] آل عمران 3:142. [2] البقرة 2:214. فقه السيرة النبوية للبوطي، ص 85-87. [3] الاختيار لتعليل المختار في الفقه الحنفي للموصلي: 104/2، و عثرات و سقطات في كتاب المنهج الحركي......، ص: 438.

لازم نہیں آتی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا: «إِنْ عَادُوا فَعُدْ» ''اگر کفار تجھ سے دوبارہ ایسی بات کہنے پر اصرار کریں تو پھر بھی کہہ لینا۔'' اصل میں مشرکین نے اُن سے جبراً اپنے معبودوں کی تعریف کرائی تھی۔ اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ دل میں ایمان پکا ہو۔[1]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے حضرت عمار کے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''اسی لیے علماء کا اتفاق ہے کہ مجبور و معذور شخص اپنی جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہہ سکتا ہے۔ ہاں اُسے یہ بھی اجازت ہے کہ وہ اپنی جان کی بازی لگا دے جس طرح حضرت بلال رضی اللہ عنہ تشدد کے بدترین حربوں کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے اور عزیمت کا ایسا ہی بے مثال نمونہ حضرت حبیب بن زید انصاری رضی اللہ عنہ نے بھی پیش کیا تھا۔ اُن سے مسیلمہ کذاب کہتا تھا: ''تو گواہی دیتا ہے کہ محمد رسول ہیں؟'' وہ کہتے: ''ہاں۔'' لیکن جب وہ کہتا: ''تو گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟'' تو وہ کہتے: ''میں نہیں سنتا۔'' وہ ظالم اُن کا ایک ایک عضو کاٹتا رہا جس سے وہ شہید ہوگئے مگر اپنی بات پر ڈٹے رہے۔''[2] افضل اور بہتر یہی ہے کہ مومن اپنے دین پر ڈٹا رہے، چاہے جان قربان ہو جائے۔ حافظ ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کے حالات میں بھی یہی بات لکھی ہے۔

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اسی موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''اگر کسی شخص کو کلمۂ کفر کہنے پر (قتل کی دھمکی دے کر) مجبور کیا جائے تو اُسے کلمۂ کفر کہنے کی اجازت ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے اس کے بارے میں دو روایات آئی ہیں۔ ایک روایت تو یہ ہے کہ اُسے کلمۂ کفر کہنے کی اجازت تب ہے اگر واقعی اُسے اپنی جان جانے یا کوئی عضو

[1] عثرات و سقطات في كتاب المنهج الحركي للسيرة لزهير سالم، ص40,39. [2] تفسير ابن كثير:4/525، 526.

ضائع ہونے کا خطرہ لاحق ہو جائے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ صرف دھمکی اُس وقت تک ''اکراہ'' تصور نہیں کی جائے گی جب تک دھمکی پر عمل شروع نہ ہو جائے۔ ہر چند ''تقیہ'' کا جواز ثابت ہے، تاہم افضل یہی ہے کہ تقیہ نہ کرے۔''[1]

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ جیسے بعض سلف صالحین کا خیال ہے کہ اس قسم کا تقیہ ابتدائے اسلام میں تھا جب ابھی دین کی جڑیں مضبوط نہیں ہوئی تھیں اور مسلمانوں کو قوت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت و غلبہ عطا فرما دیا ہے تو مسلمانوں کو اپنے دشمن کے سامنے اس نوع کا تقیہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔[2]

ان مومنین کی ثابت قدمی، عالی ہمت اور رضا برضائے الٰہی اللہ تعالیٰ پر توکل کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ تاریخ ان کے ایمان سے معمور جرأت مندانہ موقف کو فراموش نہیں کر سکے گی اور یہ اولین مسلمان ہر مقام اور ہر زمانے کے تحریکی کارکنوں کی رہبری کے لیے اُسوۂ حسنہ بنے رہیں گے۔

ہر دور اور ہر علاقے کے دشمنانِ اسلام نورِ اسلام کو بجھانے اور داعیانِ اسلام کی مخالفت کے لیے تمام وسائل اور ذرائع بروئے کار لاتے رہے ہیں اور لاتے رہیں گے۔ وسائل و ذرائع کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر آن نئی سے نئی شکل اختیار کرتے رہتے ہیں لیکن اصولی طور پر وہ ان ذرائع سے مختلف نہیں جو کفارِ قریش نے مکہ مکرمہ کے مظلوم

---

[1] زاد المسیر: 496/4. یہ تو جان جانے کا خوف ہے جس کی بنا پر مخصوص حالات میں تقیہ کی اجازت ہے مگر اہلِ تشیع اس حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تقیہ کرنے کا جو بہتان لگاتے ہیں وہ بالکل بے بنیاد ہے۔ اس ضمن میں تمام شیعی روایات من گھڑت ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے باہمی معاملات اسلامی اخوت، خیرخواہی، تعاون اور ایک دوسرے سے محبت کے جذبے پر استوار تھے۔

[2] تفسير البغوي: 26/2.

اور کمزور مسلمانوں کے خلاف استعمال کیے۔ اگر ہم ان میں سے ایک ایک طریقے کی پوری پوری وضاحت کرنے لگیں اور شریعتِ الٰہیہ کے مخالف معاشروں میں اسلامی تحریک کی مخالفت کی مثالیں پیش کریں تو بات لمبی ہو کر دور تک پھیل جائے گی، چنانچہ ہم ان اصولی باتوں ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

■ اس حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمت کارفرما تھی کہ مشرکین مکہ نے اپنی حد تک آپ ﷺ کی دعوت اور تحریک کے جو اسباب و مقاصد سمجھے اور ممکن خیال کیے اُن کی روشنی میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے طرح طرح کی سودے بازی، بھاؤ تاؤ اور جوڑ توڑ کی ہر ممکن پوری کوشش کی اور آپ ﷺ کے سامنے ہر بڑی سے بڑی انتہائی پرکشش پیشکش رکھ دی مگر آپ ﷺ نے ان کی اونچی سے اونچی پیش کش کو بھی نہایت نیچ اور ناقابل توجہ سمجھا اور دعوت الی اللہ کا کام زور شور سے جاری رکھا تاکہ تاریخ کا ہر ورق یہ اعلان کر دے کہ آپ کا مقصد فروغ اسلام کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔[1]

بارھواں حربہ: مسلمانوں کا تعاقب اور ان کے خلاف پروپیگنڈہ

جب کچھ مسلمان مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آ کر نجاشی (شاہِ حبشہ) کے پاس چلے گئے تو مشرکین نے اُن کے پیچھے کئی آدمی دوڑائے تاکہ حبشہ پہنچنے سے پہلے ہی انھیں دبوچ لیا جائے۔ لیکن جب وہ حبشہ پہنچ گئے اور وہاں امن وسکون سے رہنے لگے اور اُن کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو قریش کو یہ بات بڑی ناگوار گزری۔ انھوں نے اپنا ایک وفد حبشہ بھیجا۔ نجاشی اور مسلمانوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے کے لیے رشوت اور دیگر حیلے اختیار کیے لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کی تفصیل ہجرتِ حبشہ اولیٰ، ہجرتِ حبشہ ثانیہ اور ہجرت مدینہ کے ضمن میں آئے گی۔

[1] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص:90.

اس کے بعد معاشرتی بائیکاٹ، نبی ﷺ کو قتل کرنے کی سازش اور آپ ﷺ کے خلاف جنگی کارروائیاں اور ان کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔

رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی جائے ملاقات

رسول اللہ ﷺ اسلام میں نئے داخل ہونے والوں سے خفیہ ملاقاتیں کرتے تھے تاکہ اُن تک وحی اور دینی تعلیمات پہنچائیں۔ دعوتِ اسلامی کے پانچویں سال رسول اللہ ﷺ نے ایک مسلمان ارقم بن ابی ارقم کا گھر اس مقصد کے لیے منتخب فرمایا تاکہ وہاں مسلمان اکٹھے ہوسکیں۔ مسلمانوں نے آپس میں طے کر لیا کہ اس مکان میں اجتماع کو خفیہ رکھا جائے اور کسی کو اس کا پتہ نہ چل سکے۔ اکثر صحابہ اپنے اسلام کو ظاہر نہیں کرتے تھے، چنانچہ اس راز کو راز رکھنا ضروری تھا اور اسی میں اسلام اور مسلمانوں کا فائدہ مضمر تھا۔[1]

باقی رہی یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مقصد کے لیے دارِ ارقم ہی کو کیوں منتخب فرمایا، اس سوال کا جواب، ممکنہ حد تک، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری نے یوں دیا ہے:

''حضرت ارقم کے اسلام کا لوگوں کو علم نہیں تھا۔ وہ بنو مخزوم میں سے تھے جنھوں نے بنو ہاشم کے خلاف مقابلے بازی اور جنگ کا جھنڈا اٹھا رکھا تھا، چنانچہ یہ محال تھا کہ آپ دشمن کے عین مرکز میں چھپے رہ سکیں۔ ویسے بھی اسلام لانے کے وقت اُن کی عمر بہت چھوٹی، یعنی صرف سولہ سال تھی۔ ان حالات میں لوگوں کا عام طور پر گمان یہ ہوتا تھا کہ آپ ﷺ نے کسی بڑے صحابی کے مکان کو اپنا مرکز بنا رکھا ہے۔''[2]

یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ دارِ ارقم کوہِ صفا کے قریب تھا۔ یہ ایسا علاقہ تھا جہاں طبعی طور پر لوگوں کی آمد و رفت زیادہ ہوتی تھی۔ اتنی آمد و رفت میں چند لوگوں کا یہاں آنا جانا مخفی رہ سکتا تھا اور راز فاش ہونا مشکل تھا۔

[1] البداية والنهاية:3/34,33. [2] الرحيق المختوم، ص:49.

جب کفار کو مسلمانوں کی جائے ملاقات کا شک گزرا تو زیادہ سے زیادہ ان کا گمان یہی تھا کہ وہ صفا کے پاس کسی گھر میں جمع ہوتے ہیں (اصل گھر کا انھیں پھر بھی علم نہ ہو سکا۔)
اخفا اور راز داری کا معاملہ اور اس کی حکمت عملی رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے بے شمار مواقع میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اُنھی میں سے ایک موقع یہ بھی ہے۔

باب

4

ہجرتِ حبشہ سے اسراء ومعراج تک

- ہجرتِ حبشہ
- شعبِ ابی طالب
- عام الحزن
- اسراء ومعراج
- بیعتِ عقبہ

﴿ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝ ﴾

''اور جب تم ان لوگوں سے اور جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں ان سے الگ ہو گئے ہو تو غار میں پناہ لے لو۔ تمھارا رب تمھارے لیے اپنی کچھ رحمت پھیلا دے گا اور تمھارے لیے تمھارے کام میں آسانی مہیا کر دے گا۔''

[الکھف 16:18]

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ ﴾

''پاک ذات ہے (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا (وہ مسجد اقصیٰ) جس کے اردگرد ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بلاشبہ وہی خوب سننے والا، وہی خوب دیکھنے والا ہے۔''

[بنيّ إسرآء يل 1:17]

ہجرت حبشہ

پہلی ہجرت حبشہ

پروفیسر عبداللہ طیب نے اپنے مقالے الهجرة إلى الحبشة وما وراء ها من نبأ میں لکھا ہے کہ یہ ہجرت موجودہ سوڈان کے بعض علاقوں کی طرف تھی۔ انھوں نے اپنی اس رائے کی تائید میں کچھ تاریخی دلائل بھی دیے ہیں۔ فی الواقع یہ رائے وزن رکھتی ہے۔

قریش کے ظلم وستم اور تشدد کی ابتدا 4 نبوی کے وسط یا آخر میں ہوئی۔ شروع میں تو یہ ظلم کم تھا مگر پھر دن بدن، ماہ بماہ بڑھتا چلا گیا حتی کہ 5 نبوی کے وسط میں انتہا کو پہنچ گیا اور مسلمانوں کے لیے مکہ مکرمہ میں رہنا دوبھر ہوگیا۔ وہ مجبور ہوگئے کہ اس دردناک صورتِ حال سے نجات کا کوئی طریقہ سوچیں۔ یہی وہ وقت تھا جب مشرکین نے یہود کی انگیخت پر نبیٔ اکرم ﷺ سے کچھ سوالات کیے۔ اُن سوالات کے جواب میں سورۂ کہف نازل ہوئی۔ یہ سورت تین واقعات پر مشتمل تھی۔ ان واقعات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کے لیے واضح اشارات تھے، مثلاً: اصحابِ کہف کا واقعہ مومنین کی رہنمائی کرتا ہے کہ جب دین میں فتنے کا خدشہ ہو تو اللہ کی ذات عالی پر توکل کر کے ظلم وکفر کے مراکز سے ہجرت کر جانی چاہیے:

﴿ وَاِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاۡوٗۤا اِلَى الۡـكَهۡفِ يَنۡشُرۡ لَـكُمۡ رَبُّكُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِهٖ وَيُهَيِّئۡ لَـكُمۡ مِّنۡ اَمۡرِكُمۡ مِّرۡفَقًا ۝ ﴾

''اور جب تم ان لوگوں سے اور جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں ان سے الگ ہو گئے ہو تو غار میں پناہ لے لو۔ تمھارا رب تمھارے لیے اپنی کچھ رحمت پھیلا دے گا اور تمھارے لیے تمھارے کام میں آسانی مہیا کر دے گا۔'' [1]

حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بتلاتا ہے کہ ضروری نہیں حالات کا نتیجہ زمینی حقائق کے مطابق ہی ہو، بلکہ بسا اوقات معاملہ الٹ ہوتا ہے۔ اس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ ظلم و تشدد کا عنقریب خاتمہ ہوگا اور مسلمانوں کو سکون کا سانس لینے کا موقع ملے گا۔

حضرت ذوالقرنین کا واقعہ شاہد ہے کہ زمین اللہ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے زمین کا وارث بناتا ہے اور کامیابی ایمان کا راستہ اختیار کرنے میں ہے، کفر میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر دور کے یاجوج و ماجوج سے اپنے کمزور بندوں کو نجات دلانے کے لیے وقتاً فوقتاً اپنے بندے بھیجتا رہتا ہے اور زمین کی وراثت کے زیادہ حقدار اللہ کے نیک بندے ہی ہیں۔ پھر سورۂ زمر نازل ہوئی وہ بھی ہجرت کا اشارہ کر رہی تھی اور علانیہ کہہ رہی تھی کہ اللہ کی زمین تنگ نہیں:

﴿ لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِىۡ هٰذِهِ الدُّنۡيَا حَسَنَةٌ ؕ وَاَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَهُمۡ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ۝ ﴾

''ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اس دنیا میں اچھے عمل کیے، بھلائی ہے اور اللہ کی زمین وسیع ہے، صرف صبر کرنے والوں کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر پورا پورا دیا جائے گا۔'' [2]

لٰہذا مسلمانوں نے ان اشارات کو سمجھ کر ہجرت کی۔ حبشہ کی طرف ان کی ہجرت ظلم کے

[1] الکھف 16:18۔ [2] الزمر 10:39۔

علاقے سے امن و امان کے علاقے کی طرف تھی اور اپنے دین کی حفاظت کے لیے تھی۔ [1]

مؤرخ ابن اسحاق نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت بیان کی ہے: ''جب ہمارے لیے وادیِ مکہ کی زمین تنگ ہوگئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام کو اذیت میں مبتلا کیا گیا اور انھیں اپنا دین انتہائی خطرے میں نظر آیا اور یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے مصائب وقتی طور پر کم نہیں کرسکیں گے جبکہ آپ خود اپنے چچا اور قوم کی حفاظت میں ہیں اور صحابۂ کرام جیسی اذیتیں آپ کو نہیں پہنچ سکتیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فرمایا: ''حبشہ کے علاقے میں ایک رحم دل بادشاہ حکمران ہے۔ وہاں ظلم و ستم نہیں ہوتا۔ تم وہاں چلے جاؤ حتی کہ اللہ تعالیٰ حالات ٹھیک کردے یا کوئی اور راستہ نکال دے۔'' چنانچہ ہم حبشہ کے ارادے سے نکل پڑے اور وہاں جا کر اکٹھے رہنے لگے۔ علاقہ بہترین، حکمران بہترین، دینی لحاظ سے کوئی خوف و خطر نہیں تھا نہ کسی ظلم و ستم کا کوئی خدشہ تھا......'' [2]

ابن سعد کی روایت ہے کہ مسلمان چھپ کر نکلے تھے۔ گیارہ مرد تھے اور چار عورتیں۔ وہ دوڑتے بھاگتے شعیبہ بندرگاہ پر پہنچے۔ کوئی سوار تھا، کوئی پیدل۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ اِدھر یہ وہاں پہنچے اُدھر تاجروں کی دو کشتیاں وہاں لنگر انداز ہوئیں۔ انھوں نے نصف نصف دینار کرایہ لے کر حبشہ پہنچا دیا۔ یہ ہجرت رجب 5 نبوی میں ہوئی۔ [3] قریش کو پتہ

---

[1] سورۂ کہف اور زمر میں دیے گئے اشارات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: (الرّحيق المختوم، ص: 106,105) دعوتِ دین کی راہ میں مسلمانوں کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا اور جو حبشہ کی پہلی ہجرت کا بڑا سبب بنے، ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: (صحيح البخاري، الكفالة، باب جوار أبي بكر في عهد رسول الله ﷺ وعقده، حديث: 2297، و رسالة العودة، ص: 299، والبداية والنهاية: 73/3) [2] السيرو المغازي لابن إسحاق، ص: 213. یہ یونس بن بکیر کی روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبويّة لابن هشام: 413/1) یہ روایت بکائی کی ہے جس کی سند حسن ہے۔ [3] یہ ابن اسحاق کے قول کے موافق ہے۔ ابن اسحاق کے مطابق پہلی ہجرت مقاطعے (بائیکاٹ) کا معاملہ پیش آنے سے قبل ہوئی۔ موسیٰ بن عقبہ کا قول اس کے مخالف ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 430/1، والبداية والنهاية: 74/3) ابن کثیر کا کہنا ہے کہ موسیٰ بن عقبہ کا خیال ہے، ارضِ حبشہ کی طرف پہلی ہجرت ان ◄◄

چلا تو پیچھے بھاگے، سمندر تک پہنچے مگر اُس وقت تک صحابہ جا چکے تھے، چنانچہ کوئی مسلمان ان کے ہاتھ نہیں آیا۔[1]

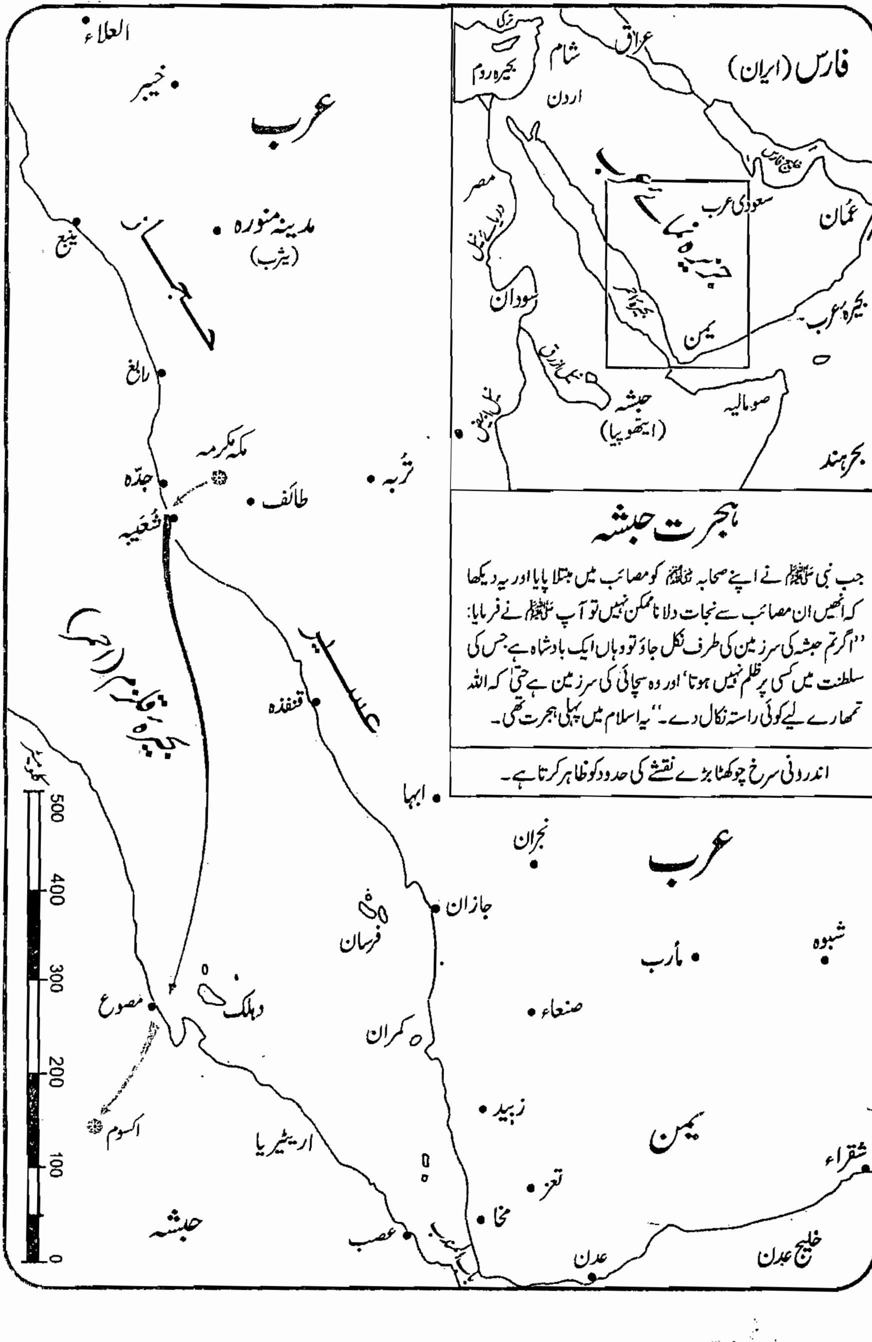
مؤرخ ابن سعد نے ایک دوسری روایت میں بارہ مردوں اور چار عورتوں کے نام بتائے ہیں۔[2] ابن سید الناس نے بھی اس کی تائید کی ہے، تاہم انھوں نے پانچویں عورت کا اضافہ کیا ہے جن کا نام ام کلثوم بنت سہیل بن عمرو ہے اور وہ ابوسبرہ کی بیوی تھیں۔[3] ابن اسحاق کی روایت ہے کہ وہ دس مرد اور چار عورتیں تھیں۔ انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود کا ذکر نہیں کیا اور حضرت حاطب کا ذکر شک کے الفاظ میں کیا ہے۔[4] ذہبی نے ابن اسحاق کی موافقت کی ہے مگر انھوں نے ابوسبرہ کا ذکر کیا ہے اور ابن مسعود اور حاطب یا ابوحاطب کا ذکر نہیں کیا۔[5] عروہ نے بیان کیا ہے کہ وہ گیارہ مرد تھے اور چار عورتیں۔ انھوں نے ابن مسعود کا ذکر کیا ہے لیکن حاطب کا ذکر نہیں کیا۔[6]

ان مہاجرین میں حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد اور اُن کی بیوی ام سلمہ بنت ابی اُمیہ رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ یہی اُم سلمہ بعد میں ام المومنین بنیں۔ اُنھی نے ہجرت حبشہ کے بارے میں لمبی روایت بیان کی ہے۔ ان کے علاوہ حضرت عثمان بن مظعون، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عثمان بن عفان اور ان کی بیوی، رسول اللہ ﷺ کی بیٹی، حضرت رقیہ بھی شامل تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان و رقیہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں فرمایا تھا:

»» دنوں ہوئی جب ابوطالب اور ان کے حلیف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شعب ابی طالب میں گئے۔

[1] الطبقات الکبریٰ: 204/1. اس روایت کی سند میں تین خرابیاں (علل) ہیں: واقدی، عبیداللہ بن عباس ہذلی کا مجہول ہونا اور اس سند کا مرسل ہونا۔ [2] الطبقات الکبریٰ: 204/1. یہ روایت واقدی کی سند سے ہے۔ حافظ ابن القیم نے اپنی کتاب میں اسی قول کو پسند کیا ہے، دیکھیے: (زادالمعاد: 23/3)

[3] عيون الأثر: 155/1. [4] السيرة النبوية لابن هشام: 399,398/1، والسّير والمغازي لابن إسحاق، ص: 223، 224 بلا سند. [5] تاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 185,184/1. [6] مغازي رسول الله ﷺ لعروة بن الزبير، ص: 105. اس روایت کی سند ضعیف ہے۔



ہجرت حبشہ
جب نبی ﷺ نے اپنے صحابہ ؓ کو مصائب میں مبتلا پایا اور یہ دیکھا کہ انھیں ان مصائب سے نجات دلانا ممکن نہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم حبشہ کی سرزمین کی طرف نکل جاؤ تو وہاں ایک بادشاہ ہے جس کی سلطنت میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا' اور وہ سچائی کی سرزمین ہے حتیٰ کہ اللہ تمھارے لیے کوئی راستہ نکال دے۔'' یہ اسلام میں پہلی ہجرت تھی۔
اندرونی سرخ چوکھٹا بڑے نقشے کی حدود کو ظاہر کرتا ہے۔
فارس (ایران)
عراق
شام
ترکی
بحیرہ روم
اردن
مصر
دریائے نیل
سعودی عرب
جزیرہ نمائے عرب
عمان
بحیرہ عرب
یمن
سوڈان
حبشہ
(ایتھوپیا)
صومالیہ
بحر ہند
العلاء
خیبر
عرب
مدینہ منورہ
(یثرب)
ینبع
حجاز
رابغ
مکہ مکرمہ
جدّہ
شُعَیبہ
طائف
تُربہ
بحیرہ قلزم (احمر)
عسیر
قنفذہ
ابہا
نجران
جازان
فرسان
مأرب
شبوہ
دہلک
مصوع
کمران
صنعاء
زبید
یمن
اکسوم
اریٹیریا
تعز
شقراء
مخا
حبشہ
عصب
عدن
خلیج عدن
کلومیٹر
500
400
300
200
100
0

«إِنَّهُمَا أَوَّلُ بَيْتٍ هَاجَرَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بَعْدَ إِبْرَاهِيمَ وَلُوطٍ»

''ابراہیم اور لوط علیہما السلام کے بعد یہ پہلا خاندان ہے جو اللہ کے راستے میں ہجرت کر رہا ہے۔'' [1]

اس ہجرت کو حبشہ کی ہجرت اولیٰ کہا جاتا ہے۔ ابن ہشام نے بیان کیا ہے کہ ان کے امیر حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ تھے۔ [2]

قصۂ غرانیق (مورتیوں کی تعریف کا جھوٹا پروپیگنڈہ)

یہ مہاجرین زیادہ دیر تک حبشہ میں نہ ٹھہر سکے کیونکہ اُن کو ایسی خبریں ملنے لگیں تھیں کہ مکہ والے سب لوگ مسلمان ہوگئے ہیں، چنانچہ انھوں نے اسی سال شوال میں مکہ واپسی کا پروگرام بنا لیا۔ [3]

لیکن جب یہ لوگ مکہ کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ سب خبریں جھوٹا پروپیگنڈہ تھیں۔ دشمنی کی آگ تو بدستور بھڑک رہی ہے، پھر کچھ لوگ واپس حبشہ چلے گئے اور کچھ لوگ چھپ چھپا کر یا کسی قریشی سردار کی پناہ حاصل کر کے مکہ میں داخل ہوگئے۔ [4]

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حبشہ سے واپسی بلاوجہ نہیں تھی بلکہ اسلام اور بت پرستی میں صلح ہوگئی تھی۔ وہ اس طرح کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے بتوں کی تعریف کی اور ان کی قدر و منزلت کو تسلیم کر کے کفار کے قریب ہونا چاہا۔ اُن کے خیال کے مطابق آپ نے مشرکین کے سامنے سورۂ نجم تلاوت فرمائی، جب اس آیت پر پہنچے:

﴿أَفَرَءَيْتُمُ اللَّٰتَ وَالْعُزَّىٰ ۝ وَمَنَوٰةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ۝﴾

---

[1] دلائل النبوّة للبيهقي: 297/2. یہ انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ اس کی سند میں موجود ایک راوی بشر بن موسیٰ خفاف کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ [2] السيرة النبويّة لابن هشام: 399/1. [3] الطبقات الكبرىٰ: 206/1. یہ روایت واقدی کی سند سے ہے۔ السيرة النبوية لابن هشام: 5/2. ابن اسحاق کی روایت بلاسند ہے۔ [4] السيرة النبوية لابن هشام: 5/2. ابن اسحاق کی روایت بلاسند ہے۔

''تم مجھے لات اور عزّیٰ کی خبر دو اور تیسری (دیوی) مناۃ کی جو گھٹیا ہے۔''[1]

تو شیطان نے مشرکین کو یہ الفاظ سنا دیے: «تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى» ''یہ بلند مرتبہ مورتیاں ہیں جن کی شفاعت کی امید رکھی جا سکتی ہے۔'' پھر سورت کے اختتام پر آپ ﷺ نے سجدہ کیا تو کافروں نے بھی سجدہ کر لیا۔ جب اس واقعے کی خبر حبشہ پہنچی تو مہاجرین نے سمجھا کہ قریش اسلام لا چکے ہیں۔

یہ قصہ روایت کرنے والے ابن سعد، طبری اور بیہقی ہی ہیں۔ صحیحین و کتب اربعہ والوں میں سے کسی نے بھی یہ قصہ روایت نہیں کیا۔ امام احمد رحمہ اللہ اور دیگر معتبر محدثین کی کتابوں میں بھی اس قصے کا کوئی ذکر نہیں۔[2]

درحقیقت یہ قصہ سند اور متن دونوں لحاظ سے باطل ہے۔ اس کے بارے میں محققین کے اقوال قارئین کی نذر ہیں:

سند کے لحاظ سے اس قصے کا جھوٹ: ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا: ''بہت سے مفسرین نے یہاں غرانیق کا قصہ بیان کیا ہے لیکن اس کی تمام سندیں مرسل ہیں۔ مجھے اس کی کوئی صحیح سند دکھائی نہیں دی۔ واللہ اعلم۔''[3]

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اس قصے پر کئی اعتراضات کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ اس حدیث کو صحت کا التزام کرنے والے کسی محدث نے بیان نہیں کیا، نہ اسے کسی ثقہ اور معتبر راوی نے محفوظ اور متصل سند سے بیان کیا ہے جبکہ اس کے تمام راوی ضعیف ہیں، تمام سندیں مضطرب اور الفاظ مختلف ہیں۔ اس جیسی روایات میں

---

[1] النجم 53:19، 20. [2] الطبقات الکبریٰ: 1/205، 206. یہ روایت واقدی کی سند سے ہے اور واقدی ضعیف راوی ہے۔ وتفسیر الطبري: 17/131، 132. اس کی سند میں ابو معشر ہے۔ اس بنا پر یہ روایت ضعیف ہے۔ ودلائل النبوّة للبیهقي: 2/285-287. اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ [3] تفسیر ابن کثیر: 3/29

صرف وہ مفسرین و مؤرخین دلچسپی رکھتے ہیں جو ہر عجیب وغریب روایت بیان کرنے کے شائق ہیں اور کتابوں سے ہر صحیح وضعیف روایت نقل کرنے کے عادی ہیں۔ جن مفسرین و تابعین سے یہ قصہ منقول ہے اُن میں سے کسی نے اسے کسی صحابی کی طرف منسوب نہیں کیا، اُن سے بعد والی اکثر سندیں بھی ضعیف اور غیر معتبر ہیں......۔''[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس قصے کے ماخذوں اور اسانید کا حوالہ دینے کے بعد یوں تبصرہ کیا ہے: ''اس قصے کی تمام سندیں، سعید بن جبیر کی سند کے علاوہ، ضعیف ہیں یا منقطع، تاہم سندوں کی کثرت ظاہر کرتی ہے کہ اس قصے کی کچھ نہ کچھ بنیاد ضرور ہے۔ اس کی دو سندیں مرسل ہیں جن کے راوی صحیحین کی شرط پر پورے اترتے ہیں۔ ایک سند امام طبری نے یونس بن یزید عن ابن شہاب کی روایت سے بیان کی ہے اور دوسری معتمر بن سلیمان اور حماد بن سلمہ سے۔''[2]

دکتور عبدالمعطی قلعجی نے اس بے بنیاد قصے کی تردید میں بہت سے دلائل دیے ہیں۔[3]

شیخ البانی نے ایک رسالہ بعنوان ''نَصْبُ الْمَجَانِيقِ لِنَسْفِ قِصَّةِ الْغَرَانِيقِ'' لکھا ہے جس میں انھوں نے اس قصے کی تمام سندیں بیان کرنے کے بعد اُن کے ضعیف اور باطل ہونے کا حکم لگایا ہے۔

انھوں نے یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ یہاں کچھ مرسل روایات ہیں جن کی سندیں اوپر کے آخری راوی تک صحیح ہیں۔ اتنی بات میں تو وہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے متفق ہیں، تاہم نتیجہ اُن سے مختلف نکالتے ہیں۔ حافظ ابن حجر کا خیال ہے کہ سندوں کی کثرت کی بنا پر یہ آثار اور مرسل روایات قوی اور معتبر بن جاتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''جب سندیں زیادہ ہوں اور اُن کے مخرج الگ الگ ہوں تو اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور

[1] الشفاء للعياض: 2/750. [2] فتح الباري: 41/18. [3] دلائل النبوّة للبيهقي: 2/287-291، حاشية: 13.

ہے اور میں بتا چکا ہوں کہ ان مرسلات میں سے تین کی سندیں صحیح بخاری کی شرط پر ہیں۔ اور یہ ایسی مراسیل ہیں کہ مرسل روایت سے دلیل لینے والے محدثین تو ان سے لا محالہ استدلال کریں گے ہی لیکن جو محدثین مرسل کو حجت نہیں سمجھتے وہ بھی ان سے استدلال کریں گے کیونکہ ایک دوسرے سے مل کر انھیں تائید حاصل ہو جاتی ہے۔''[1] لیکن علامہ البانی کا خیال ہے کہ سندوں کی کثرت کی وجہ سے حدیث کا قوی ہو جانا غیر مشروط اور لازمی نہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں دلائل بھی بیان کیے ہیں۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ مرسل روایات قابلِ حجت نہیں کیونکہ اُن کے نزدیک انھیں ایک دوسرے سے تائید وتقویت حاصل نہیں ہو سکتی۔[2]

پروفیسر ڈکتور محمد مصطفیٰ اعظمی نے اس مسئلے میں شیخ البانی پر اعتراض کیا ہے کہ خود البانی صاحب نے ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے مرسل روایت کی حجیت کے مسئلے میں یوں نقل کیا ہے کہ اگر مرسل روایت دو سندوں سے آ رہی ہو اور دونوں راویوں کے اساتذہ وشیوخ مختلف ہوں تو یہ دلیل ہے کہ وہ روایت سچی ہے کیونکہ عموماً ایسا نہیں ہوتا کہ ثقہ راویوں کو ایک جیسی غلطی سے سابقہ پڑ جائے یا دونوں جانے بوجھے ایک جیسا جھوٹ بولیں......۔[3]

بعض محققین نے البانی پر اس اصول کی پیروی کا عیب لگایا ہے۔ اس لیے میں یہ وضاحت مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ اصول البانی کے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ انھوں نے اس ضمن میں امام شافعی رحمہ اللہ کی بات پر اعتماد کیا ہے اور امام شافعی کے بعد کئی ایک محققین، مثلاً: علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور امام نووی رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اس کو صحیح سمجھا ہے۔

علامہ سیوطی نے لکھا: ''اگر کسی مرسل روایت کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ یہ یا اس جیسی کوئی روایت کسی اور سند سے بھی مرسل یا متصل طور پر نقل کی گئی ہے اور اس دوسری

[1] فتح الباري: 42/18. [2] نصب المجانيق للألباني، ص: 20. [3] مغازي رسول الله ﷺ لعروة بن الزبير، ص: 107.

سند کے شیوخ پہلی سند سے مختلف ہوں تو وہ روایت صحیح ہوگی۔''[1] امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الرسالہ'' میں اس کی صراحت کی ہے، تاہم انھوں نے یہ قید لگائی ہے کہ وہ مرسل روایت کسی کبیر تابعی کی ہو اور وہ تابعی ہمیشہ ثقات ہی سے مرسل روایت کرتا ہو اور اگر دوسرے حفاظ اور معتبر راوی اس کے ساتھ کسی روایت میں شریک ہوں تو وہ اس کی مخالفت نہ کرتے ہوں۔ ایسی روایت کی قوت اُس وقت مزید بڑھ جائے گی جب وہ کسی صحابی کے قول کے مطابق ہو یا جمہور علماء کا فتویٰ اُس کی تائید کرتا ہو۔ اگر مذکورہ شرائط میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے تو مُرسل روایت قبول نہیں ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ ان تمام شرائط کا اس مزعومہ قصے میں پایا جانا ممکن نہیں۔ اس لیے حافظ ابن حجر کا ان مُرسل روایات کو قوی قرار دینا محض اُن کی انسانی غفلت ہے۔

دکتور ابوشہبہ نے حافظ ابن حجر کی اس بات کا جواب دیا ہے جو انھوں نے فتح الباری میں لکھی اور علامہ سیوطی وغیرہ نے اُن کی موافقت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

* ''جمہور محدثین نے مرسل کو قابل حجت نہیں سمجھا اور اُسے ضعیف کی ایک قسم قرار دیا ہے کیونکہ ممکن ہے محذوف راوی صحابی نہ ہو۔ ایسی صورت میں ہوسکتا ہے وہ ثقہ یا غیر ثقہ یا دوسری صورت میں کذاب بھی ہو۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے یہی حقیقت یوں بیان کی ہے: ''مرسل روایت ہمارے اور محدثین کے نزدیک حجت نہیں۔''[2] ابن الصلاح نے لکھا: ''یہ جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ مرسل کو دلیل بنانا صحیح نہیں اور وہ ضعیف ہے۔ اسی پر جمہور حفاظِ حدیث کا اتفاق ہے اور یہ بات انھوں نے اپنی کتابوں میں بھی بیان کی ہے۔ مُرسَل کو بطور دلیل لینا امام مالک، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اُن کے متبعین کا مذہب ہے۔ کچھ اور لوگ بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ چند شرائط کے ساتھ مُرسَل کو دلیل بناتے ہیں۔ وہ شرائط امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی معرکہ آرا کتاب ''الرسالہ'' میں بیان کی ہیں۔ عراقی نے

[1] تدريب الرّاوي في شرح تقريب النواوي للسيوطي:1/198,199. [2] مقدمة صحيح مسلم:1/30.

انھیں اپنی منظوم کتاب ''الفية الحديث'' کی شرح میں بیان کیا ہے۔'' [1]

* مرسل روایت سے فروعی معاملات میں تو استدلال کیا جا سکتا ہے جہاں ظنِ غالب معتبر ہوتا ہے مگر ایسے معاملے میں اس سے استدلال کرنا قطعاً قابلِ توجہ نہیں جو عقیدہ اسلامیہ سے متصادم ہو اور رسالت مآب ﷺ کی عصمت کے منافی ہو۔ پھر یہ قصہ ائمۂ صحاحِ ستہ، امام احمد اور قابلِ اعتماد کتبِ حدیث کے مصنفین میں سے کسی نے بھی روایت نہیں کیا۔ [2]

یہ قصہ ازروئے عقل بھی باطل ہے

قرآن کی مخالفت: دکتور اعظمی نے اس افتراپردازی کی تردید کرتے ہوئے لکھا: ''بالفرض تسلیم کر لیں کہ یہ قصہ سنداً صحیح ہے تو کیا اس طرح یہ قصہ صحیح ثابت ہو جائے گا؟ معاذ اللہ! ہرگز نہیں! کیونکہ سب جانتے ہیں کہ شاذ حدیث ضعیف ہوتی ہے، حالانکہ شاذ روایت کو بیان کرنے والا راوی ثقہ اور معتبر ہوتا ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ اُس نے اس حدیث میں اپنے سے زیادہ ثقہ ایک راوی یا اپنے جیسے کئی ثقہ راویوں کی مخالفت کی ہوتی ہے۔ گویا یہ خبر واحد ہوتی ہے۔ اگر خبر واحد شاذ ہونے کی صورت میں قابل قبول نہیں تو وہ خبر واحد جو قرآن مجید یا اجماع امت کے خلاف ہو وہ کیسے قابل قبول ہوگی؟ مثال کے طور پر انبیاء کا معصوم عن الخطا ہونا اجماعی مسئلہ ہے جو حدیث اس کے خلاف ہوگی وہ نہ صرف شاذ بلکہ موضوع ہوگی۔'' [3]

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ بہت پہلے کہہ چکے ہیں: ''ہر وہ حدیث جو عقلِ صریح یا اجماعی اور مُسلّم اصول کے خلاف ہو، یقین رکھو وہ موضوع ہوگی اور اُس کو معتبر نہیں سمجھا جائے گا۔'' [4]

امام ابن ابی حاتم رازی کا کہنا ہے: ''کسی حدیث کا صحیح ہونا اس کے راویوں کے عادل

[1] مقدمة ابن الصّلاح، ص: 58. [2] السيرة النبوية في ضوء الكتاب والسنّة: 369,368/1.
[3] حاشية على مغازي رسول الله ﷺ لعروة بن الزبير. [4] فتح المغيث لابن الجوزي، ص: 114.

ہونے پر موقوف ہے، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بات نبی ﷺ کی بات ہونے کے شایانِ شان ہو۔'' تو کون سی عقل چاہے وہ کتنی ہی گئی گزری ہو اس بات کو قبول کر سکتی ہے کہ توحیدِ خالص کی طرف دعوت دینے والا ''نبیٔ عالی مقام'' اس حد تک گر سکتا ہے کہ مشرکین سے اس طرح مصالحت کرے کہ اُن کے جھوٹے معبودوں کی تعریف کرے اور پھر اس تعریف کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دے؟ [1]

جب سورج کے مانند روشن اور صحیح سندیں اس قسم کے قصے کو صحیح ثابت نہیں کر سکتیں تو ایسی ضعیف سندیں اس قصے کو کیسے ثابت کر سکتی ہیں کہ ہمیں اُس قصے کی تاویلیں کرنے کی ضرورت پیش آئے...... یہ قصہ قرآنِ کریم کی تعلیماتِ عالیہ کے خلاف ہے۔ اس کی واضح ترین دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان سے فرما دیا تھا:

﴿ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ۝ ﴾

''بلاشبہ میرے بندے، تیرا ان پر کوئی غلبہ نہیں مگر گمراہوں میں سے جس نے تیرا اتباع کیا۔'' [2]

گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو گمراہی سے کوسوں دور رکھا ہے اور شیطان کا سردار ابلیس خود اقرار کرتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں پر غلبہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝ ﴾

''اس نے کہا: تو قسم ہے تیری عزت کی! میں ضرور بالضرور ان سب کو گمراہ کر دوں گا۔ مگر ان میں سے تیرے وہ بندے جو خالص کیے ہوئے ہیں۔'' [3]

غور فرمائیے نبیٔ عالی مقام حضرت محمد ﷺ سے بڑھ کر کون مخلص و خالص ہو سکتا ہے؟ بلکہ شیطان کو تو اُن مومنین پر بھی غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا جو رب تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں

[1] مقدّمة الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ص:351. [2] الحجر15:42. [3] صٓ38:82,83.

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ ﴾

”بلاشبہ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں پر اس کا کوئی غلبہ نہیں جو ایمان لائے اور وہ صرف اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔“ [1]

رسول اللہ ﷺ بلکہ عام انبیاء سے بڑھ کر کون سچے ایمان والا اور توکل کرنے والا ہوسکتا ہے؟

اس قصّے کی روایات متضاد ہیں: اس قصّے کے ضعیف اور غیر معتبر ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ اس سے متعلقہ روایات سخت مضطرب ہیں۔ایک روایت میں ہے کہ یہ واقعہ نماز سے باہر پیش آیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نماز کی حالت میں تھے۔تیسری روایت میں ہے: ”یہ الفاظ بھولے چوکے زبان سے نکل گئے۔“ چوتھی روایت میں ہے کہ شیطان نے آپ کی زبان سے ادا کرا دیے۔ پانچویں روایت میں ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے اُونگھ کی حالت میں یہ الفاظ غیر ارادی طور پر پڑھ دیے۔چھٹی روایت میں ہے کہ جب آپ نے قراءت میں سکتہ کیا تو شیطان نے سکتہ میں آپ جیسی آواز بنا کر یہ الفاظ پڑھ دیے۔ سامعین سمجھے کہ آپ ﷺ نے پڑھے ہیں۔ اسی طرح تلك الغرانيق العلٰى کے الفاظ بھی مختلف طریقوں سے بیان ہوئے ہیں۔

عربی زبان و بیان کی رُو سے بھی یہ قصہ مہمل ہے: شیخ ابوشہبہ نے اس جھوٹے قصے کو از رُوئے عربی زبان رد کرنے کے لیے شیخ محمد عبدہ کی رائے بھی نقل کی ہے۔ شیخ عبدہ نے کہا: ”عربی نظم و نثر میں کہیں بھی معبودوں کو غرنیق نہیں کہا گیا۔عربی کے کسی خطبے میں ایسا کوئی ذکر نہیں ہے۔ نہ کسی سے یہ منقول ہے کہ یہ لفظ اُن کی زبان پر اس معنی میں جاری ہوتا ہے۔ معجم یاقوت میں یہ بات بلاسند کہی گئی ہے۔لغت میں معروف یہ ہے

[1] النحل 16:99.

کہ غُرْنُوق، غِرْنُوق، غُرْنِیق، غِرْنِیق پانی میں رہنے والے ایک سیاہ یا سفید پرندے کا نام ہے۔ اس کا دوسرا مطلب خوبصورت سفید رُو جوان ہے۔ اور بھی کئی معانی ہیں مگر اس کے کوئی لغوی معنی الوہیت یا بتوں سے میل نہیں کھاتے کہ ان معنی کو اُن کے لیے بولا جا سکے اور پھر انھیں فصیح بھی کہا جا سکے۔''[1]

اس قصے کے باطل ہونے کی ایک دلیل لغوی اسلوب کے لحاظ سے ہے اور وہ یہ کہ اس کو گھڑنے والے راویوں کے نزدیک غرانیق والی آیات سورۂ نجم کی آیات: (19-22) کے بعد اور آیت: (23) سے پہلے تھیں۔

غور کیجیے کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟! پہلے مذمت پھر تعریف اور پھر اسی کی مذمت۔ اگر یہ قصہ صحیح ہوتا تو کم از کم ماقبل اور مابعد کے ساتھ اس کی کچھ تو مناسبت ہوتی اور نظم میں خرابی اور کلام میں تناقض نہ ہوتا۔ یہ بات تو ایک مبتدی طالب علم پر بھی مخفی نہیں چہ جائیکہ قریشِ عرب، جو فصاحت و بلاغت میں شہرت رکھتے تھے، اس تناقض کو محسوس ہی نہ کر سکیں۔[2]

باقی رہی وہ آیت جس کی تفسیر میں یہ قصۂ غرانیق بیان کیا جاتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

''اور ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول اور نبی بھیجا جب وہ تلاوت کرتا تو شیطان اس کی تلاوت میں (اپنی طرف سے کچھ) ڈال دیتا، پھر اللہ اسے مٹا دیتا جو شیطان نے (وسوسہ) ڈالا ہوتا، پھر اللہ اپنی آیات کو محکم کر دیتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔''[3]

اس کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ﴿تَمَنّٰٓى﴾ کی جو

[1] السّيرة النّبوية في ضوء القرآن والسّنّة:1/367. [2] فقه السيرة للغزالي، ص: 118، والسيرة النبوّية في ضوء القرآن والسنة:1/372,371. [3] الحج 22:52.

تفسیر ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ﴿تَمَنّٰى﴾ کی تفسیر تلاوت اور قراءت ہی سے کی جائے کیونکہ یہی وہ تفسیر ہے جس کی خاطر غرانیق والا جھوٹا قصہ وضع کرنا پڑا اور طرح طرح کی آفتیں اور مصیبتیں لازم آئیں۔ یہ تفسیر اس لیے لازم نہیں کہ آیت میں تمنی کے ساتھ کتاب وغیرہ کی قید نہیں لگی بلکہ اس کا کوئی مفعول ہی نہیں ہے۔[1]

اس کی صحیح تفسیر ''حَدَّث'' کے صیغے کے ساتھ (جیسا کہ صحیح بخاری میں ابن عباس کی حدیث ہے) اس طرح ہو سکتی ہے کہ جب بھی کوئی نبی یا رسول اپنے دل میں اپنی قوم کی ہدایت کی خواہش اور رغبت کی باتیں کرتا تھا...... اگر یہ تفسیر کی جائے تو یہ ان معنی کے مطابق ہوگی جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مسند ابن حُمید میں آئے ہیں۔ پس یہی تفسیر اختیار کرنا ضروری ہے کیونکہ یہی تفسیر لغت کے مطابق ہے جسے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

عرجون نے اپنی کتاب ''محمد رسول اللہ ﷺ'' میں لکھا ہے: ''ابن منظور نے ''لسان العرب'' میں احادیث و آثار سے شواہد نقل کیے ہیں اور ائمۂ لغت کا کلام بھی نقل کیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ''أُمنية'' کے معنی ارادہ، محبت، کسی چیز کے حصول کی رغبت اور اس کے وقوع کی خواہش کرنا ہیں، البتہ ''تمني الكتاب'' کے معنی پڑھنا اور لکھنا ہیں۔ لغت کے امام جوہری کی یہ عبارت صریح ہے کہ مطلق ﴿تَمَنّٰى﴾ کے معنی ارادہ اور خواہش رکھنا ہیں، تلاوت اور قراءت کے معنی میں یہ اُسی وقت استعمال ہوگا جب اس کے ساتھ کتاب کی قید بھی لگی ہو۔

زمانے کے اعتبار سے بھی یہ قصہ باطل ہے: پروفیسر شامی نے اس بہتان کی تردید کے لیے یہ دلیل بھی دی ہے کہ سورۂ حج کی یہ ''آیتِ تمني'' اگر مدنی نہ بھی ہو تب بھی یہ مدینہ اور مکہ کے درمیان نازل ہوئی ہے اور یہ قصہ بیان کرنے والوں کے قول کے مطابق

[1] محمد رسول اللہ ﷺ لعرجون: 75/2.

مکی ہے (بلکہ مکی دور کے آغاز کا ہے۔) تو کیا عقل باور کر سکتی ہے کہ اس واقعے اور متعلقہ آیت کے نزول کے درمیان اتنی طویل مدت حائل ہو؟![1]

مشرکین کے سجدے کا سبب: صحیح بخاری میں اتنی بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں اور مشرکین کے ایک ملے جلے مجمع میں سورۂ نجم پڑھی۔ جب آپ ﷺ سورت کے اختتام پر پہنچے تو آپ ﷺ نے سجدہ کیا، پھر کیا مسلمان اور کیا مشرک سب کے سب یکبارگی سجدے میں گر پڑے۔

اصل بات یہ ہے کہ اس سورت کی آخری آیات دل ہلا دینے والی ہیں جنھیں سُن کر دل میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے بلند آواز سے وہ آیات پڑھیں اور پُر جلال لہجے میں انھیں ڈراتے ہوئے اس مقام پر پہنچے:

﴿وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ۙ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ○ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ○ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۚ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ۗ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ۙ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ۙ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ○﴾

''اور اس نے الٹ جانے والی بستی کو زمین پر دے مارا، پھر اس کو اس (تباہی و بربادی) نے ڈھانپ لیا جس نے ڈھانپا، پھر (اے انسان!) تو اپنے رب کی کن کن نعمتوں میں شک کرے گا؟ یہ (رسول) تو پہلے ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانے والا ہے۔ قریب آنے والی (قیامت) قریب آگئی۔ اس (قیامت) کو اللہ کے سوا کوئی ظاہر کرنے والا نہیں۔ کیا پھر اس بات (قرآن) سے تم تعجب کرتے ہو؟ اور تم ہنستے ہو اور روتے نہیں۔ اور تم کھیل کود میں مست ہو۔''[2]

تو حق کی رعنائی اور زیبائی کے آگے یہ متکبرین اس قدر بے بس ہوگئے کہ بے اختیار اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے۔ مسلمانوں کو تو بہر حال سجدہ کرنا ہی تھا حتی کہ ولید بن مغیرہ، جو

[1] من معين السيرة للشامي، ص: 76، حاشية: 3. [2] النجم 53:53-61.

بہت بوڑھا ہو چکا تھا اس نے بھی کنکریوں کی ایک مٹھی اٹھائی اور اُسی پر سر رکھ دیا۔ [1]

لیکن جب انھیں ہوش آیا اور انھوں نے محسوس کیا کہ ایمانی رعب و جلال نے ہماری لگام موڑ دی تھی تو وہ انتہائی نادم ہوئے اور خفت کے مارے کہنے لگے کہ ہم نے تو محمد ﷺ کے ساتھ سجدہ اس لیے کر لیا کہ انھوں نے ہمارے بتوں کی تعریف کی تھی۔ [2]

دوسری ہجرت حبشہ

جب پہلی ہجرتِ حبشہ میں جانے والے بعض افراد واپس آئے اور انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں پر تو ابتلا اور مصائب میں مزید اضافہ ہو چکا ہے تو اس بے چارگی کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو دوبارہ ہجرت کی اجازت دی۔ اس ہجرت میں اسّی (80) سے زیادہ مرد اور انیس (19) عورتیں شامل تھیں۔ [3]

مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نجاشی کی طرف بھیجا۔ ہم تقریباً اسی آدمی تھے۔ ان میں جعفر، عبداللہ بن عرفطہ، عثمان بن مظعون اور ابوموسیٰ اشعری جیسے سابقون اولون صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ انھوں نے عورتوں کی تعداد نہیں بتائی۔ [4]

ابن سعد نے لکھا ہے کہ مردوں کی تعداد تراسی تھی۔ گیارہ خواتین قریشی تھیں اور سات مکہ سے باہر کی تھیں۔ [5] ابن اسحاق نے کہا ہے کہ مرد اسی سے زائد تھے۔ انھوں نے سولہ عورتوں کے نام لکھے ہیں۔ [6] سیرت ابن ہشام میں ہے کہ وہ تراسی آدمی تھے۔ اگر ہم

[1] صحيح البخاري، التفسير، باب ﴿فَاسْجُدُوا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوا ۝﴾، حديث: 4863,4862. صحیح بخاری میں امیہ بن خلف کا نام ہے۔ [2] فقه السيرة للغزالي، ص: 117، 118. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 408/1. ابن اسحاق نے اسے بلا سند روایت کیا ہے۔ وزادالمعاد: 26/3. [4] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 185/6. احمد شاکر کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند حسن ہے۔ [5] الطبقات الكبرىٰ: 207/1. واقدی کی یہ سند ضعیف ہے۔ [6] السير و المغازي لابن إسحاق، ص: 228.

ریطہ بنت حارث کے ہاں پیدا ہونے والی بچی کو شمار کر لیں تو عورتوں کی تعداد ابن ہشام کے نزدیک بیس ہو جائے گی۔[1] علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے عورتوں کی تعداد انیس بتائی ہے۔[2] واللہ أعلم.

معلوم یوں ہوتا ہے کہ عورتوں کی تعداد میں اختلاف کا سبب یہ ہے کہ بعض لوگوں نے چھوٹی بچیوں کو بھی شمار کر لیا ہے۔ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث مہاجرین (برائے ہجرت ثانیہ) کی تعداد کے بارے میں مؤرخین کی ہمنوا ہے، چنانچہ یہ تعداد قابل قبول ہے۔

مہاجرین کو واپس پکڑ لانے کی کوشش

ابن اسحاق نے ہجرتِ حبشہ کے بارے میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت یوں بیان کی ہے: ''جب ہم حبشہ پہنچے تو ہم نے بہترین پناہ دہندہ نجاشی کے ہاں پناہ لی۔ ہم اپنے دین کے متعلق بے خوف ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے لگے۔ ہمیں کوئی تکلیف دی جاتی تھی نہ ہمیں کوئی نامناسب بات سننی پڑتی تھی۔ قریش کو اس صورت حال کا پتہ چلا تو انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ نجاشی کے پاس دو مضبوط جوان بھیجے جائیں۔ اُن کے ہاتھ نجاشی کو مکہ کے بہترین تحائف ارسال کیے جائیں۔ مکہ سے جو بہترین چیز حبشہ بھیجی جاتی تھی وہ نفیس چمڑا تھا۔ قریشیوں نے بہت سا چمڑا اکٹھا کیا اور اُسے بطورِ تحفہ بھیجا۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے نجاشی کے ہر بطریق کو بھی تحفے تحائف بھیجے اور یہ سارا مال و متاع عبداللہ بن ابی ربیعہ[3] اور عمرو بن عاص کے ہاتھ روانہ کیا اور انھیں نصیحت کی کہ وہ

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 408/1. روایت بلا سند ہے، اس لیے ضعیف ہے۔ [2] زاد المعاد: 26/3. ابن القیم نے یہ روایت ابن اسحاق کی السیر والمغازی سے نقل کی ہے۔ روایت ضعیف ہے۔
[3] عبداللہ بن ابی ربیعہ کا ذکر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے جسے امام احمد نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے، دیکھیے: (مسند أحمد: 185/6) اس حدیث کے بارے میں تفصیل گزر چکی ہے۔ قریش ◄◄

نجاشی سے پہلے ہر بطریق کو تحفے پیش کریں، پھر آخر میں نجاشی کو تحفے پیش کریں اور درخواست کریں کہ کوئی تحقیق و تفتیش کیے بغیر مسلمانوں کو ہمارے سپرد کر دیا جائے۔ یہ دونوں نجاشی کے پاس پہنچے۔ اُس کے بطریقوں کو تحفے پیش کیے اور کہا: ''تمھارے ملک میں ہمارے کچھ بے وقوف نوجوان بھاگ آئے ہیں۔ وہ اپنی قوم کا دین چھوڑ چکے ہیں اور تمھارا دین بھی قبول نہیں کیا۔ وہ کوئی نیا دین لے کر آئے ہیں جس کے نہ ہم قائل ہیں نہ تم۔''[1]

حدیث میں ہے کہ قریشی وفد نے بطریقوں سے طے کیا کہ وہ نجاشی کو مشورہ دیں کہ ان لوگوں کو بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے وفد کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن جب بات نجاشی کے پاس پہنچی تو اُس نے یہ مشورہ نہ مانا اور کہا کہ اُن لوگوں کو میرے پاس لایا جائے تا کہ میں بذاتِ خود اُن کی بات سن سکوں۔

جب مسلمان نجاشی کے پاس حاضر ہوئے تو ان کی طرف سے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بات کی۔ انھوں نے نجاشی کے سامنے حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین کی حقیقت بیان کی اور کفار کا طرزِ عمل بھی بتایا۔[2] نجاشی نے اُن سے آپ ﷺ کی لائی ہوئی وحی

◂◂ نے عمرو بن عاص کے ساتھ عمارہ بن ولید کو حبشہ بھیجا تھا۔ عرجون نے مختلف روایات کو سامنے رکھ کر اپنی کتاب میں اس امر کو ترجیح دی ہے کہ قریش نے دوسری ہجرت حبشہ میں مسلم مہاجرین کے پیچھے ایک وفد حبشہ بھیجا جس کے سرکردہ مندوبین عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ تھے جبکہ عمارہ بن ولید بھی ایک رکن کی حیثیت سے اس وفد میں شامل تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (محمد رسول اللہ ﷺ لعرجون: 2/21-24) [1] السیر و المغازي لابن إسحاق، ص: 213، والسیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 1/413. سند حسن ہے۔ [2] سیرت ابن ہشام کے محققین کی تحقیق کے مطابق ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں ہے جسے ابن اسحاق نے بسند صحیح نقل کیا، ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''......اور ہمیں نبی ﷺ نے نماز پڑھنے، زکاۃ ادا کرنے اور روزے رکھنے کا حکم دیا۔'' انھوں نے کہا: ''پھر جعفر بن ابی طالب نے ایک ایک کر کے اسلام کے اوامر نجاشی کو بتائے......'' یہاں ایک اشکال ہے اور وہ ہے نماز پڑھنے، زکاۃ ادا کرنے اور روزے رکھنے کا حکم۔ وجہ یہ ہے کہ نماز ہجرت حبشہ کے بعد معراج کے واقعے میں فرض کی گئی اور زکاۃ، سید سابق کی تحقیق کے مطابق اسلام کے ابتدائی دنوں میں مکہ میں فرض ہو چکی ◂◂

میں سے کچھ پڑھنے کو کہا۔ حضرت جعفر نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات پڑھ کر سنائیں۔ نجاشی سن کر رونے لگا اور اس قدر رویا کہ اُس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ اُس کے

» تھی لیکن یہ حد بندی نہیں کی گئی تھی کہ مال کی کتنی مقدار بطورِ زکاۃ ادا کی جائے اور یہ معاملہ مسلمانوں کے جذبات اور جود و سخا پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہجرت مدینہ کے دوسرے سال، راجح یہی ہے، ہر نوع کے مال سے زکاۃ کی مقدار مقرر کی گئی۔ روزوں کے متعلق سید سابق نے لکھا: ''روزے کی فرضیت ہجرت مدینہ کے دوسرے سال پیش آئی۔'' دیکھیے: (فقه السنة: 328/1 و 433/1) میں (مصنف کتاب) کہتا ہوں: ''فرضیتِ صلاۃ سے قبل رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام پر نماز پڑھنا واجب نہیں تھا۔'' امام عینی نے اس امر کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے کہ نماز کب فرض قرار دی گئی۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ معراج کے واقعے میں دو رکعت نماز فرض کی گئی۔ ہجرت مدینہ کے بعد دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ بعد ازاں مقیم کی نماز چار رکعت برقرار رکھی گئی اور سفر کی نماز میں تخفیف کر کے اسے دو رکعت کر دیا گیا۔ واقعۂ معراج سے قبل صرف صلاۃ اللّیل (رات کی نماز) فرض تھی جو بغیر کسی وقت یا تعدادِ رکعات کی حد بندی کے تھی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کبھی دو تہائی رات کا قیام کرتے، کبھی نصف رات کا اور کبھی ایک تہائی رات کا، دیکھیے: (عمدة القاري: 52/4) اور حافظ ابن حجر نے لکھا: ''علماء کے ایک گروہ کا میلان اس طرف ہے کہ واقعۂ معراج سے قبل کوئی نماز فرض نہیں تھی، سوائے صلاۃ اللّیل کے جو بنا کسی حد بندی کے تھی۔'' دیکھیے: (فتح الباري: 12/3)

الحربي اس طرف مائل ہیں کہ (واقعۂ معراج سے قبل) دو رکعت پہلے پہر (صبح) اور دو رکعت پچھلے پہر فرض تھی۔ امام شافعی نے بعض اہل علم کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ صلاۃ اللّیل فرض تھی، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ ''تم (اس قرآن) سے جو آسان ہو پڑھو'' تو ساری رات کی نماز منسوخ کر دی گئی اور رات کے کچھ حصے کی نماز فرض رہ گئی، پھر یہ نماز بھی پانچ نمازوں (صلاۃ خمسہ) کی فرضیت پر منسوخ ہوگئی۔ محدث محمد بن نصر مروزی نے بعض اہلِ علم کی اس بات کو درست نہ سمجھتے ہوئے کہا: ''آیت بتا رہی ہے کہ اس کا یہ حصہ ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ مدینہ میں نازل ہوا۔ اس کی وجہ اسی آیت میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا ہے: ﴿وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''اور کچھ دوسرے اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔'' لڑائی (قتال) کا حکم مدینہ میں نازل ہوا نہ کہ مکہ میں اور واقعۂ معراج اس سے قبل مکہ میں پیش آیا تھا۔'' محدث مروزی نے جس طریقے سے استدلال کیا وہ واضح نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ﴿عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ﴾ واضح طور پر مستقبل کے صیغے میں ہے گویا اللہ تعالیٰ »

دربار کے پادریوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی خوب روئے۔ اُن کے ہاتھوں میں موجود مقدس کتابیں آنسوؤں کی جھڑی سے بھیگ گئیں۔ پھر نجاشی نے قریش کے سفیروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ''یہ تعلیم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی تعلیم ایک ہی منبعِ نور سے نکلی ہوئی ہے۔ جاؤ، چلے جاؤ، اللہ کی قسم! میں انھیں کبھی بھی تمھارے سپرد نہیں کروں گا۔''

جب وہ دونوں باہر نکلے تو عمرو بن عاص عبداللہ سے کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! کل میں ایسا حیلہ اختیار کروں گا جو ان کی کھیتی کو ملیا میٹ کر دے گا (ان کا کوئی فرد زندہ نہیں چھوڑوں گا۔)''

اگلے دن عمرو بن عاص پھر نجاشی کے پاس پہنچے۔ کہنے لگے: ''یہ لوگ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کے بارے میں بہت گستاخی کی بات کہتے ہیں۔'' نجاشی نے مسلمانوں کو پھر بلا بھیجا۔ وہ آ گئے تو اس نے پوچھا: ''حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں تم کیا عقیدہ رکھتے ہو؟'' حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''اُن کے بارے میں ہم وہی کہتے ہیں جو ہمارے نبیٔ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اُس کے رسول ہیں۔ اُس کی بھیجی ہوئی روح اور کلمہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کنواری مریم بتول (مقدس) کی طرف القا کیا تھا۔''

« مسلمانوں پر اپنا احسان جتا رہا ہے کہ اس نے ان مشکلات کے پیش آنے سے قبل ہی جن کے بارے میں اسے علم ہے کہ وہ پیش آئیں گی، تمھارے لیے نماز میں آسانی کا سامان کر دیا ہے، واللہ أعلم.

ابن حجر کا کہنا ہے ''یہ حل میرے سامنے آیا اور اسی سے سابقہ دلائل کو باہم تطبیق دیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ نمازِ مغرب کے سوا پانچوں نمازیں معراج کی رات کو دو دو رکعت فرض کی گئیں، پھر ہجرت کے فوراً بعد صبح کی نماز کے سوا تمام نمازوں میں دو دو رکعت کا اضافہ کر دیا گیا، یہ بیان اس روایت کے مطابق ہے جسے امام شعبی کی سند سے ابن خزیمہ، ابن حبان اور بیہقی نے بیان کیا ہے......'' دیکھیے: فتح الباري: 11/3، والرّوض الأنف: 284/1. ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھنا اور وضو کرنا سکھایا تھا۔ وسبل السّلام للصنعاني: 397/2، والبداية والنهاية: 129/3، وتفسير القرآن العظيم: 347/2.

نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور حضرت جعفر سے کہا: ''آپ نے جو کچھ فرمایا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُس سے اس تنکے کے برابر بھی زائد نہیں۔'' درباری بطریق اگرچہ اس پر چیں بجبیں ہو رہے تھے مگر نجاشی نے اُن کی کوئی پروا نہ کی اور مسلمانوں کو اپنے علاقہ میں پروانۂ امن عطا کر دیا اور قریش کے تحائف واپس کر کے انھیں ناکام و نامراد لوٹا دیا۔[1]

قریش کی یہ سفارت تو ناکامی سے دوچار ہوئی مگر انھوں نے اس کا غصہ ان مجبور و بے بس مسلمانوں پر نکالا جو اُن کے پنجۂ ستم میں گرفتار تھے، البتہ اسلام کو اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ دو عظیم افراد حضرت نجاشی اور حضرت عمرو بن عاص کے ایمان لانے کی راہ ہموار ہوگئی۔[2]

مسلمان یہاں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ جب مکہ کے مسلمان مدینہ منورہ ہجرت کر گئے تو حبشہ کے کچھ مہاجر تو جنگِ بدر سے قبل ہی مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ یہ تینتیس آدمی تھے اور آٹھ عورتیں۔[3] باقی مہاجرین حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں اُس وقت واپس گئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی فتح سے فارغ ہوئے۔ یہ 7 ہجری کی بات ہے۔[4]

ہجرتِ حبشہ کی حکمتیں اور اسباق

* بعض مسلمانوں کے حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کے لیے دارالکفر میں رہ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا مشکل اور ناممکن ہو جائے تو اُس

[1] ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا پورا مضمون ملاحظہ کیجیے: (السیر والمغازي لابن إسحاق: 213-216)
[2] اس کی تفصیل آئندہ آرہی ہے کہ عمرو بن عاص کیسے اسلام لائے اور کس طرح ان کا حبشہ کی طرف بطور سفیر جانا ان کے قبول اسلام کا پیش خیمہ بن گیا، نیز یہ کہ نجاشی اور ان کے بطریق عربی زبان کا کتنا درک رکھتے تھے۔ [3] صحیح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النّبيّ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3905، والفتح الرّباني: 280/20، والطبقات الکبریٰ: 207/1. [4] صحیح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة الحبشة، حديث: 3876.

کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُس جگہ چلا جائے جہاں وہ آزادانہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکے۔ یہ تفصیل ہجرتِ مدینہ کی بحث میں آئے گی۔ ان شاء اللہ

* اللہ تعالیٰ کے راستے میں جان، مال اور وطن قربان کرنا بھی دین کے بنیادی اُمور میں شامل ہے کیونکہ اگر دین ہی ختم ہوگیا تو جان، مال یا وطن کا کیا فائدہ؟ یہ چیزیں دین کے تابع ہیں۔ دین ختم ہونے کے بعد یہ چیزیں بھی نابود ہو جاتی ہیں۔ اگر دین قوی ہو، اس کی شان و شوکت بلند ہو، معاشرے میں اس کے ارکان مستحکم ہوں اور دلوں میں اس کے عقیدے جاگزیں ہوں تو دین کے راستے میں جو چیز بھی صرف ہو جائے، مال ہو یا زمین و وطن، وہ پہلے سے بھی زیادہ قوی بن جاتی ہے کیونکہ شرف، قوت اور بصیرت کے انوار اُس کے محافظ بن جاتے ہیں۔ ہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہجرت بذاتِ خود تکلیف اور مصیبت کا مجسمہ تھی لیکن یہ سب کچھ اور مال و وطن کی قربانی دین کی خاطر ہے، یعنی بڑی مصیبت سے بچنے کے لیے ایک چھوٹی مصیبت اُس وقت تک گوارا کر لی جائے جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد نہیں آ جاتی۔

* مسلمانوں کے لیے ایسے پرآشوب حالات میں غیر مسلموں کی پناہ حاصل کرنا جائز ہے، چاہے وہ غیر مسلم اہل کتاب ہوں جیسے نجاشی جو عیسائی تھے یا وہ مشرک ہوں جیسے واپس آنے والے مسلمان بعض مشرک سرداروں کی پناہ لے کر مکہ میں داخل ہوئے تھے اور رسول اللہ ﷺ کو حضرت ابوطالب کی پناہ اور حمایت حاصل تھی۔ اور آپ ﷺ نے طائف سے واپسی کے وقت مطعم بن عدی کی پناہ حاصل کی تھی۔ [1]

* عبیداللہ بن جحش کے مرتد ہو جانے میں بھی نصیحت و عبرت کا سامان موجود ہے۔ اُس کا ارتداد مسلمانوں کے لیے شدید صدمے کا باعث تھا کیونکہ وہ پہلے حنفاء (موحدین) میں شمار ہوتا تھا، پھر وہ مسلمان ہوا اور اپنی بیوی کے ساتھ ہجرت حبشہ کی لیکن وہاں

[1] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 100-102.

جا کر عیسائی ہو گیا۔ وہ مسلمانوں سے کہا کرتا تھا: ”ہمیں سب کچھ کھلی آنکھوں سے نظر آ گیا تم آنکھیں جھپکاتے رہ گئے۔“ دراصل کتے کا بچہ اپنی پیدائش کے بعد جب دیکھنا چاہتا ہے تو وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش میں انھیں جھپکاتا ہے، پھر دیر بعد اس کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ اُس نے یہ مثال اپنے آپ پر اور مسلمانوں پر چسپاں کی تھی۔ [1]

حضرت نجاشی کا قبول اسلام

مؤرخ ابن اسحاق نے اپنی ایک روایت میں بیان کیا ہے کہ جب حضرت نجاشی فوت ہوئے تو بتایا جاتا تھا کہ اُن کی قبر پر عرصۂ دراز تک نور نظر آتا رہا۔ [2] اس صحیح روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہو گئے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جب وہ مسلمان ہوئے تو اُن کی قوم نے اُن کے خلاف بغاوت کر دی۔ انھوں نے باغیوں کے خلاف فوجی کارروائی کرنے سے پہلے مسلمانوں کے لیے بحری جہاز تیار کرا دیے تاکہ اگر شکست ہو جائے تو مسلمان اُن پر سوار ہو کر عرب پہنچ جائیں۔ ایک تحریر بھی لکھی جس میں اس نے اپنے اسلام لانے کا اقرار کیا۔ یہ تحریر نبیِ کریم ﷺ تک پہنچ گئی تھی۔ اس لیے جب وہ فوت ہوئے تو نبیِ اکرم ﷺ نے اُن کے لیے دعائے مغفرت کی۔ [3]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 11/4. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند مرسل اور عروہ پر موقوف ہے، تاہم اس کے راوی ثقہ ہیں۔ والسيرة النبوية لابن هشام: 285/1. یہ بھی ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند منقطع ہے کیونکہ محمد بن جعفر جس نے یہ واقعہ ابن اسحاق سے بیان کیا، وہ اس کا براہِ راست راوی نہیں ہے۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 420/1. اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ [3] السيرة النبوية لابن هشام: 421/1. اس روایت کی سند مرسل حسن ہے اور اس کا مضمون ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مخالف ہے۔ بخاری و مسلم نے یہ روایت اپنی اپنی کتابوں میں نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ نے، جس دن نجاشی نے وفات پائی، ان کی وفات کا اعلان کیا اور فرمایا: ”اپنے بھائی کے لیے دعائے ◄◄

ابن اسحاق کی یہ بات بنیادی طور پر صحیحین کی روایات کے مطابق ہے جن میں نجاشی کے مسلمان ہونے کا ذکر ہے۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کی وفات کی خبر اُسی دن دے دی تھی جس دن وہ فوت ہوئے تھے۔ [1] یہ 9 ہجری کی بات ہے۔ اور آپ ﷺ نے اُن کی غائبانہ نماز جنازہ بھی پڑھائی تھی۔ بخاری و مسلم ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«قَدْ تُوُفِّيَ الْيَوْمَ رَجُلٌ صَالِحٌ مِّنَ الْحَبَشِ، فَهَلُمَّ، فَصَلُّوا عَلَيْهِ»

''آج حبشہ کا ایک نیک شخص چل بسا۔ آؤ اُس کی نماز جنازہ پڑھو۔'' [2]

یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی کی موت کی اطلاع دینا درست ہے کیونکہ اس کا مقصد اُس کے لیے دعائے مغفرت کرنا ہے، البتہ فخر و تکبر اور لوگوں کی کثرت اور اظہار وجاہت کے لیے اعلانات ممنوع ہیں۔ اسی طرح میت کے اوصاف بیان کر کے اعلان وفات کرنا بھی ممنوع ہے۔ (تفصیل کے لیے موطا امام مالک دیکھیے)

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمھارا ایک بھائی

» مغفرت کرو۔'' دیکھیے: (صحيح البخاري، الجنائز، باب الصّلاة على الجنائز بالمصلى والمسجد، حديث: 1327) اس حدیث میں صراحت سے آیا ہے کہ یہ نجاشی ہی تھے اور دیکھیے: (صحيح مسلم، الجنائز، باب في التكبير على الجنازة، حديث: 951) [1] صحيح البخاري، الجنائز، باب الرجل ينعى إلى أهل الميّت بنفسه، حديث: 1245. نجاشی کے اسلام لانے کے متعلق حافظ ابن حجر کی گفتگو ملاحظہ کیجیے: (فتح الباري: 6/228-230، وصحيح مسلم، الجنائز، باب في التكبير على الجنازة، حديث: 951) اس حدیث میں صراحت سے لکھا ہے کہ یہ نجاشی ہی تھے، دیگر دو روایتوں میں ان کا نام اصحمہ بھی بتایا گیا ہے۔ [2] صحيح البخاري، الجنائز، باب الصفوف على الجنازة، حديث: 1320، وصحيح مسلم، الجنائز، باب في التكبير على الجنازة، حديث: 952.

فوت ہو گیا ہے۔ اٹھو اور اُس کا جنازہ پڑھو۔“ (33)

یہ حدیث اس امر کی صراحت کرتی ہے کہ حضرت نجاشی کی وفات اسلام پر ہوئی تھی۔

یاد رہے کہ یہ نجاشی جو مسلمان ہوا تھا، وہ نجاشی نہیں جسے رسول اللہ ﷺ نے خط لکھا تھا جب آپ نے مختلف بادشاہوں اور خود مختار حکمرانوں کو خطوط لکھے تھے اور انھیں اسلام لانے کی ترغیب دی تھی۔ یہ بات صحیح مسلم کی ایک روایت سے واضح ہوتی ہے۔[1] لیکن صحیح مسلم ہی کی دو اور روایتوں میں یہ صراحت نہیں ہے جس کی بنا پر شیخ عبدالقادر ارناؤوط[2] کا میلان اس بات کی طرف ہوا کہ جس نجاشی کا رسول اللہ ﷺ نے جنازہ پڑھایا، وہی نجاشی ہے جس کی طرف آپ نے مکتوب گرامی ارسال فرمایا تھا کیونکہ تاریخی کتابوں میں صرف ایک نجاشی ہی کا ذکر ہے۔[3]

نجاشی کی طرف بھیجے گئے آپ ﷺ کے نامۂ مبارک کو امام بیہقی رحمہ اللہ نے ابن اسحاق کی بے سند روایت سے نقل کیا ہے۔[4] ابن کثیر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”ظاہر یہی ہے کہ یہ نامۂ مبارک اُس نجاشی کی طرف ہے جو مسلمان نجاشی کے بعد اقتدار میں آیا۔ حضرت جعفر اور اُن کے ساتھیوں کا میزبان مسلمان نجاشی تھا۔ یہ نامۂ مبارک رسول اللہ ﷺ نے اس وقت لکھا جب آپ نے تمام بادشاہوں کو خطوط لکھے جن میں

(33) نجاشی: شاہانِ حبش کا لقب ہے جو در حقیقت ”نجوس“ (Negus) کی تعریب ہے جس کے معنی حبشی زبان میں بادشاہ کے ہیں۔ جن کے عہد میں یمن فتح ہوا، نجاشی جن کے ملک میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے ہجرت کی، نیز جنھوں نے اسلام قبول کیا اور آنحضرت ﷺ نے جن کے جنازہ کی، غائبانہ نماز پڑھائی، وہ اسی خاندان، اسی ملک اور اسی شہر کے بادشاہ تھے۔ (تاریخ ارض القرآن (کامل) از سید سلیمان ندوی، ص: 241،240)

[1] صحيح مسلم، الجنائز، باب في التكبير على الجنازة، حديث: 953. [2] صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب: كتب النبي ﷺ إلى ملوك الكفار يدعوهم إلى الإسلام، حديث: 1774. [3] حاشية إعلام السائلين عن كتب المرسلين لابن طولون، ص: 54. [4] دلائل النبوة للبيهقي: 308/2.

اُنھیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی گئی تھی۔ یہ فتح مکہ سے تھوڑا عرصہ پہلے کی بات ہے، لہٰذا یہ نامۂ مبارک دوسرے نجاشی کی طرف تھا نہ کہ پہلے کی طرف۔ اور جو اس میں ''نجاشی اصحم کی طرف'' کے الفاظ ہیں تو صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ''اصحم'' کسی راوی کی زیادتی ہے جو اُس نے اپنی سمجھ کے مطابق کی ہے۔'' واللّٰہ أعلم.[1]

ابن کثیر رحمہ اللہ کی رائے کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ دوسرے نامۂ مبارک کا اسلوب اور لہجہ پہلے سے مختلف ہے جسے حضرت ضمری لے کر گئے تھے۔ دوسرے خط میں غیر مسلم سے خطاب ہو رہا ہے جبکہ پہلے میں خطاب مسلمان سے تھا۔ ابن اسحاق نے اس دوسرے خط کو مسند بیان نہیں کیا جیسا کہ امام بیہقی نے کہا ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی ابن کثیر کی رائے اور صحیح مسلم کی روایت ہی کو ترجیح دی ہے کہ جس نجاشی کا آپ نے جنازہ پڑھا تھا وہ اور تھا اور جس نجاشی کو بذریعہ خط اسلام کی دعوت دی گئی وہ اور تھا۔[2] ابن طولون بھی اسی بات کے قائل ہیں۔ امام ذہبی صحیح مسلم کی مذکورہ حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس حدیث میں یہ صراحت نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے دوسرے نجاشی کو دعوتِ اسلام کا خط اسی سال 7 ہجری میں غزوۂ موتہ سے پہلے لکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خط پہلے مسلمان نجاشی کی وفات کے بعد لکھا گیا تھا۔ پہلے نجاشی کی وفات 9 ہجری میں ہوئی تھی۔'' اس کی مزید تفصیل ''بادشاہوں کی طرف نبی ﷺ کے خطوط'' کے ذیل میں آئے گی۔

حضرت نجاشی کے اسلام لانے کے بارے میں واردشدہ روایات سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان حضرت جعفر، دیگر صحابہ اور اپنے پادریوں کے سامنے کیا تھا۔ لیکن بطریقوں اور عام پادریوں نے دین کی اس تبدیلی کو قبول نہ کیا اور اُن سے ناراض ہو کر عوام کو اُن کے خلاف بھڑکایا جس سے اُن کے خلاف بغاوت پیدا ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نجاشی کی مدد فرمائی اور بغاوت ختم ہوگئی، تاہم نجاشی کو ''تقیہ'' کرنا

[1] البداية والنهاية (تحقيق الدكتور عبدالله التركي): 206,205/4. [2] زاد المعاد: 690/3.

پڑا اور کافروں کے خلاف تقیہ جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: «اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ» ”کافر کو جنگ میں دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔“ واقعہ یہ ہے کہ ”اُس نے ایک تحریر لکھی جس میں توحید کا اقرار اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت کا اعتراف تھا۔ یہ گواہی بھی لکھی گئی تھی کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بندے، اُس کے رسول، اُس کی بھیجی ہوئی روح اور اُس کا وہ کلمہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کی طرف القا کیا تھا، پھر نجاشی نے یہ تحریر لباس سے اوپر پہنے جانی والی قبا کی اندرونی جانب اپنے دائیں کندھے کے قریب رکھ لی، پھر وہ عوام کی طرف نکلے جو پہلے ہی صفیں باندھے کھڑے تھے۔ نجاشی کہنے لگے: ”اے حبشہ کے عوام! کیا میں سب لوگوں سے بڑھ کر تم پر حق نہیں رکھتا؟“ وہ کہنے لگے: ”ضرور۔“ نجاشی نے کہا: ”تم سے میرا سلوک کیسا رہا؟“ انھوں نے کہا: ”بہترین۔“ نجاشی نے کہا: ”تو پھر کیا وجہ ہے کہ تم بغاوت پر تُلے ہوئے ہو؟“ وہ کہنے لگے: ”آپ نے ہمارا دین چھوڑ دیا ہے اور یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔“ نجاشی نے کہا: ”تم عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“ وہ کہنے لگے: ”وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔“ نجاشی نے اپنا ہاتھ قبا پر اُس تحریر والی جگہ پر رکھا اور کہا: ”میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام اس سے کم و بیش نہیں تھے۔“ نجاشی کا مقصد تھا کہ اس تحریر سے کم و بیش نہیں تھے جس پر انھوں نے ہاتھ رکھا ہے۔ عوام نے سمجھا کہ وہ ہمارے عقیدے کی بات کر رہے ہیں۔ اس لیے عوام خوش ہو گئے اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اس واقعے کی پوری تفصیل رسول اکرم ﷺ کو بھی پہنچ گئی تھی۔ اس کے باوجود جب حضرت نجاشی فوت ہوئے تو آپ نے اُن کا جنازہ بھی پڑھا اور اُن کے لیے بخشش کی دعا بھی فرمائی۔ [1]

[1] صحیح البخاري، الجنائز، باب التکبیر علی الجنازة أربعًا، حدیث: 1333، والسیرة النبویة لابن هشام: 421/1. ابن اسحاق کی اس روایت کی سند صحیح ہے لیکن یہ مرسل ہے۔ بخاری و احمد کی روایات اس کی تائید کرتی ہیں۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

قریش کا مسلمانوں پر شدید ظلم و ستم قریش کے بہادروں کو دینِ اسلام میں داخل ہونے سے نہ روک سکا۔ عام مسلمانوں اور خصوصاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف حسد و بغض سے بھری ہوئی اس فضا میں اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ ابوجہل کا حد سے بڑھا ہوا غیظ و غضب حضرت حمزہ کے قبولِ اسلام کا سبب بن جائے جو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور قریش کے بڑے مضبوط پہلوان تھے۔ ابن اسحاق [1] اور ابن سعد [2] کی روایت ہے کہ عبداللہ بن جدعان کی ایک لونڈی نے حضرت حمزہ کو بتایا کہ ابوجہل نے آپ کے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ سخت بدتمیزی، بدزبانی اور بدسلوکی کی ہے۔ وہ فوراً ابوجہل کے پاس پہنچے۔ وہ اپنی قوم کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت حمزہ نے اُس کے سر پر اتنی زور سے کمان ماری کہ وہ شدید زخمی ہوگیا، پھر کہنے لگے: ''تو میرے بھتیجے کو گالیاں دیتا ہے؟ جبکہ میں اس کے دین پر ہوں؟'' اس طرح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ اسلام کے لیے کھل گیا۔

جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوگئے تو قریش کو یقین ہوگیا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ ہو گئے ہیں اور حمزہ انھیں کوئی اذیت نہیں پہنچنے دیں گے، چنانچہ وہ آپ کے ساتھ بدسلوکی اور بدزبانی سے رُک گئے۔ [3]

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام کا واقعہ نبوت کے چھٹے سال نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ارقم کو اپنا مرکز بنانے کے بعد کا ہے۔ [4]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 361,360/1. سند منقطع ہے۔ [2] الطبقات الكبرىٰ: 9/3. یہ روایت واقدی کی سند سے ہے۔ ابن سعد نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بدسلوکی کرنے والوں میں عدی بن حمراء اور ابن اصداء بھی شامل تھے۔ ہیثمی نے اس واقعے کو طبرانی کی روایت سے نقل کیا ہے جس کی دو سندیں مرسل ہیں۔ ان میں سے ایک سند کے راوی صحیح کے راوی اور دوسری کے راوی ثقہ ہیں، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 267/9، وسبل السّلام: 443/2) [3] السيروالمغازي لابن إسحاق، ص: 172. اس روایت کی سند منقطع ہے۔ [4] الطبقات الكبرىٰ: 9/3. واقدی کی ««

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

حضرت عمر اسلام کے شدید ترین مخالفین میں سے تھے۔ وہ شدتِ غضب اور طبیعت کی تیزی کی وجہ سے مشہور تھے۔ مسلمانوں کو اُن کے ہاتھوں بڑی تکلیفوں اور سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اُن کے قریشی رشتہ دار اور بہنوئی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''اللہ کی قسم! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت عمر اسلام لانے سے قبل مجھے اور اپنی بہن کو اسلام قبول کرنے کی پاداش میں جکڑ دیا کرتے تھے ......۔''[1] ایک روایت یوں ہے: ''کاش تو دیکھتا کہ جب عمر مسلمان نہیں ہوئے تھے اور وہ مجھے اور اپنی بہن کو جکڑ دیا کرتے تھے......۔''[2]

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ ام عبداللہ لیلیٰ جو حضرت عامر بن ربیعہ کی بیوی تھیں، انھوں نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! ہم حبشہ کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ میرے خاوند عامر کسی کام سے گئے ہوئے تھے کہ عمر آ گئے۔ اُس وقت وہ اپنے شرک پر قائم تھے اور ہمیں اُن سے بہت تکلیفیں پہنچی تھیں۔ وہ میرے پاس آ گئے اور کہنے لگے: ''ام عبداللہ! تم لوگ کہیں جا رہے ہو؟'' میں نے کہا: ''جی ہاں، اللہ کی قسم! ہم اللہ تعالیٰ کی فراخ زمین پر کہیں چلے جائیں گے۔ تم نے ہمیں بہت ستایا اور ہم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے۔ امید ہے اللہ تعالیٰ ہمارے لیے کوئی راہِ نجات مہیا فرمائے گا۔'' یہ سُن کر حضرت عمر سوچ میں پڑ گئے۔ اُن پر اس بات کا بہت اثر ہوا اور وہ بہت غمگین ہو گئے۔ جب عامر گھر واپس آئے تو لیلیٰ کہنے لگیں: ''اگر آپ اُس وقت عمر کی حالت دیکھتے تو اندازہ کرتے کہ وہ کس قدر غمگین اور دل گداز نظر آ رہے تھے......۔'' عامر کہنے لگے: ''کیا تمھیں توقع ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں گے؟'' لیلیٰ نے کہا: ''ہاں۔''

»» یہ روایت نہایت ضعیف ہے۔ [1] فضائل الصحابة لأحمد: 278/1. محقق کتاب نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ [2] صحیح البخاري، مناقب الأنصار، باب إسلام عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، حدیث: 3867.

عامر کہنے لگے: ''ہرگز نہیں! خطاب کا گدھا تو مسلمان ہو سکتا ہے مگر اُس کا بیٹا عمر مسلمان نہیں ہوگا۔'' کیونکہ حضرت عامر نے مسلمانوں کے خلاف حضرت عمر کی سختیاں اور ظلم وستم دیکھ رکھے تھے۔ [1]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ہر چند جہالت کے پردے پڑے ہوئے تھے لیکن ان کے دل میں فطرتِ سلیم کے پاکیزہ جذبات نے بھی ہلچل مچا رکھی تھی یہاں تک کہ ان پردوں کے چھٹنے کا وقت آ گیا اور وہ حلقۂ بگوش اسلام ہوگئے اور اُن کی طبیعت کی سختی اسلام کی مضبوطی کا سبب بن گئی۔ جس طرح وہ پہلے کفر میں سخت تھے اب اسلام میں اور زیادہ سخت اور مضبوط بن گئے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اُن کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیا تو وہ پوچھنے لگے: ''قریش میں کون سا شخص بات پھیلانے اور ڈھنڈورا پیٹنے میں سب سے تیز ہے؟'' کہا گیا: ''جمیل بن مَعْمر جُمَحي۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے پاس گئے اور اُسے اپنے اسلام کے بارے میں بتایا۔ جمیل نے کعبہ کی طرف دوڑ لگا دی اور لوگوں میں پہنچ کر بلند آواز سے چلایا: ''اولوگو! عمر بھی بے دین ہوگیا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی پیچھے پیچھے آ رہے تھے، کہنے لگے: ''یہ جھوٹ بولتا ہے۔ میں تو مسلمان ہوا ہوں۔'' مشرکین کی حضرت عمر سے طویل جھڑپ ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عاص بن وائل سہمی کی مدد سے کافروں کے شر سے محفوظ رکھا۔ [2]

اُن کے قبول اسلام کا مشہور واقعہ جس میں ذکر ہے کہ وہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے

---

[1] السير والمغازي لابن إسحاق، ص:181، والسيرة النبوية لابن هشام:423/1. اس روایت کی سند حسن ہے۔ [2] فضائل الصّحابة لأحمد:282,281/1. محقق کتاب نے اس روایت کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ والسير والمغازي لابن إسحاق ص: 184، والسيرة النبوية لابن هشام: 229,428/1. ابن اسحاق کی سند حسن ہے۔

کے لیے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی جس نے اُنھیں اُن کی بہن اور بہنوئی کے مسلمان ہونے کی خبر سنائی اور اُن کے اشتعال کا رخ موڑ دیا۔ حضرت عمر غصے میں اپنی بہن اور بہنوئی کی طرف چل دیے۔ وہاں حضرت خباب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت عمر نے اپنی بہن کو بھی مارا، اُن کا خون بہنے لگا۔ خون دیکھ کر غصہ کافور ہوگیا اور اُن سے قرآنی آیات سُنانے کو کہا۔ بہن کے کہنے پر انھوں نے غسل کیا اور سورۂ طٰہٰ کی ابتدائی آیات پڑھیں تو اُن کے دل کی دنیا بدل گئی۔ وہ مسلمان ہوگئے اور اپنے اسلام کا اعلان کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، پھر انھوں نے اپنے ماموں عاص کی پناہ کالعدم کر دی تاکہ ماریں بھی اور مار بھی کھائیں۔ جیسا کہ کمزور مسلمانوں کا حال تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت نصیب فرما دی...... یہ قصہ کسی صحیح سند کے ساتھ روایت نہیں ہوا جو محدثین کے نزدیک قابل قبول ہو۔ اگرچہ اس قصے کے کچھ اجزا حسن سندوں کے ساتھ منقول ہیں۔ اسے وصی اللہ [1]، ہمام اور أبو صُغَیْلِیك [2] کے علاوہ دیگر محققین نے ضعیف کہا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا نتیجہ ہے۔ آپ دعا کیا کرتے تھے:

”اے اللہ! ابوجہل اور عمر بن خطاب میں سے جو تجھے زیادہ پسند ہے اُس کے ذریعے سے اسلام کو عزت نصیب فرما۔“ [3]

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حق میں دعا قبول فرمائی اور اسلام کو ان کے ذریعے سے عزت عطا فرمائی۔ اس کے بارے میں صحیح بخاری میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ

[1] فضائل الصحابة لِأحمد بن حنبل:286,285/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام (تحقيق همام وأبو صعيليك):425/1. ابن ہشام کی سیرت میں یہ واقعہ ابن اسحاق کی روایت سے ہے جو بلاسند ہے۔ مؤرخین اور سیرت نگاروں کا عام طور پر اس واقعے کو بیان کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی تاریخی حیثیت ضرور ہے، چنانچہ ایک عام تاریخی واقعے کے طور پر اسے قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔

[3] مسند أحمد:95/1. حدیث کی سند حسن ہے، دیکھیے: (الفتح الرّباني:230/20)

سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ''جب سے عمر بن خطاب مسلمان ہوئے ہیں ہمیں عزت حاصل ہوگئی ہے۔''[1]

اس مفہوم کی بہت سی روایات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ نصرتِ اسلام میں وہ عظیم حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا، مثلاً: ابن اسحاق نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کی روایت بیان کی ہے۔ انھوں نے کہا: ''جب میں مسلمان ہوا، میں نے سوچا کہ مکہ والوں میں کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ دشمنی رکھتا ہے۔ ذہن میں ابوجہل کا نام اُبھرا۔ میں فوراً چل پڑا۔ اُس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر نکلا۔ مجھے دیکھا تو کہنے لگا: أَهْلًا وَّ سَهْلًا کیسے آئے؟ میں نے کہا: ''میں تجھے خبردار کرنے آیا ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکا ہوں اور اُن کی پیش کردہ تمام باتوں کی تصدیق کرتا ہوں۔'' اُس نے فوراً دروازہ بند کر لیا اور سٹپٹا کر کہنے لگا: ''اللہ تیرا بھی برا کرے اور اُس پیغام کا بھی جو تو لے کر آیا ہے۔''[2]

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام ایک فتح تھی۔ اُن کی ہجرت مدد و نصرت تھی اور اُن کی حکومت رحمت تھی۔ اُن کے اسلام لانے سے پہلے ہم کعبہ کے پاس نماز پڑھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جب وہ مسلمان ہوئے تو انھوں نے مشرکین سے زبردست مقابلہ کیا، کعبہ کے پاس نماز پڑھی اور ہم نے بھی اُن کے ساتھ مل کر نماز پڑھی۔''[3]

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ''جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو اسلام پردے سے باہر نکل آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے علانیہ اسلام کی دعوت دینی

[1] صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب عمر بن الخطاب، حديث: 3684. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 430/1. سند میں ایک راوی مجہول ہے، باقی رجال ثقہ ہیں۔
[3] السيرة النبوية لابن هشام: 422/1. یہ روایت ابن اسحاق کی ہے جس کی سند ضعیف ہے۔

شروع کی۔ ہم بیت اللہ کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھنے لگے، بیت اللہ کا طواف کرنے لگے، ظلم و ستم کرنے والوں سے بدلے لینے لگے اور ترکی بترکی جواب دینے لگے۔''[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ''جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو مشرکوں نے کہا: اس قوم نے ہم سے پورا پورا بدلہ لے لیا ہے۔''[2]

ابن سعد نے محمد بن عبید کی حدیث بیان کی ہے: ''مجھے بخوبی یاد ہے، ایک وقت تھا جب ہم بیت اللہ کے پاس نماز پڑھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جب حضرت عمر اسلام لائے، انھوں نے کافروں سے خوب لڑائی لڑی حتی کہ اُنھیں ہمیں روکنے کی ہمت نہ رہی تب ہم بیت اللہ کے پاس نماز پڑھنے لگے۔''[3]

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا نام ''فاروق'' رکھا۔ (34) یعنی جس نے حق و باطل کے مابین خط امتیاز کھینچ دیا۔

یہ روایات محدثین کے کڑے معیار پر تو پوری نہیں اترتیں مگر انھیں ایسے مسئلے میں پیش کرنا درست ہے جس پر نہ کوئی شرعی حکم مرتب ہوتا ہے نہ اس کا عقیدے سے کوئی تعلق ہے۔ یہ بات بالاتفاق مُسلَّم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام قبول کرنا خود اسلام کے لیے عزت اور غلبے کا باعث بنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا بھی یہی تھی: ''اے اللہ! ابوجہل اور

(34) فاروق: امام ذہبی نے لکھا: ''اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بسند ضعیف روایت کی گئی ہے، انھوں نے کہا: ''میں نے عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ کو فاروق کیوں کہا گیا؟'' اس سوال پر عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ بیان کیا اور بتایا کہ کیسے انھوں نے اپنے بہنوئی اور بہن کو مارا اور اس کے بعد کیسے وہ دارِارقم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے۔ یہ سب واقعات بتا کر انھوں نے کہا: ''پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام ''فاروق'' رکھ دیا۔'' دیکھیے: (تاریخ الإسلام (السیرۃ) للذھبی: 179/1) ابن سعد نے بھی ضعیف سندوں سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ عنہ کا نام فاروق رکھا، دیکھیے: (الطبقات الکبرٰی: 270/3)

[1] الطبقات الکبرٰی: 269/3. یہ واقدی کی روایت ہے جو نہایت ضعیف ہے۔ [2] فضائل الصحابۃ لأحمد: 248/1. سند ضعیف ہے۔ [3] الطبقات الکبرٰی: 270/3. اس روایت کی سند صحیح ہے۔

عمر بن خطاب دونوں میں سے جو تجھے زیادہ محبوب ہے اس کے ذریعے سے اسلام کو عزت عطا فرما۔'' [1]

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے فوائد

* دور جاہلیت میں قوت اور دبدبے والے لوگ مسلمان ہوئے تو دعوت اسلام کے لیے بڑا محکم سہارا بنے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرزومند رہتے تھے کہ عمر بن خطاب اور ابوجہل جیسے لوگ مسلمان ہو جائیں، مزید برآں آپ کا ارشاد گرامی ہے:

«إِنَّ خِيَارَ النَّاسِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقُهُوا»

''جاہلیت میں معزز افراد اسلام میں بھی معزز ہیں جبکہ وہ (دین کو) سمجھ لیں۔'' [2]

لہٰذا داعیانِ اسلام کی خواہش اور کوشش ہونی چاہیے کہ معاشرے کی با اثر اور مضبوط شخصیات کو دین اسلام کی دعوت ضرور دی جائے کیونکہ ایسی شخصیات کا قبول اسلام اُن کے تابع فرمان عوام کے تردد اور حیص بیص کا خاتمہ کر دیتا ہے اور وہ فوج در فوج مسلمان ہونے لگتے ہیں۔ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایسا ہی ہوا ہے۔ قرآن مجید نے یہ بات اُن عام کفار کی زبانی بیان فرمائی ہے جو اپنے سرداروں اور قائدین کے پیچھے لگ کر گمراہ ہوئے:

﴿يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَٰلَيْتَنَآ أَطَعْنَا ٱللَّهَ وَأَطَعْنَا ٱلرَّسُولَا ۝ وَقَالُوا۟ رَبَّنَآ إِنَّآ أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَأَضَلُّونَا ٱلسَّبِيلَا ۝ رَبَّنَآ ءَاتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ ٱلْعَذَابِ وَٱلْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ۝﴾

''جس دن اُن کے چہرے آگ میں الٹ دیے جائیں گے وہ کہیں گے: اے

[1] مسند أحمد: 95/2. [2] صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب قصّة إسحاق بن إبراهيم النبي عليهما السلام، حديث: 3374.

کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی! اور وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! بلاشبہ ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی تو انھوں نے ہم کو راہِ راست سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے رب! انھیں دگنا عذاب دے اور اُن پر بڑی لعنت کر۔“ [1]

* دعوت و تبلیغ مشرکین کے قائدین اور عوام الناس تک ہی محدود نہیں رہنی چاہیے بلکہ ضروری ہے کہ یہ دعوت اُن قیادتوں تک بھی پہنچائی جائے جو اسلام سے منحرف ہو چکی ہیں اور وہ اپنی جماعتوں اور تنظیموں کو زندگی کے مختلف میدانوں میں غیر اسلامی طریقے پر چلاتی ہیں۔
* جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ دارِ ارقم میں مسلمانوں کی طرف تلوار حمائل کیے ہوئے آئے تو رسول اللہ ﷺ کا جرأت کے ساتھ اُن کی طرف اٹھنا اور اُن کے تہبند کی گرہ یا گریبان کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دینا، پھر اُن کو سخت الفاظ میں تنبیہ کرنا اور ڈانٹنا آپ ﷺ کی جرأت و شجاعت کی نایاب مثال ہے۔ اس جرأت و بہادری کا مظاہرہ اور کئی مقامات پر بھی کئی دفعہ ہوا، مثلاً: غزوۂ احد میں جب مسلمانوں میں بھگدڑ مچ گئی اور غزوۂ حنین میں جب مسلمان تتر بتر ہوگئے، اُس وقت بھی رسول اللہ ﷺ نے بے مثال پامردی اور استقامت کا ثبوت دیا تھا۔

شعبِ ابی طالب

جب قریش نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ہماری تمام تر مزاحمت اور تشدد کے باوجود اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے اور انھوں نے مسلمانوں کے

[1] الأحزاب 33:66-68.

قلع قمع کے لیے جو مختلف حربے اختیار کیے تھے اُن کا کوئی فائدہ نہیں ہوا اور خاص طور پر حضرت حمزہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اسلام لانے کے بعد تو سارے حربے بے کار ہو گئے تو انھوں نے ایک نیا اور مؤثر حربہ اختیار کرنے کی سوچی۔ یہ نیا حربہ سابقہ تمام ہتھکنڈوں سے زیادہ سخت اور ظالمانہ تھا۔ اور یہ تھا بائیکاٹ کا حربہ۔

ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، عروہ بن زبیر، ابن سعد اور دیگر مؤرخین کا متفقہ بیان ہے:
''جب قریش نے دیکھا کہ صحابہ حبشہ کی سرزمین پر امن و امان سے رہنے لگے ہیں۔ ادھر مکہ میں حضرت حمزہ اور عمر جیسے دلیر جنگجو مسلمان ہو چکے ہیں اور اسلام تمام قبائل میں پھیل چکا ہے تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ آخری چارۂ کار کے طور پر رسول اللہ ﷺ کو شہید کر دیا جائے۔ جب اس بات کی سُن گن حضرت ابوطالب کو ہوئی تو انھوں نے بنوہاشم اور بنومطلب کے تمام افراد کو اکٹھا کیا۔ بنی ہاشم و بنی مطلب نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی شعب (گھاٹی) میں پہنچا دیا اور قتل کا پروگرام بنانے والوں سے آپ ﷺ کو محفوظ کر دیا۔ اس کام میں دونوں قبیلوں کے کفار بھی اُس دور کے قبائلی عصبیت و حمیت کی بنا پر شریک تھے۔ جب قریش نے اپنا یہ منصوبہ بھی ناکام ہوتے دیکھا تو انھوں نے اکٹھے ہو کر مشورہ کیا کہ ہم آپس میں بنوہاشم اور بنومطلب کے خلاف معاہدہ کر کے ایک دستاویز تیار کریں۔ اُس میں یہ طے کیا جائے کہ کوئی شخص ان سے کسی قسم کا لین دین کرے نہ شادی بیاہ کرے حتی کہ یہ رسول اللہ ﷺ کو ہمارے سپرد کر دیں۔ انھوں نے باہمی معاہدے کی دستاویز تیار کر کے کعبہ کے اندر لٹکا دی۔''[1] یہ دستاویز لکھنے والا منصور بن عکرمہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اُس کے خلاف بددعا

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 430/1، والسير والمغازي لابن إسحاق، ص: 156-167. دونوں بلاسند ہیں۔ وفتح الباري: 38/15، ودلائل النبوّة للبيهقي: 311/2. یہ روایت زہری پر موقوف ہے۔ ومغازي رسول الله ﷺ لعروة بن الزُّبير (جمع وتحقيق الأستاذ الدكتور محمد مصطفى الأعظمي)، ص: 114-116. اس حدیث کی سند میں ابن لہیعہ ہے اور یہ عروہ پر جا کر موقوف ہو جاتی ہے۔ والطبقات الكبرىٰ: 208/1-210. یہ روایت واقدی کی سند سے ہے۔

کی جس کے نتیجے میں اس کی انگلیاں شل ہوگئیں۔ بعض مؤرخین نے کاتب کا نام نضر بن حارث یا طلحہ بن ابی طلحہ بھی لکھا ہے۔[1] تمام بنو ہاشم اور بنومطلب، سوائے ابولہب کے، ابوطالب کے پاس جمع ہوگئے اور اُن کے ساتھ ہی رہے۔ ابولہب قریش کے ساتھ رہا۔

بنو ہاشم اور بنومطلب کے محصور ہونے کی ابتدا محرم الحرام 7 نبوت سے ہوئی۔ دو تین سال وہ اسی طرح محصور رہے۔ موسیٰ بن عقبہ نے یہ مدت پورے تین سال بتلائی ہے۔[2] ان تین سالوں میں وہ سخت مصیبتوں کا سامنا کرتے رہے۔ بائیکاٹ اس قدر سخت تھا کہ اُن تک کھانے پینے کی بھی کوئی چیز نہ پہنچ سکتی تھی۔ قریش کو جس شخص کے بارے میں یہ پتہ چلتا کہ اس نے کوئی چیز خفیہ طور پر بھیجی ہے تو وہ اسے بھی تشدد کا نشانہ بناتے تھے۔ چند جرأت مند لوگوں نے اس ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھائی اور وہ دستاویز پھاڑنے کا نعرہ لگایا۔ ان میں مشہور ہشام بن عمرو بن حارث، زہیر بن ابی امیہ، مطعم بن عدی، زمعہ بن اسود اور ابوالبختری بن ہشام بن حارث شامل تھے۔ ان کے بنو ہاشم اور بنومطلب کے ساتھ رشتے ناتے تھے۔

ابن ابی شیبہ کی روایت ہے: ''رسول اللہ ﷺ کی طرف سے جنگ بدر کے دن ایک منادی کرنے والے نے اعلان کیا: مشرکوں میں سے کسی کو امان حاصل نہیں سوائے ابوالبختری کے۔ اگر انھیں کسی مسلمان نے گرفتار کیا تو انھیں چھوڑ دے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں امان دے رکھی ہے۔ لیکن جب انھیں ڈھونڈا گیا تو پتہ چلا کہ وہ قتل ہو چکے ہیں۔''[3]

[1] السہیلی کا کہنا ہے کہ قریش کے ماہرینِ نسب کہتے ہیں: ''دستاویز لکھنے والے کا نام بغیض بن عامر بن ہاشم بن عبدالدار ہے۔'' دوسرا قول یہ ہے کہ دستاویز لکھنے والا منصور بن عبد شرحبیل بن ہشام تھا جس کا تعلق بنی عبدالدار سے ہے۔ یہ ابن اسحاق کے قول کے مخالف ہے۔ [2] فتح الباري: 8/15، وتاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 22/1، والطبقات الكبرىٰ: 208/1-210. ان سب کی سندیں ضعیف ہیں۔ [3] المغازي لابن أبي شيبة، ص: 189، رقم: 149. اس روایت کی سند متصل اور رجال ثقہ ہیں۔ محقق دکتور عبدالعزیز عمری کی تحقیق کے مطابق یہ سند عیزار کی طرف سے مرسل ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ ﷺ کا یہ اعلان اُس احسان کے جواب میں تھا جو انھوں نے اس ظالمانہ بائیکاٹ کو ختم کرنے کے سلسلے میں مسلمانوں پر کیا تھا۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ جب بائیکاٹ کی دستاویز اتاری گئی تو پتہ چلا کہ دیمک نے اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کے سوا ہر چیز کو ختم کر دیا ہے۔ [1] ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ اور عروہ نے اس کے برعکس لکھا ہے کہ اُس دستاویز میں جہاں جہاں لفظ ''اللہ'' تھا اُسے دیمک نے کھا لیا، باقی عبارت جو ظلم و قطع رحمی پر مشتمل تھی وہ بدستور موجود تھی۔ [2] اس اختلاف کے باوجود اس سارے معاملے کا مقصود اور نتیجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا نام نامی ظلم اور قطع رحمی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔

سُہَیلی نے لکھا: ''صحیح روایت [3] میں ہے کہ بنو ہاشم کو اس بائیکاٹ کے دوران میں انتہائی شدت کی بھوک، زبردست مصائب اور مشقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور انھیں جھاؤ اور کیکر کے پتے کھانے پڑے۔ اُن کی قضائے حاجت بکری کی مینگنیوں کی صورت میں ہوتی تھی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی اُن کے ساتھ ہی گھاٹی میں محصور تھے۔ روایت ہے کہ انھوں نے کہا: ''ایک رات مجھے اس قدر بھوک لگی کہ میرے پاؤں تلے کوئی تر چیز آئی تو میں نے اُسے منہ میں ڈال لیا۔ مجھے اب تک معلوم نہیں کہ وہ کیا چیز تھی۔'' [4]

یونس کی روایت میں ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بتایا: ''مجھے اچھی طرح یاد ہے، جن دنوں میں مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (شعب بنی ہاشم میں) محصور تھا۔ میں ایک رات

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 20/2. سند ضعیف ہے۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 19/2، والسير والمغازي لابن إسحاق، ص: 161. یہ روایت بلاسند ہے۔ وفتح الباري: 38/15. سند ضعیف ہے۔ ومغازي رسول الله ﷺ لعروة بن الزبير، ص: 116. اس کی سند عروہ پر موقوف ہے۔ اس امر کے متعلق کوئی روایت قابلِ اعتماد سند سے ثابت نہیں کہ بائیکاٹ کی دستاویز کو دیمک نے کھا لیا تھا، چنانچہ تمام سندیں ضعیف ہیں۔ [3] ہمیں اس ''صحیح روایت'' کے ماخذ کا علم نہیں ہو سکا۔ [4] الرّوض الأنف: 127/2، 128۔

پیشاب کرنے نکلا تو وہاں مجھے اپنے پیشاب تلے کسی چیز کی آواز محسوس ہوئی۔ میں نے دیکھا تو وہ اونٹ کے چمڑے کا ایک ٹکڑا تھا۔ میں نے اُسے اٹھا لیا۔ اچھی طرح دھویا، پھر اُسے آگ میں جلا کر دو پتھروں کے درمیان کوٹ لیا وہ سفوف سا بن گیا۔ اُسے پھانک کر اوپر سے پانی پی لیا۔ تین دن تک اُس پر گزارا کیا۔"[1]

جب کوئی تجارتی قافلہ غلہ لے کر مکہ مکرمہ آتا اور بنو ہاشم کا کوئی شخص اپنے بال بچوں کے لیے کھانے کی کوئی چیز خریدنے بازار جاتا تو اللہ کا دشمن ابولہب فوراً قافلے والوں کے پاس پہنچ جاتا اور اعلان کرتا: "اے تاجرو! محمد کے ساتھیوں کو اتنا مہنگا بھاؤ بتاؤ کہ وہ تم سے کوئی چیز خرید ہی نہ سکیں۔ اگر تمھاری کوئی چیز فروخت ہونے سے رہ گئی تو تمھارا خسارہ میں پورا کروں گا۔ تم جانتے ہو میں کتنا مالدار ہوں اور اپنی بات کی کتنی لاج رکھتا ہوں۔ میں ضمانت دیتا ہوں کہ تمھارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" چنانچہ تاجر بڑھ چڑھ کر بھاؤ بتاتے تو غریب مسلمان خالی ہاتھ گھر واپس آ جاتا جبکہ اُس کے بچے بھوک سے چلا رہے ہوتے لیکن اُس کے پاس اُنھیں کھلانے کی کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ وہ تاجر ابولہب کے پاس جاتے تو وہ اُن کی فروختنی چیزیں خوب منافع دے کر خرید لیتا تھا۔ ان سنگدلانہ حربوں سے مسلمان تنگ و بھوک کے مارے موت کی حد کو چھو رہے تھے بلکہ بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما محصورین میں سے کئی افراد موت کا شکار ہو گئے۔[2]

اس بائیکاٹ کی بنا پر مسلمانوں کو پہنچنے والے آلام و مصائب کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] المغازي والسير، ص: 194. یونس کی یہ روایت ان کی اپنی سند سے ہے جو سعد رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے۔ اس سند کا ایک راوی مبہم ہے۔ یہاں ہم نے عام طبع شدہ کتاب کی عبارت نقل کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ السہیلی نے یہ روایت کسی اور عبارت (نص) سے لی ہے، چنانچہ السہیلی اور ہماری نقل کردہ عبارتوں کا موازنہ کر لیا جائے۔ [2] دلائل النبوۃ لأبي نعیم: 279/1. روایت کی سند منقطع ہے اور منقطع ضعیف کی اقسام میں سے ہے۔

دین کی دعوت سے باز نہیں آئے۔ آپ ایامِ حج میں شعب سے باہر آتے، مکہ آنے والے حجاج سے ملاقاتیں کرتے اور اُنھیں اسلام کی دعوت دیتے اور اپنی قوم کے ملنے والے افراد کو بھی اسلام کا پیغام پہنچاتے تھے۔[1]

جب اللہ تعالیٰ نے وہ دستاویز نابود کر دی تو رسول اللہ ﷺ اپنے قبیلے اور ساتھیوں سمیت شعب سے باہر نکل آئے اور لوگوں کے ساتھ رہنے لگے۔[2]

اس بائیکاٹ کا مفصل تذکرہ صحیح روایات میں نہیں ملتا۔ صحیح بخاری میں اس کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وادیِ حنین کی طرف چلنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان شاء اللہ ہم کل خیف بنی کنانہ (35) میں ٹھہریں گے جہاں انھوں نے کفر پر معاہدہ کیا تھا۔''[3]

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ایک اور سند سے یوں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کل ہم ان شاء اللہ خیف بنی کنانہ میں ٹھہریں گے جہاں قریش نے کفر پر معاہدہ کیا تھا۔''[4]

اسی روایت کی تیسری سند جو اوزاعی سے زہری کے واسطے سے ہے، کے الفاظ یہ ہیں:

(35) خیف: خیف عربی زبان میں سنگلاخ پہاڑ کے دامن میں زمین کے اس حصے کو کہتے ہیں جو پانی کی گزرگاہ سے بلند ہوتا ہے۔ منیٰ میں واقع ایک مسجد کو اسی بنا پر مسجدِ خیف کہا گیا۔ اخیاف میں سب سے مشہور خیف، منیٰ کا خیف ہے اور اسی وجہ سے منیٰ کی مسجد کو مسجد خیف کہتے ہیں۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ خیفِ منیٰ ہی دراصل خیفِ بنی کنانہ ہے، دیکھیے: (المعالم الأثيرة في السنة والسيرة لمحمد حسن الشراب، مادة: خيف، ص: 110)

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 434/1. بلاسند ہے، چنانچہ یہ ضعیف ہے۔ [2] مغازي رسول الله ﷺ لعروة بن الزبير رضی اللہ عنہ، ص:167، وتاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 224/1. ذہبی نے یہ روایت موسیٰ بن عقبہ کے حوالے سے درج کی ہے۔ اس کی سندیں ضعیف ہیں۔ [3] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب تقاسم المشركين على النبي ﷺ، حديث: 3882. [4] صحيح البخاري، الحج، باب نزول النبي ﷺ مكة، حديث: 1589.

''یوم نحر سے اگلے دن جبکہ رسول اللہ ﷺ منیٰ میں تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہم کل خیف بنی کنانہ (وادیِ محصب) میں پڑاؤ ڈالیں گے جہاں قریش نے کفر پر معاہدہ کیا تھا۔''

اس فرمان کا سبب یہ تھا کہ قریش اور بنو کنانہ نے اکٹھے ہو کر بنو ہاشم اور بنو مطلب کے خلاف معاہدہ کیا تھا کہ ہم نہ ان سے کوئی رشتہ کریں گے نہ کوئی خرید و فروخت حتی کہ یہ لوگ محمد کو ہمارے حوالے کر دیں۔ [1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا: ''پہلی دو روایات میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ آپ کا یہ فرمان غزوۂ فتح مکہ کے وقت تھا جب آپ نے مکہ میں داخل ہونے کا ارادہ فرمایا۔ چونکہ غزوۂ حنین بھی اسی دوران ہوا اس لیے ایک راوی نے غزوۂ حنین کا ذکر کر دیا۔ تیسری روایت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا یہ فرمان حجۃ الوداع کے وقت صادر ہوا تھا جب آپ نے منیٰ سے واپسی پر طوافِ وداع کے لیے مکہ جانے کا ارادہ کیا تھا۔ ممکن ہے یہ جملہ دو مرتبہ ارشاد فرمایا ہو۔ فتح مکہ کے وقت بھی اور حجۃ الوداع میں بھی۔'' [2]

صحیح مسلم میں عبدالرزاق کی سند سے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب حجۃ الوداع میں ہم مکہ مکرمہ کے قریب پہنچے تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ''اللہ کے رسول! آپ کل کہاں اتریں گے؟'' فرمایا: «وَهَلْ تَرَكَ لَنَا عَقِيلٌ مَّنْزِلًا» ''کیا عقیل نے ہمارے اترنے کو کوئی جگہ چھوڑی ہے؟'' [3]

دوسری روایت میں ہے: ''کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی رہائشی مکان یا گھر چھوڑا ہے؟'' [4]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے گھر میں نہیں ٹھہرے۔ یہ روایت بخاری

[1] صحيح البخاري، الحجّ، باب نزول النبيﷺ مكّة، حديث: 1590. حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں اس امر کی وضاحت کی ہے۔ [2] فتح الباري: 39/15. [3] صحيح مسلم، الحجّ، باب نزول الحاجّ......، حديث: 1351. [4] صحيح مسلم، الحج، باب نزول الحاج بمكة وتوريث، حديث: 1351.

کی روایات سے بھی متعارض نہیں کہ آپ شعب ابی طالب میں ٹھہرے تھے۔

مواعظ و حکمتیں

اس سلسلے کی کچھ باتیں تو سابقہ بحث میں آ چکی ہیں۔ مزید یہ ہیں:

* کوئی زمانہ اور کوئی خطہ مروّت رکھنے والے جواں مرد لوگوں سے خالی نہیں ہوتا۔ داعیانِ اسلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی جری لوگوں کو اہمیت دیں تاکہ مشکلات اور مصائب کے وقت اُن سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔
* ہر دور اور علاقے میں اللہ کے دشمن داعیانِ اسلام کی معیشت اور اقتصادیات پر ضرب لگاتے رہے ہیں تاکہ وہ بے دست و پا ہو کر اپنی دعوت سے باز آ جائیں۔ یہ طریق کار اختیار کرنے میں مشرکین اور منافقین ہمیشہ متفق رہے ہے۔ اگر اولین مسلمان بھی کسی ایسی حکومت کے وظیفہ خوار یا تنخواہ دار ہوتے جو اُن کی دعوت کی مخالف ہوتی تو وہ حکومت سب سے پہلے اُن کے خلاف تادیبی کارروائی کرتے ہوئے اُنھیں اُن کے عہدوں سے برطرف کرتی لیکن اُس دور میں اس نوعیت کی کارروائی اس قسم کے بائیکاٹ ہی کے ذریعے سے تھی۔ داعیانِ اسلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس حقیقت کو اس کے ممکنہ وسیع مفہوم کے ساتھ ذہن میں رکھیں۔
* رسول اللہ ﷺ پر مصائب اور آزمائشوں میں ہر مومن کے لیے اس دنیا میں پہنچنے والی ہر مصیبت اور آزمائش کا مقابلہ کرنے کے لیے اسوۂ حسنہ اور تسلی و تشفی ہے۔
* جاہلیت قدیم ہو یا جدید اُس میں کچھ مفید چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ بنو ہاشم نے عصبیت اور قبائلی حمیت کی بنا پر اسلام کے لیے عظیم قربانیاں دیں۔ اگر موجودہ دور کے معاشروں میں بھی ایسی مفید چیزیں پائی جائیں، مثلاً: انسانی حقوق کے قوانین، سیاسی پناہ کا قانون یا آزادیٔ فکر کی اجازت تو ان سے یقیناً فائدہ

اٹھانا چاہیے، جس طرح اولین مسلمانوں نے بنوہاشم کی حمایت و استقامت سے فائدہ اٹھایا تھا۔

عالم الحزن

ابوطالب کی وفات

شعب سے رہائی کے تھوڑے عرصے بعد 10 نبوی میں جناب ابوطالب انتقال کر گئے۔ [1] بتایا جاتا ہے کہ وہ رمضان میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی رحلت سے تین دن اور ہجرت مدینہ سے تین سال پہلے فوت ہوئے۔ [2] بعض مؤرخین کے مطابق اُن کی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے درمیان ایک ماہ پانچ دن کا فاصلہ تھا۔ [3]

صحیح بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال حمایت اور حفاظت کرنے کے باوجود وہ کفر ہی کی حالت میں فوت ہوئے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ ابوطالب حالتِ نزع میں تھے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی خدمت میں گئے۔ اُن کے پاس ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا:

«يَاعَمِّ! قُلْ: لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، كَلِمَةً أَشْهَدُ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللّٰهِ»

[1] الطبقات الكبرٰى: 18/8. یہ واقدی کی روایت ہے جو نہایت ضعیف ہے۔ [2] تاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي، ص: 237. ذہبی نے یہ روایت حاکم سے نقل کی ہے۔ وأنساب الأشراف للبلاذري: 406/1، والطبقات الكبرٰى: 18/8. یہ واقدی کی سند سے ہے جو نہایت ضعیف ہے۔ والسيرة النبوية لابن هشام: 66/2. یہ بلاسند ہے۔ [3] الطبقات الكبرٰى: 211/1. یہ بھی واقدی کی سند سے ہے اور واقدی متروک ہے۔

''چچا جان! لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ پڑھ لیجیے۔ ایک ایسا کلمہ جس کے ذریعے سے میں اللہ تعالیٰ کے حضور آپ کے حق میں گواہی دوں گا۔''

ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ کہنے لگے: ''ابوطالب! کیا آپ عبدالمطلب کا دین چھوڑ دیں گے؟'' رسول اللہ ﷺ انھیں کلمہ طیبہ کی دعوت دیتے رہے اور ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ یہی بات دہراتے رہے حتی کہ ابوطالب نے آخری بات یہ کہی: ''میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں۔''

انھوں نے لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کہنے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَمَا وَاللّٰهِ! لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ مَا لَمْ أُنْهَ عَنْكَ»

''اللہ کی قسم! میں آپ کے لیے اُس وقت تک استغفار کرتا رہوں گا جب تک مجھے روک نہیں دیا جاتا۔''

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوٓا أَنْ يَّسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ ......﴾

''نبی اور ایمان والوں کے لائق نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے بخشش طلب کریں......'' [1]

پھر یہ آیت بھی نازل ہوئی:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ ......﴾

''(اے نبی!) بے شک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے......'' [2]

امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اپنی سند کے ساتھ روایت کی ہے، انھوں

---

[1] التوبة 9:113. [2] القصص 28:56. صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب قصّة أبي طالب، حديث: 3884، وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدّليل على صحة إسلام من حضره الموت، مالم يشرع في النزع......، حديث: 24، واللفظ له.

نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا سے کہا: لا إِلٰه إِلَّا اللّٰه کہہ دیجیے۔ میں قیامت کے دن اس کے ذریعے سے آپ کے حق میں گواہی دوں گا۔'' ابوطالب کہنے لگے: ''خطرہ ہے کہ قریش مجھے یہ طعنہ دیں گے کہ اُس نے موت کی گھبراہٹ میں کلمہ پڑھا ہے۔ یہ خدشہ نہ ہوتا تو میں کلمہ پڑھ کر ضرور تیری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا۔'' اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ﴾

''(اے نبی!) بلاشبہ جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت عطا فرماتا ہے۔''[1]

امام مسلم، عبد بن حمید اور امام احمد رحمہم اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث روایت کی ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آگ میں جانے والوں میں سب سے ہلکا عذاب ابوطالب کو ہوگا۔ اُن کے پاؤں میں آگ کے جوتے ہوں گے جن کی وجہ سے اُن کا دماغ کھول رہا ہوگا۔''[2]

یہ الفاظ عبد بن حمید کے ہیں۔ مسلم کے الفاظ یہ ہیں: ''......انھوں نے ایسے جوتے پہن رکھے ہوں گے جن کی حِدّت (گرمی) سے ان کا دماغ اُبل رہا ہوگا۔''[3]

مسند احمد کی روایت میں ہے: ''انھوں نے آگ کے بنے ہوئے جوتے پہنے ہوں گے جن کی وجہ سے ان کا دماغ کھول رہا ہوگا۔''[4]

وہ روایات جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جناب ابوطالب نے اپنی وفات کے وقت کلمۂ اسلام پڑھ لیا تھا، اُن میں کوئی روایت بھی صحیح نہیں۔[5] صحیح مسلم کی روایت صراحت سے

[1] القصص 56:28. صحیح مسلم، الإیمان، باب الدّلیل علی صحة إسلام من حضره الموت ......، حدیث:(42)-25. [2] المنتخب لعبد بن حمید، ص:235. [3] صحیح مسلم، الإیمان، باب أهون أهل النّار عذاباً، حدیث: 212. [4] مسند أحمد:290/1. [5] ان میں سے ایک روایت ◄◄

بتا رہی ہے کہ وہ کفر کی حالت میں فوت ہوئے، چنانچہ کوئی غیر صحیح روایت اس کے مقابلے میں پیش ہی نہیں کی جاسکتی۔ [1]

حکمت و مواعظ

* پیچھے یہ بات گزر چکی ہے کہ حضرت ابو طالب کا کفر کی حالت میں فوت ہونا اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمت کے تحت تھا جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔
* یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہجرت سے تین سال پہلے ہی ابو طالب کا اسلام قبول کیے بغیر فوت ہو جانا اس لیے تھا کہ کسی کے دماغ میں یہ خیال بھی نہ آئے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت میں اُن کا بھی کوئی دخل تھا یا اس دعوت کے پیچھے قبیلہ، خاندان، سرداری یا حصولِ منصب کا کوئی مقصد یا مفاد کام کر رہا تھا۔ [2]

عین ممکن ہے اس کی کئی حکمتیں ہوں جن تک ہماری رسائی نہیں ہوسکتی، وہ تو علّام الغیوب ہی کے علم میں ہیں۔

ایک ضروری بات

روایت ہے کہ حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد ابولہب نے رسول اللہ ﷺ کی

◂◂ ابن اسحاق کی ہے کہ عباس رضی اللہ عنہ نے ابو طالب کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ انھوں نے کان لگا کر سنا تو وہ رسول اللہ ﷺ کا تلقین کردہ کلمہ پڑھ رہے تھے۔ ابن اسحاق کی سند میں ایک مجہول راوی ہے، دیکھیے: (السیر والمغازي، ص: 238) اس نوع کی دیگر روایات کے لیے دیکھیے: (فتح الباري: 41/15) ابن حجر نے ایسی روایات کی تردید کی ہے، دیکھیے: (الإصابة في تمييز الصحابة: 4/116-119) ابن حجر نے ان اہل تشیع کی گوشمالی کی ہے جنھوں نے ڈھنڈورا پیٹا کہ ابو طالب مسلمان ہو گئے تھے۔ ذہبی نے بھی ان روایات کی تردید کی ہے، دیکھیے: (تاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 232/1)؛ [1] صحيح مسلم، باب أهون أهل النار عذاباً، حديث: 212، ومسند أحمد: 290/1. [2] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 51.

حمایت و حفاظت شروع کر دی تھی۔ جب ابو غیطلة نے رسول اللہ ﷺ کو گالی دی تو ابولہب نے اُسے ڈانٹا تھا۔ قریش نے ابولہب کی حمایت ختم کرنے کے لیے حیلہ اختیار کیا۔ انھوں نے عقبہ بن ابی معیط اور ابو جہل کو ابولہب کے پاس بھیجا کہ تم رسول اللہ ﷺ سے عبدالمطلب کے انجام کے بارے میں پوچھو۔ ابولہب نے آپ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اپنی قوم کے ساتھ ہیں۔'' ابولہب نے عقبہ اور ابو جہل کو آپ ﷺ کا جواب بتلایا تو وہ کہنے لگے: ''محمد (ﷺ) کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ وہ آگ میں جائیں گے۔'' ابولہب نے پوچھا: ''اے محمد! کیا عبدالمطلب آگ میں جائیں گے؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص بھی اُس دین پر فوت ہوگا جس پر عبدالمطلب فوت ہوئے وہ آگ ہی میں جائے گا۔'' ابولہب طیش میں آ گیا، کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! میں ہمیشہ تیرا دشمن ہی رہوں گا کیونکہ تو کہتا ہے کہ عبدالمطلب آگ میں جائیں گے۔'' اس کے بعد ابولہب اور دوسرے قریش رسول اللہ ﷺ کے پہلے سے بھی بڑھ کر دشمن ہوگئے اور ان کا برتاؤ انتہائی جارحانہ ہوگیا۔[1]

غور کیجیے، رسول اللہ ﷺ کس قدر صاف شفاف شخصیت کے مالک تھے! کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے اور نہ کسی اسلامی حکم پر کوئی لیپ پوتی کرتے تھے، نتائج چاہے کچھ بھی ہوں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ کچھ مؤرخین نے

[1] ابن کثیر نے اسے ابن جوزی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ جس کی انھوں نے مکمل سند بیان نہیں کی کہ اس کے صحیح یا ضعف کا فیصلہ ہو سکے۔ ممکنہ حد تک یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ثابت ہو جائے تو بعثت نبوی سے پہلے کے وہ لوگ جن کے پاس کوئی رسول نہیں آیا اور جنھیں ''اہل فترہ'' کہا جاتا ہے، ان کے حکم کے متعلق فقہاء کے درمیان جاری اختلاف کا راستہ بند ہو سکتا ہے، دیکھیے: (البدایة والنہایة: 148,147/3)

لکھا ہے کہ انھوں نے ابوطالب کی وفات کے دو ماہ بعد رحلت فرمائی۔ بعض کے نزدیک ایک ماہ پانچ دن بعد اور بعض کے نزدیک صرف تین دن بعد فوت ہوئیں۔ دیگر اقوال بھی ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ اُن کی وفات ہجرت سے تین سال قبل 10 نبوی کے رمضان المبارک میں ہوئی۔[1]

یوں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جب جناب ابوطالب اور پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اللہ کو پیاری ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ابوطالب نبیٔ اکرم ﷺ کے لیے مضبوط زرہ کی طرح تھے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا فروغ اسلام کے سلسلے میں انتہائی اخلاص کے ساتھ آپ کی مدد کرتی تھیں اور مشکل حالات میں آپ کو سکون کا سامان فراہم کرتی تھیں۔[2] اُن کی فضیلت میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔ اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے ہاں اُن کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا۔[3]

روایت ہے کہ جب ابوطالب فوت ہوگئے تو قریش نے آپ ﷺ سے وہ بدسلوکی شروع کی جو اُن کی زندگی میں ممکن نہ تھی۔ ایک دفعہ ایک بدقماش قریشی آپ ﷺ کے سامنے آیا اور اُس ظالم نے آپ ﷺ کے سر پر مٹی ڈال دی۔[4] آپ ﷺ اسی حالت میں گھر داخل ہوئے۔ آپ کی صاحبزادی سر مبارک سے مٹی دھوتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں۔ آپ ﷺ نے انھیں دلاسا دیا اور فرمایا: ”بیٹی! مت رو۔ اللہ تعالیٰ تیرے

---

[1] دیکھیے سابقہ عنوان ”ابوطالب کی وفات“ اور دیکھیے: (حاشية دلائل النبوّة للبيهقي: 353/2) دکتور قلعجی نے اس کے بارے میں بیشتر اقوال بیان کردیے ہیں۔ [2] السير والمغازي لابن إسحاق: 243، والسيرة النبوية لابن هشام: 66/2. بغیر سند کے۔ [3] ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی فضیلت میں بیشتر روایات ہم وہاں بیان کر آئے ہیں جہاں رسول اللہ ﷺ سے ان کی شادی کا ذکر ہے۔ اس سلسلے کی مزید روایات کے لیے ملاحظہ کیجیے: (السير والمغازي لابن إسحاق، ص: 243، 244، وفضائل الصّحابة لأحمد: 850/2-856) [4] ابن اسحاق نے یہ روایت سند کے بغیر بیان کی ہے۔ السيرة النبوية لابن هشام: 66/2. یہ روایت ضعیف ہے۔

باپ کی حفاظت کرے گا۔‘‘ ساتھ ہی ساتھ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ’’ابوطالب کے جیتے جی قریش مجھ سے ایسی بدسلوکی نہ کرتے تھے۔‘‘ [1]

پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ ایک دفعہ ظالموں نے آپ ﷺ کے کندھوں کے درمیان بحالتِ سجدہ ذبح شدہ اونٹنی کی جیر لاکر رکھ دی تھی۔ یہ جرأت بھی انھیں جناب ابوطالب کی وفات کے بعد ہی ہوئی تھی۔

ان پے در پے مکروہات و مصائب کے ٹوٹ پڑنے کی وجہ سے بعض مؤرخین نے اس سال کو ’’عام الحزن‘‘ یعنی غم کا سال قرار دیا ہے۔ [2] اگرچہ یہ ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے اس سال کا یہ نام خود رکھا تھا۔ [3] علامہ سیوطی وغیرہ نے یہی لکھا ہے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ غم کا اصل سبب زبردست شدائد تھے جو رسول اللہ ﷺ کو اس سال دعوتِ اسلامیہ کی راہ میں کفار کی طرف سے برداشت کرنے پڑے اور اُن کے وہ اقدامات جن کے ذریعے سے وہ آپ کا ناطقہ بند کرنے کی کوشش کر رہے تھے، آپ ﷺ کے لیے موجب اذیت بنے۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے شادی

ان مصائب اور آزمائشوں کے باوجود جن کا رسول اللہ ﷺ کو ہر آن سامنا کرنا پڑ رہا تھا، آپ اپنے معزز ساتھیوں سے نہایت ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ ان کی غم خواری

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 67/2. سند حسن مرسل ہے۔ [2] انھی مؤرخین کی پیروی میں دکتور البوطی نے فقه السيرة میں اور صفی الرحمن مبارکپوری نے الرحيق المختوم میں اس سال کو عام الحزن لکھا ہے۔ البانی نے اپنی کتاب دفاع عن الحديث النبوي والسيرة میں اس نام پر اعتراض کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق یہ نام ایک حدیث میں آیا ہے جسے قسطلانی نے اپنی کتاب سیرت ’’المواهب‘‘ میں بیان کیا۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی صاعد ثقہ نہیں ہے۔ [3] دفاع عن الحديث النّبوي والسيرة للألباني، ص: 8.

میں کوئی کسر باقی نہ رکھتے تھے۔

شوال 10 نبوی میں آپ نے حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی۔ حضرت سودہ اولین مسلمان خواتین میں سے تھیں۔ انھوں نے اپنے خاوند سکران بن عمرو رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبشہ کی طرف دوسری ہجرت کی تھی مگر حضرت سکران رضی اللہ عنہ فوت ہوگئے۔ اُن کی قربانیوں کی قدر شناسی اور اُن کے ساتھ غمخواری کرتے ہوئے آپ نے خود اُن کے ساتھ نکاح کر لیا۔[1] اُمہات المومنین کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہم اس نکاح کی مزید حکمت اور مصلحت بیان کریں گے۔

سفرِ طائف

ابوطالب کی وفات کے بعد قریش نے رسول اللہ ﷺ کو تکالیف پہنچانے میں ساری اگلی پچھلی کسریں نکال دیں اور کُھل کر سامنے آگئے۔ اس صورتِ حال میں رسول اللہ ﷺ نے طائف جانے کا پروگرام بنایا کہ شاید بنوثقیف آپ کی مدد کریں اور قریش کے مقابلے میں آپ کو تحفظ فراہم کریں۔ آپ کو امید تھی کہ وہ اسلام قبول کرلیں گے۔[2]

ابن حبیب نے المحبّر میں روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات سے تین ماہ آٹھ دن بعد،[3] اور مغلطائی کے نزدیک پورے تین ماہ بعد،[4] طائف تشریف لے گئے۔ ابھی شوال 10 نبوی کے چند دن باقی تھے۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق آپ کے ساتھ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔[5]

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ طائف پہنچے۔ بنوثقیف کے سرداروں

[1] الإصابة لابن حجر: 59/2 و339,338/4. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 69/2. یہ روایت سند کے بغیر ہے۔ والفتح الرّبّاني: 243/20. احمد کی سند جید ہے۔ [3] المُحَبّر لابن حبیب، ص: 11. [4] الإشارة إلى سيرة المصطفى لمغلطائي، ص: 133. [5] الطبقات الکبرٰی: 211/1. یہ ابن سعد کے استاذ واقدی کی روایت ہے۔

عبدیالیل، مسعود اور حبیب سے ملے۔ یہ تینوں عمرو بن عمیر کے بیٹے تھے۔ آپ ﷺ نے انھیں اسلام کا پیغام سنایا۔ انھوں نے قبول نہ کیا، بلکہ آپ کا تمسخر اڑانے لگے۔ آپ بنوثقیف سے ناامید ہوگئے تو اُن سے کہا کہ کم از کم آپ لوگ اس بات چیت سے دیگر لوگوں کو مطلع نہ کریں تاکہ وہ کوئی فتنہ کھڑا نہ کریں۔ انھوں نے یہ بات بھی نہ مانی بلکہ اپنے غلاموں اور ناسمجھ بچوں کو رسول اللہ ﷺ کے پیچھے لگا دیا۔ وہ شور مچانے اور آپ کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ بہت سے لوگ اکٹھے ہوگئے۔ [1]

ان شقی القلب لوگوں نے آپ ﷺ سے نہایت بدتمیزی کا برتاؤ کیا اور آپ کو ایک

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 2/70-72۔ اس روایت کی سند حسن مرسل ہے۔ ابن ہشام نے اس روایت میں دعا اور اس کے بعد والے حصے کی سند بیان نہیں کی۔ ابن سعد نے اس روایت کو اختصار کے ساتھ درج کیا ہے۔ اس کی سند میں واقدی بھی ہے۔ ابن سعد کی روایات قدرے مختلف ہیں۔ انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے لیکن دعا کا ذکر نہیں کیا۔ بیہقی نے اسے موسیٰ بن عقبہ از زہری کی سند سے روایت کیا ہے۔ زہری کی یہ سند مرسل ہے۔ بیہقی نے اپنی روایت میں دعا کا ذکر نہیں کیا، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 2/414-417) امام احمد نے اسے روایت کیا، ان کی روایت میں دعا موجود ہے، دیکھیے: (مسند أحمد: 4/335) سیوطی نے اپنی کتاب الجامع الصغیر میں یہ دعا طبرانی کے حوالے سے نقل کی اور اس کے حسن ہونے کا اشارہ دیا ہے۔ شیخ البانی نے امام غزالی کی کتاب (فقه السيرة، ص: 132) کے حاشیے اور اپنی کتاب (دفاع عن الحديث النبوي والسيرة، ص: 19) میں لکھا: ”طبرانی نے المعجم الكبير میں یہ واقعہ عبداللہ بن جعفر کی روایت سے اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس میں یہ دعا بھی موجود ہے۔“ ہیثمی نے لکھا: ”اس کی سند میں ابن اسحاق ہے جو ثقہ اور مدلس ہے۔ باقی تمام رجال ثقہ ہیں۔ یہ حدیث ابن اسحاق کے عنعن سے روایت کرنے کی بنا پر ضعیف ہے۔“ دیکھیے: (مجمع الزوائد: 6/35) الصویانی نے لکھا: ”واقعہ یہ ہے کہ ابن اسحاق کی روایت شواہد (تائیدی روایات) کی بدولت قوی ہے۔“ دیکھیے: (السيرة النبوية الصحيحة، ص: 158) الصویانی نے اس کی تائیدی روایات درج کی ہیں۔ ابراہیم العلی نے الصویانی ہی کی پیروی میں تحقیق کرتے ہوئے اس روایت کو قوی قرار دیا ہے، دیکھیے: (صحيح السيرة، ص: 98) ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ تنہا طائف کو روانہ ہوئے تھے۔

باغ میں دھکیل دیا۔ وہ باغ ربیعہ کے بیٹوں عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ وہ دونوں وہاں موجود تھے۔ انھیں دیکھ کر بنوثقیف کے تماش بین واپس چلے گئے۔ آپ ﷺ انگور کی بیل کے سائے میں جا بیٹھے۔ ربیعہ کے دونوں بیٹے آپ ﷺ کو دیکھ رہے تھے اور آپ ﷺ کے ساتھ طائف کے لوگوں کی بدسلوکی سے محظوظ ہو رہے تھے۔

جب آپ سکون کے ساتھ تشریف فرما ہوئے تو آپ نے یہ نہایت رقت آمیز دعا فرمائی: ''اے اللہ! میں صرف تیرے ہی روبرُو اپنی کمزوری، بے بسی اور لوگوں کے نزدیک اپنی ناقدری کی شکایت کرتا ہوں۔ اے سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے! تو کمزور، بے بس اور بے نوا لوگوں کا رب ہے۔ تو میرا بھی پروردگار ہے۔ تو مجھے کس کے سپرد کر رہا ہے؟ اجنبی کے حوالے کر رہا ہے جو مجھ سے ترش رُوئی کرتا ہے یا دشمن کے جسے تو نے مجھ پر قدرت دی ہے؟ اے اللہ! اگر تو مجھ سے ناراض و غضبناک نہیں تو مجھے ان مصائب کی ہرگز پروا نہیں۔ لیکن تیری عافیت میرے لیے بہت کشادہ ہے۔ میں اس بات سے تیرے چہرے کے اس نور کی پناہ میں آتا ہوں جس سے ظلمتیں چھٹ جاتی ہیں اور دنیا و آخرت کے سارے معاملات درست ہو جاتے ہیں کہ مجھ پر تو اپنا غضب نازل کرے یا تیری ناراضی مجھ پر اُتر آئے۔ تیری ہی رضا و خوشنودی مطلوب ہے، یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے اور تیرے بغیر کوئی حیلہ ہے نہ قوت۔''

ربیعہ کے بیٹوں نے رسول اللہ ﷺ کو اس عالم میں دیکھا تو رشتۂ قرابت نے جوش مارا۔ انھوں نے اپنے ایک عیسائی غلام، جس کا نام عدّاس تھا، سے کہا کہ آپ ﷺ کو انگور پیش کرے۔ اُس نے انگور پیش کیے۔ آپ ﷺ نے کھانے سے پہلے ''بسم اللہ'' پڑھی۔ عداس کو تعجب ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے اُسے بتایا کہ میں نبی ہوں تو اُس کا تعجب دور ہو گیا اور وہ آپ ﷺ کے سر مبارک، ہاتھوں اور پاؤں کو بوسے دینے لگا۔ ربیعہ کے بیٹوں نے یہ ماجرا دیکھا تو اپنے غلام کو خبردار کیا اور اُسے رسول اللہ ﷺ سے دُور رکھنے کی

کوشش کی۔ انھوں نے کہا: ''دیکھنا کہیں یہ شخص تجھے تیرے دین سے برگشتہ نہ کر دے۔ یقیناً تیرا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔''

موسیٰ بن عقبہ کی ایک روایت میں ہے کہ طائف کے اوباش لوگ دو صفیں بنا کر اللہ کے رسول ﷺ کے راستے میں بیٹھ گئے۔ جب آپ ﷺ اُن کے درمیان سے گزرے تو وہ بے تحاشا آپ کے پائے مقدس پر پتھر برسانے لگے۔ یہ پتھر انھوں نے پہلے سے جمع کر رکھے تھے۔ انھوں نے سنگ باری کرتے کرتے آپ کے پاؤں خون سے رنگین کر دیے۔ یہ سب سے زیادہ سنگین تکلیف تھی جو رسول اللہ ﷺ کو راہِ حق میں جھیلنی پڑی۔ [1]

جب رسول اللہ ﷺ کو طائف میں اس قدر ہولناک آشوب اور آزمائش کا سامنا کرنا پڑا تو آپ انتہائی غمگین ہوئے اور واپس مکہ مکرمہ کی طرف چل دیے۔ جب آپ ﷺ قرن الثعالب کے مقام پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام کو بھیجا۔ اُن کے ساتھ پہاڑوں کا فرشتہ تھا۔ اُسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ اگر آپ ﷺ اشارہ فرمائیں تو دائیں اور بائیں طرف والے پہاڑوں کو ٹکرا کر طائف والوں کو پیس ڈالے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کے لیے معنوی طور پر ایک بڑا سہارا تھا۔ [2]

ابن سعد کی روایت کے مطابق آپ ﷺ طائف میں دس دن ٹھہرے۔ [3] مغلطائی نے آپ ﷺ کے قیام کی مدت ایک ماہ بتلائی ہے۔ [4]

[1] موسیٰ بن عقبہ سے یہ روایت بیہقی نے نقل کی ہے۔ یہ روایت زہری پر موقوف ہونے کی بنا پر مرسل ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی محمد بن فلیح ہے جو صدوق (سچا) تو ہے لیکن غلطی کر جاتا ہے، دیکھیے: (تقريب التهذيب لابن حجر، ص: 502، ودلائل النبوّة للبيهقي: 414/2) [2] یہ مکہ کے دو پہاڑ ہیں، ایک أبو قُبَيس اور دوسرا اس کے بالمقابل قُعَيقِعان۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے مراد الأحمر اور منیٰ کے پہاڑ ہیں، دیکھیے: (البداية والنهاية: 150/3) [3] الطبقات الكبرىٰ: 212/1. یہ واقدی کی روایت ہے۔ [4] الإشارة إلى سيرة المصطفى لمغلطائي، ص: 133.

صحیحین میں روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا آپ پر کوئی دن احد کے دن سے بھی زیادہ سخت گزرا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عائشہ! مجھے تمھاری قوم کی طرف سے بہت مصیبتیں پہنچیں۔ سب سے شدید مصیبت مجھے عقبہ (گھاٹی) کے دن پہنچی جب میں ابن عبد یالیل بن عبد کلال کے پاس پہنچا (کہ میری حمایت و حفاظت کا ذمہ لے) لیکن اُس نے میری بات قبول نہیں کی۔ میں انتہائی غمگین حالت میں بے سُدھ وہاں سے چل پڑا۔ اچانک میں اپنی سوچوں کے گرداب سے نکلا تو معلوم ہوا کہ میں قرن الثعالب کے مقام پر ہوں۔ میں نے سر اُوپر اٹھایا تو دیکھا کہ ایک بادل مجھ پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس میں جبریل علیہ السلام نظر آئے۔ انھوں نے مجھے آواز دی اور کہنے لگے: ''اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم سے کہی گئی باتیں اور اُن کا جواب سن لیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے۔ آپ اُسے ان کے بارے میں جو چاہیں حکم دیں۔'' اسی اثنا میں پہاڑوں کے فرشتے نے مجھے آواز دی اور سلام کیا، پھر کہا: ''اے محمد!...... اگر آپ چاہیں تو ان لوگوں کو پہاڑوں تلے کچل ڈالوں؟'' نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(نہیں!) بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل میں ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں گے اور اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بنائیں گے۔''[1]

مکہ مکرمہ پہنچنے سے پہلے ایک اور معنوی مدد بھی آپ کو نصیب ہوئی۔ اس کی صورت یہ تھی کہ کچھ جن آپ کی رسالت پر ایمان لے آئے۔ مکہ مکرمہ کے قریب وادیٔ نخلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کئی دن ٹھہرے۔ اس دوران میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس جنوں کی ایک جماعت بھیجی۔ انھوں نے توجہ سے قرآن سنا اور ایمان لے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس

[1] صحيح البخاري، بدء الخلق، باب: إذا قال أحدكم: آمين......، حديث: 3231، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب ما لقي النبي ﷺ من أذى المشركين والمنافقين، حديث: 1795.

واقعے کا ذکر قرآن مجید کی سورۂ احقاف اور سورۂ جن میں فرمایا ہے:

﴿وَإِذْ صَرَفْنَآ إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ ٱلْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ ٱلْقُرْءَانَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوٓا۟ أَنصِتُوا۟ ۖ فَلَمَّا قُضِىَ وَلَّوْا۟ إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ ۝ ......﴾

''اور (یادکرو) جب ہم نے جنوں کی ایک ٹولی کو آپ کی طرف متوجہ کیا جو قرآن غور سے سنتے تھے، پھر جب وہ اس کے پاس (تلاوت سننے کو) حاضر ہوئے تو (آپس میں) کہنے لگے: ''خاموش ہو جاؤ۔'' پھر جب (تلاوت) ختم ہوگئی تو وہ اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر واپس ہوئے......۔''[1]

﴿قُلْ أُوحِىَ إِلَىَّ أَنَّهُ ٱسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ ٱلْجِنِّ فَقَالُوٓا۟ إِنَّا سَمِعْنَا قُرْءَانًا عَجَبًا ۝ يَهْدِىٓ إِلَى ٱلرُّشْدِ فَـَٔامَنَّا بِهِۦ ۖ وَلَن نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ أَحَدًا ۝﴾

''(اے نبی!) کہہ دو کہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک ٹولی نے (قرآن) غور سے سنا تو انھوں نے کہا: ''بلاشبہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔ وہ رشد و ہدایت کی راہ دکھاتا ہے، چنانچہ ہم اُس پر ایمان لے آئے ہیں اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو کبھی شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔''[2]

صحیح بخاری میں بھی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جنوں کے آنے کی روایت آئی ہے۔[3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کئی دلائل دیے ہیں جن سے ابن اسحاق اور ابن سعد رحمہما اللہ کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی طائف سے واپسی کے وقت پیش آیا۔[4]

---

[1] الأحقاف 29:46. [2] الجن 2,1:72. [3] صحيح البخاري، التفسير، باب سورة ﴿قُلْ أُوحِىَ إِلَىَّ﴾، حديث: 4921، وصحيح مسلم، الصّلاة، باب الجهر بالقرائة في الصّبح ......، حديث: 449.

[4] فتح الباري: 315/18. ابن حجر نے رسول اللہ ﷺ سے جنوں کی ملاقات کے متعلق بیان کردہ روایات پر طویل گفتگو کی ہے۔ والسيرة النبوية لابن هشام: 73/2. محمد بن کعب قرظی کی اس روایت کی سند مرسل حسن ہے۔ والطبقات الكبرٰى: 212,211/1. یہ واقدی کی روایت ہے۔ ابن سعد کے نزدیک یہ واقعہ دس نبوی کے ماہِ شوال کی راتوں میں پیش آیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان دو واقعات کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کی ہمت بندھائی اور آپ دشمنوں کی ہمہ گیر مخالفت کی پروا کیے بغیر دعوت الی اللہ کا رفیع الشان کام انتہائی سرگرمی سے انجام دیتے رہے۔ طائف سے واپسی کے بعد آپ ﷺ نے دوبارہ مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو حضرت زید نے کہا: ''یا رسول اللہ! آپ دوبارہ ان کے پاس کیسے جائیں گے جبکہ انھوں نے آپ ﷺ کو نکال دیا تھا؟'' آپ نے فرمایا: ''زید! اللہ تعالیٰ ان مصائب سے نکلنے کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور پیدا کرے گا۔ یقین رکھو! اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد کرنے والا اور اپنے نبی ﷺ کو غالب کرنے والا ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں داخل ہونے کے لیے اَخنس بن شریق کی پناہ طلب کی۔ اُسے ہمت نہ ہوئی اور اُس نے بہانہ بنایا کہ میں خود قریش کا حلیف ہوں۔ حلیف کیا پناہ دے سکتا ہے؟ آپ نے سُہیل بن عمرو سے پناہ طلب کی۔ اُس نے انکار کر دیا اور کہا کہ بنوعمرو بنوکعب کے خلاف پناہ نہیں دے سکتے۔ آخر آپ نے مطعم بن عدی کو پناہ کا پیغام بھیجا۔ اُس نے قبول کر لیا۔ وہ خود اور اُس کے بیٹے رسول اللہ ﷺ کی حمایت پر کمربستہ ہو گئے۔[2]

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اُن کی اس جرأت و جانبازی کا یوں تذکرہ کرتے ہیں:

أَجَرْتَ رَسُولَ اللّٰهِ مِنْهُمْ فَأَصْبَحُوا عَبِيدَكَ مَا لَبّٰى مُهِلٌّ وَّأَحْرَمَا
فَلَوْ سُئِلَتْ عَنْهُ مَعَدٌّ بِأَسْرِهَا وَقَحْطَانُ أَوْ بَاقِي بَقِيَّةِ جُرْهُمَا
لَقَالُوا هُوَ الْمُوفِي بِخُفْرَةِ جَارِهِ وَذِمَّتِهٖ يَوْمًا إِذَا مَا تَذَمَّمَا

''تم نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ والوں سے پناہ دی۔ وہ تمھارے غلاموں کی طرح

[1] الطبقات الکبریٰ: 212/1. [2] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 24/2. یہ ابن ہشام کی اپنی روایت ہے جو بلاسند ہے۔ مطعم بن عدی کے پناہ دینے کا یہ واقعہ ''فاکہی'' کی روایت سے ثابت ہے۔ اخنس بن شریق کے حلیف بنوزہرہ تھے۔

سہم کر رہ گئے۔ جب تک احرام باندھے جائیں گے اور صدائے لبیک پکاری جائے گی تمھاری جرأت کو داد دی جاتی رہے گی۔ اگر قبیلۂ معد (قریش)، قحطان اور بنوجرہم کے بچے کھچے افراد سے مطعم کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ پکار اٹھیں گے: ''وہی تو ایسا باوفا ہے کہ جب کسی کو پناہ دے دے یا کسی کا ذمہ اٹھا لے تو اپنی پناہ اور ذمے کا بہت پاس رکھتا ہے۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ نے بھی مطعم بن عدی کے اس احسان اور بائیکاٹ کی دستاویز چاک کر دینے کے حوالے سے اُن کا کردار یاد رکھا اور غزوۂ بدر میں قیدیوں کے بارے میں فرمایا: ''اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور مجھ سے ان پلیدوں کے بارے میں بات کرتے تو میں اُن کے لیے انھیں چھوڑ دیتا۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ نے اُس دور کے رواج کے مطابق پناہ تو ضرور حاصل کی مگر اس پناہ کی بنا پر آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابۂ کرام کے دعوت و تبلیغ کے کام میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ ایسی ہی ایک نظیر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی قائم کی تھی۔ جب مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی کوچ کیا اور جب برکِ غماد نامی جگہ پر پہنچے تو قارہ کے سردار۔ ابن اسحاق کے مطابق احابیش کے سردار۔ ابن دُغُنَّہ سے آمنا سامنا ہوا۔ اُسے صورت حال کا پتہ چلا تو اُنھیں واپس مکہ لے آیا۔ اور کہا: ''ابوبکر! تجھ جیسے افراد نہیں نکلا کرتے اور نہ انھیں نکالا جاتا ہے......۔'' بعد میں قریش نے یہ شرط لگا دی کہ تم ابوبکر

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 24,23/2. یہ ابن اسحاق کی معلق روایت ہے۔ فاکہی نے بسند حسن یہ بیان کیا ہے کہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مطعم بن عدی کی وفات کے موقع پر ان کے نبی ﷺ کے ساتھ حسنِ سلوک کی وجہ سے یہ اشعار کہے۔ [2] صحيح البخاري، فرض الخمس، باب ما منّ النبي ﷺ على الأسارى من غير أن يخمّس، حديث: 3139. حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں لکھا: ''اس سے مراد وہ واقعہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ طائف سے لوٹے اور مطعم بن عدی کی پناہ میں آئے۔'' دیکھیے: (فتح الباري: 194/15)

سے اتنا کہہ دو کہ اپنے گھر ہی میں رہ کر اللہ کی عبادت کریں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہاں کر دی۔ انھوں نے اپنے گھر کے صحن میں نماز کے لیے ایک چھوٹی سی مسجد بنا لی۔ لیکن جب وہ نماز یا قرآن پڑھتے تو مشرکین کی عورتیں اور نوجوان انھیں تعجب سے دیکھتے اور وہیں رُک جاتے کیونکہ وہ قرآن پڑھتے ہوئے رویا کرتے تھے۔ قریش کو خطرہ ہوا کہ اس طرح تو یہ لوگ قرآن پر ایمان لے آئیں گے۔ اس لیے انھوں نے ابن دغنہ سے مطالبہ کیا کہ وہ ابوبکر سے کہیں کہ وہ اپنے گھر کے صحن کے بجائے گھر کے اندر اس طرح عبادت کیا کریں کہ کسی کو دکھائی یا سنائی نہ دے۔ ابن دُغُنَّہ (دال اور غین پر پیش، نون پر تشدید۔ یا دال پر زبر، غین تلے زیر اور نون تشدید کے بغیر) ابوبکر کے ہاں پہنچا اور بولا: ''آپ اس شرط کی پابندی کریں ورنہ میری پناہ کالعدم سمجھیں۔'' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بلا تأمل فرمایا: ''آپ کی پناہ آپ کو مبارک! مجھے تو اللہ اور اُس کے رسول گرامی ﷺ کی پناہ کافی ہے۔''[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ایسا ہی دلیرانہ رویہ اختیار کیا۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے اپنے ماموں عاص بن وائل کی پناہ کالعدم کر دی تا کہ اللہ اور اس کے رسول کی پناہ میں اُسی طرح زندگی بسر کریں جس طرح دیگر بے بس مسلمان بسر کر رہے تھے اور جنھیں کوئی کافر پناہ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔

سفر طائف سے ماخوذ اسباق

* رسول اللہ ﷺ کا دین کی دعوت کے سلسلے میں بنو ثقیف کے تین سرداروں کو منتخب کرنا اس حقیقت کا اظہار و اعلان ہے کہ قومی قائدین کو دعوت دینا نہایت اہم ہے کیونکہ

[1] صحیح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3905، و دلائل النبوة للبيهقي: 471/2، والسيرة النبوية لابن هشام: 15,14/2. ابن اسحاق کی یہ روایت حسن سند کے ساتھ ہے۔ والسير والمغازي لابن إسحاق، ص: 235.

عوام الناس تو سرداروں کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ جب اُن سرداروں نے آپ کی دعوت قبول نہ کی تو آپ سمجھ گئے کہ عوام الناس بھی یہ دعوت قبول نہ کریں گے۔ اسی لیے آپ ﷺ طائف میں زیادہ دن نہیں ٹھہرے۔

* مخالفین کے خلاف رسول اللہ ﷺ کا صبر و تحمل عدیم النظیر تھا۔ طائف والوں نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کی انتہا کر دی تھی مگر آپ نے اُن کے خلاف اللہ تعالیٰ سے عذاب کی نہیں بلکہ ہدایت کی دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی۔ چند سال کے بعد جب آپ ﷺ طائف کا محاصرہ چھوڑ کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو بنوثقیف خود بخود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔

* مقامِ نخلہ میں جنوں سے آپ کی ملاقات اور قبولِ اسلام میں ان لوگوں کے لیے بڑی عبرت و نصیحت تھی جو انسان ہونے کے باوجود توحید و رسالت پر ایمان لانے پر آمادہ نہ تھے۔

* ثقیف کے ہاتھوں بدترین تشدد سہنے کے بعد جنوں کا رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا دراصل آپ ﷺ کی زبردست نصرت ربانی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ ﷺ کے لیے عظیم تسلی تھی جس نے آپ ﷺ کو سابقہ تکالیف بھلا دیں اور آپ ﷺ کو یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے ہرگز بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ اگر زمین والے آپ سے روگردانی بھی کریں تو عالمِ بالا میں بے شمار جن اور فرشتے موجود ہیں جو آپ پر ایمان لاتے ہیں اور آپ کا ساتھ دیتے ہیں۔ مزید برآں اگر اللہ تعالیٰ جنوں کو صاحبِ ایمان اور داعیِ اسلام بنا سکتا ہے تو کوئی مشکل نہیں کہ وہ قریش و ثقیف کے سرکش اور ضدی لوگوں کو بھی کسی وقت صاحبِ ایمان اور داعیٔ اسلام بنا دے اور فی الواقع ایسا ہی ہوا۔[1]

* جاہلیت کے چند قابلِ تعریف امور میں سے یک اہم چیز ''امان و پناہ'' تھی جو آج کل

[1] قراءة جديدة للسيرة النّبويّة للدكتور قلعجي، ص:99.

کے مہذب معاشروں میں بھی قابلِ فخر خیال کی جاتی ہے اور اُسے آج کل کی سیاسی اصطلاح میں ''سیاسی پناہ'' کہا جاتا ہے۔ اس سے داعیانِ اسلام تبلیغی سلسلے میں بوقتِ ضرورت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

* حضرت عدّاس رضی اللہ عنہ کا اسلام قبول کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ طائف سے مثبت نتائج حاصل کیے بغیر نہیں لوٹے، یعنی آپ ﷺ کے دستِ حق پر حضرت عداس رضی اللہ عنہ مسلمان ہوگئے۔ [1] خود رسول اللہ ﷺ ہی کا ارشاد ہے: ''(اے علی!) اللہ تعالیٰ تیرے ہاتھوں کسی کو ہدایت نصیب فرما دے تو یہ تیرے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔'' [2]

* آپ ﷺ کی ہجرتِ طائف اور وہاں کے اوباشوں کے ہاتھوں آپ کو پہنچنے والی تکالیف میں تبلیغ و دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے بہت بڑا سبق جلوہ گر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اقامتِ دین کے فریضے کے دوران ایسی ہولناک مصیبتیں پہنچ سکتی

[1] الإصابة لابن حجر: 467,466/2. یہاں حافظ ابن حجر نے اس امر کی دلیل کے طور پر کہ عداس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے تھے، چند روایات پیش کی ہیں۔ پہلی روایت ابن اسحاق کی ہے جو اس مضمون کے شروع میں بیان کی گئی ہے۔ اس کی سند کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ حسن مرسل ہے۔ دوسری روایت سلیمان تیمی کی ہے جو ان کی کتابِ سیرت میں نقل ہوئی ہے۔ یہ روایت بلاسند ہے۔ ابن حجر نے چند دیگر روایات بھی درج کی ہیں جن میں سے ہر ایک میں سند یا متن کے حوالے سے کوئی نہ کوئی خرابی پائی جاتی ہے۔ بیہقی نے عداس رضی اللہ عنہ کے نبی ﷺ پر ایمان لانے کا واقعہ زہری کی مرسل سند سے روایت کیا ہے۔ اس سند میں ایک راوی محمد بن فلیح ہے جو صدوق (سچا) تو ہے مگر غلطی کر جاتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ تمام روایات ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ عداس رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعے کی کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 2/415-417) [2] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب فضل من أسلم على يديه رجل، حديث: 3009و2942، وصحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل علي بن أبي طالب رضی اللہ عنہ، حديث: 2406.

ہیں تو ہم تم کس باغ کی مولی ہیں جو آزمائشوں سے محفوظ رہیں۔ پس داعیانِ اسلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہیں کیونکہ یہ انبیاء وصلحاء کا راستہ ہے جو آشوب اور آزمائش سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ دینِ صادق انسانی محنت و مشقت اور کلفت و عزیمت کے بغیر غلبہ نہ پائے۔

اسراء و معراج

رسول اللہ ﷺ کو پے در پے صدمات پہنچے۔ پہلے آپ کے چچا فوت ہوئے جو آپ کی حفاظت میں سینہ سپر رہے، پھر آپ کی باوفا اور غمگسار زوجہ محترمہ فوت ہو گئیں، پھر مکہ اور طائف کے لوگوں نے آپ سے بدسلوکی کی انتہا کر دی۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کے اطمینان قلب اور بطور عزت افزائی یہ معجزہ صادر فرمایا، لہٰذا یہ بات تو قطعی ہے کہ یہ واقعہ 10 نبوی کے بعد کا ہے کیونکہ واقعاتی ترتیب کا یہی تقاضا ہے، البتہ 10 نبوی میں یہ واقعہ کب رونما ہوا، اس میں خاصا اختلاف ہے۔ [1]

مہینے اور دن کے تعین میں شیخ طرہونی نے آثار و روایات کے عمیق مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ پیر کا دن اور ربیع الاول کی بارہ تاریخ تھی۔ [2]

سال کے بارے میں موسیٰ بن عقبہ نے زہری اور عروہ رحمہ اللہ سے روایت نقل کی ہے کہ بیت المقدس تک اسراء ہجرت مدینہ سے ایک سال قبل ہوا۔ [3]

[1] اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں، دیکھیے: (البداية والنهاية: 119/3) [2] صحيح السيرة النبوية للطرهوني: 274/1. مہینے اور دن کے تعین کی بابت مورخین کے اختلاف کے لیے ملاحظہ کیجیے: (سبل الهدٰى والرّشاد: 96,95/3) [3] مغازي رسول الله ﷺ لعروة بن الزبير، ص: 120. اس کی ◄◄

یہ بات شک وشبہ سے بالا ہے کہ اسراء ومعراج قرآن سے بھی ثابت ہے اور سنت سے بھی۔ قرآن کریم نے اسراء اور معراج کی طرف دو سورتوں: بنی اسرآءیل اور النجم میں اشارہ کیا ہے۔ سورۂ بنی اسرآءیل میں یہ واقعہ اور اس کی حکمت بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝﴾

”پاک ذات ہے (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا (وہ مسجد اقصیٰ) جس کے اردگرد ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بلاشبہ وہی خوب سننے والا، وہی خوب دیکھنے والا ہے۔“ [1]

دوسری سورت میں اللہ تعالیٰ نے معراج کا واقعہ اور اس کے نتائج بیان کیے ہیں:

﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی ۝ اِذْ یَغْشَی

◄◄ سندیں مرسل ہیں۔ ہم نے زہری کی روایت جو موسیٰ بن عقبہ کی سند سے ہے اور عروہ کی روایت اختیار کی ہے۔ اس کی وجہ امام جرح وتعدیل یحییٰ بن معین رحمہ اللہ کا یہ کہنا ہے: ”موسیٰ بن عقبہ کی کتاب جو زہری کی روایت سے ہے، سیرت کی کتابوں میں صحیح ترین ہے۔“ دیکھیے: (تهذيب التهذيب لابن حجر: 362/10) امام احمد کا کہنا ہے کہ موسیٰ بن عقبہ کی مغازی کو تھامے رکھو کیونکہ وہ ثقہ ہے، دیکھیے: (تذكرة الحفاظ: 148/1) اور امام مالک نے کہا: ”موسیٰ بن عقبہ کی مغازی کو تھامے رکھو کیونکہ وہ ثقہ ہے۔“ انھوں نے مزید کہا: ”مردِ صالح موسیٰ بن عقبہ کی مغازی کو تھامے رکھو کیونکہ وہ مغازی کی سب سے صحیح کتاب ہے۔“ دیکھیے: (تهذيب الأسماء واللغات للنووي: 118/1) موسیٰ بن عقبہ کی ثقاہت کے ثبوت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ بخاری ومسلم کے راویوں میں سے ہیں۔ [1] بنيٓ إسرآءيل 1:17.
اسراء سے مراد وہ معجزانہ سفر ہے جس کا آغاز مکہ میں مسجد حرام سے ہوا اور اختتام بیت المقدس (القدس) میں مسجد اقصیٰ پر ہوا۔ معراج سے مراد وہ معجزانہ سفر ہے جو مسجدِ اقصیٰ سے شروع ہو کر سدرۃ المنتہیٰ پر ختم ہوا۔

السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝﴾

''اور بلاشبہ اس (رسول) نے اس (جبریل) کو ایک بار اور بھی دیکھا۔ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ اس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا۔ نگاہ بہکی نہ حد سے بڑھی۔ یقیناً اس (رسول) نے اپنے رب کی بعض بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔'' [1]

سیرت طیبہ سے متعلقہ مکی واقعات میں اس واقعے کے متعلق سب سے زیادہ روایات آئی ہیں۔ صحیح بخاری میں چھ صحابہ سے بیس روایات ہیں [2] اور صحیح مسلم میں سات صحابہ سے اٹھارہ روایات ہیں۔ [3] البتہ کوئی روایت ایسی نہیں پائی جاتی جس میں اس سفر کے تمام واقعات ملتے ہوں۔ ہر روایت میں جداگانہ طور پر مختلف واقعات کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں۔ اس کے بارے میں وارد شدہ تمام احادیث سے یہ واقعہ اس طرح مرتب ہوتا ہے:

[1] النّجم 53:13-18. [2] محمد رسول اللہ ﷺ لعرجون: 2/357. [3] محمد رسول اللہ ﷺ لعرجون: 2/359. شامی نے (کتاب کے ساتویں باب میں) لکھا: ''جان لو! اللہ مجھ پر اور آپ پر رحم کرے کہ جن صحابہ کرام کا ذکر ہوا ان میں سے ہر ایک کی حدیث میں ایسی معلومات ہیں جو دیگر احادیث میں نہیں ملتیں، چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے بھلائی کی دعا کی (استخارہ کیا) اور ان سب کی احادیث کو جمع کر کے اس واقعے کو ترتیب دیا تاکہ باتوں کو سن کر محفوظ کر لینے والے کان جب اس واقعے کو سنیں تو انھیں حلاوت محسوس ہو اور ان پر گراں نہ گزرے اور ہر دور میں اس کا فائدہ عام ہو۔'' دیکھیے: (سبل الھدٰی والرّشاد: 3/113) شامی نے اس واقعے کو جس خوبصورت انداز سے ترتیب دیا اور اس میں موجود بعض اہم نکات کی نشاندہی اور بعض مشکل الفاظ کی شرح کی وہ ان کی کتاب کے آٹھویں اور نویں باب میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے جن اہم نکات کی نشاندہی اور مشکل الفاظ کی وضاحت کی ہے ان کی تعداد ایک سو گیارہ بنتی ہے۔ دسویں باب میں شامی نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے کہ اسراء کی رات جبریل نے نبی ﷺ کو نماز پڑھائی اور نماز کے فرض ہونے کی کیفیت بتائی۔

شق صدر

اس مبارک رات عشاء کی نماز کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے۔ انھوں نے مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ کے گھر کی چھت پھاڑی اور اندر داخل ہوئے، پھر آپ کا سینہ کھولا، اور پھر اسے زمزم کے پانی سے دھویا، پھر حکمت اور ایمان سے بھرا ہوا سونے کا طشت لائے اور اسے آپ ﷺ کے سینے میں الٹ دیا اور سینہ بند کر دیا، پھر آپ کا ہاتھ تھاما اور اوپر اپنے ساتھ لے گئے۔ [1]

اسراء

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس براق لایا گیا۔ یہ ایک سفید رنگ کا جانور تھا۔ قد میں گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا۔ جہاں اس کی نظر پڑتی وہاں اس کا پاؤں پڑتا تھا۔ میں اس پر سوار ہو گیا۔ وہ مجھے لے کر چلا اور میں بیت المقدس پہنچ گیا۔ میں نے براق کو اس حلقے سے باندھ دیا جس کے ساتھ انبیائے کرام (اپنے سواری کے جانور) باندھتے تھے، پھر میں (بیت المقدس میں) داخل ہوا اور دو رکعت نماز پڑھی، پھر میں نکلا تو جبرئیل میرے پاس ایک برتن میں شراب اور ایک برتن میں دودھ لے آئے۔ میں نے دودھ پسند کیا۔ جبرئیل نے کہا: ''فطری چیز کو پسند کیا ہے۔'' پھر ہم آسمان کی طرف چڑھ گئے......'' [2]

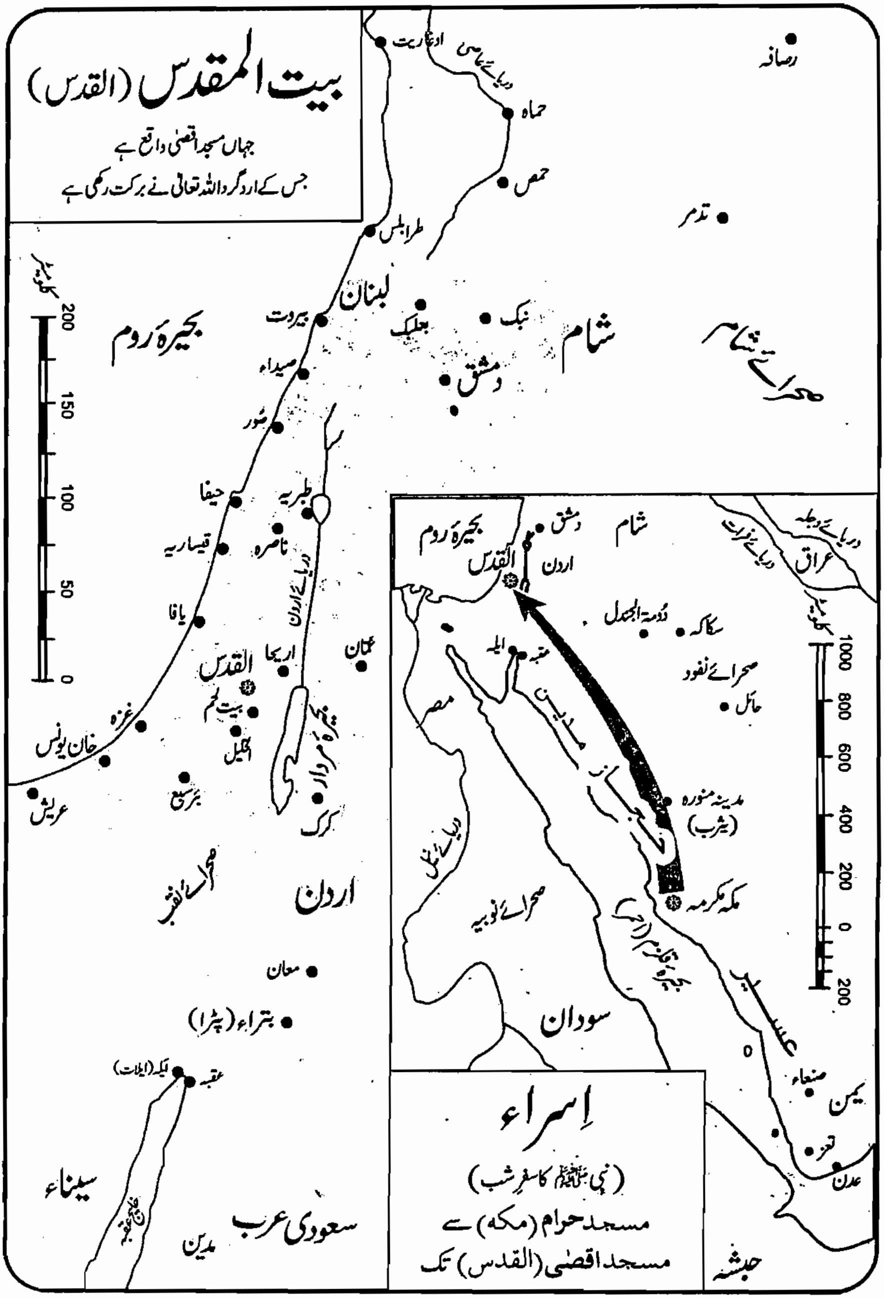
[1] صحيح البخاري، التفسير، باب قوله: ﴿أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِۦ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾، حديث: 4709، 4710، وسورة ﴿وَالنَّجْمِ﴾، حديث: 4856-4858، وصحيح مسلم، الإيمان، باب الإسراء برسول الله ﷺ إلى السموات......، أحاديث: 163، 164، وتهذيب تاريخ دمشق لابن عساكر: 386/1، 387. [2] صحيح البخاري، الأشربة، باب قول الله تعالىٰ: ﴿إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ﴾، حديث: 5576، وصحيح مسلم، الإيمان، باب الإسراء برسول الله ﷺ إلى السموات وفرض الصلوات، حديث: 162، ومسند أحمد: 149/3، و اللفظ له.

ایک اور روایت میں ہے کہ معراج میں (اوپر جانے سے پہلے) آپ نے انبیائے کرام کو نماز بھی پڑھائی۔ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے تمام انبیاء آپ کی تشریف آوری پر جمع کیے گئے۔ آپ ﷺ نے اس رات ان کی امامت کرائی۔ [1]

معراج

پھر رسول اللہ ﷺ کو آسمانوں پر لے جایا گیا۔ ہر آسمان میں حضرت جبریل علیہ السلام دروازہ کھولنے کو کہتے تو ان سے پوچھا جاتا: "آپ کے ساتھ کون ہے؟" وہ کہتے: "محمد ﷺ"۔ اس پر آپ کو مرحبا کہا جاتا۔ آپ نے پہلے آسمان پر حضرت آدم، دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰ و یحییٰ، تیسرے آسمان پر حضرت یوسف، چوتھے آسمان پر حضرت ادریس، پانچویں آسمان پر حضرت ہارون، چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ اور ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہم السلام کو دیکھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت المعمور کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے، پھر آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے آپ پر اور آپ کی امت پر ایک دن رات میں پچاس نمازیں فرض کیں۔ واپسی پر آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انھوں نے پوچھا: "اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت پر کیا کچھ فرض کیا ہے؟" آپ نے بتایا تو موسیٰ علیہ السلام نے مشورہ دیا کہ آپ واپس جائیں اور رب کریم سے تخفیف کی درخواست کریں۔ آپ نے یہ مشورہ قبول کیا اور اللہ کے حضور پہنچے۔ رب کریم نے پانچ نمازیں کم کر دیں، پھر آپ اسی طرح بار بار حضرت موسیٰ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان آتے جاتے رہے۔

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 388/2. دکتور قلعجی نے حاشیے میں لکھا: "اس امر کے متعلق روایات بکثرت وارد ہوئی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سفر معراج سے قبل انبیاء کو نماز پڑھائی تھی۔" ابن حجر رحمہ اللہ کا کہنا ہے: "یہی بات نمایاں ترین ہے۔" انھوں نے مزید کہا: "جمہور صحابہ نے بیت المقدس میں نماز کا اثبات کیا ہے۔" اس موضوع کی احادیث کے لیے دیکھیے: (الفتح الرّبّاني: 20/ 244-264)


بیت المقدس (القدس)
جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے
جس کے اردگرد اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے
بحیرۂ روم
لبنان
شام
صحرائے شام
طرابلس
حماہ
حمص
تدمر
رصافہ
بیروت
صیداء
صُور
بعلبک
نبک
دمشق
حیفا
طبریہ
ناصرہ
قیساریہ
یافا
القدس
اریحا
عمّان
بیت لحم
الخلیل
غزہ
خان یونس
عریش
بئر سبع
کرک
اردن
معان
بتراء (پٹرا)
عقبہ
سیناء
سعودی عرب
مدین
200
150
100
50
0
اسراء
(نبی ﷺ کا سفرِ شب)
مسجد حرام (مکہ) سے
مسجد اقصیٰ (القدس) تک
دمشق
شام
عراق
دریائے دجلہ
دریائے فرات
اردن
دومۃ الجندل
سکاکہ
صحرائے نفود
حائل
العلہ
عقبہ
مصر
مدینہ منورہ
(یثرب)
مکہ مکرمہ
صحرائے نوبیہ
دریائے نیل
سودان
یمن
صنعاء
تعز
عدن
حبشہ
1000
800
600
400
200
0
200

ہر موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام آپ کو واپس جانے اور مزید تخفیف کرانے کا مشورہ دیتے۔ یوں بار بار تخفیف کے بعد پانچ نمازیں رہ گئیں لیکن ان کا ثواب پچاس نمازوں ہی کے برابر ملے گا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ سے مزید تخفیف کے لیے واپس جانے کو کہا تو آپ نے فرمایا:

«قَدْ سَأَلْتُ رَبِّي حَتَّى اسْتَحْيَيْتُ»

''بار بار مطالبہ کرتے ہوئے مجھے اپنے رب کریم سے شرم آنے لگی ہے۔''

اسی اثنا میں اعلان گونجنے لگا: ''میں نے اپنا مقرر کردہ فرض نافذ کر دیا اور اپنے بندوں سے تخفیف کر دی۔''[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت جسے وہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں، اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمانوں کے تذکرے کے بعد فرمایا: ''پھر مجھے اوپر لے جایا گیا حتی کہ میں ایک سطح پر چڑھا۔ وہاں مجھے قلموں کی سرسراہٹ سنائی دیتی تھی۔'' پھر آپ نے نمازوں کی فرضیت کا ذکر کیا اور فرمایا: ''پھر مجھے آگے لے جایا گیا حتی کہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا دیا گیا۔ اس پر کچھ رنگ چھائے ہوئے تھے۔ میں نہیں جانتا وہ کیا کچھ تھا؟ پھر مجھے جنت میں لے جایا گیا۔ اس میں موتی کے بنے ہوئے قبہ نما گھر تھے۔ جنت کی مٹی کستوری تھی۔''[2]

[1] صحيح البخاري، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة صلوات الله عليهم، حديث: 3207، وصحيح مسلم، الإيمان، باب الإسراء برسول الله ﷺ إلى السموات......، حديث:163، والفتح الرّباني:20/248,247. یہ حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی ہے جو انھوں نے مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور اس کی سند صحیح ہے، دیکھیے: (سنن النسائي، الصلاة، باب فرض الصلاة......، حديث: 449) [2] صحيح البخاري، الصلاة، باب: كيف فرضت الصلاة في الإسراء، حديث: 349، وصحيح مسلم، الإيمان، باب الإسراء برسول الله ﷺ إلى السموات وفرض الصلوات، حديث: 163.

امام نووی نے صحیح مسلم کی شرح میں اس مسئلے پر گفتگو کی ہے کہ کیا معراج کے دوران میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا ہے؟ علماء کے اختلاف کا تذکرہ کرنے کے بعد انھوں نے ترجیح اس بات کو دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ ان کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ کہنا ہے: ''(حضرت) محمد ﷺ نے اپنے رب کو دو مرتبہ دل کے ذریعے سے دیکھا ہے'' حالانکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول سے تو ان لوگوں کی تائید ہوتی ہے جو اس امر کے قائل ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کیا۔ [1]

معراج سے واپسی

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ واپسی پر آپ آسمانوں سے بیت المقدس تشریف لائے، پھر وہاں سے مکہ مکرمہ آگئے۔ سنن ترمذی میں حضرت شدّاد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''......پھر حضرت جبرئیل مجھے واپس لائے۔ ہم فلاں مقام پر قریش کے ایک قافلے کے پاس سے گزرے جن کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا۔ یہ قافلہ فلاں کی سرکردگی میں تھا۔ میں نے انھیں سلام کیا۔ وہ کہنے لگے: ''یہ تو محمد (ﷺ) کی آواز ہے۔'' پھر صبح ہونے سے پہلے ہی میں اپنے ساتھیوں کے پاس مکہ مکرمہ پہنچ گیا۔'' [2]

[1] شرح النووي على صحيح مسلم: 3/4-15. اور دیکھیے: (تفسیر ابن کثیر: 7/422-430) جن محققین نے اس مسئلے پر گفتگو کی ہے ان میں علامہ شامی بھی شامل ہیں۔ انھوں نے اس کے بارے میں پیش کیے گئے مختلف دلائل کا جائزہ لیا ہے، دیکھیے: (سبل الهدیٰ والرشاد: 3/82-93) معلوم ہوتا ہے کہ شامی کا تعلق علماء کے اس گروہ سے ہے جنھوں نے اس امر کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے اور دلائل کے اختلاف کی وجہ سے نفی یا اثبات کی صراحت نہیں کی۔ [2] اس روایت کو ترمذی کے حوالے سے بیہقی نے نقل کیا ہے جو ترمذی کی اپنی سند سے ہے۔ یہ سند شداد بن اوس رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے۔ بیہقی کا کہنا ہے کہ یہ سند صحیح ہے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 2/355-357)

اسراء کا ذریعۂ سفر تو براق تھا۔ معراج کے سلسلے میں روایات میں لفظ عُرِّجَ استعمال ہوا ہے اور ذریعۂ سفر کی صراحت نہیں کی گئی۔ بعض روایات میں یہ الفاظ آئے ہیں: ''میرے لیے سیڑھی نصب کی گئی۔''

ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا: ''یہی سیڑھی تھی جس کے ذریعے سے آپ ﷺ آسمان پر پہنچے۔ بعض لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ آپ براق کے ذریعے سے آسمانوں پر چڑھے تھے۔ یہ درست نہیں۔''[1]

اسراء ومعراج پر قریش کا ردعمل

رسول اللہ ﷺ کو خدشہ تھا کہ قریش اس کے بارے میں میری تکذیب کریں گے، اس لیے اس صبح آپ کچھ فکر مند تھے۔ آپ ﷺ اسی حالت میں تھے کہ ابوجہل آپ کے پاس آبیٹھا اور ازراہ مذاق کہنے لگا: ''حضرت! کوئی تازہ خبر؟'' آپ نے اسے اسراء کا واقعہ بتلایا۔ اس نے اس ڈر سے فوراً تکذیب مناسب نہ سمجھی کہ مبادا محمد (ﷺ) لوگوں کے سامنے یہ بات چھپالے۔ وہ کہنے لگا: ''اچھا! اگر میں دوسرے لوگوں کو بھی یہاں بلا لوں تو کیا آپ انھیں بھی یہ واقعہ سنائیں گے؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں۔'' وہ بھاگا بھاگا لوگوں کے پاس گیا اور انھیں بلا لایا۔ جب سب آ گئے تو کہنے لگا: ''اب بیان کیجیے۔'' آپ نے پورا واقعہ بیان کر دیا۔ انھیں بڑا تعجب ہوا۔ جن لوگوں نے مسجد اقصیٰ کو دیکھا ہوا تھا وہ کہنے لگے: ''اچھا ہمیں مسجدِ اقصیٰ کا نقشہ بتائیے۔'' اللہ تعالیٰ نے مسجد اقصیٰ کو رسول ﷺ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ آپ ﷺ اسے دیکھ دیکھ کر اس کا نقشہ بتاتے رہے۔ قریش کہنے لگے: ''بھئی! اللہ کی قسم! نقشہ تو بالکل صحیح بیان کیا ہے۔''[2]

[1] البداية والنهاية: 122/3. [2] صحيح البخاري، التفسير، باب قوله: ﴿أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِۦ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾، حديث: 4710، وصحيح مسلم، الإيمان، باب ذكر المسيح ابن مريم والمسيح الدجال، حديث: 170، ودلائل النبوة للبيهقي: 364,363/2.

ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے یہ یقین ہی نہ کیا کہ آپ ﷺ رات کے مختصر حصے میں شام جا کر واپس بھی آ سکتے ہیں کیونکہ انھیں شام آنے جانے میں کم سے کم دو مہینے لگتے تھے، چنانچہ بودے ایمان کے ایک دو افراد مرتد بھی ہو گئے۔ [1]

لیکن جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ واقعہ بتایا گیا تو انھوں نے فوراً تصدیق کی اور کہا: ''اگر یہ سب کچھ محمد رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے تو بالکل سچ ہے۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اللہ کی قسم! آپ تو ہمیں پہلے بھی آگاہ فرماتے رہتے ہیں کہ میرے پاس دن اور رات کے مختلف اوقات میں آسمان سے وحی آتی ہے۔ وحی کا آنا تو اس واقعے سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔'' پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ سے تفصیلات پوچھنے لگے۔ جب بھی آپ کوئی بات بتاتے تو وہ کہتے: ''آپ صحیح فرماتے ہیں، میں گواہی دیتا ہوں آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں......'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر! تم صدیق ہو۔'' اس دن سے ان کا نام ہی صدیق پڑ گیا اور زبان زد عام ہو گیا۔ [2]

اسراء و معراج کے روح اور بدن کے ساتھ ہونے کے دلائل

قاضی عیاض رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اسراء و معراج کی نوعیت کے بارے میں علمائے کرام میں اختلاف ہے۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ یہ سارا واقعہ عالم

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 45/2. یہ ابن اسحاق کی معلق روایت ہے۔ بعض مسلمانوں کے مرتد ہو جانے کی خبر صحیح احادیث میں آئی ہے۔ ان میں سے ایک روایت امام احمد نے نقل کی ہے۔ اس سند کو علامہ احمد شاکر نے صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 374/1) دوسری روایت امام حاکم کی ہے اور اس نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اس پر ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 63,62/3) ان کے علاوہ دیگر محدثین نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ [2] المستدرك للحاكم: 63,62:3. حاکم کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے جبکہ بخاری و مسلم نے اسے درج نہیں کیا، ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے۔

خواب میں پیش آیا۔ لیکن حق اور صحیح وہ ہے جس کے اکثر سلف صالحین، فقہاء، محدثین اور متکلمین قائل ہیں کہ آپ ﷺ کو جسم اطہر سمیت لے جایا گیا تھا۔ روایات اسی پر دلالت کرتی ہیں۔ جو شخص بھی ان کا مطالعہ کرے گا اور تحقیق کرے گا وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا۔ ظاہر روایات کو بلا دلیل چھوڑا نہیں جا سکتا اور نہ ظاہر پر محمول کرنے میں کوئی بات مانع ہے کہ خواہ مخواہ تاویل کرتے پھریں۔ [1]

حافظ ابن حجر نے لکھا: ''اسراء اور معراج ایک ہی رات ہوئے، جاگتے میں ہوئے، جسم اور روح سمیت ہوئے اور بعثت کے بعد ہوئے۔ جمہور محدثین، فقہاء اور متکلمین نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ تمام صحیح احادیث کے ظاہر الفاظ اسی مسلک کی تائید کرتے ہیں۔ اسے چھوڑنے کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ اس میں کوئی چیز بھی عقلاً محال نہیں کہ تاویل کی ضرورت پڑے۔'' [2]

عرجون نے لکھا: ''سوائے ان چند روایات کے جو حسن بصری رحمہ اللہ کے واسطے سے حضرت عائشہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہیں اور ان کی سند بھی صحیح نہیں، پوری امت کا اجماع ہے کہ اسراء جسمانی طور پر عالم بیداری میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اسراء کی خبر دیتے ہوئے لفظ ''سبحان'' ارشاد فرمایا جو اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی طرف اشارہ ہے اور اللہ کی قدرت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ یہ لفظ انھی امور کے سلسلے میں استعمال ہوتا ہے جو انسانی طاقت سے باہر اور عقل سے بعید ہوں اور محال باور کیے جاتے ہوں اور لفظ ''عبد'' جو اس آیت میں آیا ہے عرب کے فہم و لغت میں جسم و روح کے مجموعے ہی پر دلالت کرتا ہے۔'' [3]

سورۂ نجم کی آیت: ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى﴾ بھی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ

---

[1] نسيم الرياض في شرح الشفاء للقاضي عياض لأحمد شهاب الدين الخفاجي: 2/265.
[2] فتح الباري: 15/44. [3] محمد رسول الله ﷺ لعرجون: 2/342-350.

یہ سفر جسم و روح دونوں کے ساتھ تھا۔ باقی رہی حسن بصری کی روایت تو وہ دور صحابہ میں معروف نہ تھی اور بعد کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ ''اسراء'' کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کی زوجیت میں نہیں آئی تھیں اور سن بلوغت کو بھی نہیں پہنچی تھیں......۔ [1]

پھر ان کی حدیث کو دوسری احادیث پر ترجیح کیسے دی جا سکتی ہے جبکہ وہ ان سے صحیح ثابت ہی نہیں؟

خفاجی کہتے ہیں: ''اس حدیث کا متن مخدوش ہے۔ اس کی سند میں محمد بن اسحاق ہیں جنھیں امام مالک رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے [2] جبکہ اس کے مقابل احادیث اس سے بہت قوی ہیں۔''

زرقانی کا کہنا ہے: ''......بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا صحیح سند سے منقول قول اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی ''اسراء'' جسد اطہر کے ساتھ تھا کیونکہ وہ اس امر کا انکار کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اگر ان کے نزدیک اسراء و معراج نیند کی حالت میں ہوتے تو آنکھوں سے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ [3] باقی رہی حضرت معاویہ کی روایت [4] تو اولاً اس روایت سے قبل اجماع ہو چکا تھا کہ اسراء و معراج روح و جسم سمیت ہوئے ہیں۔ ثانیاً یہ روایت صحیح سند سے ثابت نہیں کیونکہ یہ محمد بن اسحاق کی روایت ہے۔ اگر یہ بالفرض صحیح بھی ہو تب بھی یہ ان کا اجتہاد

[1] قاضی عیاض نے ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ گفتگو کی ہے، دیکھیے: (الشفاء: 372/1) [2] محمد بن اسحاق کی حدیث حسن لذاتہ کے درجے کی ہے جب وہ صراحت سے بتائیں کہ میں نے حدیث سنی ہے یا مجھ سے بیان کی گئی ہے، دوسرے یہ کہ حدیث کی سند متصل اور اس کے رجال ثقہ ہوں۔ زیر تبصرہ حدیث کی سند منقطع ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 46/2)

[3] شرح الزرقاني على المواهب اللدنية للقسطلاني: 5,4/6. [4] اسے ابن اسحاق نے یعقوب بن عتبہ پر موقوف سند سے روایت کیا ہے۔ یعقوب بن عتبہ اگرچہ ثقہ ہیں لیکن وہ کسی صحابی سے نہیں ملے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 46/2)

ہے جو اس کے خلاف اجماع ہونے کے بعد ظاہر ہوا ہے۔ ظاہر ہے یہ اجماع کو کالعدم نہیں کرسکتا اور اس سے کچھ ثابت نہیں ہوسکتا۔ حسن بصری کے بھی دو قول ہیں۔ ان کا مشہور قول یہی ہے کہ اسراء ومعراج حالت بیداری میں ہوئے......۔"

اگر یہ خواب کا واقعہ ہوتا تو قریش اس سے انکار نہ کرتے، نہ کوئی شخص مرتد ہوتا اور نہ یہ خلافِ عادت واقعہ سمجھا جاتا۔ قرآن کریم کا اسلوب بیان بھی اس کے خواب ہونے کی نفی کرتا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت کا پہلا لفظ "سبحان" کسی "عظیم الشان امر" پر دلالت کر رہا ہے، پھر لفظ "عبد" بھی روح وجسم کے مجموعے کو کہا جاتا ہے جیسے کہ عرجون وغیرہ نے اشارہ کیا ہے۔[1]

یہاں میں گزشتہ بیان کردہ روایات کے علاوہ وہ روایات پیش کرتا ہوں جنھیں اہل علم نے صحیح قرار دیا ہے۔

* حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب مجھے معراج پر لے جایا گیا تو میں ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرا جن کے ناخن پیتل کے تھے اور وہ چہروں اور سینوں کو چھیل رہے تھے۔ میں نے پوچھا: "جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟" انھوں نے کہا: "یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور (غیبت کرکے) ان کی عزت مجروح کرتے ہیں۔"[2]

[1] معين السيرة للشامي، ص: 112. امام بیہقی اسراء ومعراج کے بارے میں صحیح احادیث بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "واقعۂ معراج کے بارے میں ہماری ذکر کردہ احادیث کے علاوہ کچھ ضعیف روایات بھی ہیں لیکن صحیح احادیث کے بعد ان کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ میں ان شاء اللہ زیادہ صحیح روایات درج کروں گا۔" دیکھیے: (دلائل النبوة: 390,389/2) [2] سنن أبي داود، الأدب، باب في الغيبة، حديث: 4878، ومسند أحمد: 224/3. (تهذيب الخصائص کے محقق عبداللہ تلیدی کا کہنا ہے کہ اس روایت کی سند صحیح ہے، دیکھیے: (تهذيب الخصائص (تحقيق عبد الله التليدي)، ◄◄

* انھی سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا کہ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا: ’’جس رات مجھے اسراء کرایا گیا میں کچھ لوگوں کے پاس سے گزرا۔ ان کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے لیکن وہ ہونٹ جلد ہی ٹھیک ہو جاتے تھے (تو پھر کاٹے جاتے تھے)، میں نے پوچھا: ’’جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟‘‘ انھوں نے کہا: ’’یہ آپ (ﷺ) کی امت کے وہ خطیب ہیں جو کہتے کچھ ہیں، کرتے کچھ ہیں۔‘‘ [1]

* حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جس رات مجھے لے جایا گیا ہم ساتویں آسمان پر پہنچے تو میں نے اپنے اوپر دیکھا کہ بادل گرج رہے ہیں اور بجلیاں چمک اور کڑک رہی ہیں، پھر میں ایسے لوگوں کے پاس سے گزرا جن کے پیٹ گھڑوں کی طرح پھولے ہوئے تھے ان کے اندر سانپ تھے جو باہر سے نظر آ رہے تھے۔ میں نے پوچھا: ’’جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟‘‘ وہ کہنے لگے: ’’یہ سود کھانے والے ہیں۔‘‘ جب میں آسمان دنیا پر اترا اور نیچے دیکھا تو غبار ہی غبار اور دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا اور شور وغل برپا تھا۔ میں نے پوچھا: ’’جبرئیل! یہ کیا ہے؟‘‘ انھوں نے کہا: ’’یہ وہ شیاطین ہیں جو انسانوں کی آنکھوں پر منڈلاتے رہتے ہیں تاکہ وہ آسمانوں اور زمینوں کی حکمتوں پر غور وفکر نہ کرسکیں اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ (غور وفکر کے باعث) عجیب وغریب نظارے کرتے۔‘‘ [2]

» ص: 118، حدیث: 126) الموسوعة الحديثية کے محققین نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (الموسوعة الحديثية: 53/21، حديث: 13340) [1] مسند أحمد: 120/3 و 231 و 239. عبد بن حمید نے اسے حماد بن سلمہ عن علی بن زید بن جدعان کی سند سے روایت کیا ہے۔ عبداللہ تلیدی کی تحقیق کے مطابق اس کی سند حسن ہے، دیکھیے: (تهذيب الخصائص (تحقيق عبد الله التليدي)، ص: 119، حديث: 127) الموسوعة الحديثية کے محققین نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے۔ [2] مسند أحمد: 353/2 و 363، وسنن ابن ماجه، التجارات، باب الحيوان بالحيوان متفاضلًا يدًا بيدٍ، حديث: 2272. احمد اور ابن ماجہ دونوں کی روایات ابن جدعان کی سند سے ہیں جس کی حدیث «

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ آپ ﷺ نے (دورانِ معراج) اپنی آنکھوں سے دجال کو اس کی اصلی صورت میں دیکھا۔ یہ خواب کی بات نہیں ہے۔ اسی طرح عیسیٰ، موسیٰ اور ابراہیم علیہم السلام کو بھی (بچشم خود) دیکھا۔ جب آپ ﷺ سے دجال کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: ''میں نے اسے دیکھا، وہ عظیم الجثہ تھا۔ چاندنی جیسا سفید رنگ تھا۔ اس کی ایک آنکھ صحیح تھی اور روشن ستارے کی طرح چمک رہی تھی۔ اس کی پلکیں درخت کی ٹہنیوں جیسی تھیں۔ میں نے عیسیٰ کو دیکھا، وہ سفید رُو، گھنگھریالے بالوں والے، تیز نظر اور ہلکے پیٹ والے تھے۔ میں نے موسیٰ کو دیکھا، وہ سانولے گندمی رنگ کے، گھنے بالوں والے، مضبوط جسم والے تھے۔ میں نے ابراہیم کو دیکھا، میں ان کے جس عضو کو بھی دیکھتا تھا اپنے جیسا پاتا تھا۔ یوں سمجھو وہ بالکل میرے جیسے تھے۔ جبرئیل مجھ سے کہنے لگے: ''اپنے والد کو سلام کیجیے۔'' میں نے انھیں سلام کیا۔''[1]

* پہلے یہ روایت بیان کی جا چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سفر میں بیت المقدس بھی دیکھا تھا۔ جب قریش نے آپ سے بیت المقدس کی علامات بیان کرنے کو کہا تو آپ نے صحیح صحیح نشانیاں بتلا دیں۔[2]

* حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا:

» عبداللہ تلیدی محققِ تہذیب الخصائص کی تحقیق کے مطابق حسن ہے، دیکھیے: (تهذيب الخصائص (تحقيق عبد الله التليدي)، ص: 119، حديث: 128) الموسوعة الحديثية کے محققین نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے، دیکھیے: (الموسوعة الحديثية: 285/14و365. حديث: 8640 و8757) ان کے نزدیک یہ روایت ابن جدعان (علی بن زید) کے ضعیف ہونے اور ابوصلت کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ [1] مسند أحمد: 374/1. اس کی سند کو احمد شاکر نے صحیح قرار دیا ہے۔ دیگر محدثین نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ [2] مسند أحمد: 309/1. اس کی سند کو احمد شاکر نے صحیح قرار دیا ہے۔ مزید دیکھیے: (تهذيب الخصائص (تحقيق عبد الله التليدي)، ص: 121، حديث: 130)

''جس رات مجھے لے جایا گیا میں نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سے ملاقات کی۔ وہاں قیامت کے وقوع کی بحث ہو رہی تھی۔ انھوں نے معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر چھوڑ دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرمانے لگے: ''مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔'' پھر انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا، انھوں نے بھی فرمایا: ''میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی باری آئی تو وہ فرمانے لگے: ''قیامت کے وقوع کا معاملہ تو فی الواقع اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں، البتہ میرے رب کریم نے مجھے یہ بتلایا تھا کہ قیامت سے پہلے دجال ظاہر ہوگا۔''

پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال اور یاجوج ماجوج کا تفصیلی تذکرہ فرمایا۔[1]

* حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب مجھے اسراء کرایا گیا تو میرے قریب سے نہایت اچھی خوشبو کا گزر ہوا۔ میں نے پوچھا: ''یہ خوشبو کیسی ہے؟'' فرشتوں نے کہا: ''یہ فرعون کی بیٹی کی مشاطہ اور اس کے بچے ہیں۔ (اس کا واقعہ یہ ہے کہ کنگھی کرتے ہوئے) اس کے ہاتھ سے کنگھی گر گئی تو اس نے (بے ساختہ) کہا: ''بسم اللہ'' فرعون کی بیٹی نے کہا: ''میرا باپ نا؟''۔ مشاطہ بولی: ''میرا رب ہی تمھارا اور تمھارے والد کا رب ہے۔'' بنتِ فرعون نے پوچھا: ''کیا میرے والد کے علاوہ تمھارا کوئی اور رب ہے؟ وہ بولی: ''ہاں، میرا اور تمھارا ربّ اللہ ہے۔'' فرعون کو پتا چلا تو اس نے تانبے کی ایک دیگ میں تیل کھولانے کا حکم دیا، پھر اس نے حکم دیا کہ مشاطہ اور اس کے بچوں کو اس کھولتے ہوئے تیل میں پھینک دیا جائے۔ ان سب کو ایک ایک کر کے اس میں پھینک دیا گیا۔ ان کے ایک شیر خوار بچے کی باری آئی تو وہ بول اٹھا: ''امی جان!

[1] مسند أحمد: 375/1. اس کی سند کو احمد شاکر نے صحیح قرار دیا ہے۔ وسنن ابن ماجه، الفتن، باب فتنة الدجّال......، حدیث: 4081. سند صحیح ہے، دیکھیے: (تهذیب الخصائص (تحقیق عبد الله التلیدي)، ص: 122، حدیث: 131) تلیدی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔

کود پڑے، پیچھے نہ ہٹیں، بلاشبہ آپ حق پر ہیں......۔'' [1]

* حضرت شریک بن عبداللہ سے روایت ہے: ''پھر حضرت جبریل علیہ السلام آپ کو لے کر آسمانِ دنیا کی طرف چلے۔ انھوں نے آسمان کا ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ آسمان کے دربانوں نے بلند آواز سے پوچھا: ''کون؟'' انھوں نے کہا: ''جبریل۔'' انھوں نے پھر پوچھا: ''آپ کے ساتھ کون ہے؟'' انھوں نے کہا: ''میرے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔'' وہ پوچھنے لگے: ''کیا وہ مبعوث ہو چکے ہیں؟'' جبریل علیہ السلام نے کہا: ''ہاں۔'' وہ کہنے لگے: «أَهْلًا وَّسَهْلًا وَّمَرْحَبًا» آپ کی تشریف آوری مبارک!'' اس اطلاع پر اہلِ آسمان بہت خوش ہوئے۔ انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ زمین والوں کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں جب تک انھیں بتایا نہ جائے۔ آپ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام سے ملے۔ حضرت جبریل کہنے لگے: ''یہ آپ کے والد ہیں، انھیں سلام کہیے۔'' آپ نے سلام کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے جواب دیتے ہوئے فرمایا: ''بیٹے ! خوش آمدید! تم بہت اچھے بیٹے ہو۔'' پھر آپ نے آسمانِ دنیا پر دو نہریں بہتی دیکھیں۔ آپ نے پوچھا: ''جبریل! یہ دو نہریں کیسی ہیں؟'' انھوں نے فرمایا: ''یہ نیل و فرات کا منبع ہیں۔'' پھر وہ آپ کو لے کر آسمان میں چلے۔ وہاں ایک اور نہر دیکھی جس پر موتیوں اور زبرجد کے محل بنے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نہر کی گہرائی میں اپنا ہاتھ ڈالا۔ تہ میں مہکتی ہوئی کستوری تھی۔ آپ نے پوچھا: ''جبریل ! یہ کیا ہے؟'' وہ کہنے لگے: ''یہ نہر کوثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے چھپا کر رکھی ہے۔'' پھر وہ آپ کو دوسرے آسمان کی طرف لے چلے۔ وہاں کے فرشتوں نے بھی وہی کچھ پوچھا جو پہلے آسمان والوں نے پوچھا تھا......۔'' [2]

اس تفصیلی حدیث میں مختلف انبیاء سے ملاقات، نمازوں کی (فرضیت اور ان میں)

[1] مسند أحمد: 310,309/1. اس کی سند کو احمد شاکر نے صحیح قرار دیا ہے. [2] صحيح البخاري، التوحيد، باب ما جاء في قوله عزّوجلّ: ﴿وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا﴾، حديث: 7517.

تخفیف، سدرۃ المنتہیٰ اور تعریف باری تعالیٰ کا ذکر ہے۔

اسراء و معراج کے متعلق اہم نکات

* اسراء و معراج کی حدیث محدثین اور مؤرخین کے نزدیک متفقہ ہے۔ قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ سے قطعی طور پر ثابت ہے اور جمہور اہل اسلام کے نزدیک یہ آپ ﷺ کا عظیم معجزہ ہے۔ اس کا انکار دین اسلام کے ایک قطعی امر کا انکار ہے۔
* یہ معجزہ ان عظیم شدائد و مصائب کے بعد صادر ہوا جن سے رسول اللہ ﷺ کو گزرنا پڑا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے پختہ عزم کی تجدید کر دی جائے اور یہ واضح ہو جائے کہ آپ ﷺ کی قوم کی آپ سے بدسلوکی کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چھوڑ دیا ہے بلکہ یہ ماجرا تو ہر دور اور ہر علاقے میں اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ گزرتا رہا ہے۔ اس معجزے سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ مستقبل دین اسلام کا ہے۔ تبھی محمد رسول اللہ ﷺ سے دوسرے تمام انبیاء کی امامت کروائی گئی۔ یہ بھی وضاحت ہو گئی کہ جب اللہ کے بندوں پر زمین تنگ ہو جاتی ہے تو آسمان ان کے استقبال کے لیے اپنے دروازے کھول دیتا ہے اور اگر کسی وقت زمین والے بدسلوکی پر اتر جائیں تو آسمان والے فرشتے ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے دست بستہ صف آرا ہو جاتے ہیں۔
* بیت المقدس کا سفر اور آسمانی سیر کے لیے زمان و مکان کی یگانگت اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ اللہ رب العزت کے نزدیک بیت المقدس بے حد مقدس ہے۔ اس سے اس مضبوط تعلق پر بھی روشنی پڑتی ہے جو حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام اور حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ کی بعثت کے درمیان پایا جاتا ہے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کے مابین ایک ہی دین کا مضبوط رابطہ موجود ہے۔ [1] اس میں یہ عظیم نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ

[1] یہاں میرا اشارہ ایک صحیح حدیث کی طرف ہے: ''انبیاء علاتی بھائی ہیں جن کی مائیں مختلف ہیں ◄◄

مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مقدس سرزمین کو دشمنانِ اسلام کی دست برد سے محفوظ رکھیں۔

* مسجد حرام سے بھی براہ راست سدرۃ المنتہیٰ تک جایا جا سکتا تھا مگر ممکن ہے کہ اس سفر میں بیت المقدس سے ہو کر گزرنے میں یہ حکمت پوشیدہ ہو کہ جب یہودیوں نے وحی الٰہی کی عزت پامال کر دی اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے لاتعلق ہو گئے تو اُن پر اللہ تعالیٰ کی لعنت مسلط ہو گئی اور انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نبوت سے معزول کر دیا گیا، حالانکہ عرصۂ دراز تک نبوت ان کے ساتھ مخصوص رہ چکی تھی۔ اسی بنا پر جناب محمد ﷺ کو رسالت ملنا دراصل دنیا کی قیادت و سیادت کا ایک امت سے دوسری امت، ایک شہر سے دوسرے شہر اور حضرت اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) کی نسل سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل کی طرف منتقل ہو جانے کا اظہار و اعلان تھا۔ اس انتقال قیادت کا سبب وہ ایمان تھا جو عرصۂ دراز سے اس دوسرے مرکز میں جاگزین تھا۔ [1]

* جب آپ کے سامنے حضرت جبریل علیہ السلام نے دودھ اور شراب کے برتن پیش کیے تو آپ کا دودھ کو قبول کرنا اور شراب کو رد کر دینا اس حقیقت کا مستند ثبوت ہے کہ اسلام فطری دین ہے کیونکہ دودھ اپنی اصلیت پر قائم ہے جبکہ شراب انگور یا دوسرے شرابی مادوں میں کیمیائی تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے اور انسان کی فطرت کو تبدیل کر دیتی ہے اور عقل کی دشمن ہے۔

* اس مقدس سرزمین میں تمام سابقہ انبیاء کا اجتماع اور خاتم المرسلین ﷺ کا استقبال اس حقیقت کی دلیل ہے کہ سب نبوتیں ایک ہی سرچشمۂ ہدایت سے پھوٹی ہیں اور ایک

» اور ان کا دین ایک ہے۔" اسے بخاری و مسلم کے علاوہ دیگر محدثین نے بھی روایت کیا ہے، دیکھیے: (صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ......﴾، حديث: 3443،3442)

[1] فقه السيرة للغزالي، ص: 137، وقراءة جديدة للسيرة النبوية للدكتور قلعجي، ص: 107.

ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ ہی خاتم الانبیاء (آخری نبی) ہیں جن پر دین کی تکمیل ہوئی اور آپ ﷺ اپنے رب کریم کی بارگاہ میں سب سے اونچے مرتبے پر فائز ہوئے۔

* آسمانوں میں جا کر اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں کے دیدار کی فضیلت کافروں کی سازشوں کا مداوا تھی جس سے کافروں کے برے انجام کی صاف نشاندہی ہو رہی تھی اور اس سے نبیِ کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حوصلہ بڑھ گیا تا کہ وہ مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کرسکیں جو اسلام کے خلاف متحد ہو گئے تھے۔

* آپ ﷺ کی بعثت کے بارہ سال بعد اس معجزے کا وقوع پذیر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ کی شاہراہِ حیات میں معجزات اور خرقِ عادت واقعات صرف آپ کی تکریم و تعظیم اور اظہار فضیلت کے طور پر ہیں نہ کہ عقلی اور رائج طریق کار کے خاتمے کے لیے جبکہ بعض دوسرے انبیاء کے ساتھ یہ معاملہ بالکل برعکس تھا، مثلاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اکثر معجزات کا مقصد یہ تھا کہ مخالفین ان کی نبوت کی تصدیق پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن جب مشرکین مکہ نے نبیِ کریم ﷺ سے آسمان پر چڑھنے جیسے معجزات کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا:

﴿ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ۝ ﴾

"(نبیِ کریم!) کہہ دو: میرا رب پاک ہے۔ میں تو بس ایک بشر رسول ہوں۔" [1]

پھر جب آپ ﷺ (معراج میں) آسمانوں پر جا پہنچے تو آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ تمھارے چیلنج اور سابقہ مطالبوں کا جواب ہے۔

* معراج کی رات پانچ نمازوں کی فرضیت اس رکن عظیم کی اہمیت ظاہر کرتی ہے۔

[1] بني إسرآءيل 93:17.

حق یہ ہے کہ نماز مسلمانوں کے لیے معراج ہے۔ جب دنیوی مفادات اور نفسانی شہوات انسان کو پستی کی طرف دھکیلتے ہیں تو نماز انسانوں کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام کرکے بلندی کی انتہا پر پہنچا دیتی ہے۔ [1]

بیرونی قبائل کو دین اسلام کی دعوت

رسول اللہ ﷺ ہمیشہ ایسی پرسکون جگہ کی تلاش میں رہے جہاں امن وسکون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جا سکے۔ اسی لیے آپ نے اپنے صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ آپ خود بھی طائف تشریف لے گئے تھے اور وہاں کے قبائل کو دین اسلام کی دعوت دی تھی۔ آپ ﷺ کا یہ عمل اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے تھا۔

حافظ ابن حجر نے لکھا: ''امام حاکم نے مستدرک میں اور ابونعیم اور امام بیہقی نے اپنی اپنی دلائل النبوۃ میں حسن سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت بیان کی ہے۔ انھوں نے کہا: ''مجھ سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ دیگر قبائل عرب کو دعوت اسلام دیں تو آپ منٰی کی طرف چلے۔ میں اور حضرت ابوبکر بھی آپ کے ساتھ تھے۔ ہم ایک عرب قوم کی مجلس میں جا پہنچے......'' [2]

حج کے دن اور تجارتی منڈیاں قبائل عرب کے بڑے بڑے سرداروں سے ملاقات کے بہترین مواقع مہیا کر دیتی تھیں، نیز عوام الناس کو تبلیغ کرنے کا بھی یہ بہترین طریقہ تھا۔ آپ بڑے بڑے سرداروں سے مطالبہ کرتے تھے کہ میری حفاظت وحمایت کا ذمہ لو۔ ایسا نہیں تھا کہ آپ ان کو اپنی دعوت قبول کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ [3] ان مواقع پر آپ عموماً

---

[1] فقه السيرة للغزالي، ص: 137-143. [2] فتح الباري: 71/15، والمستدرك للحاكم: 612/2، 613، ودلائل النبوة لأبي نعيم: 282-288، ودلائل النبوة للبيهقي: 422/2-427. [3] مغازي رسول الله ﷺ لعروة بن الزبير، ص: 117. یہ ابن لہیعہ کی روایت ہے جو عروہ پر موقوف اور مرسل ہے۔ بیہقی نے اسے موسیٰ بن عقبہ عن زہری کی مرسل سند سے نقل کیا ہے۔ ان دونوں مرسل روایات »

اس طرح خطاب فرماتے تھے:

«هَلْ مِنْ رَّجُلٍ يَّحْمِلُنِي إِلٰى قَوْمِهٖ، فَإِنَّ قُرَيْشًا مَّنَعُونِي أَنْ أُبَلِّغَ كَلَامَ رَبِّي»

''کیا کوئی ایسا شخص ہے جو مجھے اپنی قوم کے علاقے میں لے جائے۔ قریش نے مجھے اپنے رب کریم کا پیغام لوگوں تک پہنچانے سے روک رکھا ہے۔''[1]

نیز آپ فرماتے:

«يَا بَنِي فُلَانٍ! إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ، يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَعْبُدُوهُ وَلَاتُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا، وَّأَنْ تَخْلَعُوا مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهٖ، وَأَنْ تُؤْمِنُوا بِي وَتُصَدِّقُونِي وَتَمْنَعُونِي حَتّٰى أُبَيِّنَ عَنِ اللّٰهِ مَا بَعَثَنِي بِهٖ»

''اے بنوفلاں! میں تمھاری طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اللہ تعالیٰ کے سوا تمام معبودوں سے لاتعلق ہو جاؤ۔ اور یہ کہ مجھ پر ایمان لاؤ، میری تصدیق کرو اور میری حفاظت کرو تاکہ میں تمھیں اللہ تعالیٰ کے وہ پیغامات پہنچا سکوں جو اس نے میری طرف بھیجے ہیں۔''[2]

» کی پشت پر ایک صحیح روایت ہے جو ان کی اصل ہے۔ اس کا ذکر آئندہ حاشیے میں ہے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي:2/414) [1] سنن أبي داود، السّنّة، باب في القرآن، حديث: 4734، وسنن ابن ماجه، المقدمة، حديث: 201، ومسند أحمد: 3/390، واللفظ له، والفتح الرّباني: 20/267. یہ جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ ذہبی نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا: ''یہ روایت بخاری کی شرط کے مطابق ہے۔'' دیکھیے: (تاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 1/282) [2] السيرة النبوية لابن هشام: 2/74. ابن اسحاق کی اس روایت کی سند میں حسین بن عبداللہ نامی ایک راوی ضعیف ہے، دیکھیے: (مسند أحمد: 3/492، 4/341) یہ سند ابن اسحاق کی سند سے مختلف ہے۔ ساعاتی نے لکھا: ''اس حدیث کی سند جید ہے۔'' دیکھیے: (الفتح الرّباني: 20/216,217 و265)

اس دوران آپ کا چچا ابو لہب، جس کا اصل نام عبدالعزّٰی بن عبدالمطلب تھا، آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے جاتا تھا۔ جب آپ اپنی بات کر کے فارغ ہوتے تو وہ کہتا: ''یہ شخص تمھیں دعوت دیتا ہے کہ تم اپنے آباء واجداد کا دین چھوڑ دو۔ لات وعزّٰی اور اپنے حلیفوں کو، جو بنی مالک بن اُقَیْش سے ہیں، چھوڑ کر اس کی لائی ہوئی بدعت (نیا دین) اور گمراہی قبول کرلو......۔'' [1]

وہ قبائل جن کے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے اور انھیں اسلام کا پیغام پیش کیا مگر انھوں نے اس پیشکش کو رد کر دیا اور اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا، مندرجہ ذیل ہیں: بنو کندہ، ان میں ان کا سردار مُلَیْح یا فُلَیْح موجود تھا۔ [2] قبیلہ کلب میں سے بنو عبداللہ [3] اور بنو حنیفہ، انھوں نے بڑا درشت اور قبیح جواب دیا۔ [4] قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ میں سے ایک آدمی جس کا نام بَیْحَرۃ بن فِرَاس تھا، اس نے کہا: ''اللہ کی قسم! اگر میں اس قریشی نوجوان کو لے جاؤں تو اس کے ذریعے سے سارے عرب کو کھا جاؤں۔'' اس نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''اچھا، آپ بتائیں اگر ہم آپ کے پیروکار بن جائیں اور اللہ تعالیٰ آپ کو مخالفین پر غالب کر دے تو کیا آپ کے بعد حکومت ہمیں ملے گی؟''

آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] یہ احمد اور ابن اسحاق کی روایت کے مضمون کا کچھ حصہ ہے۔ طارق محاربی کی ایک حسن روایت جو ابن اسحاق نے نقل کی، اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا چچا ابولہب آپ کے پیچھے پیچھے جاتا اور آپ کو پتھر مارتا جس سے آپ کے ٹخنے لہولہان ہو جاتے تھے، دیکھیے: (السیر والمغازي لابن إسحاق: 1/ 232)

[2] اسے ابن اسحاق نے زہری سے مرسل سند کے ساتھ روایت کیا ہے، دیکھیے: (السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 75/2، والسیر والمغازي لابن إسحاق، ص: 232) [3] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 75/2. ابن اسحاق نے اسے منقطع سند کے ساتھ روایت کیا ہے، دیکھیے: (السیر والمغازي لابن إسحاق، ص: 232) چنانچہ یہ روایت ضعیف ہے۔ [4] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 76,75/2. ابن اسحاق نے یہ نہیں بتایا کہ یہ روایت ان سے کس نے بیان کی۔

«اَلْأَمْرُ إِلَى اللّٰهِ يَضَعُهُ حَيْثُ يَشَاءُ»

"حکومت اللہ تعالیٰ کی ہے وہ جسے پسند فرمائے گا عطا کر دے گا۔"

وہ کہنے لگا: "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کی حفاظت کی خاطر عربوں سے اپنے سینے چھلنی کرائیں اور جب اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ عطا فرمائے تو حکومت دوسروں کو مل جائے۔ ہمیں ایسے دین کی ضرورت نہیں۔" اس طرح انھوں نے بھی دعوت اسلام سے انکار کر دیا۔ لیکن جب وہ حج سے واپس گئے اور اپنے ایک بزرگ سردار سے ملے جو بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور ان کے ساتھ حج کو نہیں جا سکتا تھا۔ یہ لوگ جب واپس جاتے تھے تو اس سردار کو وہ تمام باتیں بتاتے تھے جو حج کے دوران میں پیش آتی تھیں۔ اس دفعہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو اس نے ان سے حج کی کارگزاری پوچھی۔ وہ کہنے لگے: "ہمارے پاس ایک قریشی جوان آیا تھا۔ اس کا تعلق بنو عبدالمطلب سے تھا۔ وہ دعویٰ کرتا تھا کہ میں نبی ہوں۔ اس نے ہمیں دعوت دی کہ ہم اس کا ساتھ دیں، اس کی حفاظت کریں اور اسے اپنے علاقے میں لے آئیں لیکن ہم نے انکار کر دیا۔ بزرگ نے افسوس کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے اور کہنے لگا: "او بنو عامر! کیا اب اس کی تلافی ممکن ہے؟ کیا یہ موقع دوبارہ ہاتھ آ سکتا ہے؟! قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! کسی بھی اسماعیلی نے کبھی ایسی بات جھوٹ نہیں کہی۔ یہ دعویٰ یقیناً سچ ہے۔ تمھاری عقل کہاں گھاس چرنے چلی گئی تھی؟"[1]

محارب بن خصفہ، بنو فزارہ، غسان، بنو مرہ، بنو سلیم، بنو عبس، بنو نضر، بنو بکاء، بنو عذرہ، حضارمہ،[2] بنو ربیعہ، بنو شیبان جن کے سردار مفروق بن عمرو، ہانی بن قبیصہ اور مثنیٰ بن

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 76/2. ابن اسحاق نے اسے زہری سے مرسل سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ دیگر مؤرخین نے اسے ضعیف سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ابن ہشام کا کہنا ہے کہ اس بزرگ کا نام فراس بن عبداللہ بن سلمہ ہے۔ [2] الطبقات الكبرىٰ: 217,216/1. ان سب کا ذکر واقدی کی روایت میں ہے۔

حارثہ تھے۔ سب لوگوں نے طرح طرح کے حیلے بہانے تراشے اور کہا: ''ہم اپنی قوم سے مشورہ کریں گے۔ اس وقت تک آپ انتظار کریں۔'' مثنیٰ بن حارثہ نے کہا: ''ہم نے کسریٰ سے یہ معاہدہ کر رکھا ہے کہ نہ ہم خود بغاوت کریں گے نہ کسی باغی کو پناہ دیں گے۔ میرا خیال ہے کہ جس بات کی آپ دعوت دے رہے ہیں بادشاہ عموماً ایسی باتیں پسند نہیں کیا کرتے۔ پس اگر آپ پسند کریں کہ صرف عرب علاقے کی حد تک ہم آپ کی نصرت وحمایت کریں تو ہم تیار ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم نے برا جواب نہیں دیا کیونکہ تم نے سچی اور صاف بات کہہ دی ہے، تاہم اللہ تعالیٰ کے دین کا مددگار وہ شخص بن سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہو، یعنی اُسے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا کوئی خوف نہ ہو۔ ذرا بتاؤ، اگر تھوڑے ہی عرصے میں اللہ تعالیٰ تمھیں ان کی زمینوں، علاقوں اور مال و دولت کا وارث بنا دے اور ان کی عورتیں تمھاری لونڈیاں بنا دی جائیں تو کیا تم اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کرو گے؟'' نعمان بن شریک معاً بولے: ''اللہ کی قسم! ہاں'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیات تلاوت کیں:

﴿إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى ٱللَّهِ بِإِذْنِهِۦ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝﴾

''یقیناً ہم نے آپ کو گواہی دینے والا، خوشخبری سنانے والا، ڈرانے والا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ ان کے اخلاق سے بہت خوش ہوئے۔[2]

[1] الأحزاب 46,45:33. [2] ربیعہ سے رسول اللہ ﷺ کی ملاقات کا واقعہ محدث ابن حبان اور بیہقی نے بیان کیا ہے، دیکھیے: (السیرۃ لابن حبان: 93-101، ودلائل النبوۃ للبیہقي: 2/422-427) محقق کا کہنا ہے کہ اسے حاکم اور ابونعیم نے روایت کیا ہے، دیکھیے: (دلائل النبوۃ لأبي نعیم: 1/237-241) مؤرخ قسطلانی نے المواھب میں لکھا: ''اسے حاکم اور ابونعیم نے بسند حسن نقل کیا ہے۔'' ابن حجر نے حاکم، ابونعیم اور بیہقی کی روایت کو حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 7/220)

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ والوں کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کیا تو انھوں نے سب سے زیادہ مثبت ردعمل ظاہر کیا۔ جب آپ نے سوید بن صامت کو اسلام کا تعارف کرایا تو انھوں نے سرِعام قبولِ اسلام کا اظہار نہ کیا، البتہ اس سے لاتعلق بھی نہیں رہے اور انھوں نے جو قرآن مجید سنا اس کی بہت تحسین کی۔ جب واپس اپنے شہر آئے تو جنگ بعاث (36) میں مارے گئے۔ ان کی قوم کے لوگ کہا کرتے تھے کہ وہ حالتِ اسلام میں فوت ہوئے۔ [1]

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ بنوعبدالاشہل کا ایک وفد مکہ مکرمہ آیا۔ ان کی قیادت أبوالحَیسر انس بن رافع کر رہے تھے۔ وفد میں ایاس بن معاذ بھی تھے۔ وفد کا مقصد اپنی قوم بنوخزرج کے خلاف قریش سے معاہدہ کرنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو ان کی آمد کا پتہ چلا تو ان کے پاس تشریف لائے۔ ان سے ملاقات کی اور فرمایا: ”کیا میں تمھیں ایسی چیز بتاؤں جو اس چیز سے بہتر ہے جس کی خاطر تم آئے ہو؟“ وہ پوچھنے لگے: ”وہ کیا؟“ آپ نے فرمایا: ”میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ میں انھیں دعوت دوں کہ وہ ایک اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کتاب بھی نازل کی ہے۔“ [2]

پھر آپ ﷺ نے ان کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش کیں اور قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔ ایاس بن معاذ جو اس وقت بالکل نوجوان تھے، کہنے لگے: ”میری قوم کے لوگو! اللہ کی قسم! یہ پیغام اس معاہدے سے بہتر ہے جس کی خاطر تم آئے ہو۔“ أبوالحَیسر

(36) بعاث: یاقوت حموی نے لکھا: ”بُعاث مدینہ کے نواح میں واقع ایک جگہ کا نام ہے جہاں دورِ جاہلیت میں اوس وخزرج کے درمیان جنگیں لڑی گئی تھیں۔“ دیکھیے: (معجم البلدان: 451/1)

[1] ابن اسحاق نے سُوید بن صامت کا پورا واقعہ منقطع سند کے ساتھ روایت کیا ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن ھشام: 2/77-79) [2] السیرة النبویة لابن ھشام: 2/80،81. ابن ہشام نے اسے بسند حسن روایت کیا ہے۔ دیگر مؤرخین نے اسے ابن ہشام ہی کی سند سے روایت کیا ہے۔

نے انھیں ڈانٹا تو وہ چپ ہو گئے۔ بعد میں جب آخری وقت آیا اور ان پر عالم نزع طاری ہوا تو لوگوں نے سنا کہ وہ لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر، الحمد للہ، سبحان اللہ کے بول بول رہے ہیں۔ وہ یہی مقدس بول بولتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کسی کو شک نہ رہا کہ وہ اسلام کی حالت میں فوت ہوئے ہیں۔ حضرت ایاس کے دل میں اُسی مجلس میں اسلام سما گیا تھا جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی ایمان افروز باتیں سنی تھیں۔

11 نبوی میں رسول اللہ ﷺ نے جمرۂ عقبہ کے پاس بنوخزرج کے چند لوگوں[1] کے سامنے اسلام پیش کیا۔ وہ آپ کے پاس بیٹھ گئے۔ آپ نے ان پر اسلام کی تعلیمات واضح کیں اور قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔

ان کے دل قبول اسلام کے لیے اس سبب سے آمادہ ہو گئے کہ وہ اپنے علاقے میں یہودیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ یہودی اہل کتاب اور اہل علم تھے۔ اس لیے جب ان سے یہودیوں کی لڑائی ہوتی تو یہودی کہتے: ''فکر نہ کرو، آخری نبی (ﷺ) کی بعثت کا زمانہ آچکا ہے۔ ہم ان کے ساتھ مل کر تمھیں اس طرح نیست و نابود کر دیں گے جس طرح عاد و ارم نیست و نابود کر دیے گئے تھے۔''

جب اللہ کے رسول ﷺ نے انھیں اسلام کی دعوت دی تو وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور کہنے لگے: ''جانتے ہو یہ وہی ہے جس کی پیش گوئیاں یہودی تمھارے سامنے کرتے رہتے ہیں۔ کہیں وہ تم سے پہلے ہی ان کے ساتھی نہ بن جائیں۔'' پس انھوں نے آپ ﷺ کی دعوت قبول کر لی اور کہنے لگے: ''ہماری قوم کی یہ حالت ہے کہ ان سے

[1] مؤرخ ابن اسحاق کے نزدیک ان کی تعداد چھ تھی۔ ابن ہشام اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا: ''موسیٰ بن عقبہ نے روایت بیان کی ہے کہ زہری اور عروہ کہتے ہیں: وہ آٹھ تھے۔'' دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 82/2، والبداية والنهاية: 164/3) ابن سعد نے دونوں قول درج کیے ہیں۔ واقدی کہتے ہیں: ''چھ والی روایت زیادہ ثقہ ہے اور اسی پر اتفاق ہے۔'' دیکھیے: (الطبقات الكبرىٰ: 219/1)

بڑھ کر کسی قوم میں اتنی دشمنی اور جنگ و جدل نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ آپ کی برکت سے ان میں اتفاق پیدا فرما دے۔ ہم ان کے پاس جائیں گے اور انھیں آپ ﷺ کے دین کی دعوت دیں گے اور جو کچھ ہم نے قبول کیا ہے اس کی دعوت بھی دیں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے سے اُنھیں متفق و متحد فرما دیا تو کوئی شخص آپ سے بڑھ کر معزز نہیں ہوگا۔''

پھر وہ واپس چلے گئے اور آئندہ سال ایام حج ہی میں آپ سے ملاقات کا وعدہ کر گئے۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو انھوں نے اپنی قوم کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا ذکرِ جمیل کیا اور انھیں اسلام کی دعوت دی۔ اس طرح اسلام پھیلنا شروع ہو گیا اور انصار کے ہر گھر میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر خیر ہونے لگا۔[1]

اس کے علاوہ ایک اور سبب بھی تھا جس نے مدینہ والوں کے لیے قبول اسلام کا راستہ ہموار کیا۔ وہ سبب جنگ بُعاث تھا۔[2] صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے،

[1] اسے ابن اسحاق نے عاصم بن عمر کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ عاصم بن عمر نے اسے اپنی قوم کے بعض معمر افراد سے روایت کیا۔ ابن اسحاق نے واضح کیا ہے کہ انھوں نے یہ روایت مجھ سے بیان کی تھی، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 2/81-83) دکتور عودہ نے اس روایت کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس امر کو ترجیح دی ہے کہ جن معمر افراد سے عاصم نے روایت کی وہ صحابۂ کرام ہیں جن میں جابر، محمود بن لبید اور عاصم کی دادی رُمَیثہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں، دیکھیے: (السيرة النبوية للدكتور عودة، ص: 331) ہم دکتور عودہ کی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں۔ [2] حافظ ابن حجر نے لکھا: ''بعاث ایک جگہ کا نام ہے، بعض نے قلعے کا نام بتایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مدینہ سے دو میل کے فاصلے پر بنو قریظہ کے قریب ایک زرعی زمین تھی۔ یہاں اوس و خزرج کے درمیان زبردست جنگ ہوئی تھی جس میں فریقین کے کثیر افراد مارے گئے تھے۔ یہ ہجرت سے پانچ سال قبل کا واقعہ ہے۔ بعض نے کم و بیش بھی بتایا ہے۔ اس جنگ میں تمام متکبر سردار مارے گئے جو کسی کے ماتحت نہیں رہ سکتے تھے اور ان سے قبول اسلام کی امید بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس قسم کے لوگوں میں سے ایک سردار عبداللہ بن اُبی بچ گیا تھا۔'' دیکھیے: (فتح الباري: 14/262، حديث: 3777)

انھوں نے کہا: ”اللہ تعالیٰ کی حکمت سے جنگ بعاث کا وقوع رسول اللہ ﷺ کی کامیابی کا ذریعہ بن گیا۔ آپ مدینہ تشریف لائے تو مدینہ والوں کی جمعیت منتشر تھی۔ ان کے بڑے بڑے سردار اس جنگ میں قتل ہو چکے تھے۔ باقی لوگ زخموں سے چور تھے۔ اس طرح یہ جنگ اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ان کے لیے مشرف بہ اسلام ہونے کا سبب بن گئی۔“[1]

داعیانِ حق کے لیے رہنما سبق

* کفر اور تحریف شدہ عقائد والے معاشرے ابولہب جیسے لوگوں سے خالی نہیں ہوتے۔ ابولہب جیسی سوچ اور طرز عمل والے نمونے عام ہوتے ہیں جو ہر دور اور ہر زمانے میں داعیان حق کے راستے کا پتھر بنتے ہیں۔ وہ ہر ممکن وسائل کے ساتھ لوگوں کو راہِ حق سے روکتے اور راہ حق کو ٹیڑھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، داعیانِ دینِ حق کو بدعت و گمراہی کا داعی کہتے ہیں اور ان کو نئے دین یا پانچویں دین کا حامل ہونے کے طعنے دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنے چچا ابولہب کے طرزِ عمل سے قطعاً متاثر نہیں ہوئے اور پوری سرگرمی سے دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہے۔ اس صورتحال میں داعیان حق کے لیے یہ سبق پوشیدہ ہے کہ وہ کسی بھی حال میں مخالفین کی کارروائیوں اور ان کے نقطۂ نظر سے متاثر نہ ہوں۔
* داعیان حق کے لیے ضروری ہے کہ وہ روئے زمین پر دین کو نافذ کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ بروئے کار لائیں اور کبھی مایوس نہ ہوں۔ انفرادی یا جماعتی مخالفانہ کارروائیاں چاہے کتنی ہی شدید اور مسلسل ہوں یا وقتی نتائج کتنے ہی منفی اور حوصلہ شکن ہوں، انھیں دعوت الی اللہ کا کام بہر حال پوری ہمت اور قوت سے جاری رکھنا چاہیے۔

[1] صحيح البخاري، كتاب وباب مناقب الأنصار، حديث: 3777.

بیعتِ عقبہ

بیعت عقبہ اولیٰ

اگلے سال 12 نبوی کے موسم حج میں مدینہ کے مسلمانوں میں سے بارہ آدمی حج کے لیے مکہ آئے۔ ان میں سے بعض تو وہی تھے جو پچھلے سال بھی آئے تھے اور رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کر کے نور ایمان سے منور ہو چکے تھے۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے چند صحابہ کی موجودگی میں ملے اور آپ کی بیعت کی سعادت حاصل کی۔ صحیحین اور دوسری کتب حدیث میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی زبانی اہل بیعت کی تفصیل موجود ہے۔ حضرت عبادہ بھی مدینہ منورہ کے ان حجاج میں شامل تھے۔ ان کا بیان ہے: رسول اللہ ﷺ نے اہلِ مدینہ سے فرمایا: ''آؤ! مجھ سے عہد کرو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہیں کرو گے، زنا کا ارتکاب نہیں کرو گے، اپنے بچوں کو قتل نہیں کرو گے، اپنی طرف سے باتیں بنا کر کسی پر بہتان طرازی نہیں کرو گے اور کسی نیک کام میں میری نافرمانی نہیں کرو گے۔ تم میں سے جو شخص یہ عہد پورا کرے گا اُسے اس کا اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں ملے گا اور جس نے ان میں سے کوئی کام کیا، پھر اسے اس دنیا میں اس کی سزا مل گئی تو یہ اس کے لیے کفارہ بن جائے گی اور جس نے ان میں سے کسی کام کا ارتکاب کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا پردہ قائم رکھا تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ چاہے وہ سزا دے، چاہے معاف کر دے۔''

اہلِ مدینہ نے اس عہد پر آپ ﷺ سے بیعت کی۔ [1]

ابنِ اسحاق کی روایت میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں: ''ہم نے رسول اللہ ﷺ سے ان باتوں پر بیعت کی جن کا تذکرہ عورتوں کی بیعت میں آتا ہے۔

[1] السیرۃ النبویۃ لابن هشام: 86/2. اس روایت کی سند حسن ہے۔

اس وقت ابھی جنگ فرض نہیں ہوئی تھی۔‘‘ [1]

جب انھوں نے واپس مدینہ جانے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے تعلیم قرآن اور دعوت اسلام کے لیے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ انھیں اسلام کی تعلیمات سکھاتے تھے، اس لیے انھیں ’’مقرئ المدینة‘‘ (مدینہ کے استاذ) کہا جاتا تھا۔ ان کی رہائش حضرتِ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے ہاں تھی۔ [2]

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب وفود الأنصار إلى النبي ﷺ بمكة وبيعة العقبة، حديث: 3892، وصحيح مسلم، الحدود، باب الحدود كفّاراتٌ لأهلها، حديث: 1709. [2] یہ ابن اسحاق کی بغیر سند سے روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 86/2) بیہقی اور ذہبی نے امام مغازی موسیٰ بن عقبہ کے واسطے سے امام زہری کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان چھ آدمیوں کے بعد بھیجا تھا جو عقبہ (گھاٹی) کے پاس آپ ﷺ سے ملے تھے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 431/2، وتاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي: 294/1) بیہقی نے ابن اسحاق کی ایک اور مرسل روایت نقل کی ہے جو ابن اسحاق نے عاصم بن عمرو سے روایت کی ہے۔ اس میں یہ صراحت سے لکھا ہے کہ انھوں نے مدینہ جا کر آپ ﷺ کو لکھا کہ کسی شخص کو تبلیغ دین کے لیے بھیج دیجیے۔ آپ ﷺ نے حضرت مصعب کو بھیج دیا۔ عبداللہ بن ابی بکر اور عبداللہ بن مغیرہ بن معیقیب کی ابن اسحاق کی سند سے ایک اور روایت میں یوں ہے: ’’رسول اللہ ﷺ نے حضرت مصعب کو ان بارہ آدمیوں کے ساتھ بھیجا تھا جنھوں نے بیعت عقبہ اُولیٰ کی تھی۔‘‘ دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 438/2) ابن سعد نے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مصعب کو تب بھیجا جب اہل مدینہ نے مدینہ پہنچنے کے بعد آپ ﷺ کو لکھا کہ ان کی طرف ایسا آدمی بھیجا جائے جو انھیں قرآن پڑھائے۔ اس روایت کی سند میں واقدی ہے، دیکھیے: (الطبقات الكبرىٰ: 220/1) اسی طرح ابن اسحاق کی دو روایات ہیں جو بتاتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مصعب کو اہلِ مدینہ کی واپسی پر انصار کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ تیسری روایت کہتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مصعب کو اہلِ مدینہ کے لوٹ جانے اور استاذِ قرآن کا مطالبہ کرنے کے بعد بھیجا۔ یہ روایت ابن سعد کی روایت سے متفق ہے۔ تطبیق یوں ممکن ہے کہ پہلے چھ اشخاص نے مدینہ جا کر آپ ﷺ کو مبلغ بھیجنے کا پیغام بھیجا۔ اتنے میں دوسرے سال کا حج آ گیا تو آپ نے بیعت کرنے والے بارہ حضرات کے ساتھ حضرت مصعب کو بھی روانہ کر دیا۔ اس کی سند حسن اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

امام ابو داود اور مؤرخ ابن اسحاق نے عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک کی روایت بیان کی ہے کہ سب سے پہلے مدینہ منورہ میں نماز جمعہ رائج کرنے والے حضرت اسعد بن زرارہ تھے۔ اس وقت تک کل مسلمان چالیس کی تعداد میں تھے اور ان کی امامت مصعب بن عمیر کراتے تھے۔[1] انھیں رسول اللہ ﷺ نے جمعہ قائم کرنے کا تحریری حکم بھیجا۔[2]

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے تعاون کی بدولت حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بہت سے انصاری مسلمان ہوئے۔ مدینہ منورہ کے سرداروں میں سے اسید بن حضیر اور سعد بن معاذ مسلمان ہوئے تو ان کے اسلام لانے کے نتیجے میں بنو عبدالاشہل کے تمام مرد اور خواتین مسلمان ہو گئے۔[3] البتہ اُصَیرِم عمرو بن ثابت بن وَقش عین غزوۂ اُحد کے دن مسلمان ہوئے، پھر جنگ میں شریک ہوئے اور اللہ کے راستے میں شہید ہو گئے۔ انھوں نے ابھی تک اللہ کے لیے ایک بھی سجدہ نہیں کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو (ان کی شہادت کی) خبر دی گئی تو فرمایا:

«عَمِلَ قَلِيلًا وَّ أُجِرَ كَثِيرًا» ''کام تھوڑا کیا، ثواب زیادہ لے گیا۔''[4]

[1] سنن أبي داود، الصّلاة، باب الجمعة ......، حديث: 1069، والسيرة النبوية لابن هشام: 87/2. [2] حافظ ابن حجر نے یہ روایت محدّث دارقطنی کی کتابِ سنن کے حوالے سے نقل کی ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 75/15) ابن کثیر نے لکھا: ''اس روایت کی سند میں غرابت ہے۔ واللہ اعلم۔'' دیکھیے: (البداية والنهاية: 166/3) [3] اسید، معاذ اور بنی عبدالاشہل کے اسلام لانے کا واقعہ ابن اسحاق نے بسند حسن روایت کیا ہے۔ لیکن یہ سند عبداللہ بن ابی بکر اور عبید اللہ بن مغیرہ بن معیقیب پر موقوف ہونے کی وجہ سے مرسل ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 2/88-90) [4] اُصَیرِم کے احد کے دن اسلام لانے کا واقعہ ابن اسحاق نے السیر والمغازي میں صحیح سند سے روایت کیا ہے۔ ابن اسحاق نے صراحت سے اُصَیرِم کا نام لکھا ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 286/11) امام بخاری نے بھی احد کے دن کا یہ واقعہ روایت کیا ہے لیکن انھوں نے اُصَیرِم کا نام نہیں لکھا، دیکھیے: (صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب عمل صالح قبل القتال، حديث: 2808، وصحيح مسلم، الإمارة، باب ثبوت الجنة للشهيد، حديث: 1900)

غرض انصار کے گھرانوں میں سے کوئی گھرانہ ایسا نہیں رہا تھا جس کی عورتیں اور مرد مسلمان نہ ہو چکے ہوں۔ سوائے بنو امیہ بن زید، بنو خطم، بنو وائل اور بنو واقف کے جو ''اوس اللہ'' اوس بن حارثہ کی نسل سے تھے۔ ان کے اسلام نہ لانے کی وجہ یہ تھی کہ ان میں ایک شاعر ابو قیس بن الاسلت تھا، یہ لوگ اس کی بات مانتے تھے۔ اس نے انھیں اسلام لانے سے روکے رکھا حتی کہ غزوۂ خندق کے سال 5 ہجری میں یہ لوگ مسلمان ہوئے۔ [1]

اگلے سال 13 نبوی کے موسم حج سے پہلے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مکہ واپس آئے تاکہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کریں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اپنی مہم میں نصیب ہونے والی کامیابی کی خوشخبری سنائیں۔ [2]

بیعت عقبہ ثانیہ

آئندہ سال 13 نبوی کے ایام حج میں مدینہ منورہ کے مسلمانوں کی بڑی تعداد حج کرنے مکہ مکرمہ آئی۔ ان کے ساتھ ساتھ مدینہ کے مشرکین بھی بڑی تعداد میں تھے۔ ان سب کے قائد حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ تھے۔ [3]

انصار کے مسلمانوں نے باہمی پروگرام بنایا کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے ساتھ مدینہ منورہ لے جائیں۔ وہ کہتے تھے کہ آخر رسالت مآب ﷺ مکہ کے پہاڑوں میں کب تک پریشان پھرتے اور خوف کھاتے رہیں گے؟ [4] چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ انصار کے خفیہ مذاکرات ہوئے اور ملاقات کے لیے وقت اور جگہ کا تعین کیا گیا جس کے نتیجے میں

---

[1] ابن اسحاق نے اسے مرسل سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 91/2)
[2] ابن اسحاق نے واپسی کی روایت بلاسند بیان کی ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 92/2)
[3] یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند حسن ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 92/2)
[4] الفتح الرّباني: 270/20. اس روایت کی سند صحیح ہے۔

تاریخِ اسلام کا ایک انتہائی اہم اور عظیم الشان انقلابی فیصلہ کیا گیا۔

ابن اسحاق نے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی زبانی اس ملاقات کی تفصیل بیان کی ہے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں: ''ہم حج کے لیے نکلے۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عام ملاقات کے لیے ایام تشریق کا درمیانہ دن مقرر کر لیا اور طے پایا کہ عقبہ (گھاٹی) کے پاس ملاقات ہوگی۔ ہم حج سے فارغ ہو گئے اور وہ رات آگئی جو ملاقات کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ اس رات ہم اپنی قوم کے دوسرے لوگوں کے ساتھ گھل مل کر سو گئے۔ ایک تہائی رات گزر گئی تو ہم بھٹ تیتر کی طرح دبے پاؤں اُٹھے اور کسی آہٹ کے بغیر رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے لیے کھسکنے لگے۔ ہم تہتر آدمی جمرہ اولیٰ کی قریبی گھاٹی میں جمع ہو گئے۔ ہمارے ساتھ ہمارے قبیلے کی دو عورتیں بھی تھیں: ام عمارہ نسیبہ بنت کعب اور ام منیع اسماء بنت عمرو بن عدی۔ ہم گھاٹی میں جمع تھے اور رسول اللہ ﷺ کا انتظار کر رہے تھے۔ بالآخر آپ ﷺ تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ کے ساتھ آپ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب بھی تھے۔ وہ ان دنوں اپنی قوم ہی کے دین پر تھے، تاہم وہ چاہتے تھے کہ اس اہم موقع پر وہ اپنے بھتیجے کے ساتھ رہیں تاکہ جو کچھ طے ہو، ان کی موجودگی میں ہو اور وہ آپ ﷺ کی حفاظت کے لیے مدینہ والوں سے پختہ عہد لے سکیں۔ انھوں نے سلسلۂ کلام کی ابتدا کی۔ کہنے لگے:

''خزرجی بھائیو! (عرب لوگ اس وقت انصارِ مدینہ کو اسی نام سے پکارتے تھے، خواہ وہ خزرجی تھے یا اوسی) تم ہم میں محمد (ﷺ) کا مقام ومرتبہ اچھی طرح جانتے ہو۔ ہم نے اب تک انھیں ان کے مخالفین سے محفوظ رکھا ہے۔ وہ اپنی قوم اور شہر میں رہتے ہوئے باعزت اور محفوظ ہیں۔ لیکن اب یہ اصرار کر رہے ہیں کہ تمھارے ساتھ تمھارے شہر جائیں گے۔ خوب اچھی طرح سوچ لو۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ ان سے کیا ہوا عہد پورا کر سکتے ہو اور انھیں ان کے مخالفین سے محفوظ رکھ سکتے ہو تو بخوشی یہ ذمہ داری اٹھاؤ ورنہ انھیں یہیں

رہنے دو۔ یہ اپنی قوم اور شہر میں عزت اور حفاظت سے رہ رہے ہیں۔'' ہم نے جواب میں کہا: ''ہم نے یہ ساری باتیں سن لی ہیں اور سب کچھ اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے۔ اے اللہ کے رسول! اب آپ ارشاد فرمائیں اور اپنی ذات اور رب تعالیٰ کے سلسلے میں جو چاہیں ہم سے عہد لے لیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے خطاب شروع کیا۔ کچھ قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی دعوت پہنچائی اور اسلام کے فضائل بیان فرمائے، پھر فرمایا:

«أُبَایِعُکُمْ عَلٰی أَنْ تَمْنَعُونِي مِمَّا تَمْنَعُونَ مِنْهُ نِسَاءَ کُمْ وَأَبْنَاءَ کُمْ»

''میں تم سے بیعت لیتا ہوں کہ تم جس طرح اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہو اسی طرح میری حفاظت بھی کرو گے۔''

حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے آپ کا دست مبارک تھام لیا اور عرض کی: ''قسم اس ذات کی جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر مبعوث کیا ہے! ہم آپ کی اس طرح حفاظت کریں گے جس طرح خود اپنی عزت کی حفاظت کرتے ہیں۔ اللہ کے رسول! ہم سے بیعت لے لیجیے۔ اللہ کی قسم! ہم نے جنگوں کا دودھ پی رکھا ہے اور ہم اسلحہ کی کاٹ کے ماہر شناور ہیں۔ نسل در نسل ہمارا یہی شیوہ رہا ہے۔'' ابھی حضرت براء یہ بات کر ہی رہے تھے کہ ابوالہیثم بن تیہان رضی اللہ عنہ بول اٹھے: ''اللہ کے رسول! ہم نے کچھ لوگوں (یہودیوں) سے معاہدے کر رکھے ہیں۔ ہم انھیں ختم کر رہے ہیں ایسا نہ ہو کہ ہم سب سے منقطع ہو جائیں۔ اُدھر اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ نصیب کر دے تو آپ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم کے پاس واپس آجائیں۔'' رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور فرمایا: ''میرا خون تمھارا خون، میری حرمت و عزت تمھاری حرمت و عزت ہے، جس سے تمھاری جنگ ہے اس سے میری بھی جنگ ہے، جس سے تمھاری صلح ہے اس سے میری بھی صلح ہے۔''[1]

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: 2/94-97. سند حسن ہے۔

ان شرائط پر اتفاق ہو گیا۔ بیعت ہونے کو تھی کہ دو انصاری نوجوان جو 11 اور 12 نبوی کے موسم حج میں مسلمان ہو چکے تھے، اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک عباس بن عبادہ بن نضلہ تھے اور دوسرے اسعد بن زرارہ۔ ان کا مقصد تھا کہ وہ اپنی قوم کے سامنے صورتحال کی حقیقی تصویر پیش کریں اور اس بیعت کے مابعد خطرات واضح کر دیں تاکہ وہ پوری بصیرت اور ایمانی فراست کے ساتھ بیعت کریں اور یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ انصار جہاد و شہادت کے میدان میں کس حد تک جانے کو تیار ہیں۔

حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہ کہنے لگے: ''جانتے ہو کہ اس آدمی سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟'' انصار کہنے لگے: ''ہاں۔'' عباس نے کہا: ''ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں ہر سرخ و سیاہ سے لڑنا پڑے گا۔ جنگیں ہوں گی، آفتیں آئیں گی، تمھارے مال و دولت کا صفایا ہو جائے گا اور تمھارے معزز سردار قتل ہو جائیں گے۔ ان ممکنہ نتائج پر ابھی غور کر لو۔ اگر ایسی آزمائشوں میں تم رسول اللہ ﷺ کو تنہا چھوڑ دو گے تو بہتر ہے کہ ابھی پیچھے ہٹ جاؤ۔ اللہ کی قسم! اگر تم نے ایسا کیا تو یہ دنیا اور آخرت میں تمھارے لیے زبردست رسوائی ہو گی۔ ہاں اگر تمھارا آہنی عزم ہے کہ اپنے اموال کی تباہی اور معزز سرداروں کے قتل کے باوجود تم رسول اللہ ﷺ کے وفادار رہو گے تو اللہ کی قسم! یہ دنیا اور آخرت کی سب سے بڑی متاع ہے۔ اسے قبول کرنے میں دیر نہ کرو۔''

انصار بیک زبان بولے: ''ہم تمام مالی مصائب اور معززین کی شہادت کی صورت میں بھی عہد وفا کی بیعت کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اے اللہ کے رسول! ہم آپ سے سوال کرتے ہیں کہ اگر ہم ایسی پکی وفاداری کا ثبوت مہیا کر دیں تو ہمیں کیا ملے گا؟'' فرمایا: «اَلْجَنَّةُ» ''تمھیں جنت ملے گی۔'' انصار نے خوش ہو کر کہا: ''ہاتھ بڑھائیے۔'' آپ نے دست مبارک بڑھایا تو سب لوگ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔[1]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 100/2. یہ ابن اسحاق کی مرسل روایت ہے اور عاصم بن عمر پر موقوف ہے۔

جب لوگ بیعت کے لیے لپکے تو حضرت اسعد بن زرارہ نے پکار کر کہا: ''او یثرب والو! ذرا ٹھہرو۔ ہم اس قدر دور دراز سفر کی صعوبتیں جھیل کر اور اپنے اونٹوں کو ہلکان کر کے صرف اس لیے یہاں آئے ہیں کہ ہمیں سو فیصد یقین ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، پھر سوچ لو، رسول اللہ ﷺ کو یہاں سے اپنے ساتھ یثرب لے جانے کا مطلب پورے عالم عرب سے دشمنی اور جنگ ہے۔ تمھارے مایہ ناز سردار قتل کر دیے جائیں گے اور تلواریں تمھارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گی۔ اگر یہ سب کچھ برداشت کر سکتے ہو تو انھیں ہاتھوں پر اٹھا لو۔ تمھارا اجر و ثواب اللہ کے ذمے ہوگا لیکن اگر تم ذرا بھی کمزوری کا خدشہ محسوس کرتے ہو تو انھیں یہیں رہنے دو۔ تمھارا یہ عذر اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ قابل قبول ہوگا۔'' انصار جذبات کی شدت سے بیک آواز چیخ اُٹھے: ''اسعد! اپنا ہاتھ ہٹا لو۔ ہمیں بیعت کرنے دو۔ اللہ کی قسم! ہم ہرگز اس بیعت کو چھوڑیں گے نہ توڑیں گے۔''[1]

جب حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کو اپنی قوم کے عزم محکم کا یقین ہو گیا تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کرتے ہوئے آپ کے دست مبارک پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، پھر تو لائن لگ گئی اور ہر شخص نے رسول اللہ ﷺ کے دست حق پرست پر بیعت کی سعادت حاصل کی۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ ہر بیعت کرنے والے کو وفاداری کی صورت میں جنت کی خوشخبری دے رہے تھے۔[2] باقی رہی ان دو عورتوں کی بیعت جو ان لوگوں کے ساتھ تھیں تو ابن اسحاق لکھتے ہیں: ''لوگ کہتے ہیں کہ انھوں نے بھی آپ کے دست حق پر بیعت کی۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ عورتوں سے مصافحہ نہیں کیا کرتے تھے۔ ہاں! آپ خواتین سے زبانی قول قرار لے لیتے تھے۔ جب وہ عہد وفا قبول کر تیں تو آپ ﷺ فرمایا

[1] اس روایت کے متعلق تفصیل گزر چکی ہے۔ یہ احمد کی روایت ہے جو انھوں نے جابر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کی ہے۔ یہ صحیح روایت ہے۔ اس میں بیعت کی شرائط بھی بیان کی گئی ہیں۔ [2] ابن اسحاق نے حسن سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے بیعت کرنے والے حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ تھے۔

کرتے تھے: ”جاؤ، تمھاری بیعت ہو چکی۔“ [1]

جب یہ پیمان وفا مکمل ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اپنے میں سے بارہ نمائندے منتخب کرو جو اپنی اپنی قوم کے ذمہ دار ہوں۔“ تو انھوں نے بارہ نمائندے منتخب کیے جن میں نو خزرجی تھے اور تین اوسی۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ❶ عبادہ بن صامت ❷ براء بن معرور ❸ عبداللہ بن رواحہ ❹ سعد بن ربیع ❺ ابو امامہ اسعد بن زرارہ ❻ سعد بن عبادہ ❼ منذر بن عمرو ❽ اسید بن حضیر ❾ سعد بن خیثمہ ❿ عبداللہ بن حرام ⓫ رافع بن مالک ⓬ ابوالہیثم بن تیہان رضی اللہ عنہم۔ [2]

یہاں ابن اسحاق نے تمام حاضرین بیعت کا نام بنام ذکر کیا ہے۔ [3] ابن اسحاق کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان منتخب سرداروں سے فرمایا: ”تم اسی طرح اپنی اپنی قوم کے ذمہ دار ہو جس طرح حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کے حواری ذمہ دار تھے اور میں پوری امت مسلمہ کا ذمہ دار ہوں۔“ [4]

سب نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ذمہ داری قبول کی۔ صحیحین اور ابن اسحاق کی روایات میں اس بیعت کی شرائط درج ہیں۔ [5] لیکن امام احمد نے حضرت جابر سے اور امام بیہقی نے حضرت جابر اور عبید بن رفاعہ سے مزید تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔ [6]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 120/2. بلاسند۔ ابن اسحاق کے قول کی تائید بخاری و مسلم کی روایت سے ہوتی ہے، دیکھیے: (صحيح البخاري، الطّلاق، باب إذا أسلمت المشركة أوالنّصرانية.....، حديث: 5288، وصحيح مسلم، الإمارة، باب كيفية بيعة النّساء، حديث: 1866) [2] السيرة النبوية لابن هشام: 98,97/2. ابن اسحاق کی یہ روایت بلاسند ہے، چنانچہ یہ ضعیف ہے۔ [3] السيرة النبوية لابن هشام: 2/109-120. بلاسند ہے۔ [4] السيرة النبوية لابن هشام: 100/2. سند حسن لیکن مرسل ہے اور یہ سند عبداللہ بن ابی بکر پر موقوف ہے۔ [5] صحيح البخاري، الفتن، باب قول النبيّ ﷺ: ستروْن بعدي أمورًا تُنكرونها، حديث: 7200,7199 و 7056,7055، وصحيح مسلم، الحدود، باب الحدود كفارات لأهلها، حديث: 1709، وكتاب الإمارة، باب وجوب طاعة الأمراء......، حديث: 1709 بعدالحديث: 1840، والسيرة النبوية لابن هشام: 108/2. اس روایت کی سند حسن ہے۔ [6] الفتح الرباني: 270/20، والمستدرك للحاكم: 625,624/2. حاکم ‹‹

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم نے پوچھا: ''اللہ کے رسول ! ہم کن امور پر آپ کی بیعت کریں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خوشی یا ناخوشی، ہر حالت میں میری بات سنو گے اور اطاعت کرو گے۔ تنگی ہو یا آسانی، ہر حال میں اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے۔ نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے۔ خدالگتی بات کہو گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کرو گے۔ جب میں تمھارے پاس پہنچ جاؤں تو دل و جان سے میری مدد کرو گے اور میری حفاظت اس طرح کرو گے جس طرح تم اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔ اس کے بدلے میں تمھیں جنت ملے گی۔''

احمد اور بیہقی کے الفاظ میں تھوڑا بہت اختلاف ہے۔ لیکن ابن اسحاق کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی کہ تنگی ہو یا آسانی، پسند کریں یا نہ کریں، چاہے دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے ہم ہر حال میں آپ کی بات سنیں گے، اطاعت کریں گے اور حکمرانوں سے حکومت کے معاملے میں جھگڑا نہیں کریں گے، جہاں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مقابلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔''

« نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے ان سے اتفاق کیا ہے۔ ابن کثیر نے لکھا: ''یہ مسلم کی شرائط کے مطابق ایک جید (اچھی) سند ہے۔ لیکن محدثین نے اسے نقل نہیں کیا۔'' دیکھیے: (البداية والنهاية: 175/3) حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 75/15) جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کے لیے دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 443/2) دوسری روایت جابر رضی اللہ عنہ اور عبید بن رفاعہ کے لیے دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 452/2) ابن کثیر نے عبید کی روایت کے متعلق کہا: ''اس کی سند جید ہے لیکن محدثین نے اسے نقل نہیں کیا۔'' دیکھیے: (البداية والنهاية: 18/3) دکتور سلیمان السعود نے لکھا: ''یہ حدیث اس سند کے ساتھ سے ضعیف ہے لیکن حدیث جابر جیسی گزشتہ تائیدی روایات (شواہد) جو بیعت کی شرائط کے متعلق ہیں، ان کی بنا پر یہ قوی حدیث ہے۔'' دیکھیے: (رسالة الهجرة، ص: 92)

بیعت مکمل ہو گئی، نقیب مقرر کر دیے گئے، لوگ اٹھنے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ شیطان نے اس ملاقات کا راز فاش کر دیا تاکہ مشرکین کے سردار مسلمانوں کے منتشر ہونے سے پہلے ہی آ کر مسلمانوں کو قابو کر لیں۔ ہوا یوں کہ شیطان نے گھاٹی پر چڑھ کر انتہائی بلند آواز سے، اتنی بلند کہ اس سے پہلے ایسی زوردار آواز کبھی نہیں سنی گئی، پکارا: ''او منیٰ والو! کیا تم جانتے ہو کہ مذمم (حضرت محمد ﷺ) اور اس کے بے دین ساتھی تم سے جنگ کرنے پر متفق ہو گئے ہیں؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ اس گھاٹی کا شیطان أَزَبُّ ابْنِ أَزْيَب ہے۔ او اللہ کے دشمن! اچھی طرح سن لے۔ اللہ کی قسم! میں تیرے لیے فارغ ہو رہا ہوں۔'' پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جاؤ۔''[1]

شیطان کی یہ چیخ پکار سن کر حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''قسم اس ذات اقدس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے! اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم کل ہی منیٰ والوں پر تلواریں لے کر ٹوٹ پڑتے ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابھی ہمیں اس کی اجازت نہیں، اس لیے تم اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے جاؤ۔'' چنانچہ سب لوگ واپس جا کر چپکے سے سو گئے۔[2]

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں: ''صبح ہوئی تو بڑے بڑے قریشی ہمارے خیموں میں آ دھمکے اور کہنے لگے: ''او خزرجیو! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم ہمارے اس ''نبی'' کے پاس آئے ہو۔ تم اُسے ہمارے یہاں سے نکال کر اپنے ہاں لے جانا چاہتے ہو اور تم نے اس کے ہاتھ پر ہم سے جنگ کرنے کی بیعت کی ہے۔ اللہ کی قسم! اگر ہماری تم سے جنگ ہو گئی تو تمھارے لیے ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' ہماری قوم کے مشرکین یہ سن کر بہت

[1] بیعتِ عقبہ ثانیہ کے بارے میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو ابن اسحاق نے بسند حسن روایت کیا، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 102,101/2) بتایا جاتا ہے کہ ابن أزیب ابن ہشام کے توضیحی الفاظ ہیں۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 102,101/2.

حیران ہوئے۔ انھوں نے قسمیں کھانی شروع کر دیں کہ ایسا تو کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ ہمیں تو اس کی خبر تک نہیں۔ فی الواقع وہ سچ کہہ رہے تھے کیونکہ انھیں رات والے معاملے کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہم مسلمان کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور چپ رہے......"

خیر! حُجاج منٰی سے فارغ ہو کر چلے گئے تو قریشیوں نے باریک بینی سے تحقیق کی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ واقعی ایسا معاملہ ہو گیا ہے۔

روایت میں یہ بھی ہے کہ پھر قریشی مدینہ والوں کے پیچھے بھاگے مگر انھیں سعد بن عبادہ اور منذر بن عمرو کے سوا کوئی نہ مل سکا۔ ان میں سے بھی منذر تو بچ نکلے، البتہ انھوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا۔ ان کے ہاتھ گردن سے باندھ دیے اور بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اور گھونسے مارتے ہوئے مکہ واپس لائے لیکن یہاں اللہ نے انھیں جبیر بن مطعم اور حارث بن حرب کے ذریعے سے چھڑا دیا کیونکہ حضرت سعد ان کے شام آنے جانے والے قافلوں کو اپنی حفاظت میں مدینہ منورہ کا راستہ پار کرایا کرتے تھے۔ [1]

بیعت عقبہ ثانیہ کے نتائج

اس بیعت کے کچھ نتائج تو فوری مرتب ہوئے اور کچھ بعد میں ظاہر ہوئے۔ فوری نتائج یہ تھے:

* انصار یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے کہ رسول اللہ ﷺ کی حمایت کا مطلب یہ ہے کہ

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 2/101-104. بروایت کعب معلوم ہوتا ہے کہ دکتور عودہ نے غلطی سے یہ کہہ دیا ہے کہ مشرکین کی طرف سے سعد و منذر کو گرفتار کر کے لانے کا واقعہ بروایت مرسل ہے۔ شاید انھوں نے روایت پر یہ حکم اس واقعے کی سند کی روشنی میں لگایا ہے جو عبداللہ بن ابی ابن سلول کے ساتھ خاص ہے کہ عبداللہ بن ابی کو تو بیعت عقبہ کے معاملے کا پتہ ہی نہیں تھا۔ ہماری دانست میں یہ روایت ایک جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتی ہے جو کعب کی متصل روایت کے درمیان آ گئی ہے، دیکھیے: (السيرة في الصحيحين وعند ابن إسحاق، ص: 362، والسيرة النبوية لابن هشام: 2/103)

اب ان کو آپ ﷺ کے دشمنوں، مشرکین اور یہود کی عداوت اور جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا، یعنی اللہ کے راستے میں جہاد کرنا ہوگا۔ ہر چند بیعت کی شرطوں میں اس بات کی صراحت نہیں تھی۔

* مشرکین مکہ کا مدینہ کے مسلمانوں کو پکڑنے کی تگ و دو کرنا اس حقیقت کی بڑی پکی دلیل ہے کہ شرک اور کفر کی ایمان کے ساتھ دشمنی ہمہ وقت اور ہر جگہ ہے۔
* اس بیعت وملاقات کی رازداری یہ سبق دیتی ہے کہ معاملات انجام دیتے وقت احتیاط برتنا نہایت ضروری ہے، خصوصًا جبکہ معاملہ دعوت وتبلیغ کے مستقبل سے تعلق رکھتا ہو۔
* یہ بیعت رسول اللہ ﷺ اور دوسرے مسلمانوں کی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے انقلاب عظیم کی بنیاد بن گئی۔
* مدینہ میں اسلام کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس سے پہلے جس نے اپنے اسلام کو چھپا رکھا تھا، اب اس نے بھی اپنے دین قیم کا اعلان کر دیا۔
* جب کفار مکہ نے یہ سمجھ لیا کہ رسول اللہ ﷺ کے مدینہ والوں سے تعلقات ہمارے لیے خطرے کی گھنٹی ہیں تو انھوں نے مسلمانوں کا ناطقہ بند کرنے کی نئی کوششیں شروع کر دیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو جلد از جلد مدینہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا۔
* مابعد نتائج پر غور کرنے سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہ بیعت مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت کی بنیاد بنی اور اسلام کے وہاں سے زمین کے کونے کونے میں پھیل جانے کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ [1]
* ان فوری اور مابعد نتائج کی بنا پر اس بیعت کی اہمیت اس طرح ظاہر ہوئی کہ اس بیعت میں حصہ لینے والوں کی فضیلت غزوۂ بدر، ہجرتِ حبشہ، ہجرتِ مدینہ اور بیعتِ

[1] من معين السيرة، ص: 136، و فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 132.

رضوان میں شریک ہونے والوں سے کسی طرح بھی کم نہیں۔

* شیطان کی حق سے دشمنی اور اسلام کی سرفرازی پر اس کی بے چینی ابتدا ہی سے بالکل عیاں ہے، اس لیے وہ اسلام کے دشمنوں کو رسول اللہ ﷺ اور مدینہ منورہ کے مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ بھڑکاتا رہا۔

* بیعت عقبہ ثانیہ ان تمام مبادئ اسلام پر مشتمل تھی جو ہجرت مدینہ کے بعد نافذ کیے گئے، مثلاً: جہاد اور دعوت اسلامیہ کا دفاع، یہ چیز اگرچہ مکہ مکرمہ میں مشروع نہیں تھی مگر آپ کو الہامی طور پر علم تھا کہ مستقبل قریب میں یہ حکم نافذ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عباس بن عبادہ نے منیٰ والوں سے لڑائی کی بات کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں بھئی! ابھی ہمیں اس کی اجازت نہیں ملی۔'' اس بات پر اتفاق ہے کہ جہاد کی مشروعیت کے بارے میں سب سے پہلے یہ آیت اُتری:

﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ﴾

''وہ لوگ جن سے لڑائی کی جاتی ہے انھیں (جہاد کی) اجازت دے دی گئی ہے، اس لیے کہ بے شک ان پر ظلم کیا گیا اور یقیناً اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔''[1]

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو ہجرت پر مجبور کیے جانے پر اظہار ناپسندیدگی کرتے ہوئے کہا: ''افسوس! قریش نے اپنے نبی کریم ﷺ کو مکہ سے نکال دیا۔ اب یہ یقیناً تباہ و برباد ہوں گے ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾، پھر جب یہ آیت اتری تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مجھے تو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب جنگ کا بگل بجے گا۔''[2]

[1] الحج 39:22. [2] جامع الترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة الحج، حديث: 3171، ومسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 262/3. ترمذی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

* اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا تھا کہ جب تک مسلمانوں کے لیے دارالاسلام مہیا نہیں ہوتا جوان کے لیے مضبوط و محفوظ پناہ گاہ ہو، ان پر فریضۂ جہاد عائد نہ کیا جائے۔ مدینہ منورہ سب سے پہلا ''دارالاسلام'' تھا۔[1] مزید برآں یہ مقصد بھی تھا کہ انھیں اتنی تربیت حاصل ہو جائے کہ وہ جہاد کرنے کے قابل بن جائیں۔

* اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں قتال و جہاد کی مشروعیت ہجرت مدینہ کے بعد ہوئی اور یہی صحیح قول ہے۔ ابن اسحاق کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاد و قتال ہجرت سے پہلے ہی بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت مشروع ہو چکا تھا[2] لیکن یہ صحیح نہیں۔

ایک ضروری بات

ابن اسحاق نے حسن سند کے ساتھ روایت بیان کی ہے کہ حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ جب بیعت کے سلسلے میں مکہ آئے تھے تو وہ اس سفر کے دوران کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! میں اس سفر میں نکلا۔ چونکہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام کی توفیق مل چکی تھی، خیال آیا کہ میں کعبہ کی طرف پیٹھ نہ کروں، چنانچہ میں بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا رہا جبکہ میرے ساتھی اس سلسلے میں مجھ سے متفق نہیں تھے۔ مجھے اس کے بارے میں خلجان سا محسوس ہو رہا ہے۔ اے اللہ کے رسول! آپ کیا فرماتے ہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''آپ قبلے ہی پر تھے، کاش اس پر قائم رہتے!''[3]

[1] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 133. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 2/92و94و108، والمستدرك للحاكم: 2/ 625,624. امام حاکم کا کہنا ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے جبکہ ان دونوں نے اسے نقل نہیں کیا۔ ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے۔ [3] السيرة النبوية لابن هشام: 93,92/2، وفقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 132، والسيرة النبوية لأبي شهبة: 454/1. ابوشہبہ کا کہنا ہے کہ یہ ابن اسحاق کی غلطیوں میں سے ایک ہے۔

اس پر حضرت براء رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والا قبلہ ہی اختیار کر لیا اور شام (بیت المقدس) کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔ اس لحاظ سے حضرت براء رضی اللہ عنہ وہ پہلے صحابی ہیں جنھوں نے اسلام میں سب سے پہلے کعبہ مشرفہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔

باب

5

ہجرتِ مدینہ

- ہجرتِ مدینہ کے اسباب
- رسول اللہ ﷺ کی ہجرت
- ہجرت کا راستہ
- مدینہ منورہ میں تشریف آوری

***

﴿وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ﴾

''اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے خلاف تدبیر کر رہے تھے کہ وہ آپ کو قید کر دیں یا وہ آپ کو قتل کر دیں یا وہ (مکہ سے) نکال دیں۔ اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔''

[الأنفال 8:30]

﴿إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾

''اگر تم اس (نبی) کی مدد نہیں کرو گے تو بلاشبہ اللہ نے اس وقت بھی اس کی مدد کی تھی جب کافروں نے اسے اس حال میں نکال دیا تھا کہ وہ (نبی) دو میں سے دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا: غم نہ کیجیے، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

[التوبة 9:40]

ہجرتِ مدینہ کے اسباب

ظلم وتشدد

جب سے رسول اللہ ﷺ نے علانیہ دعوت وتبلیغ کا کام شروع کیا تو آپ اور آپ کے پیروکاروں کو مختلف قسم کے مظالم کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم سابقہ صفحات میں اس کی تفصیلات بیان کر چکے ہیں۔ ان حالات میں رسول اللہ ﷺ کو یہی فکر لاحق ہو رہی تھی کہ مکہ سے باہر حمایتی تلاش کیے جائیں کیونکہ مکہ کی عمومی فضا تو ضد اور تعصب کا شکار تھی۔ ہجرت حبشہ، ہجرت طائف اور آخر کار ہجرت مدینہ اسی سوچ کا نتیجہ تھیں۔ اس حقیقت میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ کفار کا ظلم وتشدد ہی ہجرت مدینہ کا سبب بنا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو جب ہجرت کرنی پڑی تو حسرت سے کہا کرتے تھے: ''اے اللہ! شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف پر لعنت فرما جنھوں نے ہمیں مکہ کی سرزمین سے اس وبائی علاقے (یثرب) میں دھکیل دیا۔''[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے والد محترم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہجرت مدینہ کا سبب یوں بیان فرماتی ہیں: ''ابا جان نے نبیِ کریم ﷺ سے ہجرت کی اجازت طلب کی کیونکہ (کفار کی طرف سے) تشدد کی انتہا ہو گئی تھی......۔''[2]

[1] صحيح البخاري، فضائل المدينة، باب: 12، حديث: 1889. [2] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الرجيع ورعل وذكوان......، حديث: 4093.

اس سے پہلے اسی ظلم وتشدد کی بنا پر انھوں نے اور دیگر صحابہ نے حبشہ کی طرف کوچ کر جانے کی ٹھانی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کا بیان ہے کہ جب مسلمان (کفار کی طرف سے) آزمائش کا نشانہ بنے تو حضرت ابو بکر حبشہ کی طرف ہجرت کے لیے مکہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ [1]

ابن اسحاق نے بھی لکھا ہے کہ ہجرت مدینہ کے اسباب میں سے ایک سبب مسلمانوں کا شدید عذاب وتکلیف میں مبتلا ہونا تھا۔ [2]

دعوت وتبلیغ کے لیے حمایت میسر آنا

سابقہ صفحات میں مسند احمد اور سیرت ابن اسحاق کے حوالے سے بیعت عقبہ ثانیہ کی تفصیلات بیان ہو چکی ہیں، ان سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔

تکذیب

رؤسائے قریش اور عوام الناس کا آپ کی تکذیب کرنا بھی ہجرت کا سبب بنا، چنانچہ عمومی تکذیب ہی کی بنا پر رسول اللہ ﷺ مجبور ہو کر ان دوسرے لوگوں کے بارے میں سوچنے لگے جن سے تصدیق کی امید کی جا سکتی تھی۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی ایک دعا بھی اس کی وضاحت کرتی ہے: ''اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ میں تیرے رستے میں ان لوگوں سے جہاد کروں جنھوں نے تیرے رسول (ﷺ) کی تکذیب کی اور انھیں مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔'' ایک دوسری روایت میں رسول کے بجائے نبی کے الفاظ ہیں اور صراحت ہے کہ ان لوگوں سے مراد قریش ہیں۔ [3] ابن اسحاق نے

[1] صحیح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ ......، حدیث: 3905. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 121/2. یہ روایت بلاسند ہے لیکن صحیح بخاری کی مذکورہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔
[3] صحیح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ ......، حدیث: 3901.

رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے اسباب بیان کرتے ہوئے تکذیبِ قریش کو بھی ایک اہم سبب قرار دیا ہے۔[1]

دین سے برگشتہ ہونے کا خدشہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہجرت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: ''مومنین اپنے دین کو بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف بھاگتے تھے تاکہ کہیں اُنھیں ان کے دین سے برگشتہ نہ کر دیا جائے......''[2]

ابن اسحاق کا بیان ہے: ''قریش نے آپ ﷺ کے پیروکار مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے حتی کہ انھیں دین سے برگشتہ کیا اور اپنے علاقے سے نکالا۔ کچھ مسلمان تو دین چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ کچھ ان کے ہاتھوں عذاب اور ابتلا میں گرفتار رہے اور کچھ اپنا دین بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ گئے......''[3]

لڑائی کی اجازت

ابن اسحاق نے لڑائی کی اجازت کا سبب بھی بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جنگ و قتال کی اجازت والی آیات جیسے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا﴾

''ان لوگوں کو (جہاد کی) اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے کیونکہ بلاشبہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔''[4]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 121/2.. یہ روایت ضعیف ہے، تاہم اسی مضمون کی ایک صحیح روایت حدیث کی کتاب میں آئی ہے۔ [2] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ......، حديث:3900. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 121/2. بلاسند ہونے کی بنا پر روایت ضعیف ہے، تاہم اس کا مضمون صحیح روایت میں آیا ہے۔ [4] الحج22:39.

یہ اولین آیات ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کو ان لوگوں سے جنگ کرنے کی اجازت دی گئی جنھوں نے مسلمانوں پر ظلم وستم کیا۔[1] اس کے بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی ان کے ہمنوا ہیں۔[2] ظلم برداشت کرنے کے صلے میں مسلمان رضائے الٰہی کے طالب تھے اور وہ ہر قسم کی جسمانی اور روحانی تکلیف، اہل وعیال سے جدائی اور جلاوطنی تک بخوشی گوارا کرتے تھے۔

حضرت خباب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت کی۔ اس میں ہم اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے طالب تھے، چنانچہ ہمارا اجر وثواب اللہ تعالیٰ کے ذمے لازم ہوگیا......''[3] ہجرت اور مہاجرین کی فضیلت میں بکثرت احادیث ہیں۔ حکومت کے بغیر اسلام اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں ہوسکتا تھا، علاقہ اور فرمانبردار رعایا کے بغیر حکومت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سب کچھ ہجرت ہی کی بدولت حاصل ہوا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بیان کی ہے کہ وہ فرماتی ہیں: ''نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں مسلمانوں سے فرمایا تھا:

«إِنِّي أُرِيتُ دَارَ هِجْرَتِكُمْ ذَاتَ نَخْلٍ بَيْنَ لَابَتَيْنِ۔ وَهُمَا الْحَرَّتَانِ»

''مجھے تمھارا دارالھجرت کھجوروں والا علاقہ دکھایا گیا ہے، جس کے دائیں بائیں دو پتھریلے میدان ہیں۔''

پھر جس نے ہجرت کرنا چاہی اس نے مدینہ منورہ ہجرت کی اور ان لوگوں کی بڑی

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 121/2. یہ عروہ اور دیگر علماء کے حوالے سے بلاغی روایت ہے۔ (بلاغی روایت وہ ہے جس میں راوی کہے: ''مجھے یہ خبر ملی۔'' یا ''مجھے یہ روایت پہنچی۔'') [2] زاد المسير لابن الجوزي: 436/5، ومسند أحمد(تحقيق أحمد شاكر): 358/3،حديث :1865. یہ حدیث صحیح ہے۔ [3] صحيح البخاري، الجنائز ، باب إذا لم يجد كفنا إلّا مايواري رأسه أو قدميه غطّى به رأسه، حديث: 1276.

تعداد بھی جو حبشہ گئے تھے، مدینہ منورہ لوٹ آئے۔'' [1]

اولین مہاجرین

امام بخاری رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے والے حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہما تھے۔ [2] ابن اسحاق اور ابن سعد کا بیان ہے کہ سب سے پہلے ہجرت کرنے والے حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ تھے۔ [3] موسیٰ بن عقبہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ [4] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ مؤرخین کے اس قول اور صحیح بخاری کی روایت میں تطبیق یوں ممکن ہے کہ دونوں کو مختلف نوعیت کی اولیت حاصل تھی۔ حضرت ابوسلمہ نکلے تو تھے مگر ان کا مقصد مدینہ منورہ میں مستقل اقامت کا نہیں تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر اقامت کی نیت سے مدینہ منورہ گئے تھے تاکہ وہ وہاں کے مسلمانوں کو دین کی تعلیم سے آراستہ کریں۔ مزید برآں انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ جانے کا حکم خود دیا تھا، چنانچہ دونوں میں سے ہر ایک کو ایک اعتبار سے اولیت حاصل ہے۔ [5]

ہجرت کی صعوبتیں

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''جب میرے خاوند ابوسلمہ نے ہجرت کا ارادہ کیا تو

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3905. [2] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب مقدم النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3925,3924. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 122/2. بلاسند ہے۔ تاہم ابن ہشام نے ہجرت کی کیفیت کا واقعہ حسن سند سے روایت کیا ہے۔ و الطبقات الكبرىٰ: 226/1. یہ واقدی کی روایت ہے جس کی سند متصل ہے۔ [4] تاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي، ص: 313. یہ محدث کبیر زہری کی روایت ہے جو مرسل ہے۔ [5] فتح الباري: 119/15، شرح الحديث: 3925.

مجھے اور اپنے بیٹے سلمہ کو بھی اونٹ پر سوار کرلیا۔ میرے خاندان والوں نے انھیں دیکھ لیا۔ وہ بھاگے آئے اور کہنے لگے: ''تو خود تو ہمارے ہاتھوں سے نکل ہی چکا ہے لیکن یہ تیری بیوی؟ ہم کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ تو اسے بھی دربدر لیے پھرے؟'' یہ کہہ کر انھوں نے مجھے چھین لیا۔ اس پر ابوسلمہ کے خاندان والوں کو جوش آ گیا، وہ کہنے لگے: ''اگر تم نے اپنی لڑکی ہمارے آدمی سے چھین لی ہے تو ہم بھی اپنا بیٹا تمھاری لڑکی کے پاس نہیں رہنے دیں گے۔'' پھر بچے پر کھینچا تانی شروع ہوئی حتیٰ کہ اس کا بازو نکل گیا۔ آخر وہ بچے کو لے گئے۔ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ اکیلے ہی مدینہ منورہ پہنچ گئے۔''

مصیبت کی ماری ام سلمہ ہر روز صبح صبح وادیِ بطحاء میں آکر بیٹھ جاتی اور شام تک روتی رہتی۔ اس حالت زار پر پورا سال گزر گیا۔ آخر ان کے ایک رشتہ دار کو ان پر ترس آیا وہ ان کے خاندان سے کہنے لگا: ''او ظالمو! تم اس مسکین لڑکی کو جانے کیوں نہیں دیتے؟ تم نے اسے خاوند اور بیٹے سے جدا کر رکھا ہے۔'' انھیں بھی ندامت ہوئی، کہنے لگے: ''اگر تو اپنے خاوند کے پاس جانا چاہتی ہے تو چلی جا۔'' ام سلمہ خوشی سے بھاگتی ہوئی ابوسلمہ کے خاندان کے پاس گئیں۔ ان سے اپنا بچہ واپس لیا اور عثمان بن ابی طلحہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مدینہ منورہ ہجرت کر گئیں۔ [1]

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا ارادہ کیا تو مشرکین مزاحم ہوئے۔ کہنے لگے: ''جب تو ہمارے پاس آیا تھا تو حقیر اور نہایت فقیر تھا۔ یہاں رہ کر مالا مال ہوا اور مرتبہ حاصل کیا۔ اب تو چاہتا ہے کہ جان و مال دونوں کو لے کر نکل بھاگے، اللہ کی قسم! یہ ہرگز نہ ہو گا۔'' صہیب کہنے لگے: ''اچھا اگر میں اپنا سارا سامان تمھیں دے دوں تو مجھے جانے دو گے؟'' وہ فوراً بولے: ''ہاں، ہاں۔'' حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تو سن لو! میں نے اپنا سارا مال تمھیں دے دیا۔'' اور خالی ہاتھ مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ماجرا

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 124,123/2. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند حسن ہے۔

معلوم ہوا تو فرمایا: ”صہیب فائدے میں رہا......“ [1]

خود حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ جب مشرکین نے مجھے گھیرے میں لے لیا تو میں نے ان سے کہا: ”چاہو تو میں تمھیں سونے کی اشرفیاں دے دیتا ہوں لیکن مجھے جانے دو۔“ وہ راضی ہو گئے۔ میں نے کہا: ”میرے گھر کی دہلیز کے نیچے کئی اوقیہ سونا دفن ہے۔ جا کر نکال لو، پھر میں چل پڑا اور قباء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جاملا۔ ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے روانہ نہیں ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا: ”ابو یحییٰ! تجارت سود مند ثابت ہوئی۔“ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ......﴾

”اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو اللہ کی رضا کی تلاش میں اپنی جان بیچ دیتا ہے......“ [2]

[1] ابن ہشام نے اس واقعے کو ایک معلق سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 133/2) محدث حاکم نے اسے متصل سند سے روایت کیا اور کہا: ”یہ روایت مسلم کی شرائط پر پورا اترنے کی بنا پر صحیح ہے۔ اس کے باوجود شیخین نے اسے نقل نہیں کیا۔“ دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 389/3) ذہبی نے اس روایت کے متعلق خاموشی اختیار کی اور کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس روایت کو صحیح کہنے پر البانی رحمہ اللہ نے حاکم کی موافقت کی اور کہا: ”صہیب رضی اللہ عنہ ہی سے روایت کردہ ایک حدیث اس کی تائید کرتی ہے جسے ہیثمی نے طبرانی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔“ دیکھیے: (مجمع الزوائد: 60/6) ان کے علاوہ بیہقی نے بھی اسے روایت کیا اور ابن کثیر نے اسے بیہقی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ طبرانی اور بیہقی کی اس تائیدی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صہیب رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر کہا: ”ابو یحییٰ! تجارت سود مند ثابت ہوئی۔“ دیکھیے: (فقه السيرة للغزالي، ص: 166) امام احمد نے اسے مرسل سند سے روایت کیا جس کے رجال محقق کتاب کے مطابق ثقہ ہیں، دیکھیے: (فضائل الصحابة: 828/2، حديث: 1509) مجموعی طور پر ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ صہیب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہجرت کی۔ ابن حجر نے اسے قطعی قرار دیا ہے، اور دیکھیے: (الإصابة: 195/2، وتفسير ابن كثير: 360/1) [2] البقرة 207:2. المستدرك للحاكم:400/3.

چند مرسل روایات اس مفہوم کی آئی ہیں کہ یہ آیت: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِیۡ...... ﴾ حضرت صہیب کی ہجرت کے سلسلے میں ہے اور انھی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ امام طبری نے یہ روایات ذکر کرنے کے بعد ان پر یوں تبصرہ کیا ہے: ''یہ جو روایت ہے کہ یہ آیت حضرت صہیب کے بارے میں نازل ہوئی تو یہ کوئی بعید بات نہیں۔ اس لیے کہ ممکن ہے یہ آیت رسول اللہ ﷺ پر کسی ایک سبب کی بنا پر نازل ہوئی ہو لیکن یہ اپنے مفہوم کے لحاظ سے اس قدر جامع ہے کہ تمام متعلقہ واقعات پر محیط ہو کر ان پر پوری طرح صادق آرہی ہے۔''[1]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کے بارے میں مختلف روایات ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: ''اکثر اہل علم نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ یہ آیت ہر مجاہد فی سبیل اللہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔'' امام طبری اور علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کے خیالات میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ آیات کے الفاظ کا عموم معتبر ہوتا ہے نہ کہ خاص سببِ نزول جیسا کہ فقہاء نے صراحت کی ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی ہجرت

ابن اسحاق نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں: ''میں نے عیاش بن ابی ربیعہ اور ہشام بن عاص بن وائل سہمی کے ساتھ طے کیا کہ کل صبح سرف کے قریب أَضَاةِ بنی غفار میں تناضِب (37) کے مقام پر اکٹھے ہوں گے۔ اگر ہم میں سے کوئی وقت

(37) تناضب: بلاذری کا کہنا ہے: ''تناضب اور اَضَاةِ بنی غفار ایک ہی جگہ کا نام ہے۔ اضاۃ: ایسا علاقہ جہاں پانی کھڑا رہنے سے وہاں کی مٹی گارا بن جائے۔ تناضب: اس علاقے میں اگے ہوئے درختوں کو کہتے ہیں۔ وادی سرف کے شمالی کنارے ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کی قبر کے پہلو میں یہ علاقہ »

[1] تفسير الطبري (تحقيق أحمد شاكر): 250/4، و زاد المسير: 223/1، وتفسير ابن كثير: 360/1.

مقررہ پر نہ پہنچ سکا تو سمجھا جائے گا کہ اُسے قید کر دیا گیا ہے پس باقی دونوں چل پڑیں گے۔ صبح ہوئی تو میں اور عیاش تناضب کے مقام پر پہنچ گئے، ہشام نہ پہنچ سکا۔ اُسے مجبور کر کے دین سے برگشتہ کر دیا گیا۔'' [1]

بعد میں جب یہ آیات:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ ......﴾

''کہہ دو (کہ اللہ فرماتا ہے): اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے! تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بلاشبہ اللہ سب گناہ معاف کر دیتا ہے۔ یقیناً وہی بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے......'' [2]

اتریں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیات لکھ کر ہشام بن عاص کو مکہ بھیج دیں۔ [3] لیکن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ آیات بھیجنے کا کوئی مقصد ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا، آخر کار انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ان کا مقصد میری سمجھ میں آجائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں

◂◂ اب بھی اپنے درختوں سمیت موجود ہے۔ اس کے مغربی حصے میں شمال کی جانب مکہ سے تیرہ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک قبیلہ آباد تھا، دیکھیے: (المعالم الأثيرة لمحمد شرّاب (مادة: التناضب)

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 2/129-131. سند حسن ہے۔ ابن حجر نے اسے صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (الإصابة: 3/604) یہ ابن اسحاق کی سند سے محدث ابن السکن کی روایت ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ کی ہجرت کے متعلق یہ صحیح روایت اس ضعیف روایت کے مخالف ہے جو عام طور پر مشہور ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی ہجرت کا اعلان کیا اور مشرکین سے کہا: ''جو چاہتا ہے کہ اس کی ماں اسے گنوا بیٹھے اور اس کی بیوی بیوہ ہو جائے وہ مجھے اس وادی سے باہر ملے......'' یہ روایت ابن اثیر نے نقل کی ہے، دیکھیے: (أسد الغابة: 4/58) البانی رحمہ اللہ نے اس پر ضعیف ہونے کا حکم لگایا ہے، دیکھیے: (دفاع عن الحديث النبوي والسيرة، ص: 43) ابن عساکر نے بھی اسے روایت کیا ہے، دیکھیے: (مختصر تاریخ دمشق: 18/278) [2] الزمر 39:53-55. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 2/129-131۔ یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند حسن ہے۔

یہ بات ڈالی کہ دراصل یہ آیات اس جیسے لوگوں کی رہنمائی کے لیے اتاری گئی ہیں۔ ان کا ذہن صاف ہو گیا اور وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ [1] (اور دوبارہ ہدایت پر گامزن ہو گئے۔)

علامہ ابن عبدالبر کی روایت ہے کہ انھوں نے غزوۂ خندق کے بعد ہجرت کی۔ [2]

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی نماز میں آخری رکوع کے بعد قنوت میں دعا فرمایا کرتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ! أَنْجِ الْوَلِيدَ بْنَ الْوَلِيدِ، وَسَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ، وَعَيَّاشَ بْنَ أَبِي رَبِيعَةَ......»

"اے اللہ! ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام اور عیاش بن ابی ربیعہ کو نجات عطا فرما......" [3]

ایک دوسری روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے:

«اَللّٰهُمَّ! أَنْجِ الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ......»

"مولائے کریم! کمزور اور مظلوم مسلمانوں کو نجات عطا فرما......" [4]

اللہ تعالیٰ نے ان تینوں اور دیگر مظلوم مسلمانوں کو آپ کی دعاؤں کے نتیجے میں نجات

[1] یہ روایت صحیح ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک ضعیف و معلق روایت آتی ہے جسے ابن ہشام نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خواہش کے مطابق ولید بن ولید چھپ چھپا کر مکہ گئے۔ وہاں راز داری سے عیاش اور ہشام کے قید خانے کا پتہ کیا، پھر ان کی بیڑیاں توڑ کر انھیں اپنے اونٹ پر سوار کر کے مدینہ لے آئے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 132,131/2) [2] الاستيعاب في أسماء الأصحاب لابن عبدالبر: 593/3. [3] صحيح البخاري، التفسير، بابٌ: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ﴾، حديث: 4560. [4] صحيح البخاري، الجهاد والسير، بابُ الدّعاء على المشركين بالهزيمة والزلزلة، حديث: 2932.

عطا فرمائی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیس دیگر صحابہ کے ہمراہ، جو سب کے سب سوار تھے، ہجرت کی۔[1] ابن اسحاق نے ان میں سے ایک گروہ کے نام بھی درج کیے ہیں۔ انھوں نے روایت کو یوں شروع کیا ہے: ''حضرت عمر بن خِطاب مدینہ پہنچے تو وہ اور ان کے ساتھ آنے والے ان کے اہل وعیال اور قوم کے دیگر افراد قباء میں ٹھہرے'' اور روایت کا اختتام ان الفاظ کے ساتھ ہے: ''...... جب وہ مدینہ آئے تو اس وقت عیاش بن ابی ربیعہ کی رہائش بھی انھی کے ساتھ تھی۔''[2] میرا خیال ہے کہ ابن اسحاق کی روایت صحیح بخاری کی روایت کی وضاحت کرتی ہے کہ یہ بیس لوگ ان کے متعلقین تھے۔ عیاش کے علاوہ یہ سب بعد میں ان کو جا کر ملے اور ابتدا میں ان کے ساتھ نہیں تھے کیونکہ ابتدا میں تو ان کے ساتھ صرف عیاش ہی تھے۔ اس طریقے سے دونوں روایات کا ظاہری تعارض ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں روک لیا کہ جب مجھے ہجرت کی اجازت ملے گی تو اکٹھے چلیں گے، چنانچہ انھوں نے اسی وقت سے ہجرت کی تیاری شروع کر دی۔ دو مضبوط اونٹنیاں خریدیں اور چار ماہ تک انھیں خوب چارہ ڈالا۔[3]

مستدرک حاکم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا: ''میرے ساتھ کون ہجرت کرے گا؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔''[4]

پھر تو ہجرت کرنے والوں کی لائنیں لگ گئیں۔ اہل ایمان روزانہ دارِ ہجرت اور دارالاسلام

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3905. [2] فتح الباري: 119/5، حديث: 3925 . [3] السيرة النبوية لابن هشام: 132/2. بلاسند ہے۔ [4] المستدرك للحاكم: 5/3. ذہبی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح اور غریب ہے۔

مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرتے تھے۔ دارالحرب اور دارالکفر مکہ مکرمہ میں صرف وہی کمزور اور مظلوم لوگ باقی رہ گئے جنھیں زبردستی روک کر قید کر دیا گیا یا پھر معذور لوگ جو نقل و حمل سے عاجز تھے۔ مہاجرین کے باقی ماندہ لوگوں میں سے آخری حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ تھے، وہ نابینا ہو گئے تھے۔ انھوں نے ہجرت کا عزم کیا تو ان کی بیوی نے ناپسند کیا اور مشورہ دیا کہ مدینہ کے بجائے کسی اور طرف چلنا چاہیے۔ انھوں نے خفیہ طور پر اپنے اہل و مال کے ساتھ ہجرت کی اور مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ ابوسفیان نے موقع کو غنیمت جانا۔ ان کے مکہ والے گھر پر قبضہ کر کے اسے فروخت کر دیا۔ بعد میں کسی وقت ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، عباس بن عبدالمطلب اور حویطب بن عبدالعزّٰی اس گھر کے پاس سے گزرے تو اس گھر سے غیر دباغت شدہ چمڑوں کی بو آ رہی تھی۔ عتبہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس نے یہ شعر پڑھا:

وَكُلُّ دَارٍ وَّ إِنْ طَالَتْ سَلَامَتُهَا يَوْمًا سَيُدْرِكُهَا النُّكَبَاءُ وَالْحُوبُ

''ہر گھر، خواہ وہ کتنی دیر صحیح سلامت رہے، بالآخر کسی نہ کسی دن مصائب اور بربادی کا شکار بنے گا۔'' [1]

یہ واقعہ ابن اسحاق نے بھی ہیثمی کی روایت کے مطابق بیان کیا ہے لیکن ان کی روایت میں ہے کہ نابینا عبد بن جحش تھے جو عبداللہ بن جحش کے بھائی تھے، ان کی کنیت ابو احمد تھی۔ ان کی بیوی کا نام فارعہ بنت ابوسفیان بن حرب تھا۔ ان کے بھائی عبداللہ بن جحش نے جب ہجرت کی تو وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ اپنے اس نابینا بھائی کو بھی مدینہ منورہ لے آئے۔ [2] معلوم ہوتا ہے کہ ابن اسحاق کی روایت ہی درست ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ

[1] مجمع الزوائد: 64,63/6. ہیثمی نے یہ روایت طبرانی سے نقل کی اور کہا: ''اس روایت میں عبداللہ بن شبیب ضعیف ہے۔'' [2] السيرة النبوية لابن هشام: 125,124/2. یہ روایت معلّق ضعیف ہے۔

نے صرف یہی روایت بیان کی ہے۔[1]

اس قسم کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ مکرمہ کے بہت سے گھر ان کے باسیوں کے ہجرت کر جانے کی وجہ سے سنسان ہو گئے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی ہجرت

قریش کی سازش

جب قریش کو اس معاہدے کا علم ہو گیا جو بیعت عقبہ ثانیہ میں رسول اللہ ﷺ اور مدینہ والوں کے مابین طے پایا تھا اور انھوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مسلمان اکادکا اور ٹولیوں کی صورت میں ہجرت کر رہے ہیں تو انھوں نے حقیقی خطرہ بھانپ لیا کہ مسلمان مدینہ میں اکٹھے ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ بھی ان کے پاس پہنچ گئے تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ ظاہر ہے مسلمان وہاں من مانی کریں گے۔ اس لیے انھوں نے یہ مذموم فیصلہ کر لیا کہ آپ ﷺ کی شمعِ زندگی ہی بجھا دی جائے۔

بیعت عقبہ ثانیہ سے تقریباً اڑھائی ماہ بعد، 14 نبوی کے ماہ صفر کی 26 تاریخ (12 ستمبر 622ء) کو بروز جمعرات قریشی سرداروں کا دارالندوہ میں ایک عظیم اجتماع ہوا۔ اس اجتماع کا مقصد صرف یہ مذموم مشورہ کرنا تھا کہ اللہ رب العزت کے آخری رسول ﷺ کا کام کیسے تمام کیا جائے۔ اس اجتماع میں ان لوگوں نے جو مختلف آراء پیش کیں،[2] قرآن مجید

[1] الإصابة: 3/4. [2] امام احمد نے اپنی سند سے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما تک پہنچتی ہے، روایت کیا ہے کہ یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی۔ امام احمد نے پورا واقعہ بیان کیا ہے، دیکھیے: (مسند أحمد: 301/5) اس روایت کی سند ضعیف ہے۔ محدث احمد شاکر نے اس کے ایک راوی عثمان جزری کی وجہ سے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ اس روایت کو ابن کثیر نے اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے نقل کیا ہے، دیکھیے: »

نے ان کا خلاصہ بیان کیا ہے:

﴿ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ ﴾

''اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے خلاف تدبیر کر رہے تھے کہ وہ آپ کو قید کر دیں یا وہ آپ کو قتل کر دیں یا وہ (مکہ سے) نکال دیں۔ اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔'' [1]

احادیث و آثار میں اس آیت کی تفصیلات آئی ہیں۔ اس آیت کے نزول کے بارے میں مسند احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے علاوہ ابن اسحاق نے ان کی ایک اور روایت اس کے بارے میں بیان کی ہے جس میں اس سازش کی مزید تفصیل بیان کی گئی ہے۔ [2]

» (تفسیر ابن کثیر: 49/4) ہیثمی نے یہ روایت لا کر طبرانی کا حوالہ دیا اور کہا: ''اس کی سند میں عثمان بن عمرو جزری ہے جسے ابن حبان نے ثقہ اور دیگر محدثین نے ضعیف لکھا ہے۔ اس کے بقیہ رجال صحیح کے رجال ہیں۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 27/7) سیوطی نے اس روایت کو عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن المنذر، ابوالشیخ، ابن مردویہ، ابونعیم اور الخطیب کے حوالے سے نقل کیا ہے، دیکھیے: (الدر المنثور: 179/3) ابن کثیر نے لکھا: ''یہ سند حسن ہے۔ یہ اس واقعے کے متعلق عمدہ ترین روایت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مکڑی نے غار کے دہانے پر جالا بن دیا تھا......'' دیکھیے: (البداية والنهاية: 199/3) ابن حجر نے اسے حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 90/15) عروہ کا بھی بیان ہے کہ یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی، دیکھیے: (مغازي رسول اللهﷺ لعروة ابن الزبير، ص: 128) امام بیہقی نے عروہ کا قول بیان کیا ہے کہ یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی، دیکھیے: (دلائل النبوّة للبيهقي: 466,465/2) عروہ سے ابوالاسود نے اور ان سے ابن لہیعہ اور محمد بن فلیح نے روایت کی۔ [1] الأنفال 30:8.
[2] السيرة النبوية لابن هشام: 136/2-139. اس روایت کی سند منقطع ہے۔ طبری نے اسے متصل سند سے بیان کیا ہے۔ یوں یہ سند حسن قرار پاتی ہے، دیکھیے: (تاريخ الطبري: 370/2-372)

اس روایت کے مطابق جب وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں مشورہ کرنے اکٹھے ہوئے تو وہاں ابلیس بھی ایک معمر آدمی (شیخ) کے روپ میں آ گیا۔ وہ کہنے لگا: ''میں نجد سے آیا ہوں۔[1] تم لوگ جس مقصد کے لیے اکٹھے ہوئے ہو میں نے اس کے متعلق سنا ہے۔ مجھے بھی اس معاملے میں گہری دلچسپی ہے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی مشورے میں شرکت کروں اور تمھاری خیر خواہی کروں۔'' یہ سن کر قریش مطمئن ہو گئے۔ بحث شروع ہوئی تو ایک سردار کہنے لگا: ''اس رسول کو قید کر دیا جائے۔'' نجدی شیخ کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! ہرگز نہیں۔ یہ درست رائے نہیں۔ اگر تم نے اُسے قید کر دیا تو یہ خبر اڑتی اس کے ساتھیوں تک بہرصورت پہنچ جائے گی۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ تم پر حملہ کر دیں اور اُسے تم سے چھڑا لے جائیں، پھر اس کے ذریعے سے اپنی جمعیت بڑھا کر تمھیں مغلوب کر لیں۔''

ایک اور سردار نے تجویز پیش کی کہ اسے مکہ سے نکال دیا جائے۔ نجدی شیخ نے یہ تجویز بھی رد کر دی اور کہا: ''اس رسول کی زبان کی مٹھاس اور لہجے کی حلاوت دلوں کو فتح کر لے گی۔ اس طرح وہ لوگوں کو اپنے پیچھے لگا کر تم پر غالب آ جائے گا۔'' آخر کار ابوجہل لعین نے تجویز پیش کی کہ ہر قبیلے سے ایک اعلیٰ نسب، بلند مرتبہ اور سجیلا نوجوان چنا جائے اور ان میں سے ہر ایک کو تیز طرار تلوار دی جائے۔ وہ سب کے سب مل کر یکبارگی محمد (ﷺ) پر اس طرح ٹوٹ پڑیں کہ ہر ایک کی تلوار اس کے جسم میں پیوست ہو جائے۔ اس طرح اس کا خون تمام قبائل میں تقسیم ہو جائے گا۔ محمد کا خاندان بنوعبد مناف پوری قوم قریش سے ٹکر نہیں لے سکے گا۔ مجبوراً وہ دیت پر راضی ہو جائیں گے اور ہم بخوشی دیت ادا کر دیں گے۔ نجدی شیخ نے اس تجویز کی پرزور تائید کی جس پر سب متفق ہو گئے اور یہ

[1] سہیلی کا بیان ہے کہ ابلیس نے اپنا تعلق نجد سے اس لیے بتایا کہ قریش نے پہلے سے طے کر رکھا تھا کہ تمھارے ساتھ مشاورت میں تہامہ کا کوئی آدمی شریک نہ ہونے پائے کیونکہ ان کے دل محمد (ﷺ) کے ساتھ ہیں، دیکھیے: (الروض الأنف: 229/2)

طے کر کے اجلاس برخواست ہو گیا۔ اب انھیں عمل درآمد کی مہم درپیش تھی۔ [1]

ہجرت کی اجازت، منصوبہ بندی اور اس کا آغاز

جب یہ قرار داد پاس ہو چکی تو حضرت جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کفار کے اس فیصلے کی اطلاع دی۔ انھوں نے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کا حکم سنایا اور آگاہ کیا کہ آپ رات کو اپنے بستر پر نہ سوئیں۔

امام بخاری اور طبری نے ابن اسحاق کی روایت بیان کی ہے کہ جونہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم ملا آپ فوراً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف چل دیے۔ آپ نے اپنا سر کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ نصف النہار کا وقت تھا اور کڑاکے کی دھوپ پڑ رہی تھی۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم عموماً ابوبکر کے گھر نہیں جاتے تھے۔ جب ابوبکر کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی اطلاع دی گئی تو وہ سمجھ گئے کہ اس وقت اور اس حالت میں آپ یقیناً کسی نہایت اہم مقصد کے لیے تشریف لائے ہیں، چنانچہ وہ فوراً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال کے لیے لپکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو دیکھتے ہی فرمایا کہ غیر متعلقہ افراد کو اِدھر اُدھر کر دو تا کہ کسی کو راز کا پتہ نہ چلے۔ حضرت ابوبکر نے آپ کو اطمینان دلایا کہ گھر میں کوئی بھی غیر متعلقہ فرد نہیں اور جو موجود ہیں وہ رسول اللہ کے گھر والے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو بتایا کہ مجھے ہجرت کا حکم مل چکا ہے۔ حضرت ابوبکر نے درخواست کی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تاکید سے وہ حکم بھی بتایا جو آپ کو اس سے پہلے مل چکا تھا (کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کریں گے) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے

[1] اس روایت میں قریش کے اجتماع کے وقت کا تعین نہیں کیا گیا کہ یہ دن کو منعقد ہوا تھا یا رات کو۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ قتل کی قرار داد پاس ہونے اور اس پر عمل درآمد کی شروعات میں کتنے دنوں کا فاصلہ تھا۔

رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں دو اونٹنیاں پیش کیں اور عرض کی کہ ان دونوں میں سے کوئی اونٹنی آپ لے لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات قبول کی مگر اس شرط پر کہ اونٹنی کی قیمت ادا کریں گے۔ [1]

ابوبکر رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ سے یہ کہنا کہ جو موجود ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کے گھر والے ہیں، اس سے ان کی مراد حضرت عائشہ اور اسماء تھیں۔ یہ دونوں مسلمان تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ کا نکاح بھی ہو چکا تھا۔ وہ آپ ﷺ کی بیوی تھیں، لہٰذا ان دونوں سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ امام مغازی موسیٰ بن عقبہ نے اپنی روایت میں صراحت سے بتایا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہاں کوئی اور ہے تو اسے باہر بھیج دو'' تو حضرت ابوبکر نے عرض کی: ''یہاں کوئی جاسوس نہیں، صرف میری دو بیٹیاں ہیں۔'' زہری کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''اس وقت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے پاس میرے اور اسماء کے سوا کوئی نہ تھا۔'' [2] ابن اسحاق کی روایت میں بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے یہی

---

[1] صحیح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ و أصحابه إلى المدينة، حديث: 3905. یہ سارا واقعہ ابن اسحاق نے بلاسند بیان کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 140/2) امام احمد اور حاکم نے اسے صحیح سند کے ساتھ بیان کیا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی، دیکھیے: (مسند أحمد: 25/5، والمستدرك للحاكم: 4/3) ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے گھر آئے اور دیکھا کہ علی رضی اللہ عنہ آپ کے بستر پر سو رہے ہیں۔ ابوبکر نے سمجھا کہ یہ نبی ﷺ ہیں۔ بعد ازاں علی رضی اللہ عنہ نے انھیں بتایا کہ نبی ﷺ بئر میمون کی طرف گئے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کو جا ملے اور آپ کے ساتھ غار کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس روایت اور بخاری کی روایت کو آپس میں یوں جمع کیا جا سکتا ہے کہ نبی ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف دوپہر کے وقت اس دن آئے جس رات کو مشرکین نے آپ کے گھر کا محاصرہ کیا تھا، پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے گھر گئے تو آپ کو موجود نہ پایا۔ بعد میں جب علی رضی اللہ عنہ نے انھیں بتایا تو وہ بئر میمون پر رسول اللہ ﷺ سے جا ملے۔ وہاں سے دونوں غار کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ بات دکتور عودہ نے کہی ہے، دیکھیے: (السيرة في الصحيحين، ص: 403، وتاريخ الطبري: 2/377-379) سند حسن ہے۔ [2] فتح الباري: 89،88/15.

الفاظ منقول ہیں: ''یہ میری دو بیٹیاں ہی تو ہیں۔'' [1]

اس ملاقات میں ہجرت کے طریق کار پر غور ہوا تا کہ کفار کا منصوبہ ناکام ہو جائے۔ امام بخاری اور ابن اسحاق کے مطابق طریق کار یوں طے پایا:

* رات کے وقت مکہ مکرمہ سے جنوب مغرب کی جانب نکل چلیں اور غار ثور میں جا ٹھہریں۔ [2] اس حکمت عملی کا مقصد کفارِ مکہ کو اندھیرے میں رکھنا تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرنے کے لیے ان کی تگ و دو کا رخ مدینہ منورہ کی جانب ہوتا جو مکہ مکرمہ سے شمال کی جانب ہے۔
* تین دن تک غار ہی میں رہیں تا کہ ان کی تلاش و جستجو کی کوششیں ماند پڑ جائیں۔ [3]
* صحرائی راستوں سے گہری واقفیت رکھنے والے ماہر گائیڈ عبداللہ بن اُرَیقِد (38) دِیلی سے اجرت طے کر لی جائے تا کہ وہ اپنی رہنمائی میں انھیں مدینہ پہنچائے۔ یہ شخص مشرک تھا۔ اسے تاکید کر دی گئی کہ وہ اس منصوبے کو راز ہی رکھے اور تین دن کے بعد

(38) اُرَیقِد: دکتور سلیمان العودہ کا کہنا ہے کہ یہ نام ''اُرَیقِد'' اسکوریال لائبریری، اسپین میں موجود سیرت ابن ہشام کے بنیادی مخطوطے (ق 46/ب) میں اسی طرح ''دال'' کے ساتھ لکھا ہے۔ ابن ہشام کے مطبوعہ نسخوں میں ''أُرَيقِط'' لکھا ہے جو شاید پروف کی غلطی ہے۔ اہل سیر کے ہاں مشہور ''أُرَيقِطَ'' ہی ہے۔ میں (مصنفِ کتاب) کہتا ہوں کہ تاریخ طبری کے مطبوعہ نسخے میں ''أُرقُد'' ہی لکھا ہے۔ طبری میں یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند حسن ہے، دیکھیے: (تاریخ الطبري: 380/2) محقق کا کہنا ہے کہ یہ نام ''ارقد'' تاریخ طبری کے مخطوطے میں بھی اسی طرح لکھا ہے، دیکھیے: (السیرۃ ◄◄

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 142/2. اس کی سند میں ابن ہشام سے بیان کرنے والا راوی مبہم ہے۔ بقیہ رجال ثقہ ہیں۔ طبری نے اپنی کتاب تاریخ میں اسے ابن اسحاق کی روایت سے متصل سند کے ساتھ بیان کیا ہے جو حسن درجے کی ہے، دیکھیے: (تاریخ الطبري: 378/2) [2] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3905. [3] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3905، و تاريخ الطبري: 378/3. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند حسن ہے۔

غارِ ثور کے دہانے پر آجائے۔ حضرت ابوبکر نے اپنی دونوں اونٹنیاں بھی اسی کے حوالے کر دیں جنھیں خاص اس مقصد کے لیے خرید کر پالا گیا تھا۔ [1]

* حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ان کے کھانے پینے کا سامان ایک خورجین میں ڈال دیا، پھر اپنے کمر بند کا ایک حصہ کاٹ کر اس سے خورجین کا منہ باندھ دیا۔ اسی بنا پر انھیں ''ذات النطاق'' [2] یا ''ذات النطاقین'' [3] کا معزز لقب حاصل ہوا۔

* حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو تاکید کی کہ وہ دن کو مکہ والوں کی باتیں توجہ سے سنتا رہے اور رات کو غار میں آکر ان سے مطلع کر دیا کرے اور صبح سے پہلے پہلے دوبارہ مکہ پہنچ جایا کرے تاکہ قریش کو کوئی شک نہ پڑے۔ [4]

* حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام عامر بن فہیرہ کو تاکید کی کہ دن بھر بکریاں چراتا رہے۔ شام کو غار کی طرف آجائے تاکہ تازہ دودھ پیا جا سکے اور ضرورت پڑے تو

» الشامیة: 346/3) محدث ذہبی نے عبداللہ بن اُرَیقط کا ذکر صحابہ میں کیا ہے، دیکھیے: (التجرید: 299/1) ابن حجر نے لکھا: ''ذہبی کے علاوہ مجھے کوئی مؤرخ نہیں ملا جس نے اس کا ذکر صحابہ میں کیا ہو۔'' دیکھیے: (الإصابة: 274/2) ابن اثیر نے لکھا: ''ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ وہ عبداللہ بن اُرَیقط کے مسلمان ہونے کے متعلق نہیں جانتے۔'' دیکھیے: (منال الطالب، ص:177)

[1] صحیح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3905. [2] صحیح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3905. [3] صحیح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3907 . یہ اسماء رضی اللہ عنہا کی روایت ہے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ اسماء رضی اللہ عنہا نے اپنا کمر بند چاک کیا۔ اس کے ایک چیتھڑے سے خورجین کو باندھا اور دوسرے سے مشکیزے کا منہ باندھ کر بند کر دیا۔ اس لیے انھیں ''ذات النطاقین'' کہا گیا۔ یہ واقدی کی روایت ہے، دیکھیے: (الطبقات الکبریٰ: 229/1) ابن اسحاق اور ابن ہشام نے بھی ''ذات النطاقین'' کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے۔ دونوں کا بیان بلاسند ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 144/2) [4] صحیح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3905، والسيرة النبوية لابن هشام: 143/2. ابن اسحاق کی یہ روایت بلاسند ہے۔

کوئی بکری ذبح بھی کی جا سکے۔ بکریوں کے آنے جانے سے عبداللہ بن ابی بکر کے نشانات قدم بھی مٹتے رہیں گے۔ [1]

* حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے کہا گیا کہ وہ ہر شام ضرورت کے مطابق کھانا لاتی رہیں۔ [2]
* بعد میں رسول اللہ ﷺ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف تشریف لے گئے اور انھیں تاکید فرمائی کہ تم میرے بعد مکہ میں ٹھہرنا اور میرے پاس لوگوں کی جو امانتیں رکھی ہیں انھیں واپس کر دینا۔ مکہ والوں میں سے جس کے پاس بھی کوئی قیمتی چیز ہوتی اور جس کے بارے میں اسے چوری یا خیانت کا خدشہ ہوتا، وہ اُسے رسول اللہ ﷺ کے پاس بطور امانت رکھ دیتا تھا کیونکہ وہ تمام لوگ آپ کے صدق و امانت کا کامل یقین رکھتے تھے۔ [3]
* آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ میری سبز حضرمی (حضرموت کی بنی ہوئی) چادر اوڑھ کر میرے بستر پر لیٹ جاؤ۔ آپ ﷺ خود اسی چادر میں سویا کرتے تھے۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطمینان دلایا کہ تمھیں ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ [4]

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3905، والسيرة النبوية لابن هشام: 143/2. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 143/2. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 142/2. ابن اسحاق کی یہ روایت بلاسند ہے۔ طبری نے اسے متصل سند سے بیان کیا ہے۔ اگر ہم طبری کی روایت کے اس جملے: فِيمَا بَلَغَنِي (ان باتوں میں سے جو مجھے پہنچیں) کو ایسے راوی سے خاص سمجھیں جسے رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہو تو روایت حسن قرار پاتی ہے، دیکھیے: (تاريخ الطبري: 378/2) [4] احمد نے بسند حسن روایت کیا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ اس رات نبی ﷺ کے بستر پر سوئے۔ احمد کی روایت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں، دیکھیے: (مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 87/5) حاکم کا بیان ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے بستر پر رات گزاری۔ حاکم نے علی رضی اللہ عنہ اور مشرکین کے درمیان ہونے والا مکالمہ بھی نقل کیا ہے جبکہ مشرکین نے انھیں دیکھا اور پہچان لیا تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے بستر پر بالکل اسی طرح سو رہے تھے جیسے رسول اللہ ﷺ سویا کرتے تھے، دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 4/3) اسے ابن اسحاق نے منقطع سند سے روایت کیا ہے جو شواہد (تائیدی روایات) کی بنا پر حسن ہے۔

آپ نے یہ سب کچھ کافروں کو اپنی ہجرت سے بے خبر رکھنے کے لیے کیا۔

* حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عامر بن فہیرہ سے کہا کہ تم بھی ہجرت میں ہمارے ساتھ ہی چل دینا تاکہ راستے میں خدمت وتعاون کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم تیرہ سالہ دورِ نبوت کے بعد دیا[2] اور ہجرت کے حکم کے ساتھ ہی یہ آیت بھی نازل فرمائی:[3]

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا﴾

''اور کہیے: اے میرے رب! مجھے (جہاں لے جائے تو) سچائی کے ساتھ لے جا اور (جہاں سے نکالے تو) سچائی کے ساتھ نکال اور مجھے اپنے پاس سے مدد کرنے والا غلبہ عطا کر۔''[4]

اس مختصر اور نہایت بلیغ دعا کو آپ کے لیے منتخب فرمانا آپ کے دلی اطمینان کے لیے کافی وشافی تھا۔

دوسری جانب قریش کے سرداروں نے مختلف قریشی قبائل سے گیارہ ایسے نمائندے منتخب کر لیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے سخت مخالف تھے۔ ان کا سارا دن دارالندوہ کی قرار داد پر عملدرآمد کی تیاریوں میں گزرا۔

ہر چند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار مکہ کی مذموم قرار داد کا علم ہو چکا تھا اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انتہائی عظیم الشان ایمانی کارنامہ انجام دیا ہے جسے آج کل کی مادی

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3905. [2] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3902. [3] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 291/3. احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا۔ دیگر محدثین نے بھی اس روایت کو صحیح سند سے بیان کیا ہے۔ [4] بنيٓ إسرآء يل 80:17.

لغت میں ''فدائی حملہ'' کہا جا سکتا ہے۔ امام ذہبی نے تو اسے ''منکر'' کہا ہے۔اور وہ کارنامہ یہ ہے کہ رات ہوئی تو رسول ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیا، کعبہ پہنچے اور حضرت علی سے فرمایا: ''میرے کندھوں پر سوار ہو جاؤ، بیت اللہ کے اوپر چڑھو اور قریش کا بڑا بت (جسے پیتل سے بنایا گیا تھا اور لوہے کے کیلوں سے چھت پر نصب کیا گیا تھا) اکھاڑ پھینکو۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اس بت کو توڑ پھوڑ رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے:

﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۝﴾

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، یقیناً باطل مٹنے ہی والا ہے۔'' [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اچھی طرح توڑ پھوڑ کر کے اس بت کو اکھاڑ پھینکا، پھر دونوں چل دیے۔ انھیں کسی نے بھی نہ دیکھا، اس کے بعد وہ بت بیت اللہ پر کبھی نصب نہ کیا جا سکا۔ [2]

ہمارا خیال ہے کہ آپ کی یہ کارروائی معجزاتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رسول اللہ ﷺ پر عنایات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جب رات آدھی ڈھل گئی تو منصوبۂ قتل پر عمل درآمد کے ذمہ دار لوگ رسول اللہ ﷺ کے دروازے پر اکٹھے ہو گئے اور آپ کے جاگنے کا انتظار کرنے لگے تاکہ جونہی آپ باہر نکلیں وہ آپ پر ٹوٹ پڑیں۔ ابو جہل بھی اس کارروائی کی نگرانی اور ان جوانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے موجود تھا اور اس وقت بھی رسول اللہ ﷺ کو مذاق کا نشانہ بنا رہا

[1] بني إسرآء يل 81:17. [2] المستدرك للحاكم: 2/5، 2/366، 367. یہ روایت کئی سندوں سے نقل ہوئی اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ذہبی کا کہنا ہے کہ اس کی سند نظیف اور متن منکر ہے۔ ابواسحاق حوینی اثری نے اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ اس میں ایک راوی ابو مریم ثقفی ہے جو ابواسحاق حوینی کے نزدیک مجہول ہے، دیکھیے: (خصائص أمير المؤمنين علي بن أبي طالب للنسائي، ص: 113) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی التقریب میں اسے مجہول کہا ہے۔

تھا۔ اس کا مقصد تھا کہ جوان کہیں نرم نہ پڑ جائیں، چنانچہ وہ اُن سے کہہ رہا تھا: ''محمد (ﷺ) کہتا ہے کہ اگر تم اس کے پیچھے لگ جاؤ تو تم عرب و عجم کے بادشاہ بن جاؤ گے، پھر تمھیں مرنے کے بعد زندہ کیا جائے گا اور تمھیں سرزمین اردن جیسے زرخیز باغات اور شاداب جنتیں دی جائیں گی۔ اگر تم نے اس کی بات نہ مانی تو تم میں قتل اور غارت گری کا سلسلہ جاری ہوگا، پھر تم مرنے کے بعد زندہ کیے جاؤ گے اور تم پر آگ مسلط کر دی جائے گی جس میں ہمیشہ جلتے بھنتے رہو گے۔''[1]

وہ ابھی یا وہ گوئیوں میں مصروف تھے کہ رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے۔ آپ ﷺ ابوجہل کی باتیں سن چکے تھے، آپ نے مٹی کی ایک مٹھی اٹھائی اور فرمایا: ''ہاں، ہاں میں یہی کہتا ہوں اور تو بھی جہنم جانے والوں میں سے ایک ہے۔'' پھر آپ ﷺ ان کے سروں پر مٹی پھینکتے ہوئے نکل گئے۔ وہ آپ ﷺ کو دیکھ نہ سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نگاہوں کو پکڑ لیا تھا اور رسول اللہ ﷺ سورۂ یٰسٓ کی (پہلی نو) آیات تلاوت فرماتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔[2]

علامہ سہیلی نے لکھا: ''بعض مفسرین نے یہ اشکال دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ باوجود دیوار چھوٹی ہونے کے کفار دیوار پھلانگ کر اندر کیوں نہیں گئے؟ وہ باہر کھڑے انتظار کیوں کرتے رہے؟ جبکہ ان کا مقصد ہی آپ ﷺ کو قتل کرنا تھا؟ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ انھوں نے دیوار پھلانگنے کا ارادہ کیا تھا مگر گھر کے اندر سے کوئی خاتون للکارنے لگی۔

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 139/2. ابن اسحاق نے اسے حسن مرسل سند سے روایت کیا ہے جو محمد بن کعب قرظی پر موقوف ہے۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 143/2. ابن اسحاق کی یہ روایت بلاسند ہے۔ اس روایت میں یہ بیان بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ وہاں سے نکل کر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر گئے، پھر دونوں دارِ ابوبکر کے عقبی پھاٹک کے چھوٹے در سے سمٹ سمٹا کر نکلے اور زیرین مکہ میں غارِ ثور کی طرف روانہ ہو گئے۔ غارِ ثور کی طرف روانہ ہونے کی یہ کیفیت اس سے مختلف ہے جس کا ذکر پہلے گزرا۔

وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! یہ تو بڑے عار اور ذلت کی بات ہے کہ ہمارے بارے میں عرب میں یہ مشہور ہو جائے کہ ہم نے اپنے قبیلے کی چچا زاد عورتوں کی دیوار پھلانگی ہے اور ہم نے چادر اور چار دیواری کا تقدس پامال کیا ہے۔ یہی وجہ تھی جس کی بنا پر وہ دروازے ہی پر کھڑے رہے اور صبح تک آپ کے نکلنے کا انتظار کرتے رہے لیکن جب آپ ﷺ تشریف لائے تو ان کی آنکھیں جواب دے گئیں ......''[1] لیکن علامہ شامی کی عبارت یوں ہے: ''......بعض اہل سیر نے یہ اشکال دور کرنے کی کوشش کی ہے......''[2]

گویا شامی یہ بات مفسرین کے بجائے اہل سیر کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔

بہر حال ادھر سے ابو بکر بھی نکل آئے۔ وہ آتے وقت اپنا سارا مال بھی لیتے آئے جو پانچ یا چھ ہزار درہم تھا۔[3]

غار ثور کی طرف جاتے ہوئے جبکہ ابھی تک مکہ مکرمہ آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا تھا، آپ ﷺ رکے اور مڑ کر اپنی یادوں کی امین سرزمین کی طرف محبت بھری الوداعی نظر ڈالی۔ اس نظر میں کیا کچھ نہ تھا؟ اس میں آپ کی گزشتہ زندگی کی ساری یادیں اور تمام اسرار و رموز سمٹے ہوئے تھے۔ آخر آپ کو مکہ مکرمہ سے محبت کیوں نہ ہوتی جبکہ اللہ تعالیٰ کو اس سے محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وہاں اپنا مقدس گھر بنوایا اور تمام جہانوں کی طرف اپنا آخری پیغام بھیجنے کے لیے آپ ﷺ کو اس شہر میں مبعوث فرمایا۔ آپ کچھ دیر کھڑے اپنے وطن مالوف کو دیکھتے رہے۔ اس وقت آپ ﷺ کی زبان مقدس پر یہ الفاظ تھے:

«وَاللّٰهِ! إِنَّكِ لَخَيْرُ أَرْضِ اللّٰهِ وَأَحَبُّ أَرْضِ اللّٰهِ إِلَى اللّٰهِ، وَلَوْلَا أَنِّي أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ»

''اللہ کی قسم! (اے سرزمین مکہ!) تو اللہ تعالیٰ کی تمام زمین سے افضل اور اللہ کے

---

[1] الرّوض الأنف: 229/2. [2] سُبُل الهدٰى والرّشاد: 329/3. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 152/2. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند حسن ہے۔

نزدیک تمام زمین سے زیادہ محبوب ہے۔ اگر مجھے نکلنے پر مجبور نہ کر دیا جاتا تو میں یہاں سے کبھی نہ جاتا۔''[1]

ایک دوسری روایت کے الفاظ یوں ہیں:

«مَا أَطْيَبَكِ مِنْ بَلَدٍ وَّ أَحَبَّكِ إِلَيَّ، وَلَوْلَا أَنَّ قَوْمِي أَخْرَجُونِي مِنْكِ مَا سَكَنْتُ غَيْرَكِ»

''(اے پیارے شہر!) تو کس قدر پاکیزہ ہے اور مجھے کس قدر محبوب ہے! اگر میری قوم مجھے نکلنے پر مجبور نہ کر دیتی تو میں تجھے چھوڑ کر کسی اور شہر میں بسنے کا نام بھی نہ لیتا۔''[2]

ادھر وہ مٹی کے مادھو، باولے، دروازے ہی پر جمے کھڑے تھے۔ کسی نے دیکھا تو پوچھا: ''یہاں کیوں کھڑے ہو؟'' انھوں نے اپنا پروگرام بتایا تو وہ بولا: ''محمد (ﷺ) تو جا چکے ہیں۔'' لیکن انھوں نے اس کی بات کا یقین ہی نہیں کیا کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کے بستر مبارک پر آپ کی چادر اوڑھے علی کو لیٹے دیکھ کر مطمئن تھے اور یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ محمد (ﷺ) لیٹے ہوئے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے پردہ اس وقت اٹھا جب صبح کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ اطمینان کے ساتھ بستر سے اٹھے۔[3] ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور وہ گھبراہٹ میں رسول اللہ ﷺ کو ڈھونڈنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ تلاشی مہم

[1] جامع الترمذي، المناقب، باب في فضل مكة، حديث: 3925. علامہ البانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ [2] جامع الترمذي، المناقب، باب في فضل مكة، حديث: 3926. علامہ البانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ [3] السيرة النبوية لابن هشام: 139/2. ابن اسحاق کی یہ روایت مرسل سند سے ہے۔ روایات کے جائزے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مشرکین کے رسول اللہ ﷺ کے خلاف سازش کرنے اور علی رضی اللہ عنہ کے آپ ﷺ کے بستر پر رات گزارنے کا واقعہ شواہد و متابعات (تائیدی روایات) کی بنا پر قوی ہے۔

کی تفصیل یہ ہے:

* انھوں نے فوراً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جا پکڑا۔ انھیں مارا پیٹا اور کھینچتے گھسیٹتے کعبہ میں لے گئے۔ کچھ دیر ان کو قید بھی رکھا تا کہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکیں جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری میں مدد ملے۔ لیکن وہ بے فائدہ سر کھپاتے رہے۔ علی رضی اللہ عنہ سے انھیں کچھ نہ مل سکا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی سراغ نہ پا سکے۔ [1]

* کچھ پہلوان ابو بکر کے گھر کی طرف بھاگے، ان میں ابو جہل بھی تھا۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ اگر ابو بکر گھر میں مل جائیں تو ان سے بھی وہی سلوک کریں جو علی سے کیا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو ان کی بیٹی اسماء نکلیں، ان سے پوچھنے لگے: ''ابو بکر کہاں ہیں؟'' وہ بولیں: ''مجھے کیا پتہ کہاں ہیں؟'' ابو جہل یہ جواب سن کر بھونچکا رہ گیا اور غصے میں انھیں اس زور سے تھپڑ مارا کہ ان کی بالی کان سے دور جا گری۔ [2]

* پھر انھوں نے مکہ سے نکلنے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی اور سخت نگرانی شروع کر دی۔

* اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو زندہ یا مردہ ڈھونڈ نکالے اسے ان دونوں کی مجموعی دیت دو سو اونٹ بطور انعام دی جائے گی۔ [3]

* ماہر کھوجی بلائے گئے اور انھیں بھاری معاوضے کا لالچ دیا گیا تا کہ نقوش قدم دیکھ کر

---

[1] صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے الرحیق المختوم میں یہ روایت سید سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ کی رحمۃ للعالمین کے حوالے سے نقل کی ہے۔ ہمیں معلوم نہیں ہو سکا کہ اس سلسلے میں منصور پوری کا ماخذ کیا ہے۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 245/2. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند منقطع ہے۔

[3] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3906. ابن اسحاق نے حسن سند سے روایت کی ہے کہ قریش نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ کر لانے والے کے لیے سو اونٹنیوں کا اعلان کیا تھا، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 152/2)

کھوج لگایا جائے کہ وہ کدھر چلے گئے؟ [1]

غارِ ثور کی طرف روانگی

امام بیہقی اور دیگر محدثین کا بیان ہے کہ جب دونوں غارِ ثور کی طرف جا رہے تھے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کچھ دیر رسول اللہ ﷺ کے آگے چلتے تھے اور کچھ دیر پیچھے۔ جب آپ ﷺ کو اس کا احساس ہوا تو دریافت فرمایا: ''ابو بکر! ایسا کیوں کرتے ہو؟'' انھوں نے عرض کی: ''اللہ کے رسول! جب مجھے پیچھا کرنے والوں کا خیال آتا ہے تو میں پیچھے چلنا شروع کر دیتا ہوں، پھر خیال آتا ہے کہ کوئی شخص راستے میں گھات لگائے نہ بیٹھا ہو تو میں آگے چلنا شروع کر دیتا ہوں۔'' آپ نے فرمایا: ''ابو بکر! صرف اس لیے کہ اگر کوئی نقصان ہو تو تمھارا ہو اور میں بچ جاؤں؟'' ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''ہاں، یہی مقصد ہے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا نبی بنایا ہے! کوئی آفت اور مصیبت ہو تو میری یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ مجھے پہنچ جائے اور آپ محفوظ رہیں۔'' [2]

[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حافظ ابو سعید نے شرف المصطفی میں لکھا ہے کہ مشرکین نے مشہور کھوجی کُرز بن علقمہ کی خدمات حاصل کیں۔ وہ کھوج لگاتے لگاتے غارِ ثور تک پہنچ گیا۔ غار کے دروازے پر مکڑی نے جالا بن رکھا تھا۔ وہ حیران ہو کر کہنے لگا: ''یہاں پہنچ کر نشانات ختم ہو جاتے ہیں۔ یہاں سے آگے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ دائیں گئے یا بائیں یا پہاڑ پر چڑھ گئے ہیں؟'' دیکھیے: (الإصابة :293/3) [2] دلائل النبوة للبيهقي: 476/2، والمستدرك للحاكم: 6/3. حاکم کا کہنا ہے کہ اگر یہ سند مرسل نہ ہو تو صحیح ہے اور شیخین کی شرائط پر پورا اترتی ہے۔ ابن حجر نے یہ روایت نقل کر کے بتایا ہے کہ بغوی نے اسی نوع کی روایت ابن ابی مُلَیکہ کی مرسل سند سے بیان کی ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 91/15) ابن ہشام نے بھی اس جیسی ایک بلاغی روایت اختصار سے نقل کی ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 143/2) ابن کثیر نے اس روایت کو امام بغوی کے حوالے سے نقل کرنے کے بعد لکھا: ''یہ روایت مرسل ہے۔'' دیکھیے: (البداية والنهاية: 197/3) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی سیرت کے ضمن میں ہم نے اس کے دیگر شواہد (تائیدی روایات) بھی بیان کیے ہیں۔ میں (مصنفِ کتاب) ◄◄

وہ حدیث جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے اور جس میں یہ ہے: ''اللہ کے رسول ﷺ رات کے وقت مکہ مکرمہ سے نکلے تو آپ کے ساتھ ابوبکر بھی تھے۔ وہ کبھی آپ کے آگے چلتے اور کبھی پیچھے تاکہ آپ کی حفاظت کر سکیں۔ اسی دوران میں رسول اللہ ﷺ کے قدم مبارک زخمی ہو گئے تو انھوں نے آپ ﷺ کو کندھوں پر اٹھالیا اور غار کے دہانے تک پہنچایا، پھر غار کے سوراخ اپنی ایڑیوں سے بند کیے۔ رسول اللہ ﷺ ان کی گود میں سر رکھے آرام فرما رہے تھے کہ سانپوں نے ڈسنا شروع کر دیا مگر انھوں نے اپنے پاؤں نہ ہلائے۔ درد کی شدت سے ان کے آنسو رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور پر گرنے لگے......''

اس روایت کے بارے میں امام ذہبی کا کہنا ہے کہ یہ منکر (سخت ضعیف) ہے۔[1] امام بیہقی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد سکوت کیا ہے۔[2] انھوں نے یہ حدیث یحییٰ بن ابی طالب کی سند سے بیان کی ہے اور وہ عبدالرحمٰن بن ابراہیم راسبی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ اس حدیث میں سقم اسی راسبی کی طرف سے ہے کیونکہ یہ ثقہ اور معتبر نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مجہول بھی ہے۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں اس کا تذکرہ کر کے اس پر تنقید کی ہے۔

حافظ ابن کثیر نے بیہقی کی یہ روایت بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: ''یہ غریب اور منکر ہے۔''[3] دکتور سلیمان السعود نے حافظ ابن کثیر کا یہ قول نقل کرنے کے بعد تائیداً لکھا: ''حافظ ابن کثیر کی بات صحیح ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی فرات بن سائب ہے جسے ابوحاتم اور ابوزرعہ جیسے ائمۂ فن نے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام ابوحاتم نے اُسے منکر الحدیث (جس کی حدیث سخت ضعیف ہو) کہا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا: ''محدثین نے اس سے روایت نہیں کی۔ اس کی حدیث منکر ہوتی ہے۔'' بنا بریں یہ روایت ضعیف اور

◄◄ کتاب) کہتا ہوں کہ یہ حدیث شواہد کی بنا پر قوی ہے۔ [1] تاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي، ص: 321. [2] دلائل النبوة للبيهقي: 477/2. [3] البداية والنهاية: 198/3.

غیر معتبر ہے۔"[1]

غارِ ثور

جب رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غار تک پہنچ گئے تو ابوبکر نے عرض کی: "اللہ کے رسول! باہر تشریف رکھیے تاکہ میں غار کا اچھی طرح جائزہ لے لوں کہیں کوئی موذی چیز نہ ہو۔" پھر وہ اندر داخل ہوئے اور اچھی طرح جائزہ لیا۔ باہر آئے تو یاد آیا کہ میں نے اس سوراخ کا تو کوئی بندوبست ہی نہیں کیا جو غار کے درمیان میں ہے، اس لیے پھر بولے: "اللہ کے رسول! ابھی ٹھہریے۔" پھر دوبارہ داخل ہوئے اُسے اچھی طرح بند کیا اور درخواست کی: "اللہ کے رسول! اب تشریف لائیے۔" تب آپ غار میں داخل ہوئے۔[2]

اُدھر قریش نے نبی ﷺ کی تلاش میں ہر طرف گھوڑے دوڑا دیے۔ راستے میں کنوؤں پر آباد قبائل کو بھی خبردار کر دیا اور انھیں بھاری لالچ دیا اور خود کھوج لگاتے ہوئے غارِ ثور والے پہاڑ تک جا پہنچے بلکہ اوپر بھی چڑھ گئے اور وہاں جا پہنچے جہاں رسول اللہ ﷺ موجود تھے۔ آپ ان کی آوازیں صاف سن رہے تھے۔ ابوبکر کو خدشہ لاحق ہوا اور ان کے چہرے پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔ انھوں نے کہا: "اللہ کے رسول! اگر ان میں سے کسی نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھ لیا تو اس کی نظر نیچے پڑتے ہی ہم تک آ پہنچے گی۔" نبیِ کریم ﷺ نے ایسے خطرناک موقع پر کمال اطمینان سے فرمایا: "ابوبکر! ان دو اشخاص کے بارے میں

---

[1] رسالة الهجرة للدكتور سليمان السعود، ص: 169. [2] بیہقی نے اس روایت کو مرسل سند سے نقل کیا ہے۔ مرسل اس لیے کہ یہ ابن سیرین پر موقوف ہے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 476/2) اس کے بارے میں تفصیل گزر چکی ہے، دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 6/3) حاکم کا کہنا ہے کہ اگر یہ سند مرسل نہ ہوتو یہ حدیث صحیح ہے اور شیخین کی شرط پر پورا اترتی ہے۔ اس کے باوجود شیخین نے اسے نقل نہیں کیا۔ ذہبی نے حاکم کی موافقت کی ہے۔

کیوں پریشان ہوتے ہو جن کے ساتھ تیسرا ''اللہ'' ہے۔''[1]

اسی واقعے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا:

﴿ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾

''اگر تم اس (نبی) کی مدد نہیں کرو گے تو بلاشبہ اللہ نے اس وقت بھی اس کی مدد کی تھی جب کافروں نے اسے اس حال میں نکال دیا تھا کہ وہ (نبی) دو میں سے دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا: غم نہ کیجیے، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے نبیِ کریم ﷺ کو غار میں ہر پریشانی اور تکلیف سے محفوظ رکھا۔ مسند احمد کی ایک روایت سے بھی بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اور آپ کے ساتھی کی خصوصی طور پر حفاظت فرمائی۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''قریش جب کھوج لگاتے لگاتے ثور پہاڑ کے پاس پہنچے تو قدموں کے نشانات ختم ہو گئے۔ وہ پہاڑ پر چڑھ گئے حتی کہ غار کے پاس سے گزرے۔ غار کے دروازے پر مکڑی کا جالا بنا ہوا نظر آیا۔ کہنے لگے: ''اگر کوئی غار میں داخل ہوا ہوتا تو مکڑی کا جالا باقی نہ رہتا۔''[3]

[1] صحيح البخاري، التفسير، باب قوله: ﴿ ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ ...... ﴾، حديث: 4663، وصحيح مسلم، فضائل الصّحابة، باب من فضائل أبي بكر الصّديق ﷺ، حديث: 2381۔ [2] التوبة 40:9. اس آیت کی شانِ نزول کے متعلق وارد ہونے والی روایات کے لیے دیکھیے: (تفسير الطبري (تحقيق أحمد شاكر): 4/257-260) شیخین نے یہ واقعہ اس آیت کی شانِ نزول کے طور پر بیان کیا ہے۔
[3] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 87/5. احمد شاکر کا کہنا ہے: ''اس کی سند محلِ نظر ہے کیونکہ اس میں عثمان جزری ہے جسے ابن حبان نے ثقہ اور دیگر ائمہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ بقیہ رجال صحیح کے رجال ہیں۔'' ابن کثیر نے یہ روایت نقل کر کے لکھا: ''یہ سند حسن ہے۔'' دیکھیے: (البداية والنهاية: 199,198) حافظ ابن حجر نے اسے حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 90/15)

اس جیسی روایت حسن بصری سے بھی آئی ہے۔ اس میں یہ زائد الفاظ بھی ہیں کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پہرہ دے رہے تھے۔[1] غار والے دن خیر و عافیت سے گزرے، البتہ ایک روایت میں ہے کہ ایک پتھر رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر آلگا جس سے انگلی زخمی ہوگئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

هَلْ أَنْتِ إِلَّا إِصْبَعٌ دَمِيتِ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ مَا لَقِيتِ

''اے انگلی! کوئی بڑی تکلیف نہیں آئی صرف تو زخمی ہوئی ہے اور پھر یہ تکلیف تو تجھے اللہ کے راستے میں پہنچی ہے۔''[2]

ہجرت کے بارے میں ضعیف روایات

غار ثور میں نبیٔ اکرم ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے قیام کے بارے میں بعض ضعیف روایات بھی آئی ہیں جن میں سے چند مشہور روایات یہ ہیں:

* ابن سعد اور بزار کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک درخت کو حکم دیا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے چہرے کے سامنے اگ آیا اور اس کی شاخوں نے آپ کا چہرہ ڈھانپے رکھا۔ ایک مکڑی کو حکم دیا اس نے آپ کے چہرۂ انور کے سامنے جالا بن دیا اور اسے چھپا دیا، پھر اللہ تعالیٰ نے دو جنگلی کبوتروں کو حکم دیا۔ وہ غار کے منہ پر بیٹھ گئے۔ قریش کے کچھ نوجوان جب غار کے دہانے سے تقریباً چالیس ہاتھ کے فاصلے پر پہنچے تو سب سے اگلے جوان نے کبوتر بیٹھے دیکھے۔ وہ وہیں سے واپس آگیا۔ ساتھی پوچھنے لگے: ''کیا ہوا تو غار میں کیوں

[1] ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کیا اور حافظ ابو بکر احمد بن علی بن سعید قاضی کی مسند ابی بکر کا حوالہ دیا ہے۔ ابن کثیر نے اس روایت کے متعلق کہا: ''یہ حسن بصری رحمہ اللہ کی مرسل ہے جس کی حالت شاہد (تائیدی روایت) سے بہتر ہے۔ اس میں یہ اضافہ ہے کہ نبی ﷺ نے غار میں نماز پڑھی تھی۔'' دیکھیے: (البداية والنهاية: 199/3) [2] صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب ما لقي النبي ﷺ من أذى المشركين والمنافقين، حديث: 1796.

نہیں گیا؟'' وہ بولا: ''غار کے منہ پر دو جنگلی کبوتر بیٹھے ہیں، میں سمجھ گیا اندر کوئی نہیں۔'' نبی ﷺ نے اس کی بات سن لی۔ آپ سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کبوتروں کے ذریعے سے ہماری حفاظت فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے ان کے لیے برکت کی دعا فرمائی تو وہ کبوتر حرم کعبہ میں جا بسے۔ وہاں ان کے بچے پیدا ہوئے اور نسل چل پڑی، حرم کے کبوتر انھی کی نسل سے ہیں۔ [1]

* بعض اہل سیرت نے لکھا ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: ''اگر ان میں سے کوئی اپنے قدموں کی طرف دیکھتا تو اس کی نظر ہم پر پڑ جاتی۔'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر وہ ادھر سے آجاتے تو ہم ادھر سے نکل جاتے۔'' حضرت ابوبکر صدیق نے دیکھا کہ فی الواقع غار دوسری جانب سے کھلا ہوا ہے۔ اس طرف سمندر ہے اور کنارے پر ایک کشتی بندھی ہوئی تیار ہے۔ [2]

* روایت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے سے کہا تھا: ''بیٹے! اگر کوئی فتنہ فساد برپا ہو جائے تو اس غار میں آکر رہنے لگنا جس میں تم نے ہمیں چھپتے دیکھا

[1] الطبقات الکبریٰ: 229/1. یہ روایت عون بن عمرو قیسی اور ابومصعب مکی کی سند سے ہے۔ مزید دیکھیے: (کشف الأستار للهيثمي: 300,299/2) یہی حدیث ان کتابوں میں بھی دیکھیے: (دلائل النبوّة للبيهقي: 482,481/2، ودلائل النبوّة لأبي نُعَيم: 325/2) اس حدیث کی سندیں ضعیف ہیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ بعض علماء نے احمد کی روایت، جس میں مکڑی کے غار پر جالا بننے کا ذکر ہے، کی سند کو جید قرار دیا ہے۔ اس حدیث میں کھوجی کا بھی ذکر ہے جو سراقہ بن مالک بن جعشم مدلجی تھا۔ بیہقی اور ابونعیم کی کتابوں کے مطبوعہ نسخوں میں یہ ذکر نہیں۔ [2] ابن کثیر نے لکھا: ''اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کے لیے یہ ناممکن نہیں ہے لیکن یہ روایت کسی بھی قوی یا ضعیف سند سے وارد نہیں ہوئی، دیکھیے: (البداية والنهاية: 201/3) میں (مصنفِ کتاب) کہتا ہوں کہ یہ روایت اس جملے کے آخر تک ''اگر ان میں سے کوئی اپنے قدموں کی طرف دیکھتا تو اس کی نظر ہم پر پڑ جاتی'' صحیح سند سے آئی ہے جسے امام احمد بن حنبل نے نقل کیا ہے، دیکھیے: (فضائل الصحابة: 177/1)

تھا۔ اس میں تمھیں صبح و شام تازہ کھانا ملا کرے گا۔"[1]

* یہ بھی روایت ہے کہ کھوج لگانے والے مشرکین میں سے ایک شخص عین رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیشاب کرنے لگا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: "اے اللہ کے رسول! کیا یہ ہمیں دیکھ نہیں رہا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر یہ ہمیں دیکھتا تو کبھی ہماری طرف برہنہ ہو کر پیشاب نہ کرتا۔"[2]

* روایت ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو غار میں پیاس لگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "غار کے ابتدائی حصے میں جاؤ اور پانی پی آؤ۔" حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ غار کے ابتدائی حصے میں گئے اور ایسا پانی پیا جو شہد سے زیادہ میٹھا، دودھ سے زیادہ سفید اور کستوری سے زیادہ خوشبودار تھا، پھر واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے جنت کی نہروں پر مقرر فرشتے کو حکم دیا تھا کہ جنت الفردوس سے غار تک نہر کھود دو تا کہ ابو بکر پانی پی سکے۔"[3]

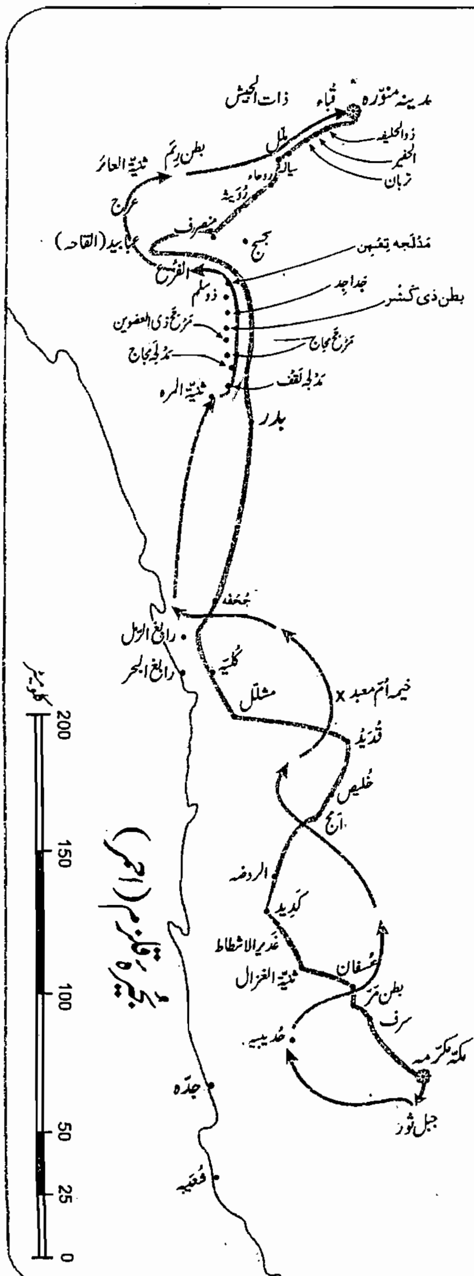
[1] اسے بزار نے ایک سند سے نقل کیا ہے جس میں موسیٰ بن مُطَیر ہے۔ ابن کثیر نے یہ روایت نقل کی اور موسیٰ بن مُطَیر کے متعلق لکھا: "یہ موسیٰ بن مُطَیر ضعیف اور متروک ہے۔" دیکھیے: (البدایة والنهایة: 201/3) یحییٰ بن معین نے اسے کذاب قرار دیا ہے، چنانچہ اس کی حدیث قابل قبول نہیں ہے۔ دکتور سلیمان السعود نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے: "ابو حاتم کا کہنا ہے: موسیٰ بن مُطَیر متروک الحدیث اور ذاہب الحدیث ہے۔" دیکھیے: (تاریخ ابن معین: 596/2، والجرح والتعدیل: 162/8، ورسالة الهجرة، ص:169) [2] اس روایت کو ہیثمی نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کیا ہے، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 54/6) ابو یعلیٰ نے اسے نقل کرنے کے بعد لکھا: "اس کی سند میں موسیٰ بن مطیر ہے جو متروک ہے۔" ہیثمی نے اسے اسماء رضی اللہ عنہا کے حوالے سے بھی نقل کیا اور اس کی سند کے بارے میں لکھا: "اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔ اس میں یعقوب بن حمید بن کاسب ہے جسے ابن حبان اور دیگر محدثین نے ثقہ اور ابو حاتم اور دیگر محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اس کے بقیہ رجال صحیح کے رجال ہیں۔" دیکھیے: (مجمع الزوائد: 54,53/6) [3] الخصائص للسیوطي: 308,307/1. امام سیوطی نے لکھا: "ابن عساکر نے اسے ایک نہایت ضعیف سند کے ساتھ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔"

ہجرت کا راستہ

جب کفار انھیں تلاش کرتے کرتے تھک گئے اور گرفتاری کی مہم تھم گئی تو ایک کھوجی، ابن اُرَیقِط (یا ابن اُرَیقِط)، معاہدے کے مطابق آ پہنچا۔ اس وقت دونوں صاحبان کو غار میں ٹھہرے پورے تین دن ہو چکے تھے۔ اس کے پاس دونوں اونٹنیاں بھی تھیں۔ عامر بن فہیرہ بھی ساتھ آ ملے اور وہ چاروں ساحلی راستے سے مدینہ کی طرف چل پڑے۔[1]

رسول اللہ ﷺ دشمن سے بچاؤ کے تمام ممکنہ انسانی ذرائع اختیار کرنے کے بعد بڑے سکون و اطمینان سے جا رہے تھے۔ آپ ﷺ کی زبان مبارک اللہ کے ذکر اور دعاؤں سے تر تھی جبکہ ابو بکر ادھر ادھر دائیں بائیں دیکھتے جاتے تھے تاکہ رسول اللہ ﷺ کو کوئی گزند نہ پہنچے۔[2] اس دن دوپہر کا وقت ہوا اور راستہ مسافروں سے خالی ہو کر سنسان ہو گیا تو انھیں ایک بلند چٹان نظر آئی۔ اس پر دھوپ نہیں پڑتی تھی۔ یہاں سایہ نصیب ہو سکتا تھا۔ وہ آرام کے لیے رک گئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھوں سے جگہ ہموار کی اور ایک فر بچھا دی اور رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ آپ آرام فرمائیں اور خود ازدِگرد کا جائزہ لینے نکل گئے۔ اتنے میں انھیں ایک چرواہا نظر آیا جو بکریوں سمیت اسی چٹان کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس کا مقصد بھی چھاؤں میں آرام کرنا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس سے بات چیت شروع کر دی تاکہ اس کا اتہ پتہ چل سکے۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3905، وفضائل أصحاب النبي ﷺ، باب مناقب المهاجرين وفضلهم، حديث: 3652. ابن اسحاق نے اس راستے کے تمام مقامات کا ذکر کیا ہے جن سے رسول اللہ ﷺ کا گزر ہوا، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 2/150-156) بلاسند ہے۔ [2] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3906





کعبہ اور مسجد الحرام

ہجرت نبوی

* نبی ﷺ 12 ربیع الاوّل مطابق 24 ستمبر 622ء بروز پیر قبا پہنچے۔
* یکم محرم 1ھ 16 جولائی 622ء کے مطابق ہے اور یہی ہجری تقویم کی ابتداء ہے۔

← ہجرت کا راستہ

← قافلوں کا راستہ



مسجد نبوی اور گنبد خضراء

مکہ مکرمہ سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر وہ انھیں بکری کا دودھ مہیا کرنے پر تیار ہو گیا۔ حضرت ابو بکر نے اُسے تاکید کی کہ دودھ دوہنے سے پہلے اپنے ہاتھ اور بکری کے تھن اچھی طرح صاف کر لو۔ دودھ لینے کے بعد حضرت ابو بکر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ ﷺ سو رہے تھے۔ حضرت ابو بکر نے آپ کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ انتظار کرتے رہے۔ جب آپ بیدار ہوئے تو بصد محبت خدمت اقدس میں دودھ پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اتنا دودھ نوش فرمایا کہ ابو بکر کی تشنگیِ محبت بھی سیراب ہو گئی اور وہ دل و جان سے شادمان ہو گئے، پھر آپ ﷺ نے روانگی کا حکم دیا۔ [1]

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اپنی اونٹنی پر اپنے پیچھے بٹھا رکھا تھا۔ راستے میں کوئی شخص حضرت ابو بکر سے پوچھتا کہ یہ آپ کے آگے کون بیٹھے ہیں؟ تو وہ کہتے: ''یہ میرے رہبر ہیں، مجھے راستہ بتاتے ہیں۔'' پوچھنے والا سمجھتا کہ صحرائی راستہ بتا رہے ہیں جبکہ ان کا مقصد دین حق کا راستہ تھا۔ [2]

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کی تفصیلی روایت بیان کی ہے کہ ''وہ لوگ راستے میں بنو مدلج (39) کے پاس سے گزرے۔ ایک آدمی نے دیکھ لیا۔ وہ اپنے قبیلے کی ایک مجلس میں پہنچا۔ وہاں سراقہ بن مالک بیٹھے تھے۔ وہ کہنے لگا: ''سراقہ! میں نے ابھی چند سایوں کو دور سے ساحل پر جاتے دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے وہ محمد (ﷺ) اور اُن کے ساتھی ہیں۔'' سراقہ کہتے ہیں: ''اس کی بات سن کر مجھے خیال گزرا کہ یقیناً وہی ہیں

(39) بنو مدلج: ان کی سکونت رابغ کے قریب ہی تھی۔ جب سراقہ نے رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کا تعاقب کیا تب آپ اور ابو بکر قُدَید سے آگے بڑھ رہے تھے۔

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3918,3917. [2] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3911.

لیکن میں نے اسے جھوٹ موٹ کہہ دیا: ''یہ وہ نہیں ہیں۔ یہ تو فلاں فلاں ہیں۔ ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرے ہیں۔'' سراقہ کا مقصد محض اس شخص کو بھٹکانا اور غافل کرنا تھا۔ اس لیے کچھ دیر بدستور مجلس میں بیٹھے رہے، پھر کسی بہانے اٹھے، اپنے گھر گئے اور لونڈی سے کہا: ''میرا گھوڑا ٹیلے کے پیچھے لے جاؤ۔'' پھر تیار ہوئے، اسلحہ ساتھ لیا۔ چھپتے چھپاتے اپنے گھوڑے کے پاس پہنچے۔ اس پر سوار ہوئے اور چل پڑے۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے قریب پہنچے تو ان کا گھوڑا لڑکھڑایا اور وہ گھوڑے سے نیچے گر پڑے۔ انھوں نے قسمت آزمائی والے تیر نکالے تاکہ پتہ چل سکے کہ وہ انھیں پکڑ سکیں گے یا نہیں؟ تیروں نے بتایا کہ تم انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ لیکن انھوں نے تیروں کی بات نہ مانی۔ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر آپ ﷺ کے پیچھے چل دیے اور اتنے قریب جا پہنچے کہ انھیں رسول اللہ ﷺ کی دعائیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ اچانک ان کے گھوڑے کے اگلے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔[1] وہ اترے اور گھوڑے کو ڈانٹا۔ گھوڑا بڑی مشکل سے زمین سے نکلا۔ جب اس کے پاؤں باہر نکلے تو اس جگہ سے بگولے کی طرح دھواں اٹھا۔ انھوں نے یہ صورت حال دیکھی تو یقین آ گیا کہ میں رسول ﷺ کو نقصان نہ پہنچا سکوں گا اور آپ ﷺ کا دین غالب آ کر رہے گا۔ انھوں نے دوبارہ قسمت آزمائی والے تیر نکالے۔ تیروں نے پھر یہی فیصلہ سنایا۔ بالآخر انھوں نے امان کا نعرہ بلند کیا۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی رک گئے۔ یہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے پاس گئے اور رسول اللہ ﷺ سے معذرت کی اور بتایا کہ قریش نے آپ ﷺ کی گرفتاری کے لیے مکمل دیت انعام دینے کا اعلان کیا ہے اور دوسرے قبائل کے منصوبوں سے بھی مطلع کیا۔ انھوں نے آپ ﷺ کو سامان خورونوش

[1] صحیح بخاری میں براء رضی اللہ عنہ کی حدیث: (3908) اور انس رضی اللہ عنہ کی حدیث: (3911) میں اور صحیح مسلم میں براء رضی اللہ عنہ کی حدیث: (2009) میں یہ بھی بیان ہے کہ ایسا نبی ﷺ کی ان پر بددعا کے باعث ہوا۔

اور دیگر ضروریات کی پیشکش کی لیکن آپ ﷺ نے کوئی چیز قبول نہ کی، صرف یہ تاکید فرمائی کہ ہمارے بارے میں کسی کو اطلاع نہ دینا نہ کسی کو اِدھر آنے دینا۔ سُراقہ نے آپ سے درخواست کی کہ میرے لیے ''امان نامہ'' لکھ دیجیے۔ آپ ﷺ نے عامر بن فُہیرہ سے فرمایا: ''اِسے لکھ دو۔'' انھوں نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر سراقہ کی مرضی کے مطابق ''امان نامہ'' لکھ دیا، پھر آگے چل پڑے۔''[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ہم نے سفر شروع کیا۔ کافر ہماری گرفتاری کے لیے برابر پیچھے لگے ہوئے تھے لیکن کوئی ہم تک نہ پہنچ سکا۔ سراقہ بن مالک بن جعشم گھوڑے پر سوار ہمارے قریب پہنچا تو میں نے گھبرا کر نبی ﷺ کو پکارا: ''اللہ کے رسول! تلاش کرنے والے تو ہم تک آ گئے۔'' آپ نے فرمایا:

«لَا تَحْزَنْ، إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا» ''غم نہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔''[2]

جب سراقہ واپس اپنی قوم کے پاس پہنچے تو اُن سے کہا: ''میں اس طرف مکمل چھان بین کر آیا ہوں۔ تمھیں ادھر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''[3]

اللہ کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے، یہ شخص دن کے آغاز میں پوری سرگرمی سے آپ ﷺ کو گرفتار کرنے کی دُھن میں لگا ہوا تھا لیکن دن ڈھلتے ڈھلتے اس کی ایسی کایا پلٹ گئی کہ آپ ﷺ کا محافظ بن گیا۔[4] شکار کرنے آیا تھا مگر خود شکار ہو گیا۔ رسولِ کریم ﷺ کا عطا کردہ امان نامہ حضرت سراقہ کے پاس محفوظ رہا حتی کہ جب آپ غزوۂ حنین اور طائف سے واپس تشریف لائے تو انھوں نے یہ امان نامہ آپ کی خدمت میں پیش کیا۔

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبيﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3906، وصحيح مسلم، الأشربة، باب جواز شرب اللبن، حديث: 2009. [2] صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبيﷺ، باب مناقب المهاجرين وفضلهم، حديث: 3652. [3] صحيح البخاري، المناقب، باب علامات النبوّة في الإسلام، حديث: 3615. [4] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبيﷺ و أصحابه إلى المدينة، حديث: 3911.

آپ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا: «يَوْمُ وَفَاءٍ وَّبِرٍّ» ''یہ ایفائے عہد اور وفا شعاری کا دن ہے۔'' حضرت سراقہ اُسی دن مسلمان ہو گئے۔ [1]

حافظ ابن حجر اور ابن عبدالبر نے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سراقہ سے فرمایا تھا:

«كَيْفَ بِكَ إِذَا لُبِسْتَ سِوَارَيْ كِسْرٰى»

''اس وقت تمھاری کیا کیفیت ہوگی جب تمھیں کسریٰ کے کنگن پہنائے جائیں گے؟''

پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس (فتح ایران کے بعد) کسریٰ کے کنگن، پیٹی اور تاج لائے گئے تو انھوں نے حضرت سُراقہ کو بلایا اور انھیں وہ کنگن پہنائے۔ حضرت سراقہ گھنے بالوں والے تھے، بازوؤں پر بھی گھنے بال تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں فرمایا: ''ہاتھ اونچے کرو۔'' پھر بآواز بلند فرمایا: ''اللہ اکبر! تعریف اس اللہ کی جس نے یہ کنگن شاہِ کسریٰ کے ہاتھوں سے اتارے، جو اپنے آپ کو لوگوں کا رب کہتا تھا اور بنومدلج کے اعرابی سراقہ بن مالک بن جعشم کو پہنا دیے۔'' [2]

ابن اسحاق نے چند شعر نقل کیے ہیں جن کے ذریعے سے ابوجہل حضرت سراقہ کی قوم کو اُن کے خلاف بھڑکاتا تھا۔ [3] حضرت سراقہ نے بھی شعروں ہی میں اُسے دندان شکن

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 154/2. ابن اسحاق کی یہ روایت حسن سند کے ساتھ ہے اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ [2] الإصابة: 19/2. اس کی سند کے رجال ثقہ ہیں لیکن یہ دونوں طرف سے منقطع ہے، چنانچہ یہ روایت صحیح نہیں۔ مزید دیکھیے: (الاستيعاب في أسماء الأصحاب لابن عبدالبر: 120/2) اس کی سند کے رجال ثقہ ہیں لیکن یہ دونوں طرف سے منقطع ہے، چنانچہ یہ روایت بھی صحیح نہیں۔ اور دیکھیے: (رسالة الهجرة للدكتورسليمان السعود، ص: 180) یہ بھی ابن حجر ہی کی سند سے ہے۔
[3] یہ اشعار یونس بن بکیر کی روایت سے ہیں جو بلا سند ہے۔ بیہقی نے یہ روایت نقل کی ہے۔ انھوں نے سراقہ کے اشعار تو بیان کیے ہیں لیکن وہ ابوجہل کے اشعار چھوڑ گئے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 489/2) بیہقی کی کتاب کے محقق نے ابوجہل کے اشعار بھی نقل کر دیے ہیں۔

جواب دیا۔[1]

پھر رسول اللہ ﷺ کا قافلہ اُم معبد خزاعیہ کے خیموں کے پاس سے گزرا۔ وہ بڑی مہمان نواز خاتون تھیں۔ قافلہ والوں نے اُن سے مہمانی کا تقاضا کیا تو انھوں نے خشک سالی کا عذر پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے خیمے کے قریب ایک بکری کھڑی دیکھی تو اس کی بابت پوچھا۔ وہ کہنے لگیں: ''یہ بکری اس قدر کمزور ہے کہ ریوڑ کے ساتھ نہ چل سکی۔'' آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «هَلْ بِهَا مِنْ لَّبَنٍ؟» ''کیا یہ دودھ دیتی ہے؟'' وہ کہنے لگیں: ''اس میں اتنی سکت کہاں؟'' فرمایا: ''تم اجازت تو دو۔'' انھوں نے بخوشی اجازت دی کہ اگر آپ کو دودھ نظر آتا ہے تو دوہ لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے تھن ملے، دعا فرمائی اور بسم اللہ پڑھی اور دوہنا شروع کر دیا۔ تھن دودھ سے بھر گئے۔ آپ نے برتن منگوایا۔ دھار پر دھار پڑنے لگی اور برتن لبالب بھر گیا۔ پہلے خاتون کو پلایا۔ انھوں نے خوب سیر ہو کر پیا، پھر ساتھیوں کو پلایا۔ انھوں نے بھی پیٹ بھر کر پیا۔ باقی ماندہ رسول اللہ ﷺ نے نوش فرمایا، پھر دوبارہ دوہنا شروع کیا۔ برتن پھر دودھ سے لبریز ہوگیا۔ آپ نے یہ دودھ خاتون کے لیے چھوڑا اور قافلہ چل پڑا۔

جب ابو معبد گھر آئے تو گھر کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ دودھ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ ام معبد نے سارا واقعہ بڑے جوش اور مسرت سے سنایا۔ وہ چونک پڑا۔ کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہی نبیٔ مکرم ہیں جن کی قریش کو تلاش ہے۔ ذرا اُن کا

[1] سراقہ رضی اللہ عنہ اور ابو جہل کے اشعار ابن کثیر نے بھی درج کیے اور کہا: ''اموی نے بھی اپنے مغازی میں ان اشعار کو اپنی سند سے بواسطۂ ابو اسحاق نقل کیا ہے۔'' دیکھیے: (البداية والنهاية:3/204) ابونعیم نے یہ اشعار اپنی سند سے بواسطۂ زیاد نقل کیے۔ زیاد نے ابن اسحاق سے روایت کی۔ ابونعیم نے ابوجہل کے اشعار میں چند ایسے مزید مصرعے بھی درج کیے ہیں جو واضح طور پر کفر کے الفاظ ہیں، دیکھیے: (دلائل النبوّة لأبي نُعَيم:2/336,337)

ناک نقشہ تو بتاؤ۔'' ام معبد نے فصاحت و بلاغت کے ساتھ ایسا سماں باندھا کہ ابومعبد پکار اُٹھے: ''اللہ کی قسم! یہ تو وہی ہاشمی نبی ہیں جن کا عرب بھر میں دور دور تک چرچا ہے۔ میں نے پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ اُن کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں گا۔ جب بھی موقع ملا ضرور جاؤں گا۔''

عین اُسی وقت مکہ میں ایک بلند آہنگ آواز اُبھری مگر آواز دینے والا دکھائی نہ دیا۔

سَلُوا أُخْتَكُمْ عَنْ شَاتِهَا وَإِنَائِهَا فَإِنَّكُمْ إِنْ تَسْأَلُوا الشَّاةَ تَشْهَدُ

''(ارے بے شرمو!) جاؤ، اُس معزز خاتون ہی سے اُس کی بکری اور برتن کا قصہ پوچھو بلکہ اگر بکری ہی سے پوچھ لو تو وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت دے گی۔''[1]

قافلہ راستے میں ایک غلام کے پاس سے گزرا جو بکریاں چرا رہا تھا۔ انھوں نے اُس سے کھانا مانگا۔ اُس نے معذرت کی کہ اُس کی بکریاں دودھ دینے والی نہیں۔ صرف ایک بکری ہے اُس کا دودھ بھی تقریباً خشک ہو چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُس کی رضامندی

[1] امّ معبد کا یہ واقعہ امام حاکم نے ہشام بن حُبَیش کی روایت سے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے، دیکھیے: (المستدرك للحاکم: 10,9/3) واقعہ نقل کر کے انھوں نے لکھا: ''اس کی سند صحیح ہے، اس کے باوجود شیخین نے اسے نقل نہیں کیا۔'' انھوں نے بعض امور کا بھی ذکر کیا جو اس واقعے کے صحیح ہونے کی خبر دیتے ہیں۔ ذہبی نے حاکم کی موافقت کرتے ہوئے واقعے کو ''صحیح'' کہا، تاہم انھوں نے حاکم سے اس امر میں اختلاف کیا کہ اس میں صحیح کی شرائط پورے طور پر نہیں پائی جاتیں۔ ابن کثیر نے ام معبد کے واقعے کے متعلق لکھا: ''ام معبد کا واقعہ مشہور و معروف ہے اور اس کی سندیں ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ تمام ردّ و قدح کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ واقعہ اپنی شہرت اور سندوں کی کثرت کے پیش نظر حسن لغیرہ کے درجے پر پہنچتا ہے۔'' دیکھیے: (البدایة والنهایة: 209/3) یہ بات دکتور سعود نے بھی کہی ہے، دیکھیے: (رسالة الهجرة، ص:199) ام معبد نے رسول ﷺ کے خدوخال کا جو نقشہ کھینچا اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

سے جونہی اُس بکری کے تھنوں کو دستِ مبارک سے چھوا بکری نے دودھ دینا شروع کر دیا۔ اس قدر دودھ دیا کہ موقع پر موجود سب لوگوں نے خوب سیر ہو کر دودھ پیا۔ چرواہے نے یہ منظر دیکھا تو مسلمان ہوگیا۔ اس نے درخواست کی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جائے گا۔'' لیکن آپ ﷺ نے اُسے نصیحت کی کہ جب تمھیں پتہ چلے کہ ہم غالب ہو چکے ہیں اور ہمارا اقتدار قائم ہو چکا ہے تو مدینہ منورہ چلے آنا۔''[1]

مسند احمد اور مسند طیالسی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، انھوں نے کہا: ''میں بالکل نوجوان تھا۔ مکہ میں عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے۔ وہ دونوں مشرکین کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر نکلے تھے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے:

«عِنْدَكَ يَا غُلَامُ! لَبَنٌ تَسْقِينَا» ''لڑکے! تمھارے پاس کچھ دودھ ہے تو ہمیں پلاؤ۔''

میں نے کہا: ''یہ بکریاں تو میرے پاس امانت ہیں، اس لیے میں تمھیں دودھ نہیں دے سکتا۔'' آپ ﷺ نے دریافت فرمایا:

«هَلْ عِنْدَكَ مِنْ جَذَعَةٍ لَّمْ يَنْزُ عَلَيْهَا الْفَحْلُ»

''کیا تیرے پاس کوئی ایسی نوجوان بکری ہے جس نے نر نہ دیکھا ہو؟''

میں نے کہا: ''ہے۔'' اور میں وہ بکری لے آیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُسے قابو کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اُس کا تھن تھاما اور دعا فرمائی۔ تھن دودھ سے بھر گیا۔ حضرت ابوبکر ایک پتھر لے آئے جو درمیان سے گہرا تھا۔ آپ نے اُس میں دودھ دوہا، پھر آپ اور ابوبکر دونوں

[1] المستدرك للحاكم: 8/3. ابن کثیر نے بکریوں کے معجزات کے ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''احتمال ہے کہ یہ تمام واقعات دراصل ایک ہی واقعہ ہے۔'' دیکھیے: (البداية والنهاية: 213/3) میرے (مصنف کتاب کے) خیال میں یہ مختلف واقعات ہیں۔ ہمارے نزدیک قابل ترجیح یہی ہے۔

نے پیا۔ مجھے بھی پلایا، پھر آپ ﷺ نے تھن سے فرمایا: «أَقْلِصْ» ''سکڑ جا!'' تو وہ سکڑ گیا۔

بعد ازاں میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور التجا کی: ''مجھے بھی وہ پاکیزہ الفاظ (قرآن مجید) سکھا دیجیے۔'' آپ نے ارشاد فرمایا: «إِنَّكَ غُلَامٌ مُّعَلَّمٌ» ''تو پڑھا لکھا جوان بنے گا۔'' پھر میں نے آپ کی خدمت میں رہ کر آپ ﷺ ہی کے دہن مبارک سے ستر سورتیں اس طرح یاد کیں کہ اس شرف میں میرا کوئی اور شریک نہ تھا اور ان سورتوں میں کوئی میری غلطی نہیں نکال سکتا تھا۔''[1]

راستے میں اس مقدس قافلے کی ملاقات ایک مسلمان تجارتی قافلے سے بھی ہوئی۔ یہ تجارتی قافلہ شام سے واپس آ رہا تھا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی اس قافلے میں موجود تھے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سفید کپڑوں کا ایک ایک جوڑا (بطورِ تحفہ) پہنایا۔[2]

جب یہ مقدس قافلہ مقامِ عرج پر پہنچا تو انھیں راستہ پوچھنے کی ضرورت پیش آئی۔ وہاں کے ایک رہائشی نے انھیں راستہ بتایا اور اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا کہ قریبی راستے میں قبیلہ بنو اسلم کے دو مشہور ڈاکو ہیں جنھیں ''مہانان'' کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن ڈاکوؤں کی کوئی پروا نہ کی۔ جب وہ ڈاکو آپ ﷺ سے ملے تو آپ نے اُن کے رُوبرو اسلام کا پیغام پیش کیا۔ وہ دونوں مسلمان ہو گئے۔ آپ نے اُن کا نام ''مُکرمان'' رکھا اور انھیں مناسب وقت پر مدینہ منورہ آنے کو کہا۔[3] (مہانان کے معنی ہیں: ''دو ذلیل شخص''

[1] مسند أحمد: 462/1. سند حسن ہے۔ ومِنحة المعبود: 2456. سند صحیح ہے۔ والسيرة النبوية لابن كثير (تحقيق سيّد الحليمي)، ص: 159. [2] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3906. [3] اس واقعے کو عبداللہ بن احمد نے مسند احمد کے زوائد میں نقل کیا ہے، دیکھیے: (مسند أحمد: 74/4) اور دیکھیے: (الفتح الرّباني: 288/20) ساعاتی نے اس کی سند کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے۔ محدث ہیثمی نے اسے نقل کرنے کے بعد لکھا: ''اسے عبداللہ بن احمد نے روایت کیا ہے۔ (حدیث کے ایک راوی) ابن سعد کا نام عبداللہ ہے، اسے میں نہیں جانتا، بقیہ رجال ثقہ ہیں۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 58/6)

جبکہ مکرمان کا مطلب ہے: ''دو معزز شخص'' رسول اللہ ﷺ نے اسلام کا پیغام دے کر اُن کی کایا پلٹ دی۔ انھیں ذلت کی پستی سے اٹھایا اور عزت کی بلندی پر فائز کر دیا۔

بزار اور علامہ ابن اثیر نے حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے اپنی اسانید کے ساتھ روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ سفرِ ہجرت ہی میں تھے کہ ایک قافلے سے ملے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر! ان سے پوچھو یہ کون لوگ ہیں؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ہم قبیلۂ اسلم سے تعلق رکھتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے (بطورِ فال) فرمایا: ''ابوبکر! سلامت رہو گے۔'' اب ان سے پوچھو'' بنواسلم کے کس خاندان سے ہیں؟'' انھوں نے جواب دیا: ''بنوسہم سے۔'' فرمایا: ''ابوبکر! اپنا تیر (سہم) پھینک دو۔''[1]

یہ بھی روایت ہے کہ جب یہ مقدس قافلہ جُحْفَة پہنچا تو کچھ اونٹ چرتے چگتے نظر آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: «لِمَنْ هٰذِهِ الْإِبِلُ؟» ''یہ اونٹ کس کے ہیں؟'' جواب ملا: ''بنواسلم کے ایک شخص کے ہیں۔'' آپ نے فال لیتے ہوئے فرمایا: «سَلِمْتَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ» ''ابوبکر! ان شاء اللہ سلامت رہو گے۔'' پھر چرواہے سے نام دریافت فرمایا۔ وہ کہنے لگا: مسعود (خوش نصیب۔) آپ ﷺ نے پھر فال لی اور فرمایا: «سَعِدْتَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ» ''ابوبکر! ان شاء اللہ خوش نصیب رہو گے۔''[2]

کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی دو اونٹنیوں میں سے ایک پیچھے رہ گئی تھی۔ جب ان

[1] كشف الأستار للهيثمي: 302,301/2. ہیثمی نے کہا: ''اسے بزار نے روایت کیا ہے اور اس میں عبدالعزیز بن عمران زہری ہے جو متروک ہے۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 55/6) مزید دیکھیے: (أسد الغابة: 209/1) اس کی سند منقطع ہے۔ [2] یہاں تک یہ واقعہ ابن کثیر نے ابونعیم کی روایت سے نقل کیا ہے۔ انھوں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، دیکھیے: (البداية والنهاية: 209/3) میں کہتا ہوں: ''یہ واقعہ ابونعیم نے بھی نقل کیا ہے، دیکھیے: (المعرفة: 2/ل182أ) لیکن اس کی سند میں محمد بن عباد بن موسیٰ عکلی ضعیف ہے۔'' موسیٰ بن عباد اور ایاس بن مالک کے حالات کسی مؤرخ نے بیان نہیں کیے۔ بنا بریں یہ روایت ضعیف ہے۔

اونٹوں کا مالک آیا جس کا نام اوس بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن حجر اسلمی تھا تو اُس نے آپ ﷺ کی خدمت میں ایک جوان اونٹ پیش کیا اور اپنے غلام مسعود سے کہا: ''ان کے ساتھ جاؤ اور جہاں یہ جانا چاہتے ہیں انھیں وہاں تک چھوڑ آؤ۔'' چنانچہ وہ غلام آپ کے ساتھ قبا تک گیا۔ [1]

روایت ہے کہ اوس بن عبداللہ بن حجر اسلمی رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر کو جُحْفَة اور هَرْشیٰ کے درمیان مقامِ حدوات پر ملا تھا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دونوں ایک ہی اونٹنی پر سوار مدینہ کی جانب رواں دواں تھے۔ اس نے آپ ﷺ کو اپنا بہترین سانڈ اونٹ ''ابن رداء'' سواری کے لیے پیش کیا۔ آپ ﷺ کے ساتھ اپنے غلام مسعود کو بھیجا اور اُسے تاکید کی کہ ان کی رہنمائی کرو۔ انھیں ٹھیک راستے پر لے جاؤ اور جب تک یہ منزل مقصود پر نہ پہنچیں، ان کے ساتھ رہو۔'' چنانچہ وہ غلام آپ کو مدینہ منورہ پہنچا کر ہی واپس گیا۔ واپسی کے وقت رسول اللہ ﷺ نے اُسے تاکید فرمائی: ''اپنے آقا سے کہنا کہ اپنے اونٹوں کی گردنوں پر شناختی نشان لگائیں۔'' [2]

[1] الاستیعاب: 82/1. اس کی سند کو ابن عبدالبر نے حسن قرار دیا ہے۔ [2] ابن ہشام نے یہ واقعہ اپنے ان اضافات میں بیان کیا ہے جو انھوں نے سیرت ابن اسحاق پر کیے ہیں جو بغیر سند کے ہیں، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 156/2) ابن حجر نے بھی اسے اوس بن عبداللہ کے حالات میں روایت کیا ہے۔ ابن حجر نے بتایا کہ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا: ''ابو العباس بن سراج نے اس واقعے کو مرسل سند سے اپنی کتاب تاریخ میں روایت کیا ہے۔'' پھر کہا: ''ابن عبدالبر کا کہنا ہے کہ ابن سراج کی حدیث کا منبع اس کا بیٹا ہے اور یہ حدیث حسن ہے۔'' دیکھیے: (الإصابة: 86/1) میں کہتا ہوں: ''ابن عبدالبر کا اس کو حسن قرار دینا اس بنا پر ہے کہ وہ مرسل روایت کو قابل قبول سمجھتے ہیں۔ جمہور محدثین مرسل روایت کو مسترد کرتے ہیں۔ اسے مشروط طور پر قبول کیا جاتا ہے جیسے شواہد و متابعات (تائیدی روایات) کی بنا پر اسے قوی قرار دینا اور مختلف راویوں کی مرسل کے درمیان فرق کرنا کہ فلاں کی مرسل قبول اور فلاں کی ناقابل قبول۔ ابن حجر نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس روایت کو ابوسعید نے اپنی کتاب شرف المصطفیٰ میں ایاس بن مالک بن اوس کی کئی سندوں سے نقل کیا ہے۔ ◄◄

• قافلۂ ہجرت غمیم کے مقام پر بریدہ بن حصیب اسلمی سے ملا۔ وہ اپنی قوم کے سردار تھے۔ وہ نکلے تو تھے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تلاش میں تاکہ قریش کا اعلان کردہ انعام حاصل کر سکیں لیکن جب اُن کی آپ سے ملاقات ہوئی تو اسلام کا نورِ صداقت ان کے سینے میں اترتا چلا گیا۔ جونہی رسول اللہ ﷺ نے انھیں اسلام کی تعلیمات سے آگاہ فرمایا تو نہ صرف وہ بلکہ اُن کے ساتھ اُن کی قوم کے ستّر یا اسی گھرانے بھی مسلمان ہوگئے۔ [1] حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ نے رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بسر کی۔ صبح ہوئی تو حضرت بُریدہ نے عرض کی: ''اللہ کے رسول! آپ مدینہ منورہ میں داخل ہوں تو اس وقت آپ کے پاس اپنا جھنڈا ضرور ہونا چاہیے۔'' پھر انھوں نے اپنی پگڑی ایک نیزے سے باندھی اور آپ ﷺ کے آگے آگے چلنا شروع کر دیا۔ اس شان کے ساتھ آپ ﷺ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ [2]

مدینہ منورہ میں تشریف آوری

امام بخاری، ابن اسحاق اور امام حاکم رحمہم اللہ کی روایت ہے کہ جب انصار کو پتہ چلا کہ

◂◂ ابن السکن اور طبرانی نے اسے ایاس کے حوالے سے متصل اور تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ ایاس نے اپنے والد سے، انھوں نے اپنے والد اوس بن عبداللہ بن حجر سے روایت کی ہے۔ [1] بریدہ رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ ﷺ سے ملاقات اور ان کے اپنی قوم کی ایک جماعت کے ہمراہ اسلام لانے کا واقعہ دیکھیے: (الطبقات الکبریٰ: 242/4، وسیر أعلام النبلاء: 469/2، وأسد الغابة: 209/1، والإصابة: 146/1، والاستیعاب: 173/1) ان کے علاوہ دیگر محدثین نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ ان سب کی سندیں ضعیف ہیں۔ [2] سفرِ ہجرت میں بریدہ کے واقعے کا یہ حصہ دیار بکری نے نقل کیا ہے، دیکھیے: (تاریخ الخمیس: 235/1) دیار بکری نے یہ حصہ ابن الجوزی کی کتاب شرف المصطفیٰ سے نقل کیا ہے۔ ابن الجوزی نے اسے بیہقی کی سند سے بیان کیا جو بریدہ رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ روانہ ہو چکے ہیں تو وہ روزانہ اپنے گھروں سے نکلتے، حَرَّہ پہنچ جاتے اور آپ کا انتظار کرنے لگتے، جب دھوپ تیز ہو جاتی تو واپس چلے جاتے۔ اسی طرح انتظار کرتے کرتے پیر کا دن آ گیا۔[1] اُس دن ربیع الاول 14 نبوی کی 12 تاریخ تھی۔ ہجرت کا یہ پہلا سال تھا۔ عیسوی سن کے لحاظ سے 23 ستمبر622ء کی تاریخ تھی۔[2] انصار اس دن بھی حرہ پہنچے اور انتظار کرتے رہے جب دھوپ تیز ہو گئی تو مایوس ہو کر واپس چلے آئے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک یہودی اپنے کسی کام سے مدینہ کی ایک بلند عمارت پر چڑھا تو اُسے یہ مقدس قافلہ آتا نظر آیا۔ اُس نے وہیں شور مچا دیا: ''عربیو! یہ رہا تمھارا نصیب، جس کا تم انتظار کر رہے تھے۔''[3]

جونہی مسلمانوں نے یہ خوشخبری سنی تو اسلحہ کی طرف لپکے اور دوڑتے بھاگتے حَرَّہ پہنچے۔ وہاں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا استقبال کیا۔ فرطِ عقیدت سے قبا والے بنوعمرو بن عوف میں نعرہ ہائے تکبیر و تحسین لگا رہے تھے۔ تمام مسلمان آپ ﷺ کی تشریف آوری کی خوشی میں ہر طرف سے نکلتے اور نعرے لگاتے آ رہے تھے اور آپ سے ملاقات کر رہے تھے۔ چاروں طرف سے اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ!، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! کی

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3906، وحديث: 3925، وفتح الباري: 15/97-99 و 199، والسيرة النبوية لابن هشام: 157,156/2. اس حدیث کی سند حسن ہے۔ والمستدرك للحاكم: 11/3. حاکم نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ ذہبی نے بتایا کہ یہ روایت صحیحین میں بھی ہے۔ [2] الرّحيق المختوم، ص: 191,190. صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے یہ تاریخ رحمۃ للعالمین (102/1) سے نقل کی ہے۔ ابن حجر نے رسول اللہ ﷺ کے قباء میں تشریف لانے کی تاریخ کے متعلق تمام آراء کا جائزہ لیا ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 98/15) ابن اسحاق کی روایت جو عام طور پر مشہور ہے، 12 ربیع الاول کی ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 156/2) [3] ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ یہودی نے انصار کو ''قیلہ کے بیٹو!'' کہہ کر پکارا۔ قیلہ انصار کی کسی دادی کا نام ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 157/2)

مقدس صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ جن لوگوں نے اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ کا دیدار نہیں کیا تھا، وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ سمجھ کر انھیں سلام کرتے تھے۔ گرمی زیادہ ہوگئی تو ابوبکر اٹھے اور انھوں نے اپنی چادر سے رسول اللہ ﷺ پر سایہ کر دیا۔ تب لوگوں کو پتہ چلا کہ رسول اللہ ﷺ تو یہ ہیں۔[1] پھر انھوں نے جوشِ عقیدت سے آپ ﷺ کو گھیر لیا اور جی بھر کر دیدار کرنے لگے۔ ادھر آپ ﷺ انتہائی سکون و وقار سے بیٹھے ہوئے تھے اور آپ پر وحی اتر رہی تھی:

﴿فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ﴾

"پس بلاشبہ اللہ اس (نبی) کا رفیق ہے اور جبریل اور نیک مومن بھی۔ اس کے بعد فرشتے بھی مددگار ہیں۔"[2]

لوگوں کی خوشی دیدنی تھی۔ حالت یہ تھی کہ عورتیں، بچے اور نوکر چاکر جنھیں ایسے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی وہ بھی خوشی کے مارے نعرے لگاتے پھرتے تھے: "حضرت محمد ﷺ تشریف لے آئے، جنابِ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے، اللہ اکبر، پیارے محمد ﷺ آ گئے۔"[3] استقبال کرنے والے یہ شعر پڑھ رہے تھے:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ

وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ

"الوداع کی گھاٹیوں سے ہم پر چودھویں کا روشن چاند طلوع ہوا ہے۔ اس احسانِ عظیم پر شکر کرنا ہم پر فرض ہے اور اس وقت تک فرض ہے جب تک کوئی بھی

[1] بخاری کی روایت یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ [2] التحریم 66:4. [3] المستدرك للحاكم: 3/13.
حاکم کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور شیخین کی شرائط پر پوری اترتی ہے، اس کے باوجود انھوں نے اسے نقل نہیں کیا۔ ذہبی نے بتایا کہ یہ روایت صحیحین میں موجود ہے۔

پکارنے والا اللہ تعالیٰ کو پکارتا رہے۔“[1]

پھر آپ ﷺ چلے، بنو اوس کے قبیلہ بنو عمرو بن عوف میں پہنچے اور اُن کے سردار کلثوم بن ہدم کے ہاں چودہ دن ٹھہرے۔ یہ قبیلہ مقامِ قبا میں فروکش تھا۔ اس دوران میں آپ نے مسجد کی بنیاد رکھی جو بعد کو مسجد قبا کے نام سے معروف ہوئی۔ یہ پہلی مسجد تھی جو ہجرت کے بعد تعمیر ہوئی۔

چودہ دن قیام کے بعد رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اونٹنی پر سوار ہوئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے آپ اپنے ننھیال بنو نجار کو پیغام بھیج چکے تھے۔ وہ بھی تلواروں سے مسلح ہو کر پہنچ چکے تھے۔ آپ مدینہ منورہ کی طرف چل پڑے۔ راستے میں بنو سالم بن عوف کی بستی میں نمازِ جمعہ کا وقت ہو گیا۔ آپ نے تمام حاضرین کو وہیں جمعہ پڑھایا جہاں بعد ازاں مسجد جمعہ تعمیر کی گئی۔ جمعہ پڑھنے والے کل افراد ایک سو تھے[2] اور مدینہ منورہ میں یہ آپ ﷺ کا پہلا جمعہ تھا۔[3]

[1] بعض اہل علم نے سند و متن کے لحاظ سے اس ترانے پر تنقید کی ہے۔ ان کے اشکال کی بنیاد ان اشعار میں موجود ”ثنیات الوداع“ (الوداع کی گھاٹیوں) کے لفظ پر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ گھاٹیاں شمال میں شام کے راستے پر ہیں نہ کہ جنوب میں مکہ کے راستے پر۔ عرجون کا خیال ہے کہ یہ ترانہ تب گایا گیا تھا جب رسول اللہ ﷺ مدینہ کے اندر ابوایوب رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ انھوں نے روایات کا جائزہ لے کر انھیں آپس میں تطبیق دی ہے۔ ان کے نزدیک یہ امر بھی بعید از امکان نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی تبوک سے واپسی پر یہ ترانہ دوبارہ گایا گیا ہو، دیکھیے: (محمد رسول اللہ ﷺ لعرجون: 2/602-611) ہم اس امر پر عرجون سے اتفاق کرتے ہیں کہ ترانہ ایک سے زیادہ مواقع پر گایا گیا تھا اور ”ثنیات الوداع“ صرف شام ہی کی جانب نہیں دیگر اطراف میں بھی پائی جاتی ہیں۔ [2] الطبقات الکبریٰ: 2/236,237. اسے ابن سعد نے متصل سند سے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ ابن اسحاق نے معلق سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: 2/159) [3] اگر ہم رسول اللہ ﷺ کے مدینہ آنے، قباء میں قیام کرنے، مدینہ کے اندر داخل ہونے، مسجد تعمیر کرنے اور ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے گھر رہائش اختیار کرنے کے متعلق ابن اسحاق کی روایت کو بیہقی کی طرح ایک سند کی روایت باور کرتے ہیں تو کہیں ««

جمعۃ المبارک کی نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ مدینہ کی فضا محبت، خوشی، سرور اور جذباتِ عقیدت سے معمور تھی۔ آپ مدینہ منورہ کے جس گھرانے کے پاس سے بھی گزرتے وہ لوگ بصد محبت آپ کی اونٹنی کی لگام تھام لیتے اور بصد ادب التجا کرتے: ''ہمارے ہاں تشریف رکھیں۔ ہماری تعداد بہت زیادہ ہے۔ اسلحہ بھی خوب ہے، سلامتی اور حفاظت کا خاطر خواہ انتظام ہے۔'' آپ ﷺ فرماتے: ''اونٹنی کا راستہ چھوڑ دو۔ اسے چلنے دو۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے چل رہی ہے۔'' اونٹنی محوِ خرام رہی حتی کہ وہ جگہ آ گئی جہاں آج مسجد نبوی ہے۔ یہاں اونٹنی اپنے آپ بیٹھ گئی۔ لیکن آپ نیچے نہ اترے۔ اونٹنی پھر اٹھی، تھوڑی دور آگے کو چلی مگر پھر واپس آ گئی اور پہلی جگہ پر دوبارہ بیٹھ گئی۔ آپ اونٹنی سے نیچے اترے۔ یہ بنونجار کا محلّہ تھا اور سامنے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا گھر تھا۔ حضرت ابوایوب نے لپک کر پالان اٹھایا اور اپنے گھر لے جا کر رکھ دیا۔ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی سواری سنبھال لی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اَلْمَرْءُ مَعَ رَحْلِهِ» ''آدمی اپنے پالان کے ساتھ ہوتا ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے گھر کی نچلی منزل میں فروکش ہوئے اور

◂◂ گے: ''اسے ابن اسحاق نے بسند حسن روایت کیا ہے۔'' دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 159/2)

[1] یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند حسن ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 159/2) رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان: ''آدمی اپنے پالان کے ساتھ ہوتا ہے۔'' بیہقی کی روایت میں آیا ہے، دیکھیے: (دلائل النبوّة للبيهقي: 509/2) اس کی سند میں عطاف بن خالد ہے جس میں قدرے ضعف ہے۔ اس کے متعلق ابن حجر نے لکھا: ''صدوق (نہایت سچا) ہے، غلطی کر جاتا ہے۔'' علاوہ ازیں صدیق بن موسیٰ کے بارے میں کسی محدث نے نہیں بتایا کہ وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتا ہے۔ اندیشہ ہے کہ عبداللہ بن زبیر سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں صدیق کے متعلق لکھا: ''یہ حجت نہیں (اس کی روایت دلیل بننے کے لائق نہیں۔)'' میں کہتا ہوں: ''ابن اسحاق کی روایت سے حسن سند کے ساتھ اس واقعے کا نقل ہونا اس حدیث کو تقویت دیتا ہے۔''

حضرت ابوایوب کے گھر والے اوپر والی منزل میں رہنے لگے۔ ایک رات ابوایوب بیدار ہوئے تو کہنے لگے: ''ہم تو رسول اللہ ﷺ کے سر مبارک سے اوپر چھت پر چلتے پھرتے ہیں۔'' یہ سوچ کر سب گھر والے دیواروں کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ صبح ہوتے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آپ اوپر والی منزل میں منتقل ہو جائیں۔ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا: «اَلسُّفْلُ أَرْفَقُ» ''ابوایوب! نچلی منزل زیادہ مناسب ہے۔'' لیکن حضرت ابوایوب کہنے لگے: ''میں اُس چھت پر نہیں چڑھ سکتا جس کے نیچے آپ تشریف فرما ہوں۔'' رسول اللہ ﷺ اُن کے جذبۂ احترام سے متاثر ہو کر اوپر والی منزل میں منتقل ہو گئے اور حضرت ابوایوب کا گھرانہ نچلی منزل میں رہنے لگا۔ ابوایوب رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے لیے کھانا تیار کیا کرتے تھے۔ جب بچا ہوا کھانا واپس آتا تو وہ پوچھتے کہ برتن میں نبی ﷺ کی انگلیاں کہاں لگی تھیں، پھر وہ جب بھی کھانا کھاتے برتن کی وہ جگہ تلاش کرتے جہاں نبی ﷺ نے اپنی انگلیاں لگائی ہوتیں۔ ایک دن انھوں نے کھانا تیار کیا جس میں لہسن بھی تھا۔ جب برتن واپس آیا تو انھوں نے پوچھا کہ نبی ﷺ کی انگلیاں برتن میں کہاں پڑی تھیں۔ ان سے کہا گیا کہ نبی ﷺ نے کھانا نہیں کھایا۔ وہ گھبرائے، اوپر گئے اور پوچھا: ''کیا یہ حرام ہے؟'' نبی ﷺ نے جواب دیا: «لَا! وَلٰكِنِّي أَكْرَهُهُ» ''نہیں! لیکن میں اسے پسند نہیں کرتا۔'' انھوں نے کہا: ''جو چیز آپ پسند نہیں کرتے میں بھی پسند نہیں کرتا۔'' اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس فرشتے آیا کرتے تھے۔[1]

انھی دنوں جب ابو ایوب رضی اللہ عنہ بالائی منزل میں تھے ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ایک دن حضرت ابوایوب کا پانی والا مٹکا ٹوٹ گیا۔ انھیں فکر لاحق ہوئی مبادا رسول اللہ ﷺ کے جسد اطہر پر پانی کا کوئی قطرہ ٹپک پڑے جس سے آپ ﷺ کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔ اُن کے پاس ایک ہی لحاف تھا جس میں وہ اور اُن کی بیوی لیٹتے تھے۔ انھوں نے

[1] صحيح مسلم، الأشربة، باب إباحة أكل الثوم......، حديث: 2053.

وہی لحاف اٹھایا اور دونوں میاں بیوی نے جلدی جلدی اُس لحاف سے پانی خشک کرنا شروع کر دیا۔ پانی تو خشک ہو گیا مگر لحاف تر بتر ہو گیا۔ [1]

روایت ہے کہ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے اس پانی والے واقعے کی وجہ سے آپ سے اوپر والی منزل میں منتقل ہونے کی درخواست کی تھی جسے آپ نے قبول کر لیا [2] لیکن امام مسلم اور امام احمد کی روایت کے مطابق آپ کے اوپر والی منزل میں منتقل ہونے کا سبب پہلی بات تھی کہ خاوند اور بیوی دونوں کو ہرگز گوارا نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے سر مبارک سے اوپر چلیں پھریں۔ [3] ظاہر ہے صحیح مسلم کی روایت زیادہ صحیح ہے۔ راجح ترین قول کے مطابق رسول اللہ ﷺ حضرت ابوایوب کے گھر ایک مہینہ تشریف فرما رہے۔ [4]

رسول اللہ ﷺ کے درِاقدس پر تین تین، چار چار انصاری صحابہ کھانا لے کر حاضر ہوتے تھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے کھانے کے سلسلے میں انصار نے باریاں مقرر کر لی تھیں حتی کہ آپ ابوایوب کے گھر سے اپنے گھر منتقل ہو گئے۔ [5]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سُنح بستی میں حبیب یا خبیب بن یساف کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک قول کے مطابق وہ حضرت خارجہ بن زید کے گھر میں مقیم تھے۔ [6]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 164/2. اسے ابن اسحاق نے بسند حسن روایت کیا ہے۔ [2] الإصابة: 415/1. ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن ابی شیبہ اور ابن ابی عاصم کا حوالہ دیا ہے۔ سند میں ابوالخیر ابورُہم سے روایت کرتے ہیں اور ابورُہم نے ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔ [3] صحيح مسلم، الأشربة، باب إباحة أكل الثوم......، حديث: 2053، والفتح الرّباني: 293/20. [4] ابن حجر نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی کی تعمیر سے قبل ایک ماہ ابوایوب رضی اللہ عنہ کے گھر قیام پذیر رہے، دیکھیے: (تهذيب التهذيب، ترجمة: 9113) اس کے علاوہ دیگر روایات بھی ہیں۔ ایک روایت ابن سعد کی ہے جو واقدی کی سند سے ہے، دیکھیے: (الطبقات الكبرىٰ: 237/1) [5] الطبقات الكبرىٰ: 233/1، والبداية والنهاية: 222/3. [6] مجمع الزوائد: 63/6. ہیثمی نے لکھا: ''اسے طبرانی نے روایت کیا اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔'' اسے ابن اسحاق نے بھی بسند حسن روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 157/2)

ہجرت سے ماخوذ احکام و اسباق

* رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر اپنے ایک خطاب میں وضاحت فرمادی تھی:

«لَاهِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَّنِيَّةٌ»

''فتح مکہ کے بعد (مکہ سے) ہجرت کی ضرورت نہیں، البتہ جہاد کرو اور نیت رکھو۔''[1] (کہ اگر کبھی ہجرت کرنا پڑی تو ضرور کریں گے۔) چنانچہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کرنا واجب نہ رہا، تاہم دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت قیامت تک فرض ہے۔[2] مدینہ منورہ کی طرف ہجرت اس لیے ضروری قرار دی گئی تھی کہ مسلمان بلاخوف و خطر اپنے رب رحیم کی عبادت کر سکیں، اسلامی حکومت قائم کریں، اُس کی حفاظت کریں اور پھر دعوت الی اللہ کے ذریعے سے اس مملکت کی حدود بڑھاتے رہیں۔ فتح مکہ کے بعد ہجرت اس لیے ضروری نہ رہی کہ اُس وقت تک اسلامی حکومت نہ صرف قائم ہو چکی تھی بلکہ مضبوط و محفوظ بھی ہو چکی تھی اور مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ اب ضروری تھا کہ مسلمان اپنے اپنے علاقوں میں رہ کر شعائرِ اسلام قائم کریں اور دنیا کے ہر خطے میں اسلامی تعلیمات پھیلا دیں۔ اس مقصد کے لیے قیامت تک کے لیے جہاد فرض کر دیا گیا، چنانچہ فتح مکہ کے بعد نبیٔ کریم ﷺ اسلام قبول کرنے والوں سے اسلام، ایمان اور جہاد کی بیعت لیتے تھے۔ آپ ﷺ نے کسی سے ہجرت کی بیعت نہیں لی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسی بات کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے: ''فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت ختم ہو گئی۔ باقی رہی مطلق ہجرت تو وہ اُس وقت تک باقی رہے گی جب تک کافروں سے لڑائی باقی

[1] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب وجوب النفير وما يجب من الجهاد والنية، حديث: 2825، وصحيح مسلم، الحج، باب تحريم مكة وتحريم صيدها وخلاها، حديث: 1353.
[2] فتح الباري: 82/15 و 304/11، و أحكام القرآن لابن العربي: 876/2.

ہے۔''[1] یعنی جب تک دنیا میں کوئی بھی دارالکفر باقی ہے اور وہاں کے مسلمانوں کو اپنے دین کے بارے میں خطرات لاحق ہیں تو اُن پر کسی بھی دارالاسلام کی طرف ہجرت فرض ہے۔[2]

اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا جاتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰٓىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝﴾

''جن لوگوں کی جان فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ (جان بوجھ کر کافروں میں رہ کر) اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہوئے ہوں تو وہ (فرشتے) ان سے پوچھیں گے: کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ جواب دیں گے: ہم تو زمین میں بالکل بے بس تھے۔ وہ پوچھیں گے کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ چنانچہ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے، مگر وہ بے بس مرد، عورتیں اور بچے جو نہ کوئی تدبیر کر سکتے تھے اور نہ کوئی راہ پاتے تھے۔''[3]

چونکہ مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت کے قیام کا تقاضا تھا کہ باقاعدہ فوج ہو جو اس نوزائیدہ اسلامی ریاست کی حفاظت کرے، چنانچہ ہر اُس شخص پر، جو ہجرت کی طاقت رکھتا تھا مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرض کر دی گئی۔ علامہ خطابی نے کہا: ''مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت اس لیے ضروری تھی کہ آپ ﷺ کے ساتھ مل کر کفار سے جہاد کیا جائے اور دین کے مسائل کا علم حاصل کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس

[1] صحیح البخاري، المغازي، باب: 54، حدیث 4306,4305. [2] فتح الباري: 82/15.
[3] النسآء4: 98,97. فتح الباري: 303/11.

حکم کے بارے میں کئی آیاتِ کریمہ میں تاکید فرمائی حتی کہ مہاجرین اور غیر مہاجرین کے درمیان دوستی اور محبت ختم کر دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ﴾

''جو لوگ ایمان لائے مگر انھوں نے ہجرت نہیں کی، تمھارا اُن کے ساتھ دوستی (اور محبت کا) کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے جب تک کہ وہ ہجرت نہیں کرتے۔''[1]

پھر جب مکہ فتح ہو گیا اور تمام قبائل کے لوگ خود بخود مسلمان ہونے لگے تو ہجرت کی فرضیت ساقط ہو گئی، البتہ اس کا مستحب ہونا باقی رہا۔[2]

اس وضاحت کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی دارالکفر مسلمانوں کے لیے دین پر عمل کرنے اور دعوت الی اللہ کے سلسلے میں سازگار اور معاون ہو تو وہاں ٹھہرنا مسلمانوں کے لیے زیادہ مناسب ہوگا اور اُن پر ہجرت واجب نہیں ہوگی۔ ایسا ملک اگرچہ دارالاسلام نہیں مگر دارالاسلام جیسا ضرور ہے۔ اس لیے وہاں ٹھہرنا ہجرت سے زیادہ افضل ہوگا اور اس صورت میں غیر مسلموں کے داخلِ اسلام ہونے کا بھی بہت زیادہ امکان ہے۔[3]

* رسول اللہ ﷺ نے اس سفر میں وہ تمام مادی ذرائع اور وسائل استعمال کیے جن کا اس قسم کے اہم اقدام میں عقل تقاضا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے نہیں تھا کہ آپ ﷺ کو اپنی جان کے بارے میں کوئی خوف تھا یا آپ ﷺ کو کفار کے ہاتھ لگ جانے کا خطرہ تھا بلکہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ امتِ مسلمہ کے لیے ایسے امور میں اسوۂ حسنہ اُجاگر ہو جائے تاکہ وہ اس کی اقتدا کریں اور اپنے کاموں میں اسباب کا

[1] الأنفال 72:8. اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے: (تفسیر الطبري (تحقیق أحمد شاکر): 14/78-87)
[2] فتح الباري: 15/82. [3] فتح الباري: 15/82.

لحاظ رکھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ جب سبب پایا جائے تو اُس کا نتیجہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ الا یہ کہ اللہ تعالیٰ خود وہ نتیجہ روک دے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے جانے کے باوجود محفوظ رہے اور آگ اُن کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی کا ذریعہ بن گئی۔ ایسی صورت میں یہ معجزہ کہلاتا ہے۔ اگر نبی کے علاوہ کسی اور کے لیے ایسا واقعہ ظہور میں آئے تو نیک لوگوں کے لیے یہ کرامت اور برے لوگوں کے لیے یہ استدراج اور مہلت ہوگا۔

مندرجہ بالا باتوں کی دلیل یہ ہے کہ جب تمام مادی اسباب ختم ہو گئے تب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالکل مطمئن اور بے خوف تھے، البتہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خوف لاحق ہوا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان احتیاطی امور پر اعتماد اور بھروسا ہوتا تو ان کے ناکام ہونے کی صورت میں آپ پر خوف اور گھبراہٹ طاری ہونا ناگزیر تھا، چنانچہ آپ کا ان احتیاطی امور کو اختیار کرنا صرف ایک شرعی فریضہ تھا جسے آپ نے اختیار فرمایا۔ ضروری اسباب اختیار کرنے کے باوجود آپ کا دل اللہ تعالیٰ ہی سے لگا ہوا تھا اور اُسی کی مدد اور توفیق پر آپ کو بھروسا اور اعتماد تھا تاکہ مسلمان یہ پختہ عقیدہ رکھیں کہ تمام معاملات میں اعتماد اور بھروسا اللہ تعالیٰ ہی پر ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حصولِ مقصد کے لیے اسباب و تدابیر اختیار نہ کی جائیں۔[1]

* حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ایسے خطرناک موقع پر آپ کے بستر پر بخوشی لیٹ جانا ان کے محکم ایمان اور بہادری کی دلیل ہے۔ اس سے اُن کی عظیم الشان فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نجات کے اسباب اختیار کرتے ہوئے دشمن کو دھوکہ دینا اور بھیس بدلنا جائز ہے۔

* رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہجرت کے دوران میں نوجوان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، مثلاً:

[1] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 145.

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بیٹوں نے جو کردار ادا کیا وہ مسلمان نوجوانوں کے لیے پیروی کا بہترین نمونہ ہے کہ وہ کم عمری کے باوجود نہایت عظیم خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔

* اس سفر کے دوران میں جو معجزات اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں صادر کروائے وہ آپ ﷺ کی عزت افزائی کے لیے تھے۔ اُن معجزوں میں یہ اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ بہرحال آپ کی مدد کرے گا اور جلد یا بدیر آپ کے لائے ہوئے دین کو روئے زمین پر نافذ کردے گا۔

* سفر ہجرت کے دوران میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو کردار ادا کیا بلاشبہ وہ اُن کی عظیم الشان فضیلت کی گواہی دیتا ہے۔ اُن کے لیے یہی عزت و تکریم بس کافی ہے کہ اُن کے اس کردار کا ذکر قرآن مجید میں بھی کیا گیا ہے جس کی بنا پر وہ قیامت تک کے لیے زندۂ جاوید ہوگئے۔

﴿ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ﴾

''دو میں سے دوسرا، جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا: غم نہ کر، بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''[1]

* رسول اللہ ﷺ کا مدینہ میں داخل ہوتے وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے بٹھانا، حالانکہ دوسری سواری بھی موجود تھی، آپ ﷺ کی تواضع کی کامل دلیل ہے۔ آپ نے عامر بن فہیرہ اور عبداللہ بن ارقد کو اپنے برابر سمجھا تبھی دوسری سواری انھیں مرحمت فرمادی۔

* جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوایوب انصاری اور اُن کی زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے آثار سے کس قدر تبرک حاصل کرتے ہیں اور آپ ﷺ اُنھیں اس سے منع بھی نہیں کرتے تو ہم سمجھ جاتے ہیں کہ نبیٔ اکرم ﷺ کے آثار سے تبرک حاصل

[1] التوبۃ 40:9.

کرنا عظیم سعادت ہے بشرطیکہ وہ حقیقت میں موجود ہوں۔ [1] فی الوقت رسول اللہ ﷺ کے آثار کا پایا جانا بہت مشکوک ہے۔

* حضرت ابوایوب انصاری اور اُن کی زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہما کا طرزِ عمل اُس زبردست جذبۂ محبت و احترام کی دلیل ہے جو صحابۂ کرام کے دلوں میں آپ ﷺ کے لیے موجزن تھا اور یہ چیز رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے تمام مواقع پر بڑی کثرت سے جلوہ نما نظر آتی ہے۔

* رسول اللہ ﷺ کا لہسن استعمال نہ کرنا مزاج مبارک کی ایک خصوصیت ہے ورنہ یہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے، بشرطیکہ وہ اس کی بو زائل ہونے کے بعد مسجد میں آئیں اور اس کا طریقہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بتلایا ہے کہ پکا کر اس کی بو ختم کرنے کے بعد اسے کھایا جائے۔ [2]

ملحوظہ: ابن ابی شیبہ کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ چالیس سال کی عمر میں رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہونا شروع ہوئی، پھر آپ ﷺ تیرہ سال مکہ مکرمہ میں اور دس سال مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے۔ تریسٹھ سال کی عمر میں آپ ﷺ اللہ کو پیارے ہوئے۔ [3] معروف یہی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے چند ایسی صحیح روایات بھی بیان کی ہیں جو اس روایت سے جزوی طور پر مختلف ہیں۔

[1] التوسل، أنواعه وأحكامه للألباني، ص:142-147. [2] صحيح مسلم، المساجد ومواضع الصلاة، باب نهي من أكل ثومًا ......، حديث:567. [3] المغازي لابن أبي شيبة، ص:100,99. محقق کتاب دکتور عبدالعزیز عمری کی تحقیق کے مطابق یہ سند متصل ہے اور رجال ثقہ ہیں۔

باب

6

اسلامی معاشرہ اور تشکیلِ حکومت

- مسجد نبوی کی تعمیر
- مؤاخات (بھائی چارہ)
- میثاقِ مدینہ
- متفرقات

***

﴿ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾

''اور (مالِ فے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنالیا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لے آئے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور وہ اپنے آپ پر (انھیں) ترجیح دیتے ہیں، خواہ انھیں خود سخت حاجت ہو۔''

[الحشر 9:59]

أَلَا لَيْتَ شِعْرِي هَلْ أَبِيتَنَّ لَيْلَةً
بِوَادٍ وَّحَوْلِي إِذْخِرٌ وَّجَلِيلُ؟
وَهَلْ أَرِدَنْ يَّوْمًا مِّيَاهَ مَجَنَّةٍ؟
وَهَلْ يَبْدُوَنْ لِّي شَامَةٌ وَّطَفِيلُ؟

''کاش! پتہ چل جائے، کیا میں کوئی رات وادیٔ مکہ میں بسر کروں گا جبکہ میرے ارد گرد اذخر اور جلیل گھاس ہوگی؟ کیا میں کسی دن مجنہ کے کنویں پر جاؤں گا؟ اور کیا شامہ اور طفیل پہاڑ مجھے نظر آ سکیں گے؟''

مسجد نبوی کی تعمیر

جس جگہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی بیٹھی تھی' وہاں مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ جگہ بنونجار کے دو یتیم بچوں سہل اور سُہیل کی ملکیت تھی۔ اس سے پہلے یہ جگہ کھجوریں سُکھانے کا میدان تھی۔ یہ دونوں بچے حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں پرورش پا رہے تھے۔ جب آپ ﷺ کی اونٹنی اس جگہ بیٹھی تو آپ نے فرمایا: ''ان شاء اللہ! یہ جگہ ہمارا ٹھکانہ بنے گی۔'' پھر رسول اللہ ﷺ نے اُن دونوں بچوں کو بلایا اور اس جگہ مسجد بنانے کے لیے اُن سے سودا کرنا چاہا۔[1] انھوں نے عرض کی: ''اللہ کے رسول! ہم یہ جگہ آپ کے لیے ہبہ کرتے ہیں۔'' لیکن آپ ﷺ نے اسے بطورِ ہبہ لینا مناسب نہ سمجھا، پھر قیمت طے کی اور جگہ خرید لی۔ بعدازاں یہاں مسجد کی بنیاد رکھی۔[2]

صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے مسجد بنانے کا فیصلہ کیا تو بنونجار کے سرداروں کو پیغام بھیجا۔ وہ حاضر ہوگئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا: ''ابن عیینہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے اُن کے چچا سے بات کی (جس کی نگرانی میں وہ پرورش پا رہے تھے) کہ یہ جگہ اُن سے خریدی جائے۔ چچا نے اُن سے پوچھا تو وہ کہنے لگے: ''چچا! آپ اس جگہ کو کیا کریں گے؟'' اس لیے چچا کو مجبوراً صحیح بات بتانی پڑی، دیکھیے: (فتح الباري:15/101) [2] صحیح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3906.

«يَا بَنِي النَّجَّارِ! ثَامِنُونِي بِحَائِطِكُمْ هٰذَا»

''بنونجار! مجھ سے اس احاطے کی قیمت طے کرلو۔''

وہ کہنے لگے: ''نہیں، اللہ کی قسم! ہم تو اس کی قیمت اللہ تعالیٰ سے لیں گے۔''[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا: ''جو لوگ مالک کے علاوہ کسی اور کے سودا کرنے کو جائز سمجھتے ہیں وہ اس واقعے سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ سودا اُن لڑکوں کے بجائے سرداروں سے طے پایا۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے بنونجار کے سرداروں کے ساتھ وہ بچے بھی آئے ہوں کیونکہ وہ اُنھی میں سے تھے۔ آپ ﷺ نے انھی سے سودا طے کیا اور اُن کے ساتھ اُن کے چچا (اسعد بن زرارہ) کو بھی سودے میں شریک کیا جن کی سرپرستی میں وہ بچے رہ رہے تھے جیسا کہ حدیث میں ذکر ہو چکا ہے۔''[2]

صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ اُس جگہ مشرکین کی چند قبریں بھی تھیں، کچھ کھنڈر اور کھجوروں کے چند درخت بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے مشرکین کی قبریں اکھاڑ دی گئیں، کھنڈر ہموار کر دیے گئے اور کھجور کے درخت کاٹ دیے گئے۔ اس کے بعد قبلے والی دیوار کھجور کے درخت گاڑ کر بنائی گئی اور دائیں بائیں کی دیواریں پتھروں سے بنائی گئیں۔ صحابۂ کرام نے خود پتھر ڈھوئے۔[3] رسول اللہ ﷺ بھی اُن کے ساتھ اینٹیں اٹھاتے تھے اور ساتھ ساتھ یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے:

هٰذَا الْحِمَالُ لَا حِمَالُ خَيْبَرْ هٰذَا أَبَرُّ رَبَّنَا وَأَطْهَرْ

''یہ بوجھ جو ہم اٹھا رہے ہیں خیبر (کی کھجوروں) کا بوجھ نہیں بلکہ یہ تو اے ہمارے رب! نیک ترین اور پاکیزہ ترین کام ہے۔''

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب مقدم النبي ﷺ و أصحابه إلى المدينة، حديث: 3932. [2] فتح الباري: 126/15. [3] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، حديث: 3906.

اَللّٰھُمَّ! إِنَّ الْأَجْرَ أَجْرُ الْآخِرَۃْ فَارْحَمِ الْأَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃْ

''اے اللہ! اصل ثواب تو وہ ہے جو آخرت میں ملے گا، لہٰذا انصار و مہاجرین پر رحم فرما۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ صحابہ پتھر اٹھاتے ہوئے یہ شعر پڑھتے تھے جبکہ رسول اللہ ﷺ بھی اُن کے ساتھ تھے:

اَللّٰھُمَّ! إِنَّہٗ لَا خَیْرَ إِلَّا خَیْرُ الْآخِرَۃْ فَانْصُرِ الْأَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃْ

''اے اللہ! آخرت کی خیر و بھلائی کے سوا کوئی خیر کامل نہیں، لہٰذا انصار و مہاجرین کی مدد فرما۔''[2]

مسلمانوں میں سے ایک کہنے والے نے یوں کہا:

لَئِنْ قَعَدْنَا وَالرَّسُولُ یَعْمَلْ ذَاكَ إِذًا لَلْعَمَلُ الْمُضَلَّلْ

''اگر ہم فارغ بیٹھے رہے اور نبیٔ کریم ﷺ کام کرتے رہے تو یہ یقیناً بہت غلط کام ہوگا۔''[3]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لَا یَسْتَوِي مَنْ یَّعْمُرُ الْمَسَاجِدَا یَدْأَبُ فِیھَا قَائِمًا وَّ قَاعِدًا

وَمَنْ یُّرٰی عَنِ التُّرَابِ حَائِدًا

''یقیناً جو شخص مسجدیں تعمیر کرتا اور اُن میں کھڑا یا بیٹھا مسلسل عبادت میں مصروف رہتا ہے اور جو شخص مٹی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، یعنی تعمیر میں بھی حصہ نہیں لیتا

[1] صحیح البخاري، مناقب الأنصار، باب مقدم النبي ﷺ وأصحابه إلی المدینة، حدیث: 3932. [2] فتح الباري: 126,125/15. [3] یہ روایت ابن حجر رحمہ اللہ نے بیان کی اور مجمع بن یزید کی سند سے اس شعر کو زبیر رضی اللہ عنہ سے منسوب کیا ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 103/15)

اور عبادت بھی نہیں کرتا، یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔" [1]

رسول اللہ ﷺ ہر شخص سے وہی کام لیتے تھے جس میں وہ ماہر ہوتا تھا۔ حضرت طلق بن علی حنفی یمامی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ مسجد کی تعمیر میں مصروف صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرماتے تھے: "اس یمامی کو مٹی کے قریب کرو۔ یہ اپنے پاؤں سے خوب اچھی طرح مٹی کو گوندھتا ہے۔" ایک روایت میں ہے: "میں نے بیلچہ پکڑا اور مٹی کو اچھی طرح نرم کر دیا۔ شاید وہ آپ کو بہت پسند آئی۔ تبھی آپ ﷺ نے فرمایا: "مٹی تیار کرنے کی ذمہ داری اسی حنفی پر رہنے دو۔ یہ تم سب سے زیادہ اچھی مٹی تیار کرتا ہے۔" [2] بیہقی کی روایت میں ہے: "اس یمامی کو مٹی کے قریب کرو۔ یہ تم سب سے اچھا معمار ہے۔" [3]

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما مسجد کی تعمیر میں بڑی سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ایک ایک اینٹ اٹھاتے تھے جبکہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ دو دو اینٹیں اٹھاتے تھے۔ ایک اینٹ اپنی طرف سے اور ایک رسول اللہ ﷺ کی طرف سے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن کی کمر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور فرمایا: "ابن سمیہ! عام لوگوں کے لیے ایک اجر ہے لیکن تجھے دو اجر ملیں گے۔ اور (دنیا کے) زادِ راہ سے تیرا آخری حصہ دودھ کا ایک گھونٹ ہے۔ تو باغی جماعت کے ہاتھوں قتل ہوگا۔" [4]

یہ حدیث آپ کی نبوت کی عظیم الشان دلیل ہے کیونکہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ واقعی اُس فتنے میں شہید ہوئے جو حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان برپا ہوا۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ

[1] ان اشعار کو ابن حجر رحمہ اللہ نے ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی سند سے بیان کیا ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 103/15) [2] یہ دونوں روایتیں ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیں اور کہا: "اسے احمد نے روایت کیا ہے۔" دیکھیے: (فتح الباري: 112/3) [3] دلائل النبوة للبیهقي: 545/2. اس روایت کی سند صحیح ہے۔ [4] صحیح مسلم، الفتن، باب لا تقوم الساعة حتٰی یمر الرجل بقبر الرجل......، حدیث: 2916، والمصنف لعبدالرزاق: 240/11، حدیث: 20426، واللفظ له، ومسند أحمد: 5/3 و 319/4، والإصابة: 665/3. ابن حجر رحمہ اللہ کے مطابق عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو ابو غادیہ نے شہید کیا تھا۔

حضرت علی کے لشکر میں تھے اور عین اُسی طرح شہید ہوئے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا تھا۔

علامہ ابن کثیر اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث کی بہترین تشریح کی ہے۔ [1]

مسجد کی تعمیر بارہ دن جاری رہی۔ [2] اس سے فراغت کے بعد نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے لیے بالکل اسی انداز میں کمرے تعمیر کیے گئے جو مسجد میں اختیار کیا گیا۔ کمروں کی تکمیل کے بعد رسول اللہ ﷺ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے گھر سے اُن میں منتقل ہوگئے۔ ایک کمرہ حضرت سودہ بنت زمعہ ؓ کے لیے اور دوسرا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے بنایا گیا۔ [3] آغاز میں یہی دو کمرے بنائے گئے تھے، پھر جب کوئی اور خاتون آپ کے عقد میں آتی تھیں تو اُن کے لیے الگ کمرہ بنا دیا جاتا تھا۔ ان کمروں کی اونچائی بھی زیادہ نہ تھی اور صحن بھی چھوٹے تھے۔ [4] بعض کمرے کھجور کی شاخوں اور مٹی سے بنائے گئے اور بعض پتھر اور چونے سے۔ چھتیں سب کی کھجور کی شاخوں سے ڈالی گئی تھیں [5] جن کے نیچے صنوبر کے تنے بطورِ شہتیر رکھے گئے تھے۔ [6] دروازوں کے کنڈے نہیں تھے۔ [7] ازواجِ مطہرات کی وفات کے بعد خلیفہ عبدالملک کے دور میں یہ حجرے مسجد نبوی میں شامل کر لیے گئے۔ [8]

اذان اپنی موجودہ شکل میں راجح ترین قول کے مطابق ہجرت کے پہلے سال اس وقت

[1] البداية والنهاية: 239,238/3، وفتح الباري: 3/110-112. [2] دلائل النبوة للبيهقي: 509/2. یہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے۔ [3] فتح الباري: 87/15. یہ طبرانی کی روایت ہے۔ [4] سبل الهدیٰ والرشاد: 508/3. شامی نے لکھا: ''ابن سعد اور بخاری نے الأدب المفرد میں اور ابن ابی دنیا اور بیہقی نے شعب الإيمان میں حسن بصری سے روایت کی، انھوں نے کہا: ''عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جبکہ میں ابھی بلوغت کے قریب لڑکا تھا، میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے کمروں میں جایا کرتا تھا۔ میرا ہاتھ ان کمروں کی چھتوں کو چھو لیتا تھا۔'' [5] الروض الأنف: 248/2. بلا سند ہے۔ [6] الروض الأنف: 248/2. یہ روایت حسن بصری کی ہے۔ [7] الروض الأنف: 248/2. سہیلی کا کہنا ہے کہ اس روایت کو بخاری نے اپنی کتاب تاریخ میں نقل کیا ہے۔ [8] الروض الأنف: 248/2، وسبل الهدیٰ والرشاد: 507,506/3. یہ سند واقدی کی ہے۔

فرض کی گئی جب حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہ کو خواب میں اذان کا طریقہ سمجھایا گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم فرمایا تو انھوں نے سب سے پہلی اذان دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کانوں میں اذان کی آواز پڑی تو وہ فوراً اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ انھوں نے بھی خواب میں وہی کچھ دیکھا جو عبداللہ بن زید نے دیکھا ہے۔''[1]

مسجد اُسی حالت پر رہی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے تعمیر کیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُس میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ اضافہ کیا کہ مسجد کے ستون (کھجور کے تنوں کے بجائے) صاف ستھری لکڑی کے ستونوں سے تبدیل کر دیے اور چھت کو بارش سے محفوظ کر دیا، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا۔ انھوں نے کئی تبدیلیاں کیں۔ دیواریں منقوش پتھر سے بنا دیں۔ ستون بھی تبدیل کر کے منقوش پتھر سے بنا دیے اور چھت ساگوان کی لکڑی سے تیار کرائی۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کاریگروں کو مسجد رنگین بنانے سے روک دیا تھا تاکہ نمازیوں کی توجہ رنگ وروغن کی طرف نہ ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نقش و نگار کے ساتھ فخریہ انداز میں مساجد بنانے کو ناپسند کیا، خصوصاً جبکہ لوگ نمازوں کے ذریعے سے مساجد کو آباد نہ کریں۔[3]

ابتدائی تعمیر میں مسجد نبوی میں منبر نہ تھا۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جائے نماز کے قریب کھجور کے ایک تنے کے سہارے کھڑے ہو کر خطاب فرمایا کرتے تھے، پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے منبر تیار کیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے اس پر تشریف فرما ہوئے تو تنا چیخنے لگا۔ وہ اس طرح آواز نکالتا تھا جیسے حاملہ اونٹنی اپنے بچے کے شوق میں آواز نکالتی ہے کیونکہ وہ اپنے قریب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب سنا کرتا تھا۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس

[1] جامع الترمذي، الصلاة، باب ماجاء في بدء الأذان، حديث: 189. [2] صحيح البخاري، الصلاة، باب بنيان المسجد، حديث: 446. [3] فتح الباري: 107/3.

تشریف لائے، اُسے چمکارا، پیار کیا اور چپ کرا دیا، جس طرح روتے بچے کو چپ کرایا جاتا ہے۔[1] یہ واقعہ بھی آپ ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے۔

امام دارمی رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ مسجد اس تنے کی چیخوں سے گونج اٹھی تھی۔ لوگوں نے اسے روتا دیکھا تو خود بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے حتی کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے اپنا دست مبارک اس پر رکھا، تب وہ چپ ہوا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ اللہ کے ذکر سے محروم ہونے کی بنا پر رویا تھا۔ قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر میں اُسے اپنی بانہوں میں نہ لیتا تو یہ قیامت تک اسی طرح روتا اور چلاتا رہتا۔''[2] پھر آپ کے حکم سے اُسے منبر کے نیچے دفن کر دیا گیا۔

حسن بصری کی روایت ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ یہ حدیث بیان کرنے کے بعد آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا: ''مسلمانو! بے جان لکڑی رسول اللہ ﷺ کے شوق میں رو رہی ہے تو وہ لوگ جو آپ ﷺ سے ملاقات کے متمنی ہیں کیوں نہ آپ سے جذب و شوق رکھیں؟''[3]

مسجد نبوی، جب سے تعمیر ہوئی، اوّل تو مسلمانوں کی عبادت گاہ تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے تمام اہم معاملات انجام پانے کا مرکز بھی بن گئی۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

* کمزور فقیر اور غیر شادی شدہ مہاجرین جو اپنے لیے جداگانہ گھر بنانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، ان کی پناہ گاہ بھی مسجد تھی۔ وہ یہیں رہتے تھے، یہیں سوتے جاگتے اور کھاتے پیتے تھے۔ انھیں اہل صفہ کہا جاتا تھا۔[4]
* اکا دکا کمزور خواتین جو بیرونی قبائل سے مسلمان ہو کر مدینہ منورہ آگئیں اور ان کے

[1] صحيح البخاري، المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام، حديث: 3585,3584. [2] سنن الدارمي، المقدمة، باب ما أكرم النبي ﷺ بحنين المنبر، حديث: 41. [3] دلائل النبوة للبيهقي: 559/2. [4] فتح الباري: 102/3.

پاس رہائش کا کوئی انتظام نہ تھا۔ وہ بھی مسجد ہی میں رہتی تھیں، مثلاً: وہ حبشی لونڈی جس کے لیے مسجد کے ایک کونے میں چھپر بنایا گیا تھا۔ [1]

* مسلمانوں کے لیے دینی تعلیمات کے حصول کا مرکز بھی مسجد ہی تھی اور ایک جامع درسگاہ کا کام دیتی تھی۔
* دعوتِ نبوی، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف کفار و مشرکین کے شعری حملوں کے جواب میں مسلمانوں کی محفل شعر و سخن بھی مسجد ہی میں منعقد ہوتی تھی۔ [2]
* کافر و مشرک جنگی قیدیوں کو مسجد ہی میں باندھا جاتا تھا تاکہ دیکھنے والے عبرت حاصل کریں اور وہ قیدی بھی مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھیں اور ان کی مقدس زبانوں سے قرآن مجید اور احادیث نبویہ سنیں تاکہ وہ متاثر ہو کر مسلمان ہو جائیں۔ حضرت ثمامہ بن اُثال رضی اللہ عنہ کا واقعہ اس کی ایک مثال ہے۔ وہ قید ہو کر آئے تھے۔ مسجد نبوی میں اسیر رہے اور رسالت مآب ﷺ کے بے مثل اخلاق و کرم سے ایسے گھائل ہوئے کہ مسلمان ہو گئے۔ [3]
* مسلمان جنگی زخمیوں کے علاج کے لیے خیمے بھی مسجد ہی میں لگائے جاتے تھے۔ غزوۂ احزاب میں رُفَیْدَہْ کا خیمہ مسجد میں نصب کیا گیا۔ [4]
* رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے والے وفود کا استقبال بھی مسجد ہی میں کیا جاتا تھا۔ اردگرد کے سفیر اور قاصد بھی مسجد ہی میں حاضر ہوتے تھے۔

[1] اس حبشی لونڈی کی قوم نے اس پر الزام لگایا تھا کہ اس نے ہماری لڑکی کا ہار چرایا ہے، پورا واقعہ دیکھیے: (صحیح البخاري، الصلاة، باب نوم المرأة في المسجد، حدیث: 439) [2] صحیح البخاري، الصلاة، باب الشعر في المسجد، حدیث: 453. [3] صحیح البخاري، الصلاة، باب الاغتسال إذا أسلم......، حدیث: 462. اس واقعے کا ذکر سریہ قرطاء کے ضمن میں آئے گا۔ [4] صحیح البخاري، الصلاة، باب الخیمة في المسجد للمرضی وغیرهم، حدیث: 463.

* مجاہدین کے لشکر اور دستے یہیں تشکیل پاتے اور انھیں جھنڈے بھی یہیں دیے جاتے تھے۔

* مسلمان اپنے قائد محترم حضرت محمد ﷺ سے مسجد ہی میں ملاقات کرتے تھے۔ مجلس مشورہ و مذاکرہ بھی مسجد ہی میں ہوتی تھی۔ اس کے دو فائدے تھے: قائد محترم ہر وقت اپنی رعایا کے ساتھ گھل مل کر رہتے اور ان کے حالات سے بخوبی آگاہ رہتے اور عوام اپنے تمام مسائل کسی تاخیر یا تکلیف کے بغیر اپنے قائد گرامی کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ مسلمانوں کو مسجد ہی میں ایک دوسرے سے ملاقات کے مواقع میسر آتے تھے۔ جس کے نتیجے میں ان میں اخوت و محبت کے جذبات فروغ پاتے رہتے تھے۔ ہمارے زمانے کے قائدین اور عوام اس فہم سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسجد صرف عبادت کی جگہ ہے۔

مواعظ و حکمتیں

* جمہور فقہاء نے مسجد نبوی کی جگہ خریدنے کے لیے بچوں کے چچا کے ذریعے سے سودا کرنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جو بچہ بلوغت کی عمر کو نہ پہنچا ہو وہ اپنے مال میں تصرف نہیں کرسکتا۔ ان کے پاس قرآن مجید کی بھی ایک دلیل ہے:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ﴾

''اور تم یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو مگر بہترین طریقے سے حتی کہ وہ بالغ ہو جائے۔''[1]

جس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جگہ کا سودا رسول اللہ ﷺ اور بچوں کے درمیان براہ راست طے پایا اس کی یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ یہ صرف آپ ﷺ ہی کا خاصہ

[1] الأنعام 152:6.

ہے کیونکہ آپ سب مومنین کے ولی تھے (اوران کے لیے بھلائی کے خواہاں رہتے تھے۔) اسی لحاظ سے آپ ﷺ نے یہ سودا فرمایا۔ اس حدیث سے احناف کا یہ استدلال درست نہیں کہ نابالغ کا تصرف درست ہے کیونکہ یہ آیت کریمہ ابن عیینہ کی روایت کو اس روایت پر ترجیح دے رہی ہے۔ [1]

اس مسئلے کے بارے میں علماء کے مزید اقوال بھی ہیں:

- جو تصرفات یتیم کے فائدے میں ہوں وہ درست ہیں، مثلاً: کوئی ہبہ قبول کرنا۔
- جو تصرفات اس کے نقصان میں ہوں وہ درست نہیں، مثلاً: کسی دوسرے کو ہبہ کرنا۔
- جو تصرفات نفع اور نقصان دونوں کا احتمال رکھتے ہوں وہ ولی یا وصی کی اجازت پر موقوف ہیں۔

* مسجد کی تعمیر کے وقت مشرکین کی قبریں اُکھاڑنے والی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا: ''اس حدیث میں دلیل ہے کہ اگر قبرستان کسی کی مملوکہ زمین میں ہو تب بھی وہ زمین بیچی جا سکتی ہے اور اسے ہبہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر قبریں مٹ چکی ہوں اور وہ قابل احترام بھی نہ ہوں تو انھیں اُکھاڑ کر ہڈیاں باہر نکالی جا سکتی ہیں اور جب ہڈیاں نکال دی جائیں تو اس جگہ نماز پڑھی جا سکتی ہے اور ایسی جگہ مسجد بھی بنائی جا سکتی ہے۔''

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس زمین میں فوت شدگان کو دفن کیا گیا ہو اوران کی قبریں مٹ چکی ہوں اس کی فروخت جائز ہے۔ وہ اپنے مالک کی ملکیت ہی میں رہتی ہے اور اسی میں وراثت بھی چلے گی بشرطیکہ اسے وقف نہ کر دیا گیا ہو۔ [2]

* رسول اللہ ﷺ کا رجز پڑھنا یا دوسروں کے اشعار پڑھنا اس امر کی دلیل ہے کہ شعر

---

[1] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 153، وإعلام الساجد للزركشي، ص: 223. [2] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 154، و إعلام الساجد للزركشي، ص: 236، و فتح الباري: 15/ 126,125.

کہنا جائز ہے، خصوصاً جنگی ترانے لکھنا یا کٹھن اور اہم کاموں اور اجتماعی اہمیت کی مہم میں ہمت بڑھانے اور جوش دلانے والی نظمیں کہنا ایک مستحسن عمل ہے کیونکہ اشعار سے ہمت افزائی ہوتی ہے، دلوں میں جرأت اور بہادری کے جذبات موجزن ہوتے ہیں اور مشکل سے مشکل کام انجام دینا آسان ہو جاتا ہے۔

* مسجدِ نبوی کی تعمیر میں ظاہری تکلف اور سجاوٹ کا خیال نہیں رکھا گیا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے تو صراحت سے کہا تھا ''لوگوں کو بارشوں سے محفوظ کرو۔ سرخ و زرد رنگ لگانے سے پرہیز کرو۔ ایسا نہ ہو کہ لوگوں کو نماز سے غافل کر دو۔''[1] لہٰذا عام اہل علم نے اس سے استدلال کرتے ہوئے مساجد میں نقش و نگاری اور ضرورت سے زیادہ تزیین و آرائش کو مکروہ سمجھا ہے بلکہ بعض علماء نے تو حرمت کا فتویٰ بھی دیا ہے۔[2]
* علماء میں اختلاف ہے کہ کیا مسجد کی قبلے والی دیوار پر کوئی قرآنی آیت لکھی جا سکتی ہے اور کیا یہ عمل ممنوع نقش و نگاری کے ذیل میں تو نہیں آتا۔ علامہ زرکشی نے لکھا: ''قبلے والی دیوار پر کوئی قرآنی آیت یا کوئی عبارت لکھنا مکروہ ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ بعض اہل علم نے اسے جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں کچھ ایسے اقدامات کیے تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے ناپسند نہیں کیا تھا۔''[3]

مؤاخات (بھائی چارہ)

مہاجرین مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لائے تو ان میں سے اکثر خالی ہاتھ تھے۔ وہ

[1] إعلام الساجد للزركشي، ص:337. [2] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص:155,154، و فتح الباري:109,108/3. [3] إعلام الساجد للزركشي، ص:337.

اپنا مال متاع پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اگرچہ وہ کاشت کار نہ تھے اور انصار کاشت کار تھے، پھر بھی انصار نے انھیں ہر ممکن چیز مہیا کی اور انھیں اپنی زمینیں اور باغ پیش کر دیے تاکہ وہ وہاں کام کر کے نصف پیدا وار حاصل کر لیں۔ کئی زمیندار انصار نے انھیں بطور عطیہ زمینیں مہیا کر دیں۔ جب خیبر فتح ہوا تب جا کر وہ زمینیں انھیں واپس ملیں۔ [1] جب قریظہ اور نضیر کی فتوحات حاصل ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ نے بذات خود وہ درخت اور باغات انصار کو واپس کر دیے جو انھوں نے آپ ﷺ کو عطیہ کیے تھے۔ [2]

انصار کا یہ طرزِ عمل ان کی اس عظیم محبت و اخوت کا ترجمان ہے جو انھیں مہاجرین سے تھی۔ وہ انھیں اپنے آپ پر ترجیح دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں یوں گواہی دی ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾

”اور (مالِ فَے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنالیا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لے آئے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور وہ اپنے آپ پر (انھیں) ترجیح دیتے ہیں، خواہ انھیں خود سخت حاجت ہو۔“ [3]

ان کا ایثار اس حد تک پہنچ گیا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی: ”آپ پسند فرمائیں تو ہمارے گھر بھی لے لیجیے۔“

آپ نے ان کے حق میں کلمۂ خیر ارشاد فرمایا لیکن ان کی پیش کش قبول نہیں کی۔ اور مہاجر

[1] شرح النووي: 100,99/12. [2] شرح النووي: 101/12. [3] الحشر 9:59. فتح الباري: 261/14.

صحابہ کو ان زمینوں پر گھر بنا دیے جو انصار نے پیش کی تھیں یا جو کسی کی ملکیت نہیں تھیں۔ [1]

انصار نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: ''ہمارے باغات مہاجرین اور ہم میں تقسیم کر دیجیے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا ، قَالَ: يَكْفُونَكُمُ الْمَؤُونَةَ وَ يُشْرِكُونَكُمْ فِي الثَّمَرِ»

''نہیں۔ یہ تمھارے باغات میں کام کاج کریں گے اور پیداوار میں تمھارے ساتھ شریک ہو جایا کریں گے۔''

انصار نے کہا: ''جیسے آپ کی مرضی۔ آپ کا فرمان سر آنکھوں پر۔'' رسول اللہ ﷺ نے انصار سے فرمایا:

«إِنَّ إِخْوَانَكُمْ قَدْ تَرَكُوا الْأَمْوَالَ وَالْأَوْلَادَ وَخَرَجُوا إِلَيْكُمْ»

''تمھارے مہاجر بھائی اپنے مال و اولاد چھوڑ چھاڑ کر تمھارے پاس آ گئے ہیں۔''

انصار نے کہا: ''ہم اپنی جائدادوں سے انھیں حصہ دیے دیتے ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَوَ غَيْرَ ذٰلِكَ؟» ''کیا اس کے علاوہ کوئی صورت ہے؟''

انصار نے پوچھا: ''اللہ کے رسول! وہ کیا؟'' فرمایا:

«هُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْرِفُونَ الْعَمَلَ ، فَتَكْلِفُونَهُمْ وَ تُقَاسِمُونَهُمُ الثَّمَرَ»

''یہ لوگ کھیتی باڑی نہیں جانتے (لہٰذا انھیں زمین دینے کا کوئی فائدہ نہیں) تم ان سے کام لو اور پھل میں انھیں حصہ دے دیا کرو۔'' وہ کہنے لگے: ''ٹھیک ہے۔'' [2]

[1] أنساب الأشراف: 270/1. بلاذری نے لکھا: ''یہ دراصل ایک حدیث کا مضمون ہے جسے بخاری نے روایت کیا۔ اس حدیث میں یہ ہے کہ انصار نے اپنے گھروں میں مہاجرین کی رہائش پر قرعہ اندازی کی۔'' [2] البداية والنهاية: 250/3. مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ ابن کثیر رحمہ اللہ کا اس سلسلے میں ماخذ کیا ہے، البتہ امام بخاری نے (صحيح البخاري، حديث: 2325 و 2719 و 3782) میں اس کا مختصراً تذکرہ کیا ہے اور اس حدیث کا مضمون درست ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: ''نبیِ اکرم ﷺ نے انصار کو بلایا کہ آؤ تمھیں بحرین کی زمین الاٹ کر دوں۔'' انصار کہنے لگے: ''نہیں، سوائے اس کے کہ آپ ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اتنی ہی زمین بانٹیں۔'' آپ نے فرمایا: ''اگر تم نہیں مانتے تو صبر کرنا حتی کہ مجھ سے (حوض پر) ملاقات ہو۔ میرے بعد تمھارا سامنا ترجیح ذات سے ہوگا۔'' [1]

انصار نے رسول اللہ ﷺ کے معزز مہمانوں کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ امام بخاری ہی کی روایت ہے کہ ایک آدمی نبیِ کریم ﷺ کے پاس سخت بھوک کی حالت میں آیا۔ رسول اللہ ﷺ کو اپنی تمام ازواج مطہرات کے ہاں اس کی خاطر مدارات کے لیے کچھ نہ ملا۔ آپ نے صحابۂ کرام سے اس کی مہمان نوازی کرنے کو فرمایا۔ ایک انصاری نے اُسے اپنا مہمان بنا لیا لیکن اس کے گھر میں بھی بال بچوں کے کھانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو بہلا پھسلا کر بھوکا سلا دیا اور کھانا نبوی مہمان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ خود بھی ساتھ بیٹھ گیا، پھر طے شدہ منصوبے کے مطابق اس کی بیوی نے چراغ بجھا دیا۔ یوں وہ مہمان کے سامنے دکھاوے کا پارٹ ادا کرتے رہے اور یہ ظاہر کرتے رہے کہ ہم بھی کھانا کھا رہے ہیں، حالانکہ انھوں نے کچھ بھی نہیں کھایا تاکہ مہمان پیٹ بھر کر کھا سکے۔ وہ خود ساری رات بھوکے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾

''یہ لوگ اپنے آپ پر (دوسروں کو) ترجیح دیتے ہیں خواہ انھیں خود سخت حاجت ہو۔'' [2]

اس ایثار کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ایسا بندوبست مناسب سمجھا جس سے مہاجرین

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب قول النبي ﷺ للأنصار: «اصبروا حتى تلقوني على الحوض» حديث:3794. [2] الحشر 9:59.

کے اقتصادی مسائل حل ہو جائیں اور انھیں یہ احساس نہ ہو کہ وہ اپنے انصاری بھائیوں پر بوجھ ہیں، چنانچہ آپ نے ہجرت کے پہلے سال ہی ''مؤاخات'' کا نظام قائم فرمایا۔ [1]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''مؤاخات'' کا اعلان حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے گھر کیا گیا [2] اور بعض روایات کے مطابق یہ اعلان مسجد نبوی میں کیا گیا۔ [3]

یہ بھی کہا گیا ہے کہ مؤاخات دو دفعہ قائم کی گئی۔ ایک دفعہ مکہ مکرمہ میں صرف مہاجرین کے درمیان اور ایک دفعہ مدینہ منورہ میں مہاجرین اور انصار کے درمیان ۔ یہاں اسی دوسری مؤاخات کا ذکر ہے۔ [4]

ابن سعد نے اپنے استاد واقدی کے واسطے سے تابعین کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے ۔ آپ نے مہاجرین کے درمیان بھی مؤاخات قائم فرمائی اور مہاجرین وانصار کے درمیان الگ سے مؤاخات قائم کی۔ اس مؤاخات کی بنیاد حق اور ہمدردی پر رکھی گئی۔ طے پایا کہ وہ موت کے بعد بھی ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔ یہ کل نوے آدمی تھے۔ پینتالیس مہاجر اور پینتالیس انصار۔ [5]

[1] فتح الباري: 130/15. [2] صحيح البخاري، الكفالة، باب قول الله عزوجل: ﴿وَالَّذِينَ عَاقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ﴾، حديث: 2294، و صحيح مسلم، فضائل الصّحابة، باب مؤاخاة النبي صلی اللہ علیہ وسلم بين أصحابه رضی اللہ عنہم، حديث: 2529. [3] ظاہر ہے کہ ان اقوال میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ مؤاخات ایک ہی دن میں مکمل نہیں ہوگئی تھی بلکہ جوں جوں مہاجرین آتے جاتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مؤاخات قائم کرتے رہتے تھے۔ اگر ترجیح ہی دینا ہو تو صحیح مسلم کی روایت کو ترجیح ہوگی کہ مؤاخات کی ابتدا حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر ہوئی تھی۔ [4] الدرر لابن عبدالبر، ص: 100. [5] الطبقات الكبرىٰ: 238/1. ڈکتور اکرم ضیاء عمری نے لکھا ہے کہ مدینہ میں مہاجرین کی باہمی مؤاخات کا ذکر صرف ابن سعد ہی نے نہیں کیا بلکہ حاکم نے مستدرک میں اور الضیاء نے مختارہ میں ابن عباس کی روایت درج کی ہے کہ انھوں نے کہا: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے درمیان رشتۂ مؤاخات قائم کیا۔'' ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل کی اور اس کی سند کو حسن قرار دیا، دیکھیے: (المجتمع المدني في عهد النبوة، ص: 75) اور اس سند پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''یہ سند سابقہ سندوں سے مل کر قوی ہو جاتی ہے۔'' دیکھیے: (فتح الباري: 131/15)

بعض روایات کے مطابق کل تعداد سو تھی۔ پچاس مہاجر اور پچاس انصار۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب مہاجرین مدینہ منورہ آئے تو اس مؤاخات کے بعد رشتہ داروں کے سوا مہاجرین انصار کے وارث بنتے تھے۔ [1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا کہ مؤاخات کا ایک مقصد یہ تھا کہ بعض مہاجر مالی، خاندانی اور جسمانی لحاظ سے دوسروں سے فائق تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان مؤاخات قائم فرما دی تا کہ ادنیٰ کو اعلیٰ سے فائدہ پہنچے اور اعلیٰ بھی بوقت ضرورت ادنیٰ سے مدد لے سکے۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مؤاخات کا راز معلوم ہو جاتا ہے۔ بعثت سے پہلے بھی حضرت علی کے بچپن کے دور سے آپ ﷺ ہی ان کے ذمہ دار تھے اور یہ معاملہ بعد میں بھی قائم رہا۔ حضرت حمزہ اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم کی مؤاخات میں بھی یہی راز ہے کہ حضرت زید ہاشمیوں کے آزاد کردہ تھے اور یہ تعلق پہلے ہی سے تھا اور دونوں مہاجر تھے۔ [2]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے اور علی کے درمیان، [3] زبیر اور ابن مسعود کے درمیان، [4]

[1] صحيح البخاري، التفسير، باب: 7، حديث: 4580، وتفسير ابن كثير: 2/255. [2] ابنِ اسحاق نے نبیِ کریم ﷺ اور علی، حمزہ اور زید رضی اللہ عنہم کی باہمی مؤاخات کا ذکر بغیر سند کے کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 2/171، 172) [3] اس کا ذکر ایک حدیث میں ہے جسے حاکم نے نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں اسحاق بن بشر کاہلی اور جمیع بن عمیر تیمی ہیں۔ حاکم نے سند پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 3/14) ذہبی کا کہنا ہے کہ جمیع پر جھوٹ بولنے کا الزام ہے اور کَاهِلي هالك (برباد شدہ) ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے نبیِ کریم ﷺ اور علی رضی اللہ عنہ کی مؤاخات کے متعلق چند احادیث درج کرنے کے بعد لکھا: ''یہ روایت سابقہ روایات سے مل کر قوی ہو جاتی ہے۔'' دیکھیے: (فتح الباري: 15/131) زاد المعاد کے دونوں محققین کا کہنا ہے کہ نبی ﷺ اور علی رضی اللہ عنہ کی مؤاخات کے متعلق وارد ہونے والی تمام احادیث ضعیف ہیں۔ [4] اس کی تحقیق اوپر گزری ہے۔ ابن اسحاق کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زبیر اور سلمہ بن وقش رضی اللہ عنہما کے درمیان رشتۂ مؤاخات قائم کیا تھا۔ اس کی سند ضعیف ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 2/173)

عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ربیع کے درمیان، [1] سلمان فارسی اور ابو الدرداء کے درمیان، [2] ابو عبیدہ اور ابو طلحہ کے درمیان، [3] عمر بن خطاب اور عتبان بن مالک کے درمیان [4] اور ابو بکر اور حضرت خارجہ بن زید رضی اللہ عنہم [5] کے درمیان مؤاخات قائم فرمائی۔

ابن اسحاق نے ان صحابہ کی خاصی تعداد بیان کی ہے جن کے درمیان آپ ﷺ نے مؤاخات قائم کی تھی۔ [6] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کے حوالے سے نقل کرنے کے بعد اشکالات بھی رفع کیے ہیں۔ [7]

اس مؤاخات کے عملی مظاہر میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہما کا واقعہ ایثار اور خودداری کی نادر مثال ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن کو پیشکش کی کہ میں انصار میں سب سے مالدار شخص ہوں۔ میں تمھیں اپنا آدھا مال دے رہا ہوں۔ میری دو بیویاں ہیں جسے تم پسند کرو میں اسے طلاق دیے دیتا ہوں، عدت کے بعد اس سے نکاح کر لینا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا بتا دیجیے کہ یہاں تجارتی منڈی کہاں ہے۔'' انھیں بنو قینقاع کے بازار کا پتہ بتا دیا گیا۔ وہ وہاں پہنچے۔ لین دین کیا۔ شام کو واپس آئے تو ان کے پاس اتنی بچت ہو چکی تھی کہ اپنے

---

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب إخاء النبي ﷺ بين المهاجرين والأنصار، حديث: 3780. [2] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب كيف آخى النبي ﷺ بين أصحابه؟ قبل الحديث: 3937. [3] صحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب مؤاخاة النبي ﷺ بين أصحابه ﷺ، حديث: 2528. [4] ابن حجر نے لکھا: ''کتاب الصلاۃ کے آغاز میں عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول گزر چکا ہے کہ میرا ایک انصاری بھائی تھا۔ اس کی شرح میں بتایا گیا ہے کہ یہ انصاری بھائی عتبان بن مالک تھا۔'' دیکھیے: (فتح الباري: 131/15) ابن اسحاق نے اس روایت کو بغیر سند کے بیان کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 173/2) [5] السيرة النبوية لابن هشام: 172/2. یہ ابن اسحاق کی معلق روایت ہے۔ معلق روایت ضعیف کی اقسام میں سے ہے۔ [6] السيرة النبوية لابن هشام: 2/172-175. [7] سبل الهدٰى والرّشاد: 3/529-533. شامی نے کئی ماخذوں سے اُن صحابۂ کرام کے نام لکھے ہیں جن کے درمیان رشتۂ مؤاخات قائم ہوا۔

کھانے کے لیے پنیر اور گھی لیتے آئے، پھر روزانہ بازار جاتے رہے، خرید وفروخت کرتے رہے حتی کہ انھیں حضرت سعد کے مال کی کوئی ضرورت نہ رہی اور چند ہی دنوں میں انھوں نے ایک انصاری خاتون سے شادی بھی کر لی اور مہر میں سونے کا سکہ ''نواۃ'' دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر انھیں کم از کم ایک بکری کے گوشت سے ولیمہ کرنے کا حکم دیا۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اس لیے بھی مؤاخات قائم کی تاکہ وہ ترک وطن کی وحشت اور احساس اجنبیت سے نجات پا جائیں۔ اہل وعیال اور خاندان سے جدائی محسوس نہ ہو اور ایک دوسرے کے معاون اور مددگار بن جائیں، پھر جب اسلام مضبوط ہو گیا، مسلمانوں کی شیرازہ بندی ہو گئی، اجنبیت ختم ہو گئی، کاروبار زندگی رواں دواں ہو گیا، معاشی پریشانیاں ختم ہو گئیں اور روزگار کے وسائل مہیا ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے مؤاخات کی بنا پر قائم وراثت ختم کر دی اور مومنین کا باہمی بھائی چارہ برقرار رہا۔ اس کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۠﴾

''اور (خون کے) رشتے دار اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو بخوبی جاننے والا ہے۔''[2]

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤى اَوْلِيٰٓىِٕكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا﴾

''اور (خون کے) رشتے دار اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کے دیگر مومنین اور مہاجرین سے زیادہ حق دار ہیں مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں سے کوئی نیکی کرو (تو یہ

[1] صحيح البخاري، البيوع، باب ما جاء في قول الله عزوجل: ﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ﴾، حديث: 2048. [2] الأنفال 8:75.

جائز ہے)، کتاب میں یہ ہمیشہ سے لکھا ہوا ہے۔'' [1]

یہ جنگ بدر [2] یا ایک روایت کے مطابق جنگ احد کے بعد کی بات ہے۔ [3]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا ہے کہ مؤاخات کے نظام سے صرف وراثت ہی ختم کی گئی تھی، البتہ باہمی تعاون، امداد، ایک دوسرے کی بھلائی اور خیر خواہی باقی ہے۔ اگر کوئی اپنے مؤاخاتی بھائی کے حق میں وصیت کرنا چاہے تو وہ بھی کر سکتا ہے۔ [4] نووی نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔ [5]

اس بات کی دلیل کہ وراثت کے سوا مؤاخات اپنے تقاضوں سمیت بدستور برقرار رہی، یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہما کے درمیان رشتۂ مؤاخات قائم کیا، حالانکہ حضرت سلمان فارسی غزوۂ احد اور خندق کے درمیانی عرصے میں مسلمان ہوئے۔ [6] اسی طرح معاویہ اور حُتَات اسلمی رضی اللہ عنہما کا رشتۂ مؤاخات تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے [7] اور حضرت حُتَات عام الوفود 9 ہجری کے اوائل میں مسلمان ہوئے جب وہ وفد بنی تمیم میں شامل ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ [8]

[1] الأحزاب 6:33. اس آیت کی تفسیر میں وارد صحیح روایات کے لیے دیکھیے: (فتح القدير للشوكاني: 331/2، وتفسير ابن كثير: 43/4، 383,382/6) [2] الطبقات الكبرىٰ: 238/1. یہ واقدی کی سند ہے۔ [3] یہ بات ابن سعد، ابن ابی حاتم اور حاکم نے نقل کی ہے۔ دکتور اکرم ضیاء عمری نے لکھا ہے کہ اسے ابن مردویہ نے صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (المجتمع المدني، ص: 78) اور شوکانی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (فتح القدير: 331,330/2) [4] صحيح البخاري، التفسير، سورة النساء، حديث: 4580. [5] دیکھیے حاشیہ: (صحيح مسلم: 1960/4) [6] الإصابة: 62/2، والاستيعاب لابن عبدالبر: 58/2. ابن عبدالبر نے ان علماء کی بات کو راجح قرار دیا ہے جنھوں نے کہا کہ سلمان رضی اللہ عنہ غزوۂ احد کے بعد ایمان لائے۔ یہ امر ثابت ہے کہ سلمان رضی اللہ عنہ سب سے پہلے جس جنگ میں شریک ہوئے وہ غزوۂ خندق تھی، دیکھیے: (الطبقات الكبرىٰ: 75/4) [7] الإصابة: 433/3. [8] الإصابة: 311/1.

حضرت جعفر بن ابی طالب اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما میں بھی مؤاخات قائم کی گئی، حالانکہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبشہ سے اس وقت واپس آئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم 7 ہجری کے اوائل میں غزوۂ خیبر سے ابھی واپس ہی آئے تھے۔

مؤاخات کے ثمرات و حکمتیں

* جو جماعت کسی ایک مقصد کے لیے کوشاں ہو اس کے افراد کے درمیان مؤاخات کی بنیاد پر تعلقات قائم ہونے ضروری ہیں تاکہ وہ ہر مشکل اور آزمائش کے موقع پر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں۔ جس مؤاخات کی بنیاد عقیدے پر ہو وہ اس جماعت کی مضبوطی اور پائیداری کی بنیاد بن جاتی ہے۔ دراصل یہی وہ بنیاد ہے جو ان کی معاشرتی زندگی میں دین کے نفاذ کو ممکن بناتی ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مؤاخات کے حد درجہ شائق تھے۔ مؤاخات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گئے اور انھیں زمینی اقتدار حاصل ہو گیا۔ اور ان کی شخصیتوں میں مبادیِ اسلام کا عملی نمونہ جگمگانے لگا۔
* مؤاخات کے درخشاں واقعات نہایت ایمان افروز اور سبق آموز ہیں۔ ہر دور میں مسلمانوں کی پوری کوشش ہونی چاہیے کہ وہ باہمی ہمدردی، تعاون اور خیر خواہی کی بنیاد پر آپس میں بھائی چارہ قائم کریں اور اس بھائی چارے کی بنا پر خصوصی حقوق و فرائض متعین کیے جائیں۔[1]
* حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنے مؤاخاتی بھائی حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی پیشکش پر جس قدر پر وقار کردار اور شانِ استغنا کا ثبوت دیا وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً مہاجرین بڑے باصلاحیت تھے اور اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اہم ترین کارنامے انجام دیتے تھے۔

[1] المجتمع المدني للدكتور العمري، ص: 80.

میثاقِ مدینہ

رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں سکون واطمینان سے قیام پذیر ہوئے تو آپ کی خواہش ہوئی کہ مدینہ منورہ کے باسیوں کے درمیان تعلقات مضبوط کریں۔اس وقت آپ نے یہ تحریر تیار کرائی جسے پرانی کتابوں میں تو''کتاب'' یا''صحیفہ'' کہا گیا مگر جدید مؤرخین نے اسے''دستور'' یا''میثاق'' یا''وثیقہ'' کا نام دے دیا ہے۔

چونکہ یہ میثاقِ نہایت اہم ہے اور موجودہ دور کے محققین نے اسے مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کے حسن انتظام، اسلامی حکومت کے نظم و ضبط، دوسری حکومتوں اور قوموں کے ساتھ تعلقات اور اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد قرار دیا ہے اور تمام قانون پسند افراد نے، چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اسے انتہائی سبق آموز، دوررس اور نہایت اہم دستاویز قرار دیا ہے۔بہت ضروری ہے کہ ہم اختصار کے ساتھ اس کی تفصیلات پیش کر کے اس کا جائزہ لیں۔

میثاق کا مضمون

مسلمانوں سے متعلقہ شقیں

* مسلمان چاہے وہ قریش سے تعلق رکھتے ہوں یا یثرب سے، وہ مقامی ہوں یا باہر سے آکر یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ مل گئے ہوں اور ان کے ساتھ مل کر اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے کوشاں ہوں، سب (بلاامتیاز) ایک امت شمار ہوں گے اور باقی لوگ دوسری امت۔
* مومنین کے تمام گروہ (مہاجرین، بنوساعدہ، اوس وغیرہ) آپس میں دیت بھرنے،

قیدی چھڑانے اور باہمی حق و انصاف کے سلسلے میں ایک دوسرے سے پورا تعاون کریں گے اور مسلمان اپنے میں سے کسی غریب و نادار اور قرض و تاوان کے بوجھ تلے دبے ہوئے شخص کو تنہا نہیں چھوڑیں گے بلکہ دیت اور فدیے میں اس سے بھرپور تعاون کریں گے۔

* تمام متقی مومن ظالم کے خلاف یک جان ہوں گے اور سختی سے اس کی مخالفت کریں گے، چاہے وہ انھی کا بیٹا ہو۔
* سب مسلمانوں کی پناہ ایک ہوگی جو اللہ کے نام پر دی جائے گی۔ ایک ادنیٰ مسلمان بھی کسی کو ایسی پناہ دے سکے گا اور سب پر اس کی تعمیل واجب ہوگی۔ سب مسلمان ایک دوسرے کے مخلص دوست اور مددگار ہوں گے۔
* اگر کوئی یہودی مسلمان ہو جائے تو نہایت ہمدردی کے ساتھ اس کی مدد کی جائے گی۔ اس کے متعلقین میں سے کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا نہ ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی۔

مشرکین سے متعلقہ شقیں

* کوئی مشرک کسی قریشی (اہل مکہ) کے جان مال کو پناہ نہیں دے گا اور ان کے خلاف مومنوں کی کارروائی میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔
* قریش اور ان کے حلیف اگر صلح کی پیشکش کریں تو ان سے صلح ہو سکتی ہے، البتہ جو قریشی مسلمانوں کی مخالفت کریں اور آمادۂ جنگ رہیں ان سے کوئی صلح نہیں۔
* قریش اور ان کے مددگاروں کو کسی قسم کی پناہ نہیں دی جائے گی۔

یہود سے متعلقہ شقیں

* اگر مومنین کی کسی سے لڑائی یا مخالفت ہوگی تو یہودی مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔
* بنوعوف کے یہودی مومنین کے حلیف شمار ہوں گے۔ وہ اپنے دین پر قائم رہ سکتے

ہیں۔ ان کے غلاموں کو بھی انھی جیسے حقوق حاصل ہوں گے جو بنوعوف کے یہودیوں کو حاصل ہیں۔

* یہودیوں میں سے کسی کو حضرت محمد (ﷺ) کی اجازت کے بغیر معاہدے سے خارج نہیں کیا جا سکے گا۔

* یہودی اپنا خرچہ برداشت کریں گے اور مسلمان اپنا۔ اس میثاق پر دستخط کرنے والوں میں سے کسی کے ساتھ کوئی لڑے گا تو سب ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور ایک دوسرے کے خیر خواہ رہیں گے۔ اس کے تمام شرکاء مظلوم کی مدد کریں گے۔

انتظامی شقیں

* اس معاہدے میں شریک ہونے والے تمام فریقوں کے لیے یثرب (مدینہ) حرم ہوگا۔ یہاں پناہ حاصل کرنے والا بھی شرکائے معاہدہ کے مانند ہوگا نہ کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا نہ جرم کا ارتکاب کیا جائے گا۔ شرکاء کی باہمی رضامندی کے بغیر کسی کو یہاں پناہ نہ دی جا سکے گی۔

* اس دستاویز پر دستخط کرنے والوں کے مابین کوئی جھگڑا یا اختلاف پیدا ہو جس سے معاشرے کے امن و امان کو خطرہ لاحق ہو تو اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ اور محمد ﷺ فرمائیں گے۔

* اس دستاویز پر دستخط کرنے والے ہر اس شخص کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں گے جو مدینہ پر حملہ آور ہوگا۔

* مدینہ کا کوئی باسی مدینہ میں رہے یا کسی کام سے باہر جائے اُسے امن حاصل ہوگا، البتہ ظالم اور مجرم کو کوئی تحفظ نہیں دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ اس شخص کے حامی اور مددگار ہوں گے جو نیکی، وفاداری اور تقویٰ پر کاربند رہے گا۔[1]

[1] من معين السيرة للشامي، ص: 164,163. اللہ تعالیٰ کی مدد کے بعد ہم نے میثاقِ مدینہ کی

میثاق مدینہ سے متعلقہ روایات

* سب سے قدیم مؤرخ جنھوں نے اس کی مکمل عبارت نقل کی، محمد بن اسحاق ہیں جن کی وفات 151ھ میں ہوئی۔ [1]

* امام احمد کی روایت: اس میں انتہائی اختصار کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''نبیِ کریم ﷺ نے مہاجرین و انصار کے مابین ایک دستاویز تحریر کرائی کہ وہ دیت وغیرہ کی ادائیگی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔ قیدیوں کو چھڑائیں گے اور مسلمانوں کے مابین اصلاح کے لیے سرگرم عمل رہیں گے۔'' یاد رہے، امام احمد رحمہ اللہ کی وفات 241ھ میں ہوئی۔ اس روایت کی دو سندیں ہیں۔

* احمد بن ابی خیثمہ کی روایت: ان کی وفات 279ھ کی ہے۔ ابن سید الناس کا بیان ہے کہ انھوں نے اسے محمد بن اسحاق کی روایت کے مانند بیان کیا ہے لیکن انھوں نے اس کی سند بیان کی ہے۔ [2] سند میں ایک راوی کثیر بن عبداللہ ہیں۔ ان کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ [3] بعض محققین کا رجحان انھیں ضعیف قرار دینے کی طرف ہے۔ [4]

» روایات کے متعلق حدیثی تحقیقات کے سلسلے میں جن ماخذوں سے مدد لی اُن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے: استاذ (پروفیسر) ضیدان یامی کا مقالہ بعنوان بيان الحقيقة في الحكم على الوثيقة. استاذ ہارون رشید محمد اسحاق کا پیش کردہ ماسٹرز کا تھیسز جس کا عنوان ہے: صحيفة المدينة: دراسة حديثية وتحقيق اور دکتور اکرم ضیاء العمري کی کتاب: المجتمع المدني في عهد النبوة. میثاقِ مدینہ کا مکمل متن ابن اسحاق کی روایت سے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 2/167-172) [1] السيرة النبوية لابن هشام: 2/167-172. یہ معلّق روایت ہے۔ دکتور عون شریف قاسم کی اپنی کتاب دبلوماسية محمد ﷺ میں بیان کردہ ترتیب کے مطابق اس کی 52 شقیں ہیں اور استاذ ہارون رشید کی ترتیب کے مطابق 47 شقیں ہیں۔ میثاق کا مضمون دونوں کے ہاں یکساں نوعیت کا ہے۔ [2] عيون الأثر لابن سيد الناس: 1/197,198. [3] کثیر بن عبداللہ کو ضعیف یا جھوٹا کہنے والوں میں ابن ابی حاتم بھی شامل ہیں، دیکھیے: (الجرح والتعديل لابن أبي حاتم: 7/54) [4] بيان الحقيقة لليامي، ص: 16-19.

اور بعض انھیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔ [1]

* ابو عبید قاسم بن سلام (متوفی 224ھ) کی روایات: ان میں سے دو کتاب الاموال میں ہیں۔ [2] پہلی روایت کی دو سندیں ہیں۔ ایک سند مرسل ہے کیونکہ یہ زہری پر موقوف ہے۔ اس میں عبداللہ بن صالح ہیں، یہ بھی مختلف فیہ راوی ہیں۔ [3] اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''اللہ کے رسول ﷺ کی جانب سے یہ معاہدہ تمام مومنوں اور مسلمانوں کے لیے ہے، خواہ وہ قریش سے ہوں یا یثرب میں رہنے والے یا باہر سے آکر ان کے ساتھ مل کر رہنے والے اور کفار سے جہاد کرنے والے ہوں ......، یہ سب لوگ ایک امت شمار ہوں گے......''

انھوں نے محمد بن اسحاق کی طرح طویل حدیث بیان کی ہے۔

دوسری سند میں یحییٰ بن عبداللہ [4] لیث کے حوالے سے بیان کرتے ہیں لیکن یہ بھی مرسل اور زہری پر موقوف ہے، چنانچہ دونوں سندیں ایک جیسی ہیں۔ یحییٰ بن عبداللہ ثقہ ہیں اور اس روایت میں عبداللہ بن صالح نے ان کی متابعت (تائید) کی ہے۔

دوسری روایت حجاج کی سند سے ہے اور مرسل ہے کیونکہ یہ ابن جریج پر موقوف ہے جو تدلیس کرنے اور مرسل روایت بیان کرنے میں معروف ہیں۔ [5] اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''نبیِ کریم ﷺ کی تحریر کردہ دستاویز جو مسلمانوں اور مومنوں کے مابین لکھی گئی، چاہے وہ قریش ہوں یا اہل یثرب یا جو دیگر علاقوں سے آکر ان کے ساتھ رہنے لگے ہیں۔ یہ آپس میں ادائے دیت اور فدیہ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے اور کسی مسلمان کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔''

---

[1] صحیفة المدينة المنورة لهارون رشيد، ص: 99. [2] صحیفة المدينة المنورة لهارون الرشيد، ص: 126. [3] تقريب التهذيب: 423/1. [4] ان کی روایت بخاری، مسلم اور ابن ماجہ نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کی ہے، دیکھیے: (تقريب التهذيب: 351/2، وتهذيب التهذيب: 238,237/11) [5] تقريب التهذيب: 520/1.

تیسری روایت ان کی کتاب غریب الحدیث میں ہے۔ اسے انھوں نے تین سندوں سے بیان کیا ہے۔ پہلی سند میں حفص، کثیر بن عبداللہ سے، وہ اپنے والد عبداللہ سے اور عبداللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ کثیر کے بارے میں تفصیل گزشتہ اوراق میں آچکی ہے۔ دوسری سند میں حماد بن عبید اور جابر جعفی ہیں۔ یہ دونوں ضعیف ہیں۔[1] نیز یہ روایت شعبی یا ابوجعفر محمد بن علی الباقر پر موقوف ہے، چنانچہ یہ سند مرسل بھی ہے اور ضعیف بھی۔

* حمید بن زنجویہ (متوفی 251ھ) کی روایت: یہ روایت انھوں نے اپنی کتاب ''الاموال'' میں بیان کی ہے۔ یہ ابن اسحاق کی روایت کی طرح ہی ہے، نیز یہ زہری کی بلاغات (بلا سند روایات) سے ہے۔ اس کی سند میں عبداللہ بن صالح ہیں۔ اور یہ روایت بھی عبداللہ بن صالح کی وجہ سے ضعیف ہے اور مرسل بھی کیونکہ زہری سے اوپر سند نہیں ہے۔[2]

* امام بیہقی (متوفی 358ھ) کی روایت: انھوں نے اس سلسلے میں دو روایات اپنی کتاب ''سنن کبریٰ'' میں بیان کی ہیں۔ پہلی کی سند عثمان بن محمد تک پہنچتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے خاندان سے یہ تحریر حاصل کی ہے، اس کے ساتھ ''زکاۃ کی دستاویز'' بھی تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کو لکھی تھی۔ میثاق والی تحریر کی عبارت یہ ہے:

«بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ۔ هٰذَا كِتَابٌ مِّنَ النَّبِيِّ ﷺ بَيْنَ

[1] غریب الحدیث، حدیث: 3011. ذہبی نے حماد بن عبید کے متعلق امامِ جرح و تعدیل ابن ابی حاتم کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آدمی صحیح الحدیث نہیں، چنانچہ اسے اہمیت نہ دی جائے۔ حدیث کے امیر المومنین امام بخاری کا کہنا ہے کہ اس کی حدیث صحیح نہیں ہے، دیکھیے: (میزان الاعتدال: 597/1) جابر جعفی کے متعلق ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا: ''ضعیف اور رافضی ہے۔'' دیکھیے: (تقریب التہذیب: 123/1)

[2] الأموال لحميد بن زنجويه: 466/2، حديث: 750.

الْمُسْلِمِينَ وَالْمُؤْمِنِينَ مِنْ قُرَيْشٍ وَّمَنْ تَبِعَهُمْ فَلَحِقَ بِهِمْ وَ جَاهَدَ مَعَهُمْ......، وَإِنَّ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَنْ لَّا يَتْرُكُوا مفْرَحًا مِّنْهُمْ حَتّٰى يُعْطَوْهُ فِي فِدَاءٍ أَوْ عَقْلٍ»

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ تحریر نبیِ کریم ﷺ نے مسلمانوں اور مومنوں کے بارے میں لکھوائی ہے۔ وہ قریش ہوں یا باہر سے آکر ان کے ساتھ رہنے لگے ہوں اور ان کے ساتھ مل کر کفار سے جہاد کیا ہو......، مومنین پر لازم ہے کہ کسی بھائی کو دیت یا فدیہ ادا کرنے میں بے یارومددگار نہ چھوڑیں۔''[1]

اس روایت کی سند میں احمد بن عبدالجبار عطاردی ہیں انھیں ضعیف قرار دیا گیا ہے۔[2] دوسرے عثمان بن محمد ہیں جنھیں بعض محدثین نے ثقہ قرار دیا ہے[3] لیکن یہ روایت انھوں نے وجادۃً بیان کی ہے۔(40) تیسرے یونس بن بکیر ہیں جو مختلف فیہ ہیں۔[4] یہ روایت دراصل اسی روایت کا اختصار ہے جو سیرت ابن اسحاق وغیرہ میں ہے۔ اس میں بہت سی شقیں نہیں ہیں، خصوصاً جو یہودیوں کے متعلق ہیں۔

دوسری روایت بھی پہلی روایت جیسی ہے، اس کے راوی ثقہ ہیں۔[5] سوائے کثیر بن

(40) وجادہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ راوی کسی کی کتابِ حدیث سے دیکھ کر روایت کرے جبکہ صاحبِ کتاب سے اس کی ملاقات نہ رہی ہو۔ یا ملاقات تو رہی ہو لیکن راوی نے صاحبِ کتاب سے وہ روایات نہ سنی ہوں جو اسے صاحبِ کتاب کے ہاتھ سے تحریر کی ہوئی ملی ہیں، نہ اُس نے صاحب کتاب سے اُس کی تحریر کردہ روایات بیان کرنے کی اجازت لی ہو، دیکھیے: (مقدمة ابن الصلاح، ص: 157)

[1] احمد بن عبدالجبار عطاردی کی بابت ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا: ''ضعیف ہے، تاہم اس سے سیرت کے متعلق جو روایات سنی ہیں وہ صحیح ہیں۔'' دیکھیے: (تقريب التهذيب: 19/1) [2] یحییٰ بن معین، ترمذی اور ابن حبان نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے، دیکھیے: (تهذيب التهذيب: 153,152/7) [3] السنن الكبرىٰ للبيهقي: 106/8. [4] تقريب التهذيب: 384/2. [5] صحيفة المدينة المنورة لهارون رشيد، ص: 109-111.

عبداللہ کے جن کے بارے میں تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

* ابن ابی حاتم رازی کی روایت: جسے انھوں نے اپنی کتاب ''الجرح والتعدیل'' کے مقدمے میں بیان کیا ہے۔[1] انھوں نے اوزاعی تک اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ اوزاعی نے عبداللہ بن محمد امیر المومنین کی طرف ایک طویل تحریر لکھی۔ اس میں درج ہے کہ مجھ سے زہری نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین وانصار کے مابین جو تحریر لکھی تھی اس میں یہ الفاظ تھے: ''مسلمانوں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ کسی ایسے بھائی کو جو قرض کے بوجھ تلے دبا ہو اور اس کی ادائی کی سکت نہ رکھتا ہو، ادائے دیت یا فدیہ کے سلسلے میں تنہا نہ چھوڑیں اور اس کی مدد کریں۔''

اس کی سند کے راوی ثقہ ہیں، سوائے عباس بن ولید کے کہ وہ ''صدوق'' ہے۔[2] یہ روایت بھی مرسل ہے کیونکہ زہری پر موقوف ہے اور بہت مختصر بھی ہے۔ اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ اوزاعی نے امیر المومنین کو روایت کا اتنا حصہ ہی لکھا ہو جو اس خط میں مناسب اور ضروری تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس پوری تحریر محفوظ تھی، وہ خود ہی تو اسے زہری کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ زہری نے یہ تحریر ابن اسحاق کی روایت کے مماثل ہی بیان کی ہے......[3]

* علامہ ابن حزم (متوفی 546ھ) کی روایت جو انھوں نے ''محلّی'' میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے بیان کی ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے: ''رسول اکرم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین ایک دستاویز تحریر کرائی تھی کہ وہ دیتوں اور قیدیوں کا فدیہ ادا کرنے کے سلسلے میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے اور

[1] مقدمة الجرح و التعديل لابن أبي حاتم: 1/195-197. [2] تهذيب التهذيب: 5/131-133، والجرح والتعديل لابن أبي حاتم: 6/215. ابن ابی حاتم نے اسے ثقہ کہا ہے۔ [3] بيان الحقيقة لضيدان اليامي، ص: 33.

اصلاح بین الناس کے لیے کوشاں رہیں گے۔''

اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ اور حکم بن مقسم ہیں۔ امام ابن حزم نے پہلے راوی کو ساقط (معیار سے گرا ہوا، نا قابل اعتبار) اور دوسرے راوی کو ضعیف کہا ہے۔[1]

ایک محقق نے اس دستاویز سے متعلقہ تمام روایات کو اصل ماخذوں سے نقل کر کے ان کی اسانید کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ روایات ضعیف ہیں، قابل حجت نہیں، البتہ اس دستاویز کی جو باتیں دوسری صحیح احادیث میں لفظاً یا معناً آ گئی ہیں وہ درست ہیں۔[2]

ایک اور محقق نے اس دستاویز کی اسانید کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ابن ہشام کی ابن اسحاق سے معلّق روایت ہر چند ضعیف ہے مگر قابل اعتبار ہے۔ ابو عبید کی دو سندوں میں سے ایک سند بھی اگرچہ مرسل ہونے کی بنا پر ضعیف ہے مگر وہ قابل اعتبار ہے۔ ابن ابی خیثمہ کی روایت کی سند میں کثیر بن عبداللہ ہیں جن پر جھوٹ بولنے کا الزام ہے مگر وہ الزام نا قابل توجہ ہے کیونکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے اور ان کی بیان کردہ ایک حدیث کو حسن کہا ہے اور اپنی صحیح کے سوا دوسری کتب میں ان کی روایات نقل کی ہیں۔ امام ترمذی نے بھی ان کی بیان کردہ حدیث کو صحیح قرار دے کر ان کی توثیق کی ہے۔ انھوں نے ان کی کئی احادیث کو حسن قرار دیا ہے۔ امام ابوداود نے ان کی روایات بیان کر کے سکوت کیا ہے۔ یحییٰ بن سعید انصاری، حاکم، ابن خزیمہ، فسوی اور بعض دوسرے محدثین نے ان کی روایات بیان کر کے ان کی توثیق کی ہے۔ یوں ابن ابی خیثمہ کی روایت کی سند کم از کم حسن لغیرہ ضرور ہے۔[3]

پھر صرف ابن ابی خیثمہ ہی نے کثیر کی حدیث بیان نہیں کی بلکہ امام بیہقی نے بھی اسی سند کے ساتھ یہ روایت بیان کی ہے اگرچہ انھوں نے اس دستاویز کا کچھ حصہ ہی بیان کیا

[1] المحلّٰی لابن حزم:408,407/12، كتاب العواقل والقسامة وقتل أهل البغي، مسئلة:2143.
[2] بيان الحقيقة لضيدان اليامي، ص:35-39. [3] صحيفة المدينة لهارون رشيد، ص:132.

ہے۔ یہ حدیث شاذ بھی نہیں، اس لیے کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو کسی صحیح روایت کے خلاف ہو۔ یہ غریب اور منفرد بھی نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث دوسری سند سے متصل بھی آتی ہے اور مرسل بھی۔ متصل تو امام بیہقی نے ایک اور سند کے ساتھ بیان کی ہے جیسے کہ پہلے تفصیل بیان کی جا چکی ہے اور مرسل روایت ابن اسحاق اور زہری نے بیان کی ہے۔ اس کی تفصیل بھی گزشتہ اوراق میں بیان ہو چکی ہے۔

چونکہ یہ تمام اسانید انفرادی طور پر بھی قابل اعتبار ہیں اور باہم مل کر ایک دوسرے کی تائید و تقویت کا باعث بھی۔ اس لیے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ میثاق مدینہ کی روایت حسن لغیرہ کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے۔

اس سے پہلے دکتور اکرم ضیاء عمری بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ انھوں نے اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے: ''یہ دستاویز مجموعی لحاظ سے شرعی احکام میں تو قابل حجت نہیں، سوائے ان چند باتوں کے جو صحیح احادیث میں آگئی ہیں مگر یہ کسی تاریخی تجزیے کی بنیاد بن سکتی ہے کیونکہ تاریخ اس درجے کی صحت کا تقاضا نہیں کرتی جو احکام شرعیہ میں مطلوب ہے، خصوصاً جبکہ یہ دستاویز کئی سندوں سے روایت کی گئی ہے جو ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ یوں اس دستاویز کو قوت حاصل ہو جاتی ہے......'' حاشیے میں لکھتے ہیں: ''مجموعی طور پر یہ آثار ایک دوسرے کی مدد سے قوی ہو جاتے ہیں اور یہ دستاویز حسن لغیرہ کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔''[1]

ان سب سے پہلے دکتور اکرم حسین علی سندھی بھی اپنے ماسٹرز کے مقالے میں، جو ابھی شائع نہیں ہوا، اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اس مقالے میں ان کے نگران دکتور اکرم عمری تھے۔ (دیکھیے، ص:53-73) یہ مقالہ جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ میں پیش کیا گیا تھا اور جامعہ نے اس کی ایک نقل مجھے بطور تحفہ عنایت کی تھی۔

[1] المجتمع المدني للدكتور أكرم ضياء العمري، ص: 111.

میثاق مدینہ کب لکھا گیا؟

ایک فاضل مقالہ نگار نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ دستاویزیں دراصل دو تھیں۔ مؤرخین نے انھیں آپس میں گڈمڈ کر دیا۔ ایک دستاویز تو یہود سے معاہدے کے متعلق تھی اور دوسری دستاویز مہاجرین و انصار کے حقوق و فرائض کے بارے میں تھی۔ یہود سے معاہدے کی دستاویز غزوۂ بدر کبریٰ سے پہلے طے پائی اور دوسری دستاویز غزوۂ بدر کے بعد لکھی گئی۔[1] مقالہ نگار نے ترجیح کے معقول دلائل بھی دیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی ترجیح دل کو لگتی ہے۔

باقی رہیں وہ روایات جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہود سے معاہدے کی دستاویز کعب بن اشرف کے قتل کے بعد تحریر کی گئی تو اس کی توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ درحقیقت اصل اور اولین معاہدے کی تجدید تھی۔[2] قرآن مجید کی یہ آیت:

﴿ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝﴾

”وہ (لوگ بھی بدترین ہیں) جن سے آپ نے معاہدہ کر رکھا ہے پھر وہ ہر دفعہ اپنا معاہدہ توڑ دیتے ہیں اور وہ ڈرتے نہیں۔“[3]

دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور یہود کے مابین ایک سے زیادہ معاہدے ہوئے۔ بیشتر مفسرین نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے۔[4]

میثاق کی دفعات پر حدیث اور تاریخ کے شواہد

ایک مقالہ نگار نے اس موضوع پر الگ باب قائم کیا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے

[1] المجتمع المدني في عهد النبوة للدكتور أكرم ضياء العمري، ص: 112-117. [2] صحيفة المدينة لهارون رشيد، ص: 154، والمجتمع المدني في عهد النبوة للدكتور أكرم ضياء العمري، ض: 114. [3] الأنفال 8:56. [4] زاد المسير لابن الجوزي: 3/372.

اس، دستاویز کی تحریر سے متعلقہ روایات بیان کی ہیں۔[1] ان کا خلاصہ وہی ہے جو امام احمد کی روایت کے متعلق گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے۔ محدث احمد شاکر اور شیخ احمد البَنّاء نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم کی روایت کہ نبیِ کریم ﷺ نے لکھوایا کہ ہر قبیلہ اپنی دیت کا خود ذمہ دار ہوگا، پھر لکھوایا کہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کے غلام کو اس کی اجازت کے بغیر اپنا غلام بنائے۔''[2]

امام ابو داود اور بیہقی کی روایت ہے کہ جب مسلمانوں نے کعب بن اشرف کو قتل کر دیا تو یہودی اس قتل کی شکایت لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے انھیں پیشکش کی کہ مجھ سے یہود اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ تحریر کرنے پر اتفاق کر لو۔[3]

علامہ خطابی نے بیان کیا ہے کہ کعب بن اشرف نے نبیِ کریم ﷺ سے معاہدہ کر رکھا تھا کہ وہ آپ کے خلاف کسی کی مدد نہیں کرے گا، نہ آپ سے لڑائی مول لے گا۔ لیکن اس نے بدعہدی کی۔ وہ مکہ گیا، مشرکین سے ساز باز کی اور مدینہ منورہ آ کر علانیہ نبیِ اکرم ﷺ سے دشمنی اور مخالفت کا برتاؤ شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں وہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔[4]

امام ابو داود اور نسائی ؒ نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی نقل کیا ہے:

«اَلْمُؤْمِنُونَ تَتَكَافَأُ دِمَاؤُهُمْ، وَهُمْ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ، وَيَسْعٰى بِذِمَّتِهِمْ أَدْنَاهُمْ، أَلَا! لَا يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ وَّلَا ذُو عَهْدٍ بِعَهْدِهٖ»

''مومنین کے خون آپس میں برابر ہیں اور مسلمان غیر مسلموں کے خلاف یک جان

[1] صحيفة المدينة لهارون رشيد، ص: 133-155. [2] صحيح مسلم، العتق، باب تحريم تولي العتيق غير مواليه، حديث: 1507. [3] سنن أبي داود، الخراج، باب كيف كان إخراج اليهود من المدينة؟ حديث: 3000، والسنن الكبرٰى للبيهقي: 183/9۔ ہارون کی تحقیق کے مطابق اس کی سند حسن ہے۔ [4] معالم السنن للخطابي: 338/2. ہارون کی تحقیق کے مطابق اس کی سند صحیح ہے، دیکھیے: (صحيفة المدينة لهارون رشيد، ص: 150)

اور متحد ہیں۔ ان میں سے ادنیٰ شخص بھی ان سب کی طرف سے امان دے سکتا ہے۔ خبردار! کوئی مومن کسی کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جا سکتا اور نہ کسی معاہد کو اس کے عہد کے دوران قتل کیا جا سکتا ہے۔'' [1]

امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے ایک روایت یوں بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ» ''کسی مسلمان کو کسی کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جا سکتا۔'' [2]

ایک دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں:

«لَا يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ وَّلَا ذُو عَهْدٍ فِي عَهْدِهِ»

''کسی مومن کو کافر کے بدلے میں اور کسی معاہد کو اس کے عہد کے دوران میں قتل نہیں کیا جا سکتا۔'' [3]

یہ روایات صراحت سے ثابت کر رہی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے ایک تحریر مہاجرین اور انصار کے مابین لکھی گئی تھی۔ دستاویز میں مذکور دیت اور قیدیوں کے فدیہ کے متعلق دفعات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ ان دفعات میں مہاجرین اور مختلف انصاری قبائل کا حوالہ دیا گیا ہے۔

ایک مقالہ نگار نے آٹھ ایسی احادیث بیان کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل دستاویز مہاجرین، انصار اور مدینہ کے یہودیوں کے مابین تحریر کی گئی تھی۔ ان میں تفصیلات بھی موجود ہیں۔ تین احادیث مسند احمد سے ہیں۔ ایک ایک روایت مصنف عبدالرزاق،

[1] سنن أبي داود، الديات، باب أيقاد المسلم من الكافر؟ حديث: 4530، وسنن النسائي، القسامة، باب القود بين الأحرار والمماليك في النفس، حديث: 4739. ہارون کی تحقیق کی رو سے یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے۔ [2] سنن ابن ماجه، الديات، باب لا يقتل مسلم بكافر، حديث: 2659. البانی رحمہ اللہ نے کہا: ''یہ حدیث حسن صحیح ہے۔'' [3] سنن ابن ماجه، الديات، باب لا يقتل مسلم بكافر، حديث: 2660. البانی رحمہ اللہ نے کہا: ''یہ حدیث صحیح ہے۔''

سنن ابی داود اور خطابی کی معالم السنن سے ہے۔ دو روایات بیہقی کی سنن کبریٰ سے ہیں۔ یہ تمام روایات صحیح یا کم از کم حسن ہیں۔ مصنف عبدالرزاق کی روایت مرسل ہے۔ [1]

باقی رہے مؤرخین تو اُن میں سے بعض نے چند معین دفعات کی طرف اشارے کیے ہیں جو اس دستاویز میں آئے ہیں، مثلاً: طبری نے دیتوں والی دفعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ [2] ابن سعد نے دیتوں والی دفعہ کے علاوہ یہ دفعات بھی لکھی ہیں کہ اسلام میں کسی ایسے مسلمان کو تنہا نہیں چھوڑا جائے گا جو قرض کے بوجھ تلے دبا ہو اور اس کی ادائی کی سکت نہ رکھتا ہو۔ اور کوئی مسلمان کسی کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ [3] عبدالرزاق صنعانی نے زہری تک اپنی سند سے اس دفعہ کی طرف اشارہ کیا ہے: ''دیت عاقلہ نسبی رشتہ داروں کے ذمے ہے۔'' نیز یہ کہ جو تحریر قریش اور انصار کے مابین لکھی گئی تھی اُس میں یہ دفعہ بھی تھی: ''تم کسی بھی مسلمان کو دیت یا قیدی کے فدیے کے سلسلے میں بے یارو مددگار نہیں چھوڑو گے۔'' [4] مقریزی نے لکھا ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے ایک دستاویز لکھوائی جس کی رُو سے مدینہ کے یہودیوں بنوقینقاع، بنونضیر اور بنوقریظہ سے معاہدہ کیا۔ [5] ابن حزم رحمہ اللہ نے لکھا: ''رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں سے معاہدہ کیا۔'' [6] دیار بکری نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں سے صلح کا معاہدہ کیا۔ انھیں اُن کے دین اور مال پر برقرار رکھا اور اُن پر یہ پابندی لگائی کہ وہ آپ ﷺ کے خلاف کسی کی مدد نہیں کریں گے اور اگر کسی دشمن نے آپ ﷺ پر حملہ کیا تو وہ آپ ﷺ کی مدد کریں گے۔'' [7]

[1] صحيفة المدينة لهارون رشيد، ص: 133-155-215. [2] تاريخ الأمم والرسل والملوك للطبري: 486/2. بلاسند، ضعیف روایت ہے۔ [3] الطبقات الكبرىٰ: 172/1. [4] المصنف لعبد الرزاق (تحقيق حبيب الرحمن): 274,273/9. سند صحیح لیکن مرسل ہے۔ [5] إمتاع الأسماع لمقريزي: 49/1. بلاسند، ضعیف روایت ہے۔ [6] جوامع السيرة لابن حزم، ص: 95. یہ روایت بلاسند ہے۔ [7] تاريخ الخميس في أحوال أنفس نفيس للدياربكري: 353/1.

ابن مردویہ نے بنونضیر کے واقعے کے بارے میں ایک روایت اس طرح بیان کی ہے:

"آپ ﷺ نے صبح کے وقت اُن پر لشکر کشی کر دی۔ دن بھر محاصرہ کیے رکھا، پھر اگلے دن جا کر بنوقریظہ کا محاصرہ بھی کر لیا۔ انھوں نے آپ ﷺ سے معاہدہ کر لیا۔ اس لیے آپ ﷺ اُنھیں چھوڑ کر بنونضیر کی طرف لوٹ آئے اور اُن سے لڑائی شروع کر دی حتی کہ وہ جلاوطنی پر رضامند ہو گئے۔" [1]

یہ روایت اس کے بارے میں صریح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنوقریظہ سے معاہدہ کیا تھا۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ یہ معاہدہ دراصل پہلے معاہدے کی تجدید کے لیے تھا۔

اس کے بعد ہارون نے دستاویز کی مختلف دفعات کے بہت سے شواہد بیان کیے ہیں۔ ایسی ستائیس آیاتِ قرآنیہ بھی درج کی ہیں جو اس دستاویز کی دفعات کی تائید کرتی ہیں۔ [2]

خلاصہ یہ کہ دستاویز کی تمام دفعات کی تائید صحیح احادیث اور قرآن مجید سے ہوتی ہے۔ خوفِ طوالت نہ ہوتا تو ہم ان میں سے چند ایک کا ذکر ضرور کرتے۔ اللہ تعالیٰ فاضل مقالہ نگار جناب ہارون کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس دستاویز کی یہ بات کہ آپ ﷺ نے یہود اور مشرکین سے بغیر جزیہ صلح کی، جزیہ کی آیت سے منسوخ ہے۔

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝﴾

"ان لوگوں سے لڑائی کرو جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے، اور نہ یومِ آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور اس چیز کو حرام نہیں سمجھتے جسے اللہ نے اور اس کے رسول نے حرام

---

[1] ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا: "اس حدیث کی سند صحیح ہے۔" دیکھیے: (فتح الباري: 102/15) [2] صحيفة المدينة لهارون رشيد، ص: 156-214.

قرار دیا ہے اور نہ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنھیں کتاب دی گئی حتی کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ ذلیل ہوں۔'' [1]

یہ 9 ہجری کی بات ہے [2] اور یہ معروف ہے کہ سورۂ توبہ اُن آخری سورتوں میں سے ایک ہے جو آپ پر نازل ہوئیں جیسا کہ امام بخاری نے بتایا ہے۔ [3]

میثاق مدینہ کی اہمیت وحکمت

* یہ دنیا کی قدیم ترین جامع دستوری دستاویز ہے۔
* علماء نے اس دستاویز میں درج کسی بھی حکم کو منسوخ نہیں کہا سوائے اس بات کے کہ جزیہ لیے بغیر یہودیوں یا غیر مسلموں سے کوئی معاہدہ کیا جائے۔ یہ جزیہ والی آیت سے منسوخ ہے جیسا کہ ابھی ابھی تفصیل گزری ہے۔
* بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہودیوں کے ساتھ تعلقات کی جو وضاحت اس میثاق میں موجود ہے، وہ اس آیت کے حکم کے مطابق ہے:

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○﴾

''اللہ تمھیں ان لوگوں سے نہیں روکتا جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں لڑائی نہیں کی اور انھوں نے تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان سے نیکی کرو اور ان سے انصاف کرو، بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' [4]

* یہ دستاویز انسانی زندگی کے مختلف گوشوں پر حاوی نہایت اہم اور جامع دستاویز ہے۔
* اس میں بڑے اہم دستوری مبادیات بیان کر دیے گئے ہیں، مثلاً:

[1] التوبة 29:9. [2] تفسير ابن كثير: 74/4. [3] صحيح البخاري، التفسير، سورة براءة (9)، حديث: 4654. [4] الممتحنة 8:60.

* امت کی تشکیل عقیدہ اور دین کی بنیاد پر ہے۔اس لیے مسلمان دنیا بھر میں جہاں بھی ہوں اور جس رنگ و نسل کے ہوں، وہ اُمت مسلمہ کی نا قابل شکست وحدت کا حصہ ہیں۔
* وطن کے لحاظ سے ایک جماعت کی تشکیل میں اُس علاقے میں رہنے والے غیر مسلم بھی شامل ہو سکتے ہیں۔
* عام معاملات میں مساوات ضروری ہے۔
* مجرمین کو پناہ دینا جرم ہے۔
* حضرت محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر یہودی معاہدے سے نہیں نکل سکتے۔
* مال اور عزت کے سلسلے میں ہر ظلم و زیادتی منع ہے۔
* کسی رُکن کی دشمن سے انفرادی صلح تسلیم نہیں کی جا سکتی۔
* قریش، یعنی دشمن کو پناہ دینا ممنوع ہے۔
* قاتل سے قصاص لیا جائے گا، یعنی ہر انسانی جان اور زندگی محترم ہے۔
* حکومت اور وطن کے دفاع میں ہر شخص کو حصہ لینا ہو گا۔
* اگر مملکت کے کچھ لوگ دشمن کے ہاتھوں قید ہو جائیں تو انھیں ہر ممکن طریقے سے چھڑایا جائے گا۔
* مقروض لوگوں کی طرف سے ادائے قرض کا اہتمام کیا جائے گا۔
* اچھے رسوم و رواج برقرار رہیں گے۔
* عقیدے اور دین میں آزادی کا حق ہر شہری کو حاصل ہو گا۔
* پڑوسی کے حقوق ادا کرنے ضروری ہیں۔
* مسلمان کا خصوصی احترام ہے، یعنی کسی مسلمان کو کسی کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔

* مدینہ منورہ حرم (عزت احترام والی جگہ) ہوگا۔
* مدینہ منورہ میں باہر سے آنے والوں کو اہل مدینہ کی اجازت کے بغیر کوئی حقوق و احترام حاصل نہ ہوں گے۔
* اس دستاویز کی شقوں کے متعلق پایا جانے والا ہر اختلاف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے پر ختم ہو جائے گا۔

اس دستاویز سے کچھ اور دستوری مبادیات بھی اخذ کیے جا سکتے ہیں اور جس قدر مبادیات بیان کیے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک بجائے خود بہت سے شرعی احکام پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں سے متعلقہ خصوصی شقوں کے علاوہ اس دستاویز کے دوسرے مبادیات ہر دستور حتی کہ موجودہ دور کے وضع کردہ دستوروں میں بھی موجود ہیں۔[1]

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہودیوں کے ساتھ اس قدر رعایتی اور فیاضانہ موقف رکھے جانے کے باوجود یہودی ہمیشہ ہر ممکن وسائل سے ہر انداز میں اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ آئندہ واقعات میں تفصیل آئے گی۔ بے فائدہ جھگڑے کا میدان یہودی گروہ کا خاص محاذ ہے جس کی طرف موجودہ دور کے مؤرخین نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اس جھگڑے کا مقصد صرف لوگوں کو دینِ اسلام سے روکنا تھا نہ کہ اسلام میں داخل ہونا۔

قرآن مجید نے اُن کے درمیان معاندانہ جھگڑے اور ضد بازی کا بہت سے مقامات پر صراحت سے ذکر فرمایا ہے۔ اس میدان میں یہودیوں کے سب سے زیادہ سرگرم یہ لوگ تھے: رافع بن حریملہ، سلام بن مشکم، نعمان بن اوفی، محمود بن دِحیہ، وشاش بن قیس، مالک بن صیف، جبل بن ابی قشیر، شمویل، نعمان بن اَحنا، بحری بن عمرو، وشاش

[1] صحيفة المدينة لهارون رشيد، ص: 326,325.

بن عدی، رافع بن حارثہ، نحام بن زید اور کردم بن کعب وغیرہ۔ [1]

متفرقات

یثرب کے نام...... طَیِّبَہ، طابہ، مدینہ

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ''میثاق مدینہ'' میں مدینہ منورہ کو یثرب کہا گیا ہے لیکن اس کے بعد اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس نام کو ناپسند فرمایا۔ اس کے بجائے طیبہ، طابہ اور مدینہ نام رکھے گئے۔ امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

«إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى سَمَّى الْمَدِينَةَ طَابَةَ» ''اللہ تعالیٰ نے مدینہ کا نام طابہ رکھا ہے۔'' [2]

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّهَا طَيْبَةُ- يَعْنِي الْمَدِينَةَ-وَ إِنَّهَا تَنْفِي الْخَبَثَ كَمَا تَنْفِي النَّارُ خَبَثَ الْفِضَّةِ»

''مدینہ طیبہ ہے۔ یہ گندگی کو (یوں) دور کرتا ہے جیسے آگ چاندی کا میل کچیل دور کر دیتی ہے۔'' [3]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 2/183-186. یہود کے بے فائدہ جدال کی مثالوں کے لیے ملاحظہ کیجیے: (هذا الحبيب لجابر الجزائري، ص: 196-198) [2] صحيح مسلم، الحج، باب المدينة تنفي خبثها وتسمّى طابة وطيبة، حديث: 1385. اس حدیث کو اسی سند اور متن کے ساتھ ابن شبہ نے بھی روایت کیا ہے، دیکھیے: (تاريخ المدينة: 1/164) [3] صحيح مسلم، الحج، باب المدينة تنفي خبثها وتسمى طابة وطيبة، حديث: 1384.

امام طیالسی نے امام مسلم والی سند کے ساتھ یہ الفاظ بیان کیے ہیں: ''لوگ مدینہ کو یثرب کہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام طَیْبَة رکھا۔''[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا کہنا ہے: ''کعب احبار سے ابوسہل بن مالک کی سند کے ساتھ منقول ہے کہ ہم اُس کتاب میں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی (تورات)، لکھا پاتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے مدینہ کو مخاطب کر کے فرمایا: یا طیبہ، یا طابۃ ......۔''[2]

رسول اللہ ﷺ کی بعض احادیث میں ایک اور نام ''مدینہ'' بھی آیا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«عَلٰى أَنْقَابِ الْمَدِينَةِ مَلَائِكَةٌ لَّا يَدْخُلُهَا الطَّاعُونُ وَلَا الدَّجَّالُ»

''مدینہ کے دروازوں پر فرشتے مقرر ہیں۔اس میں نہ طاعون داخل ہوگا اور نہ دجال۔''[3]

مسند احمد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو مدینہ کو یثرب کہے وہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے۔ یہ طابہ ہے، یہ طابہ ہے۔''[4]

[1] مسند أبي داود الطيالسي: 204/2. [2] فتح الباري: 218/8. [3] صحيح البخاري، الفتن، باب: لايدخل الدجال المدينة: 7133. [4] مسند أحمد: 285/4. یہ روایت امام احمد بن حنبل کی اپنی سند سے ہے جو براء بن عازب رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے۔ اس کے راوی سوائے یزید بن ابی زیاد کے، سب کے سب قابل اعتماد ہیں۔ یزید بن ابی زیاد ضعیف ہے، دیکھیے: (تقريب التهذيب: 365/3) بایں ہمہ یہ روایت دیگر تائیدی روایات (متابعات وشواہد) کی بنا پر قوی ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 216/18) ہیثمی نے بھی ابویعلی کے حوالے سے اسے نقل کیا اور کہا: ''اس کے رجال ثقہ ہیں۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 300/3) ابن شبہ نے اسے تین سندوں سے روایت کیا ہے: پہلی سند مرسل ہے اور اس میں یزید بن ابی زیاد ہے۔ دوسری سند مرفوع ہے لیکن اس میں بھی یزید ہے۔ تیسری سند بھی مرفوع ہے اور اس کے رجال سوائے ابن ابی یحییٰ ابراہیم بن محمد اسلمی کے ثقہ ہیں۔ ابن ابی یحییٰ تقریب التہذیب کے مطابق ››

امام سیوطی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم اسے یثرب نہ کہو، یہ (مدینہ) طیبہ ہے۔ جو شخص مدینہ کو یثرب کہے وہ اللہ تعالیٰ سے تین دفعہ معافی طلب کرے۔ یہ طیبہ ہے، یہ طیبہ ہے، یہ طیبہ ہے۔“ [1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابوحمید رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے کہا: ”ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک سے واپس آئے۔ جب ہمیں مدینہ نظر آنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«هٰذِهِ طَابَةُ» ”یہ طابہ ہے۔“ [2]

ابن شبہ نے حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے اپنی سند کے ساتھ روایت بیان کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کو یثرب کہنے سے منع کیا ہے۔ [3]

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أُمِرْتُ بِقَرْيَةٍ تَأْكُلُ الْقُرٰى، يَقُولُونَ يَثْرِبَ، وَهِيَ الْمَدِينَةُ، تَنْفِي النَّاسَ كَمَا يَنْفِي الْكِيرُ خَبَثَ الْحَدِيدِ»

”مجھے ایسی بستی کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو سب بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اسے یثرب کہتے ہیں، حالانکہ اس کا نام ”مدینہ“ ہے۔ یہ بستی خراب لوگوں کو یوں نکالتی ہے جیسے لوہار کی بھٹی لوہے سے زنگ الگ کر دیتی ہے۔“ [4]

◂◂ متروک ہے، چنانچہ اس کی حدیث نہایت ضعیف ہے، دیکھیے: (تاریخ المدینة: 164/1) [1] الدرّ المنثور للسیوطي: 188/5. سیوطی رحمہ اللہ نے اسے ابن مردویہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ [2] صحیح البخاري، فضائل المدینة، باب: المدینة طابة، حدیث: 1872. ابن شبہ نے بھی اسے روایت کیا ہے، دیکھیے: (تاریخ المدینة لابن شبة: 164/1) [3] تاریخ المدینة لابن شبة: 165/1. اس روایت کی سند ضعیف ہے کیونکہ اس میں ابن ابی یحییٰ ابراہیم بن محمد اسلمی ہے جو تقریب التہذیب کے مطابق متروک ہے۔

[4] صحیح مسلم، الحج، باب المدینة تنفي خبثها وتسمّٰی طابة وطیبة، حدیث: 1382.

قرآن مجید نے بھی کئی ایک مقامات پر اسے ''مدینہ'' ہی کہا ہے۔[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا: ''مدینہ کو یثرب کہنا اس بنا پر ناپسندیدہ ہے کہ یثرب یا تو تثریب سے مشتق ہے جس کے معنی ڈانٹنے اور ملامت کرنے کے ہیں یا یہ ثرب سے مشتق ہے اس کے معنی فساد اور خرابی ہے اور یہ دونوں معانی قبیح ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تو اچھے نام پسند فرماتے تھے۔ قبیح نام آپ کو پسند نہیں تھے۔''[2]

بخار کی وبا

مہاجرین مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لائے تو بیمار ہو گئے۔ انھیں یثرب کے مشہور بخار نے آلیا[3] اور اس قدر نڈھال کر دیا کہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھنے لگے۔[4] رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس سے محفوظ رکھا۔[5]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بخار چڑھا۔ جب بخار تیز ہوتا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ شعر پڑھتے:

كُلُّ امْرِئٍ مُّصبَّحٌ فِي أَهْلِهٖ وَالْمَوْتُ أَدْنٰى مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهٖ

''ہر آدمی اپنے گھر میں صبح (و شام) کرتا ہے جبکہ موت اس کی جوتی کے تسمے سے

[1] دیکھیے: (التوبة 9:101 و 120) [2] فتح الباري: 8/216. [3] یہ احمد کی روایت کا ایک حصہ ہے، دیکھیے: (الفتح الرباني: 21/31,32) ساعاتی کا کہنا ہے: ''ہیثمی نے اس روایت کو تفصیل سے نقل کر کے لکھا، اسے احمد اور بزار نے روایت کیا ہے۔ احمد کے رجال سوائے حارثہ بن مضرب کے، صحیح ہیں، حارثہ بھی ثقہ ہیں۔'' [4] مسند أحمد: 3/136. ابن اسحاق نے بھی اسے سند کے ساتھ روایت کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ انھوں نے یہ روایت سنی ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 2/274، وسنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب صلاة القاعد على النصف من صلاة القائم، أحاديث: 1229-1231) ابن ماجہ نے اسے ابن اسحاق ہی کی سند سے روایت کیا ہے۔ ہیثمی نے مجمع الزوائد میں کہا: ''اس روایت کی سند صحیح ہے۔'' [5] مسند أحمد: 3/136.

بھی قریب ہے۔''

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا بخار دھیما پڑتا تو وہ اپنی گلوگیر بلند آہنگ آواز میں یہ شعر پڑھتے:

• أَلَا لَيْتَ شِعْرِي هَلْ أَبِيتَنَّ لَيْلَةً   بِوَادٍ وَّحَوْلِي إِذْخِرٌ وَّجَلِيلُ؟

وَهَلْ أَرِدَنْ يَوْمًا مِّيَاهَ مَجَنَّةٍ؟   وَهَلْ يَبْدُوَنْ لِّي شَامَةٌ وَّطَفِيلُ؟

''کاش! پتہ چل جائے، کیا میں کوئی رات وادیٔ مکہ میں بسر کروں گا جبکہ میرے ارد گرد اذخر اور جلیل گھاس ہوگی؟ کیا میں کسی دن مجنہ کے کنویں پر جاؤں گا؟ اور کیا شامہ اور طفیل پہاڑ مجھے نظر آ سکیں گے؟''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ حالت دیکھی تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اُن کی حالتِ زار سے مطلع کیا۔ آپ ﷺ نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے:

«اَللّٰهُمَّ! حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ، وَصَحِّحْهَا وَبَارِكْ لَنَا فِي صَاعِهَا، وَمُدِّهَا، وَانْقُلْ حُمَّاهَا فَاجْعَلْهَا بِالْجُحْفَةِ»

''اے اللہ! ہمارے دلوں میں مدینہ کی محبت اسی طرح ڈال دے جس طرح مکہ کی محبت ڈالی ہے بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔ اس کی آب و ہوا درست فرما دے اور ہمارے لیے اس کے صاع اور مد (ماپ تول) میں برکت عطا فرما اور اس کا بخار یہاں سے نکال کر جُحْفَة پر مسلط کر دے۔''[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن فُہیرہ رضی اللہ عنہ کو بھی بخار نے آلیا۔ بہت سے دوسرے مہاجرین بھی بخار کی زد میں آگئے۔ مدینہ کا ''بخار'' مشہور تھا حتی کہ جب مسلمان عمرۂ قضا کے لیے مکہ مکرمہ پہنچے تو کفار کہنے لگے: ''تمھارے پاس ایسے لوگ آرہے ہیں جنھیں یثرب

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب مقدم النبي ﷺ وأصحابه المدينة، حديث: 3926، وفتح الباري: 122,121/15. اسے ابن اسحاق نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 2/271-273)

کے بخار نے کمزور کر دیا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ پہلے تین چکروں میں پہلوانوں کی طرح اُچک اُچک کر تنومندی سے چلو، البتہ (سانس ٹھیک کرنے کے لیے) رکنِ یمانی اور حجرِ اسود کے مابین آہستہ آہستہ قدم بڑھاؤ (کیونکہ یہ جگہ کفار کی نظروں سے اوجھل تھی۔)''[1]

اس ارشادِ گرامی کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان کفارِ مکہ کے سامنے اپنی جسمانی قوت کا مظاہرہ کریں تاکہ انھیں پتہ چل جائے کہ بخار نے مسلمانوں کی صحت پر کوئی اثر نہیں ڈالا اور یہ محض کافروں کی خام خیالی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبیِ کریم ﷺ کی دعا قبول فرمائی اور اس کے بعد مدینہ منورہ کی آب و ہوا صحت افزا ہوگئی۔ والحمدللہ

مہاجرین و انصار کو قریش کی دھمکیاں

عبداللہ بن ابی مدینہ کا سب سے بڑا سردار تھا۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو صورتِ حال یہ تھی کہ اہل مدینہ نے اس کی تاجپوشی کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اُسے اپنا بادشاہ ماننے پر آمادہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے اُس کا یہ پروگرام تلپٹ ہوگیا کیونکہ آپ ﷺ تاجِ نبوت کی بنا پر ساری دنیا کے سردارِ اعظم تھے۔ اسی بنا پر وہ شروع میں مسلمان بھی نہیں ہوا۔ وہ سمجھتا تھا کہ آپ اُس کی قیادت و سرداری کی راہ میں حائل ہوگئے ہیں۔ اُس نے آپ سے دشمنی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ جب اُسے مجبوراً اسلام کا اعلان کرنا پڑا تب بھی وہ آپ ﷺ سے دشمنی ہی پر ڈٹا رہا۔ بظاہر وہ مسلمان تھا

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب هجرة النبي ﷺ و أصحابه إلى المدينة، حديث: 3918,3917. ابن اسحاق نے اسے عائشہ ؓ کی روایت سے حسن سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ساعاتی نے کہا: ''یہ روایت متفق علیہ ہے۔'' دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 271/2، و الفتح الرباني: 13/21)

لیکن در پردہ وہ بہت بڑا منافق تھا۔ وہ منافقت کے پردے میں آپ ﷺ سے دشمنی کا برتاؤ کرتا رہا۔ بہت سے ایسے مواقع آئے کہ اُس کا نفاق ظاہر ہوگیا۔

اسی قسم کے ایک موقع کے بارے میں صحیحین اور مسند احمد کی ایک روایت ہے جسے امام زہری نے بیان کیا ہے۔ حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! اُس سے درگزر کیجیے، صرفِ نظر فرمائیے۔ قسم اُس ذات کی جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی! جب اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل کردہ حق یہاں بھیجا تو اُس وقت اس بستی کے تمام باشندے اس کی تاجپوشی کا فیصلہ کر چکے تھے اور اُسے متفقہ طور پر سردار مان چکے تھے لیکن آپ کی تشریف آوری سے اس کا پروگرام بیچ میں دھرا کا دھرا رہ گیا۔ یہ چیز اُس کے گلے کی پھانس بن گئی۔ آپ ﷺ اُس کی جو شرارتیں دیکھ رہے ہیں وہ اسی غم و غصے کا نتیجہ ہیں۔''[1]

ابن اسحاق کی روایت یوں ہے: ''حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے گزارش کی: اللہ کے رسول! آپ اُس کے معاملے میں نرمی فرمائیں۔ اللہ کی قسم! آپ ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم اس کی تاجپوشی کے لیے گھونگے (موتی وغیرہ) پرو رہے تھے۔ اللہ کی قسم! وہ صاف سمجھتا ہے کہ اس کی بادشاہت آپ نے چھین لی ہے۔''[2]

مشرکین مکہ کو عبداللہ بن ابی (اُسے ابن سلول بھی کہتے تھے) کی صورت میں اپنی امیدیں بر آتی نظر آئیں کیونکہ وہ انھی کے دین پر تھا۔ اُنھوں نے اُسے خط لکھا کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی چکر چلاؤ اور اُن سے وہی سلوک کرو جو ہم مکہ مکرمہ میں اب تک محمد (ﷺ) اور اُس کے صحابہ کے ساتھ کرتے آئے تھے۔ انھوں نے اُسے کئی خطوط لکھے۔

[1] صحيح البخاري، التفسير، باب:15، حديث:4566، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب في دعاء النبي ﷺ، وصبره على أذى المنافقين، حديث:1798، والفتح الرباني:20,19/21.

[2] السيرة النبوية لابن هشام:271,270/2. یہ بخاری، مسلم اور احمد کی سند ہے۔

انھوں نے یہ بھی لکھا: ''تم نے ہمارے باغی کو ٹھکانہ مہیا کیا ہے۔ ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ تمھیں اُس سے لڑنا ہوگا یا اُسے اپنے شہر سے نکالنا ہوگا ورنہ ہم سب اکٹھے ہو کر تم پر حملہ کر دیں گے۔ تمھارے مردوں کو قتل کر دیں گے، تمھاری عورتوں کی آبروریزی کریں گے اور انھیں اپنی لونڈیاں بنا لیں گے۔''[1]

ابن اُبی کفار کی دھمکیوں میں آ گیا۔ اُس نے مدینہ کے کافروں کو جمع کیا تا کہ اللہ کے رسول ﷺ سے جنگ کی جائے۔ لیکن یہ آسان کام نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو پتہ چلا تو آپ نے انھیں فرمایا: ''تم نے قریش کی دھمکیوں کو بڑی سنجیدگی سے لیا ہے، حالانکہ وہ تمھیں اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا تم اپنے آپ کو پہنچانے کے درپے ہو۔ کیا تم اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑنا چاہتے ہو؟'' نبیٔ مکرم ﷺ کی یہ بات سن کر وہ دم دبا کر ادھر اُدھر منتشر ہو گئے۔[2] کفارِ مکہ نے مسلمانوں کو بھی پیغام بھیجا: ''اس دھوکے میں نہ رہنا کہ تم ہم سے چھوٹ کر یثرب پہنچ گئے ہو (اور اب امن و امان سے رہو گے) بس ہم آنے ہی والے ہیں۔ ہم تمھارے گھروں ہی میں تمھارا بھرکس نکال دیں گے۔''[3]

قریش کی سازشوں سے تحفظ کے لیے مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی رہائش گاہ پر رات کے وقت پہرہ دینا شروع کر دیا حتی کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان نازل ہوا:

﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ ''اور اللہ تمھیں لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔''[4]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: ''لوگو! چلے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ کر دیا ہے۔''[5]

[1] سنن أبي داود، الخراج، باب في خبر النضير، حديث:3004. [2] سنن أبي داود، الخراج، باب في خبر النضير، حديث:3004. [3] رحمة للعالمين لمنصور پوری:109/1. ہمیں ابھی تک یہ پتا نہیں چل سکا کہ اس روایت میں قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ کا ماخذ کیا ہے۔ [4] المآئدة 67:5. [5] جامع الترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة المائدة، حديث:3046. علامہ البانی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔

اس سے پہلے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ خطرے کے پیشِ نظر رات کے وقت آپ ﷺ کے دراقدس پر پہرہ دینے آئے تھے تو آپ ﷺ نے اُن کے لیے دعا فرمائی تھی۔ [1]

خطرہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی تک ہی محدود نہ تھا بلکہ آپ کے صحابہ کی جان کو بھی خطرہ لاحق تھا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ مدینہ تشریف لائے۔ انصار نے انھیں ٹھکانہ مہیا کیا تو سارے عرب نے انھیں نشانے پر رکھ لیا حتی کہ وہ رات کو اسلحہ سمیت سوتے اور دن کو بھی مسلح رہتے تھے۔'' [2]

کفارِ قریش نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہر صورت لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکیں گے۔ اس سلسلے میں وہ مکمل منصوبہ بندی کر چکے تھے۔ اس کے تحت انھوں نے انصار کو مسجد حرام آنے سے روک دیا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور ابوجہل کے واقعے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے۔ اس کا خلاصہ صحیح بخاری میں یوں مذکور ہے:

''حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ عمرہ کی غرض سے مکہ تشریف لے گئے اور اپنے میزبان سے کہنے لگے: ''میرے لیے کوئی فارغ وقت دیکھنا تاکہ میں سکون سے طواف کر سکوں۔ عین دوپہر کے وقت جب لوگ عموماً گھروں میں بند ہوتے ہیں، امیہ نے انھیں ساتھ لیا۔ ملعون ابوجہل نے انھیں دیکھ لیا اور امیہ سے پوچھا: ''تمھارے ساتھ یہ کون ہے؟'' اُس نے بتا دیا کہ سعد بن معاذ ہیں۔ ابوجہل بھڑک اُٹھا، کہنے لگا: ''تم امن و امان سے کعبہ کا طواف کر رہے ہو، حالانکہ تم نے محمد اور اُس کے ساتھیوں کو پناہ دے رکھی ہے؟'' بعد ازاں

[1] صحیح البخاري، الجهاد والسیر، باب الحراسة في الغزو في سبیل الله، حدیث: 2885، وصحیح مسلم، فضائل الصحابة، باب فضائل سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ، حدیث: 2410. [2] اس روایت کو صفی الرحمٰن مبارکپوری نے درج کیا ہے لیکن ہمیں ابھی تک اس کے ماخذ کا علم نہیں ہو سکا، دیکھیے: (الرحیق المختوم، ص: 217)

ان دونوں میں تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دھمکی کے انداز میں یہ بھی کہا: ''اللہ کی قسم! اگر تو نے مجھے بیت اللہ کے طواف سے روکا تو میں شام کو جانے والا تیرا تجارتی راستہ بند کر دوں گا۔'' انھوں نے اس جھگڑے کے دوران میں امیہ کو بھی متنبہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے قتل کرنے کی خبر دے رکھی ہے۔ فی الواقع ایسا ہی ہوا۔ امیہ کو بدر کے میدان میں قتل کر دیا گیا۔''[1]

[1] صحيح البخاري، المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام، حديث:3632.

باب

7

غزوات وسرایا

- کفار سے لڑائی کی اجازت
- غزوۂ بدر سے پہلے کے اہم واقعات
- غزوۂ بدر کبریٰ
- نصرتِ الٰہی اور غلبۂ حق

***

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ﴾

''ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے (جہاد کی) اجازت دے دی گئی کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا اور بلاشبہ اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔''

[الحج 22:39]

«اَللّٰهُمَّ! أَنجِزْلِي مَا وَعَدْتَنِي، اَللّٰهُمَّ! آتِ مَا وَعَدْتَنِي، اَللّٰهُمَّ! إِنْ تَهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةُ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ لَا تُعْبَدْ فِي الْأَرْضِ»

''اے اللہ! وہ وعدہ پورا فرما جو تو نے مجھ سے کر رکھا ہے۔ اے اللہ! جس فتح کی تو نے خوشخبری دے رکھی ہے، آج عطا فرما۔ اے اللہ! اگر آج یہ مٹھی بھر مسلمان ختم ہو گئے تو روئے زمین پر تیری عبادت کبھی نہیں ہو گی۔''

[صحیح مسلم، حدیث: 1763]

کفار سے لڑائی کی اجازت

ابن جریر طبری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اپنی سند کے ساتھ روایت کی، انھوں نے کہا: ''جب نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکال دیے گئے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ ان بدنصیبوں نے اپنے نبیِ کریم کو نکال دیا ہے۔ اب یہ ضرور تباہ و برباد ہوں گے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ﴾

''ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے (جہاد کی) اجازت دے دی گئی کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا اور بلاشبہ اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔''[2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تب میں نے جان لیا کہ عنقریب جنگ کا ڈنکا بجے گا۔''[3]

مسند احمد کی اسی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا: ''قتال کے بارے میں اترنے والی یہ پہلی آیت ہے۔''[4]

[1] تفسير الطبري: 123/17، وتفسير ابن كثير: 431,430/5. [2] الحج 39:22. [3] جامع الترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة الحج، حديث: 3171، والسنن الكبرٰى للنسائي: 411/6، كتاب التفسير، سورة الحج، حديث: 11345، و مسند أحمد: 216/1. [4] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 262/3. احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ ترمذی نے اسے حسن

عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی، انھوں نے کہا: ”یہ آیت حضرت محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ کے بارے میں اس وقت اُتری جب انھیں مکہ سے نکال دیا گیا۔“ [1]

امر واقع یہ ہے کہ جہاد نہایت مناسب وقت پر شروع ہوا کیونکہ مکہ مکرمہ میں مسلمان مشرکین سے بہت کم تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں لڑائی کا حکم نہیں دیا۔ جب مشرک حد سے بڑھ گئے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا، اس طرح آپ کو مکہ سے نکال دیا اور آپ کے صحابہ میں سے کسی کو حبشہ اور کسی کو مدینہ کی طرف دھکیل دیا۔ اُدھر جب مسلمانوں کے قدم مدینہ منورہ میں جم گئے اور رسول اللہ ﷺ بھی اُن کے پاس پہنچ گئے اور مدینہ منورہ دارالاسلام اور مسلمانوں کی مضبوط پناہ گاہ بن گیا تو اللہ تعالیٰ نے دشمنانِ اسلام سے جہاد کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہی آیت نازل ہوئی۔ [2] اس وقت اُن پر جہاد فرض نہیں تھا بلکہ انھیں محض ظالم سے لڑنے کی اجازت دی گئی تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں سے لڑائی کرنا فرض قرار دیا جو اُن سے آ کر لڑیں۔ اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾

”اُن لوگوں سے اللہ کے راستے میں لڑائی کرو جو تم سے لڑائی کرتے ہیں۔“ [3]

پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ضروری قرار دیا کہ وہ سب مشرکوں سے لڑائی کریں۔ اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

» قرار دیا اور البانی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ [1] تفسير الطبري: 123،122/17، و تفسير ابن كثير: 350/5 و 431. [2] تفسير ابن كثير: 432،431/5. زہری نے کہا: ”عروہ نے ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کر کے مجھے جو خبر دی اس کے مطابق قتال کے متعلق سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا﴾ اس روایت کو نسائی نے نقل کیا اور ابن حجر رحمہ اللہ کے مطابق اس کی سند صحیح ہے۔ دیگر محدثین نے بھی اسے نقل کیا ہے۔“ دیکھیے: (فتح الباري: 142/15، والسيرة الشامية: 12/4) [3] البقرة 190:2.

﴿ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ﴾

''تم مشرکین سے اکٹھے لڑو جس طرح وہ تم سے اکٹھے لڑتے ہیں۔''[1]

گویا جہاد کی مشروعیت چار مراحل میں ہوئی۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

* لڑائی کے بجائے صرف صبر و برداشت کا مرحلہ۔ یہ مکہ مکرمہ میں تھا۔
* لڑائی کی اجازت کا مرحلہ۔ یہ مرحلہ ہجرت کے بعد آیا۔
* اُن لوگوں سے لڑائی کے حکم کا مرحلہ جو مسلمانوں سے جنگ شروع کریں۔
* تمام مشرکین سے لڑائی کی فرضیت کا مرحلہ۔[2]

جہاد و مجاہدین کی اہمیت

رسول اللہ ﷺ کی بہت سی احادیث جہاد اور مجاہدین کی فضیلت کے بارے میں ہیں۔ چاہے وہ جہاد جان کے ساتھ ہو یا مال کے ساتھ، ہاتھ کے ساتھ ہو یا زبان کے ساتھ، نیز آپ ﷺ نے شہادت کے معنی بھی بہت وسیع کر دیے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں بطورِ مثال چند احادیث پیش کرتے ہیں۔ کتاب اللہ میں جہاد سے متعلقہ آیات ان کے علاوہ ہیں:

* «وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، فَإِنَّ الْجِهَادَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بَابٌ من أَبْوَابِ الْجَنَّةِ، يُنْجِي اللّٰهُ بِهِ مِنَ الْهَمِّ وَالْغَمِّ»

''اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرو کیونکہ جہاد فی سبیل اللہ جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جہاد کے ذریعے سے ہر قسم کے غم و فکر سے نجات عطا فرماتا ہے۔''[3]

[1] التوبة 36:9. [2] زاد المعاد: 71/3. [3] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم (تحقيق مساعد بن سليمان الراشد الحميد): 133/1، حديث: 5. محقق کا کہنا ہے کہ اس کی سند حسن لغیرہ ہے۔ انھوں نے اس کی دوسری سندیں بھی بیان کی ہیں۔

* «إِنَّ أَبْوَابَ الْجَنَّةِ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوفِ»

''جنت کے دروازے تلواروں کے سائے تلے ہیں۔'' [1]

* ''شیطان انسان کے سامنے ہر راستے پر بیٹھتا ہے۔ وہ جہاد کے راستے پر بھی بیٹھتا ہے۔اُس سے کہتا ہے: تو مارا جائے گا، تیری بیوی کسی اور کے نکاح میں چلی جائے گی۔تیری وراثت تقسیم کر لی جائے گی۔'' پھر آپ ﷺ نے اسلام اور ہجرت کا ذکر فرمایا اور آخر میں فرمایا: ''جس نے (شیطان کے بہکانے کے باوجود) یہ کام کر لیے اللہ تعالیٰ اُس کے لیے جنت کا ضامن ہے۔'' [2]

* ''مجاہد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے نفس (کی خواہشات) کا مقابلہ کرے۔'' [3]

* حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہم غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ میں نے درخواست کی: اللہ کے رسول! (جہاد کے متعلق) مجھے کچھ بتائیے۔'' آپ نے فرمایا: ''اسلام کی چوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔'' [4]

* ''دو اوقات ایسے ہیں کہ اُن میں دعا رد نہیں ہوتی یا کم ہی رد ہوتی ہے۔ اذان کے وقت کی دعا اور جنگ کے وقت کی دعا جب ایک دوسرے کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جا رہا ہو۔'' [5]

* حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! کون سا

---

[1] صحیح مسلم، الإمارة، باب ثبوت الجنة للشهيد، حديث: 1902. [2] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 1/149-151، حديث: 13. محقق نے اس روایت کی سند کو حسن قرار دیا اور مختلف ماخذوں سے اس کی بیشتر سندیں نقل کی ہیں۔ [3] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 1/152، حديث: 14. محقق نے اس روایت کی سند کو حسن قرار دیا اور اس کے دیگر حوالے بھی دیے ہیں۔ [4] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 1/155، حديث: 16. محقق کی تحقیق کے مطابق اس روایت کی سند حسن لغیرہ ہے۔ انھوں نے مختلف ماخذوں سے اس کی کئی سندیں نقل کی ہیں۔ [5] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 1/164، حديث: 18. محقق کی تحقیق کے مطابق اس کی سند حسن لغیرہ ہے۔

عمل افضل ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ پر صدقِ دل سے ایمان رکھنا اور اُس کے راستے میں جہاد کرنا......۔''[1]

* حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: ''اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جو جہاد کے برابر ہو؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں ایسا کوئی عمل نہیں پاتا۔'' پھر فرمایا: ''کیا تم ایسا کر سکتے ہو کہ جب کوئی مجاہد جہاد کے لیے نکلے تو تم اپنی مسجد میں داخل ہو جاؤ اور عبادت شروع کر دو، کوئی وقفہ نہ کرو اور روزے رکھنے شروع کر دو، کوئی ناغہ نہ کرو (حتی کہ وہ مجاہد واپس آجائے)؟'' وہ کہنے لگا: ''میں اس کی طاقت نہیں رکھتا۔'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مجاہد کا گھوڑا اپنی دراز رسی میں اکیلا ہی ٹاپتا پھرے تب بھی مجاہد کے لیے نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔''[2]

* ''اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے کی مثال، حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کون اس کے راستے میں جہاد کرنے والا ہے، اُس شخص کی طرح ہے جو مسلسل عبادت کرتا رہے، مسلسل روزہ رکھتا رہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کا ضامن ہے کہ اگر وہ جہاد میں شہید ہو گیا تو اللہ تعالیٰ اُسے لازماً جنت میں داخل کرے گا ورنہ اُسے اجر و غنیمت کے ساتھ صحیح سالم واپس لائے گا۔''[3]

* حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''اللہ کے رسول! لوگوں میں سے افضل کون ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''وہ مومن جو اپنے جان و مال کے ساتھ جہاد کرتا ہے۔'' لوگوں نے پوچھا: ''پھر کون؟'' فرمایا: ''وہ مومن جو

[1] صحيح البخاري، العتق، باب: أيّ الرقاب أفضل؟ حديث: 2518، وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان كون الإيمان بالله تعالى أفضل الأعمال، حديث: 83. [2] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب فضل الجهاد والسير، حديث: 2785. [3] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب: أفضل الناس مؤمن مجاهد بنفسه وماله في سبيل الله، حديث: 2787.

کسی پہاڑی گھاٹی میں الگ تھلگ رہتا ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھتا ہے۔''[1]

* حضرت ابوفاطمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: ''اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا کام بتا دیجیے جس پر میں پابندی سے عمل کرتا رہوں۔'' فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا کرو۔ کوئی اور عمل اس جیسا نہیں۔''[2]

* ''جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ کبھی جنگ پر نہیں گیا، نہ اُس کے دل میں جہاد کی خواہش ہوئی وہ ایک قسم کے نفاق پر مرا۔''[3]

* اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ کے راستے میں جہاد کرتا ہے میں اُس کا ضامن ہوں۔ اگر میں نے اُس کی روح قبض کر لی تو اُسے جنت عطا کروں گا اور اگر میں نے اسے واپس آنے کا موقع دیا تو اُسے اجر وغنیمت کے ساتھ واپس لاؤں گا۔''[4]

* اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ''جو شخص خالص اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے، اُس کے وعدوں کی تصدیق کرتے ہوئے اور اُس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہوئے، اُس کے راستے میں جہاد کے لیے نکلے گا، اللہ تعالیٰ پر لازم ہے کہ اُسے اسلامی لشکر میں جیسے بھی موت آ گئی، تو اُسے لازماً جنت میں داخل کرے گا یا پھر وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ اور نگرانی میں جتنا عرصہ بھی چلے پھرے اُسے اجر وغنیمت کے ساتھ اُس کے گھر والوں

[1] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب: أفضل الناس مؤمن مجاهد ......، حديث: 2786.
[2] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 199/1، حديث: 41. محقق کی تحقیق کے مطابق اس کی سند حسن لغیرہ ہے۔ انھوں نے اس کی کئی سندیں بھی نقل کی ہیں جو اسے حسن لغیرہ کے درجے پر پہنچا دیتی ہیں۔ [3] صحيح مسلم، الإمارة، باب ذمّ من مات ولم يغز ولم يحدث نفسه بالغزو، حديث: 1910، وكتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 202/1، حديث: 43، واللفظ له. محقق نے اس کی دیگر سندیں بھی بیان کی ہیں۔ [4] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 205/1، حديث: 45. محقق کتاب مساعد الحمید کا کہنا ہے: ''اس حدیث کی سند حسن لغیرہ ہے۔'' انھوں نے اس کی کئی سندیں اور کئی ماخذ بیان کیے ہیں۔

کے پاس صحیح سالم واپس لائے گا۔''[1]

* آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں گھر سے نکلا، پھر وہ طبعی موت مر گیا یا جنگ میں مارا گیا، وہ شہید ہے۔ جس شخص کو اُس کے جانور نے گرا کر اُس کا منکا توڑ دیا یا اُسے کسی موذی کیڑے نے ڈس لیا یا وہ اپنے بستر پر جیسے بھی مر گیا، وہ شہید ہوگا اور اُسے جنت ملے گی۔''[2]

* ''اللہ تعالیٰ کے راستے میں صبح تھوڑی دیر کے لیے لڑائی کو جانا یا شام کو کچھ وقت کے لیے لڑائی کو جانا، دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہے۔''[3]

* ''جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں کچھ بھی خرچ کیا، اُسے اس کا سات سو گنا ثواب ملے گا۔''[4]

* ''تین شخص ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر اُن کی مدد کرنا لازم ہے: ❁ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا۔ ❁ زنا سے بچنے کی نیت سے نکاح کرنے والا۔ ❁ اپنے آقا سے آزادی کا معاہدہ کرنے والا غلام جو رقم کی ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہے۔''[5]

* حضرت ضحاک بن ابی جَبِیرۃ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: انصار صدقات کیا کرتے تھے اور عطیات دیا کرتے تھے۔ خشک سالی ہوگئی تو انھوں نے صدقات وعطیات

---

[1] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 222/1، حديث: 53. محقق کتاب مساعد الحمید کا کہنا ہے: ''اس حدیث کی سند حسن لغیرہ ہے۔'' انھوں نے اس کی کئی سندیں اور کئی ماخذ بیان کیے ہیں۔ [2] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 223/1، حديث: 54. سند حسن لغیرہ ہے۔ [3] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب الغدوة والروحة في سبيل الله......، حديث: 2792، وصحيح مسلم، الإمارة، باب فضل الغدوة والروحة في سبيل الله، حديث: 1880. [4] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 1/ 24، حديث: 71، و مسند أحمد: 345/4، وجامع الترمذي، فضائل الجهاد، باب ماجاء في فضل النفقة في سبيل الله، حديث: 1625. [5] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 273/1، حديث: 83، و مسند أحمد: 251/2، وجامع الترمذي، فضائل الجهاد، باب ماجاء في المجاهد والناكح......، حديث: 1655.

روک لیے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی:

﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ ''اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔'' [1]

* ''جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں لڑائی کے لیے جانے والے کو سامانِ ضرورت مہیا کرے، اُسے بھی جانے والے کے برابر ثواب ملے گا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں لڑائی کے لیے جانے والے کے گھر بار کی ذمہ داری لے اور ان کے اخراجات پورے کرے، اُسے بھی جانے والے کے برابر ثواب ملے گا۔'' [2]

* ''جو شخص جہاد پر جانے والے کے لیے سامان مہیا کرے یا اُس کی عدم موجودگی میں اُس کے گھر بار کی ذمہ داری قبول کرے یوں سمجھو وہ بھی جنگ کے لیے گیا۔'' [3]

* ایک روایت میں ہے: ''جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں لڑائی کے لیے جانے والے کو سامان مہیا کرے گویا وہ بھی جنگ پر گیا اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں جانے والے کسی شخص کے گھر بار کے اخراجات کی ذمہ داری اچھے طریقے سے پوری کرے، گویا وہ بھی جہاد پر گیا۔'' [4]

* ''جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے مال سے دو قسم کی چیزیں (یا جوڑا جوڑا) دے اُسے جنت کے تمام دروازوں سے دخولِ جنت کی دعوت دی جائے گی جبکہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ جو شخص اہل جہاد میں سے ہوگا اُسے جہاد والے دروازے سے جنت میں بلایا جائے گا۔'' [5]

[1] البقرة 2:195. كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 1/280، حديث: 87. [2] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 1/284، حديث: 89. [3] صحيح مسلم، الإمارة، باب فضل إعانة الغازي في سبيل الله بمركوب وغيره و خلافته في أهله بخير، حديث: 1895. [4] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب فضل من جهز غازيا أوخلفه بخير، حديث: 2843. [5] صحيح مسلم، الزكاة، باب فضل من ضم إلى الصدقة غيرها من أنواع البر، حديث: 1027، وكتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 1/307، حديث: 95,96، واللفظ له.

* ''جس شخص نے نہ تو کسی غازی کو سامان مہیا کیا، نہ خود جنگ پر گیا، نہ کسی غازی کے گھریلو اخراجات کا ذمہ دار بنا، اللہ تعالیٰ اُسے قیامت (اُس کی موت) کے دن سے پہلے کسی نہ کسی زبردست آفت میں مبتلا کرے گا۔''[1]

* ''مجاہدین کی بیویاں گھر بیٹھ رہنے والوں کے لیے ان کی ماؤں کی طرح قابلِ احترام ہیں۔ جو شخص کسی مجاہد کے گھر میں خیانت کا ارتکاب کرے گا، اللہ تعالیٰ اُسے قیامت کے دن مجاہد کے سامنے کھڑا کرے گا کہ اس کی نیکیوں میں سے جتنی نیکیاں چاہو لے لو۔ کیا خیال ہے وہ کوئی نیکی چھوڑ دے گا؟''[2]

* ''قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! فرض نماز کے علاوہ جہاد فی سبیل اللہ سے بڑھ کر کوئی کام افضل نہیں جس میں کسی شخص کے قدم یا چہرہ غبار آلود ہوں۔''[3]

* ''ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ کسی شخص کے قدم اللہ کے راستے میں غبار آلود ہوں، پھر اُسے جہنم کی آگ لگے۔''[4]

* ''کسی مسلمان شخص کے پیٹ میں غبار فی سبیل اللہ اور جہنم کا دھواں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔''[5]

* ''ایسا کبھی نہ ہوگا کہ کسی صاحبِ ایمان شخص کے پیٹ میں جہاد کا غبار اور جہنم کا دھواں اکٹھے ہو جائیں۔''[6]

* ''جن لوگوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اُن میں وہ شخص بھی داخل ہے جو جہاد فی سبیل اللہ

[1] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 312/1، حديث: 99. محقق کتاب نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ [2] صحيح مسلم، الإمارة، باب حرمة نساء المجاهدين، حديث: 1897، وكتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 314/1، حديث: 100. [3] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 326/1، حديث: 111. محقق کے مطابق اس کی سند حسن لغیرہ ہے۔ [4] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب من اغبرت قدماه في سبيل الله، حديث: 2811. [5] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 339/1، حديث: 119. محقق کتاب نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ [6] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 343/1، حديث: 120. محقق کتاب نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔

کے دوران دشمن کے مقابل ڈٹا رہا حتی کہ وہ شہید ہوگیا یا اللہ تعالیٰ نے اُس کے ساتھیوں کو فتح نصیب کر دی۔"[1]

* "مقتول تین قسم کے ہیں: اُن میں سے ایک وہ مومن ہے جس نے اپنے جان و مال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا۔ جب دشمن سے مقابلہ ہوا تو وہ لڑائی میں جُت گیا حتی کہ شہید ہوگیا۔" نبیِ کریم ﷺ نے اُس کی فضیلت کے بارے میں فرمایا: "اس شہید کو اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے نصب خیمے میں جگہ نصیب ہوگی۔ صرف نبی اپنے درجۂ نبوت کی وجہ سے اُس سے افضل ہوں گے......۔"[2]

* "جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں اونٹنی کے دودھ دوہنے کے درمیانی وقفے کے برابر بھی لڑائی کی اُس کے لیے جنت ہے۔"[3]

* "ایک شخص کا جہاد فی سبیل اللہ کے دوران صف میں کھڑے ہونا ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے۔"[4]

* "اُس آنکھ پر آگ میں جانا حرام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ڈر سے روئی۔ اُس آنکھ پر بھی آگ حرام ہے جو جہاد فی سبیل اللہ میں جاگتی رہی۔"[5]

* "اس شخص جیسا کوئی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے گھوڑے پر سوار رہتا ہے اور لوگوں کی شرارتوں سے بچتا ہے۔ اُس شخص جیسا بھی کوئی نہیں جو آبادی سے باہر اپنی

---

[1] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 360/1، حديث: 127. محقق کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند حسن لغیرہ ہے۔ [2] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 371/1، حديث: 132. محققِ کتاب نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ [3] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 378/1، حديث: 135. محقق نے کہا: "اس حدیث کی سند حسن لغیرہ ہے۔ علاوہ ازیں اسے احمد نے بھی روایت کیا ہے۔" دیکھیے: (مسند أحمد: 446/2-524، وجامع الترمذي، فضائل الجهاد، باب ماجاء في الغدو والرواح في سبيل الله، حديث: 1650)
[4] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 389/1، حديث: 139. محقق نے کہا: "اس حدیث کی سند حسن لغیرہ ہے۔" [5] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 433/2، حديث: 144. سند حسن لغیرہ ہے۔

بکریوں میں رہتا ہے۔ مہمان کی مہمان نوازی کرتا ہے اور اُس کا حق ادا کرتا ہے۔“ [1]

* ”جو شخص صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ سے شہادت کی دعا کرتا رہے، پھر چاہے وہ طبعی موت مر جائے یا میدان میں مارا جائے اُسے یقیناً شہید کا ثواب ملے گا۔“ [2]

* ”اے اللہ! میری امت کو نیزوں اور طاعون کے ساتھ شہادت کی موت عطا فرما۔“ [3]

* ”شہید فی سبیل اللہ قتل کی صرف اس قدر تکلیف محسوس کرتا ہے جتنی تمھیں ایک چٹکی لیے جانے سے ہوتی ہے۔“ [4]

* ”شہید کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کئی اعزاز ہیں: ۞ اُس کے خون کی پہلی دھار ہی پر اُسے معافی مل جاتی ہے۔ ۞ اُسے اُس کا جنتی ٹھکانہ دکھا دیا جاتا ہے۔ ۞ اُسے ایمان کا مکمل لباس (حُلّہ) پہنا دیا جاتا ہے۔ ۞ موٹی اور سیاہ وسفید آنکھوں والی بہتر حوروں سے اُس کی شادی رچا دی جاتی ہے۔ ۞ اُسے فتنۂ قبر (سوال و جواب) سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ ۞ بڑی گھبراہٹ کے دن (حشر کے دن) وہ مطمئن و مامون رہے گا۔ ۞ اُس کے سر پر عزت و وقار کا تاج رکھا جائے گا جس کا ایک موتی دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہوگا۔ ۞ اُس کے رشتہ داروں میں سے ستر افراد کے بارے میں اُس کی سفارش قبول کی جائے گی۔“ [5]

---

[1] صحيح مسلم، الإمارة، باب فضل الجهاد والرّباط، حديث: 1888، وكتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 423/2، حديث: 154، واللفظ له۔ [2] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 490/2، حديث: 181. محقق کی تحقیق کے مطابق اس کی سند حسن لغیرہ ہے۔ [3] مسند أحمد: 437/3، والمستدرك للحاكم: 93/2. حاکم نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے ان سے اتفاق کیا ہے۔ [4] مسند أحمد: 297/2، وكتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 505/2، حديث: 190. محقق نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ [5] جامع الترمذي، فضائل الجهاد، باب في ثواب الشهيد، حديث: 1663، وسنن ابن ماجه، الجهاد، باب فضل الشهادة في سبيل الله، حديث: 2799، ومسند أحمد: 131/4، وسلسلة الأحاديث الصحيحة: 647/7، حديث: 3213، واللفظ له، وسنن سعيد بن منصور، حديث: 2562، وكتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 533/2، حديث: 204. محقق نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ اس کی مزید تحقیق کے لیے ملاحظہ کیجیے: (الموسوعة ◄◄

* ”جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ کرنے والوں کے لیے تیار کیے ہیں۔ ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگا کرو۔ یہ جنت کے درمیان اور بلند ترین مقام میں ہے۔اس کے اوپر رب رحمٰن کا عرش ہے۔اسی سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں۔“[1]

* ”جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ کبھی دنیا میں واپس آنے کی خواہش نہیں کرے گا، چاہے اُسے زمین کی ہر چیز دے دی جائے۔مگر شہید تمنا کرے گا کہ مجھے دنیا میں واپس بھیجا جائے اور میں دس دفعہ شہید کیا جاؤں کیونکہ اُسے شہید کا اعزاز و اکرام نظر آ رہا ہوگا۔“[2]

* ایک روایت میں یوں ہے:”جو بندہ اس حال میں مرتا ہے کہ اُس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں جزائے خیر ہو وہ کبھی پسند نہیں کرے گا کہ دنیا میں واپس آئے، چاہے اُسے دنیا اور دنیا کی ہر چیز دے دی جائے، البتہ شہید جب شہادت کی فضیلت دیکھے گا تو خود آرزو کرے گا کہ مجھے دوبارہ دنیا میں بھیجا جائے تاکہ میں دوبارہ شہید ہو جاؤں۔“[3]

* ”جو مومن میدانِ جنگ میں دشمن کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں اور منہ نہیں موڑتے حتی کہ شہید ہو جاتے ہیں، وہ جنت کے بلند و بالا چوباروں میں خوش طبعی سے پھریں گے۔ رب کریم انھیں دیکھ کر ہنستا ہے اور جب رب کریم کسی بھی مقام پر کسی بندے کو دیکھ کر ہنس پڑے تو اس کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا۔“[4]

» الحديثية (مسند أحمد): 419/28، حديث: 17182) [1] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب درجات المجاهدين، حديث: 2790، وكتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 544/2، حديث: 212، واللفظ له. [2] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب تمني المجاهد أن يرجع إلى الدنيا، حديث: 2817، و صحيح مسلم، الإمارة، باب فضل الشهادة في سبيل الله تعالى، حديث: (109)-1877. [3] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب الحور العين وصفتهن، حديث: 2795، وصحيح مسلم، الإمارة، باب فضل الشهادة في سبيل الله تعالى، حديث: (108)-1877، و مسند أحمد: 126/3. [4] مسند أحمد: 287/5، وسنن سعيد بن منصور: 2566، وكتاب الجهاد «

* ”جب انسان مر جاتا ہے تو اُس کے ہر نیک عمل کی تحریر رُک جاتی ہے مگر جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں سرحد پر مستعد بیٹھا رہتا ہے اُس کا عمل اُس کی موت کے بعد بھی جاری رکھا جاتا ہے اور حساب کتاب کے دن تک اُس کا رزق اُسے پہنچتا رہتا ہے۔“[1]

* ”قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر مجھے یہ خدشہ نہ ہوتا کہ صاحبِ ایمان لوگ کبھی یہ پسند نہیں کریں گے کہ میں جنگ کو جاؤں اور وہ گھر بیٹھے رہیں، اُدھر میرے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ اُن سب کو سواری مہیا کر سکوں تو میں اللہ کے راستے میں جانے والے کسی بھی لشکر سے پیچھے نہ رہتا۔ قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میری دلی تمنا ہے کہ میں اللہ کے راستے میں شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں۔“[2]

* ”شہداء پانچ قسم کے ہیں: ❀ طاعون سے مرنے والا۔ ❀ پیٹ کی تکلیف (ہیضہ وغیرہ) سے مرنے والا۔ ❀ ڈوب کر مرنے والا۔ ❀ دیوار وغیرہ کے نیچے دب کر مرنے والا۔ ❀ اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید ہونے والا۔“[3]

* ”شہید کے قرض کے سوا تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔“[4]

* ”جو شخص صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ سے شہادت مانگے اللہ تعالیٰ اُسے شہداء کے مراتب تک پہنچائے گا، چاہے وہ اپنے بستر ہی پر مرے۔“[5]

◄◄ لابن أبي عاصم: 566/2، حدیث: 228. محقق نے اس حدیث کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ [1] كتاب الجهاد لابن أبي عاصم: 681/2، حدیث: 296. محقق نے اس کی سند کو حسن قرار دیا۔ [2] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب تمنّي الشهادة، حديث: 2797. [3] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب: الشهادة سبع سوى القتل، حديث: 2829، و صحيح مسلم، الإمارة، باب بيان الشهداء، حديث: 1915,1914. [4] صحيح مسلم، الإمارة، باب من قتل في سبيل الله كفرت خطاياه إلا الدَّين، حديث: 1886,1885. [5] صحيح مسلم، الإمارة، باب استحباب طلب الشهادة في سبيل الله، حديث: 1909.

غزوۂ بدر سے پہلے کے اہم واقعات

غزوات وسرایا کے مقاصد

اللہ تعالیٰ نے نبیِ کریم ﷺ اور مومنین کو لڑائی کی اجازت دی تو انھوں نے قریش کے ظلم وستم کے مقابلے کے لیے تیاری شروع کر دی۔ قریش کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی قریش جیسا ذہن رکھتے تھے۔ اُن کی پیش بندی بھی ضروری تھی۔ قریش نے مسلمانوں کو باور کرانے کی کوشش کی کہ ہم لوگ مدینہ میں بھی اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے بھی قریش پر یہ واضح کرنا ضروری سمجھا کہ اب ہم اتنے کمزور نہیں رہے جس قدر قریش سمجھ رہے ہیں۔ اب ہم قریش کا غرور توڑ سکتے ہیں، سیاسی واقتصادی طور پر اُن کی ناکا بندی کر سکتے اور اپنے چھینے ہوئے حقوق بزور حاصل کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں مسلمانوں نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ شمال وجنوب اور مشرق ومغرب میں قریش کے تجارتی راستوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں دو اہم اقدامات کیے:

* قریش کے تجارتی قافلوں پر حملے کے لیے فوجی دستوں کی ترسیل۔
* مدینہ منورہ کے اردگرد رہنے والے قبائل کے ساتھ ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کے دفاعی معاہدے کر کے قریش کو تنہا کرنے کی کوشش۔

قریشی قافلے شام کی طرف جاتے ہوئے ان قبائل کے علاقے سے گزرتے تھے۔ اس طرح آپ ﷺ نے ہجرت کے ابتدائی سالوں میں بنوضمرہ، جہینہ، خزاعہ، غفار، اور اسلم کے قبائل کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں سرایا کے احوال میں آئے گی۔ ان شاء اللہ۔ ان کے بعد آپ نے دوسرے قبائل کو بھی چند ہی برسوں میں اپنے بلاک

میں داخل کر لیا۔

رسول اللہ ﷺ کی جنگی مہمیں متذکرہ بالا مقاصد میں بہت کامیاب رہیں، خصوصاً قریش اور اُن کے حلیفوں کو پریشان کرنا، اُن کے مفادات کو نقصان پہنچانا، اُن کی تجارتی سرگرمیوں پر ضرب لگانا اور ضروری اخراجات اور مسلح ہونے کے لیے آمدن کا حصول ممکن بنانا۔ ان جنگی کارروائیوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ دشمنوں کو پتہ چل گیا کہ مسلمان انھیں روکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان اقدامات کے نتیجے میں اسلامی فوجوں کو فوجی تربیت، جنگی مشقوں، دشمنوں کی نبض ٹٹولنے، صحرائی راستوں اور دشمنوں کے حالات سے واقفیت رکھنے کے نئے اسلوب معلوم ہوئے۔ یوں ان کے عسکری تجربے میں بیش بہا اضافہ ہو گیا۔ (41)

ساحل سمندر کی مہم (سریّہ سیف البحر)

اس مہم کی قیادت حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی۔ اُن کے ماتحت تیس مہاجرین تھے۔ ان کا مقصد قریش کے ایک تجارتی قافلے کو روکنا تھا جو ابوجہل کی قیادت میں شام سے آ رہا تھا۔ اُس میں تین سو افراد تھے۔ جب دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے تو لڑائی کے لیے صف بندی ہو گئی لیکن دونوں گروہوں کا ایک حلیف، مجدی بن عمرو جہنی آڑے آ گیا۔ یوں لڑائی نہ ہو سکی۔ یہ واقعہ ہجرت کے ساتویں ماہ رمضان المبارک میں پیش آیا۔ [1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدنی زندگی کے آغاز ہی میں جُہینہ کی

(41) غزوہ اور سریہ: محدثین اور مؤرخین اُس لشکر کے لیے ”غزوہ“ کا لفظ بولتے ہیں جس کی قیادت رسول اللہ ﷺ نے خود فرمائی ہو اور جس لشکر کی قیادت کسی صحابی نے کی ہو اُسے ”سریہ“ کہتے ہیں۔

[1] المغازي للواقدي: 9/1، والطبقات الكبرىٰ: 6/2، والسيرة النبوية لابن هشام: 281/2. ان سب نے یہ واقعہ بغیر سند کے بیان کیا ہے۔ ابن سعد کا کہنا ہے: ”رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر تک انصار کے کسی فرد کو جنگی مہم پر نہیں بھیجا۔ وجہ یہ تھی کہ انصار کی یہ شرط تھی کہ وہ اپنے گھر میں آپ ﷺ کی حفاظت کریں گے۔ ہمارے نزدیک یہی روایت قابل اعتماد ہے۔“ دیکھیے: (الطبقات الكبرىٰ: 6/2)

ایک شاخ کے سردار سے معاہدہ کر لیا تھا گویا نصف سال سے بھی پہلے۔ اس نکتے کی وضاحت اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو مسند احمد میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو جہینہ کے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: آپ ہمارے درمیان آ کر رہنے لگے ہیں، لہٰذا ہم سے معاہدہ کر لیجیے تاکہ ہم امن و امان سے آپ کے ہاں آ جا سکیں۔ آپ نے اُن سے معاہدہ کر لیا۔ بالآخر وہ لوگ مسلمان ہو گئے ......''[1]

تاریخی حوالوں سے کئی ایسے معاہدے ثابت ہیں جو آپ ﷺ نے جُہینہ کی مختلف شاخوں سے کیے تھے۔ اُن میں سے ایک کا ذکر ابن سعد نے کیا ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے جُہینہ کے دو قبیلوں بنوزُرعہ اور بنوربعہ کو یہ تحریر لکھ کر دی تھی کہ اُن کی جان و مال کو مکمل امان حاصل ہوگی۔ اگر کوئی شخص اُن پر ظلم و زیادتی کرے گا یا اُن سے لڑائی لڑے گا تو اُن کی مدد کی جائے گی۔ اُن کے دیہی اور شہری سب لوگ اس معاہدے میں برابر کے شریک ہوں گے، بشرطیکہ وہ عہد پر قائم رہیں اور مخالفت نہ کریں۔''[2]

اس معاہدے پر سیاسی رنگ غالب ہے کیونکہ اس میں کسی دینی معاملے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔[3] باقی رہی وہ دستاویز جو آپ ﷺ نے عمرو بن معبد جہنی کے نام سے جُہینہ کے دو قبیلوں بنوحُرقہ اور بنوجُرمُز کو لکھ کر دی تھی۔ اُس میں امان کے لیے دینی فرائض ادا کرنا شرط قرار دیا گیا۔ مزید برآں اُس میں غنیمت سے خمس حکومت کو دینے اور سود کی حرمت کا بھی ذکر ہے۔[4] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریر غزوۂ بدر کے بعد کی ہے کیونکہ خمس کی فرضیت غزوۂ بدر کے بعد اس وقت لاگو ہوئی جب مسلمانوں کو شان و شوکت

[1] مسند أحمد (تحقیق أحمد شاکر): 70/3. محدّث احمد شاکر نے کہا: ''اس روایت کی سند ضعیف ہے۔'' [2] الطبقات الکبریٰ: 270/1. یہ روایت بلا سند ہے۔ [3] دبلوماسیة محمد ﷺ، ص: 43.
[4] الطبقات الکبریٰ: 272،271/1. یہ روایت بلا سند ہے۔

حاصل ہو چکی تھی۔ وہ قریش کو شکست سے دوچار کر چکے تھے اور پورے جزیرہ نمائے عرب پر اسلام کا پرچم لہرانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ [1] سود کی حرمت بھی بتدریج نازل ہوئی۔ مکی دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاۡ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝ ﴾

''اور تم سود میں سے جو کچھ (قرض) دو تا کہ وہ لوگوں کے اموال میں (شامل ہوکر) بڑھتا رہے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا اور تم اللہ کا چہرہ چاہتے ہوئے جو کچھ بطور زکاۃ دو تو یہی لوگ (اپنا مال) کئی گنا بڑھانے والے ہیں۔'' [2]

پھر مدنی دور میں سود کی حرمت صریح طور پر نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

''اے ایمان والو! سود کو دُگنا چوگنا نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔'' [3]

وہ آخری آیت جس کے ذریعے سے سود کی حرمت کی قانون سازی مکمل ہوئی، یہ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ ﴾

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سود سے جو باقی ہے، چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو، پھر اگر تم نے یہ نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ایک بڑی جنگ کے لیے خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کرتے ہو تو تمھارے لیے تمھارے اصل مال ہیں، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔'' [4]

[1] دبلوماسیة محمد ﷺ، ص:44,43. [2] الروم 39:30. [3] آل عمرٰن 130:3. [4] البقرة 279,278:2. فقه السنة لسيد سابق:133,132/3.

رسول اللہ ﷺ نے عوسجہ بن حرملہ جہنی اور جہینہ کے ایک قبیلے بنوشنخ کو بھی دو تحریریں لکھ کر دی تھیں جن میں اُنھیں کچھ جاگیر دینے اور کچھ علاقوں پر اُن کے اقتدار کا حکم تھا۔اس کے علاوہ ان دونوں تحریروں میں کوئی اور بات نہیں۔ [1]

خَرّار کی طرف حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی مہم (سریۂ خرّار)

واقدی نے اپنی سند کے ساتھ جو حضرت سعد رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے، روایت کی کہ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''سعد! جاؤ، خرار پہنچو، وہاں سے قریش کا ایک تجارتی قافلہ گزرنے والا ہے۔'' چنانچہ میں بیس، اکیس مجاہدین کے ساتھ نکل پڑا۔ [2] ہم سب پیدل تھے۔ہم دن کو چھپتے، رات کو سفر کرتے۔پانچویں دن کی صبح ہوئی تو پتہ چلا قافلہ کل گزر چکا ہے۔نبی کریم ﷺ نے مجھ سے عہد لیا تھا کہ خرار سے آگے نہ بڑھوں ورنہ مجھے امید تھی کہ ہم اُن کو جا لیتے۔ [3] ابن سعد کے مطابق جھنڈا حضرت مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ یہ واقعہ ہجرت کے نو ماہ بعد ذوالقعدہ میں رونما ہوا۔ [4]

غزوۂ ابواء (ودّان)

رسول اللہ ﷺ (بقول واقدی) ہجرت کے گیارہ ماہ بعد اور (بقول ابن سعد) ایک سال بعد، صفر 2 ہجری میں قریش کے ایک تجارتی قافلے کو روکنے کی مہم پر عازمِ سفر ہوئے۔ اس سفر کا دوسرا مقصد بنوضمرہ کے پاس جانا بھی تھا۔ چلتے چلتے آپ ابواء پہنچے۔ وہاں بنوضمرہ

[1] الطبقات الكبرىٰ: 270/1. [2] ابن اسحاق کا بیان ہے کہ ان کی تعداد آٹھ تھی۔ ابن اسحاق کی یہ روایت بلا سند ہونے کی بنا پر ضعیف ہے۔ [3] المغازي للواقدي: 1/1. اس کی سند متصل ہے۔ سوائے واقدی کے تمام رجال ثقہ ہیں۔ واقدی حدیث میں متروک ہے۔ واقدی کے مطابق خرار جحفة کے نواح میں خم کے قریب ہی تھا۔ [4] الطبقات الكبرىٰ: 7/2. بلاسند ہے۔ والمغازي للواقدي: 11/1. یہ روایت ضعیف ہے۔

آباد تھے۔قریش کے قافلے سے تو مڈھ بھیڑ نہ ہوسکی، البتہ بنوضمرہ سے معاہدے کا موقع مل گیا۔ آپ ﷺ نے اُن سے طے کیا کہ وہ آپ کے خلاف کسی کی مدد کریں گے نہ حوصلہ افزائی۔ اس سلسلے میں اُن کے سردار مَخشی بن عمرو ضمری کے ساتھ باقاعدہ تحریری معاہدہ ہوا۔ [1]

یہ پہلا موقع تھا کہ رسول اللہ ﷺ بنفسِ نفیس کسی جنگی مہم کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ [2]

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: ''ابوالاسود نے اپنی ''مغازی'' میں حضرت عُروہ سے اور ابن عائذ نے متصل سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ نبیِ کریم ﷺ ''ابواء'' پہنچے تو حضرت عبیدہ بن حارث کو ساٹھ مجاہدین دے کر بھیجا۔ اُن کی مڈھ بھیڑ قریش کی ایک جماعت سے ہوگئی لیکن مقابلہ صرف تیراندازی تک محدود رہا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے تیر چلایا۔ انھیں بجا طور پر یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں سب سے پہلے تیر چلانے والے مجاہد ہیں۔'' [3] (سریہ عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کی تفصیل سریہ رابغ میں آ رہی ہے۔)

رابغ کی جانب عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کی جنگی مہم (سریۂ رابغ)

رسول اللہ ﷺ نے انھیں ساٹھ مجاہدین دے کر بھیجا اور باقاعدہ جھنڈا بنا کر مرحمت

[1] الطبقات الكبرىٰ: 275/1 . [2] السيرة النبوية لابن هشام: 275/2، والمغازي للواقدي: 12,11/1، والطبقات الكبرىٰ: 8/2. فتح الباری میں ہے کہ اسے موسیٰ بن عقبہ نے بھی روایت کیا ہے۔ ان سب نے اسے بلاسند نقل کیا ہے۔ ان سب مؤرخین نے یہ بھی نہیں بتایا کہ اس غزوے میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ کتنے سپاہی تھے۔ حافظ ابن حجر اور ہیثمی کے مطابق اسے طبرانی نے بھی کثیر بن عبداللہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ اگر ہم بخاری کے اس حکم کو پیش نظر رکھیں جو انھوں نے کثیر کی روایت پر لگایا ہے کہ صحیح حدیث کی کتاب کے سوا دیگر کتب میں اس کی روایت حسن ہے اور کثیر کے لیے امام ترمذی کی توثیق اور ان کے اعتماد کو بھی مدنظر رکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 86/6، وفتح الباري: 141/15) [3] فتح الباري: 142/15.

فرمایا۔ وہ مقررہ جگہ پر پہنچے تو اُن کا سامنا قریش کی ایک بڑی جمعیت سے ہوا۔ اُن کے کمانڈر ابوسفیان یا عکرمہ تھے۔ یہ مقابلہ علاقۂ حجاز کے ایک کنویں کے قریب ہوا۔ دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے پر تیر برسائے۔ اس دن حضرت سعد نے تیر چلایا۔ یہ اسلام کا پہلا تیر تھا جو چلایا گیا۔ کافر بھاگ نکلے۔ لیکن اُن میں سے حضرت مقداد بن عمرو اور عتبہ بن غزوان بن جابر مازنی مسلمانوں سے آملے۔ یہ دونوں پہلے بھی خفیہ طور پر مسلمان تھے لیکن اُن کے ساتھ آئے تاکہ اس حیلے سے مسلمانوں سے مل سکیں۔[1] اس مہم میں مسلمانوں کو سب سے بڑی کامیابی ان دونوں صحابہ کی صورت میں ملی۔

اس سَرِیّہ کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ واقدی اور ابن سعد کے مطابق یہ سریہ ہجرت سے آٹھ ماہ بعد شوال میں ہوا۔[2]

اس میں کوئی اشکال نہیں کہ خرار کی جنگی مہم کے علم بردار حضرت مقداد بن عمرو ہی تھے۔ سریۂ خرار ہجرت کے نویں ماہ پیش آیا۔ لیکن ابن اسحاق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سَریہ غزوۂ ابواء کے بعد ربیع الاول میں ہوا۔[3]

ابوالاسود اور ابن عائذ کے مطابق یہ واقعہ غزوۂ ابواء کے بعد رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے قبل وقوع پذیر ہوا۔ اسی کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''ابوالاسود نے اپنی ''مغازی'' میں حضرت عروہ سے اور ابن عائذ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ''ابواء'' پہنچے تو آپ نے حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کو ساٹھ آدمیوں کے ساتھ بھیجا۔ اُن کی مڈھ بھیڑ قریش کی ایک جماعت سے ہوئی لیکن بات صرف تیر اندازی تک محدود رہی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے

[1] الطبقات الكبرٰى: 7/2، والمغازي للواقدي: 10/1، والسيرة النبوية لابن هشام: 276/2. ان سب کی روایات بلا سند ہیں۔ [2] المغازي للواقدي: 10/1، والطبقات الكبرٰى: 7/2. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 276/2.

مسلمانوں کی طرف سے سب سے پہلا تیر چلایا۔اس طرح وہ ''فی سبیل اللہ اولین تیرانداز'' بن گئے۔[1]

اگراس روایت کی سند صحیح ہے تو ابوالاسود اور ابن عائذ کی بات راجح ہونی چاہیے، تاہم یہ اشکال ضرور رہے گا کہ پھر خرار کی مہم میں مقداد علم بردار کیسے بن گئے؟ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دراصل کسی اور مہم کی بات ہے۔یا ابن سعد کو غلط فہمی ہوئی ہے۔[2]

رَضویٰ کے علاقے میں غزوۂ بواط

رسول اللہ ﷺ اپنے دوسو صحابہ کے ساتھ قریش کا ایک تجارتی قافلہ روکنے کی غرض سے نکلے۔ اس قافلے میں اُمیہ بن خلف، قریش کے ایک سو جوان اور اڑھائی ہزار اونٹ تھے۔آپ ''بواط'' تک پہنچے۔ یہ رضویٰ کے علاقے میں جُہینہ کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کا نام ہے۔جب یہاں بھی قافلے کا پتہ نہ چل سکا تو آپ ﷺ لوٹ آئے۔کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ یہ ہجرت کے بعد تیرھویں ماہ ربیع الاول کا واقعہ ہے۔[3]

غزوۂ سفوان (بدرِ اولیٰ یا بدرِ صغریٰ)

ہجرت کے تیرھویں ماہ ربیع الاول میں کُرز بن جابر فہری نے مدینہ منورہ کے نزدیک چرنے والے اونٹوں پر دھاوا بول دیا۔رسول اللہ ﷺ اُس کے تعاقب میں نکلے اور بدر کے علاقے میں وادیِ سفوان تک پہنچے لیکن وہ ہاتھ نہ آسکا۔آپ مدینہ لوٹ آئے۔[4]

[1] فتح الباري: 142/15. [2] ابوالاسود اور ابن عائذ کی سندوں کے متعلق قولِ فیصل تب ہی کہا جا سکتا ہے جب ہمیں ان دونوں کی سندیں اپنی مکمل صورت میں میسر آجائیں۔ تاحال ہم ان سندوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکے۔ [3] الطبقات الکبرٰی: 908/2، والسیرة النبویة لابن هشام: 284/2، والمغازي للواقدي: 12/1. ان سب کی روایت بلاسند ہے۔ [4] السیرة النبویة لابن هشام: 288/2، والطبقات الکبرٰی: 9/2، والمغازي للواقدي: 12/1. ان سب کی روایت بلاسند ہے۔

ابن اسحاق کے مطابق یہ واقعہ غزوۂ ذی العشیرہ کے بعد پیش آیا۔ [1]

غزوۂ عُشَیرہ

رسول اللہ ﷺ اپنے ڈیڑھ سو یا بقول بعض دو سو صحابہ کے ساتھ قریش کے ایک بڑے قافلے کو روکنے کے لیے نکلے جو شام کو جارہا تھا۔ آپ ینبع کی طرف بنومدلج کے علاقے عشیرہ میں پہنچے تو قافلہ نکل چکا تھا۔ یہی وہ قافلہ ہے جس کی واپسی کے وقت بھی آپ اُسے روکنے نکلے تھے لیکن یہ بچ کر نکل گیا تھا۔ جنگِ بدر کبریٰ بھی اسی بنا پر ہوئی تھی۔

اس غزوے میں آپ نے بنومدلج اور اُن کے حلیف بنوضمرہ سے معاہدہ کیا، پھر آپ مدینہ واپس آگئے۔ کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔

یہ غزوہ ہجرت کے سولھویں ماہ جمادی الاخریٰ میں پیش آیا۔ [2] صحیح بخاری میں اس غزوے کا ذکر آتا ہے لیکن مزید کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ [3]

تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مندرجہ بالا قبائل کے علاوہ اور بھی کئی قبائل سے مدینہ آتے ہی مشترکہ دفاع اور امان و عدم جارحیت کے معاہدے کیے تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ اُن معاہدات کا کسی غزوے یا سریے ہی سے تعلق ہو، مثلاً:

* رسول اللہ ﷺ نے بُدَیل بن وَرْقاء، بشر اور بنوعمرو کے سردار جن کا تعلق خزاعہ سے تھا، انھیں بھی خطوط لکھے تھے جن میں آپ نے معاہدے کی تجدید کی اور اپنی طرف سے عدمِ جارحیت کا یقین دلایا تھا۔ [4]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام:2/288. [2] السيرة النبوية لابن هشام:2/285,284، والطبقات الكبرٰى:2/10,9، والمغازي للواقدي:1/13,12. ان سب کی روایات بلاسند ہیں۔ واقدی اور ابن سعد نے اس کا نام ''ذوالعشیرہ'' لکھا ہے لیکن جو نام صحیح بخاری میں آیا ہے وہی زیادہ صحیح ہے۔ [3] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة العشيرة......، حديث:3949. [4] أسد الغابة لابن الأثير:1/170، والطبقات الكبرٰى:1/272.

* رسول اللہ ﷺ نے بنوغفار کو بھی خط لکھا جس میں طے کیا گیا تھا کہ جو شخص بنوغفار یا مسلمانوں سے جنگ کرے گا دونوں مل کر اُس کا مقابلہ کریں گے۔ [1]
* رسول اللہ ﷺ نے بنوخزاعہ میں سے اسلم کے قبیلے کو بھی خط لکھا جس میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا قول قرار تھا۔ [2]
* نبی کریم ﷺ نے نعیم بن مسعود بن رُخَیلہ اشجعی کو خط لکھا جس میں ایک دوسرے کی مدد اور خیرخواہی کے معاہدے کی تصدیق تھی۔ [3]

نَخْلَہ کی جنگی مہم

ہجرت کے سترھویں مہینے رجب میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں آٹھ مہاجرین کا دستہ بھیجا۔ آپ نے انھیں ایک رقعہ لکھ دیا اور فرمایا: یہ خط ابھی نہ کھولنا۔ دو دن سفر کرنے کے بعد خط کھول کر پڑھنا اور اس پر عمل کرنا۔ آپ کا مقصد اس سریے کو مخفی رکھنا تھا تاکہ کسی کو یہ پتہ نہ چل سکے کہ یہ دستہ کدھر جا رہا ہے۔

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے دو دن بعد خط کھولا۔ اُس میں لکھا تھا: ''چلے چلو حتی کہ مکہ اور طائف کے درمیان ''نَخْلَہ'' کے مقام پر پہنچ جاؤ۔ وہاں قریش کی خبریں معلوم کرو اور ہمیں بتاؤ۔ کسی کو ساتھ جانے پر مجبور نہ کرنا۔'' [4] انھوں نے ساتھیوں کو خط کے مضمون سے مطلع کیا تو وہ سب خوشی خوشی اُن کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف چل پڑے۔

یہ لوگ نخلہ پہنچے تو قریش کا ایک تجارتی قافلہ وہاں سے گزرا۔ قافلے میں ابن حَضْرمی،

[1] الطبقات الکبرٰی: 274/1. [2] الطبقات الکبرٰی: 271/1. [3] الطبقات الکبرٰی: 274/1.

[4] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قریشی قافلوں پر دھاوے بولنے کا جو منصوبہ مسلمانوں نے بنایا تھا اس کی کارروائیاں حجاز کے شمالی علاقے تک ہی محدود نہیں تھیں بلکہ یہ دائرہ جنوب میں قریشی قافلوں کے یمن کو جانے والے راستے تک پھیل چکا تھا۔

عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ، اُس کا بھائی نوفل اور ہشام بن مغیرہ کا آزاد کردہ غلام حکم بن کیسان بھی شامل تھے۔

صحابہ نے اس تجارتی قافلے پر حملہ کرنے کے بارے میں مشورہ کیا۔ یہ رجب کا آخری دن تھا جو حُرمت کا مہینہ ہے۔ انھیں خدشہ تھا کہ اس حملے کے کوئی نامناسب نتائج برآمد نہ ہو جائیں۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ اگر ہم نے آج رات انھیں جاتے دیا تو یہ حرم میں داخل ہو جائیں گے اور ہمارے لیے حملے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی تو انھوں نے جرأت کا ثبوت دیا اور فیصلہ کیا کہ جس پر بھی داؤ لگے اُسے قتل کر دیا جائے اور سامان قبضے میں لے لیا جائے۔

حضرت واقد بن عبداللہ تمیمی نے عمرو بن حضرمی کو تیر مارا۔ وہ ڈھیر ہوگیا۔ عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو گرفتار کر لیا گیا۔ نوفل چھوٹ کر نکل بھاگا۔ حضرت عبداللہ بن جحش اور اُن کے ساتھی دونوں قیدیوں اور ان کے تجارتی سامان کو لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

رسول اللہ ﷺ سخت ناراض ہوئے۔ فرمایا کہ میں نے تمھیں حرمت کے مہینے میں لڑنے کو نہیں کہا تھا۔ آپ نے سامان اور قیدی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ فوجی دستہ سہم گیا کہ ہم تو مارے گئے۔ دوسرے مسلمانوں نے بھی انھیں اس فعل پر شدید ملامت کی۔

اُدھر قریش نے واویلا کیا کہ محمد اور اُس کے ساتھیوں نے تو اب حرمت کے مہینے کو بھی بے حرمت کر دیا ہے۔ اس متبرک مہینے میں خونریزی شروع کر دی ہے۔ مال لوٹا اور قیدی بنائے ہیں۔ جب لوگوں نے اس کے بارے میں خوب شور مچایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ...... ﴾

"(اے نبی!) یہ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس

میں لڑائی کیسی ہے؟......‘‘[1]

اس طرح اللہ تعالیٰ نے مومنین کی پریشانی دور کر دی اور رسول اللہ ﷺ نے سامان اور قیدی قبول کر لیے۔ جب قریش نے اپنے دو جنگی قیدیوں کو چھڑانے کے لیے نامہ و پیام شروع کیا تو آپ نے فرمایا: ’’یہ بات چیت ہمارے دو آدمی سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کی واپسی کے بعد ہی ہوسکتی ہے۔‘‘ آپ کو خطرہ تھا مبادا قریش انھیں نقصان پہنچائیں۔ دراصل یہ دونوں صحابی نخلہ پہنچنے سے پہلے ہی دستے سے پیچھے رہ گئے تھے اور اپنے ایک گم شدہ اونٹ کی تلاش میں سرگرداں تھے۔[2]

سریہ نخلہ کی حکمتیں

* اس واقعے پر تبصرہ کرنے والی یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ مشرکین نے اب تک مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنا، کفرو شرک کرنا، مسجدِ حرام سے روکنا، مسلمانوں کو اُن کے آبائی شہر سے نکالنا، اُن کے مال چھین لینا اور اُن کو دین سے گمراہ کرنے کی پوری کوشش کرنا وغیرہ، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلمانوں کے اس کام، یعنی حرمت والے مہینے میں لڑائی کے مقابلے میں بہت بڑے جرائم ہیں۔

جب مشرکین مسلمانوں پر اتنے بڑے بڑے مظالم ڈھانے اور گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرنے میں حیا محسوس نہیں کرتے تو مسلمانوں کو اُن کی اس غلطی پر لعن طعن کرنے کا کیا جواز ہے؟ بلکہ لعن طعن کے حقدار تو وہ لوگ ہیں جو اتنے بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں نہ کہ وہ جن سے مجبوری کی بنا پر ایک اضطراری غلطی ہوگئی۔

[1] البقرۃ 2:217,218۔ [2] ہیثمی نے لکھا ہے: ’’طبرانی نے اسے ایک سند سے روایت کیا جو حسن ہے۔‘‘ دیکھیے: (مجمع الزوائد: 6/66,67)۔

اس تبصرے سے اسلامی سیاست کا اسلوب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام ظاہری احکام ورسوم جنھیں لوگ موروثی طور پر شرطِ لازم سمجھتے ہیں، ان کو قطعاً اہمیت نہیں دیتا بلکہ دینی اور اخلاقی اوصاف کو اساسی اہمیت دیتا ہے۔ اس جنگی کارروائی کرنے والوں کے ظاہری عمل پر اُن بلند پایہ جذبات کو ترجیح دی گئی جن کی بنا پر سریہ والوں کو یہ لڑائی لڑنی پڑی۔

* اس آیت نے واضح کیا کہ کچھ لوگ قوانین کا اُس وقت تک احترام کرتے ہیں جب تک وہ اُن کے مفاد میں ہوں۔ جب اُن کے مفاد پر زد پڑتی ہے تو وہ تمام قوانین روند ڈالتے ہیں۔
* اس آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ظلم و زیادتی کرنے والے مشرکین کے ساتھ مستقل صلح نہیں ہوسکتی۔
* رسول اللہ ﷺ کے خفیہ خطوط احتیاط اور حسن تدبیر کی بہترین مثال ہیں۔ ان سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اسباب اختیار کرنا شرعاً بھی ضروری ہے۔ اسلام نے اس حسن تدبیر کی مثال اس وقت دی جب مغربی دنیا میں جہالت کی دُھول اُڑ رہی تھی اور وہ سیاست کی ابجد سے بھی بے خبر تھی۔ مغرب نے جنگی حکمت عملی کا رازدارانہ طریقہ دوسری عالمگیر جنگ میں اختیار کیا۔
* نخلہ کی مہم جوئی وہ پہلی جنگی کارروائی تھی جو مکہ کے بالکل قریب کی گئی جبکہ یہ دشمن کا مرکز تھا۔ گویا یہ ایک قسم کی فدائی کارروائی تھی جو رضاکارانہ طور پر انجام دی گئی کیونکہ امیرِ دستہ نے کسی کو اس پروگرام پر مجبور نہیں کیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کے خط میں صراحت تھی کہ کسی کو مجبور کر کے نہ لے جایا جائے۔

قبلہ کی تبدیلی

جمہور کا کہنا ہے کہ ہجرت کے اٹھارھویں ماہ شعبان کے نصف میں اللہ تعالیٰ نے

بیت المقدس کے بجائے مسجد الحرام (بیت اللہ) کو قبلہ بنانے کا حکم دیا[1] جبکہ اس سے پہلے 16 یا 17 ماہ تک بیت المقدس ہی قبلہ رہا۔[2] رسول اللہ ﷺ کی دلی خواہش تھی کہ کعبہ کو آپ کا قبلہ قرار دیا جائے جو ابراہیمی قبلہ تھا۔ آپ اس سلسلے میں اکثر خشوع و خضوع سے دعا فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ﴾

"یقیناً ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں، ہم ضرور آپ کو اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں، چنانچہ اب آپ اپنا چہرہ مسجدِ حرام کی طرف پھیر لیں۔"[3]

پہلی نماز جو آپ نے نئے قبلے مسجدِ حرام کی طرف پڑھی وہ عصر کی نماز تھی۔[4] قبا والوں کو یہ خبر اگلے دن صبح کی نماز میں پہنچی تو انھوں نے فوراً اپنا رخ مسجدِ حرام کی طرف کر لیا۔[5]

رمضان کے روزوں کی فرضیت

علامہ طبری رحمہ اللہ نے 2 ہجری کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: "...... اور اس سال ماہِ رمضان کے روزے فرض کیے گئے۔ کہا گیا ہے کہ فرضیت شعبان میں ہوئی۔"

صحیحین میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی

[1] البداية والنهاية:3/276. [2] صحيح البخاري، التفسير، باب: 12، حديث:4486، وصحيح مسلم، المساجد ومواضع الصلاة، باب تحويل القبلة من القدس إلى الكعبة، حديث:525. [3] البقرة 2:144. [4] صحيح البخاري، التفسير، باب: 12، حديث: 4486. [5] صحيح البخاري، الصلاة، باب ماجاء في القبلة ......، حديث: 403، و صحيح مسلم، المساجد ومواضع الصلاة، باب تحويل القبلة من القدس إلى الكعبة، حديث:526.

عاشوراءِ محرم کے دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے بھی یہ روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا۔ جب رمضان المبارک کے روزے فرض قرار پائے تو عاشوراء کا روزہ مستحب بن گیا اور آپ ﷺ نے اُس کے رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار دے دیا۔"[1]

غزوۂ بدر کبریٰ

رسول اللہ ﷺ کو پتہ چلا کہ ابوسفیان شام سے قریش کے ایک تجارتی قافلے کے ساتھ آرہا ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو رغبت دلائی۔ فرمایا:

«هٰذِهِ عِيرُ قُرَيْشٍ، فِيهَا أَمْوَالُهُمْ فَاخْرُجُوا إِلَيْهَا لَعَلَّ اللّٰهَ يَنْفُلُكُمُوهَا»

"قریش کا تجارتی قافلہ آرہا ہے۔ اس میں اُن کا کثیر تجارتی مال ہے۔ اُسے روکنے کے لیے نکلو۔ شاید اللہ تعالیٰ تمھیں اس سے مالِ غنیمت عطا فرما دے۔"[2]

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے، انھوں نے کہا: "جب ہم مدینہ میں تھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مجھے خبر دی گئی ہے کہ ابوسفیان کا تجارتی قافلہ آرہا ہے۔ کیا خیال ہے اس قافلے کی طرف نکلیں؟ شاید اللہ تعالیٰ اسے ہمارے لیے غنیمت بنا

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، باب إتيان اليهودِ النبيَّ ﷺ حِين قدم المدينة، حديث: 3943، وصحيح مسلم، الصيام، باب صوم يوم عاشوراء، حديث: 1130، وتاريخ الطبري: 2/417.

[2] اس حدیث کو ابن اسحاق نے بسند حسن روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 2/607) مجھے یوں لگتا ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ ابن اسحاق کے ہاں غزوۂ بدر کی تمام روایت اسی سند سے ہے، باوجود اس امر کے کہ ابن اسحاق ہر بار یا ہر پیرے کے آغاز میں سند نہیں لاتے۔ اس مضمون کے ساتھ یہ روایت طبری کے ہاں بھی ان کی تفسیر میں درج ہے، دیکھیے: (تفسير الطبري: 13/399,398) طبری کی سند مرسل اور حسن ہے کیونکہ اس کے رجال تو سب کے سب ثقہ ہیں لیکن وہ عروہ تابعی پر موقوف ہے۔

دے۔"[1] ہم نے کہا: "جی، ٹھیک ہے۔" پھر آپ چلے اور ہم بھی آپ کے ساتھ نکل پڑے۔"[2]
رسول اللہ ﷺ سب لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر نہیں گئے بلکہ فرمایا: "جس کی سواری تیار ہے وہ میرے ساتھ چلے۔" جن کی سواریاں عوالی میں تھیں انھیں آپ نے وہاں سے سواریاں لانے کی اجازت نہیں دی۔[3] یہی وجہ تھی کہ اگر کوئی آپ کے ساتھ نہیں جا سکا تو آپ ﷺ نے اس پر ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔[4] آپ کے ساتھ جانے والوں کی تعداد 313 سے 319 تک تھی۔[5] ان میں 82 سے 86 تک مہاجرین تھے۔ 61 اَوسی اور 170 خزرجی تھے۔[6]

[1] صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر خاص اس غرض کے لیے بھیجے ہوئے آپ کے مخبر بُسَیْسَة نے دی تھی، دیکھیے: (صحيح مسلم، الإمارة، باب ثبوت الجنة للشهيد، حدیث: 1901) محمد فؤاد عبدالباقی نے بُسَیْسَة کے بارے میں حاشیے میں لکھا: "قاضی کا کہنا ہے کہ تمام نسخوں میں اسی طرح ہے۔ انھوں نے مزید کہا: کتبِ سیرت میں جو نام معروف ہے وہ بَسْبَس ہے، اس کے والد کا نام عمرو ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ عمرو کے بجائے بشر کے بیٹے تھے جن کا تعلق انصار کے قبیلے خزرج سے تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ انصار کے حلیف تھے۔" میں (امام نووی) کہتا ہوں: "ہوسکتا ہے کہ ایک لفظ نام اور دوسرا لقب ہو۔ میری رائے میں یہ امر بھی بعید از قیاس نہیں کہ کسی کاتب کی طرف سے یہ نام غلط لکھا گیا ہو جس سے اس میں وہ عیب پیدا ہو گیا ہو جسے اصطلاح میں تصحیف کہتے ہیں۔" صحیح اور مرسل سند سے روایت کردہ بُسیسة کے حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے: (الإصابة في تمييز الصّحابة: 147/1، والطبقات الكبرى: 24/2) [2] مجمع الزوائد: 74,73/6. [3] صحيح مسلم، الإمارة، باب ثبوت الجنة للشهيد، حديث: 1901. [4] صحيح البخاري، المغازي، باب حديث كعب بن مالك، حديث: 4418. [5] صحيح البخاري، المغازي، باب عدّة أصحاب بدر، حديث: 3959-3956. مسلم کے ہاں مسلمانوں کی تعداد 319 افراد ہے اور مشرکین 1000 تھے۔ نسائی کے نزدیک ان کی تعداد 314 تھی، دیکھیے: (السنن الكبرى للنسائي: 7/2) نسائی کی سند میں یحییٰ بن عبداللہ ہے جو نہایت سچا (صدوق) ہے لیکن غلطی کر جاتا ہے۔ بطورِ تائید اس کی روایت لے لی جاتی ہے۔ مسلم کی روایت میں البضع کا مطلب 19 بیان کیا گیا ہے۔ یہی قطعی اور قرینِ صواب ہے۔ [6] یہ ایک حسن حدیث کا حصہ ہے جسے ابن اسحاق نے روایت کیا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو قریش کے قافلے سے مڈھ بھیڑ کی دعوت دی تھی، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 295/2) ◄◄

ان سب کے پاس کل ستر اونٹ اور صرف دو گھوڑے تھے [1] (انھی اونٹوں پر وہ باری باری سوار ہوتے رہے۔)

حضرت ابولبابہ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سواری میں شریک تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدل چلنے کی باری آئی تو دونوں نے درخواست کی: ''ہم آپ کی طرف سے بھی چلیں گے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا أَنْتُمَا بِأَقْوٰى مِنِّي وَ لَا أَنَا بِأَغْنٰى عَنِ الْأَجْرِ مِنْكُمَا»

''نہ تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو اور نہ میں ثواب سے بے نیاز ہوں۔'' [2]

راستے میں جب روحاء کے مقام پر پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابولُبابہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ کا قائم مقام امیر بنا کر واپس بھیج دیا اور اُن کی جگہ حضرت مرثد بن ابی مرثد رضی اللہ عنہ آپ کے سواری کے شریک بن گئے۔ [3] لہٰذا ابن اسحاق اور امام احمد رحمہ اللہ کی روایات میں

» بخاری کے ہاں یہ روایت ہے کہ مہاجرین 60 سے اوپر اور انصار 240 سے اوپر تھے، دیکھیے: (صحیح البخاري، المغازي، باب عدة أصحاب بدر، حديث: 3956) بدر میں مہاجرین و انصار کی تعداد کی بابت مختلف روایات پر ابن حجر نے خوب تبصرہ کیا ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 155/15 و197)

[1] احمد شاکر کا کہنا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے، دیکھیے: (مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 3/6) ابن اسحاق کے ہاں یہ روایت بدر کا حصہ ہے جو بسند حسن ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 303,302/2) احمد کی روایت میں ہے کہ تین تین آدمی ایک اونٹ پر باری باری سوار ہوتے تھے۔ یہاں جو کچھ بیان کیا گیا وہ ابن اسحاق کی روایت کے مضمون کے موافق ہے۔ میرا کہنا ہے کہ شاید ابن اسحاق کی عبارت حسابی منطق کے زیادہ قریب ہے کیونکہ انھوں نے صرف ان لوگوں کی مثالیں دی ہیں جو ایک اونٹ پر باری باری سوار ہوتے رہے، چنانچہ انھوں نے دو بار تین آدمی بتائے اور ایک بار چار آدمی۔ اگر وہ مزید گہرائی میں جاتے تو پانچ آدمیوں کا بھی ذکر کرتے کیونکہ حسابی منطق کہتی ہے کہ ستر اونٹ اس امر کے لیے کافی تھے کہ ان پر چار چار یا پانچ پانچ یا تین تین آدمی سوار ہوتے نہ کہ صرف تین تین جیسا کہ احمد اور دیگر محدثین کی روایت میں ہے۔ [2] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 3/6.

[3] السيرة النبوية لابن هشام: 303/2) یہ بدر والی روایت ہے جو حسن سند کے ساتھ ہے۔

اختلاف نہیں رہتا۔ یاد رہے کہ آپ ﷺ اس سے پہلے عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو نماز کا امام مقرر کر چکے تھے۔[1] اُدھر ابوسفیان کو قافلے پر حملے کا خطرہ محسوس ہوا تو اُس نے ضمضم بن عمرو غفاری کو مکہ کی طرف دوڑا دیا کہ قریش ہماری مدد کریں۔ ضمضم بڑی تیزی سے مکہ پہنچا۔ مکہ پہنچتے ہی اُس نے اپنے اونٹ کی ناک کاٹی، پالان اُلٹا، قمیص پھاڑی اور اونٹ پر کھڑے ہو کر چیخنا شروع کر دیا۔ ''او قریشیو! اپنا مشک بردار تجارتی قافلہ بچاؤ۔ ابوسفیان تمھارا مال لے کر آ رہا ہے۔ اُس پر محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں نے حملہ کر دیا ہے۔ مجھے امید نہیں کہ تمھیں قافلہ مل سکے گا۔ مدد! مدد!''[2]

قریش اپنا تجارتی مال اور افراد بچانے کے لیے تیزی سے نکلے۔ اُنھوں نے سوچا کہ مسلمانوں سے ابھی دو دو ہاتھ ہو جائیں تو اچھا ہے تاکہ مسلمانوں کی قوت کچل دی جائے جو اُن کی تجارت کے لیے مسلسل خطرہ بن گئی ہے۔ ابولہب کے علاوہ اہم سرداروں میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہا۔ اُس نے اپنی جگہ عاص بن ہشام کو بھیج دیا۔ جس سے اس نے چار ہزار درہم لینے تھے۔ اس شرکت کے عوض اس نے عاص بن ہشام کے چار ہزار درہم معاف کر دیے۔[3] قریش کے قبائل میں سے بنوعدی کے سوا سب قبیلے اس جتھے میں شریک تھے۔[4]

مکہ سے روانہ ہوتے وقت اُن کی تعداد ایک ہزار تین سو تھی۔ اُن کے ساتھ سو گھوڑے، چھ سو زرہیں اور بہت زیادہ اونٹ تھے۔ اُن کی قیادت ابوجہل کر رہا تھا۔[5]

[1] المستدرك للحاكم: 632/3. اس روایت کے متعلق ذہبی نے خاموشی اختیار کی ہے جبکہ اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے جو صدوق (نہایت سچا) ہے، دیکھیے: (تقریب التہذیب: 444/1، والسيرة النبوية لابن هشام: 302/2) یہ روایت ان اضافوں میں شامل ہے جو ابن ہشام نے ابن اسحاق کی سیرت پر کیے ہیں اور یہ بلا سند ہے۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 298/2. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 298/2. سند حسن ہے۔ [4] السيرة النبوية لابن هشام: 311/2. سند حسن ہے۔ [5] البداية والنهاية: 285,284/3. یہ اموی کی روایت ہے جو مرسل سند سے ہے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ مشرکین کے پاس ستر گھوڑے تھے۔

اچانک انھیں خطرہ محسوس ہوا مبادا اُن کی عدم موجودگی میں بنوبکر کوئی کارروائی کر دیں کیونکہ اُن سے اُن کی دشمنی چل رہی تھی۔ قریب تھا کہ یہ سوچ کر وہ روانگی کے ارادے سے باز آ جاتے مگر ابلیس سراقہ بن مالک مدلجی، جو بنوکنانہ کے سردار تھے، کی شکل اختیار کر کے آ گیا اور کہنے لگا: ''میں ذمہ دار ہوں۔ تمھاری عدم موجودگی میں بنوکنانہ کوئی مخالفانہ کارروائی نہیں کریں گے۔''[1] وہ اس بات پر مطمئن ہو کر گھروں سے چل پڑے۔ قرآن مجید کے الفاظ ہیں:

﴿ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ ﴾

''(تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے) اکڑتے ہوئے، لوگوں کے سامنے اپنی (جنگی قوت کی) نمائش کرتے ہوئے اور وہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکنے کے لیے (نکلے)۔''[2]

ضمضم بن عمرو کی آمد سے تین دن پہلے حضرت عاتکہ بنت عبدالمطلب نے خواب دیکھا، وہ فرماتی ہیں: ''میں نے دیکھا کہ ایک آدمی اپنے اونٹ پر سوار آیا۔ ابطح میں کھڑے ہو کر اُس نے اعلان کیا: او بدر والو! تین دن کے اندر اندر اپنی ہلاکت گاہوں میں پہنچ جاؤ، پھر اُس شخص نے ایک پتھر اٹھایا اور پہاڑ کی چوٹی سے نیچے پھینک دیا۔ وہ گرتے گرتے ریزہ ریزہ ہو گیا اور ہر گھر اور عمارت میں اُس کے ذرات پہنچ گئے۔'' جب یہ خواب مشہور ہوا تو ابوجہل حضرت عباس سے کہنے لگا: ''اچھا! اب تو تمھاری عورتیں بھی نبی بننے لگی ہیں؟'' حضرت عباس کو طیش آیا۔ قریب تھا کہ آپس میں تو تو میں میں ہوتی کہ

[1] ابن اسحاق نے اسے حسن سند سے روایت کیا ہے لیکن یہ عروہ پر موقوف ہونے کی وجہ سے مرسل ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 301/2) [2] الأنفال 47:8. یہ آیت ایک حدیث میں وارد ہوئی ہے جسے طبری نے اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند ہشام بن عروہ پر موقوف ہے۔ محدث شاکر کا کہنا ہے کہ یہ سند صحیح ہے، دیکھیے: (تفسير الطبري (تحقيق أحمدشاكر): 578/13)

اُدھر سے ضمضم آ گیا اور اُس نے اعلان شروع کر دیا۔ ابوجہل اُدھر مشغول ہوگیا اور پھر سب اکٹھے ہو کر خوب تیاری کے ساتھ بدر کی طرف چل دیے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت عاتکہ کا خواب سو فیصد سچا کر دکھایا۔[1]

دوسری طرف ابوسفیان مسلمانوں کی جانب سے بار بار پیش آنے والے خطرات کے باعث خوب چوکنا تھا۔ اس لیے جب وہ بدر کے قریب پہنچا تو مجدی بن عمرو سے ملا اور اُس سے اسلامی لشکر کے بارے میں پوچھنے لگا۔ مجدی نے اُسے بتایا کہ میں نے دو سوار دیکھے ہیں جنھوں نے ٹیلے کے پاس اپنے اونٹ بٹھائے، اپنے مشکیزے پانی سے بھرے اور چلے گئے۔ ابوسفیان فوراً اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ پہنچا اور اُن کی مینگنیاں اٹھا کر توڑیں۔ فوراً پہچان گیا کہ یہ مدینہ کا چارہ ہے۔ اُس نے فوری طور پر قافلے کا راستہ بدل دیا۔ بدر کے بائیں طرف سے گزرنے والے معروف راستے کو چھوڑ کر مغربی جانب ساحلی راستہ اختیار کیا۔ یوں قافلہ خطرے کی حدود سے نکل گیا۔ ابوسفیان نے فوری طور پر قریشی لشکر کو

[1] عاتکہ کے خواب کی روایت مکمل طور پر ابن اسحاق نے بیان کی ہے۔ اس کی دو سندیں ہیں۔ پہلی سند ابن اسحاق سے بیان کرنے والے راوی کے مجہول ہونے کی بنا پر منقطع ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 296/2، والمستدرك للحاكم: 20,19/3) حاکم نے اسے متصل طور پر بیان کیا ہے۔ یوں روایت میں راوی کے مجہول ہونے کی وجہ سے جو نقص در آیا تھا وہ دور ہوگیا۔ حاکم نے واضح طور پر اس راوی کا نام لکھا ہے جس نے ابن اسحاق سے بیان کیا۔ راوی کا نام حسین بن عبداللہ ہے۔ ذہبی نے تلخیص میں اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ دوسری سند مرسل ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 2/396-398، ودلائل النبوة للبيهقي: 3/103-105) طبرانی نے بھی اسے مرسل سند سے روایت کیا ہے۔ اس میں ابن لہیعہ ہے جس میں قدرے ضعف ہے، تاہم اس کی روایت حسن درجے کی ہوتی ہے، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 70,69/6) ابن حجر نے بتایا کہ اسے ابن مندہ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند کو باوزیر نے ضعیف قرار دیا ہے، دیکھیے: (الإصابة: 357/4) ساری گفتگو کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ ابن اسحاق اور حاکم کی سند میں پایا جانے والا نقص مذکورہ بالا روایات کی کثرت کی بدولت دور ہو جاتا ہے، چنانچہ یہ حدیث حسن لغیرہ کے درجے پر پہنچتی ہے۔ باوزیر نے یہی نتیجہ نکالا ہے، دیکھیے: (مرويات غزوة بدر: 126-128)

نیا پیغام بھیجا کہ ہم بچ کر نکل آئے ہیں، لہٰذا تم واپس مکہ پہنچ جاؤ۔ اُس وقت قریشی لشکر جُحفة کے میدان میں پہنچ چکا تھا۔ [1]

یہ پیغام سن کر لشکر نے واپسی کا ارادہ کر لیا مگر ابوجہل آڑے آ گیا۔ کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! ہم ہرگز واپس نہیں جائیں گے۔ بدر کے میدان میں پہنچ کر تین دن ٹھہریں گے۔ اونٹ ذبح کریں گے، موج مستی کریں گے۔ شراب پئیں گے، لونڈیاں ہماری شان میں قصیدے پڑھیں گی، سارے عرب میں ہمارا ڈنکا بجے گا۔ انھیں ہماری لشکر کشی اور عظیم الشان اجتماع کا پتہ چلے گا تو ہمیشہ کے لیے ہماری دھاک بیٹھ جائے گی اور لوگ ہم سے ڈرنے لگیں گے۔ اس لیے بدستور چلتے رہو۔'' [2]

لشکر اس کے بھرّے میں آ گیا لیکن اخنس بن شریق نہ مانا اور اپنی قوم بنوزہرہ کو لے کر واپس چلا گیا۔ جب وہ آپس میں مشورہ اور بات چیت کر رہے تھے تو قریش نے بنوہاشم کو طعنہ دیا کہ تمھاری نیک خواہشات محمد کے ساتھ ہیں۔ اس غصے میں طالب بن ابی طالب بھی واپس لوٹ گیا۔ باقی لشکر چلتا رہا حتی کہ وہ بدر کے قریب ایک ٹیلے کے پیچھے فروکش ہوئے جو وادیِ بدر کی حدود میں آخری کنارے پر واقع تھا۔ [2]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 310,309/2. [2] طبری نے اسے اپنی تفسیر میں بسند حسن روایت کیا ہے، دیکھیے: (تفسير الطبري (تحقيق أحمد شاكر): 579/13) دراصل یہ ابن اسحاق کی روایت ہے اور اسی سند کے ساتھ ہے جسے طبری نے بیان کیا، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 310/2) یہاں یہ امر توجہ کے قابل ہے کہ طبری نے ابن اسحاق کا روایت کردہ قصۂ بدر ایک ہی سند سے بیان کیا ہے، باوجودیکہ ابن اسحاق نے ہر پیرے کے آغاز میں سند بیان نہیں کی۔ وہ ہر نئے پیرے کو معلق روایت کے مانند بیان کرتے ہیں۔ طبری کے اس عمل سے مجھے پوری طرح اتفاق ہے اور میرا اپنا رجحان بھی اسی طرف ہے جس کی وضاحت میں پہلے کر چکا ہوں۔ [3] ابن اسحاق نے اسے قصۂ بدر میں بیان کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 312,311/2) بنوزہرہ کے اس دن سو آدمی تھے۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ بلکہ وہ تقریباً تین سو آدمی تھے۔ یہ ابن سعد کی روایت ہے جو بلاسند ہے، دیکھیے: (الطبقات الکبرٰی: 14/2)

رسول اللہ ﷺ کو صورت حال کا پتہ چلا تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔[1] کچھ حضرات متذبذب تھے کہ ابھی ہماری جنگی تیاری مکمل نہیں۔ وہ درحقیقت اس غیر متوقع جنگ کے لیے تیار نہ تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنا نقطۂ نظر رسول اللہ ﷺ کے گوش گزار کر دیا۔ اُن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۪ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۗ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۙ﴾

”جیسے (بدر کے موقع پر) آپ کے رب نے آپ کو آپ کے گھر (مدینہ) سے حق (بہترین تدبیر) کے ساتھ نکالا تھا اور بے شک (اس وقت) مومنوں کا ایک گروہ (اس نکلنے کو) ناپسند کرتا تھا۔ وہ آپ سے حق (کے معاملے) میں اس کے واضح ہو جانے کے بعد جھگڑتے تھے۔ گویا وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اور وہ (اسے) دیکھ رہے ہیں۔ اور جب اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ یقیناً وہ تمھارے لیے ہے اور تم چاہتے تھے کہ جو کیل کانٹے والا نہیں (تجارتی قافلہ) وہی تمھیں ملے اور اللہ چاہتا تھا کہ وہ حق کو اپنی باتوں کے ساتھ ثابت کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔“[2]

[1] صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب غزوة بدر، حديث: 1779. [2] الأنفال 8:5-7. دو گروہوں سے مراد ابوسفیان کا تجارتی قافلہ اور قریش کا لشکر ہیں۔ طبری کے ہاں ان کی تفسیر میں آیت کی شانِ نزول کے بارے میں قتادہ کے حوالے سے مرسل سند کے ساتھ مختلف روایات بیان کی گئی ہیں۔ دو روایات ابن جریج کے حوالے سے بھی ہیں جن میں سے ایک کی سند منقطع اور دوسری کی مرسل ہے۔ ایک تیسری روایت حسن سند کے ساتھ بھی ہے، دیکھیے: (تفسیر الطبري: 13/403-405، ومجمع الزوائد: 6/73,74)

مہاجرین کے قائدین نے بالاتفاق دشمنوں کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی تائید کی۔ اُن
میں حضرت ابوبکر، عمر اور مقداد بن اسود رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔ مقداد کہنے لگے: ''اللہ کے رسول
میں حضرت ابوبکر، عمر اور مقداد بن اسود رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔ مقداد کہنے لگے: ''اللہ کے رسول !
اللہ تعالیٰ آپ کو جو سجھائیں اُسی طرف چل پڑیں، ہم ہر حال میں آپ کے ساتھ ہیں۔ اور تمھارا رب جائے اور لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں بلکہ ہم کہتے ہیں: آپ اور آپ کا رب کریم چلیں، ہم آپ کے ساتھ جائیں گے اور ڈٹ کر لڑیں گے۔ قسم اُس ذات کی جس نے آپ کو سچا نبی بنایا! اگر آپ ہمیں برکِ غماد کی طرف لے چلیں تو ہم راستے کی ہر رکاوٹ توڑ کر آپ کے ساتھ وہاں پہنچیں گے۔'' (42)

ایک روایت میں یوں ہے: ''ہم موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح جواب نہیں دیں گے کہ تم اور تمھارا رب جا کر لڑو۔ بلکہ ہم تو آپ کے دائیں بائیں، آگے پیچھے جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑیں گے۔'' رسول اللہ ﷺ مقداد کی اس جرأت مندانہ بات سے بہت خوش ہوئے۔ [1] مہاجر قائدین کا جواب سننے کے بعد آپ نے فرمایا: ''لوگو! مجھے مشورہ دو۔'' آپ ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ انصار قائدین کا موقف بھی سنیں کیونکہ آپ کے لشکر کا اکثر حصہ انھی پر مشتمل تھا۔ بیعتِ عقبہ کی رُو سے انصار اس بات کے پابند نہیں تھے کہ مدینہ منورہ سے باہر رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دیں اور مخالفین سے جنگ کریں۔ [2] حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ آپ کا مقصد بھانپ گئے۔ وہی انصار کے علم بردار تھے۔ وہ اٹھے اور یوں گویا ہوئے: ''اللہ کے رسول! یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''بالکل!'' انھوں

(42) برکِ غماد: یہ مکہ سے سمندر کی طرف پانچ راتوں کی مسافت پر ایک مقام کا نام ہے۔ دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 305/2)

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب: 4، حديث: 3952، ومسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 259/5. [2] شرح النووي على صحيح مسلم: 124/12.

نے کہا: ’’ہم آپ پر پختہ ایمان لا چکے ہیں اور دل و جان سے آپ کی تصدیق کر چکے ہیں۔ ہم علانیہ گواہی دے چکے ہیں کہ آپ کا ہر فرمان برحق اور سچا ہے اور سمع اور اطاعت کے سلسلے میں آپ کو ہر قسم کے عہد و میثاق دے چکے ہیں، لہٰذا اے اللہ کے رسول! آپ جو چاہتے ہیں کر گزریں۔ قسم اُس ذات کی جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے! اگر آپ ہمیں اپنے ساتھ لے جا کر سمندر میں بھی اتریں گے تو ہم آپ کے ساتھ اس میں کود پڑیں گے۔ ہم میں سے ایک آدمی بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ اگر آپ ہمیں کل دشمن کے مقابلے میں جھونک دیں تو ہم ہرگز دریغ نہیں کریں گے۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہنے اور ڈٹ کر لڑنے والے لوگ ہیں۔ امید ہے اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے ایسے کارنامے دکھائے گا کہ آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی، لہٰذا اللہ کا نام لے کر چل پڑیے۔‘‘[1]

رسول اللہ ﷺ حضرت سعد کی یہ بات سن کر بے حد خوش ہوئے۔ آپ ﷺ کا چہرہ کھل اٹھا اور آپ نے فرمایا:

«سِيرُوا وَأَبْشِرُوا فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ وَعَدَنِي إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ، وَاللّٰهِ! لَكَأَنِّي الْآنَ أَنْظُرُ إِلٰى مَصَارِعِ الْقَوْمِ»

’’چلو اور خوش ہو جاؤ یقیناً اللہ تعالیٰ نے مجھ سے دونوں میں سے ایک گروہ پر فتح

---

[1] اسے ابن اسحاق نے قصۂ بدر کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ مسلم کی روایت (1779) میں ہے کہ انصار کی نمائندگی کرنے والے سعد بن عبادہ تھے جو بدر کی لڑائی میں شامل تو نہیں ہوئے لیکن غنیمت سے ان کا حصہ نکالا گیا تھا۔ ابن حجر کے مطابق اس روایت کو ابن ابی شیبہ نے بھی عکرمہ کی مرسل سند سے نقل کیا ہے۔ ابن حجر نے کہا: ’’تطبیق‘‘ اس طرح ممکن ہے کہ نبی ﷺ نے غزوۂ بدر کے متعلق صحابۂ کرام سے دو بار مشورہ کیا۔ پہلی بار جب آپ ﷺ مدینہ میں تھے اور دوسری بار بدر کی طرف نکلنے کے بعد مشورہ کیا۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے بتایا ہے کہ طبرانی کے ہاں درج ہے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے یہ تقریر حدیبیہ کے موقع پر کی۔ یہی زیادہ قرین صواب ہے۔ اس اشکال کے متعلق مزید گفتگو کے لیے ملاحظہ کیجیے: (محمد رسول اللہ ﷺ لعرجون: 308/3، والبدایة والنهایة: 351/3)

کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اللہ کی قسم! مجھے تو اب بھی دشمنوں کی ہلاکت گاہیں نظر آرہی ہیں۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ نے عمیر بن ابی وقاص کو اُن کی صغرسنی (16 سال) کی بنا پر واپس جانے کا حکم دیا تو وہ رونے لگے حتی کہ آپ انھیں اجازت دینے پر مجبور ہو گئے۔ یہ بدر کے دن اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید ہو گئے۔ [2]

راستے میں حَرہ وبرہ (43) کے پاس آپ کو ایک مشرک آدمی ملا جو اپنی دلیری کی وجہ سے مشہور تھا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ آپ ﷺ کے ساتھ مل کر قریش سے لڑے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُسے جواب دیا:

«اِرْجِعْ فَلَنْ أَسْتَعِينَ بِمُشْرِكٍ»

''واپس چلے جاؤ۔ میں کسی مشرک سے مدد حاصل نہیں کروں گا۔''

پھر وہ دوبارہ شجرہ کے مقام پر آپ ﷺ سے ملا، پھر تیسری دفعہ بیداء کے مقام پر ملا۔ رسول اللہ ﷺ ہر دفعہ اُسے وہی بات کہتے تھے جو آپ نے پہلی دفعہ کہی تھی۔ آخر کار اُس نے اسلام قبول کر لیا تو آپ ﷺ نے اُس کی پیشکش قبول کر لی۔ [3]

(43) حرہ وبرہ: مدینہ سے تقریباً چار میل پر ایک جگہ کا نام ہے، دیکھیے: (معجم البلدان: 250/2)

[1] ابن اسحاق نے مشاورت کی اس روایت کو معلق سند سے بیان کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 306,305/2) ابن کثیر نے لکھا ہے: ''اس کی تائید میں کئی روایات آئی ہیں، ان میں بخاری، احمد اور نسائی کی روایات شامل ہیں۔ بخاری و مسلم کی روایات میں اس مشاورت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔'' دیکھیے: (صحيح البخاري، المغازي، باب: 4، حديث: 3952، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب غزوة بدر، حديث: 1779، والبداية والنهاية: 288,287/3) [2] عمیر بن ابی وقاص کا واقعہ ہیثمی نے طبرانی اور بزار کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ ہیثمی کا کہنا ہے کہ طبرانی کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ اور بزار کے راوی ثقہ ہیں، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 298/5، 69/6، والإصابة: 135/3، ونضرة النعيم: 2997/7، حديث: 6) [3] صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب كراهة الاستعانة في الغزو بكافر، حديث: 1817.

جب آپ ''صفراء'' کے مقام پر پہنچے تو آپ نے بَسبَس بن جُہنی اور عدی بن عمرو ابوزغبا جہنی کو بدر کی طرف بھیجا کہ وہ خفیہ طریقے سے ابوسفیان اور اس کے قافلے کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ [1]

روایت ہے کہ آپ ﷺ خود اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اس مقصد کے لیے نکلے۔ ایک بوڑھے آدمی سے ملے۔ اُس سے قریش کے لشکر کے بارے میں پوچھا۔ اُس نے شرط لگائی کہ تمھیں بتانا ہوگا کہ تم کس قبیلے سے ہو؟ انھوں نے فرمایا: ''ٹھیک ہے لیکن تم پہلے لشکر کے بارے میں بتاؤ۔'' وہ کہنے لگا: مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ محمد اور اُن کے ساتھی فلاں فلاں دن مدینہ سے چلے ہیں۔ اگر مجھے خبر دینے والے نے سچ بتایا ہے تو وہ آج فلاں جگہ پر ہوں گے...... فی الواقع یہ وہی جگہ تھی جہاں اُس وقت اسلامی لشکر موجود تھا...... اور اگر قریش کے لشکر کے بارے میں مجھے بتانے والے نے صحیح بتایا ہے تو وہ اس وقت فلاں جگہ پر ہوں گے...... واقعی یہ وہی جگہ تھی جہاں اُس وقت قریش کا لشکر موجود تھا۔ جب اس نے اپنی بات ختم کی تو کہنے لگا: ''اب بتاؤ تمھارا تعلق کس سے ہے؟'' رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: «نَحْنُ مِنْ مَّاءٍ» ''ہم پانی سے ہیں۔'' یہ کہہ کر دونوں آ گئے۔ وہ کہتا رہ گیا: ''واہ، واہ! پانی سے ہو؟ کیا عراق کے پانی سے؟'' [2]

اُسی دن کی شام آپ ﷺ نے حضرت علی، زبیر اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کو چند دوسرے صحابہ کے ساتھ دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے بدر کے کنویں پر دو غلاموں کو دیکھا، وہ قریشی لشکر کے لیے پانی لے جا رہے تھے۔ وہ

[1] اسے ابن اسحاق نے بغیر سند کے بیان کیا ہے۔ غالبًا یہ بدر کی صحیح روایت کا ایک حصہ ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 304/2) [2] اسے ابن اسحاق نے منقطع سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لا بن هشام: 307,306/2) یہ محمد بن یحییٰ بن حبان کی روایت ہے۔ اس کے بارے میں ابن حجر نے لکھا: ''ثقہ اور فقیہ ہیں۔'' دیکھیے: (تقریب التهذیب: 512)

ان کو پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آئے۔ آپ اُس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ صحابہ خود ہی اُن سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم قریشی لشکر کو پانی مہیا کرنے پر مامور ہیں۔ صحابہ نے انھیں سچا نہ سمجھا بلکہ اس جواب کا بُرا مانا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ابوسفیان کے آدمی ہیں۔ انھیں ابھی تک امید تھی کہ وہ ابوسفیان کے تجارتی قافلے پر قابو پالیں گے۔ صحابہ نے انھیں مارنا شروع کر دیا حتی کہ انھوں نے کہہ دیا: ''ہاں! ہم ابوسفیان کے آدمی ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو صحابہ پر ناراض ہوئے۔ فرمایا: ''جب وہ سچ بولتے تھے تو تم انھیں مارتے تھے اور جب انھوں نے جھوٹ بولا تو تم نے چھوڑ دیا'' پھر رسول اللہ ﷺ نے اُن سے قریشی لشکر کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ قریشی لشکر اسی ٹیلے کے پیچھے موجود ہے جو آپ آخری کنارے پر دیکھ رہے ہیں۔

جب آپ ﷺ نے اُن سے قریشی لشکر کی تعداد اور اسلحہ کے بارے میں پوچھا تو وہ کوئی متعین بات نہ کر سکے۔ تاہم انھوں نے بتایا کہ روزانہ نو یا دس اونٹ ذبح ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے اندازہ لگایا کہ وہ نو سو سے ہزار تک ہوں گے۔ انھوں نے اُن تمام قریشی سرداروں کے نام بھی بتائے جو لشکر میں آئے تھے۔ [1] رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا:

«هٰذِهِ مَكَّةُ قَدْ أَلْقَتْ إِلَيْكُمْ أَفْلَاذَ كَبِدِهَا»

''مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمھارے سامنے پھینک دیے ہیں۔'' [2]

پھر آپ نے کئی سردارانِ قریش کی قتل گاہوں کی طرف ہاتھ سے اشارے فرمائے۔

[1] صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب غزوة بدر، حديث: 1779. صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ صحابۂ کرام جس آدمی کو پکڑ کر لائے وہ بنی حجاج کا ایک حبشی غلام تھا۔ یہ واقعہ مسند احمد میں بھی نقل ہوا ہے۔ محدث کبیر احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 193/2) [2] یہ حدیث ابن اسحاق کی روایت میں وارد ہوئی ہے۔

ٹھیک ایسا ہی ہوا جب جنگ ہوئی تو وہ لوگ عین اُنھی مقامات پر قتل ہوئے پڑے تھے جن مقامات کی رسول اللہ ﷺ نے نشاندہی فرمائی تھی۔ [1]

اُسی رات اللہ تعالیٰ نے بارش برسائی جس سے مومنین کو طہارت کی سہولت نصیب ہوئی، نیز زمین کی مٹی جم گئی جس سے چلنے پھرنے اور بھاگنے دوڑنے میں آسانی ہوگئی۔ لیکن دوسری طرف قریش کا پڑاؤ ایسی جگہ تھا کہ اُن کے لیے یہ بارش مصیبت بن گئی۔ [2]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَ يُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴾

''اور وہ تم پر آسمان سے پانی نازل کر رہا تھا تاکہ تمھیں اس کے ذریعے سے پاک کر دے اور تم سے شیطان کی گندگی دور کر دے اور تمھارے دلوں کو مضبوط کر دے اور اس کی وجہ سے (تمھارے) قدموں کو ثابت رکھے۔'' [3]

بدر کے دن مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ عظیم احسان بھی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر امن وسکون والی اونگھ طاری کی۔ اس نعمت کا ذکر بھی اسی آیت کے شروع میں ہے:

﴿ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ ﴾

''(یاد کرو) جب وہ تمھیں امن دینے کے لیے تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا'' [4]

یہی بات امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے باسند بیان کی ہے۔ ابوطلحہ

[1] صحیح مسلم، الجهاد والسير، باب غزوة بدر، حديث: 1779. [2] اس بارش کے بارے میں تفصیلی روایت مسند احمد میں موجود ہے، دیکھیے: (مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 193/2) اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ یہ روایت بغیر سند کے ابن اسحاق کے ہاں بھی موجود ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 312/2)، والبداية والنهاية: 292/3، وتفسير ابن كثير: 564/3. [3] الأنفال 11:8.
[4] الأنفال: 11:8. یہ مسند احمد کی ایک طویل روایت کا اقتباس ہے، دیکھیے: (مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 193/2) اس روایت کی سند کے متعلق بات گزر چکی ہے۔

نے کہا: ''ہم بدر کے دن اپنی صفوں میں تھے کہ ہم پر اونگھ طاری ہوگئی۔ میری یہ حالت تھی کہ میری تلوار بار بار میرے ہاتھ سے گری جاتی تھی اور میں اُسے بار بار سنبھالتا تھا۔''

مومنین پر اللہ تعالیٰ نے مزید احسان یہ فرمایا کہ دشمن کے لشکر میں پھوٹ ڈال دی۔ امام احمد رحمہ اللہ ہی کی روایت ہے کہ قریش کا ایک بہت بڑا سردار عتبہ بن ربیعہ اپنی قوم کو لڑائی کے انجام سے ڈراتے ہوئے جنگ سے روکنے لگا کیونکہ اُسے پتہ چل چکا تھا کہ مسلمان مرنے مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ [1] ابوجہل نے اُسے ڈرپوک ہونے کا طعنہ دیا۔ مسند بزار کی روایت ہے کہ عتبہ نے اُس دن اپنی قوم سے کہا تھا: ''لوگو! رشتے دار ایک دوسرے کو قتل کریں گے جس سے دلوں میں ایسی تلخی پیدا ہوگی جو کبھی ختم نہ ہوگی۔'' [2] ابوجہل نے اُسے ڈرپوک ہونے کا طعنہ دیا۔

[1] الفتح الرباني: 43/21. اُسے یہ اطلاع عمرو بن وہب جُمَحي سے ملی تھی جسے قریش نے مسلمانوں کی خبر لانے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ واپس آیا تو کہنے لگا: ''قریشیو! میں نے وہاں دیکھا ہے کہ مصیبتوں نے اموات کو اٹھایا ہے۔ یثرب کے اونٹ موت کے پیغامبر ہیں۔ اُن لوگوں کے پاس تلواروں کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ کی قسم! یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن میں ہر آدمی قتل ہونے سے پہلے کم از کم ایک آدمی ضرور قتل کرے گا۔ ذرا سوچو! اگر تمھارے اتنے آدمی مارے گئے اور تمھیں فتح بھی مل گئی تو وہ فتح اور زندگی کس کام کی ہوگی؟ آگے تمھاری مرضی۔'' جنگ کے متعلق عتبہ کے موقف اور مشرکین کے پڑاؤ میں بحث و تکرار شروع ہونے کا یہی سبب تھا۔ اسے ابن اسحاق نے بسند حسن روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں بعض افراد کا مجہول ہونا مضر نہیں کیونکہ وہ سب صحابہ کرام ہیں، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 315/2) [2] مجمع الزوائد للهيثمي: 76/6. ہیثمی کا کہنا ہے: ''اس کے راوی ثقہ ہیں۔'' مشرکین کے پڑاؤ میں پیدا ہونے والی اس پھوٹ کے واقعے کو طبری اور ابن اسحاق نے روایت کیا ہے۔ طبری نے یہ روایت اپنی تاریخ میں حسن سند سے نقل کی ہے جو ابن مسیب کی ایک مرسل روایت ہے، دیکھیے: (تاریخ الطبري: 433/2) ابن اسحاق کی روایت کو ابن کثیر نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کی سند کو دکتور باوزیر نے صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (البداية والنهاية: 296,295/3، ومرويات غزوة بدر: 155)

یہی وجہ تھی کہ جب جنگ شروع ہوئی تو عتبہ نے اپنی بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کرنے کے لیے اپنے بھائی اور بیٹے سمیت مبارزت (دُوبدُو مقابلہ) کے لیے للکارا (تفصیل آگے آئے گی)۔

رسول اللہ ﷺ نے عتبہ کو سرخ اونٹ پر سوار دیکھا تو فرمایا: ''ان لوگوں میں سے اگر کسی میں خیر (عقل) ہے تو اس سرخ اونٹ والے میں ہے۔ اگر یہ لوگ اُس کی بات مان لیں تو فائدے میں رہیں گے۔''[1] لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا کہ وہ اُس کی مخالفت کریں گے، چنانچہ اُس کا مشورہ ابوجہل کی اشتعال انگیزی کے مقابلے میں کارگر نہ ہوا۔ ابوجہل لشکر والوں کو بدلہ لینے پر اُکسا رہا تھا۔

رسول اللہ ﷺ مشرکین سے پہلے بدر کے پانی پر قبضہ کر چکے تھے تاکہ قریش پانی استعمال نہ کر سکیں۔ حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے پیش کی: ''اے اللہ کے رسول! بتائیے یہ جگہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے منتخب فرمائی ہے کہ ہمیں اس سے ادھر اُدھر ہونے کی گنجائش نہیں یا آپ نے اپنی رائے سے جنگی چال کے طور پر منتخب فرمائی ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''نہیں! بلکہ یہ تو میری اپنی رائے اور جنگی چال ہے۔'' حُباب کہنے لگے: ''اللہ کے رسول! پھر یہ مناسب جگہ نہیں۔ آپ لشکر لے کر آگے چلیں اور قریشی لشکر کے قریب ترین پانی پر پڑاؤ کریں، پھر ہم باقی تمام کنوؤں میں مٹی ڈال کر انھیں بند کر دیں، اور اپنے پانی پر حوض بنا کر اُسے بھر لیں۔ اس طرح دشمنوں سے لڑتے وقت ہمیں وافر پانی ملے گا اور قریش پانی کو ترسیں گے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے نہایت عقل مندی سے مشورہ دیا ہے۔'' پھر آپ نے اُن کے مشورے پر عمل فرمایا۔[2]

---

[1] یہ مسند احمد کی طویل روایت کا اقتباس ہے، دیکھیے: (مسند أحمد (تحقیق أحمد شاکر): 193/2) [2] اس مشاورت کو ابن اسحاق نے منقطع سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 313,312/2) ابن اسحاق نے اسے ایک دوسری (مرسل) سند سے بھی روایت کیا ہے ◄◄

جب مسلمان اپنا پڑاؤ ڈال چکے تو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے تجویز پیش کی: ''اے اللہ کے نبی! ہم آپ کے لیے ایک چھپر نہ بنا دیں؟ آپ اُس میں تشریف فرما ہوں۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تیز ترین سواریاں تیار رکھیں گے، پھر ہم دشمن پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں دشمن پر غلبہ عطا فرمایا تو بہت اچھی بات ہوگی لیکن اگر خدانخواستہ دوسری بات ہوگئی تو آپ اپنی سواریوں پر بیٹھ کر مدینہ پہنچ جائیں۔ وہاں ہماری قوم کے بہت سے افراد ہیں جو یہاں نہیں آسکے۔ ان کے دلوں میں آپ کی محبت ہم سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر انھیں ذرہ بھر بھی خدشہ ہوتا کہ آپ کو جنگ کرنا پڑے گی تو وہ ہرگز پیچھے نہ رہتے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مدد سے آپ کو محفوظ رکھے گا۔ وہ دل و جان سے آپ کا ساتھ

» جو عروہ پر موقوف ہے، دیکھیے: (الإصابة: 302/1، والمستدرك للحاكم: 482/3) ذہبی نے اسے نہیں پہچانا۔ ابن کثیر نے بتایا کہ اسے اموی نے بھی منقطع سند سے روایت کیا ہے۔ ابن شاہین نے بھی اسے ایک ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔ ابن کثیر نے اس روایت کو ابن سعد کے حوالے سے بھی نقل کیا ہے۔ ابن سعد کی سند میں کلبی ہے جو متروک ہے۔ اس کی تمام سندیں ضعیف ہیں، دیکھیے: (البداية والنهاية: 293/3، والإصابة: 302/1، والطبقات الكبرى: 15/2) تاہم باوزیر کے نزدیک یہ روایت حسن لغیرہ کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے اس موقف کے حق میں دلائل دیے ہیں۔ باوزیر کا اس روایت کو قوی قرار دینا بوجوہ محل نظر ہے۔ کچھ روایات ملی ہیں جو اس روایت کے مخالف ہیں۔ ابن کثیر نے علی بن ابی طلحہ کے واسطے سے سورۂ انفال کی آیت: 11 کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بدر کے پانی پر مشرکین نے قبضہ کیا تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو شدید جسمانی کمزوری کا سامنا کرنا پڑا۔ شیطان نے ان کے دلوں میں غیظ وغضب ڈال دیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بارش اتاری۔ انھوں نے پانی پیا، طہارت حاصل کی اور اللہ تعالیٰ نے شیطان کی گندگی کو ان سے دور کر دیا، دیکھیے: (تفسير ابن كثير: 563/3) ابن کثیر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اسی نوعیت کا ایک دوسرا قول بھی نقل کیا ہے جو عوفی کی روایت سے ہے۔ ابن کثیر نے مزید لکھا کہ اسی نوعیت کے تفسیری اقوال قتادہ، ضحاک اور سُدی سے بھی روایت کیے گئے ہیں۔ بنابریں اس روایت کے صحیح ہونے کے متعلق ہمارا شک مزید پختہ ہوگیا ہے، باوجودیکہ روایت بہت معروف ہے۔

دیں گے اور آپ کے ساتھ مل کر ڈٹ کر جہاد کریں گے۔" رسول اللہ ﷺ نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ [1]

جنگ بدر سے متعلقہ آیات کے مطالعے سے یہ صاف سمجھ میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس جنگ میں شریک ہوئے اور آپ نے اپنا سارا وقت اس چھپر میں محض دعا کرتے ہوئے نہیں گزارا جیسا کہ بعض سیرت نگاروں کا خیال ہے۔

مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: "مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جنگِ بدر کے دن ہم رسول اللہ ﷺ کی اوٹ لیتے تھے کیونکہ آپ ہم سب میں سے دشمن کے زیادہ قریب تھے۔ اُس دن آپ نے ہم سب سے بڑھ کر جنگ میں حصہ لیا اور زبردست شجاعت اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔" [2]

اسی سند سے ایک اور مقام پر ہے: "بدر کے دن جنگ کا وقت آیا تو ہم رسول اللہ ﷺ کی اوٹ لے کر لڑتے تھے۔ آپ تمام مجاہدین سے زیادہ مضبوط اور ثابت قدم رہے۔ کوئی

---

[1] اسے ابن اسحاق نے منقطع سند کے ساتھ روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 313/2) یہ امر کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے بدر کے دن ایک چھپر بنایا گیا تھا، صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ حافظ ابن کثیر کے مطابق اموی نے ابن اسحاق کے واسطے سے روایت کیا ہے کہ چھپر میں نبی ﷺ ایک بار سوئے، پھر جاگے اور فرمایا: "ابوبکر! خوش ہو جاؤ۔ یہ جبریل ہیں۔ ڈھاٹا باندھے اور اپنے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے۔ ان کے اگلے دانتوں پر غبار جما ہوا ہے۔ تمھارے پاس اللہ کی مدد اور اس کا وعدہ آ پہنچا۔" دیکھیے: (البداية والنهاية:3/312) البانی نے بتایا ہے کہ اموی کی سند حسن ہے، دیکھیے: (فقه السيرة للألباني، ص:243) بخاری کے ہاں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جبکہ آپ خیمے میں تھے، فرمایا:...... دیکھیے: (صحيح البخاري، التفسير، باب: (6)، حديث: 4877) بزار کی ایک روایت جو صحیح سند کے ساتھ ہے، اس میں یہ بیان ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے کہا: "ہم نے رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک چھپر بنایا تھا۔" یہ روایت ابن کثیر نے بھی نقل کی ہے، دیکھیے: (البداية والنهاية: 298/3) [2] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 64/2. محدث شاکر نے کہا: "اس روایت کی سند صحیح ہے۔"

شخص بھی آپ سے آگے بڑھ کر دشمن کے قریب نہیں تھا۔‘‘ [1]

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن صحابہ سے فرمایا: ’’تم میں سے کوئی شخص آگے نہ بڑھے جب تک میں اُس سے آگے نہ ہوں۔‘‘ [2]

ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا: ’’رسول اللہ ﷺ نے بنفسِ نفیس شدید جنگ کی۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی۔ پہلے دونوں چھپر میں دعا اور اللہ کے حضور آہ و زاری کرتے رہے، پھر باہر نکلے، لوگوں کو جنگ پر ابھارا اور للکارا۔ دونوں نے خود بھی جنگ کی اور دعا اور جہاد دونوں کے مراتب عالیہ حاصل کیے۔‘‘ [3]

رسول اللہ ﷺ انسانی بساط کے مطابق فتح کے ہر ممکن مادی ذرائع اور اسباب اختیار کر چکے تو پھر پوری رات اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتے ہوئے فتح و نصرت کی دعاؤں میں بسر کی۔ [4] صحیح مسلم کی روایت میں آپ ﷺ کی دعا کے چند الفاظ بھی آئے ہیں:

«اَللّٰهُمَّ! أَنْجِزْلِي مَا وَعَدْتَنِي، اَللّٰهُمَّ! آتِ مَا وَعَدْتَنِي، اَللّٰهُمَّ! إِنْ تَهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةُ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ لَا تُعْبَدْ فِي الْأَرْضِ»

’’اے اللہ! وہ وعدہ پورا فرما جو تو نے مجھ سے کر رکھا ہے۔ اے اللہ! جس فتح کی تو نے خوشخبری دے رکھی ہے، آج عطا فرما۔ اے اللہ! اگر آج یہ مٹھی بھر مسلمان ختم ہو گئے تو رُوئے زمین پر تیری عبادت کبھی نہیں ہوگی۔‘‘ [5]

روایت میں مزید کہا گیا ہے: ’’آپ اپنے رب کریم کو پکارتے رہے حتی کہ آپ کی

[1] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 228/2. محدّث شاکر کا کہنا ہے: ’’اس روایت کی سند صحیح ہے۔‘‘ [2] صحيح مسلم، الإمارة، باب ثبوت الجنة للشهيد، حديث: 1901، وجامع الأصول: 182/8. جامع الاصول کے محقق کا کہنا ہے کہ یہ الفاظ دراصل یوں ہیں: ’’حتی کہ میں اسے اجازت دوں۔‘‘ صحیح مسلم کے مطبوعہ نسخوں میں یہی الفاظ ہیں: ’’حتی کہ میں اس سے آگے ہوں۔‘‘ [3] البداية والنهاية: 306/3. [4] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 271/2. [5] صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب الإمداد بالملائكة في غزوة بدر وإباحة الغنائم، حديث: 1763.

چادر آپ کے مبارک کندھوں سے نیچے گر پڑی۔ ابوبکر قریب آئے، چادر اٹھائی اور آپ ﷺ کے کندھوں پر ڈال دی، پھر عقب سے آپ ﷺ سے لپٹ گئے اور بولے: ''اے اللہ کے نبی! آپ نے اپنے رب کریم سے بہت دعا کر لی۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے کیا ہوا وعدہ آج ضرور پورا کرے گا۔'' بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ۝﴾

''(یاد کرو) جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمھاری دعا قبول کی کہ بے شک میں پے بہ پے آنے والے ایک ہزار فرشتوں کے ذریعے سے تمھاری امداد کرنے والا ہوں۔''[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتے بھیج کر آپ ﷺ کی مدد فرمائی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اُس دن کی آپ کی دعاؤں میں سے یہ دعا نقل کی ہے:

«اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَنْشُدُكَ عَهْدَكَ وَوَعْدَكَ، اَللّٰهُمَّ! إِنْ تَشَأْ لَاتُعْبَدْ بَعْدَ الْيَوْمِ»

''اے اللہ! میں تجھے تیرا عہد اور وعدہ یاد دلاتا ہوں۔ اے اللہ! اگر تیری مشیت ہے تو آج کے بعد تیری عبادت نہ کی جائے گی۔''[2]

روایت بتاتی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کا دستِ مبارک پکڑا اور بولے: ''اے اللہ کے رسول! بس اتنا کافی ہے۔ آپ نے اپنے رب سے بہت الحاح (اصرار) کیا ہے۔'' بعد ازاں آپ ﷺ زرہ پہنے ہوئے نہایت جوش و خروش سے چھپر سے نکلے۔

---

[1] الأنفال 8:9. [2] صحيح البخاري، التفسير، باب: 5، حديث: 4875، ومسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 18/5. احمد شاکر کا کہنا ہے کہ اس روایت کی سند صحیح ہے۔

اس وقت آپ ﷺ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے:

﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ﴾

''عنقریب جماعت شکست کھائے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔''[1]

ابن ابی حاتم نے اپنی سند کے ساتھ عکرمہ سے روایت کی ہے، جب یہ آیت: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ﴾ ''عنقریب جماعت شکست کھائے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔'' اتری تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کون سی جماعت شکست خوردہ ہوگی؟ کونسی جماعت غالب آئے گی؟'' حضرت عمر نے کہا: جب بدر کا دن آیا تو میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا۔ آپ زرہ پہنے ہوئے بڑے جوش سے چل رہے تھے اور فرما رہے تھے: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ﴾ اُس وقت اس آیت کا مطلب میری سمجھ میں آیا۔[2]

17 رمضان المبارک 2 ہجری جمعۃ المبارک[3] کی صبح دونوں لشکر ایک دوسرے کے

[1] القمر 45:54. [2] تفسیر ابن کثیر: 457/7. یہ عکرمہ کی مرسل روایت ہے۔ ساعاتی نے کہا: ''یہ حدیث صحیح ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اسے اپنی تفسیر میں بخاری کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ یہ عفان کی سند سے ہے جو وہیب سے روایت کرتے ہیں۔'' انھوں نے مزید کہا: ''اسی طرح اسے بخاری اور نسائی نے کئی ایک مقامات پر خالد کے حوالے سے نقل کیا ہے جو ابن مہران حذاء ہے۔'' دیکھیے: (الفتح الرباني: 37,36/21) [3] ابن حجر نے لکھا: ''یہ امر اہل سیر کے ہاں متفقہ ہے کہ غزوۂ بدر ہجرت کے دوسرے سال پیش آیا۔ اہل سیر میں ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابو الاسود اور دیگر شامل ہیں۔ وہ اس امر پر بھی متفق ہیں کہ یہ غزوہ رمضان میں برپا ہوا۔ ابن عساکر کا کہنا ہے کہ یہ جمعے کا دن تھا اور یہ بھی روایت ہے کہ پیر کا دن تھا، تاہم یہ شاذ ہے، درست جمعے کا دن ہی ہے۔ جمہور مورخین کا کہنا ہے کہ اس دن رمضان کی سترہ تاریخ تھی۔ یہ بھی کہا گیا کہ اٹھارہ تاریخ تھی۔ ان دونوں اقوال کو یوں جمع کیا گیا کہ اٹھارہ تاریخ کو اپنے اپنے شہروں کو روانگی شروع ہوئی، تاہم جنگ سترہ تاریخ ہی کو لڑی گئی۔'' دیکھیے: (التلخيص الحبير: 100/4) طبری نے اپنی تاریخ میں صحیح سند کے ساتھ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔ انھوں نے لیلۃ القدر کے متعلق لکھا: ''اسے رمضان کی سترہ تاریخ کو تلاش کرو۔'' اور انھوں نے یہ آیت تلاوت کی: ﴿يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ط﴾ ''جس دن دو گروہوں کا ٹاکرا ہوا'' یعنی یوم بدر، دیکھیے: (تاريخ الطبري: 419/2)

سامنے صف آرا ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی: ''اے اللہ! یہ قریش اپنے فخرو غرور کے ساتھ چڑھ آئے ہیں۔ تجھ سے لڑائی کرتے ہیں اور تیرے رسول کی تکذیب کرتے ہیں۔ اے اللہ! اپنی مدد کا وعدہ پورا فرما اور دوپہر کے وقت انھیں ہلاک کر دے۔''[1]

جب مسلمان میدانِ جنگ میں صف آرا ہوئے تو رسول اللہ ﷺ اُن کی صفیں درست کرنے لگے۔ آپ کے دست مبارک میں ایک تیر تھا آپ نے وہ تیر سواد بن غَزِیَّہ کے پیٹ پَر مارا کیونکہ وہ جان بوجھ کر صف سے آگے کھڑے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سواد! سیدھے ہو جاؤ۔'' سواد کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق و صداقت کے ساتھ بھیجا ہے مگر مجھے بدلہ دیجیے۔'' آپ نے اپنا بطن مبارک ننگا کر دیا اور فرمایا: ''لو، بدلہ لے لو۔'' سواد آپ سے چمٹ گئے اور بطن مبارک کو بے تحاشا چومنے لگے۔ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: ''سواد! یہ سب کچھ کس لیے؟'' سواد نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ دیکھ رہے ہیں جنگ کا طبل بجنے والا ہے (جانے انجام کیا ہو؟) میری خواہش تھی کہ آپ سے آخری ملاقات میں میرا بدن

[1] ابن اسحاق نے اسے معلق سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 314/2) یہ امر ثابت ہے کہ جب دونوں لشکر آمنے سامنے آئے تو ابوجہل نے دعا کی: ''اے اللہ! اس آدمی نے ہماری رشتے داریاں توڑ ڈالیں اور ہمارے پاس وہ شے لے کر آیا جسے ہم نہیں جانتے، سو تو اسے دوپہر کے وقت ہلاک کر دے۔'' یوں اس نے اس دعا کے ذریعے سے خود اپنی ہلاکت کا فیصلہ سنا دیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام اسی بارے میں نازل ہوا: ''اگر تم فیصلہ چاہتے ہو تو بلاشبہ تمھارے پاس فیصلہ آچکا اور اگر اب تم باز آجاؤ تو وہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر تم دوبارہ ایسا کرو گے تو ہم بھی دوبارہ ایسا کریں گے۔ اور تمھیں تمھاری جماعت کبھی کچھ فائدہ نہیں دے گی اگرچہ وہ کثیر ہو۔ اور یقیناً اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔'' (الأنفال 19:8) اس روایت کو احمد، طبری اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے، دیکھیے: (الفتح الربانی: 44/21، وتفسیر الطبری: 454/13، والمستدرك للحاكم: 328/2) دعا کے الفاظ ابن اسحاق نے بھی مرسل سند سے روایت کیے ہیں، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 323/2)

آپ ﷺ کے مبارک جسم کے ساتھ لگ جائے۔'' رسول اللہ ﷺ نے اُن کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ [1]

پھر رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو جنگی معاملات کے بارے میں یہ ہدایات فرمائیں: ''جب دشمن بالکل تمھارے قریب آجائے تب تیر چلانا۔ اپنے تیر بچا کے رکھو۔'' [2] ''اُس وقت تک تلواریں نہ نکالو جب تک وہ تمھارے سر پر نہ آ جائیں۔'' [3] پھر آپ ﷺ نے یہ فرما کر صحابہ کو جنگ کی یوں ترغیب دی: ''قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! آج جو شخص ان کافروں سے ڈٹ کر لڑے گا، منہ نہیں پھیرے گا، ثواب کی نیت رکھے گا، پھر وہ مارا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے جنت میں داخل کرے گا۔'' [4]

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ جب مشرکین قریب آئے تو نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا:

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب :10، حديث: 3985,3984. [2] سواد کا واقعہ ابن اسحاق کی روایت سے ہے جس کی سند منقطع ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 321,320/2) ابن حجر ؒ کے مطابق اسے عبدالرزاق اور بغوی نے بھی روایت کیا ہے۔ عبدالرزاق کی سند حسن مرسل ہے، دیکھیے: (الإصابة: 95/2) واقدی نے بھی اسے روایت کیا ہے، دیکھیے: (المغازي: 57,56/1) طبرانی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ ہیثمی نے کہا: ''اس کے راوی ثقہ ہیں۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 289/6) اس روایت کا مضمون ابن اسحاق کی روایت کے موافق ہے۔ باوزیر کا کہنا ہے: ''بعض علماء کے نزدیک مرسل روایت دلیل بنائے جانے کے قابل ہے۔ اگر کوئی ایسی روایت مل جائے جو اس کی سند کو ملا دے تو بیشتر علماء کے نزدیک مرسل قابلِ قبول ہے۔ یہاں ہیثمی اور ابن اسحاق کی روایتیں اس مرسل روایت کے نقص کو دور کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ابن اسحاق اور واقدی کی روایتوں میں یہ بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ایک تیر تھا۔ عبدالرزاق کی روایت میں ہے کہ وہ کھجور کی شاخ تھی۔ سواد ؓ بدر کے بعد تمام معرکوں میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔'' دیکھیے: (الاستيعاب في أسماء الأصحاب لابن عبدالبر: 122/2) یہ موسیٰ بن عقبہ کی روایت ہے۔ [3] سنن أبي داود، الجهاد، باب في سل السيوف عند اللقاء، حديث: 2664. محدث منذری نے اس کی سند کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے اور البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ [4] اسے ابن اسحاق نے بلا سند روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 322/2)

«قُومُوا إِلٰى جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ»

''اُٹھو اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین پر محیط ہے۔''

حضرت عمیر بن حُمام انصاری رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ سُنے تو کہنے لگے: ''اے اللہ کی رسول! کیا جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین سے بھی زیادہ ہے؟ فرمایا: ''ہاں!'' وہ کہنے لگے: ''واہ، واہ'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''واہ واہ کیوں کرتے ہو؟'' کہا: ''اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! کوئی وجہ نہیں صرف یہ امید اور خواہش ہے کہ میں بھی جنتیوں میں شامل ہو جاؤں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یقین رکھو تم جنتی ہو۔'' پھر انھوں نے اپنے ترکش سے چند کھجوریں نکالیں اور کھانے لگے، پھر خود ہی کہنے لگے: ''اگر میں ان کھجوروں کے کھانے تک زندہ رہا تو پھر یہ زندگی بڑی لمبی ہو جائے گی۔'' یہ کہہ کر باقی کھجوریں پھینک دیں اور لڑنے لگے حتی کہ شہید ہو گئے۔[1]

عوف بن حارث (ابن عفراء) کہنے لگے: ''اللہ کے رسول! رب کریم اپنے بندے کے کس کام سے ہنستا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ آدمی جو بغیر زرہ اور خود کے دشمن پر جھپٹ پڑے۔'' انھوں نے فوراً زرہ اتار کر پھینک دی، پھر تلوار پکڑی اور دشمن پر ٹوٹ پڑے حتی کہ شہید ہو گئے۔[2]

جنگ کا بازار گرم ہونے سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو نصیحت کی کہ بنو ہاشم میں سے کسی کو قتل نہ کریں کیونکہ انھیں زبردستی لایا گیا ہے۔ آپ نے خصوصاً أبوالبَخْتري بن ہشام کا نام لیا۔ یہ وہ نیک شخص تھا جس نے بائیکاٹ کی دستاویز ختم کرنے میں بڑا

[1] صحیح مسلم، الإمارة، باب ثبوت الجنة للشهيد، حديث: 1901، والسنن الكبرٰى للبيهقي: 43/9، والطبقات الكبرٰى: 25/2. ابن سعد نے اسے اختصار سے روایت کیا ہے۔ ابن اسحاق نے اسے بلاسند بیان کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 323,322/2) [2] اسے ابن اسحاق نے منقطع سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 322/2)

سرگرم کردار ادا کیا تھا اور اس نے نبیِ کریم ﷺ کو کبھی ذرہ بھر تکلیف نہیں دی تھی۔ آپ ﷺ نے حضرت عباس بن عبدالمطلب کا نام بھی لیا۔ حضرت ابوحُذَیفہ نے یہ بات سُنی تو کہنے لگے: ''اچھا! ہم اپنے باپوں، بیٹوں، بھائیوں اور قوم قبیلے کو تو قتل کریں اور عباس کو چھوڑ دیں؟ اللہ کی قسم!! اگر میری اُس سے مڈھ بھیڑ ہوگئی تو میں اپنی تلوار سے اُس کے منہ پر ضرب لگاؤں گا۔'' اُن کی یہ بات رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«يَا أَبَا حَفْصٍ! أَيُضْرَبُ وَجْهُ عَمِّ رَسُولِ اللّٰهِ بِالسَّيفِ؟»

''ابوحفص! رسول اللہ کے چچا کے چہرے پر تلوار ماری جائے گی؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کے رسول! اجازت دیجیے میں تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں۔ اللہ کی قسم! یہ منافق ہوگیا ہے۔'' بعدازاں ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ''مجھے اُس بات کی وجہ سے ہمیشہ خطرہ محسوس ہوتا رہتا ہے جو اُس دن میری زبان سے نکل گئی تھی۔ آئندہ بھی میں اس خطرے میں مبتلا رہوں گا الا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے شہادت نصیب فرما دے جس سے میرا یہ گناہ معاف ہو جائے۔'' پھر وہ جنگ یمامہ میں شہید ہوگئے۔[1]

لڑائی شروع ہونے سے پہلے اسود بن عبدالاسد مخزومی دشمن کے لشکر سے نکلا اور کہنے لگا: ''میں اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ میں ضرور ان (مسلمانوں) کے حوض سے پانی پیوں گا یا اُسے توڑ دوں گا یا پھر وہاں تک پہنچتے پہنچتے مر جاؤں گا۔'' حمزہ رضی اللہ عنہ اُس کی طرف بڑھے اور ایسی تلوار ماری کہ اُس کا پاؤں نصف پنڈلی سے اڑ گیا۔ وہ اپنے خون میں لت پت گھسٹتا

[1] ابن اسحاق نے اسے منقطع سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 324/2) باوزیر کا خیال ہے، ممکن ہے ابن اسحاق نے اسے اس صحیح سند سے روایت کیا ہو جس کے ذریعے سے انھوں نے غزوۂ بدر کے دیگر واقعات بیان کیے ہیں۔ ہم خود اسی بات کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس روایت میں ہے کہ أبوالبختري نے لڑائی پر اصرار کیا تھا، چنانچہ وہ قتل ہوگیا۔

ہوا حوض کی طرف چلا تا کہ اپنی قسم پوری کر سکے۔ حضرت حمزہ اُس کے پیچھے لپکے اور تلوار ماری جس سے وہ ہلاک ہو کر حوض میں جا گرا۔ [1]

دُوبدُو مقابلہ

اس کے بعد قریش کے تین شہسوار نکلے اور اپنا اپنا مقابل طلب کرنے لگے۔ یہ تینوں عتبہ بن ربیعہ، اُس کا بھائی شیبہ بن ربیعہ اور اُس کا بیٹا ولید بن عُتبہ تھے۔ اُن کے مقابل تین انصاری جوان نکلے۔ عوف بن حارث، معوذ بن حارث، یہ دونوں عفراء کے بیٹے تھے۔ اور عبداللہ بن رواحہ لیکن قریشی شہسواروں نے اپنے رشتہ دار مہاجرین کے علاوہ کسی اور کے ساتھ مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے عبیدہ بن حارث، حمزہ اور علی رضی اللہ عنہم کو اُن کے مقابل جانے کا حکم فرمایا۔ حضرت حمزہ عتبہ کے، حضرت علی شیبہ کے اور حضرت عبیدہ ولید کے مقابل جا پہنچے۔ علی اور حمزہ نے تو اپنے حریفوں کو آنِ واحد میں قتل کر دیا مگر عبیدہ اور ولید دونوں زخمی ہو گئے۔ ان دونوں نے عبیدہ کی مدد کرتے ہوئے ولید کو جہنم رسید کیا اور حضرت عبیدہ کو زخمی حالت میں اٹھا کر لے آئے۔ [2] ان چھ افراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا:

[1] ابن اسحاق کی یہ روایت بغیر سند کے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 318/2) غالبًا یہ ابن اسحاق کی اسی روایت کا حصہ ہے جس میں انھوں نے بدر کے حالات بیان کیے ہیں۔ یہ روایت حسن سند سے ہے۔ [2] سنن أبي داود، الجهاد، باب في المبارزة، حديث: 2665. حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا: ”سب سے صحیح روایت یہی ہے۔ مگر تاریخی کتابوں میں مشہور یہ ہے کہ حضرت علی کے مقابلے میں ولید تھا۔ عقلاً یہ زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ عبیدہ اور شیبہ دونوں بڑی عمر کے تھے۔ اسی طرح عتبہ اور حمزہ بھی جبکہ حضرت علی اور ولید دونوں نوجوان تھے۔ طبرانی نے حسن سند کے ساتھ حضرت علی سے روایت کی ہے کہ ”میں نے اور حمزہ نے ولید کے خلاف عبیدہ کی مدد کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ناپسند نہیں فرمایا۔“ اس سے ابوداود کی روایت کی تائید ہوتی ہے۔ واللہ اعلم، دیکھیے: (فتح الباري: 163/15. یہ روایت بلا سند ہے۔ والسيرة النبوية لابن هشام: 319/2، والطبقات الكبرىٰ: 2/17-23) ◄◄

﴿هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا فِىۡ رَبِّهِمۡ‌ فَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا قُطِّعَتۡ لَهُمۡ ثِيَابٌ مِّنۡ نَّارٍؕ يُصَبُّ مِنۡ فَوۡقِ رُءُوۡسِهِمُ الۡحَمِيۡمُ﴾

''یہ دو (جھگڑنے والے) گروہ ہیں جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا ہے، چنانچہ وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے کپڑے کاٹے جائیں گے، ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی انڈیلا جائے گا۔'' [1]

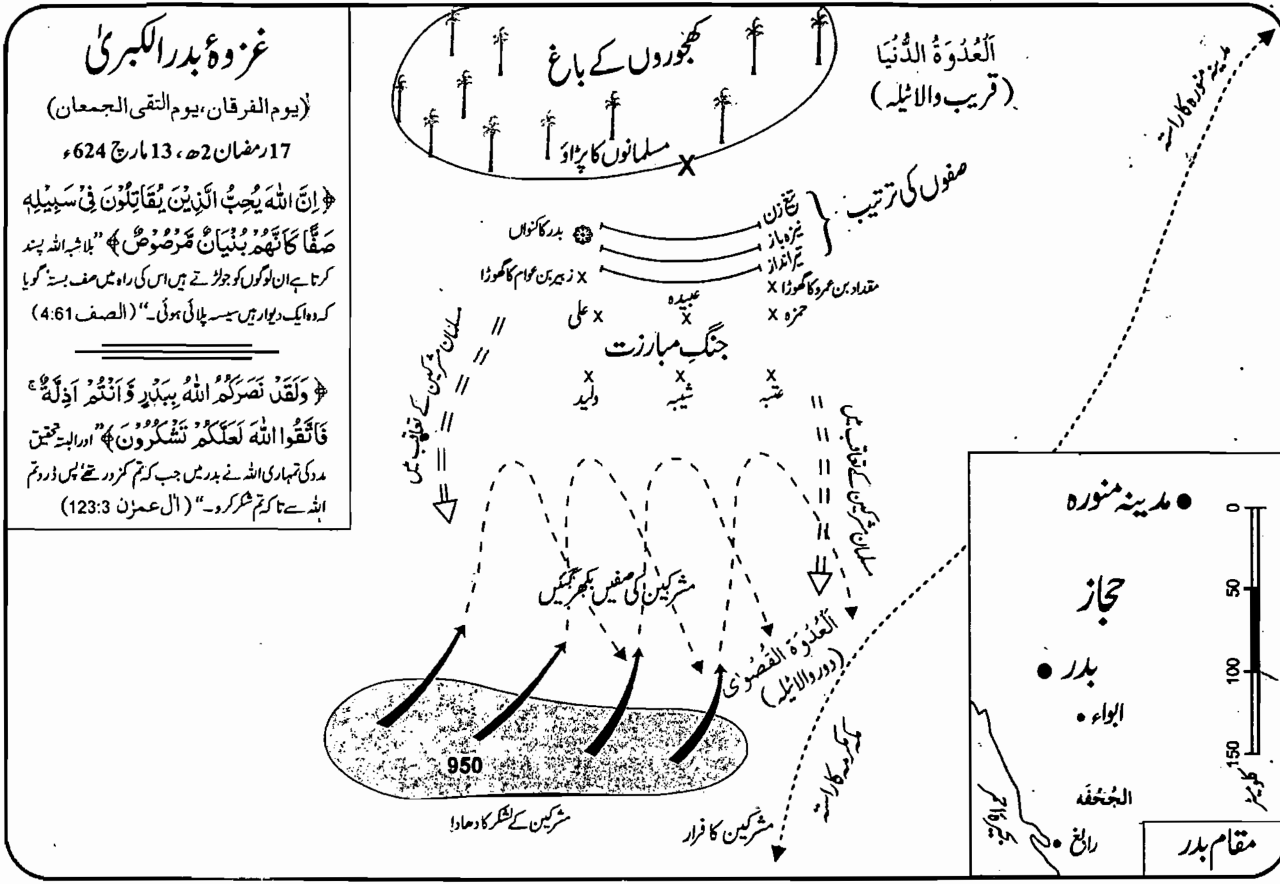
پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''مجھے کنکریوں کی ایک مٹھی پکڑاؤ۔'' انھوں نے پکڑائی تو آپ نے دشمن کے لشکر کی طرف اچھال دی۔ اُن میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کی آنکھوں میں وہ کنکریاں نہ پڑی ہوں۔ یہ آیت کریمہ اسی بارے میں نازل ہوئی:

﴿وَمَا رَمَيۡتَ اِذۡ رَمَيۡتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى‌ ۚ﴾

''(اے نبی!) جب آپ نے (مٹھی بھر خاک ان کی طرف) پھینکی تو درحقیقت وہ آپ نے نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔'' [2]

» محدثین میں سے اسے احمد نے روایت کیا ہے، دیکھیے: (الفتح الرباني: 32,31/21) محدث ہیثمی نے لکھا: ''احمد کے راوی سوائے حارثہ بن مضرب کے صحیح کے راوی ہیں۔ حارثہ بن مضرب ثقہ ہے۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 76/6، وكشف الأستار للهيثمي: 312,311/2) ہیثمی کے مطابق اسے بزار نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ آیت کی شانِ نزول کے بارے میں روایت بخاری میں ہے، دیکھیے: (صحيح البخاري، المغازي، باب قتل أبي جهل، حديث: 3966) [1] الحج 19:22. [2] الأنفال 17:8.

ہیثمی نے اسے متصل سند سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے کہا: ''اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 84/6) اسے ابن اسحاق نے بھی بلاسند روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 323/2) اس روایت میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب کنکریاں پکڑیں تو فرمایا: ''چہرے بگڑ جائیں۔'' پھر آپ نے کنکریاں مشرکین کی جانب اچھال دیں اور اپنے اصحاب کو حکم دیا اور کہا: ''حملہ کردو۔'' یوں مشرکین کو شکست ہوئی۔


غزوۂ بدر الکبریٰ
(یوم الفرقان، یوم التقی الجمعان)
17 رمضان 2ھ، 13 مارچ 624ء
﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ﴾ "بلاشبہ اللہ پسند کرتا ہے ان لوگوں کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں صف بستہ گویا کہ وہ ایک دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی۔" (الصف 4:61)
﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ "اور البتہ تحقیق مدد کی تمہاری اللہ نے بدر میں جب کہ تم کمزور تھے پس ڈرو تم اللہ سے تاکہ تم شکر کرو۔" (آل عمرٰن 123:3)
کھجوروں کے باغ
مسلمانوں کا پڑاؤ
اَلْعُدْوَةُ الدُّنْيَا
(قریب والا ٹیلہ)
صفوں کی ترتیب
تیغ زن
نیزہ باز
تیر انداز
بدر کا کنواں
زبیر بن عوام کا گھوڑا
مقداد بن عمرو کا گھوڑا
عبیدہ
علی
حمزہ
جنگِ مبارزت
ولید
شیبہ
عتبہ
مسلمان مشرکین کے تعاقب میں
مشرکین کی صفیں بکھر گئیں
اَلْعُدْوَةُ الْقُصْوٰى
(دور والا ٹیلہ)
950
مشرکین کے لشکر کا دھاوا
مشرکین کا فرار
مکہ مکرمہ کا راستہ
مدینہ منورہ کا راستہ
مدینہ منورہ
حجاز
بدر
الابواء
الجحفہ
رابغ
بحیرۂ احمر
0
50
100
150
کلومیٹر
مقام بدر

نصرتِ الٰہی اور غلبۂ حق

فرشتوں کی آمد

مسلمان میدانِ جنگ میں اپنی عظیم ایمانی قوت کے بل بوتے پر اترے تھے، اس لیے انھوں نے دشمن پر زبردست حملہ کیا اور کشتوں کے پشتے لگانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے بطورِ مدد فرشتے نازل فرمائے، قرآنِ مجید میں ہے:

﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ○ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ○ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ○ ﴾

"اور بلاشبہ اللہ نے بدر میں عین اس وقت تمھاری مدد فرمائی جبکہ تم کمزور تھے، پس تم اللہ سے ڈرو تاکہ تمھیں شکر ادا کرنے کی توفیق ہو۔ (اے نبی!) جب آپ مومنوں سے کہہ رہے تھے: کیا تمھارے لیے کافی نہ ہوگا کہ اللہ آسمان سے اتارے ہوئے تین ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے؟ کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور (اگر) دشمن تم پر فوراً چڑھ آئے تو اسی لمحے تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا جو خاص نشان والے ہوں گے۔ اور اللہ نے اسے تمھارے لیے خوشخبری بنادیا تاکہ اس سے تمھارے دلوں کو تسلی ہو اور مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے جو بہت زبردست، نہایت حکمت والا ہے۔" [1]

[1] آل عمرٰن 3:123-126.

سورۂ انفال میں ارشاد فرمایا:

﴿اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝﴾

’’جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمھاری فریاد سُن لی کہ یقیناً میں پے در پے آنے والے ایک ہزار فرشتوں کے ذریعے سے تمھاری مدد کرنے والا ہوں۔‘‘ [1]

پھر فرمایا:

﴿اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾

’’(اے نبی!) جب آپ کا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں، چنانچہ تم انھیں ثابت قدم رکھو جو ایمان لائے ہیں، میں جلد ہی ان لوگوں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا جنھوں نے کفر کیا۔‘‘ [2]

اس کے بارے میں کئی ایک احادیث بھی روایت کی گئی ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے: ’’ایک مسلمان اُس دن کسی مشرک کے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ اچانک اُس نے اپنے اوپر کوڑے کی آواز سُنی، ایک گھوڑ سوار کہہ رہا تھا: ’’حیزوم! [3] آگے بڑھو۔‘‘ مسلمان نے اپنے آگے بھاگنے والے مشرک کو دیکھا کہ وہ گر گیا۔ مسلمان نے بھاگ کر دیکھا تو اُس کی ناک پر ضرب کا نشان تھا اور چہرہ زخمی تھا جیسے کوڑا لگا ہو۔ ضرب والی پوری جگہ نیلی پڑی ہوئی تھی۔ وہ انصاری رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ’’تم سچ کہتے ہو۔ یہ تیسرے آسمان سے آنے والے فرشتے تھے۔‘‘ [4]

[1] الأنفال 9:8. [2] الأنفال 12:8. [3] امام نووی کے مطابق یہ فرشتے کے گھوڑے کا نام ہے، دیکھیے: (شرح النووي على صحيح مسلم: 86/12، و النهاية في غريب الحديث: 467/1) [4] صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب الإمداد بالملائكة في غزوة بدر وإباحة الغنائم، حديث: 1763.

مسند احمد کی روایت ہے کہ انصار میں سے ایک چھوٹے قد کا آدمی حضرت عباس کو جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، گرفتار کر لایا تو حضرت عباس کہنے لگے: ''اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! مجھے اس شخص نے گرفتار نہیں کیا۔ مجھے تو ایک انتہائی خوبصورت شخص نے گرفتار کیا ہے، جو سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ اب وہ شخص مجھے مسلمانوں میں نظر نہیں آ رہا۔'' انصاری کہنے لگا: ''اللہ کے رسول! انھیں میں ہی گرفتار کر کے لایا ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''چپ رہو۔ اللہ تعالیٰ نے ایک معزز فرشتے کے ذریعے سے تمھیں قوت دی تھی۔''[1]

اُموی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو چھپر میں اونگھ آ گئی۔ آپ بیدار ہوئے تو فرمانے لگے: ''ابوبکر! خوش ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی مدد آ چکی ہے۔ یہ جبریل علیہ السلام آ رہے ہیں۔ انھوں نے ڈھاٹا باندھ رکھا ہے اور گھوڑے کی باگ پکڑے آگے آگے آ رہے ہیں۔ اُن کے دانتوں پر غبار کے آثار ہیں۔ تمھارے پاس اللہ کی مدد اور اس کا وعدہ آ پہنچا۔''[2]

ایسی روایات تو بہت ہیں جن میں بدر کے دن فرشتوں کی شرکت کا ذکر ہے مگر کسی روایت میں یہ صراحت نہیں کہ انھوں نے جنگ بھی کی۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے بدر کے دن فرمایا:

«هٰذَا جِبْرِيلُ آخِذٌ بِرَأْسِ فَرَسِهٖ عَلَيْهِ أَدَاةُ الْحَرْبِ»

''یہ جبریل ہیں، انھوں نے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑی ہوئی ہے۔ وہ پوری طرح مسلح

[1] مسند أحمد (تحقيق أحمدشاكر): 194/2. یہ ایک طویل حدیث کا اقتباس ہے۔ محدث شاکر نے کہا: ''اس کی سند صحیح ہے۔'' ہیثمی نے کہا: ''اسے احمد اور بزار نے روایت کیا ہے۔ احمد کے راوی سوائے حارثہ بن مضرب کے صحیح کے راوی ہیں۔ حارثہ بن مضرب ثقہ ہیں۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 76,75/6)

[2] البداية والنهاية: 312/3. البانی نے لکھا ہے کہ یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند حسن ہے، دیکھیے: (حاشيه فقه السيرة للغزالي، ص: 243) ابن ہشام بھی اسے اپنی کتاب میں منقطع سند سے لائے ہیں۔ یہ وہی سند ہے جسے اموی نے راویوں کے اتصال کے ساتھ بیان کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 322,321/2) بیہقی نے بھی اپنی کتاب میں یہ حدیث دو سندوں سے روایت کی »

ہیں۔''[1]

ایک اور روایت میں ہے: ''جبریل علیہ السلام نبیِ کریم ﷺ کے پاس آئے اور پوچھنے لگے: ''آپ (ﷺ) اہل بدر کا کیا مقام و مرتبہ سمجھتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''سب مسلمانوں سے افضل (یا اسی قسم کا کوئی اور لفظ ارشاد فرمایا۔)'' جبریل علیہ السلام فرمانے لگے: ''اسی طرح بدر میں حاضر ہونے والے فرشتے بھی تمام فرشتوں سے افضل ہیں۔''[2]

مستدرک حاکم کی روایت ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بدر کے دن زرد پگڑی کا ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔ فرشتے اترے تو انھوں نے بھی حضرت زبیر کی طرح زرد پگڑیاں پہن رکھی تھیں۔[3] ابن سعد نے بھی یہ روایت اسی طرح بیان کی ہے۔[4]

بدر کے دن اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کے ہاتھوں بعض کرامتیں بھی ظاہر فرمائیں۔ روایت ہے کہ حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ تلوار سے جنگ کر رہے تھے کہ تلوار ٹوٹ گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں ایک خشک لکڑی تھما دی کہ اس سے لڑتے رہو۔ وہ لکڑی اُن کے ہاتھ میں فولاد کی مضبوط اور لمبی تلوار بن گئی۔ وہ اُس تلوار سے اُس دن بھی اور بعد کی کئی جنگوں میں بھی لڑائی لڑتے رہے۔ آخر دور ارتداد میں یمامہ کی جنگ میں اُسی تلوار کے ساتھ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔[5]

--- جو ہے ابن اسحاق کی سند کے علاوہ ہیں، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 54/7) [1] صحيح البخاري، المغازي، باب شهود الملائكة بدرًا، حديث: 3995. [2] صحيح البخاري، المغازي، باب شهود الملائكة بَدْرًا، حديث: 3996، وفتح الباري: 181/15. [3] المستدرك للحاكم: 361/3. باوزیر نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (مرويات غزوة بدر، ص: 243) [4] ابن حجر نے کہا: ''ابن سعد نے صحیح سند کے ساتھ ہشام سے اور انھوں نے اپنے والد سے روایت کی، انھوں نے کہا: ......'' دیکھیے: (الإصابة: 545/1) طبرانی یہ روایت ابوملحن کی سند سے لائے ہیں۔ ابوملحن نے اپنے والد سے روایت کی ہے۔ [5] السيرة النبوية لابن هشام: 336/2، والمغازي للواقدي: 93/1، ودلائل النبوة للبيهقي: 99,98/2. اس روایت کی سند دو وجوہات کی بنا پر نہایت ضعیف ہے۔ پہلی وجہ اس کا مرسل ہونا اور دوسری وجہ ابومعشر، نجیح بن عبدالرحمٰن کا ضعیف ہونا ہے۔

ابلیس اُس دن سُراقہ بن مالک کی صورت میں میدان میں موجود تھا۔ جب اُس نے فرشتوں اور مسلمانوں کو مشرکین کی دُرگت بناتے دیکھا تو الٹے پاؤں واپس ہوا اور بھاگ کر سمندر میں کود پڑا۔ [1]

کفر کے تین سرغنوں کا انجام

ابوجہل: بخاری اور مسلم میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انھوں نے کہا: ''بدر کے دن میں صف میں کھڑا ہوا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا، میرے دونوں طرف دو نوجوان لڑکے کھڑے تھے۔ انھیں دیکھ کر میں مطمئن نہ ہوا۔ اچانک اُن میں سے ایک آہستہ سے مجھ سے مخاطب ہوا کہ کہیں دوسرا نہ سن لے۔ وہ کہنے لگا: ''چچا جان! ابوجہل کون ہے؟ دکھا دیجیے۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا: ''بھتیجے! تو اُسے دیکھ کر کیا کرے گا؟'' وہ بولا: ''مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتا ہے۔ قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر میں نے اُسے دیکھ لیا تو میرا وجود اُس کے جسم سے الگ نہیں ہوگا حتی کہ ہم میں سے ایک مر جائے۔'' اُس کی یہ بات سُن کر مجھے تعجب ہوا۔ اتنے میں دوسرے نے بھی مجھے متوجہ کر کے یہی بات کہی۔ اُسی لمحے اچانک مجھے ابوجہل نظر آ گیا۔ وہ اپنے لشکر میں بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ میں نے کہا: ''دیکھتے ہو؟ وہ ہے تمھارا شکار جس کے بارے میں تم مجھ سے پوچھ رہے ہو۔'' یہ سنتے ہی وہ اپنی تلواریں لے کر ہوا ہو گئے۔ جاتے ہی تلواریں چلائیں اور اُس کا تیاپانچہ کر دیا، پھر

[1] تفسیر الطبري (تحقیق أحمد شاکر): 7/14. سورۂ انفال کی آیت: 48 کی تفسیر کے ضمن میں یہ روایت معاویہ بن صالح کی سند سے ہے جو علی بن ابی طلحہ سے اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں۔ دکتور ذہبی نے لکھا: ''تفسیرِ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایات میں سب سے عمدہ سند یہی ہے۔ دیگر ماخذوں میں اس روایت کی جتنی سندیں ہیں سب کی سب ضعیف ہیں، تاہم وہ ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہیں۔'' دیکھیے: (التفسیر والمفسّرون، ص: 88,87)

بھاگتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''تم میں سے کس نے اُسے قتل کیا ہے؟'' ہر ایک کہنے لگا: ''میں نے قتل کیا ہے۔'' فرمایا: ''تم نے اپنی تلواریں صاف کر لی ہیں؟'' وہ کہنے لگے: ''نہیں!'' رسول اللہ ﷺ نے دونوں تلواریں دیکھیں تو فرمایا: ''سچ کہتے ہو۔ تم دونوں نے قتل کیا ہے۔'' لیکن پھر آپ ﷺ نے ابوجہل کا ساز وسامان عمرو بن جموح کے بیٹے معاذ کو دیا۔ یہ دونوں نوجوان معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراء تھے۔'' [1]

ابن اسحاق نے یہ واقعہ حضرت معاذ بن عمرو بن جموح کی زبانی یوں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''ابوجہل اپنے ساتھیوں کے جھرمٹ میں تھا۔ میں نے لوگوں کو کہتے سُنا کہ ابوجہل تک کسی صورت پہنچا نہیں جاسکتا۔ میں نے یہ بات سُنی تو میں نے اُسے قتل کرنے کا تہیہ کرلیا۔ میں تاک لگا کر اُس کی طرف گیا۔ جونہی موقع ملا میں نے اُس پر تابڑ توڑ حملہ کر دیا۔ میں نے اُسے ایسی ضرب لگائی کہ اُس کا پاؤں نصف پنڈلی سے اڑا دیا۔ اُس کے بیٹے عکرمہ نے میرے کندھے پر تلوار ماری اور میرا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ صرف تھوڑی سی کھال رہ گئی۔ بازو لٹکنے لگا۔ میں نے پروا نہیں کی اُسی طرح لڑتا رہا۔ دن گزر گیا۔ میرا بازو اُسی طرح لٹکتا رہا۔ جب تکلیف کا احساس ہوا تو میں نے اپنے اُس بازو پر پاؤں رکھ کر انگڑائی لی اور اُسے کاٹ پھینکا۔ میرے ضرب لگانے کے بعد وہاں معوذ بن عفراء بھی پہنچ گیا۔ ابوجہل زخمی پڑا تھا۔ اُس نے بھی اُسے تلوار ماری حتی کہ وہ حرکت کے قابل نہ رہا، تاہم اُس کا سانس چل رہا تھا۔ اس کے بعد معوذ بے جگری سے لڑتا رہا حتی کہ شہید ہوگیا۔'' [2]

[1] صحيح البخاري، فرض الخمس، باب من لم يخمّس الأسلاب، حديث: 3141، و صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب استحقاق القاتل سلب القتيل، حديث: 1752 . [2] السيرة النبوية لابن هشام: 333/2. سند حسن ہے۔

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ جنگ ختم ہوگئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کون دیکھ کر آئے گا کہ ابوجہل کا کیا بنا؟'' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھاگے گئے۔ دیکھا تو وہ عفراء کے بیٹوں کی ضربوں سے نڈھال ہوکر آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ وہ کہنے لگے: ''ارے! تو ابوجہل ہے؟'' ساتھ ہی اُس کی داڑھی کو پکڑ لیا۔ وہ کہنے لگا: ''کیا اس سے بڑا بھی کوئی ہے جسے تم نے قتل کیا ہے؟!''[1]

مسند احمد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود حضرت ابن مسعود کے ساتھ گئے تاکہ ابوجہل کی لاش دیکھیں، پھر فرمایا: ''یہ اس امت کا فرعون تھا۔''[2]

ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ جب حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ابوجہل کا سر کاٹنے کے لیے اُس کے سینے پر چڑھ بیٹھے تو ابوجہل چلایا: ''او بکریوں کے ذلیل چرواہے! تو بڑی دشوار گزار جگہ پر چڑھا ہے۔''[3]

امیہ بن خلف: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے امیہ کو گرفتار کر لیا تھا۔ بلال رضی اللہ عنہ نے امیہ کو اُن کے ساتھ دیکھا تو کہنے لگے: ''یہ تو کفر کی جڑ اُمیہ بن خلف ہے۔ آج اگر یہ بچ گیا تو میں نہیں بچ پاؤں گا!'' حضرت عبدالرحمٰن نے کوشش کی کہ بلال کو اُن کے ارادۂ قتل سے باز رکھیں لیکن اُن کا بس نہ چلا۔ حضرت بلال نے انصار کو بلا لیا۔ وہ آ گئے تو اُن کے ساتھ مل کر اُسے قتل کر دیا اگرچہ حضرت ابن عوف رضی اللہ عنہ نے اُسے بچانے کی بڑی کوشش کی۔ انھوں نے اُسے نیچے گرا کر اپنا وجود اُس کے اوپر ڈال دیا تھا۔[4]

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب قتل أبي جهل، حديث:3963,3962. [2] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 316/5، حديث:3824. محدّث احمد شاکر نے اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔
[3] السيرة النبوية لابن هشام: 135/2. ابن ہشام اسے معلق سند سے لائے ہیں۔ [4] صحيح البخاري، الوكالة، باب إذا وكل المسلم حربيا في دار الحرب أو......، حديث:2301. ابن اسحاق اسے حسن سند سے لائے ہیں، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 329/2) یہ روایت زیادہ تفصیلی ہے۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ مسلمانوں میں سے کن کن لوگوں نے مل کر اسے قتل کیا تھا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ◄◄

جب مشرکین کے دیگر مقتولوں کی لاشیں بدر کے ایک خراب کنویں میں ڈالی گئیں تو اس کی لاش کنویں میں نہ پھینکی جا سکی کیونکہ وہ زرہ ہی میں پھول گئی تھی۔ جب وہ اُسے کھینچنے لگتے تو اُس کے اعضاء الگ ہونے لگتے۔ مسلمانوں نے اُسے اسی طرح پتھروں اور مٹی سے ڈھانپ دیا۔ [1]

عاص بن ہشام بن مغیرہ: عاص بن ہشام بن مغیرہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ماموں تھا۔ اس لیے اُن کی خواہش تھی کہ اُسے اپنے ہاتھوں سے قتل کریں، چنانچہ انھوں نے اُسے قتل کر دیا تاکہ سب کو پتہ چل جائے کہ اُن کے دل میں اللہ وحدہ لاشریک لہ کے سوا کسی کی محبت نہیں۔ [2]

معرکۂ بدر نے مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم نصرت آشکار کر دی کیونکہ انھوں نے ستر نامی گرامی مشرک قتل کیے تھے اور ستر کو گرفتار کر کے قیدی بنا لیا تھا۔ [3] مسلمانوں کے صرف چودہ مجاہد شہید ہوئے۔ چھ قریشی، آٹھ انصاری۔ [4]

یقیناً اُن کے حق میں یہ اللہ تعالیٰ کا عادلانہ فیصلہ اور بدلہ تھا:

﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝ ﴾

”کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے اللہ کی نعمت (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا بدلہ ناشکری اور کفر سے دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دیا۔ (یعنی) جہنم میں، وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔“ [5]

◄◄ (فتح الباري: 50,49/10) [1] السيرة النبوية لابن هشام: 339,338/2. سند حسن ہے۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 336,335/2. سند منقطع ہے۔ [3] صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب الإمداد بالملائكة في غزوة بدر، وإباحة الغنائم، حديث: 1763، ومسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 948/2. سند صحیح ہے۔ [4] ابن کثیر نے بتایا کہ یہ موسیٰ بن عقبہ کا قول ہے۔ انھوں نے اس کی کوئی سند بیان نہیں کی، دیکھیے: (البداية والنهاية: 330/3) [5] إبراهيم 29,28:14. صحيح البخاري، ◄◄

مشرکین کی لاشیں اندھے کنویں میں

بخاری، مسلم ،احمد، ابن اسحاق اور دیگر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق چوبیس سردارانِ قریش کی لاشیں بدر کے ایک کچے اوراندھے کنویں میں ڈال دی گئیں۔ یہ کنواں پہلے بھی خراب اور ویران تھا۔ان کی لاشیں گرنے کے بعد مزید خراب اور پلید ہوگیا۔ [1]

رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ جب کسی قوم پر فتح حاصل کرتے تو اُس علاقے میں تین دن تک قیام فرماتے۔ بدر کے میدان میں بھی تیسرا دن ہوا تو آپ نے حکم دیا کہ میری سواری پر پالان کسا جائے، پھر آپ ﷺ چل پڑے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ کے ساتھ ساتھ تھے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہمارا خیال تھا،شاید آپ کسی کام سے جارہے ہیں حتی کہ آپ اُس کنویں کے کنارے جا کھڑے ہوئے، پھر آپ اُن کو پورے نام نسب سمیت ایک ایک کر کے پکارنے لگے:

«يَا فُلَانَ بْنَ فُلَانٍ! وَيَا فُلَانَ بْنَ فُلَانٍ! أَيَسُرُّكُمْ أَنَّكُمْ أَطَعْتُمُ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ؟ فَإِنَّا قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا، فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا؟» فَقَالَ عُمَرُ: «يَا رَسُولَ اللّٰهِ! مَا تُكَلِّمُ مِنْ أَجْسَادٍ لَّا أَرْوَاحَ لَهَا؟» فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! مَاأَنْتُمْ بِأَسْمَعَ لِمَا أَقُولُ مِنْهُمْ»

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب قتل أبي جهل، حديث:3976، وصحيح مسلم، الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب عرض مقعد الميت من الجنة والنار عليه......، حديث:2875، ومسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 232/1 .احمد شاکر کا کہنا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ والسيرة النبوية لابن هشام:339/2. ہیثمی نے کہا: ”اسے طبرانی نے بھی روایت کیا ہے، اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔“ دیکھیے :(مجمع الزوائد: 91/6) « التفسير، باب: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا﴾، حديث: 4700.

''اے فلاں بن فلاں! اے فلاں بن فلاں! کیا اب یہ بات تمھیں اچھی لگتی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کر لیتے؟ ہم نے تو اپنے رب کا کیا ہوا وعدہ سچا اور برحق پا لیا ہے۔ کیا تم نے بھی اپنے رب جلیل کا وعدہ برحق پایا ہے؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''اللہ کے رسول! آپ ان بے جان لاشوں سے باتیں کر رہے ہیں جن کی روح کب کی پرواز کر چکی ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میری باتوں کو تم ان سے زیادہ نہیں سُن رہے۔''[1]

جب اُن کی لاشیں کنویں میں ڈالی گئیں تو اُن میں عتبہ بن ربیعہ کی لاش بھی تھی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اُس کے بیٹے ابوحذیفہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ غمگین کھڑے تھے۔ چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا: ''شاید تجھے اپنے باپ کی وجہ سے غم لاحق ہے؟'' وہ کہنے لگے: ''اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرا باپ بہت عقل مند اور فاضل شخص تھا۔ مجھے امید تھی کہ اللہ تعالیٰ اُسے اسلام کی ہدایت نصیب فرمائے گا۔ لیکن اب میں اُس کا انجام دیکھ چکا ہوں کہ وہ کفر ہی پر فوت ہوا ہے اور میری امید دم توڑ گئی ہے۔ میں صرف اس بنا پر غمگین ہوں۔'' رسول اللہ ﷺ نے اُن کے لیے دعائے خیر کی اور اُن کی تعریف فرمائی۔[2]

جنگ ختم ہو گئی، مسلمان غالب آ چکے اور قیدی قابو کیے جا چکے تو رسول اللہ ﷺ کے سامنے تجویز پیش کی گئی: ''اب تجارتی قافلہ بھی قابو کر لیجیے۔ اب اُس کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں رہا۔'' حضرت عباس نے (جو اُس وقت قیدی تھے) بلند آواز سے کہا: ''یہ

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب قتل أبي جهل، حديث: 3976. [2] ابن اسحاق نے اسے سند کے بغیر بیان کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 342/2) غالبًا یہ ابن اسحاق کے ہاں بدر کی اسی روایت کا تسلسل ہے جو حسن سند سے بیان کی گئی ہے۔

درست نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیوں؟'' وہ کہنے لگے: ''اللہ تعالیٰ نے آپ سے دو گروہوں میں سے ایک پر غلبے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور وہ وعدہ پورا ہو چکا ہے۔''[1]

جنگ بدر کا عظیم واقعہ 17 رمضان المبارک 2 ہجری بروز جمعۃ المبارک پیش آیا۔[2]

مالِ غنیمت

غنیمت کے مسئلے پر مسلمانوں میں اختلاف ہو گیا کیونکہ اُس وقت تک غنیمت کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے اس واقعے کی تفصیل یوں بیان کی ہے: ''ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بدر کی طرف نکلے۔ میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ کفار سے جنگ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست سے دوچار کیا۔ کچھ لوگ کافروں کے پیچھے بھاگے۔ وہ انھیں بھگائے لیے جاتے تھے اور قتل کرتے جاتے تھے۔ کچھ لوگ لشکرگاہ ہی میں رہے۔ وہ مالِ غنیمت اکٹھا کر کے اُس کی حفاظت کر رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے حلقے میں لے رکھا تھا تاکہ دشمن دھوکہ دے کر اچانک آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ رات ہوئی اور سب اکٹھے ہو گئے تو مالِ غنیمت کی بحث شروع ہو گئی۔ غنیمت جمع کرنے والے کہنے لگے: ''ہم نے غنیمت جمع کی ہے۔ اسے سنبھالا ہے اور اس کی حفاظت کی ہے، لہٰذا کسی دوسرے کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔'' دشمن کے پیچھے بھاگنے والے کہنے لگے: ''تمھارا حصہ غنیمت میں ہم سے بڑھ کر نہیں۔ ہم نے

---

[1] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 320/3. احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ ابن کثیر نے لکھا: ''اس حدیث کی سند جید ہے۔'' دیکھیے: (تفسیر ابن کثیر: 14,13/4) ترمذی نے اسے عبدالرزاق کی حسن سند سے روایت کیا ہے۔ عبدالرزاق نے اسرائیل سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (جامع الترمذي، تفسير القرآن، الأنفال، حديث: 3080) [2] یہ بیان ابن اسحاق کی روایت سے ہے جو ابوجعفر محمد بن علی بن حسین پر موقوف ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 21/2، والطبقات الكبرىٰ: 21/2) ابن سعد نے اسے دو سندوں سے روایت کیا ہے۔

دشمن کو بھگایا، میدان خالی کرایا۔ تبھی تم غنیمت جمع کرنے کے قابل ہوئے۔" رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کرنے والے کہنے لگے: "ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے گھیرے میں لیے رکھا ورنہ دشمن اچانک آپ ﷺ کو کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ہم اس عظیم کام میں مصروف رہے۔" تو سورۂ انفال کی آیت نازل ہوئی:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ﴾

"(اے نبی!) وہ آپ سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے: مالِ غنیمت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور آپس میں اصلاح کرلو۔"[1]

رسول اللہ ﷺ نے مالِ غنیمت تمام مسلمانوں میں برابر تقسیم فرما دیا۔[2] اصل عربی جملہ

[1] الأنفال 8:1. تفسير الطبري (تحقيق أحمد شاكر): 13/367-371. یہاں طبری نے جو روایات نقل کیں ان کی اسانید صحیح ہیں۔ ابن اسحاق نے حسن سند سے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا کہ یہ آیت بدر والوں کی بابت نازل ہوئی جبکہ ان کے درمیان غنیمت کے متعلق اختلافِ رائے ہو گیا تھا، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 2/344) حاکم اور ذہبی نے اس قول کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ احمد نے بھی اسے ابن اسحاق ہی کی سند سے بیان کیا ہے، دیکھیے: (الفتح الرباني: 14/72) ساعاتی نے کہا: "اس کی سند جید ہے۔" ابن اسحاق کا بیان ہے کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے مال غنیمت کی خاطر مسلمانوں کے درمیان مقابلے بازی کو ناپسند کیا۔ [2] اسے احمد نے روایت کیا ہے۔ ساعاتی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (الفتح الرباني: 14/73) ساعاتی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ترمذی، حاکم اور ذہبی نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ امر کہ رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت مسلمانوں کے درمیان برابر برابر تقسیم کیا تھا، اسے ابن اسحاق نے بسند حسن بیان کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 2/344) اسے ابن حبان نے بھی اپنی کتاب "صحیح" میں روایت کیا ہے۔ حاکم نے اسے المستدرك میں روایت کرنے کے بعد لکھا ہے: "یہ حدیث مسلم کی شرائط پر پورا اترتی ہے اس کے باوجود شیخین نے اسے نقل نہیں کیا۔ ذہبی نے اس کے متعلق سکوت کیا ہے۔" بیہقی نے بھی اسے اپنی ››

یوں ہے: «فَقَسَمَهَا ﷺ عَلٰی فَوَاقٍ بَیْنَ الْمُسْلِمِینَ» اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے مالِ غنیمت فوراً تقسیم فرما دیا، یا پھراتنی دیر بھی نہیں لگی جتنا اونٹنی کے دودھ دوہنے کا درمیانی وقفہ ہوتا ہے۔ تیسرا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے مالِ غنیمت اُن کی خدمات کے مطابق درجہ بدرجہ تقسیم فرما دیا۔ [1]

صحیح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مالِ غنیمت میں سے خُمس (پانچواں حصہ) بھی نکالا گیا۔ اس کے بعد باقی مال مجاہدین میں تقسیم کیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے میرے تمام حصے کے علاوہ خُمس میں سے ایک اونٹنی بھی دی۔ [2]

رسول اللہ ﷺ نے مالِ غنیمت میں سے نو ایسے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی حصہ دیا جو جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے کیونکہ اُنھیں کچھ اور کاموں پر مامور کیا گیا تھا۔ اُن میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے کیونکہ انھیں رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ تھیں، ان کی بیماری کے علاج کے سلسلے میں مدینہ منورہ میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ بعد ازاں وہ فوت ہوگئیں اور دفن کر دی گئیں۔ اُسی دن رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام بدر سے واپس تشریف لائے تھے۔ [3]

مالِ غنیمت بدر سے مدینہ منورہ واپسی کے دوران ''صفراء'' کے علاقے میں تقسیم کیا گیا۔ [4] قیدی مدینہ منورہ لائے گئے۔ حضرت زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کو خوشخبری پہنچانے کے لیے پہلے ہی مدینہ منورہ بھیج دیا گیا۔ مدینہ والوں نے بے انتہا خوشی

» کتاب میں نقل کیا ہے، دیکھیے: (السنن الکبریٰ: 292/6) [1] الفتح الرباني: 73/14. ساعاتی نے کہا کہ اس کی سند جید ہے۔ ابن اسحاق کے ہاں بھی ایسی ہی روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 344/2) [2] صحيح البخاري، المغازي، باب: 12، حديث: 4003. [3] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 101/8. سند صحیح ہے۔ [4] السيرة النبوية لابن هشام: 346/2.

کے ساتھ یہ خبر سنی لیکن انھیں دھڑکا تھا کہ کہیں یہ خبر غیر مصدقہ نہ ہو۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''اللہ کی قسم! مجھے تو اُس وقت یقین آیا جب ہم نے قیدی اپنی آنکھوں سے دیکھے۔''[1] حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے جب سہیل بن عمرو کو دیکھا کہ اُس کے ہاتھ ایک رسی سے گردن کے ساتھ جکڑے ہوئے ہیں تو دہشت زدہ ہو کر کہنے لگیں: ''ابویزید! تم نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا؟ تم عزت کی موت کیوں نہ مر گئے؟!'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سودہ! انھیں اللہ اور رسول اللہ کے خلاف بھڑکا رہی ہو؟'' انھوں نے فوراً معذرت کی۔ ''اے اللہ کے رسول! قسم اُس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر مبعوث فرمایا! جب میں نے ابویزید (سہیل) کو اس حال میں دیکھا تو بے اختیار میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔''[2]

قیدی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے قیدیوں کے بارے میں مشورہ طلب کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فدیہ لے کر چھوڑنے کی تجویز پیش کی کہ اس طرح مسلمانوں کو کفار کے

[1] بیہقی کی یہ روایت ابن کثیر نے درج کی ہے، دیکھیے: (البداية والنهاية: 334/2) دکتور اکرم ضیاء عمری نے اپنی کتاب میں اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، نیز حاکم نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (المجتمع المدني، باب الجهاد، ص:56، والمستدرك للحاكم: 218,217/3) ابن ابی شیبہ نے اسے مرسل اور ابن اسحاق نے منقطع سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (المصنف لابن أبي شيبة: 368/14، والسيرة النبوية لابن هشام: 345/2) [2] اسے ابن اسحاق نے مرسل سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 349,348/2) حاکم نے اسے متصل سند سے روایت کر کے کہا: ''یہ حدیث مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے، اس کے باوجود شیخین نے اسے نقل نہیں کیا۔'' دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 22/3) ذہبی نے حاکم سے اتفاق کیا ہے۔ سہیل بن عمرو، سکران بن عمرو کا بھائی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ام المومنین سودہ رضی اللہ عنہا کے شوہر تھے۔ ہجرت حبشہ سے واپسی کے بعد وہ مکہ میں فوت ہوئے۔

مقابلے میں قوت حاصل ہوگی اور فدیے سے اسلحہ وغیرہ خریدا جاسکے گا، پھر یہ بھی ممکن ہے اللہ تعالیٰ ان قیدیوں کو اسلام کی ہدایت نصیب فرما دے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں قتل کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ یہ لوگ ''کفر کے امام'' تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کی رائے کو تسلیم کرلیا مگر قرآن کا ارشاد حضرت عمر کی رائے کے مطابق نازل ہوا۔

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ﴾

''کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں حتی کہ وہ (انھیں قتل کر کے) زمین میں خوب خون ریزی کر لے۔ (مسلمانو!) تم دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ (تمھاری) آخرت چاہتا ہے اور اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے پہلے ہی (ایک بات) لکھی ہوئی نہ ہوتی تو تم نے (بدر کے قیدیوں سے) جو (فدیہ) لیا ہے اس کے بدلے تمھیں بڑا عذاب آ پکڑتا۔ پھر اس میں سے کھاؤ جو تم نے غنیمت حاصل کی اس حال میں کہ حلال، طیب ہے۔''[1]

ابتدائے اسلام میں فدیہ لینا جائز تھا۔ بعد ازاں امامِ وقت (حکمران) کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ چاہے تو جنگی قیدیوں کو قتل کر دے، چاہے فدیہ لے کر چھوڑ دے، چاہے احسان کرتے ہوئے بلا معاوضہ رہا کر دے۔ عورتوں اور بچوں کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ بھی جنگ میں حصہ لیں تو انھیں بھی قتل کیا جا سکتا ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا

[1] الأنفال 8:67-69. تفسیر الطبري: 14/68. سند حسن ہے۔ وصحیح مسلم، الجهاد والسیر، باب الإمداد بالملائكة في غزوة بدر وإباحة الغنائم، حدیث: 1763. [2] المغني لابن قدامة: 8/372-374.

الْوَثَاقَ ۙ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ۛ﴾

''چنانچہ جب تم (جہاد میں) ان لوگوں سے ملو جنھوں نے کفر کیا تو گردنیں مارنی ہیں حتی کہ جب انھیں اچھی طرح قتل کر چکو تو (قیدیوں کو) بیڑیوں میں مضبوطی سے باندھ لو، پھر اس کے بعد یا تو احسان کرنا ہے یا فدیہ (تاوان) لینا ہے حتی کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔''[1]

ان قیدیوں کا فدیہ مختلف تھا، چنانچہ مالدار سے چار ہزار درہم لیے گئے۔ اُن میں ابو وَداعہ بھی شامل تھا۔[2] حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ایک سو اوقیے اور عقیل بن ابی طالب سے اسی اوقیے وصول کیے گئے۔ عقیل کا فدیہ بھی حضرت عباس نے دیا۔ دوسرے لوگوں سے صرف چالیس چالیس اوقیے وصول کیے گئے۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کے بیٹے عمرو کو اس شرط پر چھوڑ دیا کہ وہ حضرت سعد بن

[1] محمد 4:47. [2] مجمع الزوائد: 90/6. ہیثمی کا کہنا ہے: ''اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔'' طبرانی اس روایت کو ابو وداعہ کے واقعے کے ضمن میں لائے ہیں۔ ابو وداعہ کا تاوان چار ہزار درہم اس کے بیٹے نے بھرا۔ ابن ہشام نے سیرت پر کیے گئے اپنے اضافات میں بغیر سند کے لکھا: ''اس دن مشرکین کا تاوان فی کس ایک ہزار سے چار ہزار درہم تک تھا۔ سوائے ان افراد کے جن کے پاس کچھ نہ ہوتا، ان پر رسول اللہ ﷺ نے احسان کیا۔'' اس روایت کے الفاظ کو معمولی ردّوبدل کے ساتھ عبدالرزاق اور ابوداود نے بھی درج کیا ہے، دیکھیے: (المصنف لعبد الرزاق: 206/5، وسنن أبي داود، الجهاد، باب في فداء الأسير بالمال، حديث:2691) اس کی سند میں ابوعنبس مقبول درجے کا راوی ہے، دیکھیے: (تقريب التهذيب، ص: 662) طبرانی بھی اسے ایسی روایت میں لائے ہیں جس کی سند کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ اس روایت میں محل شاہد یہ الفاظ ہیں: ''مشرکین میں سے ہر آدمی کا تاوان چار ہزار تھا۔'' دیکھیے: (المعجم الكبير: 407,406/11) یوں یہ حدیث حسن درجے کی ہے جیسے کہ سیرت ابن ہشام کے محققین نے بتایا، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 371/2) [3] دلائل النبوة لأبي نُعيم: 477,476/2. ابن حجر کی تحقیق کے مطابق یہ سند حسن ہے۔

نعمان بن اُکال کو چھوڑ دیں جنھیں ابوسفیان نے عمرہ کرتے ہوئے گرفتار کر لیا تھا۔ [1]

جن قیدیوں کے پاس تاوان بھرنے کی گنجائش نہیں تھی مگر وہ پڑھنا لکھنا جانتے تھے ان کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ مسند احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بدر کے قیدیوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو فدیہ دینے کی گنجائش نہیں رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا فدیہ یہ مقرر فرمایا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ ایک دن ایک بچہ روتا ہوا اپنے باپ کے پاس آیا۔ باپ نے پوچھا: ''تجھے کیا ہوا؟'' بچہ کہنے لگا: ''مجھے میرے استاد (قیدی) نے مارا ہے۔'' باپ کہنے لگا: ''وہ خبیث بدر کے بدلے لیتا ہے! اللہ کی قسم! تو کبھی اُس کے پاس نہیں جائے گا۔'' [2]

اگر کوئی قیدی مقررہ رقم نہ دے سکتا تو وہ جو دے سکتا وہی لے لیا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر ابوالعاص بن ربیع کے فدیے میں اپنا ہار بھیجا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ ہار واپس کر دیا اور ابوالعاص بن ربیع کو بغیر فدیہ رہا کر دیا۔ [3] جو لوگ کسی قسم کا فدیہ نہ دے سکے انھیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی نہ کسی طریقے سے رہا کر دیا۔ ان میں مطلب بن حنطب مخزومی، صیفی بن ابی رفاعہ اور ابوعزّہ شاعر شامل تھے۔ [4]

---

[1] ابن اسحاق کی یہ روایت منقطع سند سے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام:358,357/2)

[2] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 47/4، حديث: 2216. احمد شاکر نے کہا: ''اس روایت کی سند صحیح ہے۔'' اس کی سند میں علی بن عاصم بن صہیب واسطی ہے۔ یہ امام احمد کا استاذ ہے۔ یہ صدوق (نہایت سچا) تو ہے لیکن غلطی کرتا ہے، پھر اس پر ڈٹ جاتا ہے۔ محدث شاکر نے اس امر کو ترجیح دی کہ وہ ثقہ ہے، دیکھیے: (مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 303/1) علاوہ ازیں اس سند میں داود بن ابی ہند ہے جسے آخر عمر میں وہم ہو جاتا تھا۔ [3] الفتح الرباني: 100/14. ساعاتی نے کہا: ''اس روایت کی سند صحیح ہے۔'' والسيرة النبوية لابن هشام: 359/2. [4] السيرة النبوية لابن هشام: 269,268/2.

بہت ممکن تھا کہ سب قیدی بغیر کسی فدیے یا معاوضے کے چھوڑ دیے جاتے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور مجھ سے ان بدبودار لوگوں کے متعلق بات کرتے تو میں اُن کے لیے انھیں چھوڑ دیتا۔''[1]

دراصل مطعم کے رسول اللہ ﷺ پر احسانات تھے۔ جب آپ طائف سے واپس تشریف لائے تھے تو مطعم بن عدی ہی کی پناہ اور حفاظت میں مکہ میں داخل ہوئے تھے۔ اسی طرح بائیکاٹ کی قرارداد چاک کرنے میں بھی انھوں نے سرگرم کردار ادا کیا تھا۔

جب کچھ انصار نے حضرت عباس کو فدیہ لیے بغیر چھوڑ دینے کی اجازت چاہی تو نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! تم ایک درہم بھی نہیں چھوڑ سکتے۔''[2] اگرچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بتا دیا تھا کہ میں تو مسلمان ہوں۔ مجھے زبردستی میدانِ جنگ میں لایا گیا تھا۔[3] جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ قید میں تھے تو رسول اللہ ﷺ نے اُن کو بتا دیا تھا کہ تمھاری بیوی ام الفضل اور تم نے اپنے دروازے کی دہلیز کے نیچے بہت سا مال دفن کیا تھا (لہٰذا اُس سے فدیہ ادا کرو)۔ حضرت عباس نے یہ بات تسلیم کی تھی۔[4]

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب: 12، حديث: 4024. [2] صحيح البخاري، المغازي، باب: 12، حديث: 4018. [3] تفسير الطبري (تحقيق أحمد شاكر): 73/14. اس کی سند کو دکتور اکرم ضیاء عمری نے حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (المجتمع المدني، ص: 55) ابن حجر کا کہنا ہے: ''ابن اسحاق نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت بیان کی ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: ''اے عباس! اپنا فدیہ دو۔'' عباس رضی اللہ عنہ بولے: ''میں تو مسلمان تھا لیکن قوم مجھے زبردستی کھینچ لائی۔'' دیکھیے: (فتح الباري: 192/15) ابن اسحاق نے عباس رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کا ذکر کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 352,351/2) روایت کی سند متصل ہے اور ابن اسحاق نے صراحت سے بتایا بھی ہے کہ انھوں نے یہ روایت سنی ہے لیکن اس میں حسین بن عبداللہ ہے جس پر تنقید کی گئی ہے۔ [4] مسند أحمد: 353/1: احمد شاکر نے اس روایت کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے، دیکھیے: (مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 106/5، حديث: 3310). سيد الجليمي نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (سيرة الرسول ﷺ، ص: 163,162) انھوں نے اس کی مختلف سندیں درج کرنے کے بعد لکھا: ''یہ سندیں ◄◄

مدینہ منورہ واپس آتے ہوئے نضر بن حارث کو ''صفراء'' کے علاقے میں قتل کر دیا گیا۔ اُسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا۔ عقبہ بن ابی معیط کو ''عرق الظبیہ'' کے علاقے میں قتل کیا گیا۔ اُسے حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے قتل کیا۔[1] ایک قول کے مطابق اُسے بھی حضرت علی ہی نے قتل کیا۔[2] اتنے قیدیوں میں سے ان دو کے ساتھ اس سلوک کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے سخت دشمن تھے۔ جھوٹی بہادری اور مصنوعی شجاعت کی انتہا دیکھیے کہ جب عقبہ کو قتل کیا جانے لگا تو یہ یہودی الاصل شخص، جو قریش کا دُم چھلا تھا، گڑگڑانے لگا اور آپ ﷺ سے رحم و معافی کی درخواست کرتے ہوئے کہنے لگا: ''اے محمد! میرے بچوں کو کون سنبھالے گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلنَّارُ» ''آگ۔''[3]

طبرانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے طُعَیمہ بن

« ایک دوسری کی تقویت کا باعث ہیں اوران کے ذریعے سے یہ حدیث پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔'' مسند أحمد کے محقق نے اس حدیث کے حوالے درج کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ حدیث حسن درجے کی ہے، دیکھیے: (الموسوعة الحديثية: 335,334/5) [1] السيرة النبوية لابن هشام: 347/2. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 347/2. سند منقطع ہے۔ روایت ہے کہ سورۂ فرقان کی آیات: ''اور جس دن ظالم اپنے دونوں ہاتھ دانتوں سے کاٹے گا، کہے گا: اے کاش! میں رسول کے ساتھ راہ اختیار کرتا۔ ہائے میری بربادی! کاش میں فلاں (شخص) کو دلی دوست نہ بناتا۔'' (الفرقان 28,27:25) اسی کے بارے میں نازل ہوئیں۔ ابن جریر طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بیان کیا کہ ابی بن خلف نبیِ کریم ﷺ کے ہاں آیا کرتا تھا۔ عقبہ بن ابی معیط نے اسے ڈانٹ پلائی۔ اس پر یہ آیت آخر تک نازل ہوئی: ﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ......﴾ ''اور جس دن ظالم اپنے ہاتھ دانتوں سے کاٹے گا......'' ابن عباس رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے کہ یہاں ظالم سے مراد عقبہ بن ابی معیط ہے اور ﴿فُلَانًا خَلِيلًا﴾ سے مراد ابی بن خلف ہے۔ یہاں ابن کثیر نے کہا: ''خواہ یہ آیت عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں اتری ہو یا کسی اور کے بارے میں، اس کے حکم میں ہر ظالم شامل ہے۔'' دیکھیے: (تفسير ابن كثير: 116/6) [3] المعجم الكبير للطبراني: 407,406/11، حديث: 12154، والروض الأنف للسهيلي: 53/3. سہیلی نے بتایا کہ عقبہ کا تعلق یہود کی صفوری نسل سے تھا۔

عدی کو بھی اسی طرح باندھ کر قتل کرا دیا تھا (کہ یہ بھی انھی جیسا تھا)۔ ابن زنجویہ نے بھی یہ بات اپنی کتاب الأموال میں بیان کی ہے۔ [1]

باقی قیدیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے حسنِ سلوک کا حکم دیا۔ [2] حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا سگا بھائی ابوعزیز بھی قیدیوں میں شامل اور انصار کی تحویل میں تھا۔ وہ بیان کرتا ہے: ''مجھے گرفتار کرنے والے جب صبح اور شام کا کھانا کھاتے تو مجھے روٹی کھلاتے اور خود کھجوروں پر گزارہ کر لیتے (مدینہ منورہ میں روٹی بہت مہنگی تھی۔ کھجوریں سادہ خوراک تھی۔) یہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی بنا پر تھا۔ جس کے ہاتھ بھی روٹی آتی وہ مجھے لا کر دے دیتا۔ مجھے اکیلے کھاتے ہوئے شرم آتی تو میں وہ روٹی اُسے واپس کر دیتا مگر وہ اُسے ہاتھ بھی نہ لگاتا اور مجھے زبردستی دے دیتا۔'' [3]

ان قیدیوں میں سے اکثر فتح مکہ سے قبل اور بعد، مختلف اوقات میں مسلمان ہوگئے۔ اُن میں سے چند یہ ہیں: عباس، عقیل بن ابی طالب، نوفل بن حارث بن عبدالمطلب، خالد بن ہشام، عبداللہ بن سائب، مطلب بن حنطب بن حارث، ابووداعہ حارث بن صبیرہ، حجاج بن حارث بن قیس، عبداللہ بن ابی ابن خلف، وہب بن عمیر، سہیل بن عمرو،

[1] سبل الهدٰى والرشاد: 97/4، والأموال لابن زنجويه: 341/1. ابن زنجویہ کی سند صحیح ہے جو سعید بن جبیر تک پہنچتی ہے۔ کتاب الاموال کی تحقیق دکتور شاکر فیاض نے کی ہے۔ فاضل محقق کے مطابق اس سند کے رجال ثقہ ہیں۔ ان کی سند متصل ہے جو سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ کتاب المغازی کی تحقیق عبدالعزیز عمری نے کی ہے۔ عمری کے مطابق اس روایت کی تائید میں دیگر روایات بھی ملتی ہیں، دیکھیے: (المغازي لابن أبي شيبة، ص: 197، حديث: 159) ابو داود نے اس روایت کو المراسیل میں نقل کیا ہے۔ دکتور شاکر کے مطابق ان کی روایات کے الفاظ ابن زنجویہ کی روایت کے مانند ہیں۔ دکتور شاکر کا کہنا ہے کہ ابوعبید نے اپنی کتاب الأموال (ص: 171) میں اس روایت کو اسی سند کے ساتھ اختصار سے نقل کیا ہے۔ [2] مجمع الزوائد: 86/6. [3] ابن اسحاق کی یہ روایت منقطع سند سے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 350,349/2)

عبد بن زمعہ، قیس بن سائب اور نسطاس مولیٰ امیہ بن خلف۔ [1] یہاں سہیل بن عمرو کا ایک واقعہ ہے۔ ابن ابی شیبہ میں حضرت عطاء سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: ''سہیل بن عمرو کا نچلا ہونٹ پیدائشی طور پر کٹا ہوا تھا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے: ''اللہ کے رسول! اس کے نچلے سامنے کے دو دانت نکلوا دیجیے۔ اس طرح بات کرتے وقت اس کی زبان باہر نکل آیا کرے گی اور یہ کسی جگہ آپ کے خلاف تقریر نہیں کر سکے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں مثلہ نہیں کروں گا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ میرا بھی مثلہ کرے گا۔'' [2]

ابن اسحاق کی روایت میں یہ لفظ بھی ہیں: «وَإِنْ كُنْتُ نَبِيًّا» ''اگرچہ میں نبی ہوں۔'' ابن اسحاق نے کہا: مجھے یہ بات بھی پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ''ہوسکتا ہے کہ یہ ایک ایسے مقام و مرتبہ پر پہنچ جائے جو آپ کو برا نہ لگے گا۔'' [3]

شامی کہتے ہیں: ''امام حاکم اور بیہقی نے محمد بن حنفیہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«دَعْهُ، فَلَعَلَّهُ أَنْ يَسُرَّكَ يَوْمًا» ''رہنے دو، ہوسکتا ہے یہ کسی دن تمھیں خوش کرے۔'' [4]

راویِ حدیث حضرت سفیان بن عیینہ کا کہنا ہے: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے تو مکہ والے بد دل سے ہوئے تو یہ سہیل بن عمرو کعبہ کے پاس کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ''جو شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معبود سمجھتا تھا تو وہ سن لے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں۔

[1] الروض الأنف: 125/3، وعيون الأثر: 387/1. مذکورہ بالا اصحاب کے احوال الإصابة، الاستيعاب اور أسد الغابة وغیرہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ [2] المغازي لابن أبي شيبة، ص: 217، حديث: 206. سند متصل ہے اور راوی ثقہ ہیں لیکن یہ سند عروہ پر موقوف ہونے کی وجہ سے مرسل ہے۔ [3] السيرة النبوية لابن هشام: 355/2. اس کی سند مرسل و متصل ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ محققین کے مطابق یہ روایت ضعیف ہے۔ [4] سبل الهدى والرشاد: 405/10.

لیکن اگر اللہ تعالیٰ معبود ہے تو پھر یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لیے زندہ ہے، وہ کبھی فوت نہیں ہوگا۔''[1]

شامی نے بیان کیا ہے کہ ابن سعد نے اپنی سند سے ابوعمرو بن عدی بن حمراء خُزاعی کا قول نقل کیا کہ جس دن نبیِ کریم ﷺ کی وفات کی خبر مکہ مکرمہ پہنچی تو میں نے دیکھا کہ حضرت سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے بعینہ وہی خطبہ دیا جو آپ کی وفات کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ انھوں نے وہ خطبہ سنا ہوا ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس خطبے کی اطلاع پہنچی تو انھوں نے کہا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور آپ جو کچھ لے کر آئے وہ حق ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اشارہ فرمایا تھا کہ امید ہے یہ ایک مرتبے پر پہنچ جائے گا جسے تم ناپسند نہیں کروگے۔''[2]

بدر کا واقعہ اسلام کی شان میں اضافے کا باعث بنا۔ اسی لیے قرآن میں اسے ''یوم الفرقان'' کہا گیا ہے۔ احادیث میں بھی بدر والوں کی فضیلت اور جنت میں اُن کے بلند مقام کا ذکر واضح طور پر آیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بدر میں حصہ لینے والوں کی فضیلت کے بارے میں ایک باب قائم کیا ہے جس میں حضرت حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ انھیں اس جنگ میں ایک اندھا تیر آلگا تھا جس سے وہ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے۔ وہ ابھی لڑکے تھے۔ اُن کی والدہ آپ ﷺ کے پاس آئیں اور اُن کے انجام اور ٹھکانے کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اُنھیں خوشخبری دی کہ بلاشبہ

---

[1] الخصائص الکبریٰ: 128/2، والمستدرك للحاكم: 282/3. حاکم اور ذہبی دونوں نے اس کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے۔ اس سند میں انقطاع ہے۔ ابن ہشام بھی یہی روایت ایک اور مرسل سند سے لائے ہیں۔ اس میں بھی انقطاع ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 56/3) [2] سبل الهدیٰ والرشاد: 406/10.

وہاں کئی جنتیں ہیں اور تمھارا بیٹا جنت الفردوس میں گیا ہے۔ [1]

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کا واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ انھوں نے قریش کو خفیہ طور پر پیغام بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ مکہ فتح کرنے آرہے ہیں۔ وحی نے یہ راز فاش کر دیا۔ لیکن رسولِ اکرم ﷺ نے انھیں معاف کر دیا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں قتل کرنے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

«لَعَلَّ اللّٰهَ اطَّلَعَ عَلٰى أَهْلِ بَدْرٍ، فَقَالَ: اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ، فَقَدْ وَجَبَتْ لَكُمُ الْجَنَّةُ، أَوْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ»

''عمر! تجھے کیا علم؟ شاید اللہ تعالیٰ نے بدر والوں کو عرش پر سے جھانک کر کہہ دیا ہو: جو چاہو کرو، تمھارے لیے جنت واجب ہو چکی یا میں تمھیں معاف کر چکا ہوں۔'' [2]

جب حاطب کے ایک غلام نے کہا: ''اللہ کے رسول! حاطب ضرور آگ میں جائے گا۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«كَذَبْتَ، لَا يَدْخُلُهَا، فَإِنَّهُ شَهِدَ بَدْرًا وَّالْحُدَيْبِيَةَ»

''تو جھوٹ بولتا ہے۔ وہ کبھی آگ میں نہیں جائے گا کیونکہ وہ بدر اور حدیبیہ میں شریک ہوا ہے۔'' [3]

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب فضل من شهد بدرًا، حديث: 3982. [2] صحيح البخاري، المغازي، باب فضل من شهد بدراً، حديث: 3983. [3] صحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل حاطب بن أبي بلتعة......، حديث: 2495، وشرح النووي على صحيح مسلم: 55/16. نووی نے زکاۃ کی ادائیگی کے معاملے میں ثعلبہ کے ٹال مٹول کرنے کا واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ باوزیر نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس واقعے میں ثعلبہ سے مراد ثعلبہ بن ابی حاطب ہے نہ کہ ثعلبہ بن حاطب بدری۔ علاوہ ازیں اس واقعے کی سند دراصل ضعیف ہے اور دلیل بنائے جانے کے قابل نہیں۔ اس سلسلے میں مزید تفاصیل عذاب محمود حمش کے ہاں ان کی کتاب ثعلبة بن حاطب الصحابي المفترٰى عليه، ص: 76 میں ملاحظہ کیجیے۔

جنگ بدر کا مدینہ منورہ اور جزیرۂ عرب کے دوسرے شہروں اور صحراؤں کی سیاست پر گہرا اثر پڑا۔ اس کے نتیجے میں مسلمان مدینہ کے یہودیوں اور باقی مشرکین پر مکمل طور پر غالب آ گئے۔ یہودی بے یار و مددگار رہ گئے۔ اس جھنجھلاہٹ میں انھوں نے مسلمانوں سے علانیہ دشمنی شروع کر دی جس کے نتیجے میں بنوقینقاع کو مدینہ سے جلاوطن ہونا پڑا۔ اس کا مفصل تذکرہ آگے آئے گا۔ جس شخص کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا وہ مسلمان ہوگیا اور جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخصوص مصلحت کے تحت گمراہ کر دیا وہ منافق ہوگیا۔ ان منافقین کا قائد عبداللہ بن ابی تھا جسے ابن سلول بھی کہا جاتا تھا۔ اُس نے بدر کی فتح کے بعد کہا: ''اب یہ دین نمایاں ہوگیا ہے۔''[1]

مدینہ کے یہودی علماء میں سے مشہور منافقین یہ تھے: زید بن اللّصیت، رافع بن حریملہ، رفاعہ بن زید بن تابوت، سوید بن حارث، سعد بن حنیف، نعمان بن اوفی بن عمرو، اس کا بھائی عثمان بن اوفی، سلسلہ بن برہام اور کنانہ بن صوریا۔

مشرکین مدینہ میں سے عبداللہ بن ابی کے علاوہ معروف منافقین یہ تھے: زوی بن حارث، جلاس بن سوید، اس کا بھائی حارث بن سوید، نبتل بن حارث، مربع بن قیظی اور اس کا بھائی اوس بن قیظی، حاطب بن امیہ بن رافع، بشیر بن اُبیرق ابوطعمہ اور قزمان۔

ان میں سے کچھ مسلمان بھی ہوگئے اور خوب چمکے اور دوسرے نفاق ہی پر فوت ہوئے۔ اُن میں سے کئی ایک کے واقعات اور اسلام کے متعلق اُن کے نظریات سیرت کے واقعات کے تحت آئیں گے۔[2]

[1] صحیح البخاري، التفسیر، سورة آل عمران، باب: 15، حدیث: 4566. عبداللہ بن ابی کی منافقت اور اسلام دشمنی کے متعلق بخاری کی اس روایت کے علاوہ ابن اسحاق کی روایت ملاحظہ کیجیے جس کی سند حسن ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 270,269/2) [2] هذا الحبیب محمد ﷺ لجابر الجزائري، ص: 189-194.

احکام و اسباق

غزوۂ بدر کے واقعات سے بہت سے احکام و اسباق ثابت ہوتے ہیں۔ چند اہم یہ ہیں:

* دشمن کے آدمی قتل کر کے، اُن کے مال چھین کر اور اُن کے تجارتی راستوں کو خطرناک بنا کر دشمن کو سزا دی جا سکتی ہے کیونکہ اس طرح وہ اقتصادی اور اندرونی طور پر کمزور ہوں گے۔
* دشمن کے حالات سے خبردار رہنے اور اُس کے منصوبے ناکام بنانے کے لیے جاسوسی کا نظام قائم کرنا جائز ہے۔
* اہل حل وعقد (ذمہ داران) حضرات اور عوام الناس کی ایک شوریٰ ہونی چاہیے جس کی وساطت سے اہم فیصلے کیے جائیں۔ شوریٰ کی حجیت و اہمیت کے بارے میں قرآن مجید، احادیث نبوی اور خلفائے راشدینؓ کے طرزِ عمل سے بہت سے دلائل حاصل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے قرآنی دلائل کو لیجیے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ ''اور معاملات میں ان سے مشورہ لیا کرو۔''[1]

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾

''اور وہ لوگ جو اپنے رب کا حکم مانتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور اُن کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں اور ہمارے دیے ہوئے مال سے خرچ کرتے ہیں۔''[2]

احادیث میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ غزوۂ احد میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے

[1] آل عمرٰن 3:159۔ یہ آیت غزوۂ احد کے بعد نازل ہوئی۔ [2] الشوریٰ 42:38.

ساتھیوں سے مشورہ کیا تھا کہ جنگ کے لیے مدینہ سے باہر نکلنا چاہیے یا شہر ہی میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ غزوۂ خندق کے دن بعض قبائل کے ساتھ مدینہ کے ایک تہائی پھل کے عوض صلح کرنے کے متعلق بھی آپ ﷺ نے مشورہ کیا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کسی کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے والا نہیں پایا۔ [1]

خلفائے راشدین کے طرزِ عمل سے شوریٰ کی اہمیت و حجیت کے ثبوت کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد کافی ہے کہ حکمران منتخب کرتے وقت مشورہ کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے فرمایا: ''جو شخص مسلمانوں کے مشورے اور فیصلے کے بغیر لوگوں کو اپنی حکومت کی طرف دعوت دے یا کسی اور کی حکومت کی طرف تو تم پر لازم ہے کہ اسے قتل کر دو۔'' نیز انھوں نے فرمایا: ''جو شخص مسلمانوں کے اجتماعی مشورے اور فیصلے کے بغیر کسی شخص کی بیعت کرے تو ایسی بیعت اور ایسے امیر کی کوئی حیثیت نہیں۔'' [2]

* امیر کی اجازت سے دُوبدُو لڑائی جائز ہے۔ یہ اکثر اہل علم کا قول ہے۔ [3]
* حضرت سواد رضی اللہ عنہ کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ اور صلح میں ایک عام فوجی اور کمانڈر برابر ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے سواد کے سامنے اپنا بطن مبارک ننگا کر دیا تھا تاکہ وہ بدلہ لے سکے۔ آپ کے بعد خلفائے راشدین ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل بھی یہی رہا ہے۔

[1] جامع الترمذي، الجهاد، باب ماجاء في المشورة، حديث: 1714. اس کی سند پر کچھ تنقید کی گئی ہے، تاہم اس کا مضمون بالکل درست اور نبی ﷺ سے ثابت ہے۔ [2] ان اقوال کو عبدالرزاق نے صحیح سندوں سے روایت کیا ہے۔ فاضل محقق نے اشارہ کیا ہے کہ بخاری نے اس قول کو رجمِ حبلی کے باب میں دو سندوں سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (المصنَّف لعبد الرزاق: 445/5) [3] المغني لابن قدامة: 367/8.

جنگی قیدیوں سے فدیہ بھی لیا جا سکتا ہے اور بلا معاوضہ بھی چھوڑا جا سکتا ہے۔

* امام تک پہنچنے سے پہلے پہلے کسی قیدی کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ حضرت بلال اور انصار رضی اللہ عنہم نے امیہ بن خلف کو قتل کر دیا تھا، حالانکہ وہ اُس وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے ہاتھوں قید ہو چکا تھا۔
* امت مسلمہ کے لیے غنیمت حلال ہے۔ خمس لینے کے بعد اُسے مجاہدین میں تقسیم کیا جائے گا۔
* مقتول کافر کا ساز و سامان قاتل مجاہد ہی کو ملے گا بشرطیکہ مقتول مقاتلین میں سے ہو اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جنھیں قتل کرنے کی ممانعت ہے، مثلاً: عورتیں، بچے اور بہت بوڑھے وغیرہ، نیز اُس نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالا ہو، مقتول کو اکیلے قتل کیا ہو، اسی طرح یہ بھی شرط ہے کہ مقتول سخت زخمی حالت میں نہ ہو، بلکہ اپنے اعضا سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہو۔ اگر مجاہدین کی صف میں کھڑے کھڑے تیر مار کر قتل کیا ہو تو سلب قاتل کو نہیں ملے گا۔ اگر وہ اُسے ایسا کاری زخم لگا دے جو اُس کے قتل کا سبب بن جائے تب ہی وہ سلب کا حقدار ہوگا۔
* قیدیوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلوک سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے میں اجتہاد کا حق تھا۔ جمہور علمائے اصول اور فقہاء نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجتہاد کا حق حاصل تھا تو اجتہاد میں غلطی کا بھی امکان تھا، البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غلطی پر برقرار نہیں رہ سکتے تھے۔ کوئی نہ کوئی آیت نازل ہوتی اور غلطی کی تصحیح ہو جاتی تھی۔ اگر کوئی آیت نہ اترتی تو یہ اس حقیقت کی دلیل ہوتی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد درست ہے۔
* اصل حکم یہی ہے کہ سب مسلمان جنگی تیاری اور دشمن سے مقابلے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ﴾

''جہاں تک طاقت ہو ان (کافروں) کے لیے اسلحہ اور گھوڑے تیار رکھو۔''[1]

اس کے بعد اگر اللہ تعالیٰ مدد کا اہل سمجھے گا تو معجزات و کرامات کی صورت میں اُن کی مدد فرمائے گا۔ جس طرح جنگ بدر میں فرشتوں کی مدد آئی، مسلمانوں پر اونگھ طاری کی گئی اور عین موقع پر بارش برسائی گئی تھی۔

* اللہ تعالیٰ نے مومنین کو ایک نہایت اہم اصول کی طرف توجہ دلائی ہے کہ حالات و واقعات کیسے ہی ہوں، وہ اہم امور جن کی بنیاد صرف دینی نقطۂ نظر پر ہو، ان میں فیصلے کرتے وقت ان پر دنیاوی مال کی محبت غالب نہ ہو، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انھیں فقر و حاجت کے باوجود غنیمتیں دکھا کر اور قیدیوں کے مسئلے کے حوالے سے ان کی خوب تربیت فرمائی۔ جیسا کہ سابقہ مذکورہ آیات سے ظاہر ہے۔
* قیامت کے دن تمام بدری اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت سے فیض یاب ہوں گے، البتہ دنیوی احکام میں اُن پر گرفت ہو سکتی ہے اور اگر وہ کسی حد کا ارتکاب کر بیٹھیں تو انھیں سزا بھی ہو سکتی ہے۔ حضرت قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ کو شراب پینے کی حد لگائی گئی تھی۔
* رسول اللہ ﷺ کی سنتِ مبارک تھی کہ جنگ ختم ہونے کے بعد تین دن تک میدانِ جنگ میں قیام کرتے۔
* شہداء کے بارے میں سنت یہی ہے کہ انھیں اُن کی شہادت گاہوں میں دفن کر دیا جائے جیسا کہ شہدائے بدر اور شہدائے احد کے ساتھ ہوا، نیز اُن کا جنازہ نہ پڑھا جائے۔ شہدائے احد کے بارے میں تو صراحت سے ثابت ہے اور شہدائے بدر کے بارے میں کہیں بھی ذکر نہیں کہ آپ نے اُن کا جنازہ پڑھا ہو۔
* جنگ بدر میں ایمانی جرأت و بہادری کے عظیم مظاہرے ہوئے، مثلاً: روایت ہے کہ

[1] الأنفال 60:8.

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے اپنے والد جراح کو جنگِ بدر میں قتل کر دیا تھا۔ حضرت ابوعبیدہ کا والد بار بار جان بوجھ کر اُن کے سامنے آتا وہ پہلو بچا جاتے تھے۔ مگر آخر کار انھیں قتل کرنا ہی پڑا۔ اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾

"(اے نبی!) آپ (ایسی) کوئی قوم نہیں پائیں گے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں کہ وہ ان سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوں۔"[1]

ابن اسحاق نے ابوعزیز بن عُمیر کی روایت بیان کی ہے کہ انھوں نے کہا: "جب ایک انصاری شخص مجھے باندھ رہا تھا تو میرے پاس سے میرے بھائی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ گزرے۔ وہ مجھے دیکھ کر انصاری کو کہنے لگے: "اس کو مضبوطی سے کس کر باندھو۔ اس کی والدہ خوب مالدار ہے وہ تجھے بہت رقم دے کر اسے چھڑائے گی۔" ابن ہشام نے اس روایت پر اضافہ کیا کہ "جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوالیسر انصاری کو جو اُن کے بھائی کو قید کر رہے تھے، یہ الفاظ کہے تو ابوعزیز کہنے لگے: "بھائی! تو نے خوب میرا حق ادا کیا!" تو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے کہا: "اب تیرے بجائے یہ میرا بھائی ہے (جو تجھے باندھ رہا ہے۔)"[2]

---

[1] المجادلة 58 : 22. الإصابة: 253,252/2، والتلخيص الحبير لابن حجر: 102/3.

[2] السيرة النبوية لابن هشام: 349/2. ابن اسحاق کی سند تو منقطع ہے جبکہ ابن ہشام نے اپنی روایت کی سند ہی بیان نہیں کی۔

باب

8

غزوۂ اُحد تک کے واقعات

- بدر و اُحد کے درمیانی واقعات
- غزوۂ بنو قینقاع
- غزوۂ اُحد
- فقہی احکام، نتائج و حکمتیں

***

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝﴾

''ایمان والوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ سچ کر دکھایا۔ اُن میں سے کچھ اپنی مراد پا گئے (شہید ہو گئے) اور کچھ ابھی انتظار کر رہے ہیں۔ انھوں نے (اپنے عہد میں) ذرا بھر تبدیلی نہیں کی۔''

[الأحزاب 23:33]

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝﴾

''جو اللہ کے راستے میں شہید ہو گئے آپ اُنھیں ہرگز مُردہ نہ سمجھیں بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اُنھیں اپنے ربّ کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔''

[آل عمرٰن 169:3]

بدر و اُحد کے درمیانی واقعات

عصماء بنت مروان کا قتل

عصماء بنت مروان رسول اللہ ﷺ کو ایذا پہنچایا کرتی تھی، اسلام پر طعنے کستی تھی اور کافروں کو نبیِ کریم ﷺ کے خلاف اشعار سنا کر بھڑکایا کرتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی یہ شرارتیں معلوم ہوئیں تو آپ نے فرمایا: ''کیا کوئی شخص ایسا نہیں جو بنت مروان سے میرا بدلہ لے؟''

حضرت عمیر بن عدی رضی اللہ عنہ نے آپ کی یہ بات سن لی۔ وہ بنتِ مروان کے خاوند کی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ رات کو نکلے۔ عصماء کے گھر گئے۔ اُس کے بال بچے اُس کے اردگرد موجود تھے۔ ایک بچے کو وہ دودھ پلا رہی تھی۔ حضرت عمیر نابینا تھے، اس لیے ہاتھ سے ٹٹول کر آگے بڑھے۔ عصماء کا پتہ لگایا، دودھ پیتا بچہ اس کی گود سے الگ کر دیا، پھر عصماء کو قتل کر ڈالا۔ صبح ہوئی تو انھوں نے نمازِ فجر نبیِ کریم ﷺ کے ساتھ ادا کی۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''بنتِ مروان کو قتل کر آئے ہو؟'' کہنے لگے: ''جی ہاں!'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عمیر! تم نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی مدد کی ہے۔''[1]

[1] ابن اسحاق نے یہ حدیث روایت کی ہے۔ سند میں انھوں نے وضاحت سے نہیں بتایا کہ انھوں نے یہ روایت سنی ہے۔ یہ روایت انھوں نے عصماء کے قصۂ قتل کے ضمن میں نقل کی ہے، دیکھیے: ««

عمیر کہنے لگے: ''کیا مجھے اس کی کوئی سزا بھی بھگتنا ہوگی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَنْتَطِحُ فِيهَا عَنْزَانِ»

''اس سلسلے میں کسی کی نکسیر تک نہیں پھوٹے گی۔''[1]

یہ بلیغ جملہ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ سے سنا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن کا نام آنکھوں والا عمیر (عمیر البصیر) رکھ دیا۔ یہ واقعہ بدر سے واپسی کے فوراً بعد، ہجرت کے انیسویں مہینے، 25 رمضان کو پیش آیا۔ اُس دن حضرت عمیر کی قوم بنوخطمہ کے بہت سے لوگ اسلام کی عزت و عظمت دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔ مزید برآں اس قبیلے کے وہ لوگ جو اپنے اسلام کو چھپائے بیٹھے تھے اب اپنے اسلام کا اظہار کرنے لگے۔[2]

کُدُر کے مقام پر غزوۂ بنوسلیم و غطفان

رسول اللہ ﷺ کو بدر سے مدینہ منورہ واپس تشریف لائے ابھی سات دن ہی گزرے تھے کہ آپ کو پتہ چلا کہ کُدُر کے مقام پر بنوسُلَیم اور غطفان کے بہت سے لوگ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔[3] رسول اللہ ﷺ بذاتِ خود بنوسُلَیم کی طرف چل پڑے۔ یہ شوال 2 ہجری کی بات ہے۔ آپ اُن کے کنویں ''کُدُر'' پر پہنچے تو وہ لوگ بھاگ گئے، اس لیے کوئی لڑائی نہ ہوئی۔[4] آپ وہاں تین دن ٹھہر کر واپس مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔

« (السيرة النبوية لابن هشام: 379/4) یوں یہ روایت ضعیف ہے۔ تاہم ابو داود کی صحیح روایت کی بدولت تقویت حاصل کرتی ہے۔ [1] السيرة النبوية لابن هشام: 379/4، والمعجم الكبير للطبراني: 351/11. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 477/4-479. ابن اسحاق کی روایت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عصماء کو ابوعفک کے بعد قتل کیا گیا، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 172/1، والطبقات الكبرٰى: 27/2) واقعہ بلاسند ہے۔ [3] المغازي للواقدي: 183,182/1، والطبقات الكبرٰى: 31/2. بلاسند ہے۔ [4] السيرة النبوية لابن هشام: 64/3. بلاسند ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کی سازش

عمیر بن وہب کے دل میں اپنے بیٹے وہب کے قید ہونے کا صدمہ انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اُدھر صفوان بن اُمیہ کا بھی یہی حال تھا کیونکہ اُس کا باپ اور بھائی بھی جنگ بدر میں مارے گئے تھے۔ عمیر بن وہب نے خفیہ طور پر صفوان سے رابطہ کیا کہ اگر مجھے اپنے ذمے قرضے کا احساس اور بال بچوں کے بھوکوں مرنے کا خطرہ نہ ہو تو میں مدینہ جا کر محمد کو قتل کر ڈالوں (معاذ اللہ) صفوان پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا: کہنے لگا: ''ہاں ہاں! یہ کام فوراً انجام دے۔ اگر اس کام کے دوران تو مارا گیا تو یقین رکھ میں تیرا قرضہ بھی چکاؤں گا اور تیرے بال بچوں کی بھی بھرپور کفالت کروں گا۔ بس تو فوراً چلا جا اور محمد (ﷺ) کو ٹھکانے لگا دے، البتہ یہ بات راز میں رکھنا۔''

جب وہ مدینہ پہنچا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُسے دیکھ لیا۔ انھیں خطرے کی بو محسوس ہوئی۔ اُسے اسی وقت پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بات چیت شروع ہوئی۔ آپ نے دریافت فرمایا: ''سچ سچ بتا دو، کس لیے آئے ہو؟'' وہ کہنے لگا: ''میں اپنے بیٹے وہب کے فدیے کے سلسلے میں آیا ہوں۔'' وہ اپنے جھوٹ پر مصر رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے معاً صفوان بن اُمیہ اور اُس کے مابین ہونے والی پوری بات چیت بیان کر دی۔ اُسے بڑا تعجب ہوا کہ ہم نے تو یہ سازش مکہ میں کی تھی اور نہایت رازداری کے ساتھ خفیہ طور پر کی تھی۔

حضرت محمد ﷺ کو مدینہ میں بیٹھے بیٹھے اس سازش کا علم کس طرح ہو گیا؟ بس پھر کیا تھا؟ دل کی دنیا بدل گئی اور وہ مسلمان ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: ''اسے دین سکھاؤ اور اس کا قیدی بھی چھوڑ دو۔'' آپ نے اُسے مکہ جانے کی اجازت دے دی تا کہ وہ اسی جوش و جذبے سے اسلام کی دعوت دے جس سے وہ کفر کی دعوت دیا کرتا

تھا، پھر اُس کے ہاتھوں بہت سے لوگ مسلمان ہوئے۔ [1]

ابوعَفک کا قتل

رسول اللہ ﷺ نے حارث بن سوید بن صامت کو قتل کرایا تو بنوعمرو بن عوف کے ابوعفک کا نفاق ظاہر ہوگیا۔ اُس نے اس کے بارے میں مخالفانہ اشعار کہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ لِّي بِهٰذَا الْخَبِيثِ؟»

''کون ہے جو میری خاطر اس خبیث کا کام تمام کر دے؟''

حضرت سالم بن عمیر رضی اللہ عنہ اٹھے اور جا کر اُسے قتل کر آئے۔ یہ واقعہ ہجرت کے بیسویں ماہ شوال میں پیش آیا۔ [2]

[1] اس سازش کا قصہ ابن اسحاق نے مرسل سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 371/2-374) ابن حجر نے کہا: ''اسے موسیٰ بن عقبہ نے اپنی کتاب المغازي میں، اسود نے عروہ سے اورابن مندہ نے روایت کیا ہے۔ اسود کی سند مرسل اورابن مندہ کی متصل ہے۔ ابن مندہ کا کہنا ہے کہ یہ روایت غریب ہے، ہم اسے ابن عمران کے حوالے سے صرف اسی سند سے جانتے ہیں۔'' دیکھیے: (الإصابة: 37/3) طبرانی نے بھی اسے روایت کیا اور کہا: ''میں اسے صرف انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے حوالے سے جانتا ہوں۔'' ابن عقبہ اوراسود کی روایات بیہقی کی کتاب میں ہیں، دیکھیے: (دلائل النبوة: 147/3-149) [2] یہ ابن اسحاق کی معلق روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 376/4، 377) ابن حجر نے بھی اسے اسی طرح معلّق سند سے نقل کیا ہے، دیکھیے: (الإصابة: 238/4) واقدی نے بھی اسے روایت کیا ہے، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 174/1، 175) اس روایت میں یہ بھی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے میدانِ بدر میں فتح پائی تو ابوعَفک نے اپنے حسد کا اظہار کیا۔ ابن سعد نے اس روایت کو بلا سند نقل کیا ہے۔ ابن سعد کی روایت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ابوعَفک یہودی تھا، دیکھیے: (الطبقات الكبرىٰ: 28/2)

غزوۂ بنوقینقاع

یہ غزوہ کس تاریخ کو ہوا؟

اکثر مؤرخین اور سیرت نگار متفق ہیں کہ یہ غزوہ جنگ بدر کے بعد ہوا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔[1] انھوں نے سُنن ابی داود میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے استدلال کیا اور اس روایت کو حسن قرار دیا ہے کیونکہ مغازی ابن اسحاق میں عبادہ بن ولید کی روایت بھی اس کی تائید کرتی ہے۔[2] امام زہری نے اسے شوال 2 ہجری کا واقعہ قرار دیا ہے۔[3] واقدی اور ابن سعد نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ ہفتے کا دن اور ماہِ شوال کا نصف تھا۔[4]

غزوے کے اسباب

مؤرخین نے اس غزوے کے دو اسباب بتائے ہیں۔ پہلا سبب یہ تھا کہ جب مسلمانوں کو بدر کے میدان میں عظیم الشان فتح نصیب ہوئی تو یہودیوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور انھوں نے حسد اور بغض کے مارے مسلمانوں کے خلاف اپنے خبث باطن کا علانیہ اظہار شروع کر دیا۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے بازار میں گئے اور انھیں اکٹھا کر کے ارشاد فرمایا:

[1] فتح الباري: 204/15. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 72,71/3. سند مرسل ہے۔ [3] تاريخ الطبري: 2/4709-80. سند مرسل ہے۔ [4] المغازي للواقدي: 1/ 176، والطبقات الكبرٰى: 29,28/2. روایت بلاسند ہے۔ روایات کی چھان بین کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ تمام روایات ضعیف ہیں، تاہم دکتور سندھی کے مطابق یہ روایات ایک دوسری کی تقویت کا باعث بن کر حسن لغیرہ کے درجے تک جا پہنچتی ہیں، دیکھیے: (مرويات تاريخ يهود المدينة في عهد النبوة، ص: 83)

«يَا مَعْشَرَ يَهُودَ! أَسْلِمُوا قَبْلَ أَنْ يُّصِيبَكُمْ مِّثْلُ مَا أَصَابَ قُرَيْشًا»

''یہودی ساتھیو! مسلمان ہو جاؤ تاکہ تم اُس ذلت و رسوائی سے محفوظ رہو جو قریش کو دیکھنی پڑی۔''

وہ کہنے لگے: ''اے محمد! تم اس دھوکے میں نہ رہو کہ تم نے قریش کے کچھ لوگ قتل کر دیے ہیں۔ وہ اناڑی لوگ تھے۔ لڑنا نہیں جانتے تھے۔ اگر تمھارا مقابلہ ہم سے ہوا تو تمھیں دن میں تارے نظر آئیں گے۔ ابھی ہم جیسوں سے تمھارا واسطہ نہیں پڑا۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝﴾

''(اے نبی!) ان لوگوں سے کہہ دیجیے جنھوں نے کفر کیا: عنقریب تم مغلوب کیے جاؤ گے اور تم جہنم کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے اور (وہ) بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ بلاشبہ تمھارے لیے ان دو گروہوں میں ایک بڑی نشانی ہے جو (بدر میں) باہم ٹکرائے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑتا تھا اور دوسرا کافر تھا۔ وہ (مسلمان) انھیں ظاہری آنکھ سے اپنے سے دگنا دیکھتے تھے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی نصرت کے ساتھ مدد دیتا ہے، بلاشبہ اس میں اہل بصیرت کے لیے بڑی عبرت ہے۔''[1]

[1] آل عمرٰن 3:12،13. سنن أبي داود، الخراج، باب كيف كان إخراج اليهود من المدينة، حدیث:3001. اس روایت کی سند میں محمد بن ابی محمد مولیٰ زید بن ثابت ہے جس کے متعلق ابن حجر نے لکھا کہ وہ مجہول ہے، دیکھیے: (تقريب التهذيب، ص: 505) اس کے باوجود خود ابن حجر اور محمد الذہبی نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 204/15، والتفسير والمفسرون: 79/1) سندھی نے تحقیق کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ اس واقعے کی روایات ایک دوسری کی تقویت کا باعث اور »

دوسرا سبب یہ تھا کہ ایک یہودی نے بنو قینقاع کے بازار میں یہ شرارت کی کہ ایک مسلمان عورت کے لباس کے کنارے کو گرہ لگا دی۔ جب وہ عورت اٹھی تو برہنہ ہوگئی۔ اُس نے اپنی مدد کے لیے مسلمانوں کو پکارا۔ وہاں ایک مسلمان موجود تھا۔ اُس نے تلوار اٹھائی اور یہودی کا کام تمام کر دیا۔ باقی یہودی اکٹھے ہو کر مسلمان پر ٹوٹ پڑے اور اسے قتل کر دیا۔ مسلمانوں میں شور و غوغا برپا ہوگیا۔ وہ یہودیوں کے خلاف اکٹھے ہوگئے۔ اس طرح مسلمانوں اور قینقاع کے یہودیوں کے درمیان ٹھن گئی۔ [1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے پہلا سبب بیان کرنے والی ابن اسحاق کی روایت کو حسن قرار دیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہودیوں کو جلاوطن کرنے کا سبب ان کا اسلام قبول کرنے سے انکار کرنا تھا۔ اُس وقت اسلام اُن کے ساتھ صلح صفائی سے رہنے کا قائل تھا اور میثاقِ مدینہ کی رُو سے اُنھیں مدینہ منورہ میں مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ان کی جلاوطنی کا اصل سبب ان کی اسلام دشمنی تھی جس کا وہ علانیہ اظہار کرتے تھے۔ مسلمان عورت کا مندرجہ بالا واقعہ اس کا کھلا ثبوت ہے۔ (اُن کی اس خباثت کی وجہ سے مدینہ منورہ کا داخلی امن تاراج ہوگیا۔) [2]

شاس بن قیس قینقاعی کا واقعہ بھی اُن کے خبث باطن کا ثبوت ہے۔ یہ شخص ایک دفعہ اوسی اور خزرجی صحابہ کرام کی ایک مشترکہ مجلس کے پاس سے گزرا تو اُن کی باہمی محبت و الفت دیکھ کر جل بھن گیا۔ اُسے یہ حقیقت بچشم خود دیکھ کر صدمہ ہوا کہ مسلمان زمانۂ جاہلیت کی باہمی عداوت بھلا کر بھائی بھائی بن چکے ہیں۔ اُس نے ایک یہودی نوجوان کو

◄◄ دلیل بنائے جانے کے قابل ہیں، دیکھیے: (مرویات تاریخ یہود المدینة......، ص: 77) [1] السیرة النبویة لابن ہشام: 70/3. سند ضعیف ہے۔ ومرویات تاریخ یہود المدینة......، ص: 79، والمجتمع المدني للدکتور العمري، ص: 137، و دفاع عن الحدیث النبوي والسیرة للألباني، ص: 27,26. اس روایت پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ [2] المجتمع المدني للدکتور العمري، ص: 138.

اس مجلس میں بھیجا کہ وہ اُن میں بیٹھ کر یومِ بعاث جیسی باہمی جنگوں کی بات چھیڑ دے تاکہ وہ آپس میں پھر الجھ پڑیں۔[1]

محاصرہ اور جلاوطنی

بنوقینقاع کو جلاوطن کرنے کی روایت صحیحین میں آتی ہے۔[2] محاصرے کی تفاصیل ابن اسحاق، واقدی اور ابن سعد نے بیان کی ہیں۔ بعد کے مؤرخین بھی انھی کے پیرو ہیں۔ اُن کے محاصرے کی تفصیل یہ ہے کہ یہ لوگ سُنار تھے۔ انھوں نے عبداللہ بن ابی سے دوستی کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ وہ یہودیوں میں سب سے زیادہ بہادر تھے۔ جب انھوں نے سرِ عام بغض و عداوت کا اظہار شروع کر دیا تو رسول اللہ ﷺ کو خدشہ ہوا کہ یہ عہد میں خیانت کریں گے،اس لیے آپ نے علانیہ طور پر ان سے معاہدہ ختم کر دیا۔[3] ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو یہی حکم تھا:

﴿وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ۝﴾

''اور اگر تم کسی قوم کی خیانت سے ڈرو تو ان کی طرف (ان کا عہد) برابری سے پھینک دو، بے شک اللہ خیانت (بدعہدی) کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''[4]

[1] ابن اسحاق کی اس روایت کی سندیں ضعیف ہیں، تاہم وہ ایک دوسری کو تقویت دیتی ہیں، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 232/2، وتفسير الطبري: 55/7-60، ومرويات تاريخ يهود المدينة...... ص: 32) یہ ماسٹرز کا مقالہ ہے جو زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوا۔ اسے مدینہ یونیورسٹی کے السنۃ کالج میں پیش کیا گیا تھا۔ [2] صحيح البخاري، المغازي، باب حديث بني النّضير......، حديث: 4028، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب إجلاء اليهود من الحجاز، حديث: 1766. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 70/3-72. اس کی سند مرسل ہے۔ اس کے باوجود یہ روایت متابعت (تائیدی روایت) کی بنا پر قوی ہے۔ والمغازي للواقدي: 176/1. یہ سند ضعیف ہے۔ والطّبقات الكبرىٰ: 29/2. یہ بلاسند ہے۔ [4] الأنفال 58:8.

آپ نے پندرہ دن ان کا محاصرہ کیے رکھا۔ جب محاصرہ شدید ہوگیا تو انھوں نے آپ کا فیصلہ منظور کر لیا۔ آپ نے فیصلہ فرمایا: ''تمھارا مال ہمارا ہوگا اور تمھارے بیوی بچے تمھارے پاس رہیں گے۔'' پھر رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تو ان کے مردوں کی مشکیں کس دی گئیں۔ اُن کے حلیف عبداللہ بن اُبی نے خوشامد شروع کر دی۔ ''جناب! یہ چار سو ننگے بدن اور تین سو زرہ پوش، انھوں نے ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا ہے۔ اب آپ انھیں آن کی آن میں ختم کر رہے ہیں؟'' جب عبداللہ بن ابی نے حد درجہ اصرار اور گریہ زاری کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «هُمْ لَكَ» ''تیرے اصرار پر میں ان کی جان بخشی کرتا ہوں۔''[1] آپ نے حکم دیا کہ انھیں مدینہ منورہ سے نکال دیا جائے، چنانچہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں جلاوطنی عمل میں آئی۔ یہ لوگ ''اذرعات'' کے علاقے میں چلے گئے۔ ان کے باقی ماندہ مال اور اسلحہ پر قبضہ کر کے اُس میں سے خمس نکالنے کے بعد صحابۂ کرام میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ کام حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے انجام دیا۔[2]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی ان کے حلیف تھے۔ لیکن جب انھوں نے ان کی سرکشی اور رسول اللہ ﷺ سے ان کی واضح دشمنی دیکھی تو ان کے معاہدے سے دستبردار

[1] ابن اسحاق کی یہ روایت منقطع سند سے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 71,70/3) واقدی اور ابن سعد نے اسے بلا سند نقل کیا ہے، دیکھیے: (المغازي: 178,177/1، والطبقات الكبرٰى: 92/2) ان کی روایت میں آیت کا ذکر بھی ہے۔ بنوقینقاع کے ساتھ عبداللہ بن ابی کے چمٹے رہنے اور ان سے اس کی تعلق داری کے متعلق تفصیل ابن اسحاق کی دو ضعیف روایتوں میں ہے۔ یہ روایتیں عاصم اور عبادہ پر موقوف ہیں، تاہم ان میں سے ہر ایک دوسری کی تائید کرتی اور تقویت کا باعث بنتی ہے۔ یوں یہ دونوں روایات حسن لغیرہ کے درجے تک پہنچ جاتی ہیں۔ اہل مغازی و سیر کی اکثریت کا ان روایات کو بیان کرنا بھی ان کے قوی ہونے کی دلیل ہے۔ [2] الطبقات الكبرٰى: 92/2. یہ روایت بلا سند ہے۔

ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عبادہ بن صامت اور عبداللہ بن ابی کے بارے میں یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ○ فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَن تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ ۚ فَعَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنفُسِهِمْ نَادِمِينَ ○﴾

''اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ تم میں سے جو ان سے دوستی کرے گا، بے شک وہ انھیں میں سے ہے۔ یقیناً اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ چنانچہ (اے نبی!) آپ دیکھیں گے کہ جن لوگوں کے دلوں میں ایک بڑی بیماری (نفاق) ہے وہ بھاگ بھاگ کر اُن کے پاس جاتے (اور) کہتے ہیں: ہمیں ڈر ہے کہیں ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ پھر قریب ہے کہ اللہ واضح فتح لائے یا اپنی طرف سے کوئی اور امر ظاہر کرے، تو یہ لوگ اپنے دلوں میں چھپائی ہوئی باتوں پر اظہارِ ندامت کرنے لگیں۔''[1]

یہودیوں سے دوستی کے متعلق احکام ونصیحتیں

* یہ واقعہ یہود کے بغض و عداوت کی واضح دلیل ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں اوران کے قائدین سے بدعہدی اور بے وفائی کے لیے ہر ممکن ذرائع اختیار کرتے ہیں اور انھیں نقصان پہنچانے کے لیے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے۔

[1] المآئدة 5:51،52. یہ روایت ابن اسحاق نے مرسل سند سے بیان کی ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن ہشام: 3/71،72) متابعات وشواہد (تائیدی روایات) کی بنا پر یہ روایت قوی ہے۔

* اس واقعے میں عبداللہ بن ابی کا کردار اور یہودیوں کی حمایت بالکل عیاں ہے جو اُس کے نفاق کا واضح ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ آزمائش کے دیگر مواقع پر بھی اُس کا کردار یہی رہا۔ وہ مسلمانوں کے بجائے اُن کے دشمنوں کی مدد کرتا اور مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پھیلانے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ ان ساری باتوں کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اُس سے مسلمانوں جیسا سلوک کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیوی احکام میں منافقین کو مسلمان سمجھا جائے گا اور اُن کا باطن اللہ کے سپرد ہے۔ وہی قیامت کے دن اُن سے حساب لے گا۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک فرمان بھی اسی پر دلالت کرتا ہے: ''رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں لوگوں کا مؤاخذہ وحی کے ذریعے سے ہو جاتا تھا۔ اب وحی منقطع ہو چکی ہے۔ اب ہم تم سے تمھارے ظاہری اعمال کے مطابق سلوک کریں گے۔ جو اچھے کردار کا مظاہرہ کرے گا ہم اُس پر اعتماد کریں گے۔ اور اسے اپنا قریبی سمجھیں گے۔ اُس کے باطن سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔ باطن کا حساب اللہ تعالیٰ لے گا۔ جو برے کردار کا مظاہرہ کرے گا ہم اُس پر اعتماد کریں گے نہ اُسے سچا سمجھیں گے، چاہے وہ کہتا رہے کہ میرا دل پاک ہے۔''[1]

منافقین کے ساتھ اُن کے ظاہری اعمال کے مطابق سلوک کرنے میں حکمت یہ ہے کہ حق وانصاف پامال نہ ہونے پائے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کوئی حاکم صرف اپنے اندازے اور وجدان کو کسی کے ساتھ ظلم وزیادتی کا ذریعہ بنا لے، چاہے اس کے خلاف کوئی حقیقی ثبوت موجود نہ ہو۔[2]

* غیر مسلموں سے دوستی جائز نہیں۔ اُن سے لاتعلقی ضروری ہے الّا یہ کہ مسلمان اتنے کمزور

[1] صحيح البخاري، الشهادات، باب الشهداء العُدُول، حديث:2641. [2] فقه السيرة النبوية للبوطي: ص:183,182.

ہوں کہ کفار کے ساتھ کوئی معاہدہ کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ﴾

''اہل ایمان مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو ہرگز دوست نہ بنائیں اور جو شخص ایسا کرے گا اُس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں الّا یہ کہ تم اُن (کے شر) سے بچنا چاہو۔''[1]

غزوۂ سویق

ہجرت کے بائیسویں مہینے ذوالحجہ کی 5 تاریخ کو ابوسفیان خفیہ طور پر مدینہ منورہ کے اطراف میں بنونضیر کے ہاں پہنچا۔ اُس کے ساتھ دو سو شہسوار بھی تھے، پھر اُس نے حرہ واقم کی طرف مدینہ کی ایک وادیِ عریض میں ایک بزدلانہ کارروائی کی۔ دو آدمی قتل کر دیے۔ کھجور کے چند درخت جلائے اور واپس مکہ مکرمہ بھاگ گیا۔ مسلمانوں کو اس انتقامی کارروائی کا علم ہوا تو اُس کے پیچھے بھاگے۔ قَرْقَرة الكدر کے علاقے تک جا پہنچے مگر وہ ہاتھ نہ لگا۔ کافر بھاگتے بھاگتے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اپنے کھانے پینے کا سامان گراتے گئے۔ جب مسلمان آپ ﷺ کے ساتھ واپس مدینہ منورہ پہنچے تو پوچھنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! کیا اسے بھی غزوہ کہا جا سکتا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ!» ''ضرور۔'' اس غزوے کا نام غزوۂ سویق اس لیے رکھا گیا کہ کافروں نے جو سامان گرایا، وہ زیادہ تر سَتُّو ہی تھے۔[2]

[1] آل عمرٰن 3:28. [2] اسے ابن اسحاق نے ایک صحیح سند سے روایت کیا جو عبداللہ بن کعب تک پہنچتی ہے۔ یہ سند مرسل ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 3/66,65) طبری نے اس واقعے کو اپنی تاریخ میں ابن اسحاق کی اسی سند کے ساتھ درج کیا ہے۔ انھوں نے راوی کا نام عبداللہ کے بجائے عبداللہ بن کعب لکھا ہے، دیکھیے: (تاريخ الطبري: 2/484) نیز واقدی اور ابن سعد نے بلاسند ◄◄

غزوۂ قرقرۃ الکدر

ہجرت کے تیئیسویں مہینے محرم کے نصف میں رسول اللہ ﷺ کو پتہ چلا کہ بنوسلیم، غطفان اور بعض دوسرے قبائل کے کچھ لوگ بنوسلیم کے ایک کنویں ''قرقرۃ الکدر'' کے آس پاس مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے لیے اکٹھے ہوگئے ہیں۔ آپ دو سو صحابہ کو ساتھ لے کر نکلے مگر وہ مذکورہ مقام پر آپ کے پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہوگئے۔ انھوں نے اپنے جانور وہیں چھوڑ دیے جو مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ جانوروں کے ساتھ یَسَار نامی ایک غلام بھی تھا۔ مسلمانوں نے وہ غلام رسول اللہ ﷺ کے حصے میں کر دیا۔ آپ ﷺ نے اُسے آزاد فرما دیا۔[1]

کعب بن اشرف یہودی کا قتل

کعب بنو طے کے ایک قبیلے بنو نبہان کی طرف منسوب تھا۔ دورِ جاہلیت میں اس کے باپ کے ہاتھوں ایک شخص قتل ہوگیا۔ وہ بھاگ کر مدینہ آ گیا اور بنونضیر کا حلیف بن گیا۔ یہاں اُس نے عقیلہ بنت ابی الحقیق سے نکاح کر لیا جس سے کعب بن اشرف پیدا ہوا۔[2] کعب شاعر تھا۔ بدر میں مسلمانوں کو عظیم فتح نصیب ہوئی تو اسے ایک آنکھ نہ بھائی۔

»» روایت کیا ہے، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 181/1، والطبقات الكبرٰى: 30/2) ابن کثیر نے اس غزوے کا نام غزوۂ قرقرۃ الکدر لکھا ہے، دیکھیے: (البداية و النهاية: 378/3) سَوِیق عربی میں سَتُّو کو کہتے ہیں، جو بھنی ہوئی گندم یا جو سے بنایا جاتا ہے۔ اس کے استعمال کے مختلف طریقے ہیں۔ دیسی گھی، دودھ، شہد یا پانی میں ملا کر استعمال کرتے ہیں اور یہ مسافروں کا بہترین زادِراہ ہوتا ہے۔

[1] المغازي للواقدي: 181/1. واقدی نے پانی کا نام قرارۃ الکدر لکھا ہے۔ ابن سعد نے بھی اس کا نام قرقرۃ الکدر لکھا ہے، دیکھیے: (الطبقات الكبرٰى: 31/2) [2] فتح الباري: 209/15. ابن اسحاق نے اسے بسند مرسل روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 75,74/3، وتاريخ الطبري: 488/2)

وہ شدید غم و غصے میں مکہ گیا تاکہ مشرکین سے اُن کے مقتولین کی تعزیت کرے اور انھیں انتقام لینے پر اکسائے۔اُس نے رسول اللہ ﷺ کی شان کے منافی اشعار بھی کہے۔ ابوسفیان نے اُس سے پوچھا: ''میں تمھیں اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا ہمارا دین اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے یا محمد اور اُس کے ساتھیوں کا؟ اور ہم میں سے کون زیادہ ہدایت یافتہ اور حق کے قریب ہے؟'' کعب کہنے لگا: ''تم اُن سے زیادہ راہِ راست پر ہو۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر وحی نازل فرمائی:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ ﴾

''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا، (ان کا حال یہ ہے کہ) وہ بتوں اور شیطان پر ایمان لاتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے متعلق کہتے ہیں: یہ لوگ (راستے کے لحاظ سے) ان لوگوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں جو ایمان لائے۔'' [1]

وہ مدینہ واپس آیا تو مسلمانوں کی عورتوں کے نام لے کر شعر کہنے لگا۔ اس صورتحال میں رسول اللہ ﷺ نے اس کے خون کو حلال قرار دے دیا۔ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اور کعب کے رضاعی بھائی حضرت ابونائلہ رضی اللہ عنہ نے اس حکم پر عمل درآمد کا تہیہ کر لیا۔ محمد بن مسلمہ نے اس مقصد کے لیے مضبوط پلان بنایا۔ اس سلسلے میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی کہ ممکن ہے اس مقصد کے لیے ہمیں کوئی بات آپ کے خلاف کہنی پڑے۔ آپ نے بخوشی اجازت دے دی، پھر محمد بن مسلمہ اُس کے پاس گئے۔ کچھ کھجوریں ادھار طلب کیں اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ چندہ مانگ مانگ کر ہمیں تنگ کرتے رہتے ہیں۔ یہ کھجوریں بھی انھی کو دینی ہیں۔ کعب کہنے لگا: ''اپنی بیویاں یا بیٹے میرے

[1] النسآء 4:51.

پاس رہن رکھ دو۔‘‘ محمد بن مسلمہ بولے: ’’یہ تو بہت بے عزتی کی بات ہے۔ زندگی بھر بچوں کو عار دلائی جائے گی۔‘‘ اس کے بجائے انھوں نے اسلحہ رکھنے کی پیش کش کی۔ کعب مان گیا۔ اگلی رات محمد بن مسلمہ، ابو نائلہ (جن کا نام سلکان بن سلامہ بن وقش تھا)، عباد بن بشر، حارث بن بشر اور ابوعبس بن جبر رضی اللہ عنہم اسلحہ اٹھائے پہنچے۔ ان سب کا تعلق اوس قبیلے سے تھا۔ انھوں نے اُسے آواز دی۔ وہ باہر نکل آیا۔ اُس کی بیوی نے اُسے ڈرایا بھی تھا کہ اس وقت باہر نکلنا مناسب نہیں۔ وہ آ کر اُن کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ انھوں نے ازراہِ بے تکلفی اُس کے بالوں کی خوشبو سونگھنی چاہی۔ اسی بہانے اُسے دبوچ کر قتل کر دیا۔ اس دوران ان میں سے کسی کی تلوار سے اُن کا اپنا ایک ساتھی بھی زخمی ہو گیا، تاہم یہ بحفاظت واپس آ گئے۔[1]

یہودیوں نے اس کارروائی پر احتجاج کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اُس کی شرارتیں ایک ایک کر کے گنوائیں۔ یہودی معاملہ سمجھ گئے اور خوفزدہ ہو کر واپس چلے گئے۔ اس واقعے سے یہودیوں اور مشرکین مدینہ کے دل دہل گئے اور انھیں اپنی جان خطرے میں محسوس ہونے لگی۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں پیش کش کی کہ آپس میں امن و سکون سے رہنے کا معاہدہ کر لیا جائے۔ ابو داود کی روایت کے مطابق یوں امن کی ایک دستاویز لکھی گئی۔[2]

راجح یہ ہے کہ یہ دستاویز دراصل میثاق مدینہ ہی کی تجدید تھی جو جنگ بدر سے پہلے مسلمانوں

---

[1] صحیح البخاري، المغازي، باب قتل كعب بن الأشرف، حدیث: 4037، وصحیح مسلم، الجهاد والسیر، باب قتل كعب بن الأشرف طاغوت الیهود، حدیث: 1801، والسیرة النبویة لابن هشام: 79/3. ابن اسحاق نے کعب بن اشرف کے قتل کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے احکامات کی تنفیذ کا منصوبہ بسند حسن روایت کیا ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 3/81-84) ابن اسحاق کی صحیح روایت میں بیان ہے کہ زخمی ہونے والے حارث بن اوس بن معاذ تھے۔ [2] سنن أبي داود، الخراج......، باب كیف كان إخراج الیهود......، حدیث: 3000. اس روایت کا دار و مدار عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کعب کے والد پر ہے۔ اگر تو «أب» کے لفظ سے راوی کی مراد اس »

اور یہودیوں کے مابین طے پایا تھا۔[1]

کعب بن اشرف کا قتل غزوۂ بدر کے بعد اور غزوۂ بنی نضیر سے پہلے ہوا۔[2] واقدی کے مطابق یہ واقعہ ہجرت کے بعد تیسرے سال، یعنی پچیسویں ماہ، 14 ربیع الاول کا ہے۔[3]

احکام و مسائل

* کعب بن اشرف کے قتل سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر غدر و خیانت کی وجہ سے کسی کو ہلاک کرنا ضروری ہو تو اُس کے لیے کوئی بھی حیلہ اور حربہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔
* دشمن سے جھوٹ بول کر اُسے دھوکا دیا جا سکتا ہے کیونکہ جنگ میں دھوکا جائز ہے۔
* غدار اور خائن کو قتل کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح اُس کے پشت پناہ بھی خوف کھا جاتے ہیں اور اُس جیسے شریر لوگ شرارتوں سے باز آ جاتے ہیں۔

غزوۂ ذی اَمَر

رسول اللہ ﷺ کو پتہ چلا کہ غطفان کے کچھ مشرکین نجد میں ''ذی اَمَر'' کے مقام پر

» کے دادا کعب ہیں تو حدیث متصل ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ یوں یہ حدیث صحیح ہے۔ اور اگر اس لفظ سے راوی کی مراد اس کے والد ہیں تو یہ روایت مرسل ہے۔ اس صورتحال میں اسے کسی متابعت (تائیدی روایت) کی ضرورت ہوگی جس کے ذریعے سے یہ روایت حسن لغیرہ کے درجے تک پہنچ جائے۔ ہیثمی کے ہاں مجھے یہ متابعت مل گئی۔ یہ عبداللہ بن کعب کی ان کے چچا سے روایت ہے۔ یہ بھی ہو بہو پہلی روایت کے مانند ہے۔ ہیثمی نے اسے احمد کے حوالے سے نقل کیا اور اس کے راویوں کے متعلق کہا کہ یہ صحیح کے راوی ہیں، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 196,195/6) اس روایت کے دیگر شواہد بھی ہیں۔ ایک شاہد (تائیدی روایت) بیہقی نے دو سندوں سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبیهقي: 197,196/3) [1] المجتمع المدني للدكتور أكرم ضياء العمري، ص: 142. [2] ابن اسحاق، واقدی اور ابن سعد نے بتایا ہے کہ کعب بن اشرف کے قتل کا واقعہ غزوۂ احد سے پہلے کا ہے۔ [3] المغازي للواقدي: 1/184-189.

جمع ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ اُن کی طرف چلے۔ جب انھیں پتہ چلا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ [1] امام واقدی اور ابن سعد کے مطابق ذی اَمَر میں جمع ہونے والے لوگ غطفان کے ایک قبیلہ بنوثعلبہ بن محارب سے تعلق رکھتے تھے۔ [2] مسلمانوں کے لشکر کی تعداد چار سو پچاس تھی۔ مسلمان اس غزوے میں 12 ربیع الاول 3 ہجری کو نکلے تھے۔ بقول واقدی جمعرات کا دن تھا۔ [3]

واقدی اور ابن سعد نے دَعثور محاربی کا قصہ بھی اسی غزوے کے ذیل میں لکھا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی واپسی کے دوران بارش ہونے لگی۔ رسول اللہ ﷺ کے کپڑے بھیگ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے وادیٔ ذی امر سے نکل کر علیحدگی میں اپنے کپڑے اتارے اور سوکھنے کے لیے ایک درخت پر پھیلا دیے اور خود درخت کے نیچے آرام فرمانے لگے۔ دشمن چوری چھپے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے آپ کو تنہا دیکھا تو اپنے قائد دعثور کو اکسایا۔ وہ مشہور پیشہ ور قاتل تھا۔ انھوں نے اس سے کہا: یہ مناسب موقع ہے حضرت محمد ﷺ کا کام تمام کر دیا جائے۔ وہ تلوار لے کر آپ ﷺ کے سر پر آن کھڑا ہوا۔ کہنے لگا: ''آج آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ!'' جبریل علیہ السلام نے اُسے دھکا دیا تو اُس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی۔ آپ ﷺ نے فوراً تلوار اٹھائی اور اُس کے سر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

«مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّي الْيَوْمَ؟» ''اب بتا تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟''

وہ کانپ اٹھا: کہنے لگا: ''کوئی بھی نہیں۔'' آپ ﷺ نے اُسے چھوڑ دیا۔ وہ آپ کے کریمانہ اخلاق سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا اور واپس جا کر اپنی قوم کو سارا قصہ سنایا اور انھیں بھی دعوتِ اسلام دینے لگا۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا:

[1] ابن اسحاق کی یہ روایت بلا سند ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 68/3) [2] المغازي للواقدي: 194/1، والطبقات الكبرٰى: 34/2. [3] المغازي للواقدي: 193/1.

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ﴾

''اے ایمان والو! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب ایک قوم نے چاہا کہ وہ اپنے ہاتھ تمھاری طرف بڑھائیں تو اس (اللہ) نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیے۔''[1]

غزوۂ بُحران یا غزوۂ فُرُع

نبیِ کریم ﷺ تین سو صحابہ کو لے کر نکلے۔ ابنِ اسحاق کے مطابق آپ کا ارادہ قریش کے ایک تجارتی قافلے کو روکنا تھا[2] اور بقول واقدی آپ بنوسلیم کو سزا دینا چاہتے تھے۔[3] آپ فُرُع کے علاقے میں بُحران تک پہنچے۔ مکہ سے شام کے لیے تجارتی راستہ اسی علاقے سے گزرتا تھا۔ لیکن فریقین میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔

امام واقدی اور اُن کے شاگرد ابن سعد کے مطابق یہ غزوہ ہجرت کے ستائیسویں ماہ جمادی الاولیٰ میں پیش آیا۔[4]

قردہ کی جنگی کارروائی

جنگ بدر میں قریش کے ساتھ جو بیتی اُس کی بنا پر وہ شام کے تجارتی راستے پر جاتے

[1] المآئدة 11:5. دعثور محاربی کا واقعہ صحیحین میں ثابت ہے لیکن اس کا مضمون ہماری بیان کردہ روایت سے مختلف ہے۔ ان کے مطابق یہ واقعہ کسی اور غزوے میں پیش آیا۔ انھوں نے دعثور کے بجائے غورث بن حارث نام لکھا اور بتایا ہے کہ یہ مسلمان نہیں ہوا تھا۔ یہ امر صحیحین اور اہل سیر کے درمیان متفقہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس کافر سے محفوظ رکھا۔ واقعے کی جو تفصیلات صحیحین میں ہیں وہ زیادہ قرینِ صواب ہیں۔ بخاری، مسلم اور ابن اسحاق کی روایت سے اس واقعے کی تفصیلات غزوہ ذات الرقاع کے ضمن میں پیش کی جائیں گی۔ ان شاءاللہ۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 68/3. یہ روایت بلا سند ہے۔ [3] المغازي للواقدي: 196/1. [4] الطبقات الكبرىٰ: 35/2. یہ بلا سند ضعیف روایت ہے۔

ہوئے ڈرنے لگے۔ انھوں نے سوچا کہ عراقی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ابوسفیان مکہ کے بہت سے تاجروں کی معیت میں چلا۔ اُن کا سب سے بڑا تجارتی مال چاندی تھا جو ان کے پاس بھاری مقدار میں موجود تھی۔ انھوں نے بنوبکر بن وائل کے ایک آدمی فُرات بن حیان کو راستہ بتانے کے لیے اجرت پر اپنے ساتھ رکھ لیا۔رسول اللہ ﷺ کو پتہ چلا تو آپ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کو اُن کے تعاقب میں بھیجا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے نجد کے ایک کنویں ''قردہ'' پر انھیں جا لیا اور پورے قافلے کو قابو کر لیا، البتہ قافلے کے مرد بھاگ گئے۔ یہ غزوۂ بدر کبریٰ سے چھ ماہ بعد کی بات ہے۔[1] ہجرت کے ستائیسویں ماہ جمادی الاخریٰ کی پہلی تاریخ تھی۔[2]

ابن سعد کے مطابق اس کارروائی میں ایک سو مجاہد شریک ہوئے۔ وزن کے لحاظ سے تیس ہزار درہم چاندی اُن کے ہاتھ لگی جس کی قیمت اُس دور کے سکے کے مطابق ایک لاکھ درہم تھی۔[3]

جب قریش نے دیکھا کہ مسلمانوں کی اقتصادی ناکابندی سے نکلنے کے لیے ان کا بنایا ہوا نیا منصوبہ بھی ناکام ہوگیا ہے تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے خلاف اُن کے وطن میں فوری بھرپور جنگی کارروائی کی جائے تاکہ مسلمانوں کی قائم کردہ اقتصادی ناکابندی ختم کرکے تجارتی راستوں کا امن و امان بحال کیا جاسکے اور بدر کے میدان میں اُن کی شکست سے اُن کی شہرت کو جو نقصان پہنچا تھا،اس کا ازالہ بھی ہو۔اس فیصلے کے نتیجے میں ''غزوۂ اُحد'' برپا ہوا۔

[1] ابن اسحاق کی یہ روایت بلا سند ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام:73/3) [2] المغازي للواقدي:197/1، و الطبقات الكبرٰى:36/2.ان کی اسانید ضعیف ہیں۔ [3] الطبقات الكبرٰى: 36/2.اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

غزوۂ اُحد

تاریخ

تاریخ و سیرت کی تمام کتابیں اس امر پر متفق ہیں کہ یہ غزوہ 3 ہجری شوال میں ہوا۔ دن کے بارے میں اختلاف ہے۔ مشہور قول یہ ہے کہ یہ 15 شوال [1] ہفتے کا دن [2] تھا۔

غزوے کے اسباب

مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اس غزوے کا اصل سبب یہ تھا کہ قریش جنگ بدر میں اپنے مقتولوں کا انتقام لینا چاہتے تھے اور اپنا وہ مقام و مرتبہ بحال کرنا چاہتے تھے جو بدر کی شکست کے بعد عربوں کے نزدیک ڈانواں ڈول ہوگیا تھا۔ [3]

کچھ دوسرے اہم اسباب بھی تھے جو واقعات و شواہد سے اخذ کیے جا سکتے ہیں، مثلاً:

[1] یہ روایت خلیفہ بن خیاط نے بھی نقل کی ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔ یوں یہ سند مرسل ہے، دیکھیے: (تاریخ خلیفة بن خیاط، ص: 97) طبری نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ ان کی سند میں حسین بن عبداللہ ضعیف راوی ہے، دیکھیے: (تفسیر الطبري: 399/7) ابن اسحاق نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ ان کی سند مرسل ہے جس میں کچھ راوی ثقہ اور کچھ ضعیف ہیں، دیکھیے: (السیر والمغازي لابن إسحاق، ص: 324) اس بات میں طبری کی روایت سب سے صحیح ہے، دیکھیے: (المجتمع المدني للدکتور العمري، الجهاد، ص: 65) [2] واقدی، ابن سعد اور بلاذری کا کہنا ہے کہ یہ ہفتے کا دن اور ہجرت کے بتیسویں ماہ شوال کی سات تاریخ تھی۔ ان سب کی اسانید ضعیف ہیں، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 199/1، والطبقات الکبریٰ: 36/2، وأنساب الأشراف للبلاذري: 310/1)

[3] السیر والمغازي لابن إسحاق، ص: 322، والسیرة النبویة لابن هشام: 3/86-88. اس مرسل سند میں شیوخ کی ایک جماعت ہے جن میں کچھ ثقہ اور کچھ ضعیف ہیں، یہ روایت بھی واقدی ہی کے واسطے سے ہے، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 199/1، والطبقات الکبریٰ: 37/2)

قریش چاہتے تھے کہ مسلمانوں نے تجارتی راستوں کا جو امن و امان تہ و بالا کر رکھا ہے اُس کی روک تھام کی جائے اور مسلمانوں کو قریش کے لیے خطرہ بننے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے۔

مشرکین کی تعداد

قریش نے فیصلہ کیا کہ ابوسفیان کا تجارتی قافلہ، جو جنگ بدر سے قبل مسلمانوں سے بچ کر نکل گیا تھا، اس کا پورا منافع جنگی تیاری پر خرچ کیا جائے۔[1] قریش نے اپنے سمیت دیگر حلیفوں بنوکنانہ اور تہامہ والوں سے تین ہزار جنگجو اکٹھے کیے۔ ان کے پاس دو سو گھوڑے اور سات سو زرہ پوش جوان تھے۔ میمنہ پر خالد بن ولید اور میسرہ پر عکرمہ بن ابوجہل مقرر تھے۔ اُن کے ساتھ عورتیں بھی تھیں تاکہ وہ اُن کی غیرت اور جذبۂ شجاعت کو اُبھارتی رہیں اور اگر وہ بھاگنے لگیں تو انھیں شرم دلائیں۔ بقول ابن اسحاق یہ آٹھ عورتیں تھیں اور بقول واقدی چودہ تھیں۔ دونوں مؤرخین نے اُن کے نام بھی لکھے ہیں۔[2] ابن سعد کے مطابق اُن کی تعداد پندرہ تھی۔[3]

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں وہ سب کچھ دکھا دیا جو اُحد میں ہونے والا تھا اور آپ ﷺ نے صحابہ سے بیان بھی فرما دیا تھا۔ آپ نے فرمایا: ”میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے تلوار کو حرکت دی تو اُس کا اگلہ حصہ ٹوٹ گیا۔ اس سے مراد وہ جانی نقصان ہے جو مومنین کو احد کے دن پہنچا، پھر میں نے دوبارہ تلوار چلائی تو وہ ٹھیک ہوگئی۔ اس سے مراد مومنین کا دوبارہ جمع ہو جانا اور فتح نصیب ہونا ہے۔ میں نے خواب میں گائیں دیکھیں (اور اللہ کا کرنا بہتر ہے) یہ بھی احد کے دن مومنین تھے۔“[4]

[1] المغازي للواقدي:600/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام:87/3. ابن اسحاق کی یہ روایت بلاسند ہے، دیکھیے: (المغازي للواقدي:201/1) [3] الطبقات الكبرىٰ:37/2. [4] صحيح البخاري، المناقب، باب علامات النبوّة في الإسلام، حديث: 3622، وصحيح مسلم، الرؤيا، باب رؤيا النبي ﷺ، حديث:2272.

ایک دوسری روایت میں ہے:

«رَأَيْتُ أَنِّي فِي دِرْعٍ حَصِينَةٍ، فَأَوَّلْتُهَا الْمَدِينَةَ»

''میں نے اپنے آپ کو ایک مضبوط زرہ میں ملبوس دیکھا تو میں نے اس کا مطلب یہ لیا کہ یہ مدینہ ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے ان خوابوں کی یہ تعبیر بھی بتلا دی تھی کہ صحابۂ کرام میں بھگدڑ مچے گی اور وہ بڑی تعداد میں شہید ہوں گے۔[2]

رسول اللہ ﷺ کو لشکر قریش کی روانگی کا پتہ چلا تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ مدینہ کے اندر رہ کر مقابلہ کرنا چاہیے یا باہر جا کر دشمن سے نبرد آزما ہونا چاہیے۔ انصار کی اکثریت نے کہا: ''اے اللہ کے نبی! ہم اچھا نہیں سمجھتے کہ مدینہ کی گلیوں میں مارے جائیں۔ ہم زمانۂ جاہلیت میں مدینہ منورہ کو جنگ سے محفوظ رکھتے تھے۔ اب تو اسلام کی برکت سے یہ شہر امن کا زیادہ حقدار ہے، لہٰذا دشمن کے مقابلے کے لیے باہر ہی چلنا چاہیے۔'' رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے اور اسلحہ پہننے لگے۔ آپ کے چلے جانے کے بعد لوگ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک خیال پیش فرمایا اور تم نے دوسری تجویز دے دی۔ انھوں نے حضرت حمزہ سے کہا: ''آپ اندر جائیں اور نبیِ کریم ﷺ سے عرض کریں کہ ہماری رائے آپ کی رائے کے مطابق ہے۔'' حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ گئے اور کہا: ''اے اللہ کے نبی! وہ لوگ اپنی تجویز پر پشیمان ہیں۔ ایک دوسرے کو ملامت کر رہے ہیں اور عرض کر رہے ہیں کہ ہماری رائے وہی ہے جو آپ ارشاد فرمائیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّهُ لَيْسَ لِنَبِيٍّ إِذَا لَبِسَ لَأْمَتَهُ أَنْ يَضَعَهَا حَتّٰى يُنَاجِزَ»

[1] الفتح الرباني: 221/17. ساعاتی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ [2] الفتح الرباني: 221/17.

”کسی نبی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اسلحہ پہننے کے بعد اسے برسرِ پیکار ہوئے بغیر اتار دے۔“ [1]

ابن اسحاق کی یہ بات کہ عبداللہ بن اُبی کی رائے بھی آپ ﷺ ہی کی رائے کے موافق تھی کہ مدینہ میں ٹھہر کر دشمن کا سامنا کیا جائے، دیگر مؤرخین کے نزدیک تو متفقہ ہے [2] مگر طبری نے سُدّی سے اس کے برعکس نقل کیا ہے۔ طبری کی روایت کی سند صحیح ہے۔ راوی بھی ثقہ ہیں مگر ایک تو یہ مُرسَل ہے دوسرے اس کے بعض راوی وہم اور کثرتِ خطا کے ساتھ متصف ہیں، [3] چنانچہ باکری نے ابن اسحاق کی روایت ہی کو ترجیح دی ہے کیونکہ وہ سند کے اعتبار سے بھی صحیح ہے اور اہل سیر کا اس پر اتفاق بھی ہے۔ [4] ابن اسحاق کی روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ عبداللہ بن اُبی کی اُحد سے واپسی کا بہانہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات نہیں مانی۔

اہل سِیَر نے مدینہ سے باہر جا کر دشمن سے مقابلہ کرنے کی تجویز کا مُحرّک یہ بتلایا ہے کہ یہ مخلص اور پُر جوش لوگ دشمنوں کو اپنی بہادری کے جوہر دکھانا چاہتے تھے۔ ان میں سے اکثر لوگ جنگِ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے اور اس فضیلت سے محروم رہے تھے۔ وہ اس کمی کو جہاد میں شریک ہو کر پورا کرنا چاہتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ کئی لوگ اس تجویز کے حامی تھے کیونکہ اس طرح مدینہ منورہ کے مضبوط قلعوں سے بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا اور تمام اہل مدینہ کی طاقت مجتمع ہو جاتی۔ یوں دشمن کو شکست دینا آسان ہوتا۔ [5]

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 204/3، والمستدرك للحاكم: 129,128/2 و 297,296. امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے ان سے اتفاق کیا ہے۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 91/3.
[3] تفسير الطبري: 162/7، وتاريخ الطبري: 11/3. [4] مرويات غزوة أحد للباكري، ص: 62.
[5] ابن اسحاق کی یہ روایت بغیر سند کے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 92,91/3، والمغازي للواقدي: 1/209-211، والطبقات الكبرى: 38/2)

رسول اللہ ﷺ کے قطعی فیصلۂ خروج کے بعد ایک بڑا سیاہ جھنڈا[1] اور تین چھوٹے جھنڈے تیار کیے گئے۔ ان چھوٹے تین جھنڈوں میں سے ایک مہاجرین کو دیا گیا جسے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اٹھایا اور اُن کی شہادت کے بعد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ رہا۔ ایک جھنڈا قبیلہ اوس کو دیا گیا جسے حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اٹھایا۔ ایک خزرج کو دیا گیا جسے حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے اٹھایا۔[2] ان جھنڈوں تلے مدینہ سے نکلنے والے مسلمانوں اور اُن کے ساتھیوں کی تعداد ایک ہزار تھی۔ اُن کے ساتھ صرف دو گھوڑے اور ایک سو زرہ پوش تھے۔[3] رسول اللہ ﷺ نے دو زرہیں پہن رکھی تھیں۔[4]

جب رسول اللہ ﷺ اُحد کی طرف جاتے ہوئے ثنیۃ الوداع (وداع کرنے کی گھاٹی) سے گزرے تو آپ نے بھاری اسلحے سے لیس ایک دستہ دیکھا۔ دریافت فرمایا: «مَنْ هٰؤُلَاءِ؟» ”یہ کون لوگ ہیں؟“ لوگوں نے عرض کی: ”یہ عبداللہ بن ابی ہے جو بنوقینقاع کے چھ سو حلیف یہودیوں کو لے کر آیا ہے۔ یہ یہودی عبداللہ بن سلام کا گروہ ہیں۔“ آپ نے فرمایا: ”کیا یہ مسلمان ہو چکے ہیں؟“ لوگوں نے بتایا: ”نہیں! اے اللہ کے رسول!“ آپ نے فرمایا: ”انھیں کہہ دو کہ واپس چلے جائیں۔ ہم مشرکین کے خلاف مشرکین سے مدد حاصل نہیں کریں گے۔“[5]

اگر یہ روایت صحیح ہو تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ بنوقینقاع کی جلاوطنی اُحد کے بعد عمل میں آئی۔

---

[1] تاريخ خليفة بن خياط، ص: 67. یہ سعید بن مسیب کی مرسل روایت ہے جس کی سند حسن ہے۔ جیسا کہ ابن مسیب کی مرسل روایات بھی قوی ہوتی ہیں۔ [2] المغازي للواقدي: 215/1. جھنڈوں کے معاملے کے متعلق کوئی ایسی روایت وارد نہیں ہوئی جو دلیل بنائے جانے کے قابل ہو۔ [3] الطبقات الكبرى: 39/3، وتاريخ الطبري: 504/3. [4] المستدرك للحاكم: 25/3، والمغازي للواقدي: 219/1. حاکم نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ [5] الطبقات الكبرى: 48/2. اس کی سند پر تنقید کی گئی ہے، تاہم یہ شواہد و متابعات (تائیدی روایات) کی بنا پر قوی ہے۔

جب اسلامی لشکر شوط (44) کے مقام پر پہنچا تو منافق عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو منافق ساتھیوں کو لے کر واپس آ گیا۔ بہانہ یہ بنایا کہ مشرکین سے لڑائی نہیں ہو گی۔ اُس نے مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے پر بھی اعتراض کیا کہ آپ ﷺ نے بچوں (نوجوانوں) اور کم عقل لوگوں کی بات مان لی ہے۔ میری رائے نہیں مانی۔ پس ہم کیوں اپنی جانیں قربان کریں؟[1]

صحابہ میں سے ایک گروہ کا خیال تھا کہ ان منافقین سے جنگ کی جائے جبکہ دیگر صحابۂ کرام سیاسی ماحول کی دقتوں کے پیش نظر اسے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ اس پر یہ آیت اتری:

﴿فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ط﴾

''پھر تمھیں کیا ہوا کہ تم منافقین کے بارے میں دو گروہ ہو گئے، حالانکہ انھیں اللہ نے اس (عمل) کے سبب جو انھوں نے کمایا، (کفر کی جانب) واپس دھکیل دیا ہے۔''[2]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ (حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد) ان منافقین کے پاس

(44) شوط: مدینہ میں آج کل اس جگہ ملعب التعليم (Educational Play Ground) ہے، دیکھیے: (المدينة بين الماضي والحاضر للعياشي، ص: 369، ومعجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية للبلادي، ص: 170) واقدی کا کہنا ہے کہ وہ جگہ جہاں عبداللہ بن ابی اسلامی فوج سے علیحدہ ہوا احد کے قریب، شیخین کے پاس ہے، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 219/1)

[1] ابن اسحاق کی یہ روایت بغیر سند کے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 92/3، والمغازي للواقدي: 219/1، والطبقات الكبرٰى: 39/2، ودلائل النبوة للبيهقي: 208/3) بیہقی نے یہ روایت موسیٰ بن عقبہ کی مرسل سند سے نقل کی ہے۔ بخاری اور دیگر نے روایت کی کہ جب نبی ﷺ غزوۂ اُحد کو روانہ ہوئے تو ان افراد میں سے کچھ لوگ واپس آ گئے جو آپ ﷺ کے ساتھ نکلے تھے، دیکھیے: (صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة أحد، حديث: 4050، وفتح الباري: 232/15، ومرويات غزوة أحد للباكري، ص: 71) [2] النسآء 88:4. صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة أحد، حديث: 4050.

گئے اور کہنے لگے: ”میں تمھیں اللہ تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم اس نازک موقع پر جبکہ دشمن سر پر کھڑا ہے، اپنی قوم اور نبیِ کریم ﷺ سے غداری نہ کرو۔“ وہ کہنے لگے: ”اگر ہمیں یقین ہوتا کہ لڑائی ہوگی تو ہم ہرگز تمھیں چھوڑ کر نہ جاتے۔ لیکن ہمیں تو لڑائی ہوتی نظر نہیں آتی۔“ جب وہ کسی طرح بھی ماننے پر آمادہ نہ ہوئے تو عبداللہ بن حرام نے کہا: ”اللہ کے دشمنو! اللہ تمھیں دُور ہی رکھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبیِ کریم ﷺ کو تمھاری ضرورت ہی پیش نہ آنے دے گا۔“ اللہ تعالیٰ نے اس بات چیت کی طرف ان آیات میں اشارہ فرمایا ہے:

﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۝﴾

”اور اس (احد کے) دن جب دونوں لشکر آپس میں ٹکرائے تو تمھیں جو (نقصان) پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لیے بھی کہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور اس لیے بھی کہ وہ ان لوگوں کو جان لے جنھوں نے نفاق کیا اور ان (منافقوں) سے کہا گیا تھا کہ آؤ! اللہ کی راہ میں قتال کرو یا (شہر کا) دفاع کرو۔ انھوں نے کہا: اگر ہمیں لڑائی ہونے کا یقینی علم ہوتا تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ اس روز ایمان کی نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جو ان کے دلوں میں نہیں تھی۔ اور اللہ وہ بات خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔“ [1]

قریب تھا کہ خزرج میں سے بنوسلمہ اور اوس میں سے بنوحارثہ بھی منافقوں والی روش

[1] آل عمرٰن 3:166,167. ابن اسحاق نے اسے مرسل سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: 93/3)

اختیار کرتے مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل ایمان پر مضبوط کر دیے۔فرمانِ الٰہی ہے:

﴿اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ﴾

''اور جب تمھارے دو گروہوں نے کم ہمتی دکھانے کا ارادہ کیا، حالانکہ اللہ ان کا دوست و مددگار تھا۔''[1]

شیخین کے مقام پر رسول اللہ ﷺ نے کچھ کم عمر نوجوانوں کو واپس بھیج دیا کیونکہ وہ ابھی چودہ سال کے یا اس سے بھی کم عمر تھے۔ان میں عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، اُسامہ بن زید، نعمان بن بشیر، زید بن ارقم، براء بن عازب، اُسید بن ظُہَیر، عُرابہ بن اوس اور ابوسعید خدری وغیرہ رضی اللہ عنہم شامل تھے۔یہ کل چودہ لڑکے تھے۔ابن سید الناس نے اُن کا ذکر کیا ہے۔[2] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ذکر صحیح بخاری میں ہے۔[3] رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کو میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت دے دی کیونکہ آپ ﷺ کو بتایا گیا تھا کہ وہ ایک تیر انداز ہیں۔جب آپ نے رافع کو اجازت دی تو حضرت سمرہ بھی اڑ گئے کہ میں رافع سے زیادہ طاقتور ہوں اور اسے پچھاڑ سکتا ہوں۔ آپ نے اُن کو بھی اجازت دے دی۔[4] اس رات حضرت ذکوان بن عبدالقیس نے لشکر پر پہرہ دیا۔ایک قول یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے تحفظ کے لیے پہرہ دیتے تھے اور آپ سے کسی لمحے جدا نہیں ہوتے تھے۔[5]

[1] آل عمرٰن 3:122.صحیح البخاري، المغازي، باب:﴿اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ﴾، حدیث:4051، وصحیح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل سلمان وبلال و صهیب رضی اللہ عنہم، حدیث:2505. [2] عیون الأثر لابن سید الناس: 7/2. ان نوعمر صحابۂ کرام کے نام واقدی اور ابن ہشام نے بھی بغیر سند کے بیان کیے ہیں، دیکھیے: (المغازي للواقدي:216/1، والسیرة النبویة لابن هشام:96/3) [3] صحیح البخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب، حدیث:4097، وصحیح مسلم، الإمارة، باب بیان سنّ البلوغ،حدیث: 1868. [4] السیرة النبویة لابن هشام:96/3. روایت بلا سند ہے۔ [5] المغازي للواقدي:217/1. روایت بلا سند ہے۔

ہفتے کے دن صبح کے وقت اسلامی لشکر نے دشمن کے مقابل جانے کے لیے حرکت شروع کی تو راستے میں مِرْبَع بن قَیظی کے باغ سے گزر ہوا۔ یہ اندھا منافق تھا۔ وہ مسلمانوں کے چہروں پر مٹی پھینکنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتا جاتا تھا: ''اگر تو اللہ کا رسول ہے تو میں تجھے اپنے باغ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ اللہ کی قسم! اگر مجھے یقین ہو کہ تیرے علاوہ کسی اور کو نہیں لگے گی تو میں تیرے مُنہ پر کوئی چیز دے ماروں۔'' صحابہ اُسے قتل کرنے کے لیے لپکے مگر رسول اللہ ﷺ نے روک دیا اور فرمایا:

«لَا تَقْتُلُوهُ، فَهٰذَا الْأَعْمٰى أَعْمَى الْقَلْبِ، أَعْمَى الْبَصَرِ»

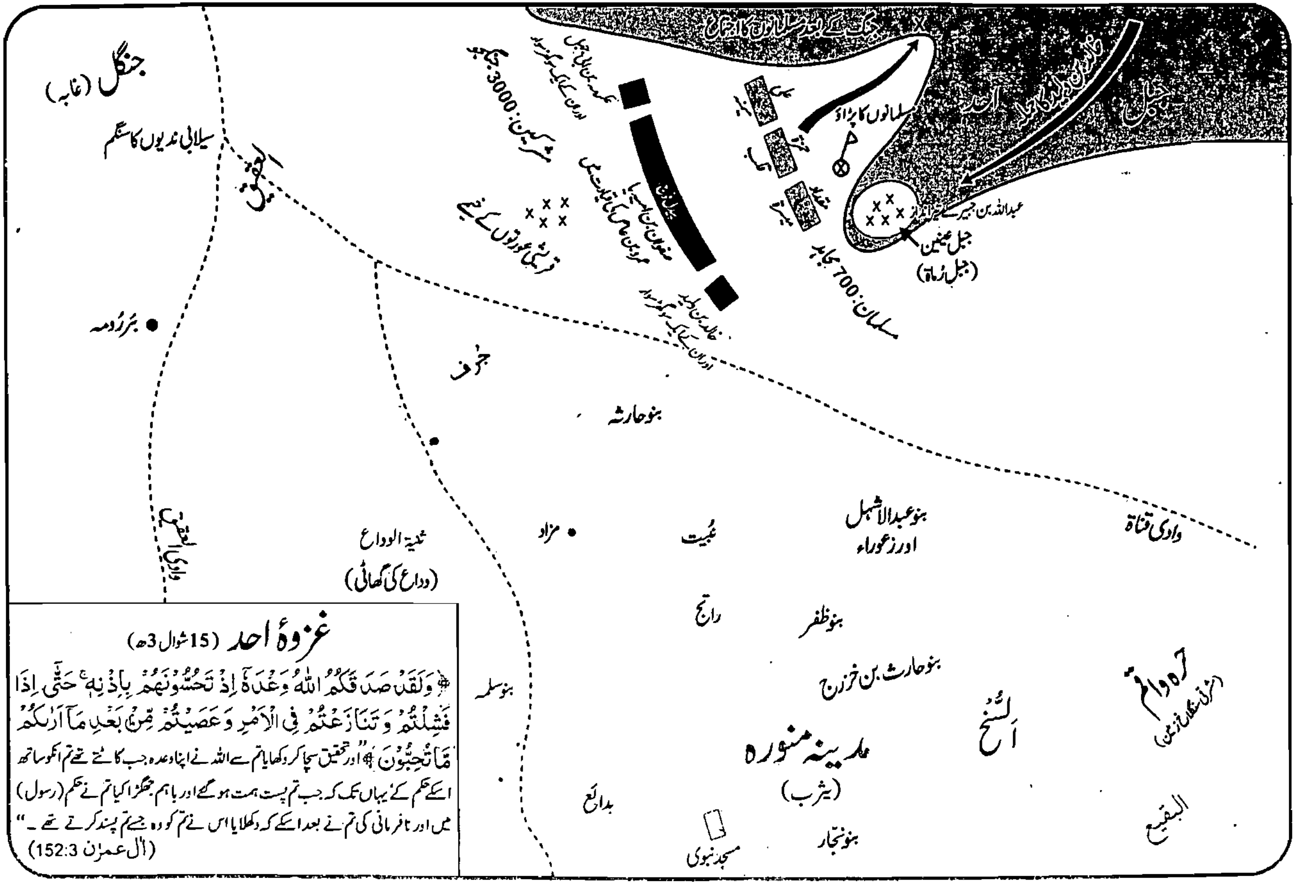
''اسے قتل کرنے کا کیا فائدہ؟ یہ تو خالص اندھا ہے۔ دل کا بھی اندھا، آنکھوں سے بھی اندھا۔''

لیکن آپ کے روکنے سے پہلے ہی حضرت سعد بن زید رضی اللہ عنہ نے اُس کا سر زخمی کر دیا۔ [1]

میدانِ جنگ کو جاتے ہوئے راستے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کہا: ''میری زرہ تم لے لو۔'' زید کہنے لگے: ''جس طرح آپ کی خواہش شہید ہونے کی ہے اُسی طرح میں بھی شہادت کا آرزو مند ہوں۔'' آخرکار دونوں میں سے کسی نے بھی زرہ نہیں پہنی۔ [2]

جب اسلامی لشکر اُحد پہاڑ کے پاس پہنچا تو رسول اللہ ﷺ نے پہاڑ کو پشت پر رکھا اور لشکر کا رخ مدینہ کی طرف کر لیا، پھر آپ نے حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں پچاس تیر انداز منتخب فرمائے اور انھیں جبلِ اُحد کے مقابل عَینین کے ٹیلے پر بٹھا دیا تاکہ دشمن مسلمانوں کا گھیراؤ نہ کر سکے، پھر آپ نے تاکید فرمائی:

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 94/3، و المغازي للواقدي: 218/1. [2] ہیثمی کے قول کے مطابق اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔ ہیثمی نے کہا: ''اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 298/5، و مرويات غزوة أحد للباكري، ص: 93)


غزوۂ احد (15 شوال 3ھ)
﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ﴾
"اور تحقیق سچا کر دکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ جب کاٹتے تھے تم انکو ساتھ اسکے حکم کے یہاں تک کہ جب تم پست ہمت ہو گئے اور باہم جھگڑا کیا تم نے حکم (رسول) میں اور نافرمانی کی تم نے بعد اسکے کہ دکھلایا اس نے تم کو وہ جسے تم پسند کرتے تھے۔"
(آل عمران 152:3)
جنگل (غابہ)
سیلابی ندیوں کا سنگم
جنگ کے بعد مسلمانوں کا اجتماع
جبل احد
خالد بن ولید کا حملہ
مسلمانوں کا پڑاؤ
عبداللہ بن جبیر کے تیر انداز
جبل عینین (جبل رماۃ)
مسلمان: 700 مجاہد
مشرکین: 3000 جنگجو
قریشی عورتوں کے خیمے
بروُمہ
جرف
بنو حارثہ
مزاد
ثنیۃ الوداع (وداع کی گھاٹی)
عُبیت
بنو عبدالاشہل اور زعوراء
وادی قناۃ
راتج
بنو ظفر
بنو سلمہ
بنو حارث بن خزرج
حرہ واقم
الشیخ
مدینہ منورہ (یثرب)
بدائع
مسجد نبوی
بنو نجار
البقیع

«إِنْ رَأَيْتُمُونَا تَخْطَفُنَا الطَّيْرُ فَلَا تَبْرَحُوا مَكَانَكُمْ هٰذَا حَتّٰى أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ»

''اگر تم دیکھو کہ پرندے ہماری لاشیں نوچ رہے ہیں تب بھی یہ جگہ نہ چھوڑنا جب تک میں خود تمھیں پیغام نہ بھیجوں۔'' [1]

یوں اسلامی لشکر تمام اونچی جگہوں پر خود قابض ہوگیا اور نشیبی جگہ لشکر قریش کے لیے چھوڑ دی تاکہ اُن کا مُنہ اُحد کی طرف اور پیٹھ مدینہ کی طرف ہو۔

جب دونوں لشکر گتھم گتھا ہوئے تو ابو عامر (45) عبدِ عمرو بن صیفی نے اپنی قوم اوس کو پکارا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ مشرکین کی صف میں آجائیں۔ لیکن انھوں نے اُسے بڑا سخت جواب دیا: ''او فاسق! اللہ تجھے کبھی کوئی خوشی دیکھنی نصیب نہ کرے۔'' وہ ہڑ بڑا کر کہنے لگا: ''میری قوم میرے بعد خراب ہوگئی ہے۔'' اور پھر وہ اُن پر پتھر پھینکنے لگا۔ [2]

(45) ابو عامر عبدِ عمرو بن صیفی: اس کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں کچھ اوسی نوجوانوں کے ساتھ مدینہ چھوڑ کر مکہ چلا گیا۔ یہ قریش سے کہا کرتا تھا: ''جب میری قوم میرے سامنے آئے گی تو سب میری بات مان کر میرے ساتھ آن ملیں گے؟'' ابو عامر راہب کے نام سے مشہور تھا۔ نبیِ کریم ﷺ نے اسے راہب کے بجائے ''فاسق'' کا لقب دیا۔ اُحد والے دن اس نے گڑھے کھودے تھے کہ مسلمان ان میں گر پڑیں۔ اُن میں سے ایک گڑھے میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ گر پڑے تھے۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ شخص جنگ اُحد میں اپنی قوم کے پچاس نوجوان اور کچھ حبشیوں کو لے کر آیا تھا۔ ابو عامر کا یہ تعارف ابن جریر نے قتادہ کے حوالے سے بیان کیا ہے اور ابن جریر سے شامی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، دیکھیے: (سبل الهدٰى والرشاد: 4/ 296,295)

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب ما يكره من التنازع والاختلاف في الحرب وعقوبة من عصى إمامه، حديث: 3039. احمد اور حاکم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''ہماری پشت کی حفاظت کرو۔ اگر تم ہمیں قتل ہوتا دیکھو تو ہماری مدد نہ کرنا اور اگر تم ہمیں غنیمت حاصل کرتا دیکھو تو ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا۔'' احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 209/4) [2] ابن اسحاق کی یہ روایت مرسل ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 98,97/3)

جنگ کا آغاز حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مشرکین کے علمبردار طلحہ بن عثمان کے درمیان دُو بدُو مقابلے سے ہوا۔ حضرت علی نے طلحہ کا کام تمام کر دیا۔ [1] پھر دونوں لشکر آپس میں الجھ پڑے اور لڑائی کا بازار گرم ہوگیا۔ مسلمانوں نے بڑی جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا اور مشرکین کو دھکیلتے ہوئے اُن کی قیام گاہ تک پہنچ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی روحانی قوت دوبالا کرنے کے لیے ایک تلوار اپنے دستِ مبارک میں پکڑی اور فرمایا:

«مَنْ يَّأْخُذُ مِنِّي هٰذَا؟» ''یہ تلوار مجھ سے کون لے گا؟''

ہر مسلمان میں، میں کہتا ہوا ہاتھ پھیلا کر آپ کی طرف بڑھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ يَّأْخُذُهٗ بِحَقِّهٖ؟» ''مجھ سے یہ تلوار لے کر اس کا حق کون ادا کرے گا؟''

لوگ ایک لمحے کے لیے رُکے۔ ابودجانہ سَماک بن خرشہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر پوچھا: ''اللہ کے رسول! اس کا حق کیا ہے؟'' فرمایا:

«أَنْ تَضْرِبَ بِهِ الْعَدُوَّ حَتّٰى يَنْحَنِيَ» ''تم اس سے دشمن کو اتنا مارو کہ یہ مڑ جائے۔''

وہ لپک کر کہنے لگے: '' اس کا حق میں ادا کروں گا۔'' پھر انھوں نے تلوار لے لی اور اہلِ باطل کی اس قدر کھوپڑیاں اڑائیں کہ فی الواقع اس مقدس تلوار کا حق ادا کر دیا۔ [2]

» والمغازي للواقدي : 223/1، والطبقات الكبرٰى : 40/2) [1] اسے طبری نے صحیح سند سے روایت کیا ہے، تاہم یہ روایت سدّی کی مرسل روایات میں سے ہے، دیکھیے: (تفسير الطبري: 281/7) [2] صحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل أبي دجانة......، حديث: 2470، ومسند أحمد: 123/3، والمستدرك للحاكم: 230/3. حاکم نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، تاہم باکری نے ان دونوں سے اتفاق نہیں کیا۔ انھوں نے اس امر کو حاکم و ذہبی کی غلطی قرار دیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اس کی سند کا ایک راوی عبیداللہ مجہول ہے، دیکھیے: (مرويات غزوة أحد للباكري، ص: 108) ابن سعد اور ابن ہشام نے بھی اس روایت کو سند کے بغیر نقل کیا ہے۔ ابن ہشام کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ حضرت ابودجانہ بڑے بہادر تھے۔ میدانِ جنگ میں خوب اکڑ اکڑ کر چلتے تھے۔ ان کے پاس سرخ رنگ کی ایک پٹی تھی۔ جب اُسے سر پر باندھ لیتے تو لوگ سمجھ «

جنگِ اُحد میں مسلمانوں کا شِعار (حرفِ رمز/Code Word) اَمِتْ، اَمِتْ (موت کے گھاٹ اتار دو) تھا۔[1] مسلمان اس شعار کے مفہوم کے مطابق موت سے بے خوف ہو کر لڑے۔ تاریخ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بے خوفی اور شجاعت کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔ انھوں نے سباع بن عبد العُزّٰی سے دو بدو مقابلہ کیا۔[2] اور اُسے عثمان بن ابی طلحہ، ابوشیبہ

◄◄ جاتے کہ آج یہ مرنے مارنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ احد کے دن جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ سے تلوار لی تو وہ پٹی نکالی اور اپنے سر پر باندھ لی اور دونوں لشکروں کے درمیان اکڑ کر چلنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: ”اللہ تعالیٰ ایسی متکبرانہ چال پسند نہیں کرتا مگر ایسے مواقع پر (یہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے)“ دیکھیے: (الطبقات الکبرٰی: 55/3، والسیرة النبویة لابن هشام: 97/3) حاکم کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ حضرت ابو دجانہ اس تلوار کے ساتھ لڑتے لڑتے پہاڑ تک پہنچ گئے۔ وہاں مشرکین کی عورتیں بیٹھی تھیں۔ ایک عورت کہہ رہی تھی: ”ہم ستاروں کی چھاؤں میں قالینوں پر چلنے والی نازک اندام نازنین ہیں......“ حضرت ابو دجانہ نے اُسے قتل کرنے کے لیے تلوار اٹھائی لیکن مناسب نہ سمجھا کہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار سے کسی عورت کو قتل کریں، چنانچہ اُسے چھوڑ دیا۔ مؤرخین نے یہ ضعیف روایت بھی بیان کی ہے کہ جب وہ اکڑ اکڑ کر چل رہے تھے تو ساتھ ہی یہ شعر بھی پڑھ رہے تھے: ”میں وہ شخص ہوں کہ جب ہم پہاڑ کے دامن میں نخلستان کے قریب تھے تو مجھ سے میرے خلیل مکرم ﷺ نے یہ عہد لیا کہ میں کبھی بھی پچھلی صف میں کھڑا نہیں ہوں گا اور اللہ اور اس کے رسول کی تلوار چلاتا رہوں گا۔“ دیکھیے: (مرویات غزوة أحد للباکري، ص: 109) [1] حاکم نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے اس کے متعلق سکوت کیا ہے۔ دارمی نے اس روایت کو اختصار سے نقل کیا ہے۔ اور سیرت ابن ہشام کے محققین کا کہنا ہے: ”احمد، ابوداود اور حاکم کی سند عکرمہ کے باوجود صحیح ہے، تاہم یہاں عکرمہ کی روایت ایاس بن صالح سے ہے۔ حاکم ہی کی ایک حدیث، جس کی سند میں ابوعُمیس نے اِیاس سے روایت کی، عکرمہ کی روایت کی تائید کرتی ہے۔“ حاکم کا کہنا ہے کہ یہ روایت مسلم کی شرط پر پورا اترتی ہے۔ دارمی نے کہا کہ یوں یہ حدیث صحیح قرار پاتی ہے، دیکھیے: (سنن أبي داود، الجهاد، باب في الرجل ینادي بالشعار، حدیث: 2596، ومسند أحمد: 46/4، وسنن الدارمي: 219/2، والمستدرك للحاکم: 108,107/2، والسیرة النبویة لابن هشام: 99/3، والمغازي للواقدي: 234/1) [2] صحیح البخاري، المغازي، باب قتل حمزة بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، حدیث: 4072، والمغازي للواقدي: 308/1.

جو اس دن مشرکین کے علمبرداروں میں سے تھا اور دیگر مشرکین کے ساتھ واصلِ جہنم کیا۔[1]

جبیر بن مطعم نے اپنے حبشی غلام وحشی سے کہہ رکھا تھا کہ اگر تو میرے چچا طُعَیمہ بن عدی (جسے جنگ بدر میں حضرت حمزہ نے قتل کیا تھا) کے بدلے حمزہ کو قتل کر دے تو تو آزاد ہے۔ وحشی صرف اسی مقصد کے لیے اُحد میں آیا تھا۔ وہ ایک پتھر کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ جونہی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ قریب سے گزرے اُس نے اچانک ایک برچھا دُور ہی سے تاک کر اُن کی طرف پھینکا۔ وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے بدن کے آر پار ہوگیا۔ یوں وحشی نے انھیں دھوکے سے قتل کر دیا۔[2]

واقدی کی روایت ہے کہ جب وحشی کو حضرت حمزہ کی موت کا یقین ہوگیا تو وہ چھپ چھپا کر اُن کی لاش کے پاس گیا اور اُن کا جگر نکال لیا تاکہ وہ ہند سے اس کی قیمت وصول کر سکے۔ اُسے علم تھا کہ ہند کو بدر کی جنگ میں اپنے باپ، چچا اور بھائی کے قتل کا سخت صدمہ ہے۔ وہ جگر لے کر ہند کے پاس گیا اور کہا کہ یہ حمزہ کا جگر ہے۔ ہند نے یہ جگر چبایا، پھر اگل دیا۔ اُس نے اپنے قیمتی کپڑے اور زیورات اتار کر وحشی کو انعام میں دے دیے اور وعدہ کیا کہ مکہ جا کر وہ اُسے بہت سے دینار بھی دے گی، پھر وحشی نے اُسے حضرت حمزہ کی لاش دکھائی تو اُس نے اُن کا آلۂ تناسل، خصیتین، ناک اور کان کاٹ کر اُن کے کنگن اور پازیب بنا کر پہنے۔[3]

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بے جگری سے لڑتے لڑتے شہید ہوئے۔ اُن کی شہادت کے بعد جھنڈا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اٹھا لیا۔[4] مسلمان خوب ڈٹ کر لڑے۔ مشرکین کو

[1] المغازي للواقدي: 307/1. [2] یہ وحشی کی اُس طویل روایت کا اقتباس ہے جو امام بخاری نے نقل کی ہے۔ بخاری کے علاوہ اس واقعے کو احمد اور ابن اسحاق نے بھی نقل کیا ہے۔ ابن اسحاق نے بخاری کی سند سے ہو بہو انھی کی روایت نقل کی ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 3/102-105، والفتح الرباني: 60,59/21) [3] المغازي للواقدي: 289/1. [4] تاريخ خليفة بن خياط، ص: 67. یہ ابن میسب کی مرسل قوی روایت ہے۔

بڑھ چڑھ کر قتل کیا اور اُن کے تمام علمبردار ہلاک کر ڈالے۔ مشرکین نے اپنے جھنڈے کو یونہی پڑا رہنے دیا، پھر ان میں سے کوئی اس کے قریب نہیں آتا تھا۔ [1]

اس مرحلے میں تو مسلمان ہی فتح یاب ہوئے۔ اسی کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ﴾

''اور یقیناً اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تھا جب تم (اُحد میں) اُن (مشرکین) کو اُس کے اذن سے (گاجر مولی کی طرح) کاٹ رہے تھے۔'' [2]

تیراندازوں کی لغزش

مشرکین اپنی عورتوں سمیت بھاگنے لگے۔ عورتیں کپڑے اٹھائے، پنڈلیاں ننگی کیے بھاگ رہی تھیں۔ ان کی پازیبیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ حضرت ابن جُبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھی کہنے لگے: ''اولوگو! غنیمت لوٹو۔ مسلمان غالب آچکے۔ اب تم کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟'' حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ارے کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بھول گئے؟'' وہ کہنے لگے: ''بخدا! ہم ضرور لوگوں کے پاس جائیں گے اور غنیمت لوٹیں گے۔'' اور وہ غنیمت جمع کرنے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔

اِدھر یہ غلطی ہوئی اُدھر خالد بن ولید کو موقع مل گیا۔ وہ چکر کاٹ کر آئے اور مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا۔ بھاگتے ہوئے مشرکین نے خالد بن ولید کو دیکھا تو وہ بھی میدان جنگ میں پلٹ آئے۔ [3] اور مسلمانوں کو آگے پیچھے سے دبا لیا۔ اس ناگہانی افتاد پر

[1] ابن اسحاق کی یہ راویت بسند حسن ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 112/3). [2] آل عمرٰن 152:3. صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة أحد، قبل الحديث: 4041. [3] یہ سُدّی کی ایک مرسل روایت ہے جسے طبری نے بیان کیا ہے، دیکھیے: (تفسير الطبري (تحقيق أحمد شاكر): ◄◄

مسلمان اس قدر پریشان ہوگئے کہ انھیں کافر مسلمان کی کوئی تمیز نہ رہی۔ کئی مسلمان خود اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔ اُن میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد یمان رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ چیختے رہ گئے: ''اللہ کے بندو! یہ تو میرے والد ہیں۔'' جب وہ غلطی سے قتل ہوگئے تو حذیفہ کہنے لگے: ''اللہ تمھیں معاف کرے۔ اس ناگہانی حملے میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو شہید کر دیا گیا۔''[1]

دوسری مصیبت یہ آپڑی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل ہوگئے اور مشہور ہوگیا کہ آپ شہید ہو چکے ہیں۔[2] اس سے مسلمانوں کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔

بہت سے مسلمان تو آپا دھاپی میں میدان سے بھاگ گئے۔ کئی ایک ہتھیار پھینک کر بیٹھ گئے کہ اب زندگی کا کیا فائدہ۔[3] کچھ مسلمان کافروں سے مسلسل نبرد آزما رہے بلکہ دوسرے مسلمانوں کو بھی لڑنے کی ترغیب دیتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ بھی شہید ہوگئے۔

◄◄ 282,281/7، حدیث: 8004. اسے ابن اسحاق نے بھی بسند حسن روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 112/3) انھوں نے یہ بیان نہیں کیا کہ گھیرا ڈالنے والے خود خالد تھے۔

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب: (18)، حديث: 4065، والمستدرك للحاكم: 202/3. حاکم نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے ان کے اس حکم کو برقرار رکھا ہے۔ محدث احمد شاکر مصری نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ حذیفہ کے والد یمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ کہ اوّل اوّل وہ بچوں اور عورتوں کے پاس پیچھے قلعوں میں رہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو لیے اور شہید ہوئے۔ اسے ابنِ اسحاق نے بسند حسن نقل کیا ہے، دیکھیے: (مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 209/4-211، والسيرة النبوية لابن هشام: 128,127/3) [2] فتح الباري: 226/15. یہ سُدی کی روایت ہے جسے ابن حجر نے طبری کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ ابن اسحاق نے بھی اسے بسند حسن روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 112/3) [3] ابن اسحاق نے اسے مرسل صحیح سند سے نقل کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 120/3، والمغازي للواقدي: 280/1، وتاريخ الطبري: 517/2، وتفسير الطبري: 256/7)

ان میں حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ بھی تھے جنھیں جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکنے کی بنا پر اپنی سابقہ محرومی کی تلافی کرنے کا بڑا شوق تھا۔ جب انھوں نے کچھ مسلمانوں کو ہتھیار چھوڑے مایوس بیٹھے دیکھا تو کہنے لگے: ''اے اللہ! میں تیرے روبرو اُس غلطی کی معذرت پیش کرتا ہوں جو میرے ساتھیوں سے ہوئی اور ان مشرکوں نے جو کیا اُس سے تیرے حضور بری ہوتا ہوں۔'' پھر میدانِ جنگ کی طرف بڑھے۔ آگے حضرت سعد بن معاذ آتے دِکھائی دیے، کہنے لگے: ''سعد! میرے باپ نضر کے ربّ کریم کی قسم! مجھے تو اُحد کے پاس جنت کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔'' بعد میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے رسولِ کریم ﷺ سے کہا: ''اللہ کے رسول! میں یہ سن کر ان کے ساتھ چلا مگر وہ جوہر نہ دکھا سکا جو انھوں نے دکھائے۔'' لڑائی ختم ہوئی تو وہ اس حالت میں شہید پائے گئے کہ اُن کے جسم پر تلوار، تیر اور نیزے کے اسّی سے زیادہ زخم تھے۔ زخموں کی بہتات کے باعث وہ پہچانے نہ جاتے تھے۔ اُن کی بہن رُبیع نے انھیں انگلیوں کی پوروں سے پہچانا۔ اُن جیسے مخلص مجاہدین کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۝﴾

''ایمان والوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ سچ کر دکھایا۔ اُن میں سے کچھ اپنی مراد پا گئے (شہید ہو گئے) اور کچھ ابھی انتظار کر رہے ہیں۔ انھوں نے (اپنے عہد میں) ذرا بھر تبدیلی نہیں کی۔''[1]

[1] الأحزاب 33:23. صحیح البخاري، الجهاد والسیر، باب: (11)، حدیث: 2805، وصحیح مسلم، الإمارة، باب ثبوت الجنة للشهید، حدیث: 1903، والسیرة النبویة لابن هشام: 120/3. ان کی روایت مختصر اور دو سندوں سے ہے۔ ان میں سے ایک سند قابلِ قبول اور دوسری ضعیف ہے۔ ضعیف سند کی تائید شیخین اور دیگر کی روایت سے ہوتی ہے۔ آیت کی شانِ نزول کے بارے میں دیکھیے: (المستدرك للحاکم: 200/3) حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے اُن کی موافقت کی ہے۔

اُدھر بھاگنے والے اس قدر سراسیمہ تھے کہ مڑ کر پیچھے بھی نہیں دیکھتے تھے، حالانکہ رسولِ اکرم ﷺ لوگوں کو اپنے پاس ثابت قدم رہنے کے لیے پکار رہے تھے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿ اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ فِىۡۤ اُخۡرٰٮكُمۡ ﴾

”جب تم بھاگے چلے جارہے تھے اور مڑ کر کسی کو نہیں دیکھتے تھے جبکہ رسول (ﷺ) تمھیں تمھاری پچھلی جماعت میں کھڑے پکار رہے تھے۔“ [1]

اللہ تعالیٰ نے بھاگنے والوں کو معاف فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡكُمۡ يَوۡمَ الۡتَقَى الۡجَمۡعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسۡتَزَلَّهُمُ الشَّيۡطٰنُ بِبَعۡضِ مَا كَسَبُوۡا ۚ وَلَقَدۡ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ۝ ﴾

”بلاشبہ وہ لوگ جو تم میں سے پلٹ گئے، اُس دن جبکہ دو جماعتیں آپس میں ٹکرائیں۔ انھیں محض شیطان نے پھسلا دیا تھا اُن (کوتاہیوں) کے سبب جو انھوں نے کیں۔ اور بلاشبہ اللہ نے اُنھیں معاف کر دیا، بلاشبہ اللہ بہت بخشنے والا، بہت حوصلے والا ہے۔“ [2]

امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بھاگنے کا ایک سبب نبی ﷺ کی شہادت کی افواہ تھی۔ [3]

اس افراتفری میں جس صحابی کو سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے زندہ ہونے کا پتہ چلا وہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے وفورِ مسرت سے بہ آوازِ بلند یہ خوشخبری سنانی شروع کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں چپ کرا دیا کہ مبادا مشرکین کو آپ کا پتہ

[1] آل عمرٰن 153:3۔ [2] آل عمرٰن 155:3۔ زاد المسیر کے محققین کا بیان ہے کہ احمد، ابویعلیٰ، طبری اور بزار نے اس آیت کے متعلق بسند حسن روایت کی کہ یہ آیت اُن مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی، جو اُحد کے دن بھاگ کھڑے ہوئے۔ دیکھیے: (زادالمسیر: 483/1) [3] زاد المسیر: 483/1.

چل جائے۔[1]

بعض مشرکین رسول اللہ ﷺ تک پہنچ بھی گئے۔ اُس وقت آپ کے پاس صرف سات انصار اور دو قریشی صحابہ تھے۔ جب مشرکین آپ کے بالمقابل گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ يَرُدُّهُمْ عَنَّا وَلَهُ الْجَنَّةُ، أَوْ هُوَ رَفِيقِي فِي الْجَنَّةِ؟»

''جو ان مشرکین کو مجھ سے دور کرے گا، اُس کے لیے جنت ہے، یا (فرمایا:) وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا۔''

وہ یکے بعد دیگرے آپ کے دفاع میں آگے بڑھتے گئے حتی کہ ساتوں انصاری شہید ہوگئے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے دو قریشی ساتھیوں سے کہا: ''ہم نے اپنے ان بھائیوں سے انصاف نہیں کیا۔''[2]

تاریخ نے رسول اللہ ﷺ کے دفاع میں شدید لڑائی کرنے والے جن لوگوں کے نام محفوظ رکھے ہیں اُن میں سے ایک حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ (46) ہیں۔ آپ ﷺ کے

(46) حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ: طلحہ بن عبیداللہ ہی ہیں جو احد کی گھاٹی میں جبکہ کفار نے مسلمانوں کو گھیر رکھا تھا، رسول اللہ ﷺ کے نیچے بیٹھ گئے تاکہ آپ ﷺ کو اٹھا کر پہاڑ کی اُوپری چٹان پر پہنچا دیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اُن کے لیے فرمایا تھا: ''طلحہ نے (جنت) واجب کر لی۔'' اس حدیث کو ابن اسحٰق نے بسند حسن روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 126/3، وصحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، باب ذكر طلحة بن عبيد الله، حديث: 3724) رسول اللہ ﷺ نے اُن کے متعلق یہ بھی فرمایا تھا: ''جو زمین پر چلتے ہوئے کسی شہید کو دیکھنا چاہے وہ طلحہ بن عبیداللہ کو دیکھ لے۔'' البانی نے لکھا: ''اسے اصبہانی نے شواہد کی بدولت صحیح ثابت ہونے والی سند سے روایت کیا ہے۔'' دیکھیے: (سلسلة الأحاديث الصحيحة: 32/2)

[1] یہ ایک حدیث کا اقتباس ہے جسے حاکم نے روایت کیا ہے۔ انھوں نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے اُن کے اس حکم کو برقرار رکھا ہے۔ ابونُعیم نے بھی اسے ابن اسحاق کی روایت سے بسند حسن و متصل نقل کیا ہے، دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 201/3، ودلائل النبوة: 482/2) [2] صحيح مسلم، ◄◄

تحفظ میں اُن کا/وہ ہاتھ ناکارہ ہوگیا جسے انھوں نے آپ ﷺ کی طرف آنے والے ہر تیر، نیزے اور تلوار کے لیے ڈھال بنا رکھا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی اُن جاں نثاروں میں شامل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ انھیں بنفسِ نفیس تیر پکڑاتے اور فرماتے تھے:

«يَاسَعْدُ! اِرْمِ فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي»

''سعد! تیر چلا، تجھ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص کے علاوہ کسی کے لیے یہ الفاظ نہیں کہے۔

حضرت ابوطلحہ انصاری بھی اُن خوش قسمت افراد میں سے ایک ہیں۔ یہ انتہائی ماہر تیرانداز تھے۔ جب کوئی اور شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس سے ترکش میں تیر لیے گزرتا تو آپ فرماتے:

«اُنْثُرْهَا لِأَبِي طَلْحَة» ''یہ تیر ابوطلحہ کے لیے بکھیر دو۔''

رسول اللہ ﷺ کافروں کو دیکھنے کے لیے سر اونچا کرتے تو ابوطلحہ عرض کرتے تھے: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان! سر اونچا نہ کیجیے۔ مبادا دشمن کا کوئی تیر آپ کو لگ جائے۔ آپ کی طرف آنے والے ہر تیر کے لیے میرا سینہ حاضر ہے۔''[2] ابوطلحہ ہی ہیں جن سے خوش ہو کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَصَوْتُ أَبِي طَلْحَةَ فِي الْجَيْشِ أَشَدُّ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مِنْ فِئَةٍ»

''ابوطلحہ کی آواز مشرکین پر ایک پورے لشکر سے بھی زیادہ بھاری ہے۔''[3]

◄◄ الجهاد والسير، باب غزوة أحد، حديث: 1789. [1] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة أحد، حديث: 4057-4059. [2] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة أحد، حديث: 4064.

[3] الفتح الرباني: 589/22. اس کی سند کے راوی ثقہ ہیں۔ اور واقدی کے الفاظ ہیں: ''لشکر میں ابوطلحہ کی آواز چالیس آدمیوں سے بہتر ہے۔'' دیکھیے: (المغازي للواقدي: 243/1)

حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ اپنی پشت تیروں کی طرف کیے ہوئے رسول اللہ ﷺ پر جھکے ہوئے تھے۔ اُن کی پشت پر ہر طرف تیر ہی تیر پیوست تھے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے بھی اتنے تیر چلائے کہ آپ کی کمان کا ایک کنارہ ٹوٹ گیا۔ وہ کمان حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ نے (بطورِ تبرک) لے لی اور وہ اُنھی کے پاس رہی۔ اُس دن حضرت قتادہ کی آنکھ پر ایسی چوٹ لگی کہ آنکھ نکل کر رخسار پر ڈھلک آئی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے آنکھ اس کی جگہ پر ٹکا دی تو وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آنے لگی اور نظر بھی بہت تیز ہوگئی۔ [2]

ان مشکل اور نامساعد حالات میں حضرت ام عمارہ نُسَیبہ بنت کعب مازنیہ بھی بے خود ہوکر آپ کا دفاع کرنے لگیں حتی کہ ملعون ابن قمئہ نے اُن کے کندھے پر گہرا زخم لگا

---

[1] ابن اسحاق کی یہ روایت بغیر سند کے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 119,118/3) [2] ابن اسحاق کی یہ روایت منقطع سند سے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 119/3) اسے حاکم نے بھی روایت کیا ہے ذہبی نے اس کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے، دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 295/3) ہیثمی نے لکھا: ''اسے طبرانی نے روایت کیا اور اس میں موجود ایک راوی کو میں نہیں جانتا۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 113/6، والمغازي للواقدي: 242/1) ابن حجر نے لکھا: ''اسے دارقطنی اور ابن شاہین نے قتادہ کی سند سے نقل کیا۔ دارقطنی اور بیہقی نے اسے قتادہ ہی کی ایک اور سند سے روایت کیا ہے۔'' دیکھیے: (الإصابة: 217/3) ابن اثیر اس روایت کو جس سند سے لائے ہیں اُس میں عبدالعزیز بن عمران نامی راوی متروک ہے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 3/251-253، ومرويات غزوة أحد للباكري، ص: 223-227) تمام بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ روایت کسی ایسی سند سے نہیں آئی جسے انفرادی طور پر قبول کیا جا سکے، تاہم تمام سندیں مل کر اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ واقعے کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور ہے۔ سیرت الرسول ﷺ کے محقق سید بن عباس جلیمی نے اس روایت کی تمام سندیں اکٹھی کر کے اُن کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس حدیث کی بعض سندیں ایک دوسری کی تقویت کا باعث ہیں۔ یوں یہ حدیث حسن یا اس سے بھی اعلیٰ درجے کی ہے۔ اس کی اکثر سندیں ناقابل اعتبار ہیں اور بعض سندوں میں اضطراب پایا جاتا ہے۔

دیا۔[1] رسول اللہ ﷺ نے بڑی ثابت قدمی سے مقابلہ کیا۔ آپ کو کئی زخم لگے۔ آپ کا رباعی دانت ٹوٹ گیا۔(47) چہرۂ مبارک زخمی ہوگیا۔ خون بہنے لگا۔ آپ خون صاف کرتے اور فرماتے جاتے تھے: ''وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جس نے اپنے نبی کا چہرہ خون آلود کر دیا جبکہ وہ انھیں اسلام کی طرف بُلا رہا ہے۔'' اُدھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ۝﴾

''(اے نبی!) آپ کا اس معاملے میں کچھ اختیار نہیں، اللہ چاہے تو ان کی توبہ قبول کر لے، چاہے تو انھیں عذاب دے کیونکہ وہ بلاشبہ ظالم ہیں۔''[2]

رسول اللہ ﷺ کو اُن کے ایمان کی کچھ امید نظر آئی تو بارگاہِ الٰہی میں فوراً عرض گزار ہوئے:

«رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ»

''رب کریم! میری قوم کو معاف کر دے کہ یہ جانتے نہیں۔''[3]

صحیح بخاری کی روایات میں ہے کہ اُس دن رسول اللہ ﷺ کا رباعی دانت ٹوٹا، چہرۂ مبارک زخمی ہوا اور سَر کا خود ٹوٹ گیا۔ مشرکین نے آپ کے ساتھ یہ سلوک کیا تو آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا اُن لوگوں پر سخت غضب ہے جنھوں نے اُس کے نبی کے ساتھ یہ برتاؤ کیا۔'' آپ ﷺ اپنے دانت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرما رہے تھے:

''اللہ تعالیٰ کا اُس شخص پر سخت غضب ہے جسے اللہ کا رسول، اللہ کے راستے (جہاد)

(47) رباعی دانت: ثنایا (سامنے والے اوپر نیچے کے دو دو دانتوں) کے ساتھ دائیں بائیں اوپر نیچے کے چار دانت رباعی کہلاتے ہیں۔ امام احمد بن محمد شافعی قسطلانی نے نبی ﷺ کا نچلا دایاں رباعی دانت ٹوٹنے کی خبر دی ہے، دیکھیے: (إرشاد الساري: 118/9)

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 118/3، والمغازي للواقدي: 268/1، 269. سند منقطع ہے۔
[2] آل عمرٰن 128:3. صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب غزوة أحد، حديث: 1791. [3] صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب غزوة أحد، حديث: 1792.

میں قتل کر دے۔“[1]

ایک روایت کے الفاظ ہیں: ”اللہ تعالیٰ کا اُس شخص پر سخت غضب ہے جسے نبی اللہ کے راستے (جہاد) میں قتل کر دے۔ اللہ تعالیٰ کا اُن لوگوں پر سخت غضب ہے جنھوں نے اللہ کے نبی (ﷺ) کا چہرہ خون آلود کیا۔“[2]

رسول اللہ ﷺ کی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے سر اور چہرے کا خون دھو رہی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ڈھال میں پانی لاتے اور زخموں پر بہاتے جاتے تھے۔ مگر پانی ڈالنے سے خون کا بہاؤ تیز ہو رہا تھا۔ حضرت فاطمہ نے یہ دیکھا تو چٹائی کا ایک ٹکڑا جلا کر اُس کی راکھ زخموں پر جما دی جس سے خون بند ہو گیا۔[3]

اس جنگ میں بھی ایمانی قوت اور شجاعت کے زبردست مظاہرے ہوئے۔ ایک صحابی نے نبیٔ کریم ﷺ سے پوچھا: ”اگر میں قتل ہو جاؤں تو مجھے بتائیں میں کہاں ہوں گا؟“ آپ نے فرمایا: «فِي الْجَنَّةِ» ”جنت میں۔“ اس صحابی کے ہاتھ میں کچھ کھجوریں تھیں۔ انھوں نے وہ کھجوریں پھینک دیں اور بے تحاشا لڑائی لڑنے لگے حتی کہ شہید ہو گئے۔[4]

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے جنگ سے قبل الہامی الفاظ کہے تھے: ”(اے اللہ!) میں قسم کھاتا ہوں کہ جب ہم دشمن سے ٹکرائیں تو وہ مجھے قتل کر دیں۔ میرا پیٹ پھاڑ دیں،

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب ما أصاب النبيﷺ من الجراح يوم أحد، حديث: 4073-4076. [2] امام بخاری کے علاوہ ابن اسحاق نے بغیر سند کے اس روایت کا ایک جز بیان کیا ہے، جس کے الفاظ ہیں: ”اُس پر اللہ کا سخت غضب ہے جس نے اُس کے نبی کا چہرہ خون آلود کر دیا۔“ دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 124/3) [3] صحيح البخاري، المغازي، باب ما أصاب النبيﷺ من الجراح يوم أحد، حديث: 4075. [4] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة أحد، حديث: 4046.

میرے ناک کان کاٹ دیں حتی کہ میری شکل بگاڑ دیں، پھر جب میں تجھ سے ملوں اور تو مجھ سے پوچھے: ''یہ کیوں ہوا؟'' تو میں جواب دوں: ''مولائے کریم! تیری خاطر!'' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دشمن سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن جحش نے دادِ شجاعت دی۔ دشمن نے اُن سے وہی سلوک کیا جس کے وہ آرزومند تھے۔ وہ اسی حالت میں شہید پائے گئے جو اُنھوں نے بیان کی تھی۔ [1]

حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ اپنے چار بیٹوں سمیت جنگ میں شریک ہوئے۔ بیٹے اُن کی ٹانگوں کے شدید لنگڑے پن کی وجہ سے انھیں جنگ میں شرکت سے روک رہے تھے لیکن وہ نہ مانے۔ آخر رسول اللہ ﷺ نے بیٹوں سے فرمایا کہ اگر یہ شہید ہی ہونا چاہتے ہیں تو انھیں نہ روکو۔'' انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا: ''اگر آج میں شہید ہوجاؤں تو کیا اپنے اسی لنگڑے پن کے ساتھ جنت میں چلا جاؤں گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ!» ''ضرور!'' تو وہ چہک کر کہنے لگے: ''قسم اُس ذاتِ اقدس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! میں آج ہی اس لنگڑے پن کے ساتھ جنت پہنچ جاؤں گا، ان شاء اللہ۔'' پھر وہ خوب لڑے حتی کہ اپنا مقصود و مطلوب (شہادت) پالیا۔ [2]

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

مؤرخین اور سیرت نگار بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سعد بن ربیع کی

[1] اسے حاکم نے سعید بن مسیب کی مرسل سند سے روایت کیا ہے۔ حاکم کا کہنا ہے: ''اگر یہ حدیث مرسل نہ ہوتو بخاری و مسلم کی شرط پر پوری اترتی ہے۔'' ذہبی نے کہا: ''مرسل صحیح ہے۔'' دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 199/3) [2] كتاب الجهاد لابن المبارك، ص: 69. یہ عکرمہ کی مرسل روایت ہے اور احمد نے اسے اسحاق کی سند سے اختصار کے ساتھ روایت کیا ہے، دیکھیے: (مسند أحمد: 299/5) ہیثمی کے مطابق اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں سوائے یحییٰ بن نصر انصاری کے، وہ ثقہ ہیں، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 315/9)

خبر کون لائے گا؟ میں نے اُسے ادھر۔ وادی کے ایک کنارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔اس حالت میں دیکھا ہے کہ اُس کے جسم میں بارہ نیزے پیوست ہیں۔''

یہ سن کر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اور ایک روایت کے مطابق ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اُس طرف تیزی سے بھاگے۔ وہ کہتے ہیں: ''میں مقتولین میں انھیں تلاش کرتا پھر رہا تھا کہ میں نے انھیں نشیب میں بے سُدھ پڑا پایا۔ میں نے انھیں آواز دی۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا، پھر میں نے کہا: ''مجھے رسول اللہ ﷺ نے تمھاری طرف بھیجا ہے۔'' یہ سن کر انھوں نے یوں سانس لیا جیسے دھونکنی ہوا کھینچتی ہے، پھر کہا: ''واقعی رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں؟'' میں نے کہا: ''ہاں!'' اُنھی نے ہمیں بتایا ہے کہ تمھارے جسم میں بارہ نیزے پیوست ہیں۔ وہ کہنے لگے: ''واقعی مجھے بارہ نیزے لگے ہیں۔ ہر نیزہ پیٹ میں گڑ گیا ہے۔ اپنی قوم انصار کو میرا سلام کہہ کر یہ پیغام پہنچا دینا: اللہ سے ڈرتے رہو اور رسول اللہ ﷺ سے عقبہ کی رات کیے گئے معاہدے اور بیعت پر ڈٹ جاؤ۔ اللہ کی قسم! اگر کوئی دشمن رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گیا جبکہ تم میں سے ایک میں بھی زندگی کی رمق باقی ہو تو اللہ تعالیٰ کے ہاں تمھارا کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہوگا۔'' اور ...... میرے کھڑے کھڑے اُن کی روح پرواز کر گئی۔ میں نے جا کر رسول اللہ ﷺ کو ساری بات سنائی۔ آپ ﷺ نے معاً قبلہ رخ ہو کر ہاتھ اٹھا دیے اور بڑی دلسوزی سے دعا کی:

«اَللّٰهُمَّ! الْقَ سَعْدَ بْنَ الرَّبِيعِ وَأَنْتَ عَنْهُ رَاضٍ»

''اے اللہ! سعد بن ربیع سے خوش ہو کر ملنا۔''

یہ واقدی کے الفاظ ہیں۔ ابن اسحاق کی روایت میں اُس شخص کا نام نہیں بتایا گیا جسے اُن کی خبر لانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اُس روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''کون جا کر دیکھے گا کہ سعد بن ربیع کا کیا حال ہے؟ وہ زندوں میں ہے یا شہیدوں میں؟''

ایک انصاری نے کہا: ''اللہ کے رسول! میں دیکھ کر آتا ہوں کہ سعد کا کیا بنا۔'' وہ گیا تو انھیں شہیدوں کے درمیان شدید زخمی حالت میں پایا۔ اُن میں زندگی کی کچھ رمق باقی تھی۔ انصاری نے اُن سے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے مجھے بھیجا ہے کہ دیکھوں تم زندوں میں ہو یا شہیدوں میں؟'' وہ کہنے لگے: ''بس میرا آخری دم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت عالیہ میں میرا سلام پہنچا دینا اور عرض کرنا: ''سعد بن ربیع کہتا ہے: اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری طرف سے وہ بہترین جزا عطا فرمائے جو اللہ تعالیٰ کسی بھی نبی کو اس کی امت کی طرف سے عطا فرمائے گا۔'' پھر اپنی قوم انصار کو بھی میری طرف سے سلام پہنچانا اور کہنا: ''سعد بن ربیع تمھیں تاکید کرتا ہے کہ اگر تم میں سے ایک آنکھ بھی متحرک ہوئی اور اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ تک کوئی دشمن پہنچ گیا تو تم اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی عذر پیش نہیں کر سکو گے۔'' ابھی میں کھڑا ہی تھا کہ وہ فوت ہو گئے۔ میں نے آ کر یہ پورا واقعہ رسول اللہ ﷺ کے گوش گزار کر دیا۔ [1]

اگرچہ اللہ تعالیٰ نے کمزور بوڑھوں کو معذور قرار دیتے ہوئے میدانِ جنگ میں جانے سے مستثنیٰ رکھا ہے۔ مگر حضرت یمان اور ثابت بن وقش رضی اللہ عنہما نے عورتوں اور بچوں کے ساتھ قلعے میں رہنا پسند نہ کیا اور شہادت کے شوق میں میدانِ جنگ پہنچ گئے۔ حضرت ثابت تو کافروں کے ہاتھوں شہید ہوئے لیکن حضرت یمان غلطی سے مسلمانوں ہی کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن کی دیت دینا چاہی لیکن اُن کے بیٹے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اپنے والد محترم کی دیت معاف کر دی جس سے رسول اللہ ﷺ کی نظر میں اُن کی

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 137/3. اس روایت کی سند منقطع ہے۔ حاکم نے بھی اسے ابن اسحاق کی سند سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے اُن کی موافقت کی ہے، دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 201/3) واقدی کی روایت بلاسند ہے، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 293,292/1)

قدرومنزلت اور زیادہ بڑھ گئی۔ [1]

حضرت حنظلہ بن ابی عامر رضی اللہ عنہ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اُحد کی رات جب انھوں نے اعلان سنا تو تعمیل حکم میں نہائے بغیر ہی چل دیے اور لڑائی شروع کر دی حتی کہ شہید ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن کی لاش دیکھی تو فرمایا:

«إِنَّ صَاحِبَكُمْ لَتَغْسِلُهُ الْمَلَائِكَةُ»

''تمھارے ساتھی کو فرشتے غسل دے رہے ہیں۔''

اس کے بعد وہ غَسِیلٌ یا غَسِیلُ الْمَلَائِكَة کے لقب سے مشہور ہوئے۔ [2]

حضرت مُخَیریق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کفار سے مسلسل جنگ کرتے رہے حتی کہ شہید ہو گئے۔ یہ اسلام لانے والے یہودیوں کے لیے بہترین نمونہ تھے۔ جب جنگ کے لیے نکلے تو اعلان کیا: ''اگر میں مارا گیا تو میرا مال محمد ﷺ کی ملکیت ہے۔ وہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف فرمائیں۔'' [3] رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مُخَیْرِیق یہودیوں میں سے بہترین شخص ہے۔'' [4]

بنوعبدالاشہل کے اُصَیرم عمرو بن اُقَیش جنگ اُحد سے پہلے تک اسلام سے گریزاں رہے

---

[1] ابن اسحاق کی یہ روایت بسند حسن ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 127/3) [2] ابن اسحاق کی یہ روایت معلق ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 108,107/3) حاکم اسے متصل سند سے لائے ہیں۔ انھوں نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے اُن سے اتفاق کیا ہے، دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 204/3) البانی نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (سلسلة الأحاديث الصحيحة: 36/4) [3] ابن اسحاق کی یہ روایت معلق ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 129/3) [4] یہ ابن اسحاق کی بلاغی روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 131/3) ابن سعد نے بھی اسے واقدی کی سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (الطبقات الكبرىٰ: 501/1، والمغازي للواقدي: 263/1) ابن حجر کا کہنا ہے: ''یہ بنونضیر سے تعلق رکھتے تھے۔'' دیکھیے: (الإصابة: 392/3) واقدی کا بیان ہے کہ وہ مسلمان تھے۔

لیکن اُحد کے دن وہ مسلمان ہوگئے۔ اُحد کے میدان میں مسلمانوں سے آ ملے اور کفار سے ڈٹ کر لڑے حتی کہ مرتبۂ شہادت سے سرفراز ہوئے، حالانکہ اُنھیں ایک بھی نماز پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ [1]

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اگرچہ جنگ احد اور دیگر جنگوں میں جہاد بالسیف کی فضیلت سے محروم رہے لیکن مسلمانوں کی شجاعت کے تذکرۂ جاوید میں پختہ اور خوبصورت شاعری کی فضیلت میں سب سے آگے تھے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ معذور لوگوں میں سے تھے۔ کلبی نے بتایا ہے کہ بزدلی حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی عادت نہیں تھی بلکہ وہ بڑے زبان دان، فصیح و بلیغ اور بہادر تھے۔ دراصل انھیں ایک ایسی بیماری لاحق ہوگئی تھی جس کی بنا پر وہ لڑائی میں شرکت نہیں کر سکتے تھے۔ [2] واقدی نے اس بیماری کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ اُن کے بازو کی رگِ اکحل کٹ گئی تھی جس کی بنا پر وہ ہاتھ سے ضرب نہیں لگا سکتے تھے۔ [3] اس سے اُن روایات کی وضاحت ہوتی ہے جن میں اُن کے کسی بھی جنگ میں شریک نہ ہونے کا ذکر ہے، مثلاً: طبرانی کی روایت ہے کہ جنگ اُحد کے موقع پر وہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ قلعۂ فارع میں موجود تھے کہ ایک یہودی آ کر قلعے پر چڑھنے لگا۔ حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہنے لگیں: ''اٹھو اور اسے قتل کر دو۔'' وہ کہنے لگے: ''مجھ میں اتنی ہمت نہیں، اگر ہوتی تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدانِ جنگ میں ہوتا۔'' حضرت صفیہ خود ہی اٹھیں اور اُسے قتل کر دیا، پھر حسان سے کہنے لگیں: ''اس کا سر کاٹ کر نیچے یہودیوں میں پھینک دو۔'' انھوں نے پھر معذرت کی۔ آخر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ہی نے سر کاٹ کر نیچے پھینکا۔ یہودی ڈر کر بھاگ گئے کہ یہاں بھی جنگجو موجود ہیں۔ [4]

---

[1] ابن اسحاق کی یہ روایت بسند حسن ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 131/3) [2] تاریخ دمشق لابن عساكر: 140/4. [3] واقدی کی بیان کردہ یہ وضاحت ابوالفرج اصفہانی نے نقل کی ہے، دیکھیے: (الأغاني لأبي الفَرَج الأصفهاني: 16/4) [4] مجمع الزوائد للهيثمي: 114/6. اس روایت ◄◄

بلاذری اور یعقوبی نے تو یہی لکھا ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ اُحد کا ہے۔[1] ابن اسحاق اور دیگر کے مطابق اس واقعے کا تعلق غزوۂ خندق سے ہے۔[2]

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا واقعہ کسی قابل حجت سند سے روایت نہیں ہوا۔ اس میں واقدی اور کلبی کی بات ماننی پڑتی ہے اگرچہ وہ اتنے معتبر نہیں کیونکہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ دورِ جاہلیت بلکہ دورِ اسلام میں بھی دوسرے شعراء کی ہجو کرتے رہے لیکن کسی شاعر نے اُنھیں بزدلی کا طعنہ نہیں دیا۔ اگر طبرانی کی روایت جیسی روایات درست ہوں تو ایسی باتیں اشعار میں ہونی چاہیے تھیں اور لازماً اُن کے اس عیب کی مذمت کی جاتی جس طرح وہ دوسرے شاعروں کی ایسے عیوب پر مذمت کرتے ہیں۔ سیرت ابن ہشام کے محققین کے مطابق قرین قیاس یہ ہے کہ دورِ اسلام میں اُن کا کسی جنگ میں نہ جانے کا باعث ان کا بڑھاپا تھا۔[3] ابن عبدالبر حضرت حسان کی جنگوں میں عدم شرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اگر ایسی بات ہوتی تو حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبدالرحمٰن کی ہجو بھی کی جاتی کیونکہ وہ بھی معروف شاعر تھے اور دیگر شعرائے عرب، مثلاً: نجاشی وغیرہ کی ہجو بھی کرتے رہتے تھے۔'' میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی سرشتِ میں بزدلی

◄◄ کی سند میں جعفر بن زبیر ہے جو متروک اور کذاب ہے۔ وہ احادیث گھڑتا اور منکر روایات بیان کرتا تھا، دیکھیے: (میزان الاعتدال: 406/1) طبرانی نے اسے عروہ کی مرسل سند سے بھی روایت کیا ہے، دیکھیے: (مجمع الزوائد للهيثمي: 135/6) ابویعلٰی نے بھی اسے روایت کیا اور ہیثمی نے ابویعلٰی کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے۔ انھوں نے اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے، دیکھیے: (مسند أبي يعلى: 84/1، ومجمع الزوائد: 134/6) علامہ زرقانی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، باوجودیکہ اس میں جعفر بن زبیر ہے، دیکھیے: (المواهب للزرقاني: 11/2) علاوہ ازیں اسے بزار نے بھی روایت کیا اور ہیثمی نے اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے، دیکھیے: (كشف الأستار: 223/2-234) [1] أنساب الأشراف للبلاذري: 324/1، وتاريخ اليعقوبي: 48/2. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 317/3-319. سند منقطع ہے۔ [3] اس حوالے سے محققین اور خشنی کی بیان کردہ تفصیل دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 318/3) ◄◄

ہوتی تو وہ لوگوں کو بزدلی کے طعنے نہ دیتے۔ ذرا اُن کے یہ اشعار دیکھیے:

وَإِنَّا لَقَوْمٌ مَّا نُسَوِّدُ غَادِرًا   وَلَا نَاكِلًا عِنْدَ الْحَمَّالَةِ زُمَّلَا

وَلَا مَانِعًا لِّلْمَالِ فِيمَا يَنُوبُهُ   وَلَا عَاجِزًا فِي الْحَرْبِ جِبْسًا مُغَفَّلَا

وَأَصِيدُ نَهَّاضًا إِلَى السَّيْفِ صَارِمًا   إِذَا مَا دَعَا دَاعٍ إِلَى الْمَوْتِ أَرْقَلَا

''ہم وہ لوگ ہیں کہ کسی غدار، بدعہد، کمزور، بزدل، ذمہ داری لے کر پھر جانے والے، آسمانی آفات میں مالی کنجوسی کرنے والے، جنگ میں نکمے، سست و بہانہ تراش اور کسی مت کے مارے کو اپنا سردار نہیں بناتے۔ ہم تو ایسے شخص کو سردار بناتے ہیں جو نامور، بہادروں کا شکار کرنے والا، قاطع تلوار کی طرف ہاتھ بڑھانے والا اور جنگ کا اعلان سن کر موت کی طرف تیزی سے لپکنے والا ہو۔''[1]

اس قصیدۂ لامیہ کے اکثر اشعار دلیری کے توصیفی جذبات پر مشتمل ہیں۔ اُن کا کوئی فخریہ یا ہجوی قصیدہ ایسے اشعار سے خالی نہیں۔ ان کا مکمل دیوان ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اُحد کی لڑائی میں حصہ ضرور لیا مگر اُن کی نیت جہاد فی سبیل اللہ کی نہیں تھی۔ وہ نسبی اور خاندانی حمیت کی وجہ سے میدان میں آ گئے تھے۔ ان میں سے ایک قُزمان تھا جس نے تنہا آٹھ یا سات مشرکین قتل کیے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے رُو برو جب بھی اُس کی جرأت و بہادری کی تعریف کی جاتی تو آپ ﷺ فرماتے:

«إِنَّهُ لَمِنْ أَهْلِ النَّارِ» ''وہ تو جہنمی ہے۔''

احد کے دن قزمان شدید زخمی ہو گیا۔ تکلیف حد سے بڑھی تو اس نے خودکشی کر لی۔[2]

›› سہیلی اور باکری نے بھی اس سلسلے میں گفتگو کی ہے، دیکھیے: (الروض الأنف: 281/3، ومرویات غزوة أحد، ص: 260-264) [1] شرح ديوان حسّان لعبد الرحمٰن البرقوقي، ص: 403-406.
[2] قزمان کا واقعہ ابن اسحاق نے منقطع سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: ››

یہ بھی محمد ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے کہ آپ نے جو پیش گوئی فرمائی وہ پوری ہوئی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جہاد میں خلوصِ نیت بنیادی لازمہ ہے۔

غزوۂ احد میں بعض عورتیں بھی مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ تھیں۔ اُن کا کام زخمیوں کو پانی پلانا تھا۔ ام عمارہ،[1] حمنہ بنت جحش اسدیہ،[2] حضرت عائشہ ام المومنین[3]، ام سَلیط اور

129/3) ہیثمی نے بتایا کہ اسے ابویعلی نے ایک دوسری متصل اور صحیح سند سے روایت کیا ہے۔ ابویعلیٰ کی روایت میں قُزمان کا نام نہیں ہے، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 116/6) صحیح بخاری کی دونوں سندوں میں انھوں نے آدمی کا نام نہیں بتایا۔ پہلی سند میں تو انھوں نے یہ تک ذکر نہیں کیا کہ یہ کس غزوے کا واقعہ ہے، البتہ دوسری سند میں بتایا ہے کہ یہ غزوۂ خیبر تھا، دیکھیے: (صحیح البخاري، المغازي، باب غزوة خيبر، حديث: 4204,4203) امام مسلم نے بھی اس واقعے کو دو سندوں سے بیان کیا ہے۔ پہلی سند میں یہ بتایا ہے کہ یہ غزوۂ حنین تھا۔ دوسری سند میں غزوے کا نام نہیں لیا۔ آدمی کا نام دونوں سندوں میں نہیں ہے، دیکھیے: (صحیح مسلم، الإيمان، باب بيان غلظ تحريم قتل الإنسان نفسه......، حديث: 111) امام احمد بھی اس روایت کولائے ہیں۔ ان کی روایت میں بتایا گیا ہے کہ یہ غزوۂ خیبر تھا، دیکھیے: (مسند أحمد: 135/4) واقدی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ انھوں نے اس امر پرابن اسحاق سے اتفاق کیا ہے کہ آدمی کا نام قزمان تھا، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 263/1) باکری کے علاوہ ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ ان روایات میں کوئی اختلاف نہیں اور ان میں تطبیق ممکن ہے کہ واقعات ایک سے زائد ہیں۔ واللہ أعلم. [1] ابن ہشام نے اُحد کے دن ام عمارہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ منقطع سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 118/3، و المغازي للواقدي: 269,268/1) [2] ہیثمی نے لکھا کہ حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کا واقعہ طبرانی نے حسن سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 292/9) ضعیف سندوں سے ایک روایت ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس معرکے میں شرکت نہیں کی تھی۔ وہ لوگوں کو راستے میں ملی تھیں جبکہ وہ معرکے سے واپس آ رہے تھے۔ یہاں انھیں اُن کے بھائی عبداللہ اور ماموں حمزہ کی شہادت کی خبر دی گئی تو انھوں نے ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ پڑھا اور دونوں کے لیے مغفرت کی دعا کی۔ جب انھیں اُن کے شوہر مصعب کی شہادت کے بارے میں بتایا گیا تو چلا کر رونے اور ہائے ہائے کرنے لگیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”واقعی شوہر کا بیوی کے نزدیک بڑا مقام ہے۔“ ابن اسحاق کی یہ روایت بغیر

ام سُلیم [1] رضی اللہ عنہا کا ذکر تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جنگ کو جاتے تو حضرت ام سُلیم اور چند انصاری عورتوں کو ساتھ لے جاتے۔ وہ مجاہدین کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ [2]

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے دفاع میں جنگ کرنے کے لیے جبریل اور میکائیل علیہما السلام کو بھیجا تھا۔ [3]

◄◄ سند کے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 144/3، وسنن ابن ماجه، الجنائز، باب ماجاء في البكاء على الميت، حديث: 1590) اس کی سند میں عبداللہ عمری نامی راوی ضعیف ہے۔ اس روایت کے ضعیف ہونے کا ذکر علامہ البانی نے بھی کیا ہے۔ حمنہ، ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں۔ [3] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة أحد، حديث: 4064. بخاری نے یہی روایت کتاب الجہاد میں بھی بیان کی ہے، دیکھیے: (صحيح البخاري، حديث: 2880، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب غزوة النساء مع الرجال، حديث: 1809)

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب ذكر أم سَلِيط، حديث: 4071. امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اِس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں جو انھوں نے ام سَلِیط کے بارے میں کہے تھے: ''یہ اُحد کے دن ہمارے لیے مشکیں اٹھاتی تھیں۔'' ام سلیط ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں۔ ان کے پہلے شوہر ابوسلیط ہجرت سے قبل ہی وفات پا گئے تھے۔ بعد ازاں اُن کی شادی مالک بن سنان خدری سے ہوئی جن سے ابوسعید خدری پیدا ہوئے۔ یہ تمام تفصیل ابن حجر نے حدیث کی شرح میں لکھی ہے، نیز دیکھیے: (صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب حمل النساء القِرَب، حديث: 2880-2883)

[2] صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب غزوة النساء مع الرجال، حديث: 1810. [3] صحيح البخاري، المغازي، باب: ﴿إِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا﴾، حديث: 4054. بخاری کی روایت میں فرشتوں کے نام نہیں ہیں۔ ان کی روایت میں صرف دو آدمیوں کا ذکر ہے۔ مسلم کی روایت میں دونوں فرشتوں کے نام بھی درج ہیں، دیکھیے: (صحيح مسلم، الفضائل، باب إكرامه ﷺ بقتال الملآئكة معه ﷺ، حديث: 2306)

اللہ تعالیٰ نے مومنین سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ڈٹ کر لڑتے رہیں، اللہ اور رسول کی مخالفت سے بچے رہیں تو چاہے دشمن اچانک آ جائے، اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعے سے اُن کی مدد کرے گا۔ جب یہ شرائط پوری نہ ہو سکیں تو وعدہ بھی تشنۂ تکمیل رہا۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنزَلِينَ ۝ بَلَىٰ ۚ إِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) جب آپ ایمان والوں سے کہہ رہے تھے: کیا تمھیں کسی طرح کافی نہ ہو گا کہ تمھارا رب اتارے گئے تین ہزار فرشتوں کے ذریعے سے تمھاری مدد کرے۔ ہاں، ضرور! اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور وہ (دشمن) تمھارے پاس اسی دم آ جائے تو تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں کے ذریعے سے تمھاری مدد کرے جبکہ وہ (فرشتے) نشان زدہ ہوں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ اور مومنین پر ٹوٹ پڑنے والی اس مصیبت پر جو مسلمان انتہائی مغموم تھے اللہ تعالیٰ نے اُن پر اونگھ طاری کر دی۔ وہ تھوڑا سو کر اٹھے تو ان کے دل طمانیت سے بھر چکے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے پوری مستعدی اور چابکدستی سے رسول اللہ ﷺ کے دفاع کا فریضہ انجام دیا۔ حضرت ابوطلحہ انصاری بھی اُن لوگوں میں شامل تھے جن پر اونگھ طاری ہوئی۔ اُن کی تلوار کئی بار اُن کے ہاتھ سے گری، وہ پھر اٹھا لیتے، پھر گرتی، پھر اٹھا لیتے۔[2] اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

[1] آل عمرٰن 3:124،125. تفسير الطبري: 7/137-190. طبرانی اور دیگر محدثین کے نزدیک وہی راجح ہے جو ہم نے لکھا۔ [2] صحيح البخاري، المغازي، باب:﴿ ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا ﴾، حديث: 4068.

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ﴾

’’پھر اُس نے غم کے بعد تم پر امن نازل کیا وہ ایک اونگھ تھی، جو تم میں سے ایک جماعت پر طاری ہو رہی تھی۔‘‘ [1]

باقی رہے منافقین، چاہے وہ جو عبداللہ بن اُبی کے ساتھ واپس چلے گئے تھے یا وہ شکست کھا کے آئے تھے، اُن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اسی آیت میں فرمایا:

﴿وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ﴾

’’اور ایک جماعت وہ تھی جنھیں اُن کی جانوں نے فکر میں ڈال رکھا تھا، وہ اللہ کے ساتھ ناحق جاہلیت کا گمان رکھتے تھے، کہتے تھے: کیا اس معاملے میں ہمارا بھی کوئی اختیار ہے؟ کہہ دیجیے: بلاشبہ اختیار سارا اللہ کا ہے۔ وہ اپنے دلوں میں ایسی باتیں چھپاتے ہیں جو تمھارے لیے ظاہر نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں: اگر ہمارے لیے اس معاملے سے کچھ (اختیار) ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔‘‘ [2]

مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کے لیے (معاذ اللہ) ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو محفوظ رکھا، چنانچہ مروی ہے کہ اُبی بن خلف رسول اللہ ﷺ کو مکہ میں دھمکیاں دیا کرتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی دن آپ ﷺ کو قتل کر کے رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے:

«بَلْ أَنَا أَقْتُلُكَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ» ’’ان شاء اللہ۔ میں ہی تجھے قتل کروں گا۔‘‘ [3]

اُحد کا دن آیا تو وہ گھاٹی میں آپ تک پہنچ گیا اور کہنے لگا: ’’اے محمد! اگر آج تم بچ گئے

---

[1] آل عمرٰن 3:154. [2] آل عمرٰن 4:154. تفسیر الطبري: 7/315-323، وتفسیر ابن کثیر: 2/124-126. [3] ابن اسحاق کی یہ روایت منقطع سند کے ساتھ ہے، دیکھیے: (السیرۃ النبویۃ لابن

تو میری خیر نہیں۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ''اللہ کے رسول! ہم میں سے کوئی اس کو مزا چکھائے؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے آنے دو۔'' جب وہ بالکل قریب آ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حارث بن صمہ سے نیزہ لے کر اُس کی طرف سیدھے ہو گئے اور وہ نیزہ اُس کی گردن میں چبھو دیا جس سے وہ کئی دفعہ اپنے گھوڑے ہی پر لوٹ پوٹ ہوا [1] اور قریش کی طرف مڑ گیا۔

بظاہر اُسے کوئی گہرا زخم نہیں لگا تھا مگر خون بہہ رہا تھا اور وہ چلّا رہا تھا: ''اللہ کی قسم! محمد نے مجھے قتل کر دیا۔'' اُس کے ساتھی اُسے اطمینان دلاتے رہے کہ کوئی خطرے کی بات نہیں۔ مگر وہ انھیں وہ بات یاد دلاتا تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے مکہ مکرمہ میں کہی تھی۔ وہ کہتا تھا: ''اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھ پر تھوک بھی دیتا تو میں مر جاتا (اب تو نیزہ لگایا ہے)۔'' آخر کار مکہ واپس جاتے ہوئے اللہ کا یہ دشمن ''سرِف'' کے مقام پر واصل جہنم ہو گیا۔ [2] اُس کی موت بھی جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل اور معجزہ ہے۔

مسلمانوں نے اپنی زندگی کی پروا نہ کرتے ہوئے ڈٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کیا تو مشرکین آپ تک پہنچنے سے مایوس ہو گئے اور لڑ لڑ کر تھک گئے۔ ابوسفیان کو اور کوئی راہ

« هشام: 122/3، والمغازي للواقدي: 251/1، والطبقات الكبرٰى: 46/2) ابن سعد کے ہاں یہ روایت سعید بن مسیب کی مرسل سند سے ہے۔ واحدی نے اسے متصل سند سے بیان کیا ہے، دیکھیے: (أسباب النزول، ص:56) بیہقی بھی اسے عروہ کی مرسل سند سے لائے ہیں جس میں ابنِ لہیعہ ہے۔ ابنِ لہیعہ کی حدیث حسن درجے کی ہے۔ بیہقی اسے سعید بن مسیب کی مرسل سند سے بھی لائے ہیں جس میں ابن مسیب سے زہری اور زہری سے موسیٰ بن عقبہ روایت کرتے ہیں۔ ابن مسیب کی مرسل روایات (مراسیل) قوی ہوتی ہیں، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 259,258/3) طبری بھی اسے اپنی تفسیر میں سُدّی کی مرسل سند سے لائے ہیں، دیکھیے: (تفسير الطبري: 255/7) [1] ابن اسحاق کی یہ معلق روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 122,121/3) [2] ابن اسحاق کی یہ روایت منقطع سند سے بیان کی گئی ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 123,122/3)

نہ سوجھی تو اُس نے مسلمانوں کو آئندہ سال پھر جنگ کی دھمکی دے کر واپسی کا اعلان کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اُس کا یہ چیلنج قبول کر لیا۔ [1]

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ ابوسفیان مسلمانوں کے قریب آ کر کہنے لگا: ''کیا تم میں ''محمد'' موجود ہیں؟'' آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: ''کوئی جواب نہ دو۔'' اس نے پھر پوچھا: ''کیا تم میں ابوبکر زندہ ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے کوئی جواب نہ دو۔'' اس نے پھر پوچھا: ''کیا تم میں عمر بن خطاب موجود ہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''اسے کوئی جواب نہ دو۔'' وہ خوش ہو کر کہنے لگا: ''چلو، یہ تو مارے گئے۔ اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضبط نہ کر سکے۔ بآواز بلند فرمایا: ''او اللہ کے دشمن! تو جھوٹ بکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے غم انگیز چیزیں باقی رکھی ہیں۔'' ابوسفیان بولا: ''ہُبَل کی شان بلند ہو۔'' رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اسے جواب دو۔'' صحابہ نے پوچھا: ''کیا کہیں؟'' فرمایا: «قُولُوا: اَللّٰهُ أَعْلٰى وَأَجَلُّ» ''تم کہو: اللہ ہی سب سے بلند اور برتر ہے۔''

ابوسفیان کہنے لگا: ''ہمارا عُزّٰی ہے تمھارا کوئی عُزّٰی نہیں۔'' نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا: ''جواب دو۔'' صحابہ کہنے لگے: ''کیا کہیں؟'' فرمایا: «قُولُوا: اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ» ''تم کہو: اللہ ہمارا مولا (دوست، مددگار) ہے۔ تمھارا کوئی مولا نہیں۔''

ابوسفیان کہنے لگا: ''آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے۔ جنگ ڈول کی طرح ہے (کبھی ہمارے حق میں کبھی تمھارے حق میں) تم اپنے چند مقتولوں کا مُثلہ کیا ہوا پاؤ گے۔ میں نے اس کام کا حکم نہیں دیا تھا مگر یہ مجھے بُرا بھی نہیں لگا۔'' [2]

[1] ابن اسحاق کی یہ روایت معلّق، یعنی بلاسند ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 136/3، والمغازي للواقدي: 297/1)۔ [2] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة أحد، حديث: 4043، والمغازي لابن أبي شيبة، ص: 238، حديث: 250. محقق کتاب دکتور اکرم ضیاء عمری کے مطابق ابن ابی شیبہ کی سند متصل اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

مسند احمد اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے: ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”ہم تم برابر نہیں۔ ہمارے مقتولین جنتی ہیں اور تمھارے جہنم کی غذا ہیں۔“ [1]

مشرکین مسلمانوں کے اتنے نقصان ہی کو غنیمت سمجھ کر واپس چل دیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”ان کے پیچھے جاؤ اور دیکھو کہ ان کا کیا منصوبہ ہے؟ اگر وہ اونٹوں پر سوار ہوئے اور گھوڑے ساتھ ساتھ رکھیں تو پھر وہ مکہ جا رہے ہیں اور اگر وہ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور اونٹوں کو آگے لگایا تو پھر وہ مدینہ جائیں گے۔ قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر انھوں نے مدینہ کا رخ کیا تو میں مدینہ پہنچ کر اُن سے لڑوں گا اور انھیں نقد بدلہ دوں گا۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ گئے۔ دیکھا کہ وہ اونٹوں پر سوار ہیں اور گھوڑے ساتھ ساتھ جا رہے ہیں اور اُن کا رخ مکہ مکرمہ کی طرف ہے۔ [2]

جنگ کا غبار تھما۔ پتہ چلا کہ ستر مسلمان شہید ہوئے [3] اور بائیس مشرک مارے گئے ہیں۔ [4]

---

[1] مسند أحمد: 209/4 و181/6، و السيرة النبوية لابن هشام: 136/3. یہ روایت بلاسند ہے۔
[2] ابن اسحاق کی یہ روایت بغیر سند کے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 137,136/3، والمغازي للواقدي: 298/1) بیہقی اس روایت کو عروہ کی مُرسَل سند سے لائے ہیں جس میں ابن لہیعہ ہیں، دیکھیے: (دلائل النبوة: 282/3) واقدی اور بیہقی کے ہاں مشرکین کا ارادہ معلوم کرنے کی غرض سے اُن کے تعاقب میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تھا۔ [3] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة أحد، حديث: 4043. ابن اسحاق نے بغیر سند کے بیان کیا ہے کہ پینسٹھ مسلمان شہید ہوئے تھے اور اُن سب کے نام بھی بتائے ہیں۔ ابن ہشام نے ستر کی تعداد پوری کرتے ہوئے مزید پانچ نام بتائے ہیں، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 180,179/3) واقدی اور باکری کے ہاں شہداء کی تعداد چوہتر ہے، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 200/1، و مرويات غزوة أحد للباكري: 367-369) [4] ابن اسحاق نے یہ تعداد بلاسند بیان کی ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 182/3) واقدی کا کہنا ہے کہ ستائیس مشرک قتل ہوئے تھے، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 307/1) باکری اور ابن سعد کے نزدیک مقتولین کی تعداد تیئیس تھی، دیکھیے: (الطبقات الكبرى: 42/2، ◄◄

رسول اللہ ﷺ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی تلاش میں نکلے۔ وہ وادی کے نشیب میں اس حال میں پائے گئے کہ اُن کا پیٹ چیر کر جگر نکالا گیا ہے۔ ناک کان کاٹ کر مثلہ کیا گیا ہے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ نے یہ حالت دیکھی تو فرمایا: ''اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ ان کی بہن صفیہ غمگین ہو گی اور لوگ اسے سنت سمجھ لیں گے تو میں ان کی لاش دفن کیے بغیر یونہی پڑی رہنے دیتا اور یہ درندوں اور جانوروں کی خوراک بن جاتے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی جگہ قریش پر غلبہ عطا فرمایا تو میں اُن کے تیس آدمیوں کے ساتھ ضرور ایسا ہی سلوک کروں گا۔''

مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ غم و غصہ دیکھا تو کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ نے کبھی ہمیں مشرکین پر غلبہ عطا کیا تو ہم مقتولوں کے ساتھ وہ سلوک کریں گے جو عرب میں سے کسی نے نہ کیا ہوگا۔'' [2] اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ۝﴾

''اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی۔ اور بلاشبہ اگر تم صبر کرو تو یقیناً وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔'' [3]

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس ارشادِ الٰہی کے پیش نظر معاف کر دیا۔ صبر و حوصلہ سے کام لیا اور مثلہ کرنے (مقتول کے اعضاء کاٹ کر شکل بگاڑنے) سے روک دیا۔ [4]

◄◄ و مرویات غزوة أحد للباكري : 369) [1] یہ ابن اسحاق کی معلّق روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام : 138/3) [2] یہ ابن اسحاق کی منقطع سند سے روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام : 139,138/3) یہ حدیث شواہد کی بنا پر قوی ہے۔ [3] النحل 126:16. [4] السيرة النبوية لابن هشام : 140/3. بلاسند ہے۔ ترمذی نے ایک دوسری سند سے روایت کیا اور کہا: ''یہ حدیث حسن غریب ہے۔'' دیکھیے: (جامع الترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة النحل، حديث: 3129) احمد نے بھی اسے نقل کیا ہے، دیکھیے: (الفتح الربّاني: 193,192/18) واحدی نے بھی اسے ذکر کیا ہے، دیکھیے: (أسباب النزول، ص: 192,191) حاکم نے بھی اسے صحیح روایت کیا ہے۔ ذہبی نے اُن کی موافقت کی ◄◄

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کا مثلہ کرنے کے بارے میں امام مغازی موسیٰ بن عقبہ کی روایت ہے کہ اُن کے قاتل وحشی نے اُن کا پیٹ چیرا، جگر نکالا اور ہند کے پاس لے گیا۔ ہند نے اُسے چبانے کی کوشش کی مگر نگل نہ سکی۔ [1] ابن اسحاق کی روایت ہے کہ ہند نے خود جناب حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر نکالا تھا۔ ابن اسحاق نے مزید بیان کیا کہ اُس نے شہداء کے ناک کان کاٹ کر اُن سے ہار اور پازیب بنا کر پہنے اور اپنے پازیب، ہار اور بالیاں بطورِ انعام وحشی کو دے دیے۔ [2] واقدی نے اپنے مغازی میں روایت کیا ہے کہ وحشی نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کیا اور اُن کا جگر نکال کر مکہ لے گیا تاکہ اُس کا آقا جُبیر بن مطعم اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ [3] شامی نے لکھا ہے: ''واقدی اور مقریزی نے اپنی کتاب امتاع الاسماع میں روایت کیا ہے کہ وحشی نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا پیٹ چیرا، جگر نکالا اور ہند کے پاس لے گیا۔ ہند نے جگر چبا کر اگل دیا، پھر وہ وحشی کے ساتھ اُن کی لاش کے پاس آئی، اُن کے جگر کے ٹکڑے کیے، اُن کے ناک کان کاٹے، پھر ان اعضاء سے دو کڑے، دو بازو بند اور دو پازیب بنائے اور اُن کو پہنے ہوئے مکہ پہنچی۔'' [4] ابن ابی شیبہ اور احمد کی روایت ہے: ''...... انھوں نے تلاش کیا تو دیکھا کہ حمزہ رضی اللہ عنہ کا پیٹ چیر کر ہند نے جگر نکالا، اُسے چبایا لیکن نگل نہ سکی*......'' [5]

◄◄ ہے، دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 359/2) [1] البداية والنهاية: 43/4. یہ روایت بغیر سند کے ہے اور ضعیف ہے۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 133/3. اس روایت کی سند منقطع اور ابن اسحاق کے استاذ ابن کیسان پر موقوف ہے۔ یوں یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ [3] المغازي للواقدي: 332/1. اس کی روایت نہایت ضعیف ہے۔ [4] سُبُل الهُدٰى والرشاد: 321/4. [5] المغازي لابن أبي شيبة، ص: 238، حدیث: 250. محقق کتاب دکتور عمری کا کہنا ہے: ''اس روایت کی سند متصل ہے اور اس کے رجال (راوی) ثقہ ہیں۔'' محدث احمد شاکر نے اس روایت کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: (مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 191/6، حدیث: 4414) یہ ابن ابی شیبہ ہی کی سند سے ہے۔ الموسوعة الحديثية کے محققین کا کہنا ہے: ''یہ روایت حسن لغیرہ ہے۔ یہ سند منقطع ہونے کے باعث ضعیف ہے۔ شعبی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث نہیں سُنی۔'' دیکھیے: (الموسوعة الحديثية: 418/7، ◄◄

یوں معلوم ہوتا ہے کہ واقدی اور مقریزی کی روایت جس کی طرف شامی نے اشارہ کیا، ابن عقبہ اور ابن اسحاق کی روایات میں تطبیق و توافُق کی ایک صورت ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کے مثلے کی روایت تو صحیح سندوں سے ثابت ہے جس کی وضاحت ہم گزشتہ اوراق میں کر چکے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے جگر نکالے جانے کی روایات جنھیں مؤرخین اور اہلِ سِیَر و مغازی نے بیان کیا ہے اُن کی کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ ابن ابی شیبہ کی روایت بھی اُن کی تائید کرتی ہے۔

تاریخ میں بعض مسلمان عورتوں کے ایمان سے بھرپور شاندار واقعات محفوظ ہیں کہ انھوں نے اپنے عزیز رشتہ داروں کی شہادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی خوشی میں بسر و چشم قبول کر لی۔ ایسا ہی ایک واقعہ اُس وقت پیش آیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کے ساتھ بنو دینار کی ایک عورت کے پاس سے گزرے۔ [1] اُس عورت کا خاوند، بھائی اور باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ اُحد میں شہید ہو چکے تھے۔ جب اُسے ان تینوں کی شہادت کی خبر دی گئی تو وہ کہنے لگی: ''تم یہ بتاؤ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟'' صحابہ کہنے لگے: ''اے ام فلاں! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بخیریت ہیں۔ وہ کہنے لگی: ''مجھے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کراؤ۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔''

حدیث : 4414) محققین نے اُن شواہد (تائیدی روایات) کا ذکر کیا ہے جن کی بدولت یہ روایت حسن لغیرہ کے درجے تک پہنچی۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ [1] واقدی نے اس خاتون کا نام بھی لکھا، اس کا نام سُمیراء بنت قیس تھا، دیکھیے: (المغازي : 292/1) واقدی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا مسلمانوں کے ہمراہ اس معرکے میں شریک نہیں ہوئی تھیں۔ جیسے کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، یہ صحیح بخاری کی روایت کے برعکس ہے۔ دونوں اقوال کے درمیان یوں تطبیق دینا ممکن ہے کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا میدانِ معرکہ میں دوسرے مرحلے کے دوران آئیں جس میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کو آزمائش میں ڈالا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ کھڑے ہیں تو وہ آپ ﷺ کو دیکھ کر کہنے لگی: «كُلُّ مُصِيبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ» ''آپ کے بعد ہر مصیبت بے معنی ہے۔''[1]

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بھائی کا چہرہ دیکھنے آئیں تو رسول اللہ ﷺ نے اُن کے بیٹے زبیر سے فرمایا کہ انھیں واپس لے جاؤ تا کہ یہ اپنے بھائی کی مُثلہ شدہ لاش نہ دیکھ سکیں۔ وہ کہنے لگیں: ''کیوں! مجھے پتہ چل چکا ہے کہ میرے بھائی کی لاش مسخ کر دی گئی ہے لیکن یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہے۔ اس راہ میں جو کچھ پیش آئے ہمیں بخوشی قبول ہے۔ اللہ کی قسم! میں، ان شاء اللہ، ثواب کی امید رکھتے ہوئے صبر کروں گی۔'' جب حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اُن کی یہ ایمان افروز بات آپ ﷺ کو بتائی تو آپ نے حکم دیا کہ انھیں آنے دیا جائے۔ وہ آئیں، بھائی کا چہرہ دیکھا، دعا کی، إِنَّا لِلّٰهِ پڑھی اور اُن کے لیے استغفار کیا، پھر آپ ﷺ کے حکم پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو دفن کر دیا گیا۔[2]

[1] البداية والنهاية: 53/4. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند حسن ہے۔ [2] یہ ابن اسحاق کی بلاغی روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 142,141/3) قریب قریب یہی الفاظ احمد نے بھی روایت کیے ہیں، دیکھیے: (مسند أحمد: 165/1) امام احمد کے علاوہ بزار اور بیہقی نے بھی اسے نقل کیا ہے، دیکھیے: (مسند بزار: 328/2، ومسند أبي يعلى: 46,45/3؛ ودلائل النبوة للبيهقي: 290,289/3) سیرت ابن ہشام کے دونوں محققین نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس روایت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ صفیہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی حمزہ رضی اللہ عنہ کی تکفین کے لیے دو کپڑے بھی ساتھ لائی تھیں۔ حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کے قریب انھیں (صحابۂ کرام کو) ایک انصاری کی لاش نظر آئی جس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا تھا جو حمزہ کی لاش کے ساتھ کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کو عار محسوس ہوئی کہ حمزہ کو تو دو کپڑوں میں کفن دیا جائے اور انصاری شہید بے کفن رہے۔ آپ نے فرمایا: ''ایک کپڑا انصاری کے لیے ہے اور ایک حمزہ کے لیے۔'' چونکہ ایک کپڑا بڑا تھا، صحابۂ کرام نے دونوں کے درمیان قرعہ ڈالا، پھر ہر ایک کو ایک ایک کپڑے میں کفنا دیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ اُحد سے مدینہ واپس ہوئے تو راستے میں حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا ملیں۔لوگوں نے انھیں اُن کے بھائی حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر دی۔ انھوں نے إنا للہ پڑھی اور اُن کے لیے بخشش کی دعا کی، پھر لوگوں نے اُن کے ماموں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اطلاع دی تو اُنھوں نے پھر إنا للہ پڑھی اور دعائیہ کلمات کہے، پھر انھیں اُن کے شوہر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا بتایا گیا تو وہ چیخ اٹھیں اور ہائے ہائے کرنے لگیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھائی اور ماموں کی وفات کی خبر پر اُن کا صبر کرنا اور شوہر کی خبر پر اُن کا غم و الم دیکھا تو فرمایا: ''واقعی شوہر کا بیوی کے نزدیک بڑا مقام ہے۔''[1]

صحیح بخاری اور سنن ابی داود کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ شہدائے اُحد میں سے دو دو کو ایک کپڑے میں کفن دیتے، پھر دریافت فرماتے: «أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخْذًا لِّلْقُرْآنِ؟» ''ان میں سے زیادہ حافظ قرآن کون ہے؟'' پھر جس کی طرف اشارہ کیا جاتا اُسے لحد میں آگے رکھتے اور فرماتے: «أَنَا شَهِيدٌ عَلٰى هٰؤُلَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» ''میں قیامت کے دن ان کے حق میں گواہ ہوں گا۔'' آپ نے حکم دیا کہ انھیں خون آلود حالت میں دفن کر دیا جائے اور اُن کا جنازہ نہیں پڑھا۔انھیں غسل بھی نہیں دیا گیا تھا۔[2]

[1] ابن اسحاق کی یہ معلق روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام : 144/3) ابن ماجہ نے بھی اسے روایت کیا ہے، تاہم اُن کی حدیث میں حمنہ کے ماموں حمزہ کا ذکر نہیں ہے، دیکھیے: (سنن ابن ماجه، الجنائز، باب ماجاء في البكاء على الميت، حديث : 1590) البانی نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [2] صحيح البخاري، المغازي، باب من قتل من المسلمين يوم أحد، حديث : 4079، وسنن أبي داود، الجنائز، باب في الشهيد يُغَسَّلُ؟ حديث : 3138، وجامع الترمذي، الجنائز، باب ماجاء في ترك الصلاة على الشهيد، حديث: 1036. اس حدیث کی سند کے راوی ثقہ ہیں۔ وہ احادیث جن میں شہدائے احد کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے، اُن احادیث کے مقابلے میں پیش کیے جانے کے قابل نہیں جن میں اُن کی نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کا ذکر ہے۔

دو دو تین تین شہداء ایک ایک قبر میں دفن کیے گئے۔[1] رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ وہ جس جگہ شہید ہوئے وہیں دفن کیے جائیں، چنانچہ جنھیں مدینہ میں دفن کرنے کے لیے لے جایا گیا تھا اُنھیں واپس لایا گیا اور اُحد کے میدان میں دفن کیا گیا۔[2] دفن کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو جمع کیا، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انھیں دنیا و آخرت کی نعمتیں عطا فرمائے اور تکذیب کرنے والے کافروں کو تہس نہس فرمائے۔[3]

رسول اکرم ﷺ کی تمنا تھی کہ میں بھی شہدائے اُحد کے ساتھ شہید ہو جاتا۔[4] آپ ﷺ نے اس وقت شہدائے اُحد کی بڑی تعریف کی جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے یہ کہتے ہوئے سُنا: ''یہ تلوار پکڑو اس نے (اُحد کے دن) مجھے بہت خوش کیا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تو نے اپنی خوب تلوار چلائی ہے تو سہل بن حنیف، ابودجانہ، عاصم بن ثابت الْأَقْلَحْ اور حارث بن الصِّمّہ نے بھی تلوار کا حق خوب ادا کیا ہے۔''[5]

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو اُس اجرِ عظیم کی خوشخبری دی جو شہدائے اُحد کو حاصل ہوا۔ جب آپ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی پھوپھی فاطمہ کو جابر کے والد عبداللہ بن عمرو کی نعش پر روتے سنا تو فرمایا:

«وَلِمَ تَبْكِي؟ فَمَا زَالَتِ الْمَلَائِكَةُ تُظِلُّهُ بِأَجْنِحَتِهَا حَتّٰى رُفِعَ»

''کیوں روتی ہو؟ جب تک ان کی میت پڑی رہی فرشتوں نے اس پر اپنے پروں سے سایہ کیے رکھا۔''[6]

[1] صحيح سنن الترمذي: 142/2. [2] الفتح الرّباني: 149/8. [3] المستدرك للحاكم: 23/3. حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ [4] الفتح الرّباني: 58/21. اس حدیث کی سند حسن ہے۔ [5] المستدرك للحاكم: 24/3. حاکم نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے اُن کے اس حکم کو برقرار رکھا ہے۔ [6] صحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل عبدالله بن عمرو بن حرام رضي الله عنه، حديث: 2471.

ایک روایت میں ہے: ''تو رو یا نہ رو۔ جب تک تم لوگوں نے انھیں اٹھا نہیں لیا، فرشتوں نے اپنے پروں سے ان پر سایہ کیے رکھا۔''[1]

شہدائے احد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝﴾

''جو اللہ کے راستے میں شہید ہو گئے آپ اُنھیں ہرگز مُردہ نہ سمجھیں بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اُنھیں اپنے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔''[2]

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا: ''ہم نے اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَرْوَاحُهُمْ فِي جَوْفِ طَيْرٍ خُضْرٍ لَّهَا قَنَادِيلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ، تَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ، ثُمَّ تَأْوِي إِلٰى تِلْكَ الْقَنَادِيلِ»

''اُن کی روحیں سبز پرندوں میں ڈال دی گئیں جو عرش کے نیچے آویزاں قندیلوں میں رہ رہے ہیں۔ جنت میں جہاں جی چاہتا ہے کھاتے پھرتے ہیں، پھر واپس انھی قندیلوں میں پہنچ جاتے ہیں۔''[3]

اس حدیث کے پیشِ نظر علماء کا کہنا ہے کہ شہداء کی زندگی حقیقی زندگی ہے۔[4]

[1] صحيح البخاري، الجنائز، باب الدّخول على الميّت بعد الموت إذا أدرج في أكفانه، حديث: 1244، وصحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل عبدالله بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ......، حديث: (130)2471، واللفظ له۔ [2] آل عمرٰن 169:3. المستدرك للحاكم: 88/2. حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا اور ذہبی نے اُن کی موافقت کی ہے۔ [3] صحيح مسلم، الإمارة، باب بيان أن أرواح الشهداء في الجنة وأنهم أحياء عند ربهم يرزقون، حديث: 1887. [4] فتح القدير للشوكاني: 399/1. علماء نے یہ بات ترمذی کی ایک روایت کی رُو سے کہی ہے، دیکھیے: ◄◄

رسول اللہ ﷺ اُحد سے واپس تشریف لائے تو آپ نے بنوعبدالاشہل اور بنوظفر کی عورتوں کو اپنے شوہروں پر جو اُحد میں شہید ہوئے تھے، روتے سنا تو فرمایا: ''لیکن حمزہ پر رونے والی کوئی نہیں۔'' پھر آپ سو گئے اور کچھ دیر بعد جب بیدار ہوئے تو آپ ﷺ نے سنا کہ وہ عورتیں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر رو رہی اور بین کر رہی ہیں۔ [1] اُسی دن آپ نے بین اور نوحہ کرنے سے منع کر دیا۔ [2]

تربیت و نصیحت اور اہم اسباق

متذکرہ آیات کے علاوہ بہت سی ایسی قرآنی آیات نازل ہوئیں جن میں اس جنگ کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان میں مسلمانوں کے لیے تربیت اور نصیحت کے نہایت اہم اسباق ہیں، مثلاً:

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○﴾

''اور نہ تم ہمت ہارو اور نہ غم کھاؤ اور تمھی غالب ہو اگر تم ایمان والے ہو۔'' [3]

◄◄ (جامع الترمذي، تفسير القرآن، حديث :3011,3010) [1] مسند أحمد (تحقيق أحمد شاكر): 82/7. احمد شاکر نے اس حدیث کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ حاکم نے اسے اختصار سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے اُن کی موافقت کی ہے، دیکھیے: (المستدرك للحاكم: 381/1) ابن سعد نے بھی اسے روایت کیا ہے، دیکھیے: (الطبقات الكبرٰى: 16/3) اُن کی سند کے راوی سوائے اسامہ بن زید لیثی کے ثقہ ہیں۔ اسامہ لیثی میں قدرے ضعف ہے۔ اسامہ لیثی کی روایت اُن شواہد کے ذریعے سے قوی ہو جاتی ہے جنھیں ابن سعد نے آخر میں بیان کیا ہے۔ احمد اور حاکم کی روایات بھی ابن سعد کی روایت کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ ابن اسحاق نے بھی اسے معلق روایت کے طور پر بیان کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام : 145,144/3) ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ سعد بن معاذ اور اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہما نے اپنی عورتوں کو حکم دیا کہ وہ کمر بند باندھیں اور جا کر رسول اللہ ﷺ کے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ پر روئیں۔

[2] السيرة النبوية لابن هشام: 145/3، والطبقات الكبرٰى: 17/3. [3] آل عمرٰن 139:3.

﴿ اِنۡ یَّمۡسَسۡکُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ ؕ وَتِلۡكَ الۡاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیۡنَ النَّاسِ ۚ ﴾

''اگر تمھیں (اُحد میں) کوئی زخم لگا ہے تو اس (کافر) قوم کو بھی اسی کے مانند (بدر میں) ایک زخم لگا تھا اور یہ دن ہیں، ہم انھیں لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں۔''[1]

﴿ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَیَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ ○﴾

''کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے جبکہ ابھی تک اللہ نے تم میں سے اُن لوگوں کو نہیں جانا جنھوں نے جہاد کیا اور (تاکہ) وہ صبر کرنے والوں کو جان لے۔''[2]

﴿ وَلِیَعۡلَمَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَیَتَّخِذَ مِنۡكُمۡ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ○ۙ﴾

''اور تاکہ اللہ اُن لوگوں کو جان لے جو ایمان لائے اور تم میں سے کچھ کو شہید بنا لے اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔''[3]

﴿ وَلَقَدۡ كُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَلۡقَوۡهُ ۪ فَقَدۡ رَاَیۡتُمُوۡهُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ○﴾

''اور تحقیق تم جنگ سے پہلے ہی (شہادت کی) موت کی تمنا کیا کرتے تھے، پھر تحقیق تم نے اسے اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ لیا ہے۔''[4]

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِكُمۡ ؕ وَمَنۡ یَّنۡقَلِبۡ عَلٰی عَقِبَیۡهِ فَلَنۡ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیۡـًٔا ؕ وَسَیَجۡزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِیۡنَ ○﴾

[1] آل عمرٰن 3:140. [2] آل عمرٰن 3:142. [3] آل عمرٰن 3:140. [4] آل عمرٰن 3:143.

''اور محمد ایک رسول ہی تو ہیں۔ اس سے پہلے بھی کئی رسول گزر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ فوت ہو جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے؟ اور جو اپنی ایڑیوں پر پھر جائے تو وہ اللہ کا ہرگز کچھ بھی نقصان نہیں کرے گا۔ اور اللہ شکر کرنے والوں کو جلد (اچھی) جزا دے گا۔''[1]

﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ط﴾

''اور کسی جان کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے، ایک لکھا ہوا وقت مقرر ہے۔''[2]

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اُن کی اطاعت کرو گے جنھوں نے کفر کیا (تو) وہ تمھیں تمھاری ایڑیوں پر لوٹا دیں گے، پھر تم خسارہ پانے والے ہو کر لوٹو گے۔''[3]

﴿اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ط﴾

''اگر تم تکلیف میں پڑے ہو تو وہ بھی تمھاری طرح تکلیف میں پڑے ہیں۔ اور تم اللہ سے اس (ثواب) کی امید رکھتے ہو جس کی وہ امید نہیں رکھتے۔''[4]

اس جنگ کے متعلق سورۂ آل عمران کی اٹھاون آیات نازل ہوئیں جن کے آغاز میں جنگ کے ابتدائی مرحلے کا ذکر ہے:

﴿وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ط﴾

''اور جب آپ صبح سویرے اپنے گھر والوں کے پاس سے نکلے تھے، مومنوں کو

[1] آل عمرٰن 3:144. [2] آل عمرٰن 3:145. [3] آل عمرٰن 3:149. [4] النسآء 4:104.

لڑائی کے لیے مختلف ٹھکانوں پر بٹھا رہے تھے۔'' [1]

اور آخر میں اس جنگ کے نتائج اور حکمتوں پر جامع تبصرہ ہے:

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝﴾

''اللہ کبھی ایسا نہیں کہ ایمان والوں کو اس حال پر چھوڑ دے جس پر تم (اس وقت) ہو یہاں تک کہ ناپاک کو پاک سے جُدا کر دے اور اللہ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ تمھیں غیب پر مطلع کرے اور لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے، لہٰذا اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔'' [2]

فقہی احکام، نتائج و حکمتیں

فقہی احکام

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے غزوۂ احد سے معلوم ہونے والے فقہی احکام کے بارے میں ایک باب قائم کیا ہے۔ ہم یہاں یہ احکام مختصر طور پر افادۂ عام کے لیے درج کرتے ہیں:

* جہاد کا آغاز کر دیا جائے تو پھر یہ لازم ہو جاتا ہے۔ اگر تیاری کر کے نکلنے کا عزم کر لیا تب بھی دشمن سے دو دو ہاتھ کیے بغیر واپس نہیں آنا چاہیے۔
* اگر دشمن شہر پر چڑھ آئے تو ضروری نہیں کہ مسلمان شہر سے باہر نکل کر لڑیں۔ وہ اپنے

[1] آل عمرٰن 121:3. [2] آل عمرٰن 179:3.

شہر میں رہ کر بھی دشمن کا مقابلہ کریں تو جائز ہے بشرطیکہ اس میں زیادہ حفاظت اور فائدے کا امکان ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو یہی مشورہ دیا تھا۔

* اسلامی لشکر کے راستے میں رعایا میں سے کسی کی ملکیتی زمین آئے تو لشکر اُس میں سے بغیر اجازت گزر سکتا ہے، چاہے اس جگہ کے مالک کو یہ بات گوارا نہ ہو۔ مربع بن قیظی کے باغ کے ساتھ یہی ہوا۔
* جو نابالغ بچے جنگ نہیں کر سکتے انھیں میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور انھیں واپس بھیج دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما اور اُن کے ساتھیوں کو واپس بھیج دیا تھا۔
* خواتین بھی جنگ میں جاسکتی ہیں مگر ان کی خدمات کے دائرے لڑائی سے باہر ہوں گے، مثلاً: وہ مجاہدین کو پانی پلاسکتی ہیں، زخمیوں کی مرہم پٹی اور علاج بھی کرسکتی ہیں بشرطیکہ کسی فتنے کا اندیشہ نہ ہو۔[1]

میں کہتا ہوں: ابن ابی شیبہ نے اپنی سند سے ایک روایت بیان کی ہے جو سعید بن عمرو قرشی تک پہنچتی ہے کہ بنوعذرہ کی ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی: ''اللہ کے رسول! میرا ارادہ لڑائی کرنے کا نہیں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ زخمیوں کی مرہم پٹی کروں۔ بیماروں کو پانی پلاؤں اور ان کی دوا دارو کروں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''اگر رواج پڑ جانے کا خدشہ نہ ہوتا اور یہ کہا جائے گا کہ فلاں عورت تو گئی تھی، تو میں تمھیں اجازت دے دیتا، البتہ تم گھر ہی میں رہو۔''[2]

[1] زاد المعاد : 212,211/3. [2] المصنف لابن أبي شيبة (تحقيق كمال يوسف الحوت) : 538/6، حديث : 2653. کنگ سعود یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر دکتور خالد الدریس نے اس حدیث کی تخریج و تحقیق کی ہے۔ انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ متصل ہونے کے اعتبار سے »

میں نے یہ حدیث اس لیے بیان کی ہے کہ بعض حضرات اس سے استدلال کرتے ہیں کہ نبیِ کریم ﷺ نے اپنی زندگی کے آخر میں عورتوں کو جنگ میں جانے سے روک دیا تھا۔ مجھے اس حدیث کے درجے (ضعف) کا علم ہے لیکن جب جنگ میں عورتوں کے جانے کی صورت میں یہ احتمال غالب ہو کہ وہ کفار کے ہاتھوں قید ہو جائیں گی اور وہ انھیں اٹھا کر لے جائیں گے، چنانچہ اس صورت میں میرا میلان بھی اس حدیث کے مطابق ہے۔ باوجودیکہ اس میں کچھ ضعف ہے لیکن فضائل اعمال میں ضعیف روایت سے بھی حجت لی جاسکتی ہے۔ (مؤلف کا یہ کہنا کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل ہو سکتا ہے، محل نظر ہے، محققین کے نزدیک ضعیف حدیث پر عمل کرنا کسی بھی صورت میں درست نہیں، مزید یہ کہ مذکورہ عمل فضائل میں سے نہیں بلکہ مسائل (جائز، ناجائز) کے قبیل سے ہے۔)

بعض اہل علم، جن میں امام احمد رحمہ اللہ بہت نمایاں ہیں، کا یہی مسلک ہے، خصوصاً اس لیے بھی کہ ام کبشہ کی یہ روایت فتح مکہ اور غزوۂ حنین کے بعد کی ہے اور یہ وہ آخری غزوے ہیں جن میں کسی عورت نے شرکت کی ہے۔ غزوات کے تفصیلی واقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

* دشمن کی صفوں میں اکیلے گھس جانا جائز ہے جس طرح حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ اور دیگر نے کیا تھا۔ (علامہ ابن تیمیہ نے اس کے بارے میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔)

»اس حدیث کی سند محل نظر ہے، تاہم اس کے رجال ثقہ ہیں۔ سعید بن عمرو اور ام کبشہ کا ہم عصر ہونا ثابت نہیں، چہ جائیکہ اُن کی ملاقات ثابت ہو۔ دکتور خالد کی بھی یہی تحقیق ہے۔ حافظ ابن حجر ابن ابی شیبہ کے حوالے سے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد خاموش ہیں، دیکھیے: (الإصابة: ۸/487,486)

* اگر امام زخمی ہو جائے تو بیٹھ کر نماز پڑھا سکتا ہے۔ اس صورت میں مقتدی بھی بیٹھ کر نماز پڑھیں گے۔ یہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔[1]
* شہادت فی سبیل اللہ کی تمنا اور دعا جائز ہے۔ یہ موت کی تمنا نہیں ہے جس سے منع کیا گیا۔
* قزمان کے واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ خودکشی کرنے والا جہنمی ہے۔
* شہید فی سبیل اللہ کے بارے میں سُنت یہ ہے کہ اُسے نہ غسل دیا جائے، نہ خون آلود کپڑے اتارے جائیں بلکہ اُسی حالت میں اُسے دفن کر دیا جائے۔ دشمن اُس کے کپڑے اتار لے یا وہ پھٹ جائیں تو یہ الگ بات ہے۔ اس صورت میں اُسے اور کفن دیا جائے گا۔ اس کی حکمت ایک روایت کی رُو سے یہ ہے: ''شہداء اپنے رب کریم سے اپنے زخموں سمیت ملیں گے۔ خون بہہ رہا ہوگا لیکن اس سے کستوری جیسی خوشبو آئے گی۔''[2]

اُنھیں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عزت ہی کافی ہے۔''

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شہدائے اُحد کے بارے میں فرمایا:

«أَنَا شَهِيدٌ عَلٰى هٰؤُلَاءِ، مَا مِنْ جَرِيحٍ يُجْرَحُ فِي اللّٰهِ، إِلَّا وَاللّٰهُ يَبْعَثُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَدْمٰى جُرْحُهُ، اللَّوْنُ لَوْنُ دَمٍ وَّالرِّيحُ رِيحُ مِسْكٍ»

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے: (المغني لابن قدامة: 221،220/2، والمحلّٰى لابن حزم: 59/3، ونيل الأوطار للشوكاني: 159/3) اگر امام کسی عذر یا بیماری وغیرہ کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھاتا ہے تو مقتدیوں کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھیں۔ لیکن اگر مقتدی کھڑے ہو کر نماز پڑھیں تو یہ بھی جائز بلکہ اولیٰ ہے اور اسی طرح دونوں حدیثوں میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (تحفة الأحوذي: 291/2) [2] جامع الترمذي، فضائل الجهاد، باب ما جاء فيمن يكلم في سبيل الله، حديث: 1656.

''میں اُن کے حق میں گواہی دوں گا۔ جو بھی اللہ کے راستے میں زخمی کیا گیا اُسے اللہ قیامت کے دن اس حال میں اٹھائے گا کہ اُس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا۔ رنگ تو خون جیسا ہی ہوگا مگر مہک کستوری کی آ رہی ہوگی۔''[1]

* شہید کے جنازے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ امام کو اختیار ہے، جنازہ پڑھے یا نہ پڑھے کیونکہ دونوں طرف روایات موجود ہیں۔[2]

زاد المعاد کے محققین نے ان روایات کی تخریج کے بعد اُن کا درجۂ صحت بیان کیا اور یہ نتیجہ نکالا ہے: ''ان احادیث سے شہداء کے جنازے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ واجب نہیں، اس لیے کہ بہت سے صحابہ غزوۂ بدر وغیرہ میں شہید ہوئے، کہیں روایت نہیں کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا جنازہ پڑھا۔ اگر آپ نے پڑھا ہوتا تو اس کا لازماً ذکر ہوتا۔ مؤلف ابن القیم رحمہ اللہ بھی اسی طرف مائل ہیں۔''[3]

* شہداء کے بارے میں سنت یہی ہے کہ انھیں میدانِ جنگ ہی میں دفن کیا جائے۔
* جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے معذور قرار دے کر اُنھیں جنگ میں شریک نہ ہونے کی رخصت عطا فرمائی ہے (مثلاً: بیمار، لنگڑے، بوڑھے وغیرہ) اگر وہ جنگ میں جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ حضرت عمرو بن جموح لنگڑے ہونے کے باوجود اور یمان اور ثابت بن وقش رضی اللہ عنہم بہت زیادہ بوڑھے ہونے کے باوجود غزوۂ احد میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ شہید بھی ہوئے۔
* اگر کوئی مسلمان خدانخواستہ مسلمانوں کے ہاتھوں اس غلط فہمی میں، کہ یہ کافر ہے، مارا جائے تو امام کے لیے ضروری ہے کہ اُس کی دیت بیت المال سے ادا کرے۔

[1] السیرة النبویة لابن هشام :143,142/3. یہ روایت صحابہ کی مرسل روایات میں سے ایک ہے۔ اس کی سند حسن ہے۔ [2] تهذیب السنن لابن القیم :295/4. [3] تهذیب السنن:295/4

حضرت یمان رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں یہی ہوا۔

نتائج و حکمتیں

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے غزوۂ اُحد کے متعلق بعض حکمتیں اور اچھے نتائج بھی بیان کیے ہیں۔ ان اہم اور اصولی نتائج کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران کی تقریباً ساٹھ آیات میں بیان کیا ہے۔ یہاں ہم اختصار کے ساتھ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کا بیان درج کرتے ہیں:

* مسلمانوں کو پتہ چل گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی، اختلاف و تنازع اور کم ہمتی کا نتیجہ کتنا خوفناک اور لرزہ خیز ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو پہنچنے والے نقصان کا سبب یہی باتیں تھیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے صراحت سے فرمایا ہے:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ﴾

''اور بلاشبہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا جب تم اُس کے اذن سے انھیں تہس نہس کر رہے تھے حتی کہ جب تم کم ہمت ہو گئے اور حکم (اپنی ذمہ داری) کے بارے میں آپس میں جھگڑنے لگے اور تم نے نافرمانی کی، بعد اس کے کہ اُس نے تمھیں وہ شے دکھا دی جسے تم پسند کرتے تھے، تم میں سے (کچھ) وہ تھے جو دُنیا چاہتے تھے اور (کچھ) وہ جو آخرت چاہتے تھے، پھر اُس نے تمھیں اُن سے پھیر دیا (پسپا کر دیا) تا کہ وہ تمھیں آزمائے اور بلاشبہ یقیناً اُس نے تمھیں معاف کر دیا۔''[1]

[1] آل عمرٰن 152:3.

جب مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی، اختلاف اور کم ہمتی کا خمیازہ بھگت لیا۔ تو وہ انتہائی محتاط ہوگئے۔

* اللہ تعالیٰ نے رسولوں اور اُن کی امتوں کے معاملے میں یہ حکیمانہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ کبھی اُن کو کفار پر غلبہ دیا جاتا ہے کبھی کافروں کو اُن پر۔ لیکن آخر کار فتح اہلِ ایمان ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر ہمیشہ اُنھی کو غلبہ حاصل رہے تو بعثت اور رسالت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ انھیں دونوں چیزیں حاصل ہوں تاکہ اُن کے متبعین میں واضح امتیاز قائم ہوجائے اور صاف پتہ چل جائے کہ کون حق و صداقت کی بنا پر اُن کا فرمانبردار ہے اور کون صرف فتح و غلبہ کی خاطر اُن کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ یہ انبیائے کرام کی خاص نشانی ہے۔

ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا تھا: ''کیا تمھاری اُن سے کوئی جنگ ہوئی ہے؟'' اُس نے کہا: ''ہاں!'' ہرقل نے دریافت کیا: ''تمھاری باہمی جنگوں کا نتیجہ کیا نکلا؟'' ابوسفیان نے کہا: ''برابر۔ کبھی اُسے غلبہ حاصل ہو جاتا تھا اور کبھی ہمیں۔'' اس پر ہرقل نے کہا تھا: ''رسولوں کی کیفیت ایسی ہی ہوتی ہے۔ اُن کو آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، پھر آخر کار انجام اُنھی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔''[1]

* اُحد کی آزمائش نے مومن اور منافق میں حد فاصل قائم کر دی۔ یہ منافقین جنگ بدر میں مسلمانوں کی عظیم الشان فتح کے بعد بظاہر مسلمان ہوگئے تھے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ﴾

[1] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب دعاء النبيﷺ إلى الإسلام......، حديث :2941، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب : كتب النبي ﷺ إلى هرقل، حديث : 1773.

''اللہ ایسا نہیں ہے کہ ایمان والوں کو اُس (حالت) پر چھوڑ دے جس پر تم ہو حتی کہ وہ پلید کو پاک سے جدا کر دے۔''[1]

* اللہ تعالیٰ اپنے مخلصین اور اولیاء کی عبودیت ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ سہولت ہو یا تنگی، پسند ہو یا ناپسند وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبودیت پر قائم رہتے ہیں۔ درحقیقت اللہ کے بندے یہی ہوتے ہیں نہ کہ وہ جو صرف خوشحالی، نعمتوں اور عافیت و سلامتی کی صورت ہی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔

* خوشحالی اور تنگ حالی ان دونوں حالتوں ہی سے بندوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق اپنے بندوں کے معاملات طے کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو عزت و نصرت سے ہمکنار کرنا چاہے تو پہلے اُسے نیچا کرتا، عاجز بناتا ہے، پھر اُس کے عجز و انکسار کے مطابق اُسے رفعت اور نصرت عطا فرماتا ہے۔ بدر میں یہی ہوا:

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾

''اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے تمھاری مدد بدر کے مقام پر کی جبکہ تم بہت ہی کمزور تھے۔''[2]

حنین میں بھی ایسا ہی ہوا:

﴿وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ﴾

''اور حنین کے دن، جب تمھیں تمھاری کثرت نے خوش کیا، پھر اُس (کثرت تعداد) نے تمھیں کچھ فائدہ نہ پہنچایا۔''[3]

* اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کے لیے جنت میں بلند مراتب مقرر کر رکھے ہیں جن تک وہ اپنے اعمال کے زور سے نہیں پہنچ سکتے، اس لیے کوئی بڑی مصیبت اور آزمائش درکار تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے آزمائش و ابتلا کے اسباب پیدا کر

[1] آل عمرٰن 3:179. [2] آل عمرٰن 3:123. [3] التوبۃ 9:25.

دیے جو اُن کو ان عظیم مراتب تک پہنچا دیں۔ جس طرح اعمالِ صالحہ بھی اُن مراتب تک پہنچنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی نے مہیا کیے ہیں۔

* نفس کی یہ عادت ہے کہ جب اُسے ہمیشہ عافیت، نصرت اور کفایت حاصل رہے تو وہ سرکش ہو جاتا ہے اور اُس کا رُخ دنیا اور وقتی مفادات کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اس بنا پر وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کسی پر رحم کرنے اور اسے باوقار و معزز بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے کچھ مصائب میں بھی مبتلا کرتا ہے تاکہ اس کمزوری اور مرض کا ازالہ ہو جائے۔

* اللہ تعالیٰ کے ہاں ''شہادت'' اولیاء اللہ کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ اس کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ کبھی دشمن کو بھی اُن پر غلبہ ہو تاکہ وہ اس مرتبے سے سرفراز ہو سکیں۔

* آزمائشوں اور مصائب سے بندوں کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ خلوص پیدا ہوتا ہے اور حصولِ شہادت کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

''اور تاکہ اللہ اُن لوگوں کو جان لے جو ایمان لائے اور تم میں سے بعض کو شہید بنائے۔ اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور تاکہ اللہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے پاک صاف کر دے اور کافروں کو مٹا دے۔''[1]

* انبیاء کے مراتب کی بلندی اور اجر و ثواب میں اضافے کے لیے انھیں دنیوی مصائب، مثلاً: زخم، تکالیف اور بیماریاں لاحق ہوتی ہیں تو اُن کے پیروکاروں کو صبر و برداشت کے حوالے سے اُسوۂ حسنہ اور اعلیٰ نمونہ حاصل ہوتا ہے تاکہ وہ بھی مصائب میں اُس پر

[1] آل عمرٰن 3:140، 141.

عمل پیرا ہو سکیں۔

* ایسی جنگوں میں رسول اللہ ﷺ کا ایک عام فرد اور فوجی کی طرح شریک ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ اپنے لشکر میں بڑے چھوٹے کی تمیز روا نہ رکھتے تھے اور اپنے آپ کو دوسرے مجاہدین کے برابر سمجھتے تھے، نیز اس سے آپ ﷺ کی عظیم شجاعت، صبرِ جمیل اور قوت برداشت کا پتہ چلتا ہے۔

باب

9

غزوۂ مریسیع تک کے واقعات

- غزوۂ اُحد سے بعد کے واقعات
- غزوۂ بنی نضیر
- غزوۂ مریسیع (بنومصطلق)
- واقعۂ اِفک

ABU UMAIMAH OWAIS

***

﴿الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۚ﴾

''وہ لوگ جنھوں نے اللہ اور رسول کا کہا مانا، بعد اس کے کہ انھیں زخم لگے، اُن میں سے جنھوں نے اچھائی کی اور تقویٰ اختیار کیا اُن کے لیے ایک بڑا اجر ہے۔''

[آل عمرٰن 3:172]

مَا إِنْ أُبَالِي حِينَ أُقْتَلُ مُسْلِمًا
عَلٰى أَيِّ شِقٍّ كَانَ فِي اللّٰهِ مَصْرَعِي
وَذٰلِكَ فِي ذَاتِ الْإِلٰهِ وَإِنْ يَّشَأْ
يُبَارِكْ عَلٰى أَوْصَالِ شِلْوٍ مُّمَزَّعِ

''اگر میں اسلام کی حالت میں مارا جا رہا ہوں تو مجھے کوئی پروا نہیں کہ مر کر کس پہلو پر گرتا ہوں؟ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہو رہا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو میرے جسم کے ٹکڑوں اور جوڑوں پر برکت نازل فرما دے۔''

[صحيح البخاري، حديث : 4086]

غزوۂ اُحد سے بعد کے واقعات

غزوۂ حمراء الاسد

مشرکین میدانِ احد سے بھاگے تو کچھ دور جا کر انھیں خیال آیا کہ مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کر کے اُنھیں مکمل طور پر ختم کر دینا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کو اُن کی اس نیت کا اندازہ ہو گیا۔ آپ ﷺ نے اُن کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آپ نے اعلان فرمایا:

«لَا يَخْرُجُ مَعَنَا إِلَّا مَنْ شَهِدَ الْقِتَالَ»

''ہمارے ساتھ وہی لوگ چلیں جو غزوۂ احد میں موجود تھے۔''

اُس وقت مسلمان زخموں سے چور چور تھے اور خوف و دہشت کی فضا طاری تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے آپ کے اعلان پر دل و جان سے لبیک کہا۔ آپ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کو ساتھ چلنے کی خصوصی اجازت دی کیونکہ وہ اُحد میں شریک نہیں تھے۔ انھیں اُن کے والد محترم نے اُن کی بہنوں کی نگہداشت کے لیے گھر چھوڑا تھا۔ خیر اسلامی لشکر تیار ہو کر حمراء الاسد [48] تک پہنچ گیا۔

وہاں معبد بن ابی معبد خزاعی رسول اللہ ﷺ سے ملے۔ آپ نے انھیں حکم دیا کہ وہ ابوسفیان کے پاس پہنچ کر اُس کا حوصلہ پست کریں۔ وہ اُسے روحاء کے مقام پر ملے۔

(48) حمراء الأسد: مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر ذوالحلیفہ جانے والے راستے پر بائیں ہاتھ آتا ہے۔

ابوسفیان کو اُن کے مسلمان ہو جانے کا علم نہیں تھا۔ انھوں نے اُسے ڈرایا کہ مسلمان تو تیرا پیچھا کرتے ہوئے حمراء الاسد تک پہنچ چکے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم صحیح سلامت مکہ چلے جاؤ۔ [1] اللہ تعالیٰ نے اس غزوے کے متعلق فرمایا:

﴿ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝﴾

”وہ لوگ جنھوں نے اللہ اور رسول کا کہا مانا، بعد اس کے کہ انھیں زخم لگے، اُن میں سے جنھوں نے اچھائی کی اور تقویٰ اختیار کیا اُن کے لیے ایک بڑا اجر ہے۔“ [2]

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حمراء الاسد سے واپسی کے دوران عبدالملک بن مروان کے نانا معاویہ بن مغیرہ اور ابوعزہ جمحی کو، جسے رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں میں سے بلامعاوضہ احسان فرماتے ہوئے چھوڑ دیا تھا، گرفتار کر لیا گیا۔ ابوعزہ کہنے لگا: ”اللہ کے رسول! مجھے معاف فرما دیجیے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ کی قسم! اب ایسا نہ ہوگا کہ تم دوبارہ مکہ جا کر اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرو اور کہو: ”میں محمد کو دو دفعہ دھوکا دے آیا ہوں۔“ پھر رسول اللہ ﷺ کے حکم سے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اُس کی گردن اڑا دی۔ [3]

---

[1] یہ ابن اسحاق کی معلق روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 3/148-150) [2] آل عمرٰن 3:172. صحيح البخاري، المغازي، باب: ﴿اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾، حديث: 4077، وصحيح مسلم، فضائل الصّحابة، باب من فضائل طلحة والزبير رضی اللہ عنہما، حديث: 2418. حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کا تعاقب کرنے کی غرض سے ستر صحابۂ کرام کو بلایا۔ شامی کا کہنا ہے: ”بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ اس روایت اور اُس روایت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں جو اہلِ مغازی نے بیان کی کہ تمام مسلمان ابوسفیان کے تعاقب کی مہم پر روانہ ہوئے تھے، تاہم ستر صحابۂ کرام نے پیش قدمی کی اور باقی بعد میں جا کر اُن سے ملتے رہے۔“ [3] السيرة النبوية لابن هشام: 3/152، اس روایت کی سند معضل ہے۔

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوعزہ سے فرمایا تھا:

«إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يُلْدَغُ مِنْ جُحْرٍ مَّرَّتَيْنِ»

''مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاسکتا۔''

پھر حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تو انھوں نے اُس کی گردن ماردی۔ [1]

یہ غزوہ ہجرت کے بتیسویں ماہ شوال کی آٹھ تاریخ کو پیش آیا۔ [2] دیگر اقوال بھی ہیں۔ مثلاً ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ یہ غزوہ 16 شوال کو اتوار کے دن پیش آیا۔ [3]

بلند حوصلہ

رسول اللہ ﷺ کا اس قدر تلخ حالات میں حمراء الاسد تک جانا ''کمالِ محمدی'' کا اعلیٰ مظہر ہے جس سے آپ کی شجاعت، تحمل و برداشت، صبرو استقامت اور حسن سیادت کی بے مثل خوبیاں اظہر من الشمس ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بڑی سے بڑی شکست سے بھی متاثر نہ ہوتے تھے۔ اس سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عظیم فضیلت بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ کس قدر صبرو استقامت اور تحمل و برداشت کے حامل اور رسول اللہ ﷺ

[1] یہ ابن ہشام کی بلاغی روایت ہے جو انھوں نے ابن مسیّب کے حوالے سے بیان کی ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 152/3) یہ حدیث صحیحین میں بھی درج ہے لیکن وہاں یہ ایک عمومی روایت کے طور پر بیان کی گئی ہے اور اس کا تعلق کسی خاص موقع سے نہیں جوڑا گیا، دیکھیے: (صحيح البخاري، الأدب، باب: لا يلدغ المؤمن من جُحر مرتين، حديث: 6133) یہ ابن مسیّب کی روایت ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن ہشام کی روایت کی بنیاد صحیح بخاری میں موجود ہے۔ ابن اسحاق نے اسے مغازی میں بغیر سند کے روایت کیا ہے۔ [2] المغازي للواقدي: 334/1، والطبقات الكبرىٰ: 48/2. ان دونوں کی اسانید ضعیف ہیں۔ [3] السيرة النبوية لابن هشام: 147/3. سند کے بغیر ہے۔ طبری نے اسے اپنی تاریخ اور تفسیر میں ابن اسحاق کی سند سے روایت کیا جو عکرمہ پر موقوف ہے۔ علاوہ ازیں اس میں حسین بن عبداللہ نامی راوی ضعیف ہے۔

کے کیسے زبردست فرمانبردار اور آپ کے ایک اشارے پر لبیک کہنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اُن کے لیے شاہد عدل ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۚ۝ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾

''وہ لوگ جنھوں نے اللہ اور رسول کا کہا مانا، بعد اس کے کہ انھیں زخم لگا، اُن میں سے جنھوں نے اچھائی کی اور تقویٰ اختیار کیا، اُن کے لیے ایک بڑا اجر ہے۔ وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ بلاشبہ لوگ تمھارے (مقابلے کے) لیے جمعیت اکٹھی کر چکے، سو تم اُن سے ڈرو تو اس امر نے اُن کو ایمان میں بڑھا دیا اور انھوں نے کہا کہ اللہ ہمیں کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے، چنانچہ وہ اللہ کی بڑی نعمت اور اُس کے فضل کے ہمراہ لوٹے، انھیں کسی تکلیف نے مس نہیں کیا اور انھوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''[1]

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی جنگی کارروائی (سریۂ ابی سلمہ)

مدینہ منورہ کے اردگرد رہنے والے اعرابیوں کو غزوۂ احد میں مسلمانوں کی شکست اور نقصانات کا پتہ چلا تو انھوں نے بھی مسلمانوں کے خلاف پر پُرزے نکالنے شروع کر دیے اور نجد میں رہنے والے بنو اسد اور عرفات میں رہنے والے بنو ہذیل اور دوسرے قبائل نے مدینہ منورہ پر دھاوا بولنے کے پروگرام بنائے۔ رسول اللہ ﷺ کو برابر خبریں پہنچ رہی تھیں

[1] آل عمرٰن 3:172-174. ان آیات کی شانِ نزول جاننے کے لیے ملاحظہ کیجیے: (تفسير الطبري: 415-399/7) طبری نے اس ضمن میں صحیح سندوں کے ساتھ روایات بیان کی ہیں۔

کہ بنواسد بن خزیمہ اپنے سردار طُلَیحہ اسدی اور اُس کے بھائی سلمہ کی قیادت میں مدینہ منورہ پر حملے کی تیاریاں کررہے ہیں تاکہ لوٹ کھسوٹ کریں اور قریش کی آتشِ عداوت اور زیادہ بھڑکا دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے پیش بندی فرماتے ہوئے ایک سو پچاس مہاجرین و انصار کو جنگی کارروائی کے لیے بھیجا اور حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد کو ان کا امیر مقرر فرمایا۔ اسلامی دستے نے بنواسد کو جبل قَطَن کے قریب ایک چشمے پر اچانک جالیا۔ وہ دستے کو دیکھتے ہی بھاگ اٹھے۔ مسلمان اُن کے ڈھورڈنگر ہانک کر مدینہ منورہ لے آئے۔ یہ ہجرت کے 35 ویں ماہ، ماہِ محرم کے آغاز کی بات ہے۔[1]

حضرت عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کی جنگی کارروائی (سریّۂ عبداللہ بن انیس)

رسول اللہ ﷺ نے بنوہُذَیل کے سردار خالد بن سفیان بن نُبَیح ھُذَلي کو قتل کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن اُنَیس رضی اللہ عنہ کو مامور کیا اور مقامِ نَخْلَہ یا عرفات کی وادیِ عُرَنہ کی طرف روانہ کیا۔ خالد بن سفیان مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے لشکر جمع کررہا تھا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے روانہ ہونے سے پہلے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے اُس کا حُلیہ بتادیں۔ آپ نے حلیہ بتایا تو وہ چل پڑے۔ اُس سے ملاقات ہوئی تو آپ ﷺ کا بیان کردہ حلیہ دیکھ کر فوراً پہچان گئے کہ یہ وہی ملعون ہے، چنانچہ انھوں نے کسی حیلے سے اُسے قتل کردیا اور بخیریت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: «أَفْلَحَ الْوَجْهُ» ''یہ چہرہ کامیاب رہا۔'' پھر آپ انھیں گھر لے گئے اور ایک عصا مرحمت فرمایا کہ اُس پر ٹیک لگالیا کریں۔ یہ چھڑی بروز قیامت اُن کے اور رسول اللہ ﷺ

[1] المغازي للواقدي: 340/1. ابن اسحاق نے بھی یہ روایت معلّق اور مختصر طور پر بیان کی ہے، دیکھیے: (السیرۃ النبویة لا بن هشام: 344/4) اس روایت کے متعلق کوئی ایسی روایت نہیں ملی جو قابلِ اعتماد ہو۔

کے درمیان ایک نشانی ہوگی۔ انھوں نے اسے بڑی حفاظت سے رکھا حتی کہ وہ اُن کے ساتھ ہی دفن ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن سے یہ بھی فرمایا: ''اُس دن کم لوگ ہی (عصا پر) ٹیک لگانے والے ہوں گے۔''[1]

یہ کارروائی ہجرت کے 35 ویں ماہ، ماہِ محرم کی پانچ تاریخ کو کی گئی۔

سریہ رجیع

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگ جاسوسی کے لیے بھیجے[2] اور

[1] ہم نے اس واقعے کو اختصار سے بیان کیا ہے۔ اس کی سند منقطع ہے۔ اس کی تفصیل ابن اسحاق کے ہاں دیکھی جا سکتی ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام : 355,354/4) بیہقی نے اسے متصل سند سے بیان کیا ہے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 43,42/4) انھوں نے اسے السنن الکبریٰ میں بھی بسند حسن نقل کیا ہے۔ احمد نے بھی اسے اسی حسن سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السنن الكبرىٰ للبيهقي: 256/3، ومسند أحمد: 496/3، وسنن أبي داود، صلاة السفر، باب صلاة الطالب، حديث: 1249) ابوداود کی روایت میں عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کے ساتھ عصا کے دفن کیے جانے کا ذکر نہیں ہے۔ یہ ابن اسحاق کی سند سے بیان کیا گیا ہے۔ اس سند میں انھوں نے صراحت سے نہیں بتایا کہ انھوں نے یہ حدیث سُنی ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 260/15) علاوہ ازیں دیکھیے: (المغازي للواقدي : 531/2 ، والطبقات الكبرىٰ : 50/2) [2] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الرجيع......، حديث : 4086. اہلِ مغازی میں سے ابنِ اسحاق اور ابنِ سعد نے یہ قصہ روایت کیا ہے۔ ابن اسحٰق کی سند مُرسل ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام : 3/241-260) ابن سعد کی سند صحیح ہے، دیکھیے: (الطبقات الكبرىٰ: 56,55/2) ابن اسحاق اور ابن سعد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں عضل وقارہ، جو الہون بن خزیمہ کی شاخیں ہیں، کے کچھ افراد آئے۔ انھوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! ہم اسلام کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ آپ ہمارے ساتھ اپنے کچھ ساتھی روانہ کریں جو ہمیں دین سمجھائیں، قرآن پڑھائیں اور اسلام کے قوانین سکھائیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے اُن کے ہمراہ دس آدمی روانہ کیے۔

حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر مقرر فرمایا۔[1] وہ چل پڑے۔ جب وہ عسفان پہنچے تو ہذیل کے ایک قبیلے بنولحیان کو اُن کا پتہ چل گیا۔ انھوں نے تقریباً ایک سو تیر انداز اُن کے پیچھے لگا دیے۔ وہ اُن کے نشاناتِ قدم کا کھوج لگاتے لگاتے ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں صحابہ کچھ دیر پہلے ٹھہرے تھے۔ اس جگہ انھوں نے کھجوروں کی گٹھلیاں دیکھیں۔ وہ پہچان گئے کہ یہ یثرب کی کھجوریں ہیں۔

اب انھوں نے تیزی سے تعاقب کیا حتی کہ اُن کو جا لیا۔ صحابہ نے انھیں دیکھا تو ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ بنوہذیل نے اُنھیں گھیر لیا اور کہا: ''ہمارا تم سے پختہ وعدہ ہے اگر تم ہمارے پاس اتر آؤ تو ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔'' حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں تو کسی کافر کی پناہ میں نہیں اترتا۔ اے اللہ! ہمارے بارے میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع پہنچا دے۔'' اور پھر اُن سے لڑائی شروع کر دی۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ سمیت سات صحابۂ کرام تیروں سے

[1] مغازي عروہ میں اس مہم جوئی کا وہی سبب بیان کیا گیا ہے جو بخاری کے ہاں وارد ہے، دیکھیے: (مغازي رسول الله ﷺ لعروة، ص: 175) ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ یہ چھ افراد تھے جن کے امیر مرثد بن ابی مرثد رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے ان سب کے نام درج کیے ہیں۔ واقدی نے زور دے کر کہا کہ یہ سات افراد تھے۔ انھوں نے بھی اُن سب کے نام لکھے ہیں۔ انھوں نے کمزور الفاظ (صیغۂ تمریض) میں یہ بھی بتایا ہے کہ یہ دس تھے اور زور دے کر کہا کہ اُن کے امیر مرثد ہی تھے۔ واقدی نے کمزور الفاظ (صیغۂ تمریض) میں یہ بھی بتایا کہ امیر عاصم تھے۔ اُن کا کہنا ہے: اس مہم کا سبب یہ تھا کہ بنولحیان عضل وقارہ کے ہاں آئے اور کچھ رقم کے عوض انھیں اس بات پر راضی کیا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں جائیں اور اُن سے مطالبہ کریں کہ وہ اُن کے ہمراہ اپنے کچھ ساتھی روانہ کریں جو اُن کے ہاں اسلام کی دعوت دیں، پھر وہ اُنھیں قابو کر کے قیدی بنائیں اور مکہ لا کر اُن کے حوالے کریں اور اپنا معاوضہ پائیں، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 355,354/1) بخاری اور ابن اسحاق کی روایات کے درمیان یہ کہہ کر تطبیق دی جا سکتی ہے کہ انھیں جاسوس کے طور پر روانہ کرنے اور اسلام کی تعلیم کے لیے افراد کے مطالبے کی غرض سے آنے والے وفدِ عضل وقارہ کے دونوں واقعات بیک وقت ظہور پذیر ہوئے ہوں، دیکھیے: (محمد رسول الله ﷺ لعرجون: 41/4)

شہید ہوگئے۔ خُبیب، زید اور ایک اور صحابی [1] بچ گئے۔ کفار نے پھر پیشکش کی کہ ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ تم میں سے کسی کو قتل نہیں کریں گے۔ تینوں صحابہ اتر آئے۔ جب انھوں نے اُن پر قابو پالیا تو اُن کی کمانوں کی تندیاں کھول کر اُن کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ تیسرے صاحب کہنے لگے: ''یہ تمھاری پہلی بے وفائی ہے۔'' انھوں نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے انھیں گھسیٹا اور ساتھ لے جانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ آخر انھوں نے انھیں قتل کر دیا اور خبیب و زید کو لے جا کر مکہ میں قریش کے ہاتھ بیچ دیا۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو بنوحارث بن عامر بن نوفل نے خرید لیا کیونکہ انھوں نے بدر کے دن حارث بن عامر کو قتل کیا تھا۔ [2] وہ اُن کے پاس چند دن قید رہے۔ جب انھوں نے اُن کے قتل کا فیصلہ کر لیا تو انھوں نے حارث کی کسی بیٹی سے استرا طلب کیا تاکہ صفائی کر سکیں۔ اُس نے اُسترا مہیا کر دیا۔ وہ عورت خود بیان کرتی ہے: ''اس دوران میں اپنے بچے سے غافل ہوگئی۔ وہ رینگتا ہوا خبیب کے پاس پہنچ گیا۔ انھوں نے اُسے اپنی ران پر بٹھا لیا۔ اُن کے ہاتھ میں اُسترا تھا۔ میری نظر پڑی تو میں گھبرا گئی۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ میری پریشانی بھانپ گئے۔ کہنے لگے: ''تجھے خدشہ ہے کہ میں اسے قتل کر دوں گا۔ ہرگز نہیں میں ان شاء اللہ ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتا۔'' وہ خاتون کہتی ہے: ''میں نے خبیب سے اچھا قیدی کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے انھیں انگور کا خوشہ کھاتے دیکھا، حالانکہ اُن

[1] ابن اسحاق کی روایت کے مطابق یہ عبداللہ بن طارق تھے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 244/3، والمغازي للواقدي: 357/1) [2] بعض اہل مغازی کا کہنا ہے کہ خبیب رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ جو شریک ہوئے اور جنھوں نے حارث بن عامر کو قتل کیا وہ خبیب بن اساف تھے۔ اہل سیر اور بخاری کی روایات کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا کہ انھوں نے خبیب کو حارث کے بدلے اُس جاہلی دستور کی بنا پر قتل کیا جس کے مطابق قاتل کے بجائے اُس کے قبیلے کا کوئی بھی فرد قتل کیا جا سکتا تھا۔ عرجون نے اس مسئلے کا خوب جائزہ لیا ہے، دیکھیے: (محمد رسول الله ﷺ لعرجون: 4/53-65)

دنوں مکہ میں کھجوریں بھی نہیں ملتی تھیں۔ ویسے بھی وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق تھا جو انھیں عطا کیا گیا۔''[1] خیر! کفار انھیں قتل کرنے کے لیے حرم سے باہر لے گئے۔ انھوں نے کہا: ''مجھے دو رکعت نماز پڑھ لینے دو۔'' فارغ ہوئے تو بولے: ''اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تم لوگ سمجھو گے کہ میں موت سے گھبرا رہا ہوں تو میں مزید نماز پڑھتا۔'' حضرت خبیب رضی اللہ عنہ وہ پہلے فرد ہیں جنھوں نے قتل کے وقت دو رکعت نماز پڑھنے کا طریقہ رائج کیا، پھر کہا: ''مولائے کریم! ان سب کو اچھی طرح گن لے، انھیں ایک ایک کر کے قتل کرنا، کسی کو باقی نہ چھوڑنا۔'' پھر یہ شعر پڑھے:

مَا إِنْ أُبَالِي حِينَ أُقْتَلُ مُسْلِمًا عَلٰى أَيِّ شِقٍّ كَانَ فِي اللّٰهِ مَصْرَعِي

وَذٰلِكَ فِي ذَاتِ الْإِلٰهِ وَإِنْ يَّشَأْ يُبَارِكْ عَلٰى أَوْصَالِ شِلْوٍ مُّمَزَّعِ

''اگر میں اسلام کی حالت میں مارا جا رہا ہوں تو مجھے کوئی پروا نہیں کہ مر کر کس پہلو پر گرتا ہوں؟ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہو رہا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو میرے جسم کے ٹکڑوں اور جوڑوں پر برکت نازل فرما دے۔''[2]

[1] اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبیب رضی اللہ عنہ کی اس کرامت کا ذکر ابن اسحاق نے منقطع سند سے کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 246/3) حارث کی یہ بیٹی مسلمان ہو گئی تھی۔ [2] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الرّجيع......، حديث: 4086. ابن حجر نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا: ''ابوالاسود نے عروہ کی روایت سے ان اشعار میں اضافہ کیا ہے۔'' پھر انھوں نے یہ دو شعر درج کیے: ''میرے گرد گروہوں کا اکٹھ ہو چکا ہے۔ انھوں نے اپنے قبائل کو بھی جمع کر لیا اور سب کو بلا لیا ہے۔ میں صرف اللہ سے اپنی اجنبیت اور اپنے دکھ کی اور میری قتل گاہ میں ان لوگوں نے جو کچھ تیار کر رکھا ہے، اُس کی شکایت کرتا ہوں۔''

ابوالاسود ہی نے عروہ سے یہ روایت کی کہ جب مشرکین خُبیب رضی اللہ عنہ کو اٹھا کر لکڑی کی طرف جانے لگے تو انھوں نے یہ اشعار پڑھے: ''میرے گرد گروہوں کا اکٹھ ہو چکا ہے۔ انھوں نے اپنے قبائل کو بھی جمع کر لیا اور ہر ایک کو بُلا لیا ہے۔ انھوں نے اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کو بھی جمع کیا اور مجھے ◄◄

ایک روایت کے الفاظ ہیں:

فَلَسْتُ أُبَالِي ......

پھر عقبہ بن حارث اٹھا اور اُس نے خبیب رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا۔ [1]

»» ایک مضبوط اور طویل تنے کے قریب لے جایا گیا۔ میں اللہ ہی سے اپنی اجنبیت اور اپنے دُکھ کی شکایت کرتا ہوں اور میری قتل گاہ میں انھوں نے جو کچھ تیار کر رکھا ہے اُس کی بھی شکایت کرتا ہوں۔ اے عرش والے! میرے ساتھ جو ظلم کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے اُس پر مجھے صبر عطا فرما۔ انھوں نے میرا گوشت کاٹا ہے اور میری ساری امیدیں ٹوٹ چکی ہیں۔ یہ سب اللہ کے لیے ہے اور اگر وہ چاہے تو ہر عضو کے بکھرے ہوئے جوڑوں میں برکت عطا فرما دے۔ میری عمر کی قسم! جب میں مسلمان ہو کر مَروں تو مجھے پروا نہیں کہ اللہ کے لیے میرا مَر کر گرنا کس حال میں ہو۔'' دیکھیے: (فتح الباري: 165/15) ابن حجر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ ابن اسحاق نے تیرہ شعر لکھے ہیں۔ ہمیں سیرت ابن ہشام میں ابن اسحاق کے دس اشعار ملے ہیں۔ ہم نے جو اشعار بیان کیے اُن پر اضافہ عروہ کی روایت سے ہے، جو یہ ہیں: ''ان میں سے ہر ایک دشمنی کا اظہار کرتا اور مجھ سے دست درازی کرتا ہے کیونکہ میں بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں۔ انھوں نے مجھے موت اور کفر میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار دیا ہے۔ میری آنکھیں بہہ پڑی ہیں لیکن یہ آنسو بے صبری کی بنا پر نہیں۔ مجھے موت کا ڈر نہیں کہ میں تو مرنے والا ہوں۔ لیکن مجھے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کا ڈر ہے۔ اللہ کی قسم! جب میں مسلمان ہو کر مروں تو مجھے پروا نہیں کہ اللہ کے لیے کس پہلو پر مر کر گرتا ہوں۔ میں دشمن کے سامنے خوف کا اظہار اور جزع وفزع کرنے والا نہیں۔ میری واپسی تو اللہ کی طرف ہے۔'' دیکھیے: (مغازي رسول الله لعروة بن الزبير، ص: 177) ابن ہشام کا کہنا ہے کہ شعر کا علم رکھنے والے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ اشعار خبیب رضی اللہ عنہ کے نہیں ہو سکتے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 250/3) [1] بخاری کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ خبیب رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والا أبوسَرْوَعَة تھا۔ اور ایک تیسری روایت میں ہے کہ وہ أبوسَرْوَعَة عقبہ بن حارث تھا۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا: ''أبوسَرْوَعَة، عقبہ کا بھائی ہے۔ أبوسَرْوَعَة اور عقبہ ایک ہی نام نہیں۔ ابن اسحاق کی ایک حسن صحیح روایت میں ہے کہ عقبہ بن حارث نے خبیب کو قتل نہیں کیا تھا کیونکہ وہ چھوٹا تھا۔ انھیں ابومیسرہ عبدری نے قتل کیا تھا۔ اُس نے نیزہ پکڑا اور عقبہ کے ہاتھ میں دیا، پھر نیزے سمیت اُس کا ہاتھ پکڑا اور خبیب رضی اللہ عنہ کو مارا اور انھیں قتل کر دیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

پھر قریش نے کچھ آدمی بھیجے کہ وہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی لاش کا کوئی حصہ کاٹ کر لائیں تاکہ اُن کی پہچان ہو سکے۔ حضرت عاصم نے بھی مشرکین کے ایک بڑے سردار کو جنگ بدر میں قتل کیا تھا۔[1] اللہ تعالیٰ نے اُن کی لاش پر بھڑوں کا ایک چھتا بھیج دیا جس نے انھیں قریب نہ آنے دیا۔ یوں اُن کی لاش کافروں کی دست برد سے محفوظ رہی۔[2]

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ اور اُن کے رفقائے کرام کے مرثیے میں بڑے بلند پایہ شعر کہے ہیں:

مَا بَالُ عَيْنَيْكَ لَا تَرْقَا مَدَامِعُهَا　　سَحًّا عَلَى الصَّدْرِ مِثْلَ اللُّؤْلُؤِ الْقَلِقِ
عَلٰى خُبَيْبٍ فَتَى الْفِتْيَانِ قَدْ عَلِمُوا　　لَا فَشِلٍ حِينَ تَلْقَاهُ وَلَا نَزِقِ

”حسان! کیا وجہ ہے تیرے آنسو نہیں رُک رہے؟ بلکہ تیرے سینے پر مضطرب موتیوں کی طرح بے تحاشا گر رہے ہیں؟ کیا کروں؟ خُبیب کی یاد آ رہی ہے جو سو جوانوں کا ایک جوان تھا۔ وہ جنگ میں بزدل نہ تھا اور ملاقات کے وقت بدخلق نہ تھا۔“

يَا عَيْنُ جُودِي بِدَمْعٍ مِّنْكِ مُنْسَكِبِ　　وَابْكِي خُبَيْبًا مَّعَ الْفِتْيَانِ لَمْ يَؤُبِ

[1] یہ ”بڑا سردار“ عقبہ بن ابی معیط تھا جو بدر میں قیدی ہوا۔ عاصم رضی اللہ عنہ نے اسے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے باندھ کر قتل کیا تھا۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ [2] ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ہُذیل نے عاصم رضی اللہ عنہ کا سر حاصل کرنا چاہا تا کہ وہ اسے سلافہ بنت سعد بن شُہَید کے ہاتھ بیچ دے۔ اُحد کے دن جب عاصم رضی اللہ عنہ نے سُلافہ کے دو بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو اُس نے نذر مانی تھی کہ اگر اُسے عاصم کا سَر مل گیا تو وہ اُن کے کاسۂ سر میں شراب پیے گی، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 244/3) سند کے بغیر ہے۔

صَقْرًا تَوَسَّطَ فِي الْأَنْصَارِ مَنْصَبُهٗ   سَمْحَ السَّجِيَّةِ مَحْضًا غَيْرَ مُؤْتَشِبِ

قَدْ هَاجَ عَيْنِي عَلٰى عِلَّاتِ عَبْرَتِهَا   إِذَا قِيلَ: نُصَّ إِلٰى جِذْعٍ مِّنَ الْخَشَبِ

''اے آنکھ! ذرا سخاوت کر اور اپنے آنسو خوب برسا اور خبیب پر رو جو جوانوں سمیت واپس نہ آیا۔ وہ تو شکرا تھا۔ انصار میں اُس کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ بہت فراخ طبیعت اور خالص النسب تھا۔ ذرہ بھر بھی کھوٹ نہیں تھی۔ جب پتہ چلا کہ اُسے لکڑی کے ایک تنے (سُولی) پر چڑھا دیا گیا تو میری آنکھ بے تحاشا آنسو برسانے لگی۔''

حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے ہذیل اور بنولحیان کی ہجو بھی کی۔

حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کو صفوان بن امیہ نے خرید لیا تا کہ انھیں اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلے میں قتل کر دے۔ جب وہ اُنھیں قتل کرنے کے لیے حرم سے باہر مقامِ تنعیم پر لائے تو وہاں قریش کا مجمع پہلے ہی موجود تھا۔ اس میں ابوسفیان بھی تھا۔ وہ کہنے لگا: ''زید! میں تجھے اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں: سچ بتا۔ اب تو تیرا جی چاہتا ہو گا کہ محمد ہمارے پاس ہوتے اور ہم تیرے بجائے اُن کی گردن اڑا دیتے اور تو اپنے اہل و عیال میں بخیر و عافیت بیٹھا ہوتا؟'' زید تڑپ کر بولے: ''رب ذوالجلال کی قسم! میں تو یہ بھی نہیں چاہتا کہ حضرت محمد (ﷺ) اس وقت جہاں تشریف فرما ہیں وہاں انھیں ایک معمولی سا کانٹا بھی چبھ جائے اور میں اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا رہوں۔'' ابوسفیان بے اختیار پکار اٹھا: ''واللہ! میں نے کسی قوم کو اپنے آقا سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جو محمد کے ساتھی محمد سے کرتے ہیں۔'' پھر صفوان کے آزاد کردہ غلام نِسطاس نے انھیں قتل کر دیا۔[1]

جب سریۂ رجیع کے صحابہ شہید ہوئے تو منافقین میں سے کچھ لوگوں نے کہا: ''ہائے

[1] یہ ابن اسحاق کی بلاسند روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام : 245/3، والطبقات ◄◄

افسوس! یہ گمراہ لوگ کس طرح ہلاک ہوئے کہ نہ اپنے گھر بار میں ٹھہرے نہ اپنے نبی کا پیغام پہنچا سکے۔'' اللہ تعالیٰ نے اُن کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِي قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝﴾

''کچھ لوگ ایسے ہیں کہ آپ کو اُن کی دنیوی زندگی کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ (تعالیٰ) کو گواہ (بھی) کرتا ہے، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔''[1]

اور اللہ تعالیٰ نے ان شہداء کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝﴾

''اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ (تعالیٰ) کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان قربان کر دیتے ہیں اور اللہ (تعالیٰ) اپنے بندوں پر بہت شفقت کرنے والا ہے۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے اکیلے عمرو بن امیہ ضمری کو مکہ بھیجا۔ وہ کہتے ہیں: ''میں خُبَیب کی سُولی کے پاس آیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ میں سُولی پر چڑھا اور خبیب کی رسیاں کھول دیں۔ ان کی لاش زمین پر گر پڑی۔ میں تھوڑی دور گیا، پھر مُڑ کر دیکھا تو مجھے خبیب کی لاش نظر نہ آئی۔ یوں لگتا تھا کہ انھیں زمین نے اپنے اندر سمو لیا ہے۔ اس کے بعد خُبیب کا کوئی نشان آج تک نظر نہیں آیا۔''[3] سریۂ رجیع ہجرت کے 36 ویں ماہ،

« الکبریٰ: 56/2) ابن سعد کی روایت بھی ابنِ اسحاق کی مُرسل سند سے ہے۔ [1] مسند أحمد: 139/4، 288/5. ابن ابی شیبہ نے اسے جعفر بن عمرو بن اُمیہ کی سند سے نقل کیا ہے۔ انھوں نے اپنے والد سے روایت کیا۔ اس سند میں ابراہیم بن اسماعیل ہے جس کے ضعیف ہونے پر سب کا اتفاق ہے، دیکھیے: (تقریب التھذیب، ص: 88) [2] البقرۃ 204:2. [3] البقرۃ 207:2. یہ ابن اسحاق کی «

ماہِ صفر میں پیش آیا۔ [1]

واقعہ بئرِ معونہ

جس مہینے رسول اللہ ﷺ نے رجیع والوں کو بھیجا اُسی میں آپ نے بئر معونہ کی مہم روانہ کی۔ [2] صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجد کی طرف ستر بہترین صحابہ بھیجے جنھیں "قُرَّاء" کہا جاتا تھا۔ یہ دن کو لکڑیاں جمع کرتے اور رات کو نفل نماز پڑھتے رہتے تھے۔ [3] صحیح مسلم میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ وہ اپنی لکڑیاں بیچ کر ان کی آمدنی اہل صُفہ پر خرچ کرتے تھے۔ [4]

صحیح مسلم میں ہے: انھیں بھیجنے کا سبب یہ تھا کہ کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور مطالبہ کیا کہ ہمارے ساتھ کچھ آدمی بھیجے جائیں جو ہمیں قرآن وسنت کی تعلیم دیں۔ [5]

امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک اور سبب بھی بیان کیا ہے جو اصولی طور پر اس سے زیادہ مختلف نہیں کہ بنوسُلَیم کے کچھ قبائل رعل، ذکوان، عصیہ اور بنولحیان نے رسول اللہ ﷺ سے دشمن کے خلاف مدد طلب کی تو آپ نے یہ ستر افراد بھیجے۔ [6] ابن سعد نے بھی یہی سبب بیان کیا ہے۔ [7] بعض ائمۂ مغازی نے لکھا ہے کہ ابوبراء عامر بن مالک، جسے مُلَاعِبُ الْأَسِنَّة

»» روایت ہے جو منقطع سند سے ہے۔ ابن کثیر نے اسے متصل سند سے بیان کیا ہے لیکن اُن کی سند ضعیف ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 248/3، والبداية والنهاية: 76/4) [1] المغازي للواقدي: 354/1، والطبقات الكبرٰى: 55/2. دونوں کی سندیں ضعیف ہیں۔ [2] المغازي للواقدي: 346/1، والطبقات الكبرٰى: 51/2، والسيرة النبوية لابن هشام: 260/3. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے اور ان سب کی سندیں ضعیف ہیں۔ [3] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الرجيع......، حديث: 4090. [4] صحيح مسلم، الإمارة، باب ثبوت الجنة للشهيد، حديث: 677، بعد الحديث: 1902. [5] صحيح مسلم، الإمارة، باب ثبوت الجنة للشهيد، حديث: 677، بعد الحديث: 1902. [6] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الرّجيع......، حديث: 4090. [7] الطبقات الكبرٰى: 53/2. سند صحیح ہے۔

''نیزوں اور تیروں سے کھیلنے والا'' کہا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ نے اُسے اسلام کی دعوت دی۔ وہ مسلمان نہ ہوا لیکن اُس نے انکار بھی نہ کیا۔ اور کہا: ''اللہ کے رسول! اگر آپ اپنے چند مبلغ نجد والوں کی طرف بھیج دیں جو انھیں دین اسلام کی دعوت دیں تو شاید وہ دعوت قبول کر لیں۔'' آپ نے فرمایا:

«إِنِّي أَخَافُ عَلَيْهِمْ أَهْلَ نَجْدٍ»

''مجھے خطرہ ہے کہ نجد والے انھیں نقصان پہنچائیں گے۔''

ابو براء نے کہا: ''میں ان کا ذمہ دار ہوں۔'' ان روایات میں تطبیق ممکن ہے کہ دونوں باتیں ہوئی ہوں گی اور رسول اللہ ﷺ نے یہ ستر صحابہ ابو براء اور بنو سلیم دونوں کے مطالبے پر روانہ فرمائے۔[1]

جب یہ قُرّاء عامر کی زمین اور بنو سلیم کے پتھریلے میدان کے درمیان معونہ کے کنویں (بئر معونہ) پر پہنچے تو انھوں نے حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کا خط دے کر اللہ کے دشمن عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ اُس نے خط پر نظر بھی نہ ڈالی اور ایک آدمی کو اشارے سے حکم دیا۔ اُس نے حضرت حرام رضی اللہ عنہ کو پیچھے سے نیزہ مارا جو سینے کے پار ہو گیا۔ خون کا فوارہ پھوٹا تو حضرت حرام رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ اکبر! رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔''[2]

حضرت حرام رضی اللہ عنہ نے بہتا ہوا خون اپنے چہرے اور سر پر مل لیا۔[3] گویا وہ چاہتے تھے کہ اپنے رب کریم کے حضور پہنچیں تو اُن کا سارا جسم خونِ شہادت سے رنگین ہو تا کہ اُن کا

[1] یہاں پہنچ کر اہلِ سیرت کی روایت صحیحین کی روایت کے موافق ہو جاتی ہے، سوائے منذر کی حکومت اور اس کے لقب کے تذکرے کے کہ وہ اہلِ سیرت کی روایت سے ہے۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 260/3، والطبقات الكبرٰى: 51/2، والمغازي للواقدي: 346/1. ان سب کی اسانید ضعیف ہیں۔
[3] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الرّجيع......، حديث: 4092.

ثواب بڑھ جائے، پھر عامر بن طفیل نے بنو عامر سے کہا کہ وہ باقی مسلمانوں کو قتل کر دیں لیکن ابو براء کی پناہ کی وجہ سے انھوں نے اُس کی بات نہ مانی، پھر اُس نے بنو سلیم کو یہی حکم دیا تو عصیہ، رعل اور ذکوان نے ہامی بھر لی۔ اُن کا مسلمانوں کے ساتھ خونی معرکہ ہوا جس میں سب مسلمان شہید ہو گئے۔ سوائے کعب بن زید بن نجار کے جو شدید زخمی ہونے کے باوجود بچ گئے۔ وہ غزوۂ خندق میں شہید ہوئے تھے۔ عمرو بن امیہ ضمری بھی محفوظ رہے کیونکہ وہ اُن سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اُن کے ساتھ منذر عقبہ بن عامر بھی تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ سب ساتھی مارے گئے ہیں تو مشرکین سے لڑائی شروع کر دی۔ مشرکین نے منذر کو قتل کر دیا اور عمرو بن اُمیہ کو قید کر لیا۔ عامر نے انھیں اپنی ماں کی طرف سے ایک نذر کے سلسلے میں آزاد کر دیا۔

حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ دلخراش خبر لے کر پہنچے۔ راستے میں انھوں نے موقع پا کر بنو کلاب کے دو آدمی قتل کر دیے۔ انھوں نے سمجھا میں نے اپنے ساتھیوں کا کچھ بدلہ لے لیا ہے مگر بعد ازاں پتہ چلا کہ اُن دونوں کے ساتھ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ تھا جس کا انھیں علم نہ تھا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی دیت دینا لازم جانا۔ دیت کے سلسلہ میں آپ نے مسلمانوں اور معاہد یہودیوں سے تعاون کے لیے رابطہ کیا۔ جب آپ اس مقصد کے لیے یہودیوں کے پاس گئے تو انھوں نے آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی جو غزوۂ بنو نضیر کا سبب بنی۔ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں سانحوں رجیع اور معونہ سے سخت صدمہ پہنچا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس دن صبح کی نماز میں صحابہ کے قاتلین رعل، ذکوان، بنو لحیان اور عصیہ کے خلاف بددعا کی۔[1]

[1] یہ بخاری کی نو روایات کا خلاصہ ہے، دیکھیے: (صحیح البخاري، المغازي، باب غزوة الرجیع……، أحادیث:4088-4096، وصحیح مسلم، المساجد……، باب استحباب القنوت في جمیع ◄◄

اس موقع پر حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کی ایک کرامت ظاہر ہوئی۔ امام بخاری کی روایت ہے کہ جب معونہ میں قرّائے کرام شہید ہوئے اور عمرو بن اُمیّہ ضمری قید ہو گئے تو عامر بن طفیل نے ایک مقتول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: ''یہ کون ہے؟'' عمرو بن امیہ نے کہا: ''یہ عامر بن فہیرہ ہیں۔'' اُس نے کہا: ''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ قتل ہونے کے بعد اس کی لاش آسمان کی طرف اٹھائی گئی حتی کہ وہ زمین و آسمان کے درمیان پہنچ گئی، پھر اسے واپس لا کر زمین پر رکھ دیا گیا۔''[1] ابن فُہیرہ کو قتل کرنے والا جبار بن سلمی کلابی تھا۔ جب اُس نے حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کی لاش کا یہ حال دیکھا تو وہ مسلمان ہو گیا۔[2] ہمیں یہ پتہ نہیں چل سکا کہ حضرت کعب بن زید رضی اللہ عنہ کس طرح مدینہ منورہ پہنچے۔ تاریخی کتب میں اتنا لکھا ہے کہ اُنھیں مقتولین کی لاشوں کے درمیان سے شدید زخمی حالت میں اٹھایا گیا تو اُن کا سانس چل رہا تھا۔

حکم و احکام

* یہ دونوں المناک واقعات اس حقیقتِ عظمیٰ کا ثبوت ہیں کہ دعوتِ اسلامی کی ذمہ داری میں سب مسلمان شریک ہیں۔ یہ صرف انبیاء اور رسولوں یا اُن کے خلفاء اور علماء ہی کی ذمہ داری نہیں بلکہ یہ فرضِ عین ہے اور ہر مسلمان کی پہلی اور فوری ذمہ داری ہے۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے وہ خطرہ پہلے ہی بھانپ لیا تھا جو معونہ والوں کو بعد میں پیش آیا۔ اس کے باوجود آپ نے قُراء کو بھیجنے میں ذرا بھی توقف نہیں فرمایا بلکہ اپنی وفات تک آپ ﷺ اس قسم کے تبلیغی وفود ہمیشہ بھیجتے رہے۔ آپ ﷺ سمجھتے تھے کہ دعوت و تبلیغ کی اساسی ذمہ داری ہر چیز سے اہم اور مقدم ہے، پھر اس مبارک راستے

◂◂ الصلوات……، حديث: 677) [1] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الرجيع……، حديث: 4093. [2] المغازي للواقدي: 349/1، والطبقات الكبرىٰ: 52/2. یہ روایت بھی واقدی کی ہے۔

میں جو بھی مصائب و مشکلات پیش آئیں وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ اُن کی فکر نہیں کرنی چاہیے بلکہ راضی برضائے رب العزت رہنا چاہیے۔

* اسلامی تربیت کا بے مثل اعجاز حضرت خُبیب بن عدی رضی اللہ عنہ کی سیرت میں سورج کی طرح چمک رہا ہے۔ انھیں جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ پرلے درجے کے بدترین مشرکین نے انھیں زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ موت کی تلوار ان کے سر پر چمک رہی تھی۔ کیسا سازگار موقع تھا کہ اُسترا ان کے ہاتھ میں تھا اور بدترین دشمن آل حارث کا بچہ ان کی آغوش میں ہمک رہا تھا۔ وہ اپنی موت سے پہلے اس بچے کو انتقاماً قتل کر کے آل حارث کو ان کی شقی القلبی کا مزہ چکھا سکتے تھے لیکن انھوں نے اس نازک گھڑی میں بھی دینی تعلیمات ہی کو حرزِ جان بنائے رکھا اور دشمن کے بچے کو قتل کرنے کا انھیں خیال تک نہیں آیا۔ اس کے برعکس کفار کی جو ذہنیت اور سفاکانہ عمل نمایاں ہوتا ہے وہ کس قدر گھٹیا اور گھناؤنا ہے۔ انھوں نے رجیع اور معونہ والے صحابہ سے بدعہدی کی، پھر انھوں نے خبیب کے اُن کے بچے کو قتل نہ کرنے کا بھی کوئی اچھا صلہ نہیں دیا بلکہ اس حسن عمل کے باوجود انھیں نہایت دردناک طریقے سے سُولی پر لٹکا دیا۔ معلوم ہوا کہ بے وفائی، خیانت اور خباثت کافروں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔

* قیدی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دشمن کی قید میں ہونے کے باوجود اُن کی پناہ قبول نہ کرے اور اُن کا کوئی بھی فیصلہ ماننے سے انکار کر دے، چاہے وہ اس جرم میں قتل کر دیا جائے۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے یہی ثابت ہوتا ہے اور اگر وہ رخصت قبول کرتے ہوئے اُن کی امان قبول کرے تو یہ بھی درست ہے بشرطیکہ وہ رہائی پانے کا کوئی نہ کوئی موقع تلاش کرتا رہے۔ حضرت زید اور حضرت خُبیب رضی اللہ عنہما کا طرزِ عمل اسی پر دلالت کرتا ہے۔

* قید کے دوران میں حضرت خُبیب رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو خرقِ عادت، یعنی غیر موسم میں انگوروں کی دستیابی کا واقعہ پیش آیا اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو چیز نبی کا معجزہ بن سکتی ہے وہ ولی کی کرامت بھی بن سکتی ہے۔
* قتل کیے جانے کے وقت دو رکعت نماز پڑھنا جائز ہے۔ حضرت خُبیب رضی اللہ عنہ نے یہ عمل رائج کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے برقرار رکھا۔
■ حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کی قوتِ ایمانی اور حب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اظہر من الشمس ہے کہ وہ اپنی موت پر راضی ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کانٹا چبھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حب رسول میں اسی معیار پر تھے اور یہ اُن کا اور ہر مومن مرد و عورت کا فرض بنتا ہے۔ حب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ جذبہ پکے ایمان کی دلیل ہے۔
* رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام اللہ تعالیٰ کو اُس کی مخلوق میں سب سے زیادہ پیارے تھے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اُن کو آزمائش اور مصائب کی بھٹی میں ڈالا۔
* ظالمین کے خلاف نمازوں میں دعائے قنوت کی جاسکتی ہے۔ مسلمانوں پر کوئی آفت نازل ہو جائے تب بھی قنوت نازلہ پڑھی جاسکتی ہے۔[1]

غزوۂ بنی نضیر

غزوے کا سبب

تاریخی کتب میں اس جنگ کے تین اسباب بیان کیے گئے ہیں:

* جنگ بدر کے بعد قریش کی انگیخت پر بنونضیر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش کی۔

[1] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 119-201، وهٰذا الحبيب محمد يا محب لجابر الجزائري، ص: 282-285، وفقه السيرة للغزالي، ص: 298-301.

* بنوکلاب کے دو مقتولوں کی دیت کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ اُن کے ہاں تشریف لے گئے تو انھوں نے آپ کی جان لینے کی کوشش کی۔
* انھوں نے قریش کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف لڑائی برپا کرنے پر اُکسایا اور اُنھیں مسلمانوں کی دفاعی کمزوریاں بتائیں۔

پہلے سبب کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ قریش نے یہودیوں کو پیغام بھیجا کہ محمد (ﷺ) سے جنگ کرو ورنہ ہماری تمھاری جنگ ہے۔ بنونضیر اس دھمکی میں آ گئے اور انھوں نے منصوبہ بنایا کہ رسول اللہ ﷺ کو دھوکے سے قتل کر دیا جائے۔ انھوں نے آپ سے درخواست کی کہ آپ تیس صحابہ کو ساتھ لے کر کسی مناسب جگہ تشریف لے آئیں ہم بھی اپنے تیس علماء لائیں گے، وہاں گفتگو ہوگی۔ اگر ہمارے علماء نے آپ کی بات مان لی تو ہم سب مسلمان ہو جائیں گے۔ جب مقررہ جگہ کے قریب پہنچے تو انھوں نے تجویز پیش کی کہ آپ صرف تین صحابہ کو لائیں ہمارے بھی تین عالم ہوں گے۔ ان تین یہودیوں نے خنجر چھپائے ہوئے تھے۔ لیکن اُن لوگوں کی ایک عورت نے اپنے مسلمان بھائی کے سامنے یہ راز فاش کر دیا۔ اُس نے فوراً رسول اللہ ﷺ کو مطلع کر دیا۔ آپ وہاں سے واپس تشریف لے آئے اور تیاری کے بعد اُن کا محاصرہ کر لیا۔ وہ بے بس ہو کر جلاوطنی پر رضامند ہو گئے بشرطیکہ انھیں اسلحہ کے بجائے اونٹوں پر مال لاد کر لے جانے دیا جائے۔[1]

دوسرے سبب کی تفصیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ بنو کلاب کے دو مقتولین کی دیت کے سلسلے میں یہود کے ہاں گئے کیونکہ ان سے معاہدہ ہو چکا تھا، انھوں نے مقررہ حصہ ادا کرنے کا وعدہ کیا تو آپ ان کے انتظار میں ایک دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے۔ انھوں نے دیکھا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے: تمھیں دوبارہ ایسا موقع نہیں ملے گا۔ انھوں نے

[1] المصنف لعبد الرزاق:5/360,359. اس روایت کی سند صحیح ہے۔

منصوبہ بنایا کہ عمرو بن جحاش اس دیوار پر چڑھ کر آپ پر ایک بھاری پتھر گرا دے تا کہ آپ کا کام تمام ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو ان کے ارادے کی اطلاع کر دی۔ آپ مدینہ منورہ واپس آ گئے۔ صحابہ کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا لیکن جب آپ کافی دیر تک واپس نہ آئے تو انھیں پتہ چلا کہ آپ تو مدینہ منورہ پہنچ گئے ہیں۔ صحابہ بھی واپس چلے گئے۔ آپ ﷺ نے انھیں ان کی سازش بتلائی اور جنگ کی تیاری کا حکم دیا، تیاری کے بعد مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ چھ دن محاصرہ جاری رہا۔ آخر کار وہ اس شرط پر صلح پر مجبور ہو گئے کہ اونٹوں پر جتنا مال لاد سکیں لے جائیں۔ [1]

تیسرا سبب صرف موسیٰ بن عقبہ ہی نے بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ''بنونضیر نے خفیہ طور پر قریش کو پیغام بھیجا اور انھیں رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے پر اکسایا تھا بلکہ انھیں مسلمانوں کی چند دفاعی کمزوریاں بھی بتلائی تھیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب قریش مسلمانوں سے لڑائی کرنے کے لیے اُحد کے پاس فروکش تھے۔'' [2]

شاید دکتور اکرم ضیاء عمری کو بیہقی کی اس روایت کا پتہ نہ چل سکا جس میں حافظ ابن حجر کے ہاں موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے کچھ زائد الفاظ بھی ہیں: ''جب قریش اُحد کے پاس

[1] ابن اسحاق کی یہ روایت مرسل سند سے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 268,267/3) یہ سند متابعت (تائیدی روایت) کی بنا پر قوی ہے۔ یہ تائیدی روایت موسیٰ بن عقبہ کی ہے جو ابن حجر اور بیہقی نے نقل کی ہے۔ ابن حجر کے ہاں موسیٰ بن عقبہ کی روایت میں ابن اسحاق کی روایت سے اضافہ ہے کہ بنونضیر نے خفیہ طور پر قریش کو پیغام بھیجا اور انھیں رسول اللہ ﷺ سے لڑائی کرنے پر برانگیختہ کیا اور انھیں اسلامی لشکر اور اُن کے شہر کی دفاعی کمزوریاں بتائیں۔ بخاری کے ہاں بنونضیر کی روایت کا عنوان اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ انھوں نے بھی یہی سبب سمجھا ہے۔ عنوان کا متن یہ ہے: ''بنونضیر کا قصہ اور رسول اللہ ﷺ کا کلابیوں کی دیت کے متعلق اُن کی طرف جانا اور اُس غدر کی تفصیل جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا۔'' دیکھیے: (فتح الباري: 202/5، ودلائل النبوة للبيهقي: 181,180/3)

[2] فتح الباري: 203/15، ودلائل النبوة للبيهقي: 180/3. اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

فروکش تھے۔" تبھی تو عمری نے لکھا ہے: "موسیٰ بن عقبہ کی روایت میں مسلمانوں کے خلاف یہودیوں کی شرارت کا وقت متعین نہیں کیا گیا۔"[1]

مشہور ہے کہ یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف مشرکین کو اشتعال دلایا تھا جس کے نتیجے میں اُحد کی جنگ برپا ہوئی۔ جب ابوسفیان نے مدینہ کے اطراف میں لوٹ مار کی، اس وقت انھوں نے ابوسفیان کی مدد بھی کی تھی جس کی وجہ سے غزوۂ سویق پیش آیا تھا۔ اسی طرح کعب بن اشرف مسلمانوں کی ہجو میں شعر کہا کرتا تھا اور قریش کو ان کے خلاف مشتعل کرتا تھا۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہودیوں کا مسلمانوں کے ساتھ کیا رویہ تھا۔ قتل کی سازش نے جلتی پر تیل کا کام کیا جس کے نتیجے میں فیصلہ کیا گیا کہ ان کے جرائم کی بیخ کنی کی جائے، چنانچہ ان کی جلاوطنی عمل میں آئی۔[2]

ملخص قصہ: جب رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کی بنونضیر کی تیار کردہ سازش بے نقاب ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو انتباہ کیا کہ دس دن کے اندر اندر مدینہ خالی کردیں۔ اس کے بعد جو نظر آیا اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔

بنونضیر جلاوطنی پر رضا مند ہوگئے مگر عبداللہ بن ابی نے انھیں اکسایا کہ وہ یہ دھمکی قبول نہ کریں۔ اُس نے انھیں یقین دلایا کہ وہ اُن کے ساتھ ہے۔ اس پر انھوں نے مخالفت کا اعلان کردیا۔ مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کرلیا[3] سورۂ حشر کی آیات میں اسی صورتحال کی

[1] یہ واقدی کی روایت ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ محاصرہ کتنی مدت جاری رہا، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 1/367-369) ابن اسحاق نے بھی اسے بغیر سند کے بیان کیا ہے۔ انھوں نے محاصرے کی مدت کا ذکر نہیں کیا، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 3/269) ابن سعد نے بھی اسے بلاسند بیان کیا ہے، دیکھیے: (الطبقات الكبرىٰ: 3/57,58) اُن کی روایت کا مضمون واقدی کی روایت کے مانند ہے۔ بیہقی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ بیہقی کی دونوں سندوں میں چار راوی مجہول ہیں، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 3/181-183) یوں یہ تمام سندیں ضعیف ہیں۔ [2] المجتمع المدني في عهد النبوّة، ص: 147. [3] المجتمع المدني في عهد النبوة، تنظيماته......، ص: 147.

طرف اشارہ کیا گیا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ ﴾

''کیا تو نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے منافقت کی؟ وہ اپنے اُن بھائیوں سے، جنھوں نے اہلِ کتاب میں سے کفر کیا، کہتے ہیں اگر تمھیں نکال دیا گیا تو ہم بھی تمھارے ساتھ ہی نکلیں گے اور تمھارے معاملے میں کبھی کسی کی بات نہیں مانیں گے۔ اور اگر تم سے لڑائی کی گئی تو ہم تمھاری مدد ضرور کریں گے۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بلاشبہ وہ جھوٹے ہیں۔''[1]

جلاوطنی اور اس کی شرطیں

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنونضیر کو جنگ پر اتر آنے کی وجہ سے جلاوطن کردیا۔[2] اس کی تفصیلات تاریخی کتابوں میں موجود ہیں، مثلاً: جلاوطن کیسے کیا گیا

[1] الحشر 11:59. جن لوگوں نے اس آیت کی شانِ نزول کے متعلق یہ روایت کیا کہ یہ بنونضیر اور منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، اُن میں طبری اور ابن اسحاق شامل ہیں۔ طبری نے ایک سند سے روایت کیا جو ابن عباس رضی اللہ عنہما تک پہنچتی ہے۔ یہ سند ضعیف ہے۔ اُن کی دوسری روایت ایک مرسل سند سے ہے جو مجاہد تابعی رحمہ اللہ پر موقوف ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں، دیکھیے: (تفسير الطبري: 46/28) ابن اسحاق کی روایت بلاسند ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 273,272/3) یوں یہ تمام روایات ضعیف ہیں، تاہم ان میں سے بعض متابعت (تائیدی روایت) کی بنا پر تقویت حاصل کر لیتی ہیں۔ دوسری جانب سورۂ حشر کا بنونضیر کے بارے میں نازل ہونا صحیح سندوں سے ثابت ہے۔ سورۂ حشر نے اپنی بعض آیات میں بنونضیر کے متعلق منافقین کے موقف اور اُن کے رویے کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اس سورت کو سورۂ بنونضیر کہتے تھے۔ یہ بخاری کی روایت ہے، دیکھیے: (صحيح البخاري، المغازي، باب حديث بني النضير، حديث: 4029) [2] صحيح البخاري، المغازي، باب حديث بني النضير، حديث: 4028.

اور جنگ کی نوعیت کیا تھی۔ یہ بھی درست طور پر ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے باقاعدہ لشکر کے ساتھ ان کا محاصرہ کیا تھا اور ان سے فرمایا:

«إِنَّكُمْ لَا تَأْمَنُونَ عِنْدِي إِلَّا بِعَهْدٍ تُعَاهِدُونِي عَلَيْهِ»

''میں تمھارے بارے میں مطمئن نہیں ہوسکتا الا یہ کہ تم مجھ سے کوئی پختہ معاہدہ کرو۔''

انھوں نے معاہدہ کرنے سے انکار کیا۔ آپ نے ان سے لڑائی شروع کردی۔ سارا دن لڑائی ہوتی رہی۔ اگلے دن آپ نے انھیں چھوڑ کر بنوقریظہ پر لشکر اور شہ سوار دستوں کے ہمراہ چڑھائی کردی اور بنوقریظہ کو پیشکش کی کہ معاہدہ کرلو۔ وہ مان گئے اور معاہدہ کرلیا۔ آپ واپس آگئے۔ اگلے دن پھر بنونضیر پر چڑھائی اور لڑائی کی حتی کہ وہ جلا وطنی پر راضی ہوگئے اور طے پایا کہ انھیں اونٹوں پر سامان لے جانے کی اجازت ہے، البتہ وہ اسلحہ نہیں لے جائیں گے۔ اس معاہدے کے مطابق وہ اپنا سامان حتی کہ گھروں کے دروازے بھی اونٹوں پر لاد کر لے گئے۔ گھروں کو توڑ پھوڑ دیا۔ جو کام کی لکڑی ملی وہ بھی لے گئے۔[1]

قرآن کی عبارت سے ثابت ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے بنونضیر کے باغات میں سے کھجور کے کچھ درختوں کو محاصرے کے دوران جلایا اور کاٹا۔ صحیح احادیث سے بھی یہ ثابت ہے۔[2] بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں شام کی طرف جلا وطن کیا گیا[3] جبکہ بعض دیگر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خیبر چلے گئے۔[4] ابن اسحاق کی روایت سے دونوں میں تطبیق ہوجاتی ہے، وہ کہتے ہیں: ''وہ مدینہ منورہ سے نکل کر خیبر چلے گئے اور کچھ شام چلے

[1] سنن أبي داود، الخراج، باب في خبر النّضير، حديث: 3004، والمصنّف لعبد الرزاق: 361-358/5، و دلائل النبوة للبيهقي: 182,181/3. [2] صحيح البخاري، التفسير، باب قوله: ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّن لِّينَةٍ﴾، حديث: 4884، و كتاب المغازي، باب حديث بني النضير......، حديث: 4032,4031. [3] اسے عبدالرزاق نے صحیح سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (المصنّف لعبد الرزاق: 361-358/5) [4] الطبقات الكبرٰى: 58/3. اس روایت کی سند ضعیف ہے۔

گئے۔ ان کے بڑے بڑے سردار، مثلاً: سلام بن ابی الحُقیق، کنانہ بن ربیع بن ابی الحُقیق اور حُیَی بن اَخطب خیبر جا کر رہنے لگے۔ جب یہ وہاں اترے تو خیبر والوں نے بھی ان کی سرداری قبول کر لی۔''[1] بعد میں ہونے والے واقعات بھی جو صحیح روایات سے ثابت ہیں، اسی کی تائید کرتے ہیں، مثلاً: خیبر کی لڑائی میں ان کا حصہ لینا، کنانہ کا مارا جانا، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا قید ہونا اور سلام بن ابی الحُقیق کا واقعہ۔[2]

بنونضیر کے دو افراد یامین بن کعب اور ابوسعید بن وہب مسلمان ہو گئے تھے، اس لیے ان کا سارا مال محفوظ رہا اور انھی کو مل گیا۔[3]

باقی ماندہ مال اور باغات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مل گئے[4] آپ ان میں سے اپنے اہل و عیال کے لیے ایک سال کے اخراجات مہیا کرتے اور باقی پیداوار جنگی تیاری پر اسلحہ اور گھوڑے خریدنے میں صرف کر دیتے تھے۔[5]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنونضیر کی زمین مہاجرین میں تقسیم کر دی اور انصار کو کچھ نہیں دیا، تاہم سہل بن حنیف اور ابودجانہ کو ان کے فقر کی بنا پر حصہ مرحمت فرمایا۔[6]

اس کے بعد بھی بنونضیر کے سردار اپنی سازشوں اور شرارتوں سے باز نہیں آئے۔ انھوں نے قریش اور دوسرے قبائل کو بھڑکانا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں جنگ خندق لڑی گئی۔[7]

[1] السيرة النبوية لابن هشام : 269/3. یہ معلّق روایت ہے۔ [2] المجتمع المدني، ص : 149. [3] ابن اسحاق کی یہ روایت اُن کے شیخ عبداللہ بن ابی بکر سے ہے جس کی سند منقطع ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام :270/3) [4] صحيح البخاري، التفسير، سورة الحشر، باب: (1)، حديث : 4883,4882، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب جواز من نقض العهد......، حديث: 1769,1768. [5] صحيح البخاري، التفسير، سورة الحشر، باب قوله: ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ﴾، حديث : 4885. [6] سنن أبي داود، الخراج، باب في خبر النضير، حديث: 3004. ابوداود نے دونوں صحابہ کا نام نہیں لکھا۔ ابنِ اسحاق نے بھی اس روایت کو منقطع سند سے بیان کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام :270/3، والمصنَّف لعبدالرّزاق: 358/5-361) [7] غزوۂ خیبر کے واقعات کے ضمن میں سلام بن ابی الحُقیق کا واقعہ آ رہا ہے کہ وہ مدینہ کے خلاف جنگ پر ››

غزوۂ بنونضیر کی تاریخ

مصنف عبدالرزاق میں زہری اور مستدرک حاکم میں عروہ کی روایت ہے کہ یہ بدر کبریٰ کے بعد کی بات ہے۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے عروہ کے حوالے سے ایک معلق روایت بیان کی کہ یہ غزوہ جنگ بدر کے چھ ماہ بعد اور جنگ اُحد سے پہلے ہوا۔[2] حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہی روایت عبدالرزّاق نے زہری سے متصل سند کے ساتھ بیان کی ہے اور یہ روایت بخاری کی روایت سے زیادہ مکمل ہے۔ بیہقی نے بھی اسی سند سے بیان کی ہے۔[3] امام بیہقی نے ایک روایت زہری عن عقیل کی سند سے بخاری اور عبدالرزاق کی روایت کے مانند بیان کی ہے۔[4]

محدثین کا خیال یہی ہے کہ غزوۂ بنونضیر غزوۂ اُحد سے پہلے اور غزوۂ بدر کے بعد ہوا۔ لیکن اہل سیرت و مغازی بالاتفاق اسے اُحد کے بعد کا واقعہ بتلاتے ہیں۔ ابن اسحاق کہتے

»» ابھارنے کے جرم میں موت کی سزا دی گئی۔ ابن اسحاق نے منقطع سند سے بنونضیر کے ان یہودیوں کے نام لکھے ہیں جنھوں نے احزاب (بیرونی قبائل) کو مدینہ پر حملے کے لیے برانگیختہ کیا۔ ان میں سلام، حُیَی اور کنانہ شامل تھے۔ احزاب کو مدینہ کے خلاف بھڑکانے کی روایات کا ذکر عبدالرزاق، ابن سعد اور ابن حجر نے بھی کیا ہے۔ ابن حجر نے فتح الباری میں جو معلّق روایت نقل کی وہ موسیٰ بن عقبہ کی ہے، دیکھیے: (المصنَّف لعبد الرزاق:5/368-373، والطبقات الكبرٰى: 3/66,65، وفتح الباري: 15/275) ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس موضوع کی تمام روایات ضعیف ہیں، تاہم مجموعی اعتبار سے یہ قابل اعتبار ہیں اور اہلِ سیرت و مغازی کی روایات ہونے کی وجہ سے ایک دوسری کو تقویت دیتی ہیں اور ان کی تائید میں دیگر روایات (شواہد) بھی موجود ہیں۔ [1] المصنَّف لعبدالرزاق :5/357، والمستدرك للحاكم : 2/483. حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا اور ذہبی نے اُن کی موافقت کی ہے۔ اور یہ بات گزر چکی ہے کہ غزوۂ بدر کبریٰ 17 رمضان المبارک 2ھ کو پیش آیا۔ [2] صحیح البخاري، المغازي، باب حديث بني النضير......، قبل الحديث:4028. [3] المصنف لعبدالرزاق :5/357، ودلائل النبوّة للبيهقي: 3/178. بیہقی کی سند ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا تک پہنچتی ہے۔ [4] دلائل النبوة للبيهقي :3/176.

ہیں کہ یہ غزوہ چار ہجری میں ہوا۔[1] واقدی اور ابن سعد کے مطابق یہ ہجرت کے 37 ویں ماہ، ربیع الاول میں پیش آیا۔[2] ابن ہشام نے بھی ان کی موافقت کی ہے۔[3]

چونکہ سریہ بئر معونہ بالا تفاق اُحد کے بعد ہوا ہے۔ اسی طرح جب ہم دوسرے اسباب اکٹھے کرتے ہیں تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزوہ بھی اُحد کے بعد ہی ہوا ہے۔ امام بخاری نے ایک معلّق روایت میں جو ابن اسحاق سے ہے، اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے بئر معونہ کے واقعے میں عمرو بن امیہ ضمری کا ذکر کیا ہے اور بئر معونہ کے واقعے کو اُحد کے بعد لائے ہیں، پھر غزوۂ بنو نضیر کے اسباب کے بیان میں انھی عمرو بن امیہ ضمری کا ذکر آتا ہے۔ ان سب کو ملانے سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ غزوۂ بنو نضیر غزوۂ اُحد اور حادثہ بئر معونہ کے بعد پیش آیا۔ اس سے ابن اسحاق اور دیگر اہل سیر کی تائید ہوتی ہے۔ ابن حجر، سندھی اور دکتور اکرم عمری کا رجحان بھی یہی ہے۔[4] ہم بھی اسی کو درست سمجھتے ہیں۔

حکمتیں و عبرتیں

اللہ تعالیٰ کا وقت سے پہلے اپنے نبیِ کریم ﷺ کو یہودیوں کی عہد شکنی اور بے وفائی سے مطلع کر دینا آپ کا معجزہ ہے جس کے پیش نظر تمام انسانوں کو آپ کی نبوت پر ایمان لانا چاہیے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہودی بار بار عہد شکنی کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ ہر دفعہ پورا فرمایا جو اس آیت مبارکہ میں آپ سے کیا گیا ہے:

﴿ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ ''اور اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔''

رسول اللہ ﷺ کا بنو نضیر کے کچھ درختوں کو کاٹ دینا اور جلا دینا اس امر کی دلیل ہے

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 267/3. یہ معلّق روایت ہے۔ [2] المغازي للواقدي: 363/1، والطبقات الكبرٰى: 57/2. [3] السيرة النبويّة لابن هشام: 268/3. [4] صحيح البخاري، المغازي، باب حديث بني النضير، حديث: 4028، ومرويّات تاريخ يهود المدينة، ص: 142، والمجتمع المدني، ص: 145,144.

کہ دشمن کی اشیاء ضائع کرنا امام کی رائے پر موقوف ہے۔ اگر اس سے دشمن کے ہتھیار ڈالنے کا امکان ہے تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ سیاسی مسئلہ ہے۔ جمہور مجتہدین وفقہاء، مثلاً: امام نافع، مالک، ثوری، ابوحنیفہ، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں، البتہ امام لیث، ابوثور اور اوزاعی رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ وہ کفار کے درختوں کو کاٹنا اور جلانا درست نہیں سمجھتے۔[1]

* ائمہ کا اتفاق ہے کہ جو غنیمت مسلمانوں کو دشمن سے لڑے بغیر حاصل ہو وہ ''فے'' ہے۔ اس میں تصرف امام کی رائے پر موقوف ہے۔ یہ مسلمانوں کی بھلائی کے لیے خرچ کیا جائے گا۔ جنگ میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کی طرح اسے فوجیوں میں تقسیم کرنا ضروری نہیں۔ ائمہ کی دلیل یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنونضیر سے حاصل ہونے والے ''مال فے'' کو مال غنیمت کی طرح برابر تقسیم نہیں کیا بلکہ مصلحت کا خیال رکھا ہے۔ قرآن مجید نے بھی رسول اللہ ﷺ کی تائید کی ہے۔[2]
* بنونضیر کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل سے یہ بات ثابت ہورہی ہے کہ کفار کا معاہدہ توڑ دینا دراصل اعلان جنگ ہے، لہٰذا معاہدہ توڑنے والے کفار سے بلاتوقف جنگ کی جاسکتی ہے۔

غزوۂ بدر (ثانی)

رسول اللہ ﷺ شعبان چار ہجری میں غزوۂ اُحد کے دوران میں ابوسفیان سے کیے گئے وعدے کے مطابق میدان بدر کی طرف نکلے، آپ کے ساتھ ایک ہزار پانچ سو صحابہ اور

[1] شرح النووي على صحيح مسلم: 50/12، وفقه السيرة النبوية للبوطي، ص:205,204، والأُم للشافعي: 324/7، وضوابط المصلحة في الشريعة الإسلامية للبوطي، ص: 171,170.
[2] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 205. بوطی نے اُن اراضی کے متعلق فقہاء کا اختلاف بیان کیا ہے جو جنگ کے ذریعے سے حاصل ہوئی ہوں۔

دس گھوڑے تھے۔ آپ بدر پہنچ گئے اور وہاں آٹھ دن مشرکین کا انتظار کرتے رہے۔ [1]

ادھر ابوسفیان بھی مشرکین کو لے کر نکلا لیکن جب مکہ مکرمہ سے چالیس کلو میٹر دور مرّالظھران کے مقام پر پہنچا تو وہاں مِجَنہ کے چشموں پر قیام پذیر ہوا اور یہ بہانہ بنا کر لشکر واپس لے گیا کہ یہ سال قحط والا ہے۔ بزدلی کے اس مظاہرے سے مسلمانوں کی ہیبت میں اضافہ ہوگیا جس میں اُحد کی شکست سے کچھ کمی آگئی تھی۔

غزوۂ ذات الرقاع

اہلِ سیرت و مغازی کے درمیان اس غزوے (49) کی تاریخ کے بارے میں اختلاف

(49) غزوۂ ذات الرقاع: اس غزوے کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے۔ راجح وہی ہے جو ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے الصحیح میں بیان کیا کہ جب صحابۂ کرام کے موزوں میں جا بجا سوراخ ہو گئے تو انھوں نے اپنے پیروں پر چیتھڑے باندھ لیے۔ وجہ یہ تھی کہ ہر چھ افراد کے لیے ایک اونٹ تھا جس پر وہ باری باری سوار ہوتے تھے (چیتھڑوں کو عربی میں رِقَاع کہتے ہیں، چنانچہ اس غزوے کا نام ذَاتُ الرِّقَاع ''چیتھڑوں والا'' پڑ گیا۔) دیکھیے: (صحیح البخاري، المغازي، باب غزوة ذات الرقاع، حدیث: 4128) اس حدیث میں ہے کہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اس معاملے میں کوئی بات کرنا پسند نہیں کیا کیونکہ یہ عبادت کا معاملہ تھا جسے وہ افشا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید رکھی تھی۔ اس بات سے جہاد کے اس مفہوم پر روشنی پڑتی ہے جو ہمارے سلف صالحین نے سمجھا تھا۔ نووی نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے اس کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''مسلمان کے لیے پسندیدہ یہی ہے کہ وہ اپنے نیک اعمال چھپائے اور اُن مصائب کو بھی پوشیدہ رکھے جو اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے راستے میں جھیلے۔ اُسے چاہیے کہ ایسے کسی عمل کا اظہار نہ کرے، سوائے اس کے کہ کوئی مصلحت اُس کے پیشِ نظر ہو، جیسے اُس عمل کا حکم بیان کرنا اور اس کی پیروی کرنے کی ترغیب دلانا وغیرہ۔ سلف صالحین نے اپنے بعض اعمال کے متعلق جو روایات بیان کی ہیں اُن کا سبب یہی تھا۔'' دیکھیے: (شرح النووي علی صحیح مسلم: 198,197/12)

[1] یہ ابن اسحاق کی معلّق روایت ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 292/3) واقدی اور ابن سعد نے بھی اسے بطورِ معلّق روایت کیا ہے۔ ان دونوں کا بیان ہے کہ یہ غزوہ ہجرت کے 45 ویں »

ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا میلان اس طرف ہے کہ یہ غزوہ، غزوۂ خیبر کے بعد پیش آیا۔[1] ابن اسحاق کے نزدیک یہ غزوہ، غزوۂ بنونضیر کے بعد ہوا۔ بعض کے مطابق غزوۂ خندق کے بعد چار ہجری میں ہوا۔[2] واقدی اور ابن سعد کا خیال ہے کہ یہ غزوہ محرم پانچ ہجری میں ہوا۔[3] ابومعشر نے اسے یقین کے ساتھ غزوۂ خندق اور غزوۂ بنوقریظہ کے بعد بتلایا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے نزدیک راجح وہی ہے جسے امام بخاری اور ابومعشر نے اختیار کیا ہے کیونکہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اس غزوے میں شریک ہوئے ہیں۔ وہ خیبر کی فتح کے فوراً بعد حبشہ سے آئے تھے۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی اس غزوے میں شریک ہوئے۔ وہ بھی فتح خیبر کے وقت مسلمان ہوئے تھے۔ اس غزوے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلاۃِ خوف ادا کی جبکہ غزوۂ خندق کے وقت صلاۃِ خوف کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ اس کی مشروعیت حدیبیہ کے سفر میں عسفان کے مقام پر ہوئی اور حدیبیہ کا واقعہ چھ ہجری کا ہے۔[4]

دکتور بوطی نے تو یقین سے کہا ہے کہ یہ غزوۂ خندق سے پہلے ہوا۔[5] ان کی دلیل وہ حدیث ہے جو صحیح بخاری میں آئی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے غزوۂ خندق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر جانے کی اجازت طلب کی اور گھر جا کر اپنی بیوی کو بتایا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر بھوک کے آثار نظر آرہے ہیں، پھر انھوں نے کھانا تیار کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے کی دعوت دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سارے لشکر سمیت جابر کے گھر پہنچ گئے، پھر معجزہ ظہور پذیر ہوا اور کھانے میں بے پناہ برکت ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

»» ماہ ذیقعد میں پیش آیا، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 384/1، والطبقات الكبرٰى: 59/2) ابن اسحاق، ابن سعد اور واقدی کی معلق روایات میں سے جو بغیر سند کے ہوتی ہیں، ابن اسحاق کی روایت کو فوقیت دی جائے گی۔ [1] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة ذات الرقاع، قبل الحديث: 4125. یہ معلق روایت ہے۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 285/3. یہ معلق روایت ہے۔ [3] المغازي للواقدي: 395/2، والطبقات الكبرٰى: 61/2. [4] فتح الباري: 304/15، 305 و311. [5] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 210.

جابر کی بیوی سے فرمایا:

«كُلِي هٰذَا وَأَهْدِي فَإِنَّ النَّاسَ أَصَابَتْهُمْ مَّجَاعَةٌ»

''تم بھی کھاؤ اور ادھر ادھر بھی بھیجو کیونکہ لوگ سخت بھوک کا شکار ہیں۔''

نیز وہ روایت جو صحیحین میں آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ ذات الرّقاع میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''تم نے شادی کرلی ہے؟'' انھوں نے کہا: ''جی ہاں۔'' اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع تک آپ کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی شادی کا علم نہیں تھا۔ بنابریں یہ جنگِ خندق سے قبل کی بات ہے کیونکہ غزوۂ خندق میں تو آپ ﷺ نے ان کے گھر کھانا کھایا تھا۔

پھر دکتور بوطی نے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے ان دلائل کا کہ یہ غزوہ، غزوۂ خیبر سے بھی بعد کا ہے، جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے لکھا: ''حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ استدلال کہ آپ ﷺ نے غزوۂ خندق میں صلاۃ خوف نہیں پڑھی بلکہ قضا کرکے نماز پڑھی۔ اگر صلاۃ خوف شروع ہوچکی ہوتی تو آپ قضا نہ کرتے۔'' اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ نماز قضا کرنے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس وقت دونوں لشکروں کے درمیان پتھر اور تیر چل رہے تھے اور نماز کے لیے جانے کی گنجائش ہی نہیں تھی، یا ممکن ہے دشمن قبلے کی جانب ہو یا یہ بتلانا مقصود تھا کہ فوت شدہ نماز کی قضا کیسے دی جائے گی۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی شرکت کا جواب یہ دیا ہے جو کئی اہلِ سیرت و مغازی نے بھی بیان کیا ہے کہ اس سے کوئی اور غزوہ مراد ہوگا۔ اسے بھی غزوۂ ذات الرقاع ہی کہتے ہوں گے۔ دلیل یہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ہم ایک جنگ میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ نکلے۔ ہم چھ آدمی تھے۔ ایک اونٹ پر باری باری سوار ہوتے تھے۔ یہاں ہم جس غزوۂ ذات الرقاع کی بات کررہے ہیں اس میں تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔

دکتور حافظ حکمی اور دکتور اکرم عمری اسی بات کو ترجیح دیتے ہیں جو امام بخاری اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بیان کی ہے۔[1] ہمارا میلان اس کے بارے میں دکتور بوطی کی طرف ہے کیونکہ جابر رضی اللہ عنہ کی شادی والی دلیل کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ وہ صحیحین کی روایت ہے۔ امام بخاری نے بھی اپنی رائے معلّق صورت میں بیان کی ہے۔ ان کی دلیل صرف یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ غزوۂ خیبر کے بعد آئے ہیں۔ اس کا جواب بوطی نے یہ دیا ہے کہ غزوۂ ذات الرّقاع ایک سے زائد ہو سکتے ہیں۔

اس غزوے میں مسلمانوں اور غطفان کے درمیان کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ صرف ایک دوسرے کو ڈراتے رہے۔ اس میں مسلمانوں نے صلاۃ خوف پڑھی۔ طریقہ یہ تھا کہ لشکر کا ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے لگتا اور دوسرا دشمن کے مقابلے میں ڈٹا رہتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ والوں کو ایک رکعت پڑھا دیتے اور کھڑے رہتے۔ اس دوران میں مقتدی دوسری رکعت خود پڑھ لیتے، پھر وہ جا کر دشمن کے مقابل کھڑے ہوجاتے اور دوسرا گروہ آکر آپ کے پیچھے کھڑا ہوجاتا۔ آپ ان کو باقی ماندہ ایک رکعت پڑھا دیتے اور بیٹھے رہتے۔ اس دوران میں انھوں نے ایک رکعت خود پڑھ لی ہوتی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیر دیتے۔[2] ایک روایت میں یہ طریقہ یوں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھاتے۔ وہ اٹھ کر چلے جاتے اور دوسرا گروہ آتا تو اسے بھی دو رکعتیں پڑھا دیتے۔ یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار رکعات ہوجاتیں اور مقتدیوں کی

[1] مرويّات الحُدَيبية للحكمي، ص : 73-86، و المجتمع المدني، الجهاد، ص : 130.

[2] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة ذات الرقاع، حديث: 4136,4135، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين وقصرها، باب صلاة الخوف، حديث : 843. نیز دیکھیے: (الفتح الرّباني : 22-20/7) ابن اسحاق نے بھی اسے ایک متصل سند سے روایت کیا ہے لیکن اس میں عمرو بن عبید قدری ہے جس کے بارے میں ابن کثیر کا کہنا ہے: ''اس کی بدعت کی وجہ سے اس سے روایت کرنا درست نہیں۔'' دیکھیے: (البداية والنهاية : 4/95)

دو۔[1] دکتور بوطی کہتے ہیں: ”دونوں احادیث میں تطبیق یوں ہے کہ آپ نے صلاۃ خوف کئی بار پڑھائی ہے۔ کبھی ایک طریقے سے، کبھی دوسرے طریقے سے۔ یہ نماز اس نخلستان میں پڑھی گئی جو مدینہ منورہ سے دو دن کے فاصلے پر ہے۔“[2]

اس غزوے میں کچھ اہم واقعات رونما ہوئے جن سے کئی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں، مثلاً:

اعرابی کا واقعہ

بخاری، مسلم اور دیگر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ واپسی کے وقت ایک وادی میں دوپہر کا وقت ہوگیا۔ اس وادی میں کانٹے دار درخت بہت تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر روک دیا۔ لوگ سائے کی تلاش میں مختلف درختوں تلے بکھر گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک الگ درخت کے سائے میں ٹھہرے۔ آپ نے اپنی تلوار درخت کے ساتھ لٹکا دی۔ ہمیں سوئے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پکارا۔ ہم اٹھ کر آپ کی طرف بھاگے تو ہم نے دیکھا کہ آپ کے پاس ایک اعرابی بیٹھا ہے۔ آپ نے فرمایا: ”اس اعرابی نے آکر میری تلوار میان سے نکال لی جبکہ میں سویا ہوا تھا۔ مجھے جاگ آئی تو یہ تلوار سونتے کھڑا تھا۔ کہنے لگا: تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟ میں نے کہا: ”اللہ!“ اب یہ یہاں بیٹھا ہے۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی سزا نہیں دی۔ اس اعرابی کا نام غورث بن حارث تھا۔[3]

حضرت قتادہ اور ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس اعرابی کے بارے میں نازل ہوا:[4]

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة ذات الرقاع، حديث: 4127. [2] صحيح مسلم، صلاة المسافرين وقصرها، باب صلاة الخوف، حديث: 843. [3] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 207، حاشية، وفتح الباري: 301/15. [4] تفسير الطبري: 106/10. اس کی سند صحیح ہے۔ اس آیت کی تفسیر اور اس کی شانِ نزول کے بارے میں اسی باب میں دیگر روایات بھی ہیں۔ طبری کے خیال میں »

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱذْكُرُوا نِعْمَتَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَن يَبْسُطُوٓا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ ﴾

''اے ایمان والو! اللہ کا احسان یاد کرو جو تم پر ہے۔ جب کچھ لوگوں نے چاہا کہ وہ اپنے ہاتھ تمھاری طرف بڑھائیں تو اُس (اللہ) نے اُن کے ہاتھ تم سے روک دیے۔''[1]

مسدّد کے واسطے سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ اس اعرابی غورث نے آپ سے عہد کیا تھا کہ نہ میں آپ سے لڑائی کروں گا، نہ ان لوگوں کے ساتھ ملوں گا جو آپ سے لڑیں گے۔ آپ نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اپنی قوم کے پاس جا کر کہنے لگا: ''میں سب لوگوں سے بہترین شخص کے پاس سے آیا ہوں۔''[2]

مفید باتیں

یہ واقعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی بڑی روشن دلیل ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حد درجہ بہادر، اللہ تعالیٰ کی ذات پر پختہ یقین رکھنے والے، تکالیف پر صبر جمیل کرنے والے اور نادان لوگوں کے ساتھ انتہائی شفیق و بردبار تھے۔

پہرے کا واقعہ

غزوۂ ذات الرّقاع سے واپسی پر مسلمانوں نے ایک مشرک عورت کو قیدی بنالیا۔ اس کے خاوند نے نذر مان لی کہ وہ محمد کے ساتھیوں میں خون بہائے بغیر واپس نہ جائے گا۔ وہ

» زیادہ قرین صواب یہ ہے کہ یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی جب بنونضیر کے یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہا، دیکھیے :(تفسیر الطبري : 108,107/10، وزاد المسیر: 308/2، والسیرة النبویة لابن هشام: 288,287/3) سند متصل ہے لیکن اس میں عمرو بن عبید قدری ہے۔ [1] المآئدة 11:5 .

[2] فتح الباري: 317/15.

رات کے وقت آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے نیند کے وقت عباد بن بشر اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کو پہرے پر مقرر فرما دیا تھا۔ اس مشرک نے حضرت عباد رضی اللہ عنہ کو تیر مارا۔ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے تیر کھینچ دیا اور نماز پڑھتے رہے حتی کہ اس مشرک نے انھیں تین تیر مارے لیکن انھوں نے نماز نہ چھوڑی، جب سلام پھیرا تو اپنے ساتھی کو جگایا۔ وہ کہنے لگا: ''سبحان اللہ! تم نے مجھے پہلے کیوں نہ جگا دیا؟'' انھوں نے جواب دیا: ''میں نے نماز میں ایک سورت شروع کر رکھی تھی۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ درمیان میں چھوڑ دوں۔ جب اس نے تیر چلانے بند نہ کیے تو میں نے رکوع کر کے نماز مکمل کی اور تمھیں جگا دیا۔ اللہ کی قسم! اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کے مقرر کردہ پہرے میں کوتاہی ہو جائے گی تو میں کبھی درمیان میں سورت نہ چھوڑتا، چاہے اس میں میری جان ہی چلی جاتی۔''[1]

نصیحت

ان دو جلیل القدر صحابیوں کے اس واقعے سے جہاد اسلامی کی حقیقت واضح ہوتی ہے جسے صحابۂ کرام خوب سمجھتے تھے اور اُس پر عمل بھی کرتے تھے۔ حضرت عباد رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ کیوں نہ اپنے پہرے کے وقت کا کچھ حصہ نماز میں صرف کروں اور پھر نماز بھی اللہ تعالیٰ کے حضور نہایت خشوع وخضوع میں ڈوبی ہوئی کہ تیروں کی زبردست تکلیف کے باوجود نماز کو مختصر کرنا گوارا نہ کیا اور پھر نماز مختصر بھی کی تو صرف اس ذمہ داری کے زیر اثر جو اللہ کے رسول ﷺ نے انھیں سونپی تھی۔ سلف صالحین کے نزدیک عبادت اور جہاد کا مفہوم اس

[1] یہ بخاری کی معلق روایت ہے۔ انھوں نے اسے جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے کمزور الفاظ (صیغۂ تمریض) میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''بتایا جاتا ہے ......'' دیکھیے: (صحیح البخاري، الوضوء، باب: (34)، من لم یر الوضوء إلا من المخرجین......) ابن اسحاق نے بھی اسے حسن سند سے راویت کیا ہے۔ ابن اسحاق کے علاوہ دیگر مورخین نے اسے اُنھی کی سند سے نقل کیا ہے، دیکھیے: (السیرۃ النبویۃ لابن هشام: 3/290-292)

طرح یکجا تھا۔[1]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے اونٹ کا واقعہ

بخاری، مسلم اور دیگر محدثین اور ابن اسحاق اور دیگر مؤرخین نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ غزوۂ ذات الرّقاع سے واپسی کے وقت راستے میں ان کا اونٹ سست ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہ اونٹ تھک گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی سواری سے اترے اور چھڑی سے اونٹ کو کچوکے دینے لگے، پھر فرمایا: ''اب سوار ہوجاؤ۔'' اب تو ان کا اونٹ رسول اللہ ﷺ کے اونٹ سے بھی آگے بڑھنے لگا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اسے روکتے جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ ان سے ان کے گھریلو حالات دریافت فرمانے لگے تو حضرت جابر نے بتایا کہ میں نے ایک شوہر دیدہ عورت سے شادی کی ہے۔ آپ نے فرمایا:

«أَفَلَا جَارِيَةً تُلَاعِبُهَا وَتُلَاعِبُكَ؟»

''تو نے نوعمر لڑکی سے شادی کیوں نہ کی تاکہ تم دونوں ایک دوسرے سے خوب دل لگی کرتے؟''

انھوں نے عرض کی: ''میری کئی بہنیں ہیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کسی تجربہ کار عورت سے شادی کروں جو ان کو سنبھال سکے اور ان کی کنگھی پٹی اور نگہداشت کرے۔'' آپ ﷺ نے ان کی اس رائے کی تعریف کی اور فرمایا کہ جب مدینہ پہنچو تو سمجھداری سے کام لینا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «أَتَبِيعُ جَمَلَكَ؟» ''اونٹ بیچو گے؟'' جابر مان گئے تو آپ نے وہ اونٹ ایک اوقیے میں خرید لیا۔ جب وہ اگلے دن اونٹ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ انھیں قیمت ادا کریں۔

[1] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 214,213.

بلال نے تول کر قیمت دی بلکہ کچھ زیادہ دی۔ جابر جانے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں واپس بلایا اور اونٹ لوٹا دیا۔

ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ جب حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے شوہر دیدہ عورت سے شادی کرنے کی معقول وجہ بیان کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم نے ٹھیک ہی کیا ہے۔''

اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَمَا إِنَّا لَوْ قَدْ جِئْنَا صِرَارًا أَمَرْنَا بِجَزُورٍ فَنُحِرَتْ، وَأَقَمْنَا عَلَيْهَا يَوْمَنَا ذَاكَ، وَسَمِعَتْ بِنَا فَنَفَضَتْ نَمَارِقَهَا»

''ہم مقامِ صرار (50) پہنچ کر ایک اونٹ ذبح کریں گے اور اس دن وہاں ٹھہریں گے، اور اسے (تمھاری بیوی کو) ہماری آمد کا پتہ چلے تو وہ تکیے جھاڑ کر رکھے گی۔''

جابر کہنے لگے: ''ہمارے ہاں تو کوئی تکیے نہیں۔'' آپ نے فرمایا:

«إِنَّهَا سَتَكُونُ ......» ''جلد ہی ہوں گے......''

اس روایت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ بھی ہیں: ''آپ ﷺ کے عطا کردہ درہم اللہ کی قسم! ہمارے لیے ہمیشہ موجب برکت بنے رہے۔ ہمارے گھر میں ان کی خصوصی حیثیت تھی۔'' [1]

(50) صرار: یہ مقام مدینہ منورہ سے عراقی راستے پر تین میل کے فاصلے پر ہے، دیکھیے: (معجم البلدان: 398/3)

[1] صحيح البخاري، البيوع، باب شراء الدّوابّ والحمير، حديث: 2097، وصحيح مسلم، الرضاع، باب استحباب نكاح ذات الدِّين، حديث: 1466، و السيرة النبوية لابن هشام: 3/288-290. اس کی سند حسن ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کی ہمدردی

اس واقعے میں رسول اللہ ﷺ کے کریمانہ اخلاق کی کتنی دلکش تصویر نظر آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ کس قدر شفقت اور رحمت کا سلوک فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کی بات چیت میں کس قدر پاکیزگی، کتنی بے تکلفی اور کیسی بے مثل خوش طبعی جلوہ فرما تھی۔ آپ صحابہ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ ان کے حالات سے باخبر رہتے اور ان کی مشکلات میں مالی اور روحانی مدد کیا کرتے تھے۔ آپ کو پتہ چل گیا کہ جابر کے پیچھے رہ جانے کا سبب ان کے اونٹ کی کمزوری ہے اور ان کے پاس تنگ دستی کی وجہ سے کوئی اور اونٹ بھی نہیں کیونکہ ان کے والد محترم جنگ اُحد میں شہید ہو گئے تھے اور اپنے بیٹے بیٹیاں ان کی نگرانی اور ذمہ داری میں چھوڑ گئے تھے۔ ان کے ہاں رزق بھی کشادہ نہ تھا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ضروری سمجھا کہ ان سے بر بنائے ہمدردی تعاون کریں جس سے انھیں برکت حاصل ہوتی رہے۔

غزوۂ دُومۃ الجندل

تمام مؤرخین اور سیرت نگار متفق ہیں کہ یہ غزوہ ہجرت کے 49 ویں مہینے ربیع الاول کی 25 تاریخ کو ہوا۔[2]

ابن اسحاق نے اس کا کوئی سبب نہیں لکھا، البتہ واقدی اور ابن سعد کا بیان ہے: ”اللہ کے رسول ﷺ کو اطلاع ملی کہ دومۃ الجندل کے علاقے میں کچھ مفسدین جمع ہو چکے ہیں

[1] ابن اسحاق اور ابن ہشام کی یہ معلق روایت ہے، دیکھیے: (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: 298,297/3، والمغازي للواقدي: 402/1، والطبقات الکبرٰی: 62/2) ابن سعد کی روایت بھی معلق ہے۔ تاریخ اور ماہ کی تحدید واقدی نے کی اور اُن کے شاگرد و کاتب ابن سعد نے بھی انھی کی پیروی کی ہے۔

[2] فقه السیرۃ النبویۃ للبوطي، ص: 213,212. مکمل روایت ابن ہشام کے ہاں ہے۔

جو وہاں سے گزرنے والے ہر تجارتی قافلے پر ظلم وستم کرتے ہیں۔ وہاں بہت بڑی تجارتی منڈی تھی۔ اس لیے بہت سے عرب ان سے آن ملے۔ ان کا ارادہ مدینہ پر حملہ آور ہونے کا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو اس طرف توجہ دلائی۔ ایک ہزار کا لشکر جمع ہوگیا جو آپ کی سرکردگی میں چل پڑا۔ ان کے ساتھ بنو عذرہ کا مذکور نامی ایک رہبر بھی تھا۔ دومۃ الجندل پہنچنے سے ایک دن پہلے آپ نے ان کے جانوروں اور چرواہوں پر حملہ کردیا۔ کچھ بھاگ گئے، کچھ دھر لیے گئے۔ دومۃ الجندل خبر پہنچی تو مفسدین رفو چکر ہوگئے۔ جب آپ وہاں پہنچے تو دور تک کوئی متنفس نہ تھا۔ آپ وہاں چند دن ٹھہرے۔ ادھر ادھر فوجی دستے بھیجے۔ ان میں سے کوئی شخص گرفتار نہ کیا جاسکا، البتہ اونٹ بڑی مقدار میں ملے۔ صرف حضرت محمد بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ والے دستے کو ایک آدمی ملا۔ انھوں نے اسے گرفتار کرلیا اور اسے اسلام کے محاسن بتائے تو وہ مسلمان ہوگیا۔''[1]

پھر رسول اللہ ﷺ واپس مدینہ تشریف لے آئے۔[2]

غزوۂ مریسیع (بنو مصطلق)

علمائے نسب متفق ہیں کہ بنو مصطلق قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ ہے اور ان میں سے اکثر کا خیال ہے کہ خزاعہ یمنی قحطانی ہیں۔[3] نسبی لحاظ سے یہ لوگ عمرو بن عامر میں اوس وخزرج سے جا ملتے ہیں۔ یہ عمرو بن عامر اوس اور خزرج کے دوسرے اور بنو مصطلق کے چوتھے دادا ہیں۔[4]

[1] واقدی نے اس غزوے کا ایک اور سبب یہ بھی لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ شامی سرحد کے قریب پہنچیں تاکہ قیصر مرعوب ہوجائے، دیکھیے: (المغازي للواقدي :403/1) [2] المغازي للواقدي :1/402-404، والطبقات الکبرٰی : 63,62/2. [3] نهاية الأرب للنويري: 422/2، وقلائد الجُمان للقلقشندي، ص: 93، والسيرة النبوية لابن هشام: 136/1. [4] الطبقات لخليفة بن خيّاط، ص: 76-107.

یہ لوگ مدینہ سے مکہ کے راستے پر خزاعہ کی پھیلی ہوئی بستیوں کے درمیانی علاقے میں مرّ الظّہر ان (51) اور ابواء (52) کے درمیان مقامِ قدید وعسفان [1] پر رہائش پذیر تھے۔ تجارتی قافلوں کے راستے پر مسلمانوں اور قریش کے درمیان ہونے والی جھڑپوں میں یہ جگہ خصوصی اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ ان جھڑپوں کے دوران میں ان لوگوں کا مسلمانوں کے ساتھ مصالحتی رویہ تھا جس کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں آچکا ہے۔

خزاعہ مشرک تھے اور عرب کا مشہور بت ''منات'' انھی کے علاقے میں مشلّل کے ٹیلے پر نصب تھا۔ عرب لوگ باقاعدہ اس بت کا حج کرتے تھے اور یہ لوگ مدینے کی نسبت مکہ کے زیادہ قریب تھے۔ ان کے قریش کے ساتھ پرانے معاہدے بھی تھے۔ ان کے اس مصالحتی رویے کا اہم سبب یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے دادا محترم عبدالمطّلب کے ساتھ ان کے پرانے تعلّقات اور معاہدے تھے۔ ان کی قریش کے ساتھ دشمنی جو قدیم زمانے میں ان کے مکہ سے اخراج پر ختم ہو گئی تھی ظہورِ اسلام سے پہلے پھر جاگ اٹھی تھی۔ [2]

یہ دشمنی قریش کے حلیفوں بنو بکر جن کا تعلق کنانہ سے تھا اور بنو خزاعہ میں مستقل جنگ کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ امن و امان کی اس خطرناک صورت حال نے خزاعہ کو عبدالمطّلب سے معاہدے پر مجبور کر دیا۔ [3]

روایت ہے کہ جب بنو خزاعہ چھ ہجری میں حدیبیہ کے مقام پر اس معاہدے کی دستاویز رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے کر آئے تو آپ نے اس کی تائید و تصدیق فرمائی۔ [4]

معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاقے میں ''منات'' کی موجودگی کی وجہ سے بنو خزاعہ میں

(51) مرالظهران: یہ مکہ مکرمہ کے شمال میں 46 کلومیٹر دور ایک مقام ہے۔
(52) الأبواء: یہ مقام مکہ مکرمہ سے 240 کلومیٹر شمال میں واقع ہے۔

[1] المناسك للحربي، ص:458-463. [2] السيرة النبوية لابن هشام:173/1، وفتح الباري: 20/14. [3] المغازي للواقدي: 782,781/2، وتاريخ اليعقوبي: 279,278/1. [4] المغازي للواقدي: 782,781/2، وتاريخ اليعقوبي: 279,278/1.

عام طور پر اور بنو مصطلق میں خصوصاً اسلام پھیلنے کی رفتار سست رہی۔ [1] مکہ میں بھی یہی صورت حال تھی۔

خزاعہ نے سب سے پہلے مسلمانوں کے خلاف کارروائی میں اس وقت حصہ لیا جب وہ احابیش (53) کے ساتھ مل گئے جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ اُحد میں قریش کی مدد کی۔ [2]

جب قریش کے ہاتھوں جنگ احد میں مسلمانوں کو نقصان پہنچا تو جس طرح دوسرے اعرابی قبائل مسلمانوں کے خلاف پر پُرزے نکالنے لگے اسی طرح بنو مصطلق بھی مسلمانوں کو آنکھیں دکھانے لگے تھے۔ ان کے سردار حارث بن ابی ضرار نے نہ صرف مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے اسلحہ اور جنگجو اکٹھے کرنے شروع کر دیے بلکہ قریبی قبائل کو بھی مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ کو ان کی مشکوک سرگرمیاں معلوم ہوئیں تو آپ نے حضرت بُریدہ بن حُصَیب اسلمی رضی اللہ عنہ کو تحقیق حال کے لیے بھیجا، حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ ان کے پاس گئے اور ظاہر کیا کہ میں تمھاری مدد کے لیے آیا ہوں۔ اس طرح انھیں ان کی نیت کے فتور کا پتہ چل گیا اور انھوں نے واپس آ کر رسول اللہ ﷺ کو مطلع کر دیا۔ [3] چنانچہ پیر کے دن 2 شعبان 5 ہجری [4]

(53) احابیش: اس سے مراد وہ قبائل ہیں جن کا تعلق بنیادی طور پر قریش سے نہیں تھا لیکن وہ قریش میں ضم ہو گئے۔ ان کا تعلق الهون بن خزيمة کے قبیلے القارة (عضل و دیش) سے تھا۔

[1] المجتمع المدني، الجهاد، ص:94. [2] المغازي للواقدي: 200/1. [3] الطبقات الكبرىٰ: 63/2. ابن سعد کی بعض اسانید میں واقدی کا ذکر ہے اور بعض میں نہیں۔ [4] یہ راجح ہے اور امام مغازی موسیٰ بن عقبہ کا قول بھی یہی ہے۔ امام بخاری نے موسیٰ بن عقبہ سے جو نقل کیا کہ یہ چار ہجری کی بات ہے تو یہ سبقت قلم ہے اور درست نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 318/15) واقدی، ابن سعد، ابو معشر سندھی بھی موسیٰ بن عقبہ کی تائید کرتے ہیں، البتہ ابن اسحاق نے اسے شعبان چھ ہجری کا واقعہ بتایا ہے لیکن صحیحین کی روایت اس کے خلاف ہے کہ حضرت سعد بن ◄◄

کو رسول اللہ ﷺ سات سو مجاہد [1] اور تیس گھوڑے [2] لے کر بنو مصطلق کی طرف روانہ ہوگئے۔ بنو مصطلق کو اس سے پہلے دعوت اسلام پہنچ چکی تھی۔ وہ قریش کے ساتھ غزوۂ اُحد میں بھی شامل تھے اور مسلمانوں کے خلاف لشکر اکٹھے کر رہے تھے۔ بخاری، مسلم کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے ان پر اچانک حملہ کردیا۔ [3] وہ بالکل غافل تھے۔ ان کے جانوروں کو کنویں پر پانی پلایا جا رہا تھا۔ آپ نے ان کے جنگجو افراد قتل کر دیے اور عورتیں بچے گرفتار کر لیے۔ حارث بن ابی ضرار کی بیٹی جویریہ جو ام المومنین بنیں، اسی جنگ میں گرفتار ہوئیں۔

ابن اسحاق کی ایک ضعیف روایت ہے کہ مریسیع کے چشمے یا کنویں پر لڑائی ہوئی، پھر بنو مصطلق بھاگ کھڑے ہوئے، آپ نے کچھ افراد قتل بھی کیے۔ ان کی عورتیں، بچے اور جانور قبضے میں لے لیے اور مجاہدین میں تقسیم کر دیے [4] لیکن صحیحین کی روایت ہی درست اور قابل حجت ہے۔

واقدی لکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے بنو مصطلق کے دس آدمی قتل کر دیے، باقی جو کنویں پر موجود تھے انھیں قید کر لیا۔ یہ دو سو گھر تھے۔ دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں غنیمت میں ملیں۔ [5] ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ایک سو خاندان قید ہوئے تھے، [6] یہی بات صحیح ہے۔

»» معاذ رضی اللہ عنہ اس غزوے میں شریک ہوئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ تو غزوۂ خندق کے فوراً بعد ہونے والے غزوۂ بنی قریظہ میں شہید ہوگئے تھے۔ غزوۂ خندق صحیح قول کے مطابق شوال پانچ ہجری میں ہوا۔

[1] تاريخ الإسلام (السيرة) للذهبي، المغازي، ص : 259. [2] المغازي للواقدي : 405/1.

[3] صحيح البخاري، العتق، باب من ملك من العرب رقيقاً......، حديث : 2541، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب جواز الإغارة على الكفار الذين بلغتهم دعوة الإسلام......، حديث : 1730. [4] السيرة النبوية لابن هشام : 402/3. سند مرسل ہے۔ [5] المغازي للواقدي : 410/1.

[6] السيرة النبوية لابن هشام : 409/3. سند حسن ہے۔

زرقانی نے بیان کیا ہے کہ وہ سات سو سے زیادہ افراد تھے۔[1] ان دونوں اقوال میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ ایک گھر میں ایک سے زائد افراد ہوتے ہیں۔[2]

مسلمانوں میں سے ایک صاحب جو بنو کلب بن عوف سے تعلق رکھتے تھے، انھیں ہشام بن صبابہ کہا جاتا تھا، وہ مقیس بن صُبابہ کے بھائی تھے۔ وہ اسی جنگ میں شہید ہوئے اور وہ بھی ایک انصاری کے ہاتھوں کیونکہ اس نے انھیں دشمن کا فرد سمجھا اور یوں میدانِ جنگ میں دورانِ جنگ غلطی سے قتل کر بیٹھے۔ انصاری کا تعلق حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے خاندان سے تھا۔ مقیس کو پتہ چلا تو وہ مسلمان بن کر مکہ سے آیا اور اپنے بھائی کی دیت کا مطالبہ کیا۔ اسے دیت دے دی گئی لیکن اس نے اسے کافی نہ سمجھا اور اپنے بھائی کے قاتل کو قتل کر ڈالا، پھر مرتد ہو کر مکہ بھاگ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اس کے خون کو حلال قرار دے دیا۔ حضرت نُمَیلَہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے جن کا تعلق اُس کی قوم سے تھا، اسے واصل جہنم کیا۔[3] اس جنگ میں بہت سے منافقین بھی شامل ہوئے۔ تاریخ نے اس جنگ میں ان کی دو شرارتیں تفصیل سے بیان کی ہیں۔ پہلی شرارت مہاجرین اور انصار کے درمیان تعصب اور فتنہ بھڑکانے کی کوشش اور دوسری سازش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت پر حملہ کرتے ہوئے آپ کو دلی تکلیف پہنچانے کی سازش جو تاریخ میں واقعۂ اِفک کے نام سے مشہور ہے، یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان طرازی۔

مہاجرین وانصار میں فتنہ انگیزی

حضرت زید بن ارقم اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم نے یہ ماجرا پوری تفصیل سے بیان کیا

[1] شرح المواهب اللدنية للزرقاني :117/2۔ زرقانی نے اس کی کوئی سند بیان نہیں کی، صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ میرے بعض اساتذہ نے کہا:...... دیکھیے: (المجتمع المدني، الجهاد، ص: 97) [2] أسد الغابة :400/5. [3] أسد الغابة :363/5، والإصابة :574/3 و603. ابن اسحاق نے بھی اسے معلق بیان کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام:406/3، والمغازي للواقدي :408,407/1)

ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ”میں ایک جنگی سفر میں تھا۔ میں نے عبداللہ بن اُبی کو یہ کہتے سنا: ”تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں بیٹھنے والوں کو کھانے پینے کی کوئی چیز نہ دیا کرو، جب یہ لوگ اٹھ جائیں اور آپ اکیلے رہ جائیں تب کوئی چیز پیش کیا کرو۔ اور اگر ہم مدینہ واپس پہنچ گئے تو معزز ذلیل کو اس سے نکال باہر کرے گا۔“ [1] میں نے اس کی یہ بات اپنے چچا محترم کو بتائی۔ [2] انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دی۔ آپ نے مجھے بلایا۔ میں نے پوری بات آپ کے گوش کردی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن اُبی کو بلا بھیجا۔ وہ اور اس کے ساتھی آئے اور صاف مکر گئے اور قسمیں اٹھا دیں کہ جناب! ہم نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سچا سمجھ کر میری تکذیب کردی۔ مجھے اس قدر رنج ہوا کہ اس واقعے سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں مایوس ہوکر گھر [3] بیٹھ گیا۔ چچا کہنے لگے: ”تجھے بیٹھے بٹھائے کیا ہوگیا تھا جو تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تکذیب بھی کرائی اور آپ کی ناراضی بھی مول لی؟ آخر اللہ تعالیٰ نے سورۂ منافقین نازل فرمائی:

﴿إِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُونَ......﴾ ”جب یہ منافق آپ کے پاس آتے ہیں......“ [4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا بھیجا اور فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ قَدْ صَدَّقَكَ يَا زَيْدُ» ”زید! اللہ تعالیٰ نے تیری تصدیق کردی ہے۔“ [5]

[1] دیگر روایات میں یہ صراحت سے بتایا گیا ہے کہ یہ غزوۂ بنی مصطلق کا سفر تھا، دیکھیے: (مسند أحمد: 374/4، وجامع الترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة المنافقين، حديث: 3312) امام ترمذی کا کہنا ہے: ”یہ حدیث حسن صحیح ہے۔“ [2] مراد حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ ان کے حقیقی چچا نہیں تھے۔ وہ خزرج کے سردار تھے۔ زید کے حقیقی چچا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ تھے، دیکھیے: (فتح الباري: 84/18) [3] گھر سے مراد خیمہ ہے کیونکہ یہ سفر کی بات ہے جیسا کہ ترمذی کی حدیث میں صراحت ہے، لہٰذا اس لفظ سے یہ سمجھنا درست نہیں کہ یہ سورت غزوہ سے واپسی کے بعد مدینہ میں اتری۔ [4] المنٰفقون 1:63. [5] صحيح البخاري، التفسير، سورة المنافقين، حديث: 4900، وصحيح مسلم، كتاب و باب صفات المنافقين وأحكامهم، حديث: 2772.

اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ''یہ وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے صحیح صحیح کان دیے ہیں۔'' [1]

ایک دوسری روایت میں ہے: ''لڑکے! تیرے کان نے پورا پورا کام کیا ہے۔'' [2]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں زیادہ تفصیل ہے۔ اس میں ابی بن کعب کی اس بات کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے: ''ہم ایک جنگی سفر میں تھے کہ مہاجرین میں سے کسی شخص نے ایک انصاری کے سُرین پر لات ماردی۔ [3] وہ انصاری پکارنے لگا: ''اوانصاریو! میری مدد کرو۔'' مہاجر نے بھی ہانک لگا دی: ''او مہاجرو! میری مدد کرو۔'' رسول اللہ ﷺ نے یہ آواز سنی تو فوراً فرمایا: «مَا بَالُ دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ؟» ''کیا وجہ ہے کہ (مسلمانوں میں) جاہلیت کی پکار سنائی دے رہی ہے؟'' لوگوں نے بتایا: اے اللہ کے رسول! ایک مہاجر نے ایک انصاری کے سرین پر لات ماری ہے۔ آپ نے فرمایا: «دَعُوهَا فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ» ''دفع کرو ایسے کاموں کو۔ یہ بہت گندے کام ہیں۔'' منافق عبداللہ بن ابی کو بھی اس قصے کا پتہ چل گیا۔ وہ کہنے لگا: ''اچھا! یہ (مہاجر) اس حد تک پہنچ گئے ہیں؟ اللہ کی قسم! ہم مدینہ جا کر ان ذلیلوں کو نکال دیں گے۔'' یہ بات نبیِ کریم ﷺ تک پہنچی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ ماجرا دیکھا تو یک لخت کھڑے ہو گئے اور بارگاہ رسالت میں عرض کی: ''اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجیے میں اس منافق کی گردن اتار دوں۔''

[1] صحيح البخاري، التفسير، سورة المنافقين، حديث: 4906. [2] فتح الباري: 286/18. یہ حسن بصری کی مرسل روایت ہے۔ [3] ابن اسحاق کی ایک روایت میں جس کی سند مرسل ہے، مہاجر کا نام جهجاه بن مسعود غفاري بتایا گیا ہے جو ابن خطاب رضی اللہ عنہ کے خدمت گار تھے۔ انصاری کا نام سِنَان بن وَبَر جُهني تھا جو بنی عوف بن خزرج کے حلیف تھے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 402/3) ابن حجر کے نزدیک ان کا نام جهجاه بن قيس ہے۔ دوسرا قول انھوں نے لکھا کہ ان کا نام جهجاه بن سعيد غفاري تھا، دیکھیے: (فتح الباري: 289/18)

نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا:

«دَعْهُ، لَا يَتَحَدَّثُ النَّاسُ أَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ»

''رہنے دو، لوگ کہیں گے: محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کراتا ہے۔''

جب مہاجرین مدینہ آئے تھے اس وقت انصار زیادہ تھے۔ بعد کو مہاجرین زیادہ ہو گئے۔ [1]

بعض دیگر قوی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن ابی نے یہ بات غزوۂ تبوک میں کہی تھی لیکن یہ غلط ہے۔ [2] صحیح یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی غزوۂ تبوک میں موجود ہی نہیں تھا۔ [3]

رسول اللہ ﷺ نے اس واقعے کو بھلانے کے لیے عملی تدبیر اختیار فرمائی اور فوراً کوچ کا حکم دے دیا، پھر باقی سارا دن اور ساری رات مسلسل چلتے رہے۔ جب اگلے دن سورج کی تپش بڑھ گئی تب پڑاؤ ڈالا۔ اتنے لمبے سفر اور اس قدر زبردست مشقت کی وجہ سے لوگ فرش پر پڑتے ہی سو گئے۔ آپ کا مقصد بھی یہی تھا کہ لوگوں کو چہ میگوئیوں کا موقع نہ

---

[1] صحيح البخاري، التفسير، سورة المنافقين، باب 5، حديث: 4905. مسلم کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' آدمی کو اپنے بھائی کی مدد کرنی چاہیے، وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے روک دیا جائے اور مظلوم ہو تو اس کی مدد کرے۔'' دیکھیے: (صحيح مسلم، البر والصلة، باب نصر الأخ ظالمًا أو مظلومًا، حديث: 2584) ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ عبداللہ بن ابی نے کہا تھا: ''اچھا! اب یہ اس حد تک اتر آئے ہیں کہ ہمارے شہر میں رہ کر ہمارے خلاف نفرت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ہم پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ کی قسم! ہم پر اور ان پر یہ مثل صادق آتی ہے: «سَمِّنْ كَلْبَكَ يَأْكُلْكَ» ''اپنے کتے کو خوب موٹا تازہ کر، وہ تجھے ہی کاٹے گا۔'' دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 403,402/3) [2] جامع الترمذي، تفسير القرآن، باب ومن سورة المنافقين، حديث: 3315. ترمذی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

[3] تفسير ابن كثير: 369/4، وفتح الباري: 290/18.

ملے مبادا کوئی نیا فتنہ کھڑا ہو جائے۔[1]

جب اس قضیے کا علم عبداللہ بن اُبیّ کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ہوا تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بولے: ''اے اللہ کے رسول! مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ میرے والد کو اُس کی باتوں کی وجہ سے، جو آپ کو پہنچی ہیں، قتل کرانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کا یہ پکا ارادہ ہے تو مجھے حکم دیجیے میں اپنے والد کا سر آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ اللہ کی قسم! خزرج کو علم ہے کہ ان میں سے کوئی شخص اپنے والد کا مجھ سے بڑھ کر فرماں بردار نہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ آپ کسی اور شخص کو حکم دیں اور وہ میرے باپ کو قتل کر دے تو مجھ سے جیتے جی اپنے باپ کا قاتل زندہ چلتا پھرتا برداشت نہ ہو سکے گا اور میں ایک کافر کے بدلے ایک مومن شخص کو قتل کر کے جہنم میں چلا جاؤں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«بَلْ نَتَرَفَّقُ بِهِ، وَنُحْسِنُ صُحْبَتَهُ، مَا بَقِيَ مَعَنَا»

''نہیں! بلکہ ہم اِس سے رواداری سے کام لیں گے اور جب تک وہ (زبانی کلامی طور پر بھی) ہمارے ساتھ ہے ہم اس سے اچھا سلوک کریں گے۔''[2]

[1] ابن اسحاق کی یہ روایت مرسل سند سے ہے جس کے راوی ثقہ ہیں، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 404/3) ابن ابی حاتم کے ہاں روایت کا ایک شاہد ہے جو عروہ اور عمر بن ثابت انصاری کی مرسل روایت ہے۔ ابن حجر کے مطابق یہ جید، مرسل ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 289/18) اس کی بنیاد صحیحین میں موجود زید بن ارقم اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم کی روایت پر ہے۔ یوں یہ حدیث حسن لغیرہ کے درجے پر ہے، دیکھیے: (مرويات غزوة بني المصطلق للدكتور قريبي، ص: 190) [2] ابن اسحاق کی یہ روایت منقطع سند سے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 406,405/3) ابن حجر کے مطابق اسے ابن مندہ نے بھی روایت کیا ہے، دیکھیے: (الإصابة: 372/2) ہیثمی کے نزدیک اسے طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔ ہیثمی کا کہنا ہے: ''اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں، البتہ عروہ بن زبیر کی ملاقات عبداللہ بن عبداللہ بن ابی سے نہیں ہوئی۔ یوں یہ روایت مرسل ہے۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 318/9) ہیثمی کے قول ◄◄

بعد ازاں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے والد کو مدینہ منورہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور صاف کہہ دیا کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داخلے کی اجازت نہ دیں آپ مدینہ آنے کی کوشش نہ کریں۔ [1]

اس کے بعد جب بھی عبداللہ بن ابی کوئی شرارت کرتا تو اس کے ہم قوم اسی کو ملامت کرتے، ڈانٹتے اور مجرم گردانتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

«كَيْفَ تَرٰى يَا عُمَرُ! أَمَا وَاللّٰهِ! لَوْ قَتَلْتَهُ يَوْمَ قُلْتَ، لَأَرْعَدَتْ لَهُ آنُفٌ، لَوْ أَمَرْتُهَا الْيَوْمَ بِقَتْلِهِ لَقَتَلَتْهُ»

''عمر! اب بولو! اگر تم اسی دن اسے قتل کر دیتے تو تمھارے اس اقدام پر بے شمار لوگ ناک بھوں چڑھاتے لیکن آج صورت حال یہ ہو چکی ہے کہ اگر میں اس کی قوم کو حکم دوں تو وہ خود اپنے ہاتھوں اسے قتل کر ڈالے گی۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''اللہ رب العزت کی قسم! مجھے کامل یقین ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے گرامی میرے خیال سے بہت افضل اور مبارک ہوتی ہے۔'' [2]

واقعۂ افک

منافقین کی پہلی کوشش کہ مسلمانوں میں جاہلی تعصب بھڑکایا جائے ناکام ہو گئی تو انھوں نے اس غزوے میں ایک اور انتہائی مذموم اور گھناؤنی کوشش کر کے فتنۂ افک برپا کر دیا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ اس غزوے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی

»» کے مطابق اسے بزار نے بھی روایت کیا ہے۔ اس روایت کے متعلق ہیثمی نے کہا: ''اس کے راوی ثقہ ہیں۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 318/9) [1] جامع الترمذي، تفسیر القرآن، باب ومن سورة المنافقين، حدیث: 3315. ترمذی نے کہا: ''یہ حدیث حسن صحیح ہے۔'' [2] ابن اسحاق کی یہ روایت منقطع سند سے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 406/3، والمغازي للواقدي: 418/1)

تھیں۔ [1] واپسی پر مدینہ منورہ کے قریب مسلمان آرام کے لیے ایک جگہ ٹھہرے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا حاجتِ ضروریہ کے لیے اپنے ہودج سے نکل کر دور ویرانے میں چلی گئیں۔ واپس آئیں تو پتہ چلا کہ گلے میں ہار موجود نہیں، چنانچہ سیدہ ہار ڈھونڈنے کے لیے واپس چلی گئیں۔ وہاں تلاش کرتے دیر ہوگئی۔ واپس آئیں تو پہلے سے بھی بڑا حادثہ منتظر تھا کہ لشکر کوچ کر چکا تھا اور وہاں کوئی متنفس موجود نہیں تھا۔ ہوا یوں کہ کوچ کا اعلان ہوا تو ہودج اٹھانے والوں نے ہودج اٹھالیا اور اونٹ پر رکھ دیا۔ ہودج بجائے خود وزنی تھا، اس لیے یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ ہودج خالی ہے۔ ویسے بھی اس عمر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا وزن بہت ہلکا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پریشانی کے عالم میں وہیں لیٹ کر انتظار کرنے لگیں۔ وہاں سے حضرت صفوان بن معطل سلمی رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا۔ انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو پہچان لیا کیونکہ پردہ فرض ہونے سے پہلے انھوں نے انھیں دیکھا ہوا تھا۔ انھوں نے اونٹ بٹھایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سوار ہوگئیں وہ مہار تھام کر چل دیے اور مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور لشکر پہلے مدینہ پہنچ چکے تھے۔

منافقین نے یہ موقع غنیمت جانا اور جھوٹا واقعہ بنا کر چسپاں کردیا۔ اس سازش کا اصل سرغنہ عبداللہ بن ابی تھا۔ منافقین کی چال سے چند مخلص صحابہ: مسطح بن اُثاثہ، حمنہ بنت جحش اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم بھی اس جال میں پھنس گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس افواہ سے بے حد صدمہ ہوا۔ آپ نے مسجد میں تمام حاضرین کے روبرو اپنی زوجہ محترمہ اور صفوان بن معطل پر پورے اعتماد کا اظہار فرمایا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے پیشکش کی کہ ہم اس بہتان طرازی میں حصہ لینے والوں کو اگر وہ اوس میں

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ ڈالا کرتے۔ جس زوجہ کے نام قرعہ نکل آتا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر پر نکلتیں۔ یہ بزار کی روایت ہے جس کی سند ہیثمی کے مطابق حسن ہے۔ سیوطی نے اُن کی موافقت کی ہے، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 230/9، والدّرّ المنثور للسیوطي: 27/5)

سے ہیں تو قتل کر دیتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت سعد بن عبادہ طیش میں آ گئے کیونکہ بہتان طرازی کا سلسلہ خزرجی منافقین سے چلا تھا۔ قریب تھا کہ دونوں قبیلوں میں فتنہ پھوٹ پڑے جیسا کہ منافقین کی خواہش تھی لیکن رسول اللہ ﷺ نے یہ معاملہ سنبھال لیا اور فتنے کی آگ بجھا دی۔ یوں منافقوں کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔

ادھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبیِ کریم ﷺ سے اجازت چاہی کہ میں اپنے والدین کے گھر جانا چاہتی ہوں کیونکہ سفر سے واپسی کے بعد سے وہ بیمار تھیں۔ انھیں اس بہتان اور افواہ کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ والدین کے گھر جا کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اصل صورت حال کا پتہ چلا تو ان کی نیند اڑ گئی اور گریہ طاری ہو گیا۔ وہ مسلسل روتی رہیں ان کو امید تھی کہ اللہ تعالیٰ نبیِ کریم ﷺ کو خواب کے ذریعے سے براءت کا یقین دلا دیں گے۔ اس کا تو انھیں گمان بھی نہ تھا کہ ان کے بارے میں قرآنی وحی نازل ہوگی جو قیامت تک پڑھی جائے گی اور ان کی طہارت اور عظمت و منزلت کی گواہی دیتی رہے گی:

﴿إِنَّ الَّذِينَ جَاءُو بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ ......﴾

''بے شک جو لوگ (ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر) بہتان گھڑ لائے وہ تمھی میں سے ایک گروہ ہیں......۔''[1]

بالآخر ایک ماہ کی پریشانی اور اضطراب کے بعد ان کی براءت اور لوگوں کے طرز عمل کے بارے میں سورۂ نور کی آیات نازل ہوئیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس ماجرے سے پہلے اپنے ماموں زاد مِسطح بن اُثاثہ کے اخراجات پورے کرتے تھے لیکن جب وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام تراشی میں ملوث پائے گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ آئندہ اسے ایک پیسہ بھی نہیں دیں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

[1] النور 11:24۔

﴿ وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ ﴾

''اور تم میں سے صاحب فضل مالدار لوگ یہ قسم نہ اٹھائیں کہ وہ رشتہ داروں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو ایک پیسہ بھی نہیں دیں گے۔ انھیں چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ بھی تمھیں معاف فرمائے؟''[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور بخشش کی طلب میں اس کا وظیفہ دوبارہ جاری کر دیا۔[2]

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو خوب ڈانٹا جو منافقین کے جال میں پھنس گئے تھے، یعنی حمنہ، مسطح اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم، چنانچہ فرمایا:

﴿ لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُبِينٌ ﴿١٢﴾ ﴾

''کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم نے یہ بات سنی تو مومن مرد اور عورتیں اپنے بارے میں اچھا گمان رکھتے اور کہہ دیتے کہ یہ تو واضح جھوٹ ہے۔''[3]

قرآن مجید نے مخلص مومنین کے شاندار موقف کو سراہا ہے ہوئے جنھوں نے خاندان نبوت کے مقدس و مطہر افراد کے سلسلے میں پختہ ایمانی کا رویہ اختیار کیا، جیسے ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور ام ایوب رضی اللہ عنہا وغیرہ، چنانچہ اللہ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَٰذَا سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ﴾

[1] النور 22:24. [2] صحيح البخاري، التفسير، سورة النور، باب: (6)، حديث: 4750، وصحيح مسلم، التوبة، باب في حديث الإفك وقبول توبة القاذف، حديث: 2770.
[3] النور 12:24.

''جب تم نے یہ بات سنی تھی تو کیوں نہ کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات کرنا زیب نہیں دیتا۔ (اے اللہ!) تو پاک ہے، یہ بہت بڑا بہتان ہے۔''[1]

واحدی نے متصل سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس آیت کی شان نزول روایت کی ہے: ''حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے تو ان کی زوجۂ محترمہ نے پوچھا: کیا آپ نے وہ بات نہیں سنی جو لوگ کر رہے ہیں؟'' حضرت ابوایوب نے پوچھا: ''کون سی بات؟'' بیوی نے تفصیل سے بتائی تو انھوں نے معاً فرمایا: ''ہمیں تو ایسی بات کرنی زیب نہیں دیتی، (اے اللہ!) تو پاک ہے، یہ بڑا بہتان ہے۔''[2] اللہ تعالیٰ نے ان کی تحسین و تعریف کرتے ہوئے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔

امام بخاری کی روایت ہے کہ ایک انصاری نے یہ بہتان سنا تو فوراً پکار اٹھا: ''سبحان اللہ! ہمیں تو ایسی بات منہ سے نکالنی بھی زیبا نہیں، یہ تو عظیم بہتان ہے۔''[3] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: ''ابن اسحاق کی روایت کے مطابق یہ انصاری حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ ہی تھے۔''[4] یہ روایت امام حاکم نے ابن اسحاق کی سند سے، طبرانی نے مسند شامیین میں اور ابوبکر آجُرّی نے عطاء خراسانی عن زہری عن عروہ عن عائشہ کی سند سے بیان کی ہے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ جس آیت کی طرف ابن اسحاق نے اشارہ کیا ہے، وہ ﴿هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ والی ہے نہ کہ ﴿هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ والی۔[5]

بہرصورت دونوں آیتوں کے مفہوم و معنی ایک ہی ہیں جبکہ دونوں آیات ایک وقت میں ایک ہی مناسبت سے نازل ہوئیں تو بعید نہیں کہ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کا موقف بھی اس آیت کے سبب نزول میں شامل ہو۔ واقدی نے بھی ابن اسحاق کی موافقت کی ہے۔

[1] النّور 24:16. [2] أسباب النزول للواحدي، ص:218، وزاد المسيرلابن الجوزي : 24/6. [3] صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب:(28)، حديث :7370. [4] فتح الباري : 110/28. [5] السيرة النبوية لابن هشام :419,418/3.

انھوں نے ضعیف کا اشارہ کرتے ہوئے یہ قول بھی بیان کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ام طفیل رضی اللہ عنہا اور ان کے خاوند حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ [1]

سُدّی کی تفسیر میں سعید بن جبیر کی مرسل روایت ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں یہ لغو اور بیہودہ بات سنی تو انھوں نے بھی یہی فرمایا تھا: ﴿سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ﴾ [2] مختصر یہ کہ واحدی کی روایت کو آجُرّی، ابن اسحاق اور واقدی کی روایات سے قوت حاصل ہوجاتی ہے اور وہ کم از کم حسن لغیرہ بن جاتی ہے۔ [3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان، مسطح اور حمنہ رضی اللہ عنہم پر حدِ قذف نافذ کی۔ [4] منافق عبداللہ بن اُبیّ جو اس بہتان کا سرغنہ تھا اس پر حد نہ لگ سکی کیونکہ اس نے بڑی چالاکی سے یہ کام انجام دیا تھا۔ اس نے خود صریح بہتان باندھنے کے بجائے سادہ لوگوں کو آگے کر دیا اور خود پوچھ تاچھ کر کھود کرید کیا کرتا تھا، پھر کسی نہ کسی کے حوالے سے بات پھیلاتا تھا کہ فلاں فلاں نے ایسا کہا ہے۔ اس طرح وہ آگ بجھنے نہیں دیتا تھا۔ [5]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس فتنے سے فارغ ہوئے تو حارث بن ابی ضرار کی بیٹی جویریہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنا مقام و مرتبہ بیان کیا کہ میں سب سے بڑے سردار کی بیٹی ہوں، لہٰذا مجھ سے تعاون کیا جائے تاکہ میں اپنی قیمت ادا کر کے آزاد ہوسکوں۔ وہ حضرت ثابت بن قیس بن الشماس رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں پیشکش کی کہ میں تمھاری پوری قیمت ادا کر کے تم سے شادی کر لیتا ہوں، حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے بخوشی رضامندی ظاہر کردی۔

---

[1] المغازي للواقدي: 2/ 435,434. [2] فتح الباري: 28/ 110. [3] مرويات غزوة بني المصطلق للقريبي، ص: 276. [4] اسے بزار نے روایت کیا جس کی سند ہیثمی کے مطابق حسن ہے۔ بیہقی نے بھی اسے حسن سند کے ساتھ نقل کیا ہے، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 9/230، و السنن الكبرٰى للبيهقي: 8/250) [5] صحيح مسلم، التوبة، باب في حديث الإفك وقبول توبة القاذف، حديث: 2770.

لوگوں کو پتہ چلا تو انھوں نے بنو مصطلق کے تمام قیدی جوان کے پاس تھے، آزاد کردیے۔ یہ ایک سو گھر تھے۔ مقصد یہ تھا کہ اب یہ قبیلہ رسول اللہ ﷺ کا سسرال بن گیا ہے، لہٰذا تقاضائے ادب یہ ہے کہ ان کے سب قیدی آزاد کردیے جائیں۔ اس طرح کوئی عورت حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر اپنی قوم کے لیے بابرکت ثابت نہیں ہوئی۔ [1]

ام المومنین جویریہ رضی اللہ عنہا کی آزادی ہی اُن کا حق مہر بنی۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے والد حارث مدینہ آئے اور رسول اللہ ﷺ سے انھیں چھوڑ دینے کی درخواست کی۔ آپ نے اسے اختیار دیا کہ جانا چاہے تو چلی جائے لیکن حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ [2] بالآخر حارث بھی اپنی قوم سمیت مسلمان ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں ان کی قوم کے صدقات جمع کرنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ [3]

احکام و مسائل

* سلب اور خمس نکالنے کے بعد مال غنیمت مجاہدین میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔
* ابن اُبَیّ کی پیدا کردہ مشکل کو رسول اللہ ﷺ نے جس حسن تدبر سے حل کیا وہ آپ کی فقید المثال اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ مشکل معاملات کی تدبیر اور دشمنوں کی طرف سے مومنین کی صفوں میں دسیسہ کاری ختم

[1] یہ ساری روایت ابن اسحاق کے ہاں حسن سند سے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 409,408/3) [2] التاريخ لابن خياط، ص: 80. اس کی مرسل سند کے راوی ثقہ ہیں۔ [3] مسند أحمد: 279/4. ان کی سند میں ایک راوی دینار کوفی ہے جو مقبول درجے کا ہے۔ اس کی روایت شواہد و متابعات (تائیدی روایات) کی بدولت قوی ہو جاتی ہے۔ قتادہ کی ایک مرسل روایت اِس کا شاہد ہے جو بسند حسن ہے۔ اسے طبری نے روایت کیا ہے، دیکھیے: (تفسير الطبري: 476/26) اس کے شواہد کی بنا پر الموسوعة الحديثية کے محققین نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ وہاں تفصیل دیکھی جاسکتی ہے، دیکھیے: (الموسوعة الحديثية: 405-403/30، حديث: 18459)

کرنے کی تدبیر سے بخوبی واقف تھے۔ آپ کے تدبر کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود ابن اُبی کی قوم کے لوگ اس سے بیزار ہو گئے بلکہ وہ اسے لعنت ملامت کرنے لگ گئے جس سے اس کی دسیسہ کاری ناکام ہو گئی۔

* واقعۂ افک ایذا رسانی اور آزمائشوں کے اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جو رسول اللہ ﷺ کو دین کے دشمنوں کی طرف سے برداشت کرنا پڑیں۔ اللہ تعالیٰ کا نبیِ کریم ﷺ اور مومنین پر بہت بڑا احسان تھا کہ اُس نے خود اس جھوٹ اور جعل سازی کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ تاریخ نے صاحب ایمان لوگوں کے طرز عمل کو بھی محفوظ رکھا ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ مسلمانوں کی زندگی میں جب بھی اس قسم کا موقع پیش آئے تو انھیں یہی طرز عمل اختیار کرنا چاہیے کیونکہ وحی ختم ہو چکی لیکن اسباق تا ابد باقی ہیں۔

* واقعۂ افک میں اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی حکمت پوشیدہ تھی جس سے رسول اللہ ﷺ کی عزت مآب شخصیت پر سے ہر قسم کے شکوک و شبہات ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر وحی صرف آپ کی دفاعی یا نفسیاتی امر کا نام ہوتا تو رسول اللہ ﷺ پورا ایک مہینہ زبردست پریشانی میں نہ گزارتے۔ اس واقعے کے ساتھ لوگوں کے سامنے آپ کی انسانی اور نبوی حیثیت واضح ہو گئی۔ جب وحی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں اڑایا جانے والا طوفانِ بدتمیزی ختم کر دیا تو ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے تعلقات پوری آب و تاب کے ساتھ بحال ہو گئے اور تمام مومنین سخت ذہنی کوفت کے بعد اس نتیجے سے بے حد خوش ہوئے۔ اس سے وحی کی حقیقت عیاں ہو گئی۔ اگر یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو لازماً آپ ﷺ کے دل میں کچھ نہ کچھ شکوک و شبہات بعد میں بھی قائم رہتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کی سابقہ محبت و مودت میں یقیناً فرق آجاتا۔ اس طرح یہ آزمائش آپ کی نبوت کی زبردست دلیل بن گئی۔

* اس واقعے کی وجہ سے حدّ قذف شروع اور جاری ہوگئی جو نافذ کی گئی۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ پاکدامن مومن مرد وعورت پر جھوٹا الزام لگانا نہ صرف حرام بلکہ کبیرہ گناہ ہے جس کی حد اسّی کوڑے ہے۔
* اس واقعے سے قرعہ اندازی کی مشروعیت بھی ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس سے متعلقہ افراد کے دل مطمئن ہوجاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سفر کے موقع پر اپنی بیویوں میں سے کسی اہلیہ کو ہمراہ لے جانے کے سلسلے میں قرعہ اندازی کرتے تھے۔ اس کے بجائے اگر اختیار استعمال کیا جاتا تو ممکن ہے طرح طرح کے اعتراضات پیدا ہوتے اور بے لطفی کا سامنا کرنا پڑتا۔
* اگر حالات اجازت دیں اور کوئی خطرہ نہ ہوتو مجاہد جہاد کو جاتے وقت اپنی بیوی ساتھ لے جاسکتا ہے۔
* سورۂ نور کی سولہ آیات جن کی ابتدا ﴿إِنَّ الَّذِينَ جَآءُو بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ﴾ سے ہوتی ہے اور انتہا ﴿لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾ پر ہوتی ہے اور جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان کی تردید کی گئی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں اور کسی گناہ پر واقعۂ افک جیسے سخت الفاظ استعمال نہیں کیے گئے۔ [1]

[1] فتح الباري: 86/18.

باب

10

غزوۂ احزاب و بنو قریظہ

- غزوۂ خندق
- خندق کی کھدائی کے دوران رونما ہونے والے معجزات
- غزوۂ بنو قریظہ
- قیدیوں کا انجام

ABU UMAIMAH OWAIS

﴿إِذْ جَآءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ○ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ○﴾

''جب وہ تمھارے اوپر اور تمھارے نیچے سے تم پر چڑھ آئے تھے۔ اور جب آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے، تب ایمان والے آزمائے گئے اور شدت سے ہلا دیے گئے۔''

[الأحزاب 33:10,11]

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا
عَلَى الْإِسْلَامِ مَا بَقِينَا أَبَدًا

''ہم وہ لوگ ہیں جنھوں نے محمد ﷺ کے دست حق پرست پر ہمیشہ کے لیے اسلام کی بیعت کی ہے جب تک کہ ہمارے جسم میں جان ہے۔''

اَللّٰهُمَّ! إِنَّهُ لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُ الْآخِرَةْ
فَبَارِكْ فِي الْأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةْ

''مولائے برحق! آخرت کی خیر کے علاوہ کوئی خیر نہیں، لہٰذا انصار و مہاجرین میں برکت و اضافہ فرما۔''

[صحيح البخاري، حديث: 4100]

غزوۂ خندق

یہ غزوہ شوال 5 ہجری میں پیش آیا۔ ابن اسحاق اور ان کی موافقت کرنے والے جمہور مؤرخین و محدثین اسی کے قائل ہیں۔ [1] واقدی کے مطابق یہ غزوہ بروز منگل 8 ذوالقعدہ 5 ہجری کو واقع ہوا۔ [2] ابن سعد کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی دعا قبول فرمائی اور بدھ کے دن ذوالقعدہ 5 ہجری کو باطل لشکروں کو شکست دی۔ [3] امام زہری، امام مالک بن انس اور امام موسیٰ بن عقبہ سے منقول ہے کہ غزوۂ خندق 4 ہجری میں پیش آیا۔ [4]

اہل علم کا خیال ہے کہ جو لوگ اس غزوے کو 4ھ کا غزوہ سمجھتے ہیں وہ تاریخ کا آغاز اس محرم سے کرتے ہیں جو ہجرت کے بعد آیا اور پہلے مہینوں کو کسی گنتی میں نہیں لاتے، اس لحاظ سے ان کے نزدیک غزوۂ بدر 1ھ میں، غزوۂ اُحد 2ھ میں اور غزوۂ خندق 4ھ میں ہوا۔ مگر یہ موقف جمہور اہل علم کے خلاف ہے جو تاریخ ہجرت والے سال کے محرم سے

[1] السيرة النبوية لابن هشام : 298/3. روایت بلاسند ہے۔ والبداية والنّهاية : 106,105/4.
[2] المغازي للواقدي :440/2. روایت بلاسند ہے۔ [3] الطبقات الكبرٰى :65/2-73. سند متصل ہے۔ اس سند میں کثیر بن زید ہے جو صدوق (نہایت سچا) تو ہے لیکن غلطی کرتا ہے۔ یوں یہ سند ضعیف ہے۔ بعض علماء ضعیف حدیث کو قبول کر لیتے ہیں، یعنی ان امور میں، جو احکام اور عقائد کے متعلق نہیں، معمولی ضعیف حدیث کو قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ [4] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الخندق، قبل الحديث: 4097. امام بخاری نے موسیٰ بن عقبہ کا قول معلق روایت کے «

شروع کرتے ہیں۔ [1] ابن حزم کے نزدیک یہ غزوہ 4ھ ہی میں ہوا۔ [2] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے غزوۂ اُحد سے واپس بھیج دیا تھا۔ میں اس وقت چودہ سال کا تھا [3] اور غزوۂ خندق میں اجازت دے دی۔ اس وقت میں پندرہ سال کا تھا اور یہ قطعی ہے کہ غزوۂ اُحد 3ھ میں ہوا۔ لیکن امام بیہقی اور حافظ ابن حجر نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما احد کے دن چودھویں سال کے آغاز میں تھے اور خندق والے دن پورے پندرہ سال کے ہو چکے تھے۔ یہ تفسیر جمہور اہل علم کے قول کے مطابق ہے۔ [4]

غزوۂ خندق کا سبب

فتح مکہ 8 ہجری سے قبل مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان جنگ ختم نہیں ہوئی تھی، اس لیے یہ بدیہی امر ہے کہ قریش ہر دفعہ مسلمانوں کی قوت کا مکمل خاتمہ کرنے کے درپے تھے کیونکہ مسلمانوں کی قوت کو وہ اپنے تجارتی قافلوں کے راستوں میں مستقل خطرہ اور اپنی شان وشوکت کے منافی خیال کرتے تھے۔

اس دفعہ قریش کا ارادہ تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ اس کشمکش اور جنگ کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔ اس لیے انھوں نے ہر ممکن قوت فراہم کی اور ہر اس قبیلے سے معاہدہ کیا جسے مسلمانوں کے خاتمے سے ذرہ بھر بھی دلچسپی تھی اور انھیں سب سے بڑی کامیابی بنونضیر کے یہودیوں میں ہوئی جنھیں مدینہ منورہ سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ یہودیوں نے اپنی نجات اور کامیابی قریش کا ساتھ دینے میں سمجھی، گویا ان دونوں کا ہدف ایک تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔

» طور پر باب کے عنوان میں بیان کیا ہے۔ [1] فتح الباري: 276/15، والبداية والنهاية: 105/4. [2] جوامع السيرة لابن حزم: ص: 185. [3] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب، حديث: 4097. [4] دلائل النبوة للبيهقي: 396/3، و فتح الباري: 276/15.

یہ سوچ سب سے پہلے مدینہ منورہ سے خیبر جانے والے یہودیوں میں پیدا ہوئی کہ قریش اور دوسرے قبائل سے مل کر مسلمانوں سے انتقام لیا جائے تا کہ وہ اپنی متروکہ زمینوں اور گھروں میں واپس جاسکیں۔ ان کا ایک وفد مکہ گیا جس میں بنونضیر کے سلام بن ابی الحُقَیق، حُیَیّ بن اخطب، کنانہ بن ابی الحُقَیق، بنو وائل کے ہوذہ بن قیس، ابوعمار اور بنونضیر اور بنووائل کے دیگر افراد شامل تھے۔ انھوں نے قریش کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کی دعوت دی اور ساتھ مل کر لڑنے کی پیشکش کی تا کہ مسلمانوں کو ختم کیا جاسکے۔ انھوں نے از راہ خوشامد یہ بھی کہا کہ تمھارا دین محمد کے دین سے بہت بہتر اور حق کے زیادہ قریب ہے۔ انھی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴾

''کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا؟ وہ بتوں اور باطل معبود پر ایمان لاتے اور اُن کے متعلق کہتے ہیں جنھوں نے کفر کیا: یہ اُن لوگوں سے زیادہ سیدھے راستے پر ہیں جو ایمان لائے۔''[1]

[1] النسآء 4:51. ابن اسحاق کی یہ روایت مرسل سند سے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 3/298، 299، والبداية والنهاية: 4/106، وتفسير الطبري (تحقيق أحمد شاكر): 8/469-471) طبری کی تفسیر میں یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے جس کی سند میں محمد بن ابو محمد نامی راوی مجہول ہے۔ طبری نے اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں علماء کی آراء کا ذکر کیا ہے۔ اپنی رائے دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: ''سب سے درست قول یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ عزوجل نے اہلِ کتاب یہود کی ایک جماعت کے متعلق خبر دی ہے۔ ممکن ہے اس جماعت میں وہی لوگ شامل ہوں جن کا ذکر ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اُس روایت میں ہے جسے محمد بن ابی محمد نے عکرمہ یا سعید سے روایت کیا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حُیَیّ اور اُس کے ساتھی ہوں یا کعب ہو یا کوئی اور۔'' اسے واقدی نے بھی روایت کیا ہے، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 2/441، 442)

اس کے بعد وہ نجد کے بڑے قبیلے غطفان کے پاس گئے اور انھیں اکسایا کہ تم بھی ہمارے اور قریش کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کرو۔ [1] ہم تمھیں خیبر کا نصف پھل دیں گے۔ [2] غطفان کے پاس جانے والا کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق تھا۔ غطفان کے سردار عیینہ بن حصن فزاری نے ہامی بھر لی۔ [3]

ادھر مشرکین مکہ نے اپنے حلیف بنو اسد سے رابطہ کیا تو ان میں سے طلحہ بن خویلد اپنے ساتھیوں کے ساتھ آ گیا۔ ابو سفیان قریش اور دوسرے حلیف قبائل کو لے کر چل پڑا اور مرّالظہران میں پڑاؤ ڈالا۔ بنو سلیم میں سے بھی بہت سے لوگ ابو اعور کے والد سفیان بن عبد شمس کی قیادت میں، [4] بنو مرّہ، حارث بن عوف کی قیادت میں اور بنو اشجع، مِسعر بن رُخَیْلَة کی قیادت میں بطور کمک آ ملے۔ [5] قریش کے ساتھ بنو کنانہ اور تہامہ والوں کے علاوہ احابیش کی بھی بہت بڑی تعداد آ گئی، اس طرح یہ بڑا لاؤ لشکر تیار ہو گیا۔ [6] انھی کو اللہ تعالیٰ نے ''احزاب'' (مختلف جماعتوں) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ [7] ابن اسحاق کے

[1] تفسیر ابن کثیر: 513/1. یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی حسن سند ابنِ عباس رضی اللہ عنہما تک پہنچتی ہے۔
[2] یہ واقدی کی روایت ہے، چنانچہ یہودِ خیبر نے غطفان کو خیبر کا ایک سال کا پھل دیا، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 443/2) [3] فتح الباري: 275/15، ودلائل النبوة للبيهقي: 398/3. [4] دلائل النبوة للبيهقي: 399/3، وفتح الباري: 275/15. ابن حجر کی روایت میں ہے کہ بنو سلیم، ابو اعور کی قیادت میں تھے۔ یہ شاید غلطی ہے۔ درست وہی ہے جو واقدی اور ابن سعد نے بتایا کہ یہ سفیان تھا جو ابو اعور کا والد ہے۔ یہ جنگِ صفین میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے قائدین میں سے تھا، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 443/2، والطبقات الكبرىٰ: 66/2) [5] یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جو ان کی سند سے زہری اور ان کے دیگر اساتذہ تک پہنچتی ہے۔ یہ مرسل روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 300/3) [6] یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جو ان کی کئی سندوں سے ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 306/3) [7] یہ موسیٰ بن عقبہ کی روایت ہے جو بیہقی کی دلائل النبوة اور ابن حجر کی فتح الباري میں نقل ہوئی ہے۔

مطابق ان کی تعداد دس ہزار تھی جبکہ مسلمان صرف تین ہزار تھے۔ [1]

یہ لشکر مرّالظہران سے مدینہ کے راستے پر چل پڑا۔ قریش اوران کے ساتھ چلنے والے جرف اور زغابہ کے درمیان آبی گزر گاہوں کے سنگم میں فروکش ہوئے جبکہ بنوغطفان احد کے ایک جانب نقمی کے پہلو میں خیمہ زن ہوئے۔ [2] بنواسد بھی انھی کے ساتھ تھے۔ [3]

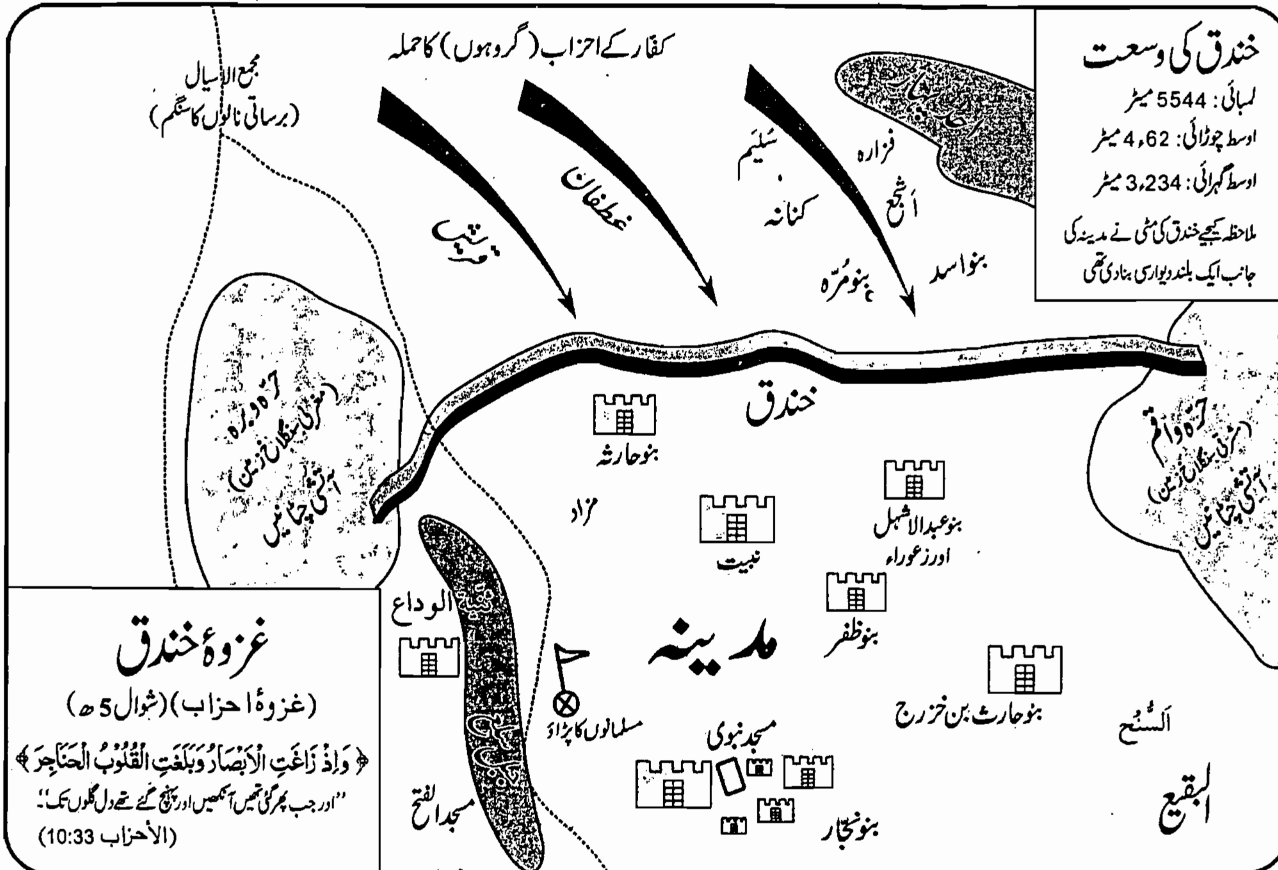
ادھر رسول اللہ ﷺ کو ان کے ارادوں کا علم ہوا تو آپ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا کہ مدینہ منورہ کی واحد کھلی جانب (شمال) میں خندق کھود دی جائے۔ [4] باقی تینوں اطراف قلعے کی طرح محفوظ تھیں۔ عمارتوں اور کھجور کے باغات کی قطاریں تھیں اور دشوار گزار پتھریلے علاقے تھے جہاں سے کارروائی کرنا اور اونٹوں اور پیدل دستوں کا چلنا دشوار تھا۔ [5] سب حضرات نے اس تجویز کو منظور کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جنگ کے لیے آنے والے لشکر بھاری تعداد میں ہیں۔ اس طریقے کے بغیر ان کا مقابلہ مشکل ہے۔ مسلمان پوری دلجمعی اور جوش وخروش سے خندق کی کھدائی میں لگ گئے۔ خندق مشرق میں أجم الشیخین سے لے کر مغرب میں مذاذ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی لمبائی تقریباً 4 کلومیٹر چوڑائی تقریباً 7 میٹر اور گہرائی تقریباً 5 سے 8 میٹر تھی۔

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 306/3. یہ معلّق روایت ہے۔ واقدی نے ان لشکروں کی الگ الگ تعداد بھی لکھی ہے۔ قریش اور احابیش 4000، بنوسلیم 700، بنوفزارہ 1000، بنواشجع 400، بنومرہ 400 ان کی مجموعی تعداد 6500 بنتی ہے۔ باقی جنگجو غطفان اور بنو اسد کے تھے جو تعداد میں 3500 تھے۔
[2] یہ ابن اسحاق کی معلّق روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 306/3). سفاريني نے زغابہ کے بجائے غابہ کا لفظ لکھا ہے۔ دونوں لفظوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ غابہ، زُغابہ کا شمالی علاقہ ہے اور یہ دونوں قریب قریب ہیں، دیکھیے: (ثلاثيات مسند أحمد: 200,199/1) [3] یہ موسیٰ بن عقبہ کی روایت ہے جو بیہقی کی دلائل النبوة میں نقل ہوئی۔ [4] فتح الباري: 275/15. واقدی نے بھی اپنے بیشتر اساتذہ کی اسانید سے اسے روایت کیا ہے۔ واقدی کے اساتذہ میں ابومعشر نجیح بھی شامل ہے جو ضعیف ہے، دیکھیے: (الطبقات الكبرىٰ: 66/2) [5] فتح الباري: 275/15، ودلائل النبوة للبيهقي: 398/3.

ہر دس مسلمانوں کے ذمے تقریباً 32 میٹر خندق کی کھدائی آئی۔ [1] مہاجرین نے مشرق میں راتج کے قلعے سے ذباب کے قلعے تک کھدائی شروع کی جبکہ انصار نے قلعۂ ذباب سے مغرب میں جبل بنی عبید تک کا ذمہ لیا۔ [2] مسلمانوں نے خندق کی کھدائی میں غیر معمولی تیزی دکھائی۔ وہ چاہتے تھے کہ احزاب کی آمد سے قبل یہ کام پورا ہو جائے۔ [3] کھدائی کی مدت چھ دن سے بیس دن تک بیان کی گئی ہے۔ اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ کے نزدیک بیس دن، واقدی کے نزدیک چوبیس دن، نووی کے نزدیک پندرہ دن [4] اور ابن سعد کے نزدیک کل چھ دن۔ [5]

اس دوران میں مسلمانوں کی خوراک تھوڑے سے جو ہوتے تھے جنھیں پرانے خراب ذائقے اور بو باس والے گھی کے ساتھ ملا کر پکایا جاتا تھا۔ حلق میں خراب ذائقہ اور بو محسوس ہوتی تھی لیکن بھوک کی مجبوری سے اسے نگلنا ہی پڑتا تھا۔ [6] کبھی کبھی محض کھجوروں پر گزارا کرنا پڑتا۔ [7] کبھی تین تین دن تک جو ملتے نہ کھجوریں حتی کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی بھوک

[1] اس کے بارے میں چند ضعیف روایات ملتی ہیں جو کثیر بن عبداللہ مزنی کی سند سے ہیں۔ کثیر ضعیف راوی ہے، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 130/6، وتفسير الطبري: 33/21، وفتح الباري: 280/15) ہارون نے کثیر بن عبداللہ کو ثقہ قرار دیا ہے۔ [2] المغازي للواقدي: 2/445-450، والطبقات الكبرىٰ: 67,66/2، و شرح ثلاثيات مسند أحمد: 200,199/1. [3] یہ بھی ابن عقبہ کی روایت ہے جو بیہقی کی دلائل النبوة اور ابن حجر کی فتح الباري میں نقل ہوئی۔ [4] فتح الباري: 276/15. [5] الطبقات الكبرىٰ: 67/2. یہ معلّق روایت ہے۔ دکتور اکرم ضیاء العمری نے صرف یہی قول بیان کیا ہے۔ شاید ان کے ہاں درست یہی ہے، دیکھیے: (المجتمع المدني، الجهاد، ص: 114) ہمارا جھکاؤ ابن عقبہ کی روایت کی طرف ہے کیونکہ وہ کتب ستہ کے راوی، ثقہ اور سیرت و مغازی میں امام ہیں۔ اس کا ذکر ہم کتاب کے آغاز میں اور دیگر مقامات پر کر چکے ہیں۔ [6] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب، حديث: 4100. [7] ابن اسحاق کی یہ روایت بسند منقطع ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 304,303، والبداية والنهاية: 112/4)


کفار کے احزاب (گروہوں) کا حملہ
مجمع الاسیال
(برساتی نالوں کا سنگم)
قریش
غطفان
سُلَیم
کنانہ
فزارہ
اَشجع
بنومُرّہ
بنواسد
خندق کی وسعت
لمبائی: 5544 میٹر
اوسط چوڑائی: 4،62 میٹر
اوسط گہرائی: 3،234 میٹر
ملاحظہ کیجیے خندق کی مٹی نے مدینہ کی جانب ایک بلند دیوار سی بنا دی تھی
(مغربی سنگلاخ زمین)
اونچی چٹانیں
(شرقی سنگلاخ زمین)
اونچی چٹانیں
خندق
بنوحارثہ
مزاد
نبیت
بنوعبدالاشہل
اورزعوراء
بنوظفر
مدینہ
الوداع
مسلمانوں کا پڑاؤ
مسجد نبوی
بنوحارث بن خزرج
السُّنح
البقیع
بنونجار
مسجد الفتح
غزوۂ خندق
(غزوۂ احزاب) (شوال 5ھ)
﴿ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ ﴾
''اور جب پھر گئی تھیں آنکھیں اور پہنچ گئے تھے دل گلوں تک۔''
(الأحزاب 10:33)

کی شدت کی بنا پر پیٹ پر پتھر باندھنے پڑے۔[1]

خندق کھودنے میں سب مسلمان بلا امتیاز شریک تھے۔غریب، امیر اور غلام و آقا میں کوئی فرق نہ تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ بھی برابر کے شریک تھے۔آپ مٹی اٹھاتے جاتے حتی کہ بطن مبارک غبار آلود ہو جاتا اور مٹی جسم اطہر کو ڈھانپ لیتی اور اگر کوئی چٹان صحابہ سے نہ ٹوٹتی تو وہ آپ سے عرض کرتے۔ آپ اسے دست مبارک کی ضرب سے ریزہ ریزہ کر دیتے۔[2] ساتھ ہی ساتھ جنگی شعر اور ترانے بھی پڑھتے جاتے تاکہ چستی کے ساتھ کام جاری رہے، آپ فرماتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ! لَوْلَا أَنْتَ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

فَأَنْزِلَنْ سَكِينَةً عَلَيْنَا وَثَبِّتِ الْأَقْدَامَ إِنْ لَّاقَيْنَا

إِنَّ الْأُلٰى قَدْ بَغَوْا عَلَيْنَا وَ إِنْ أَرَادُوا فِتْنَةً أَبَيْنَا

''اے اللہ! اگر تو نہ ہوتا تو ہم نہ ہدایت پاتے نہ صدقے کرتے، نہ نمازیں پڑھتے، لہٰذا ہم پر سکینت (اطمینان) نازل فرما اور دشمن سے مقابلہ ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھ، یہ لوگ ظلم کی نیت سے ہم پر چڑھ آئے ہیں، اگر یہ ہم کو گمراہی اور شرک پر مجبور کریں تو ہم قطعاً انکار کریں گے۔''

آخری لفظ کو کھینچ کر بلند آواز سے پڑھتے تھے۔[3]

عام مسلمان بھی کام کے دوران یہ جنگی شعر پڑھتے:

[1] صحیح البخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب، حديث: 4101. [2] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب، حديث: 4098-4101، و صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب غزوة الأحزاب وهي الخندق، حديث: 1803. [3] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب، حديث: 4104، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب غزوة الأحزاب وهي الخندق، حديث: 1803-1805.

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا عَلَى الْإِسْلَامِ مَا بَقِينَا أَبَدًا

''ہم وہ لوگ ہیں جنھوں نے حضرت محمد ﷺ کے دست حق پرست پر ہمیشہ کے لیے اسلام کی بیعت کی ہے جب تک کہ ہمارے جسم میں جان ہے۔''

آپ ﷺ ان کو یوں جواب دیتے:

اَللّٰهُمَّ ! إِنَّهُ لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُ الْآخِرَةْ فَبَارِكْ فِي الْأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةْ

''مولائے برحق! آخرت کی خیر کے علاوہ کوئی خیر نہیں، لہٰذا انصار و مہاجرین میں برکت و اضافہ فرما۔''[1]

کبھی آپ ابتدا کرتے اور آپ کے جواب میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم شعر پڑھتے تھے۔[2]

خندق کی کھدائی کے دوران رونما ہونے والے معجزات

خندق کی کھدائی کے دوران اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کے ہاتھوں چند معجزے صادر کرائے جن میں سے چند یہ ہیں:

* حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور پر بھوک اور کمزوری کے آثار دیکھے تو آپ ﷺ سے اجازت لے کر گھر گئے۔ اپنی زوجہ محترمہ سے ان کا تذکرہ کیا، پھر ایک بکری ذبح کی۔ بیوی نے کچھ جَو پیسے جو دو کلو ہوں گے۔ اس طرح ہنڈیا تیار کی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبیِ کریم ﷺ کو بلانے چلے گئے۔ انھوں نے آپ سے چپکے سے عرض کی کہ میں نے تھوڑا سا کھانا تیار کیا ہے جس سے افراد خانہ کے علاوہ ایک دو آدمیوں

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب، حديث: 4100، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب غزوة الأحزاب وهي الخندق، حديث: 1805. [2] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب، حديث: 4099، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب غزوة الأحزاب وهي الخندق، حديث: 1805.

کا گزارہ ہوسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تمام حاضرین خندق کو چلنے کی دعوت دے دی۔ وہ ایک ہزار تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اوران کی زوجہ محترمہ پریشان ہوئے لیکن اللہ تعالیٰ نے کھانے میں اس قدر برکت دی کہ تمام لوگوں نے خوب سیر ہوکر کھایا بلکہ بہت سا کھانا بچ بھی گیا جو حضرت جابر کے اہل خانہ نے کھایا بھی اور بطور تحفہ لوگوں کو بھیجا۔[1]

* خندق کی کھدائی کے دوران میں آپ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ تمھیں ایک باغی جماعت قتل کرے گی اور واقعی ایسا ہوا۔ وہ جنگ صفین میں شہید ہوئے اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے۔[2]

* کھدائی کے دوران میں ایک بڑی چٹان آ گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے تین ضربیں لگائیں اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ پہلی ضرب کے بعد آپ نے فرمایا:

«اَللّٰهُ أَكْبَرُ، أُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ الشَّامِ، وَاللّٰهِ! إِنِّي لَأُبْصِرُ قُصُورَهَا الْحَمْرَاءَ السَّاعَةَ»

”اللہ اکبر! مجھے شام کی چابیاں دے دی گئیں۔ اللہ کی قسم! مجھے اس وقت اس کے سرخ محلات نظر آرہے ہیں۔“

پھر آپ نے دوسری ضرب لگائی تو فرمایا:

«اَللّٰهُ أَكْبَرُ، أُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ فَارِسَ، وَاللّٰهِ! إِنِّي لَأُبْصِرُ قَصْرَ الْمَدَائِنِ أَبْيَضَ»

”اللہ اکبر! مجھے فارس (ایران) کی چابیاں دے دی گئیں، اللہ کی قسم! میں مدائن

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب، حديث: 4102,4101، وصحيح مسلم، الأشربة، باب: (20)، حديث: 2039. اسے ابن اسحاق نے بھی بسند حسن روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 305,304/3) [2] صحيح مسلم، الفتن، باب: (18) حديث: 2915.

کے قصرِ ابیض کو دیکھ رہا ہوں۔''

پھر آپ نے تیسری ضرب لگائی اور فرمایا:

«اَللّٰهُ أَكْبَرُ، أُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ الْيَمَنِ، وَاللّٰهِ! إِنِّي لَأُبْصِرُ أَبْوَابَ صَنْعَاءَ مِنْ مَّكَانِي هٰذِهِ السَّاعَةَ»

''اللہ اکبر! مجھے یمن کی چابیاں دے دی گئیں، اللہ کی قسم! میں اس وقت یہاں کھڑا صنعاء کے دروازے دیکھ رہا ہوں۔''[1]

اس حدیث میں بشارت تھی کہ مسلمان ان سب علاقوں کو فتح کریں گے اور ایسا ہی ہوا۔ مومنین کو تو اس بشارت پر پہلے ہی سے یقین تھا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ز وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝﴾

''یہ تو وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا۔ اور اس (بشارت) نے انھیں ایمان اور فرماں برداری ہی میں بڑھایا۔''[2]

لیکن منافق اس بشارت کا مذاق اڑاتے تھے۔

﴿وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝﴾

''اور جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے کہتے تھے: اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے محض دھوکے کا وعدہ کیا تھا۔''[3]

[1] مسند أحمد: 303/4، و سنن النسائي، الجهاد، باب غزوة الترك والحبشة، حديث: 3178. ابن حجر کے مطابق اس حدیث کی سند حسن ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 280/15) [2] الأحزاب 22:33. [3] الأحزاب 12:33. واحدی کا کہنا ہے: ''ابن سائب کا خیال ہے کہ یہ بات مُعَتِّب بن قُشَیر نے کہی تھی۔'' دیکھیے: (أسباب النزول للواحدي: 359/6)

اس سورت کی 13 سے 20 تک کی آیات منافقین کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کی حقیقی تصویر پیش کرتی ہیں جن میں افواہ سازی اور حوصلے کے متعلق ان کے اقوال بیان کیے گئے ہیں۔ خندق کی کھدائی سے جان چھڑانے کے حیلوں کا تذکرہ ہے اور دشمن کے مقابلے سے بچنے کے لیے ان کے بہانے بیان کیے گئے ہیں۔ منافقین کی حوصلہ شکنی، کھانے کی کمی اور سردی کی شدت کے باوجود خندق کی کھدائی مکمل ہوگئی۔ اس طرح مضبوط دفاعی لائن قائم ہوگئی، پھر آپ ﷺ نے عورتوں، بچوں اور معذور لوگوں کو قلعۂ فارع میں محفوظ کر دیا۔[1] یہ قلعہ بنو حارثہ کا تھا اور اس وقت مسلمانوں کا سب سے مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا۔[2]

مسلمانوں کا جنگی منصوبہ یہ تھا کہ ان کی پشت مدینہ منورہ میں جبل سلع کی طرف ہو[3] اور ان کے چہرے خندق کی طرف جو ان کے اور مشرکین کے درمیان حائل تھی۔ دشمن بنی جرف کے رومہ، غابہ اور نقمیٰ کے مقامات پر تھا۔[4] رسول اللہ ﷺ نے دشمنوں اور مسلمانوں کی حالت میں بڑا بین فرق محسوس کیا کہ مسلمان جنگی لحاظ سے بہت کمزور اور

---

[1] صحیح مسلم، فضائل الصّحابة، باب من فضائل طلحة والزبیر رضی اللہ عنہما، حدیث: 2416. مسلم کی روایت میں قلعے کا نام قلعۂ حسان ہے۔ ابن اسحاق نے مرسل سند سے بیان کیا ہے کہ قلعہ فارع ہی قلعۂ حسان بن ثابت ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 317/3) فارع کا نام واضح طور پر بزار اور ابو یعلی کی روایت میں ضعیف سند سے آیا ہے۔ اس روایت کو ہیثمی نے نقل کیا ہے۔ واقدی نے بھی یہ روایت نقل کی ہے، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 134,133/6، وکشف الأستار: 333/2، والمغازي للواقدي: 462/2) [2] اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔ ہیثمی نے اسے نقل کر کے لکھا: ''اس کے راوی ثقہ ہیں۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 133/6) دکتور اکرم ضیاء العمری نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، دیکھیے: (المجتمع المدني، الجهاد، ص: 117) اکرم ضیاء العمری کو طبرانی کے استاذ اور استاذ الأستاذ کے حالات نہیں ملے، نیز دیکھیے: (المغازي للواقدي: 469/2) ابن اسحاق نے بھی اسے بسند منقطع روایت کیا ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 315/3) [3] یہ ابن اسحاق کی معلق روایت ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 306/3) [4] یہ عروہ کی مرسل روایت ہے۔ اسے طبری نے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے، دیکھیے: (تفسیر الطبري: 130,129/21)

مشرکین بے حد طاقتور ہیں، چنانچہ آپ کو مشرکین کی قوت کمزور کرنے کا خیال آیا۔ آپ نے انصار کے سرداروں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا اور ان سے مشورہ لیا کہ کیوں نہ غطفان کی صلح کی یہ پیشکش قبول کر لی جائے کہ انھیں مدینہ کا ایک تہائی پھل دے دیا جائے تو وہ مسلمانوں کے ساتھ لڑائی سے دست بردار ہو جائیں گے؟ صرف صلح کی دستاویز پر دستخطوں کی دیر تھی۔ وہ دونوں کہنے لگے: ''نہیں۔ اللہ کی قسم! ہم نے تو جاہلیت میں ایسی ذلت قبول نہیں کی۔ اس اسلام کی دولت و عزت حاصل ہونے کے بعد تو ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' طبرانی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں، دونوں کہنے لگے: ''اللہ کے رسول! اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے تو بسر وچشم تسلیم ہے۔ اگر آپ کی تجویز اور خواہش ہے تب بھی آپ کی تجویز و خواہش کے ہم پابند ہیں لیکن اگر آپ صرف ہماری بہتری کے لیے یہ ارشاد فرما رہے ہیں تو رب العزت کی قسم! ہم ان سے کسی طرح کم نہیں۔ وہ ہم سے پھل کا ایک دانہ بھی نہیں لے سکتے، اِلاّ یہ کہ خریدیں یا بطور مہمانی حاصل کریں۔'' یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے بنو مرّہ کے قائد حارث غطفانی سے مذاکرات ختم کر دیے۔ وہ ان کا نمائندہ تھا۔[1]

دوسری طرف بنونضیر کے یہودیوں نے کوشش کی کہ بنو قریظہ کے یہودیوں کو بھی مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی اور غداری پر مجبور کریں تاکہ وہ بھی مشرکین کے حلیف بن

[1] طبرانی اور بزار نے اس روایت کو دو سندوں سے بیان کیا ہے۔ یہ دونوں سندیں حسن ہیں، دیکھیے: (کشف الأستار: 332,331/2، و مجمع الزوائد: 132/6) دیگر ضعیف سندیں بھی ان کی تائید کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک ابن اسحاق کی معلق روایت ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 311,310/3) دوسری ابن سعد کی روایت ہے جو مختصر ہے، دیکھیے: (الطبقات الکبرٰی: 73/2) تیسری روایت ابن ابی شیبہ کی ہے، دیکھیے: (المصنف لابن أبي شیبة: 420/14) یہ روایت ابن ابی شیبہ کی اپنی سند سے ہے جو ابو معشر تک پہنچتی ہے۔ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے صحیفہ لیا اور اس کی تحریر مٹا دی، پھر کہا: ''اُن سے جو ہوتا ہے کر لیں۔''

جائیں۔ یہ کام انجام دینے کے لیے انھوں نے حُیَیّ بن اخطب کو بھیجا۔ حُیَیّ کعب بن اسد قرظی کے پاس آیا۔ لمبی چوڑی گفتگو کے بعد اس نے کعب کو مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی پر راضی کرلیا۔ دلیل یہ پیش کی کہ تمام عرب قوتیں اکٹھی ہوچکی ہیں اور وہ مسلمانوں کی جڑ اکھاڑ کر ہی جائیں گے۔ اس نے یہ پیش کش بھی کی کہ لشکروں کی واپسی کے بعد تم میرے قلعے میں آجانا، تمھارا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ [1]

جب مسلمانوں کو پتہ چلا کہ یہود بنو قریظہ نے بھی مسلمانوں سے اپنا معاہدہ توڑ دیا ہے تو انھیں بڑی تشویش ہوئی کیونکہ اس طرح یہ نہایت سنگین خطرہ پیدا ہوگیا کہ وہ مسلمانوں پر پیچھے سے کاری ضرب لگائیں گے۔ وہ مدینہ منورہ کی جنوب مشرقی جانب عوالی میں وادیٔ مہزور میں رہتے تھے۔ [2]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے آپ کو ان کی غداری کی خبر سنائی۔ اسی دن آپ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

«إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيًّا وَّ حَوَارِيَّ الزُّبَيْرُ»

''یقیناً ہر نبی کا ایک حواری اور مخلص مددگار ہوتا ہے، میرا حواری زبیر ہے۔'' [3]

مزید تحقیق و تاکید کے لیے آپ نے سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ، عبداللہ بن رواحہ اور

[1] یہ ابن اسحاق کی معلق روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام:3/307,308) موسیٰ بن عقبہ نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ اُن کی روایت بیہقی نے نقل کی جو اُن کے استاذ زہری پر موقوف ہے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي:3/400,401) [2] معجم البلدان: 5/234,235. [3] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب، حديث: 4113، وصحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل طلحة والزبير رضی اللہ عنہما، حديث: 2415. واقدی نے اس واقعے کی تفصیل بیان کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کو دیکھا: ''وہ اپنے قلعے مرمت کر رہے ہیں، راستے ہموار کر رہے ہیں اور انھوں نے اپنے جانور اکٹھے کر لیے ہیں۔'' دیکھیے: (المغازي للواقدي: 1/457) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبیر رضی اللہ عنہ ان کے حالات کے بارے میں معلومات لائے تھے۔

خوات بن جبیر رضی اللہ عنہم کو بھیجا۔ یہ حضرات بنو قریظہ کے پاس گئے، ان سے بات چیت کی تو ثابت ہوگیا کہ وہ معاہدہ ختم کر چکے ہیں بلکہ انھوں نے میثاق مدینہ جو بیشتر انھی کے بارے میں تھا، اس کی دستاویز بھی پھاڑ دی ہے، البتہ ان کا ایک قبیلہ بنو سَعْیَہ عہد کا پابند رہا۔[1]

انھوں نے ان سرداروں کو اپنی وفاداری کا پورا یقین دلایا، پھر ان حضرات نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر بنو قریظہ کی غداری کے بارے میں بتایا کہ یہ اطلاع درست ہے۔[2]

جب یہ خبر مشہور ہوئی تو مسلمانوں کو بنو قریظہ کی طرف سے اپنی عورتوں اور بچوں پر حملے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ یہ انتہائی نازک اور آزمائش کا وقت تھا۔ قرآن مجید نے یہ حالت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝﴾

”جب وہ تمھارے اوپر اور تمھارے نیچے سے تم پر چڑھ آئے تھے۔ اور جب آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے، تب ایمان والے آزمائے گئے اور شدت سے ہلا دیے گئے۔“[3]

اوپر سے آنے والے تو قریش اور ان کے حلیف و مددگار تھے اور نیچے سے آنے والے

[1] بنو سَعْیَہ کی خبر ابن اسحاق کی معلّق روایت میں ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 3/330,329)
[2] یہ ابن اسحاق کی معلّق روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 3/309,308) [3] الأحزاب 33:10،11۔ یہ ابن اسحاق کی معلّق روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 3/340,339) طبری نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں کئی روایات بیان کی ہیں جو بعض تابعین کی مرسل روایات ہیں۔ مجموعی طور پر یہ روایات ایک دوسری کو قوت پہنچاتی اور حسن لغیرہ کے درجے تک پہنچ جاتی ہیں، دیکھیے: (تفسير الطبري: 2/128-155)

بنو قریظہ اور اللہ کی ذات عالی کے بارے میں بدگمانیاں کرنے والے منافقین تھے۔ باقی رہے مومنین تو وہ اس امتحان کے لیے مکمل طور پر تیار تھے اور انھوں نے اس امتحان سے گزرنے کے لیے ہر ممکن وسائل اختیار کر رکھے تھے۔ انھوں نے مدینہ کی اندرونی حفاظت کے لیے دستے بنا رکھے تھے۔ حضرت سلمہ بن اسلم اوسی دو سو شہسوار کے دستے پر اور حضرت زید بن حارثہ تین صد شہسوار کے دستے پر مامور تھے۔ یہ دونوں دستے مدینہ منورہ میں چکر لگاتے رہتے تھے اور بلند آہنگی سے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے تھے تاکہ بنو قریظہ کو معلوم رہے کہ مسلمان مستعد اور تیار ہیں۔ اس تدبیر کا مقصد یہ تھا کہ ان غداروں کو قلعوں میں موجود خواتین اور بچوں پر حملے کا موقع نہ ملے۔[1]

جب مشرکین اور ان کے حلیفوں کے الگ الگ لشکر مدینہ منورہ پہنچے تو وہ خندق کو دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ انھوں نے خندق عبور کرنے کی زبردست کوششیں کیں مگر ناکام رہے۔ مسلمان ان پر تیروں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ اس طرح یہ محاصرہ چوبیس راتیں جاری رہا۔[2]

ابن اسحاق اور ابن سعد کا بیان ہے کہ بعض مشرکین نے خندق بھی عبور کر لی تھی۔ ابن اسحاق نے عمرو بن عبدوُدّ، عکرمہ بن ابی جہل، ہبیرہ بن ابی وہب اور ضرار بن خَطَّاب بن مِرداس شاعر کے نام لکھے ہیں۔ ابن سعدؒ نے ان کے علاوہ نوفل بن عبداللہ کا بھی ذکر

---

[1] الطبقات الكبرٰى: 67/2، والمغازي للواقدي: 460/2. [2] یہ ابن سعد کی روایت ہے۔ اس کی سند کے راوی ثقہ ہیں اور یہ ابن مسیب کی مرسل روایت ہے۔ ان کی مراسیل قوی ہوتی ہیں۔ محاصرے کی مدت کے متعلق یہ سب سے قوی سند ہے، دیکھیے: (الطبقات الكبرٰى: 73/2) ابن اسحاق کا کہنا ہے: ''بیس سے کچھ اوپر راتیں، تقریباً ایک ماہ۔'' یہ روایت معلّق ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 310/3) طبری نے قتادہ کی ایک مرسل روایت بیان کی ہے جو بسند حسن ہے کہ محاصرہ ایک ماہ جاری رہا، دیکھیے: (تفسير الطبري: 128/21) موسیٰ بن عقبہ عن ابن شہاب کی روایت میں ہے کہ تقریباً بیس راتیں۔ یہ روایت بیہقی نے نقل کی ہے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 401/3) ابن سعد کا کہنا ہے: ''پندرہ راتیں۔'' دیکھیے: (الطبقات الكبرٰى: 70/2)

کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قریش کے نامور شہسوار عمرو بن عبدوُدّ کا دو بدو مقابلہ کیا اور اسے جہنم واصل کیا۔ نوفل بن عبداللہ مخزومی کو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے قتل کیا اور باقی تینوں دم دبا کر واپس بھاگ گئے۔ [1]

محاصرہ ختم ہونے سے پہلے تک مشرکین کی مسلمانوں کے ساتھ جھڑپیں اور دور دور سے تیراندازی کے واقعات جاری رہے حتی کہ ایک دن انھوں نے مسلمانوں کو عصر کی نماز پڑھنے کا موقع بھی نہ دیا۔ مسلمانوں نے اس دن عصر کی نماز سورج غروب ہونے کے بعد پڑھی۔ [2] اس وقت تک صلاۃ خوف شروع نہیں ہوئی تھی۔ یہ نماز غزوۂ ذات الرّقاع میں جاری ہوئی۔ [3] یہ ان لوگوں کی رائے کے مطابق ہے جن کے نزدیک غزوۂ ذات الرّقاع غزوۂ خندق کے بعد واقع ہوا۔ ان جھڑپوں میں تین مشرک مارے گئے اور چھ صحابۂ کرام شہید ہوئے۔ [4] ان میں سے ایک حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے بازو کے درمیان اکحل نامی رگ میں تیر لگا جو حبان بن عرقہ نے چلایا تھا۔ وہ شدید زخمی ہوگئے

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 3/311-313، والطبقات الكبرٰى: 2/68. یہ معلّق روایت ہے۔ طبری نے زہری کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے ابن عبدوُدّ کا دوبدو مقابلہ کیا۔ زہری کی مراسیل ضعیف ہوتی ہیں۔ انھوں نے عکرمہ کی ایک مرسل روایت بھی درج کی جس کے رجال ثقہ ہیں، دیکھیے: (تاريخ الطبري: 3/48) مشرکین کے خندق عبور کرنے کی کوششوں اور علی رضی اللہ عنہ اور عمرو بن عبدوُدّ کی دو بدو لڑائی کے متعلق دیکھیے: (المغازي للواقدي: 2/464-473) علی رضی اللہ عنہ کا یہ شاندار ایمانی کردار تھا۔ میری مسلم نوجوانوں سے درخواست ہے کہ وہ علی رضی اللہ عنہ کے اس بے باکانہ اقدام پر ٹھہر کر خوب غور کریں کہ وہ کیسے بہادر اور نڈر شہسوار تھے۔ [2] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب، حديث: 4112,4111. [3] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة ذات الرّقاع، حديث: 4125. [4] یہ ابن اسحاق اور واقدی کی معلّق روایت ہے۔ ان دونوں نے تعداد، ناموں اور قبائل کا ذکر بھی کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 3/350,349، والمغازي للواقدي: 2/496,495) ابن سعد نے ایک معلّق روایت میں ان لوگوں میں سے چار افراد کا تذکرہ کیا ہے جن کے نام ابن اسحاق اور واقدی نے لکھے۔

تھے۔ ان کے لیے مسجد میں خیمہ لگا دیا گیا تا کہ رسول اللہ ﷺ قریب سے ان کی بیمار پرسی کرلیا کریں۔ غزوۂ بنی قریظہ کے بعد یہ رگ دوبارہ پھٹ پڑی اور زیادہ خون بہنے کی وجہ سے وہ شہید ہو گئے [1] ان کی تیمارداری کے لیے حضرت رُفَیدہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا کو مقرر کیا گیا تھا۔ [2] انھوں نے زخمی ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ ''اے اللہ! اگر قریش کے ساتھ مزید کسی جنگ کا امکان ہے تو مجھے اس جنگ کے لیے زندہ رکھنا اور اگر قریش کے ساتھ کوئی جنگ باقی نہیں رہی تو میرا زخم پھوٹ پڑے اور میں فوت ہو جاؤں، چنانچہ زخم پھوٹ پڑا جو ان کی وفات کا سبب بنا۔ ابن اسحاق نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ انھوں نے دعا میں یہ بھی کہا تھا: ''یا اللہ! مجھے اس وقت تک موت نہ دینا جب تک میں اپنی آنکھوں سے بنو قریظہ کا عبرتناک انجام نہ دیکھ لوں۔'' [3]

غزوۂ خندق اور غزوۂ بنو قریظہ میں مسلمانوں کا شعار (حروفِ رمز) ''حٰمٓ'' اور ''لَا یُنْصَرُوْنَ'' تھا۔ [4]

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب مرجع النبي ﷺ من الأحزاب......، حديث: 4122.
[2] یہ ابن اسحاق کی معلّق روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 331/3) [3] یہ ابن ہشام کی معلّق روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 316/3) یہی حدیث احمد کی روایت سے اُن کی کتاب المسند میں بھی موجود ہے، دیکھیے: (الفتح الرباني: 83/21) ہیثمی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 139/6) احمد کی روایت میں بھی دعا کے وہ الفاظ موجود ہیں جو بخاری اور ابن اسحاق نے بیان کیے ہیں۔ [4] یہ ابن اسحاق کی معلّق روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 314/3، وسنن أبي داود، الجهاد، باب في الرجل ينادي بالشعار، حديث: 2597، وجامع الترمذي، الجهاد، باب ماجاء في الشعار، حديث: 1682، والمستدرك للحاكم: 107/2) حاکم نے اسے کئی سندوں سے روایت کیا اور اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے اس کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے۔ سیرت ابن ہشام کے محققین کے مطابق یہ حدیث شواہد و متابعات (تائیدی روایات) کی بنا پر صحیح ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مومنین کو دو بدو جنگ سے بچا لیا اور دو طریقوں سے تمام لشکروں کو تتر بتر کر دیا۔

* اللہ تعالیٰ نے نُعَیم بن مسعود کا دل نور اسلام سے بھر دیا اور انھوں نے کافر لشکروں کو ایک دوسرے سے بدظن کر دیا۔
* زبردست ٹھنڈی اور طوفانی آندھی چلی اور کفار ٹھٹھر کر رہ گئے۔

نُعَیم بن مسعود رضی اللہ عنہ کا کردار

ابن اسحاق، واقدی، امام عبدالرزاق اور موسیٰ بن عقبہ کی روایت ہے کہ نُعَیم بن مسعود غطفانی نبی کریم ﷺ کے پاس آکر مسلمان ہوگئے اور عرض کی کہ میں آپ کی کیا خدمت سرانجام دے سکتا ہوں؟[1] آپ نے فرمایا:

«إِنَّمَا أَنْتَ رَجُلٌ وَّاحِدٌ فِينَا، وَلٰكِنْ خَذِّلْ عَنَّا إِنِ اسْتَطَعْتَ، فَإِنَّ الْحَرْبَ خُدْعَةٌ»

''تم واحد آدمی ہو (جو اندر سے مسلمان ہو مگر کفار تمھیں اپنا ساتھی سمجھتے ہیں)، لہٰذا ہو سکے تو ان لشکروں کو بھگانے کی کوئی تدبیر کرو کیونکہ جنگ دھوکا ہے۔''[2]

حضرت نُعَیم رضی اللہ عنہ نکتہ سمجھ گئے۔ ابھی ان کے مسلمان ہونے کا کسی کو علم نہ تھا۔ وہ بنوقریظہ کے پاس گئے اور انھیں قائل کیا کہ تم اس وقت تک جنگ میں ملوث نہ ہونا جب

[1] یہ ابن اسحاق کی معلق روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 320,319/3، والمغازي للواقدي: 2/480-483، والمصنف لعبدالرزاق: 369,368/5) یہ ابن مسیّب کی مرسل روایت ہے۔ ان کی مراسیل قوی ہوتی ہیں۔ مزید دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي: 405,404/3) [2] صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب: الحرب خُدْعة، حديث: 3030,3029، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب جواز الخداع في الحرب، حديث: 1739، ودلائل النبوة للبيهقي: 445/3.

تک قریش کے چند افراد بطور ضمانت اپنے پاس نہ رکھ لو۔ ایسا نہ ہو کہ قریش بھاگ جائیں اور تمھیں یہاں مسلمانوں کے رحم و کرم پر اکیلا چھوڑ جائیں، پھر وہ قریش کے پاس گئے اور انھیں کہنے لگے کہ بنو قریظہ مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی کرنے پر بہت نادم ہیں۔ انھوں نے خفیہ طور پر رسول اللہ ﷺ سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم قریش اور غطفان کے چند بڑے سردار کسی حیلے سے قابو کر کے آپ کے حوالے کر دیں گے تاکہ آپ انھیں قتل کر دیں اور آپ کو ہماری ندامت اور توبہ کا یقین آجائے۔ لہٰذا اگر یہودی تمھارے پاس چند آدمی بطور ضمانت بھیجنے کا پیغام بھیجیں تو ایک آدمی بھی ان کے پاس نہ بھیجنا، پھر نعیم غطفان کے پاس پہنچے اور انھیں بھی وہی بات سمجھائی جو قریش کو سمجھائی تھی۔ اس طرح انھوں نے یہود اور مشرکین کے درمیان شکوک و شبہات کا بیج بو دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر خیانت کا الزام لگانے لگے اور ان میں پھوٹ پڑ گئی۔

آندھی اور ٹھنڈ کا عذاب

بڑی سرد اور تاریک رات تھی کہ زبردست طوفانی آندھی آئی۔ اس کے تھپیڑوں سے مشرکین کی دیگیں الٹ گئیں، خیمے اکھڑ گئے، آگ بجھ گئی اور ان کے خیمے مٹی تلے دفن ہو گئے۔ مشرکین اس بے مقصد طویل جنگ سے پہلے بددل ہو چکے تھے آندھی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ابوسفیان کو کچھ نہ سوجھا، اس نے کوچ کا اعلان کر دیا۔ گویا یہ آندھی اللہ تعالیٰ کا ایک لشکر تھی جسے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے خلاف بھیجا تھا۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝﴾

”اے ایمان والو! تم اپنے آپ پر اللہ کا احسان یاد کرو جب تمھارے خلاف لشکر

امڈ آئے تھے تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور ایسے لشکر جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور اللہ تمھارے اعمال کو بخوبی دیکھنے والا ہے۔“[1]

امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما سے اس تباہ کن رات کی کچھ باتیں روایت کی ہیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں: ”ہم اس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ تیز آندھی اور شدید سردی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَلَا رَجُلٌ يَأْتِينِي بِخَبَرِ الْقَوْمِ، جَعَلَهُ اللّٰهُ مَعِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

”کیا کوئی ایسا شخص نہیں جو ہمارے پاس دشمن کی خبر لائے؟ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے میری معیت عطا فرمائے گا۔“

ہم سب چپ ہوگئے، کسی نے جواب نہ دیا۔ آپ نے تین دفعہ یہ بات دہرائی، پھر خود ہی فرمانے لگے:

«قُمْ يَا حُذَيْفَةُ! فَأْتِنَا بِخَبَرِ الْقَوْمِ» ”حذیفہ! اٹھو، دشمن کی خبر لاؤ۔“

چونکہ آپ نے میرا نام لے کر حکم دیا تھا، اس لیے اب اٹھے بغیر کوئی چارا نہ تھا۔ آپ نے مزید فرمایا:

«اِذْهَبْ فَأْتِنِي بِخَبَرِ الْقَوْمِ، وَلَا تَذْعَرْهُمْ عَلَيَّ»

”جاؤ دشمن کی خبر لاؤ لیکن کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس سے وہ میرے خلاف بھڑک اٹھیں۔“

میں آپ کے پاس سے رخصت ہوکر آگے چلا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میں گرم حمام میں جا رہا ہوں۔ میں دشمن کے لشکر میں پہنچا تو دیکھا کہ ابوسفیان اپنی پیٹھ آگ کی طرف کیے آگ تاپ رہا ہے۔ میں نے کمان میں تیر ڈالا۔ تیر چلانے ہی لگا تھا کہ مجھے

[1] الأحزاب 33:9.

اللہ کے رسول ﷺ کا حکم یاد آ گیا کہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا۔ اگر میں تیر چلا دیتا تو یقیناً ابوسفیان کی کمر میں پیوست ہو جاتا، پھر میں واپس چل پڑا۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا گویا گرم حمام سے گزر رہا ہوں۔ میں نے آپ کے پاس پہنچ کر آپ کو دشمن کی صورت حال سے مطلع کر دیا۔ جب میں اس کام سے فارغ ہوا تو مجھے زبردست سردی لگنے لگی۔ رسول اللہ ﷺ چادر اوڑھ کر نماز پڑھ رہے تھے اس کا زائد حصہ آپ نے مجھے اوڑھا دیا تو میں آرام سے سوتا رہا حتی کہ صبح ہو گئی۔ آپ نے فرمایا:

«قُمْ يَانَوْمَانُ!» ''اٹھ، اے گہری نیند سونے والے!'' [1]

ابن اسحاق نے یہ روایت بیان کرتے ہوئے اضافہ بھی کیا ہے: ''...... میں جب دشمن کے ہاں پہنچا تو آندھی اور اللہ کے لشکر ان کی خوب آؤ بھگت کر رہے تھے۔ ان کی کوئی دیگ ٹھکانے سے نہ رہی۔ سب الٹ گئیں، آگ بجھ گئی۔ کوئی خیمہ سلامت نہ رہا۔ ابوسفیان اٹھا اور کہنے لگا: قریشیو! ہر شخص اچھی طرح دیکھ لے کہ اس کے قریب کون بیٹھا ہے؟ میں نے فوراً اپنے ساتھ والے شخص کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا بتا تو کون ہے؟ وہ بولا: ''یار! میں تو فلاں بن فلاں ہوں۔'' پھر ابوسفیان دل کی بات کہنے لگا: ''اے قریشیو! اللہ کی قسم! ہمارے یہاں ٹھہرنے میں کوئی تک نہیں۔ ہمارے گھوڑے بھی مر گئے۔ اونٹ بھی ڈھیر ہو گئے۔ ادھر بنو قریظہ نے ہم سے وعدہ خلافی کر دی ہے۔ ہمیں ان کے بارے میں بڑی خطرناک خبریں پہنچ رہی ہیں۔ ادھر اس آندھی نے جس طرح ہمارا حلیہ بگاڑا ہے وہ بھی تم دیکھ رہے ہو...... آؤ واپس چلیں، میں تو جا رہا ہوں۔'' [2]

حاکم اور بزار کی روایت میں ہے: ''...... میں ان کے لشکر میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ابوسفیان چند لوگوں کے ساتھ آگ جلائے بیٹھا ہے۔ اس کے حلیف ادھر ادھر بکھر چکے

[1] صحیح مسلم، الجهاد والسير، باب غزوة الأحزاب......، حديث: 1788. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 322/4. سند مرسل اور محمد بن کعب قرظی پر موقوف ہے۔

تھے۔ جب میں ان میں جا کر بیٹھا تو ابوسفیان کو کھٹک گیا کہ کوئی غیر شخص ہم میں آ بیٹھا ہے۔ وہ کہنے لگا: ''ہر شخص اپنے ساتھ والے آدمی کا ہاتھ پکڑ لے۔'' میں نے فوراً اپنا دایاں ہاتھ اپنے دائیں والے آدمی کی طرف بڑھایا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر بایاں ہاتھ اپنے بائیں والے آدمی کی طرف بڑھایا اور اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر میں اٹھا اور واپس رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گیا، میں نے آپ کو مطلع کیا: ''اللہ کے رسول! سب لوگ ابوسفیان کو چھوڑ کر ادھر ادھر بکھر چکے ہیں، صرف چند لوگ رہ گئے ہیں جو آگ جلائے بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں سردی کی مار ماری ہے۔ سردی تو ہمیں بھی لگ رہی ہے مگر ہمیں اللہ تعالیٰ سے ثواب اور فتح کی امید ہے جس سے وہ محروم ہیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے اس خوفناک امتحان کا یہ خوشگوار نتیجہ ظاہر کیا اور مسلمانوں کو لڑائی کے نقصانات سے بچا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس انجام اور نتیجے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴾

''اور اللہ نے کافروں کو ان کے (ناکامی کے) غصے سمیت واپس بھیج دیا۔ وہ کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے اور اللہ نے مومنین کو لڑائی سے بھی بچا لیا۔ اللہ ہمیشہ سے بڑی قوت والا اور غلبے والا ہے۔''[2]

یہ خوشگوار انجام دراصل رسول اللہ ﷺ کی ان عاجزانہ دعاؤں کی قبولیت کا نتیجہ تھا جو آپ

[1] المستدرك للحاكم: 31/3. حاکم نے اسے صحیح قرار دیا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ حاکم، بزار، مسلم، ابو نُعیم اور بیہقی کی روایات ابن اسحاق کی روایت کی تائید کرتی ہیں، دیکھیے: (دلائل النبوة لأبي نعيم: 501,500/2، ودلائل النبوة للبيهقي: 449/3-454، وكشف الأستار للهيثمي: 336,335/2) ہیثمی نے کہا: ''اسے بزار نے روایت کیا اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔'' دیکھیے: (مجمع الزوائد: 136/6) [2] الأحزاب 25:33.

محاصرے کے دوران مسلسل اللہ تعالیٰ کے حضور کرتے رہے تھے:

«اَللّٰهُمَّ! مُنْزِلَ الْكِتَابِ، سَرِيعَ الْحِسَابِ، اهْزِمِ الْأَحْزَابَ، اَللّٰهُمَّ! اهْزِمْهُمْ وَزَلْزِلْهُمْ»

''اے اللہ! اے قرآن اتارنے والے! اے جلدی حساب لینے والے! ان سب لشکروں کو شکست فاش سے دوچار فرما۔ اے اللہ! انھیں شکست دے اور ان کو ہلا کر رکھ دے۔''[1]

تمام دشمن جماعتوں نے مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑنے کی ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل کر کے نامراد واپس کر دیا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ آئندہ بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

«أَلْآنَ نَغْزُوهُمْ وَلَا يَغْزُونَنَا، نَحْنُ نَسِيرُ إِلَيْهِمْ»

''اب ہم ان پر حملہ کریں گے وہ ہم پر حملہ نہ کر سکیں گے، ہم چل کر ان کے سر پر پہنچیں گے۔''[2]

یہ آپ کی نبوت کی زبردست دلیل ہے کیونکہ بعد میں ٹھیک وہی کچھ پیش آیا جو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا تھا۔

[1] صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب كراهة تمني لقاء العدوّ، والأمر بالصّبر عند اللقاء، حديث: 1742. [2] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب، حديث: 4110,4109. ابن حجر نے اس حدیث کی جو شرح لکھی ہے وہ دیکھنی چاہیے۔ ابن اسحاق نے اسے بطور بلاغی روایت بیان کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 352/3) دیگر مؤرخین نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ صحیح بخاری کی روایت کے پہلو بہ پہلو ہم نے ابن اسحاق کی روایت کی طرف بھی اشارہ کیا تاکہ معلوم ہو کہ ابن اسحاق بھی دیگر اہل سیرت کی طرح اس فن میں با کمال ہیں۔ ان کی بلاغی، منقطع اور دیگر ضعیف روایات کے متعلق یہ امکان ہے کہ صحیح کی کتابوں میں ان کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہو۔

چند مفید نصیحتیں

* خندق کی کھدائی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت ہوئی:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾

''اور اُن کے لیے ہر ممکن قوت تیار رکھو۔''[1]

لہٰذا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ دشمن کے خلاف قوت کے تمام ممکن وسائل اختیار کریں، چاہے وہ کہیں سے بھی مہیا ہوں کیونکہ حکمت اور دانائی مومن کی میراث ہے جہاں پائے قابو کر لے۔

* رسول اللہ ﷺ نے خندق کی کھدائی میں اپنے ساتھیوں کے شانہ بشانہ حصہ لے کر حکمرانوں اور رعایا کے لیے اعلیٰ نمونہ قائم فرمادیا کہ سب برابر ہیں۔ سب کے حقوق بھی برابر ہیں اور کسی کو ترجیح حاصل نہیں۔ یہی وہ سچی عبودیت اور بندگی ہے جو آپ کی پیغمبرانہ شخصیت میں جلوہ نما نظر آتی ہے۔

* رسول اللہ ﷺ نے مومنین سے گہری محبت اور شفقت کی مثال قائم کر دی۔ آپ جس طرح ان کے ساتھ خندق کی کھدائی میں شریک تھے اسی طرح آپ نے انھیں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ضیافت میں بھی شریک کرلیا، حالانکہ کھانا بہت کم تھا۔ یہ نہیں کیا کہ چند صحابہ کے ساتھ شریک ہوجاتے اور باقی مجاہدین بھوکے رہتے۔ انھی واقعات و حقائق کی روشنی میں اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''بلاشبہ تمھارے پاس تمھی میں سے ایک رسول آیا جس پر تمھاری تکلیف و مشقت

[1] الأنفال 8:60.

بہت گراں گزرتی ہے، وہ تمھاری بھلائی کا بہت حریص ہے اور مومنین پر بہت رحم اور شفقت کرنے والا ہے۔'' [1]

* وہ تمام معجزات جو غزوۂ خندق کے دوران میں رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر صادر ہوئے، خواہ وہ خندق کی کھدائی کے دوران میں ظاہر ہوئے یا بعد میں، مثلاً: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے کھانے میں برکت یا مشرکین پر اللہ کا عذاب بن جانے والی طوفانی آندھی۔ یہ ان کثیر معجزات کی لڑی میں سے چند ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیِ کریم ﷺ کی تصدیق و تائید فرمائی تاکہ ضدی اور متعصب لوگوں، منافقین، مشرکین اور دیگر دشمنانِ دین کے پاس کوئی حجت اور بہانہ باقی نہ رہے۔ ہم نے اس بحث کے لیے الگ باب قائم کیا ہے۔

* رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جس صلح کی پیشکش غطفان نے خود کی تھی اس کے بارے میں صحابہ سے مشورہ کرنے میں حکمت یہ تھی آپ دیکھنا چاہتے تھے کہ آزمائش کی اس نازک گھڑی میں جبکہ مشرکین اور معاندین کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لپک رہے ہیں اور دوسری طرف آستین کے سانپ بنو قریظہ نے مسلمانوں سے غداری کرکے سارے معاہدے توڑ دیے، صحابہ کے ایمان و یقین کا کیا حال ہے۔ ان کی قوتِ ایمانی کتنی ہے اور انھیں قادر مطلق اللہ ربّ العزت کی مدد اور توفیق پر کتنا بھروسا ہے!

* اس مشاورت کا دینی اور شرعی پہلو صرف اس قدر ہے کہ ہر ایسے مسئلے میں جس میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو مشورہ کرنا جائز اور مناسب ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اگر اب مسلمانوں پر دشمن چڑھ آئیں تو مسلمان ان کو دفع کرنے کے لیے اپنی زمین یا مال کا کچھ حصہ انھیں دے کر اپنی جان چھڑا سکتے ہیں کیونکہ یہ امر متفقہ ہے کہ شریعت اسلامیہ میں قابل حجت آپ ﷺ کے فرامین مبارکہ ہیں یا وہ اعمال جن پر آپ کاربند

[1] التوبة 9:128.

رہے، نیز ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید میں کوئی اعتراض نہ کیا گیا ہو۔ یہاں تو آپ نے صرف رائے معلوم کی تھی، نہ صحابہ نے موافقت کی، نہ آپ نے عمل فرمایا۔ آپ کا یہ مشورہ فرمانا اس بات پر قطعاً کوئی دلیل نہیں کہ مسلمانوں کے لیے کفار کو جزیہ ادا کرنا جائز ہے۔ اگر مجبوراً ناگزیر حالت میں ان کے مال کا کوئی حصہ کفار کے پاس چلا جائے تو وہ پوری کوشش کرتے رہیں کہ جونہی موقع ملے وہاں سے اپنا سلب کردہ حق واپس لے کر رہیں گے۔[1]

* جب مشرکین نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابۂ کرام کو عصر کی نماز بروقت ادا نہ کرنے دی تو آپ نے مغرب کے بعد وہ نماز باجماعت پڑھائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فوت شدہ نماز کی قضا دی جائے گی۔

غزوۂ بنو قریظہ

یہ غزوہ جنگ خندق کے فوراً بعد ذوالقعدہ کے آخر اور ذوالحجہ 5 ھ کے شروع میں ہوا۔[2] تاریخی واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ اس غزوے کا سبب بنو قریظہ کی بدعہدی اور غداری ہے جو انھوں نے حُیَیّ بن اخطب نضری کی انگیخت پر کی۔[3]

[1] ان فقہی مسائل کے لیے دیکھیے: (فقه السيرة النبوية للبوطي، ص: 234,233) [2] یہ ابن سعد کا خیال ہے۔ ان کے مطابق آپ ﷺ بدھ کے دن جب ذوالقعدہ کے سات دن باقی تھے بنو قریظہ کی طرف چلے تھے۔ یہ دراصل ان کے استاد واقدی کی روایت ہے، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 396/2) جبکہ ابن اسحاق نے کہا ہے: ''یہ غزوہ 5 ھ میں ہوا۔'' انھوں نے دن یا مہینہ نہیں بتایا۔ یہ معلق روایت ہے۔ [3] اسے عبدالرزاق نے سعید بن مسیب کی مُرسل سند سے روایت کیا ہے۔ متابعت کی بنا پر یہ روایت قابلِ اعتماد ہے، دیکھیے: (المصنف لعبد الرزاق: 368/5-373، و دلائل النبوة لأبي نعيم: 505,504/2)

گزشتہ صفحات میں یہ بات گزر چکی ہے کہ صحیحین کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے پہلے زبیر رضی اللہ عنہ کو بنوقریظہ کی نیت کا پتہ لگانے کے لیے بھیجا، پھر ان کے بعد سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ، ابن رواحہ اور خوات رضی اللہ عنہم کو اسی مقصد کی خاطر بھیجا تاکہ ان کی غداری کا صحیح علم ہو جائے۔ چونکہ یہ غداری اور خیانت انتہائی نازک موقع پر کی گئی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ کو غزوۂ خندق سے واپس آتے ہی اسلحہ اتارنے کے بعد بنوقریظہ سے لڑائی کا حکم دیا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں صحابۂ کرام کو حکم دیا کہ فوراً بنوقریظہ کی طرف چلیں۔ مزید تاکید کے لیے آپ نے فرمایا:

«لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ»

''ہر شخص عصر کی نماز بنوقریظہ میں پہنچ کر پڑھے۔''

یہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں۔ [1]

مسلم کی روایت میں عصر کے بجائے ظہر کا لفظ آیا ہے۔ [2]

راستے میں نماز کا وقت ہو گیا۔ بعض صحابہ کہنے لگے: ''ہم تو عصر بنوقریظہ میں جا کر پڑھیں گے۔'' کچھ اصحاب کہنے لگے: ''رسول اللہ ﷺ کا مقصد یہ نہ تھا، اس لیے ہم تو راستے ہی میں نماز پڑھیں گے۔'' نبیِ کریم ﷺ کے سامنے اس اختلاف کا ذکر ہوا تو آپ نے کسی کو بھی قصوروار نہ ٹھہرایا [3] کیونکہ ان میں سے ہر ایک نے رسول اللہ ﷺ کا مقصد سمجھنے کی نیک نیتی کے ساتھ کوشش کی تھی۔ [4]

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب مرجع النبي ﷺ من الأحزاب و مخرجه إلى بني قريظة و محاصرته إياهم، حديث: 4117-4119. [2] صحيح مسلم، الجهاد والسير، باب المبادرة بالغزو وتقديم أهمّ الأمرين المتعارضين، حديث: 1770. [3] صحيح البخاري، المغازي، باب مرجع النبي ﷺ من الأحزاب......، حديث: 4117-4119، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب المبادرة بالغزو وتقديم أهمّ الأمرين المتعارضين، حديث: 1770. [4] ابن اسحاق نے اسے بسند مرسل روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 326/3) یہاں ہم نے اُن کی »

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا کہنا ہے: ''بعض علماء نے دونوں روایات میں یوں تطبیق دی ہے کہ ہوسکتا ہے بعض صحابہ نے آپ کے حکم سے پہلے ظہر کی نماز پڑھ لی تھی اور بعض نے نہیں پڑھی تھی۔ جنھوں نے نہیں پڑھی تھی انھیں آپ نے فرمایا: ''ظہر کی نماز بنوقریظہ میں جا کر پڑھیں۔'' اور جنھوں نے ظہر پڑھ لی تھی انھیں آپ نے فرمایا: ''عصر کی نماز بنوقریظہ میں جا کر پڑھیں۔'' اور بعض اہل علم نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ کچھ لوگ پہلے چلے گئے کچھ بعد میں۔ پہلے جانے والوں کو آپ نے ظہر کے بارے میں فرمایا اور بعد میں جانے والوں کو عصر کی نماز کے بارے میں تاکید کی، لہٰذا علماء کی دونوں تطبیقیں درست ہیں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ تین ہزار مجاہدین لے کر بنوقریظہ کی طرف چلے۔ ان کے ساتھ چھتیس گھوڑے تھے۔[2] زیادہ راجح قول کے مطابق پچیس دن تک ان کا محاصرہ جاری رکھا۔[3] جب ان کا اچھی طرح ناطقہ بند ہوا اور انھیں مشقت سہنا پڑی تو بالآخر انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فیصلے کا اختیار دیتے ہوئے ہتھیار ڈالنے کی پیشکش کر دی، پھر انھوں نے اپنے حلیف ابولبابہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اُن کے بارے میں کیا فیصلہ ہوگا۔ ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا کہ تمھارے قتل کا فیصلہ ہوگا۔ بعد میں انھیں ندامت ہوئی کہ میں نے ایک راز فاش کر دیا ہے تو انھوں نے بطور سزا اپنے آپ کو مسجدِ نبوی کے ایک ستون سے باندھ لیا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی

» روایت کا صرف وہ حصہ درج کیا ہے جو صحیحین کی روایت میں نہیں۔ [1] فتح الباري : 294/15.
[2] الطبقات الکبریٰ: 74/3. یہ ضعیف روایت ہے۔ [3] یہ مسند احمد کی روایت ہے اور اس کے راوی قابلِ اعتماد ہیں، دیکھیے: (الفتح الرباني: 21/81-83) حافظ ابن کثیر نے اس حدیث کی سند کو جید کہا ہے، دیکھیے: (البدایة والنهایة: 140/4، وتاریخ الطبري: 538/2) اس حدیث میں یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ مدت تقریباً ایک ماہ اور پچیس راتیں ہیں۔ ابن اسحاق نے یہ مدت پچیس راتیں ہی لکھی ہے، دیکھیے: (السیرة النبویة لابن هشام: 326/3)

اور انھیں کھول دیا گیا۔[1]

جب انھوں نے ہتھیار ڈال دیے تو آپ ﷺ نے مناسب سمجھا کہ اُن کے بارے میں فیصلہ اوس قبیلے کا سردار کرے کیونکہ یہ ایک دوسرے کے حلیف تھے، لہٰذا آپ نے فیصلہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔ وہ مسلمانوں کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے انصار سے فرمایا: ''اپنے سردار (یا اپنے بہترین) آدمی کی طرف اٹھو۔'' پھر فرمایا: ''یہ تمھارے فیصلے کے پابند ہیں۔'' وہ کہنے لگے: ''ان کے جنگجو قتل کر دیے جائیں، ان کی عورتیں اور بچے قید کر لیے جائیں اور ان کے مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیے جائیں۔'' نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا: ''تم نے وہی فیصلہ کیا جو اللہ تعالیٰ کا تھا۔''[2]

آپ نے ان میں اللہ کا یہ فیصلہ صادر فرما دیا۔ زیادہ راجح قول کے مطابق اُن کے جنگجو چار سو تھے۔[3] وہ سب قتل کر دیے گئے۔ صرف تین زندہ رہے کیونکہ وہ اسلام لے آئے تھے۔[4]

[1] الفتح الرباني: 21/81-83. [2] صحيح البخاري، المغازي، باب مرجع النبي ﷺ من الأحزاب ......، حديث: 4121، وكتاب مناقب الأنصار، باب مناقب سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ، حديث: 3804، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب جواز قتال من نقض العهد......، حديث: 1768، والسنن الكبرٰى للنسائي: 5/63، المناقب، باب سعد بن معاذ......، حديث: 8223، وصحيح ابن حبان (ابن بلبان): 15/496,497، حديث: 7026. اس حدیث کے الفاظ ان تمام احادیث سے ماخوذ ہیں۔ [3] مسند أحمد: 3/350. اس کی سند حسن ہے۔ ترمذی، نسائی اور ابن حبان میں جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کی سند صحیح ہے۔ اس کا ذکر ابن حجر نے کیا ہے، دیکھیے: (فتح الباري: 5/301) مقتولین کی تعداد میں اہلِ سیرت کا اختلاف ہے۔ دکتور محمد بن فارس جمیل نے اس کے بارے میں اپنی کتاب النبي ﷺ ويهود المدينة میں تحقیق لکھی ہے۔ وہ زہری کی روایت کے قائل ہیں جس کے مطابق مقتولین صرف چالیس تھے، دیکھیے: (النبي ﷺ ويهود المدينة) یہ تحقیق قابلِ قدر ہے۔ اس کے بارے میں ہم بھی ان کی تائید کرتے ہیں، اللہ انھیں جزائے خیر دے۔ [4] صحيح البخاري، المغازي، باب حديث بني النضير، حديث: 4028، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، باب إجلاء اليهود من الحجاز، حديث: 1766، وسنن أبي داود، الخراج، باب في خبر النضير، حديث: 3005، ومسند أبي عوانة: 4/163.

ان کے مال بھی محفوظ رہے۔ [1] بعض روایات کے مطابق دو اور شخص بھی زندہ رہے کیونکہ انھیں کسی صحابی نے امان دی تھی یا انھوں نے محاصرے کے دوران میں عہد کی پابندی کرنے کا یقین دلا دیا تھا۔ [2] ممکن ہے کچھ اور لوگ بھی بچ گئے ہوں مگر ان کی تعداد ایک گھرانے کے افراد سے زیادہ نہیں۔ ابن اسحاق اور دیگر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے کہنے پر زبیر بن باطا قرظی کی اولاد کی جان بخشی کر دی تھی۔ ان میں سے ایک عبدالرحمٰن بن زبیر ہیں جو بعد میں مسلمان ہو گئے اور صحابی بنے۔ [3] جن قیدیوں کے قتل کا فیصلہ ہوا انھیں بنت حارث نجاریہ رضی اللہ عنہا [4] اور

[1] یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جس کی سند ضعیف ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 272/1، 329/3) اس روایت کی پہلی سند متابعت (تائید) کی وجہ سے قوی ہے۔ اس کی تائید بخاری، مسلم، ابوداود اور ابوعوانہ کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ہے کہ ان میں سے چند ہی قتل سے بچ سکے۔ اس ''چند'' کی تفصیل ابن اسحاق کی اس روایت میں ہے۔ [2] ابن اسحاق نے اسے معلق روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام:3/330) انھی میں عمرو بن سعدی بھی شامل تھا۔ [3] ابن اسحاق کی سند ضعیف ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 336,335/3) ابن اسحاق نے اس سند میں صراحت سے نہیں بتایا کہ انھوں نے یہ روایت سنی ہے۔ بیہقی نے ابن اسحاق کی زہری سے یہ روایت نقل کی ہے، اس کی سند مرسل ہے۔ اس میں ابن اسحاق نے سماع کی تصریح کی ہے۔ بیہقی نے اسے ایک اور سند سے روایت کیا ہے۔ یہ موسیٰ بن عقبہ کی زہری سے روایت ہے اور سند مرسل ہے، دیکھیے: (دلائل النبوة للبيهقي:4/20, 21، 24) طبرانی بھی اسے الأوسط میں ضعیف سند سے لائے ہیں، دیکھیے: (مجمع الزوائد: 142/6) یہ ضعیف سندیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ ثابت بن قیس اور زبیر بن باطا کے قصے کی کوئی نہ کوئی حقیقت اور اصل ضرور ہے۔ کم از کم یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ثابت نے زبیر سے کسی احسان کی وجہ سے اچھا سلوک کیا جو زبیر نے جاہلیت میں ثابت پر کیا تھا۔ نیز دیکھیے: (الأموال لأبي عبيد، ص: 146) یہ روایت زہری کی مرسل ہے، اس لیے ضعیف ہے۔
[4] یہ ابن اسحاق کی معلق روایت ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 333/3، و المغازي للواقدي: 512/2)

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے گھروں میں قید کر دیا گیا۔ [1] پھر ان کے لیے مدینہ منورہ کے بازار میں خندقیں کھو دی گئیں اور وہاں لا کر ان کی گردنیں اڑائی گئیں۔ [2] ان میں سے ایک عورت بھی قتل کی گئی [3] کیونکہ اس نے خلّاد بن سوید رضی اللہ عنہ پر چکی کا پاٹ گرا کر انھیں شہید کر دیا تھا۔ [4]

اس کے علاوہ کسی عورت یا نابالغ بچے کو قتل نہیں کیا گیا۔ [5] پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مال اور بال بچے مسلمانوں میں تقسیم کر دیے۔ [6]

[1] مغازي رسول الله ﷺ لعروة بن الزبير، ص: 187، و المغازي للواقدي: 2/512-518.
[2] مسند أحمد: 4/310، وصحيح سنن الترمذي للألباني: 3/118، حديث: 3544.
[3] مسند أحمد: 6/277، وسنن أبي داود، الجهاد، باب في قتل النساء، حديث: 2671. ابوداود کی سند حسن لذاتہ ہے۔ ان کے نزدیک اس عورت کے قتل کا سبب اس کی کوئی کارگزاری تھی۔ شارح کا کہنا ہے اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی تھی۔ ابن اسحاق نے بھی اس روایت کو بسند حسن روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 3/334، والمغازي للواقدي: 2/516) واقدی کے نزدیک اس عورت کا نام نباتہ تھا۔ سیرت ابن اسحاق کے اصل نسخے میں بثاثہ درج ہے۔ [4] مسند أحمد: 6/277، وسنن أبي داود، الجهاد، باب في قتل النساء، حديث: 2671، والمستدرك للحاكم: 3/35,36. حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا اور امام ذہبی نے سکوت اختیار کیا ہے۔ ابن ہشام نے معلق طور پر روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 3/335) سندھی کے بقول یہ حدیث حسن لذاتہ کے درجے سے کم نہیں۔ غزوۂ بنی قریظہ میں شہید ہونے والے واحد صحابی خلّاد رضی اللہ عنہ تھے۔ [5] سنن أبي داود، الحدود، باب في الغلام يصيب الحد، حديث: 4404,4405، وصحيح سنن الترمذي: 2/114، حديث: 1649. ترمذی نے اس کے صحیح ہونے کا اشارہ دیا ہے۔ وسنن ابن ماجه، الجهاد، باب الغارة والبيات......، حديث: 2842، ومسند أحمد: 4/310، 5/311,312. ابن اسحاق نے اسے بسند حسن روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 3/337، والطبقات الكبرى: 2/76,77) سند صحیح ہے۔ یہ ابن اسحاق ہی کی سند ہے۔ ان کے علاوہ دیگر محدثین و مؤرخین نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ [6] صحيح البخاري، المغازي، باب حديث بني النضير......، حديث: 4028. سورۂ احزاب کی آیت: 27 اسی سلسلے میں نازل ہوئی۔

قیدیوں کا انجام

مؤرخ ابن اسحاق اور دیگر نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے کچھ قیدیوں کو سعد بن زید رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں نجد بھیجا تاکہ انھیں بیچ کر گھوڑے اور اسلحہ خریدا جائے۔ [1]

واقدی نے ''مغازی'' میں بنو قریظہ کے قیدیوں کی فروخت کے بارے میں ابن اسحاق کے اس قول کے علاوہ دو اور اقوال بھی بیان کیے ہیں:

* رسول اللہ ﷺ نے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو قیدی دے کر بھیجا کہ انھیں فروخت کر کے اسلحہ اور گھوڑے خرید لائیں۔
* عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کئی قیدی خرید لیے۔

تینوں اقوال میں تطبیق یوں ممکن ہے کہ یہ تینوں واقعات ہوئے ہیں۔ [2]

رسول اللہ ﷺ نے اُن کی عورتوں میں سے اپنے لیے ریحانہ بنت عمرو بن خنافہ کو چنا جو مسلمان ہو گئیں۔ جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو وہ آپ کی لونڈی تھیں۔ انھوں نے غلامی خود اپنے اختیار سے پسند کی تھی۔ [3]

[1] شامی نے یہی قول ابن اسحاق کے حوالے سے بیان کیا ہے، دیکھیے: (سبل الهدٰی والرشاد: 29/5) ابن عبدالبر نے سعد بن زید کے حالات میں اسے معلق روایت کے طور پر بیان کیا ہے، دیکھیے: (الاستیعاب: 47/2) واقدی نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 523/2) [2] المغازي للواقدي: 523، والسيرة الشامية: 29/5، والسيرة الحلبية: 675/674. [3] ابن اسحاق نے اسے مرسل سند سے روایت کیا ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية لابن هشام: 339/3) یہ روایت متابعت کی بنا پر قوی ہے۔ اسے ابن سعد نے بھی روایت کیا ہے۔ ان کی سند کے راوی سوائے واقدی کے سب ثقہ ہیں۔ انھوں نے ریحانہ بنت عمرو رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ ﷺ کی بیویوں میں شمار کیا ہے، دیکھیے: (الطبقات الكبرٰى: 131/8) واقدی اور طبری نے بھی انھیں اپنی تاریخ کی کتاب میں رسول اللہ ﷺ کی بیوی ہی ◄◄

احکام و مسائل

* جو عہد شکنی کرے، اُسے قتل کرنا جائز ہے۔ ہمارے زمانے تک حکومتیں اُن خائنوں کو قتل کرتی آرہی ہیں جو دشمنوں سے گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ اسے خیانتِ عظمیٰ کہا جاتا ہے۔
* مسلمانوں کے باہمی اہم معاملات میں کسی تیسرے شخص سے فیصلہ کرانا جائز ہے جیسا کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے فیصلہ کرانے سے معلوم ہوتا ہے۔
* فروعی مسائل میں اجتہاد جائز ہے اور اگر اجتہاد میں اختلاف ہو جائے تو کسی کو بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: ''سنو! تم میں سے ہر ایک عصر (یا ظہر) کی نماز بنوقریظہ میں جا کر پڑھے۔'' میں اجتہاد کیا جس میں اختلاف ہو گیا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو خطا وار قرار نہیں دیا۔
* علامہ نووی رحمہ اللہ کا کہنا ہے: جمہور علماء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ''اپنے سردار (یا اپنے بہترین آدمی) کی طرف اٹھو......'' سے استدلال کیا ہے کہ اہل علم اور صاحب فضیلت حضرات کے احترام میں کھڑے ہونا جائز ہے۔ یہ وہ قیام نہیں جس سے منع فرمایا گیا ہے۔ ممنوع قیام یہ ہے کہ لوگ کھڑے رہیں اور وہ فاضل شخص بیٹھا ہو اور جب تک بیٹھا رہے لوگ کھڑے رہیں۔ (علامہ نووی جمہور اہل علم کی موافقت کرتے ہوئے کہتے ہیں:) تشریف لانے والے صاحب فضیلت شخص کے احترام میں کھڑے ہونا مستحب ہے۔ اس کے موافق کئی احادیث آئی ہیں اور اس سے ممانعت کی کوئی صحیح و صریح روایت منقول نہیں۔''[1] میں نے اس مسئلے کی پوری تفصیل اور اہل علم کی آرا کو

»» شمار کیا ہے، دیکھیے: (المغازي للواقدي: 2/520,521، و تاريخ الطبري: 2/592) ابن عبدالبرّ نے بھی انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں شمار کیا ہے، دیکھیے: (الاستيعاب: 4/309) ان کا ذکر کتاب کے اس باب میں آرہا ہے جو امہات المومنین کے ساتھ خاص ہے۔ [1] شرح النووي على صحيح مسلم: 12/93.

ایک الگ رسالے میں سپرد قلم کیا ہے اور ''نہی'' کے توہمات کا شافی جواب دیا ہے۔

* دکتور بوطی کا کہنا ہے: ''یاد رہے کہ یہ اس روایت کے منافی نہیں جس میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اس بات سے خوش ہو کہ لوگ اس کے سامنے کھڑے رہیں، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔'' [1]

کیونکہ اہل علم اور صاحب فضیلت حضرات کا احترام اس امر کا محتاج یا متقاضی نہیں کہ وہ خود اس کا بتکلف اہتمام کریں اور اپنی تعظیم کرانے کے لیے کوشاں رہیں بلکہ صالحین کی امتیازی صفت تو یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تواضع سے پیش آتے ہیں۔ اُن کے اکرام واحترام کی بھی ایک حد ہے۔ اگر اس سے تجاوز کیا جائے گا تو یہی عمل حرام بن جائے گا اور دونوں فریق گنہگار ہوں گے، حد سے تجاوز کرنے والا بھی اور خاموش رہنے والا بھی۔ اس کی ایک صورت وہ ہے جو بعض اہل تصوف کی مجالس میں نظر آتی ہے کہ مرید کھڑے رہتے ہیں اور پیر صاحب بیٹھے ہوتے ہیں۔ مرید اپنے پیر کے سامنے دست بستہ نہایت عاجزی اور انکسار کے ساتھ کھڑا رہتا ہے۔ اسی طرح بعض مرید اپنے پیر کے پاس آتے وقت اس کے پاؤں یا ہاتھوں پر سجدہ کرتے ہیں اور پیر صاحب کی مجلس میں آتے وقت تقریباً گھسٹ کر پہنچتے ہیں [2]

یہ سب باتیں حرام ہیں۔ اسلام نے اپنے پیروکاروں کی تربیت کے لیے طریق کار متعین کر دیا ہے جس سے تجاوز کرنا مسلمانوں کے لیے حرام ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ تربیت کے سلسلے میں نبوی طریق کار سے بڑھ کر کوئی طریقہ کارگر اور مفید نہیں۔ ***

[1] سنن أبي داود، الأدب، باب الرجل يقوم للرجل يعظمه بذلك، حديث: 5229، وجامع الترمذي، الأدب، باب ماجاء في كراهية قيام الرجل للرجل، حديث: 2755، واللفظ له.

[2] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص:241,240.

قرآن مجید

مسلمانوں پر

حقوق

تالیف

فضیلۃ الشیخ صہیب احمد حفظہ اللہ

دار العلم ممبئی
DARUL ILM

سیرتِ نبوی ﷺ

ڈاکٹر محمد رزق اللہ احمد

1

DARUL ILM
PUBLISHERS & DISTRIBUTORS

242, J.B.B. Marg, (Belasis Road),
Nagpada, Mumbai-8 (INDIA)
Tel.: (+91-22) 2308 8989, 2308 2231
fax :(+91-22) 2302 0482
E-mail : ilmpublication@yahoo.co.in

مکمل سیٹ ₹ 650/-